

# آکاس بیل

شیریں حیدر

## پیش لفظ

الحمد للہ! میری ساتویں کتاب اللہ کے فضل، آپ سب کی دُعاؤں اور علم و عرفان پبلشرز کی کاوشوں سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ذاتی مصروفیات کے باعث اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔

زیر نظر ناول ماہنامہ پاکیزہ میں قسط وار چھپ کر قارئین میں پسندیدگی کی سند پا چکا ہے۔ ایک حقیقی کہانی پر مبنی اس ناول کے تقریباً سبھی کردار زندہ ہیں اور ہمارے ارد گرد ہی ہیں۔ امرتیل میں نہ صرف ایک انتہائی مہربان سسرال کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ اس میں ہر عورت کی طرح میرے اندر کی یہ خواہش بھی ابھر کر سامنے آئی ہے کہ ہر بیٹی کو ایسی سسرالی نصیب ہوں۔

عورت کی زندگی ایک جھد مسلسل اور کاوشوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ وہ سب کچھ پا کر بھی معروضہ عمل رہتی ہے، اس کی ذمہ داریاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ اپنے بچوں کے بعد ان کے بچے۔

اگر آپ ایک بہو ہیں تو کوشش کریں کہ سسرال کو اپنا گھر سمجھیں اور انہیں اسی

طرح اپنا بنالیں جس طرح کے رشتے آپ میکے میں چھوڑ کر آئی ہیں۔

اگر آپ ساس ہیں تو بہو کو بیٹی سمجھیں، وہ ایک ایسا پودا ہے جسے ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ پر لگایا جاتا ہے، اسے نئی جگہ پر بڑ پکڑنے کے لیے تھوڑا وقت درکار ہے۔ اس سے تعاون کریں، اسے سازگار آب و ہوا فراہم کریں تاکہ وہ اسی طرح رچ بس جائے جیسے آپ اسے چاہتی ہیں۔

یہ ناول پاکیزہ میں تو ”امرئیل“ کے نام سے شائع ہوا لیکن اس اشاعتی ادارے سے اسی نام سے دو کتب شائع ہو چکی ہیں اس لئے میں نے اس کا نام تبدیل کر کے ”آکاس نیل“ رکھا ہے۔

دعاؤں کی طالب

شیریں حیدر

ڈولی سے پاؤں اتر ابھی نہ تھا کہ پہلا فقرہ کان میں پڑا۔

”بھابی، غرارہ نیچے کر لیں کہیں پیروں کو نظر ہی نہ لگ جائے۔“ یہ میری نند کی طرف سے پذیرائی کا ایک انداز تھا۔ ساس بھی بلائیں لیتے نہ تھک رہی تھیں۔ پھر رسمیں شروع ہوئیں تو ان کا سلسلہ طویل ہوتے ہوتے رات سر پر آن پہنچی۔ ویورجی کے گود میں بیٹھ کر ٹیگ لینے کی رسم آخری قرار پائی اور اس کے ساتھ ہی کھانے کا اہتمام ہونے لگا۔ سوندھی سوندھی تازہ روٹیوں کی مہک پھیلنا شروع ہو گئی۔ میں نے بیڈ کی ٹیک سے کمر نکالی۔

”اٹھو نگہت! رات بہت ہو گئی ہے، بہو کا کھانا نکلواؤ اور کمرے میں بھجوادو۔ بہو بھی بیچاری آرام کرے کل پھر یہی بکھیڑے ہیں۔“ نگہت میرے پاس سے اٹھ گئی اور دل میرا دھڑ دھڑانے لگا۔ اسے میں خوف کا نام دوں یا کچھ اور.....

مجھے جھجکی محسوس ہونے لگی۔ اب یہ سارے لوگ جو ارد گرد بیٹھے ہیں ان میں بزرگ بھی ہیں، کنوارے بھی اور شادی شدہ بھی، کیا اب میں ان سب کی سوچوں کا مرکز ہوں۔ اس خیال سے میرا سر اور بھی نیچا ہو گیا۔ یہ کیا رسوم ہیں..... کس طرح کے ہمارے فیشن ہیں؟ لہن نہ ہوئی تماشا ہو گیا۔ کئی دن تک اس کی نمائش لگائے رکھتے ہیں۔ میں انہی خیالوں میں غلطیاں تھی کہ نگہت واپس آ گئی اس کے ہمراہ غالب بھی تھے اور پھر زندگی میں پہلی بار پورے حقوق کے ساتھ میں نے اپنے نئے محرم کے ہاتھوں کو اپنی کمر پر محسوس کیا۔ ان ہاتھوں کی زبان میں ایسا مطالبہ تھا کہ میں آپوں آپ سمنٹی ہوئی کھڑی ہو گئی اور پھر اپنے اس بھاری بھر کم لباس کو سنبھالتی نگہت کی مدد اور غالب کی ہمراہی میں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

نگہت اور غالب میں تھوڑی دیر بحث رہی، بہت سی لڑکیاں پہلے سے وہاں موجود تھیں بالآخر

غالب نے انہیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔ غالب نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ مگر مجھے ہاتھ لگانا ہی چاہتے تھے کہ چھوٹا بھائی تیمور کھٹکھارا۔ غالب کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ تیمور نے ایک فلک شکاف قہقہہ لگایا۔

”واہ بھائی صاحب! اکیلے اکیلے اتنی آسانی سے اتنی بڑی چیز پار کرنے کی کوششیں۔“ غالب بھی کھیانی ہنسی ہنسے۔ وہ مجھ سے اتنے قریب کھڑے تھے کہ ان کے جذبوں کی آنچ سے میں گویا پکھل رہی تھی۔ تیمور تھوڑی دیر تک ہم دونوں کی حالت سے لطف اندوز ہوتا رہا اور بالآخر بھائی سے وعدہ لے کر چل دیا کہ باقی آئندہ!!!

دروازہ اب جو بند ہوا تو اس کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ ہوا۔ ہم نے شاید آئندہ سو برس کے لیے باتیں آج ہی رات کرنا تھیں۔ صبح کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ غالب کی باتیں ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔ دل سے دعا نکلتی تھی کہ یہ رات کبھی ختم نہ ہو، اس مرادوں والی رات کی کبھی سحر نہ ہو۔ یہ رات یونہی قائم رہے، یہ رات ہمیشہ اسی طرح رات ہی رہے۔ نہ باتیں ختم ہوں، نہ حکایتیں۔ لطف و سرور کے یہ لحاظ دائمی ہو جائیں لیکن ساری باتیں، ساری دعائیں ختم ہو گئیں۔ صبح ناشتے کے ساتھ نگہت آگئی۔ اس کے لبوں کے گوشوں پر شرارت رقصاں تھیں۔ میں نہا کر تازہ دم ہو چکی تھی لیکن نیند اب غالب آ رہی تھی۔ غالب ابھی تک غسل خانے میں تھے۔

”بھابی اب سولیں تھوڑی دیر۔“ نگہت نے شرارت سے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں خفیف سی ہو گئی۔ اچانک امی جان (غالب کی امی) کمرے میں داخل ہوئیں۔

”السلام علیکم امی جان!“ میں نے سر پر پلو ڈالتے ہوئے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے ساتھ لگا کر سر پر بوسہ دیا۔

”جیتتی رہو بہو۔“ رات نیند تو ٹھیک سے آئی، نئے گھر میں ذرا پہلے پہلے نیند کم ہی آتی ہے۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں اور نگہت مسلسل مسکرا رہی تھی۔ میں نے سر جھکا کر صرف ”جی“ کہا۔ وہ باہر چلی گئیں تو نگہت میری جان کو آگئی، یہ باہر نکلے تو میں سولوں۔ غالب غسل خانے سے نکلے تو نگہت بھی باہر چلی گئی اور میں تنہائی میں اس شخص سے سے شرمائی جس کے سینے پر سر رکھ کر میں نے رات اس کی دھڑکنیں تک سنیں اور ساری رات باتوں میں گزار دی تھی۔ غالب دیوانوں کی طرح

لگ رہے تھے۔ ان کی حرکتیں، ان کی باتیں، ان کی ہنسی، ان کے مذاق نے مجھے بے طرح مسحور کر ڈالا۔ ”غالب پلیز! صبح ہو چکی ہے۔“ اور غالب کی دیوانگی پر اس فقرے نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔

”کیوں صبح کو ہمارا رشتہ کسی اور نوعیت کا ہو جائے گا؟“ انہوں نے پھر دروازہ بولت کر دیا۔ دن کے دس بج چکے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ میں اور غالب دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہے تھے۔ ناشتامیز پر پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں ایک دم گھبرا گئی۔

”غالب! کتنی دیر ہو گئی ہے۔“ وہ تو شکر ہے کہ ولیمہ دن میں نہیں تھا۔

”اوہو! اب پولیس آجائے گی تو تم تھانے جا کر کیا جواب دو گی؟“ غالب کا انداز اتنا معصوم تھا کہ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”چلو اب نہا کر تازہ دم ہو جاؤ۔“ غسل کر کے نکلی تو غالب ابھی تک کھڑے تھے۔ ”بھئی، ہم تو الوداعی ملاقات کے لیے کھڑے ہیں کیونکہ آپ کے حالات دیکھ کر ہمیں امید ہے کہ رات سے قبل ملاقات نہ ہوگی۔“ میں بے طرح شرمائی۔

غالب اور میں اپنے کمرے سے نکلے تو ٹی وی لاؤنج میں امی جان، نگہت، تیمور اور مظہر موجود تھے۔ مہمانوں میں سب لاہور کے ہی تھے اس لیے سب برات کے بعد واپس چلے گئے تھے اور اب رات کو انہیں ویسے کے لیے سیدھا ہوٹل میں ہی آنا تھا۔ تینوں بہن بھائی غالب سے بہت چھوٹے تھے۔ مظہر بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ غالب کے بعد نگہت، تیمور اور پھر مظہر۔ نگہت بی اے کر کے فارغ تھی۔ میں نے حال ہی میں بی اے کے امتحانات دیئے تھے۔ تیمور تھرڈ ایئر میں تھا حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے بڑا ہی تھا اور مظہر میٹرک میں تھا۔ سر صاحب کافی عرصہ ہوا وفات پا چکے تھے۔ غالب اباجی کے قریبی اور عزیز دوست کے بیٹے تھے اور مرحوم دوست کے بیٹے سے بیٹی بیاہ کر انہوں نے دوستی کے رشتے کو مضبوط کر لیا تھا۔

نگہت برتن اٹھانے کے لیے کمرے میں گئی تو واپس ٹرائی سیدھی لاؤنج میں لائی۔ ”امی دیکھیں ذرا ٹرائی۔“ امی جی ٹرائی دیکھ کر پریشان ہوئیں اور میں شرمندہ۔ تیمور تو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!“ اس پر امی جان نے اسے ڈانٹ دیا۔ نگہت کو تازہ ناشتا بنانے کو کہا اور میں جو اندر سے سوچ رہی تھی کہ شاید اس بات پر امی جی سے پہلی ڈانٹ پڑے گی۔ اس وقت حیران رہ گئی جب امی جی نے غالب کو ڈانٹا۔

”غالب تم اتنے بڑے ہو کر بھی عقلمند نہیں ہو سکے۔ تمہیں رب نے صرف قد لمبا دے دیا



آنکھیں سہمی ہوئی ہرنی جیسی ہیں  
رنگ گویا چکنی مٹی میں گلابوں کی آمیزش  
جلد اتنی چمکدار ہے کہ اندھیرے میں چمکتی ہے  
عمیق بینی ہے تجھ میں، لطافت بھی ہے

○ حسن بھی ہے اور حسن کو سنوارنے کی صلاحیت بھی ○

میں یہ سب جانتے ہوئے بھی کسر نفسی سے کام لیتی ہوں۔ تکبر نہیں کرتی کہ خدا کو پسند نہیں۔ غرور رکھتی ہوں کہ عورت کا اضافی وصف ہے۔ خود سے تو میں کچھ آگاہ تھی ہی کچھ ایک ہی رات میں غالب کے والہانہ انداز اور ان جیسے خشک زاہد (عورت کے معاملے میں) کے منہ سے میرے لیے جو الفاظ ادا ہوئے وہ ایک مرد کی طرف سے میری تعریف اور میری پسندیدگی کی حقی سند ہیں۔ حسن کو دیکھنا اور سراہنا مرد کی شاید عادت ہے لیکن غالب سے قبل میں نے کبھی کسی پر غور نہیں کیا تھا۔

غالب بھی دن بھر کوشاں رہے کہ مل بیٹھنے کا کوئی موقع مل سکے۔ خود تو وہ ایک موقع پا کر تھوڑی دیر کو سولے لیکن میں صبح تھوڑی دیر سو جانے پر ہی کافی شرمندہ تھی۔ دن کا کھانا ہم چھ افراد خانہ نے پوری آزادی اور بالکل خالص گھریلو ماحول میں کھایا۔ نگہت کی دبی مسکراہٹیں۔ تیمور کے شرارتی فقرے اور امی جان کا میری حمایت کرنا مجھے بہت اچھا لگا۔ مظہر ان تمام معاملات میں بالکل غیر جانبدار نہ رویہ لیے بیٹھا رہا۔ وہ تھا ہی ایسا بھولا اور سادہ مزاج۔ غالب کو تو خدا نے کھل کھیلنے کا موقع دیا۔ انہوں نے اپنی ماں کی خوشنودی کی خاطر میری بہت خاطر داری کی۔ میں باقی لوگوں کی موجودگی میں بہت محتاط رویہ رکھنے کی خواہش مند ہوں اور آج رات ہی یہ غالب کو بتا دوں گی کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔

رات گلابی جوڑا پہن کر ہلکے سے میک اپ کے ساتھ جب آئینے کو دیکھ کر میں خود شرمانے لگی تو نگہت کی تسلی ہوئی۔ اپنے حسن کا احساس تو تھا، اسے نمایاں کرنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ نہ یہ شادی سے قبل بہت بننا سنورنا اچھا لگتا تھا۔ پہلی دفعہ بھاری زیورات اور کا مدار جوڑا پہن کر تو خود کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ غالب تو نگہت کی موجودگی میں ہی شاید پیش قدمی کرتے لیکن نگہت خود ہی عقلمندی کا مظاہرہ کر کے باہر گئی تو غالب نے مجھے کھڑا کر کے سر تاپا جائزہ لینا اور نظر سے سراہنا

ہے۔ بے وقوف! اس طرح تو بہو غائب ہو جائے گی۔ اتنی کمزور تو وہ پہلے ہی ہے۔ بیٹے ناشتا کرنے سے انسان میں قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ اس گھر میں اس کے تمام رشتے تمہاری وساطت سے ہیں، تمہیں اس کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے۔ مجھے نہیں امید تھی کہ بہو پہلے ہی دن ناشتے سے محروم رہے گی۔“ غالب کو جواب نہیں سوچ رہا تھا۔

”امی! یہ سو گئی تھی۔“ انہوں نے اور حماقت کی جس پر تیمور پھر ہنس پڑا اور امی بھی اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکیں۔

”برداشت تو بھائی میں بہت ہے امی! شاید اسی برداشت کو بھائی جان آزما رہے ہیں۔ یہ ان کی کم ہمت ہے کہ انہوں نے غالب بھائی جان کو برداشت کر لیا۔“ تیمور نے کہا تو امی جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”تیمور، غالب نہ صرف تم سے عمر اور مرتبے میں بڑا ہے بلکہ اب وہ شادی شدہ بھی ہے اور تم پر لازم ہے کہ تم اس کا احترام کرو۔ بہو کیا سوچتی ہوگی؟“

”ارے نہیں امی جان! یہ بھائیوں کا آپس کا مذاق تو زندگی کی خوبصورتی ہے اور پھر میرے دل میں جو احترام غالب کے لیے ہے اس میں کسی طرح کی نہیں ہو سکتی اور تیمور تو خود بھی میرے چھوٹے بھائی جیسا ہے۔“ میں عمر میں تیمور سے چند ماہ چھوٹی ہی ہوں گی لیکن اسے چھوٹا بھائی کہہ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، وہ بھی میرا مشکور نظر آنے لگا اور امی جی نے اس بات پر میری بلائیں لے لیں۔ نگہت ناشتا لے آئی۔ ہمارے ساتھ سب ہی تھوڑا بہت کچھ نہ کچھ کھانے لگے۔

شام کو ہمیں ہوٹل کے لیے تیار ہونا تھا۔ میں دن بھر پھر ترستی ہی رہ گئی کہ کوئی موقع ملے تو ذرا سو جاؤں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو پائی۔ دن بھرای جان کی مکمل داسرہیلیاں مجھے دیکھنے اور مختلف آراء سے نوازنے آتی رہیں لیکن مجموعی طور پر ان کی تمام سہیلیوں نے مجھے بہت سراہا۔

○ مجھے خود پر تو مان نہیں

لیکن آئینہ مجھے ہمیشہ کہتا ہے

تیرے نقوش بہت خوبصورت ہیں

شروع کر دیا، میں شرما کر ان کے سینے سے جا لگی۔

شرما کر وہ اس میں منہ چھپا لیتی ہے، اپنے دکھ کا ظہار کرنا ہو یا خوشی کی زیادتی، وصل کی گھڑیاں ہوں یا طویل جدائی کا سفر درپیش ہو، کوئی اچھی خبر سنائی ہو یا کوئی مطالبہ کرنا ہو، مرد کا سینہ اس کی بہترین پناہ گاہ ہوتا ہے۔ عورت اس بات کو روزِ اول سے ہی جان لیتی ہے، مرد کی کمزوری بھی شاید عورت کا سینے سے لگا وجود ہوتا ہے اور عورت مرد کی کمزوریوں کے بل پر ہی اس پر حکومت کرتی ہے۔ ہوٹل میں بچپن سے قتل ہی گھر میں کافی رش ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ گھر سے ہو کر ہوٹل جا رہے تھے۔ مجھے پھر ایک دفعہ دلہن کی طرح بیٹھنا پڑ گیا جبکہ آج اس گھر میں اجنبیت کا احساس کم تھا لیکن آج لوگوں کی نظریں مجھے کچھ کھوجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مقررہ وقت پر ہم گھر سے روانہ ہو گئے۔ ہوٹل میں استقبالیے پر نگہت، تیمور اور امی جی کھڑے تھے۔ غالب اپنے دوستوں میں گھرے ہوئے تھے جو ان پر فقرے چست کر رہے تھے۔ مجھے ان کے تین چار دوست سلام کرنے آئے تو ان کے دوست غالب کو میرے ساتھ بٹھا کر دیکھنے پر مضر ہو گئے۔ غالب خود بھی بہت اسماٹ لگ رہے تھے، بقول لوگوں کے چاند سورج کی جوڑی تھی۔ غالب مسلسل ساتھ بیٹھنے پر انکار کر رہے تھے۔ ”یار! تم اتنا مجبور کیوں کر رہے ہو؟“

”ہم ذرا دیکھنے آئے ہیں کہ پہلے خور میں لنگور کا محاورہ کس قدر مناسب لگ رہا ہے؟“ دو ایک نے ہنس کر کہا۔ میں زیر لب مسکرا دی۔ تعریف تو ہر کسی کو بھاتی ہے اور آج تو ایسے القاب مجھے بہت سننے کو مل رہے تھے جن کو سن کر خوشی ہو رہی تھی۔

”تمہیں شرم نہیں آتی میری بیوی کو لنگور کہتے ہوئے“ غالب نے مصنوعی غصے سے کہا اور اس بات پر میں اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ سارے دوست کھل کر ہنسنے اور غالب پھر اپنے دوستوں کے چلو میں راجا اندر بنے دوسری طرف بڑھ گئے۔

تھوڑی دیر میں میرے میکے والے آ گئے۔ سرریلوں کی طرف سے ان کا شاندار استقبال اور بہت پذیرائی ہوئی۔ میں کھڑے ہو کر سب سے ملتی رہی۔ ابو، بھائی، بہنیں اور والدہ سب کو ملنے کافی دیر ہو گئی۔ بہنیں مخصوص انداز میں چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔ والدہ بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ جب ملنے ملانے کا مرحلہ ختم ہوا تو سب اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ والدہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ بہت مطمئن تھیں کہ میں ان کو دیکھنے میں بہت خوش جو لگ رہی تھی۔ مجھ سے دیر تک میرا

حال احوال پوچھتی رہیں اور باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھیں لبریز ہو جاتیں تو سر نیچے کر کے ناک صاف کرنے کے بہانے آنکھیں صاف کر لیتیں۔ میرا دل بھی جیسے اندر سے کٹ رہا تھا۔ بہنوں میں، میں آخری نمبر پر تھی۔ مجھ سے پہلے بھی سب بہنوں کی شادی پر والدہ کی یہی کیفیت ہوتی تھی لیکن تب اس کیفیت کو سرسری طور پر محسوس کرتی تھی۔ آج اس کیفیت کو ہم دونوں محسوس کر رہے تھے۔ چھوٹی اولاد ہونے کے باعث والدہ سے پیار بھی بہت زیادہ تھا۔ اس لیے آج والدہ کا کلیجا اور طرح سے کٹ رہا تھا۔

مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہو رہی تھی کہ ماں کی متا بھی کیا چیز ہے۔ اولاد کو پیدا کرتی ہے، راتیں جاگ کر پالتی ہے۔ پھر ایک دن آتا ہے کہ بیٹی کے نام پر زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلتی ہے، انہیں ہنستا بستا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ خوشی سے آنسو بھی نکل آتے ہیں اور یہ سوچ کر یہ آنسو بیٹی کی سسرال والوں کو اور معنی ندے دیں ان پر پردے ڈالتی ہے۔ کتنا حوصلہ ہوتا ہے ماں باپ کا اپنی اولاد کو غیر کے حوالے کر دینے کا۔ ایک بالکل اجنبی شخص کے حوالے کر دینے کا۔ وہی ماں باپ جو بیٹیوں کی عزت و عصمت کے محافظ ہوتے ہیں اس کے تمام اختیارات ایک اور مرد کو تفویض کر دیتے ہیں جو ماں باپ سے زیادہ با اختیار ہوتا ہے۔ جو چاہے سلوک روا رکھے اچھا یا برا ماں باپ اس کو کچھ کہنے کے روادار بھی نہیں ہوتے۔ یہ تو بیٹی کی قسمت ہے جس کے اچھے ہونے کی اس کی پیدائش پر ہی دعا کرتے ہیں۔ میری ماں شاید اس حساب سے خوش نصیب ہے کہ اس نے چار بار بیٹیوں کے مقدر کا جوا کھیلا اور اس کی صاف نیت اور اس کے دل کا سکون ہے کہ وہ ہر جوئے میں اس حد تک کامیاب رہی کہ بیٹیاں اس کے کیے ہوئے رشتے آخر دم تک ہنس کر نبھائیں گی۔ متا کی تڑپ تو مشہور ہے، بار بار تڑپتی ہے بیچاری، اولاد کی ہر تکلیف پر مگر آج والدہ کیوں رو رہی ہیں؟

”والدہ میں بہت خوش ہوں آپ نہ روئیں“ اور والدہ نے مجھے سینے سے لگا کر بہت پیار کیا۔ آج مجھے بڑی شدت سے متا کی خوشبو محسوس ہوئی اپنی ماں کے سینے سے۔

کھانا شروع ہوا تو سب لوگ اٹھ گئے۔ میرا اور غالب کا کھانا اسٹیج پر ہی آنا تھا۔ میں نے والدہ کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ہی بٹھالیا اور غالب سے کہا کہ وہ امی جان کو بھی لے آئیں لیکن والدہ نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ یہاں بیٹھیں، سو غالب کی معیت میں ڈاننگ ہال میں چلی گئیں۔ غالب واپس آئے تو میری آنکھیں دیکھ کر بھانپ گئے اور شرارت سے بولے ”اچھا تو ہماری شکایتیں لگ

رہی تھیں؟“

”جی ہاں!“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”اگر ایسا سلوک کریں گے تو شکایت لگے گی۔“

”کیسا؟“ غالب شاید سنجیدہ ہونے لگے۔

”جیسا رات کو کیا..... اور اب تک کر رہے ہیں اور اب بھوکا مارنے کا ارادہ ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا تو غالب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلا نوالہ اپنے ہاتھ سے بنا کر میرے منہ میں رکھا اور بولے۔

”بھئی سلوک تو ہم ایسا ہی کریں گے، آپ اپنی والدہ سے کب تک ہماری شکایتیں کریں گی اور ویسے بھی آپ کی والدہ نے مجھے خاص طور پر کہا ہے کہ اس سے ایسا ہی سلوک کرو۔“

”جھوٹ، سراسر جھوٹ۔“ میں نے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔

”سچ آپ اپنی والدہ کو میرے سلوک سے اسی طرح آگاہ کرتی رہیں تو وہ مجھے حسن کارکردگی کا سرٹیفکیٹ جلد عنایت کر دیں گی۔“ میرے کی آمد نے گفتگو کا سلسلہ توڑ دیا۔ ہلکی پھلکی باتوں کے دوران ہمارا کھانا انتہائی پزیر ہوا۔ آج بھی رات کتنی دیر ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ سارے مہمانوں کو رخصت کیے کے ہم بھی گھر آ گئے۔

چند دن تک تو یہ معمول رہا کہ دعوتوں اور مبارکبادوں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ دل ترس گیا تھا کہ کبھی گھر کا پکا ہوا بھی نصیب ہوا اور مجھے تو گھر میں خود کام کرنے کی عادت بھی تھی اس لیے فارغ رہ کر اکتانے لگی۔

سسرال کے بارے میں یہی سنا تھا کہ ایک وادی پُر خار ہے جس میں قدم رکھتے ہی نت نئی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی لڑکی کے مزاج نہیں ملتے۔ کبھی شوہر سے ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ ساس، سسر، سسرندیں غرض بہت سے پل صراط جو ایک تنہا اکیلی لڑکی کو پار کرنے ہوتے ہیں۔ شادی ایک سمجھوتا ہے، شادی ایک جوا ہے جس میں ایک لڑکی داؤ پر لگائی جاتی ہے۔ کھانیاں، گھانیاں، مشکل ترین چوٹیاں سب ایک ہی ذات کو سر کرنا ہوتی ہیں لیکن ہر انسان اپنی ذات کا سفر تو تنہا ہی طے کرتا ہے۔ سامنے والا کیا سوچ رہا ہے، وہ کس چیز کو کس زاویے سے دیکھ رہا ہے اس کو صرف

وہی جانتا ہے۔ دوسرے اندازے تو کر سکتے ہیں لیکن نہ تک نہیں پہنچ پاتے۔

شادی کو ابھی چند ہی رونہ ہوئے تھے لیکن میں نے ایک لمحے کو بھی خود کو ”مس فٹ“ محسوس نہ کیا تھا۔ یہ سب مجھے اپنے اپنے سے لگتے تھے اور غالب تو گویا جنموں جنموں سے میرے واقف تھے۔ میرے لیے بنے تھے، میرے ہم مزاج، میرے ہم آہنگ، میرے ہمدم!

اس روز میں زیادہ بور ہوئی تو اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ امی جان اور نگہت کے ہاتھوں میں کچن آئینے کی طرف صاف شفاف اور چمکدار لگ رہا تھا۔ دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہو گئی۔ نگہت غالباً نہار ہی تھی اور امی جان نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے بہت کم آواز پیدا کرتے ہوئے چائے بنائی۔ ٹرے میں چائے کے برتن رکھے اور سیدھی امی جان کے کمرے میں آ گئی۔ امی جان جہاں یکدم خوش ہوئیں وہیں شاید ششدر بھی رہ گئیں۔

”بہو! یہ کیا کیا ہے تم نے؟ نگہت کہاں ہے؟“ میں تو وہیں رک گئی۔ شاید میں نے زیادہ با اختیار ہونے کی کوشش کی تھی۔ شاید میں نے اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر غلطی کی تھی۔ اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا۔ اپنی حدود پھیلا گئی تھی۔ میرا ذہن قوت فیصلہ سے محروم ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے عقوبت سے مانوس ہی خوشبو محسوس کی۔ مجھے اپنا آپ پناہ میں محسوس ہوا تو میں نے امی جان کی بات کا جواب دیا۔

”کیوں امی جان؟ کیا میں نے کوئی غلطی کر دی ہے؟“ امی جان اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں۔ ”نہیں بہو! مجھے تو شرمندگی ہو رہی ہے کہ پہلی دفعہ اس گھر میں تمہارا کچھ کھانے کو جی چاہا اور تمہیں خود کچن میں جانا پڑا۔“ میں نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ اتنی دیر میں غالب بھی بیٹھ چکے تھے۔

”امی جان! میرا کچھ کھانے پینے کو نہیں بلکہ کام کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس لیے میں نے چائے بنائی اور پھر اگر میں اس گھر کی فرد ہوں تو آج پندرہ دن ہو گئے ہیں میں مہمانوں کی طرح رہ رہی ہوں۔ آپ نے اور نگہت نے مجھے تھیلی کا چھالنا کرنا تو رکھا ہوا ہے اور آئندہ سے پلیز مجھے کسی کام سے منع نہ کریں بلکہ مجھے خوشی محسوس ہوگی اگر آپ نگہت کی طرح مجھے سمجھیں گی، جو کام کہنا ہوگا اس کے بجائے مجھے کہیں گی اور آپ مجھے بہو کے بجائے بیٹی کہیں گی۔“ امی جان نے آگے بڑھ کر میرا سر اپنے کندھوں پر ٹکالیا۔ مجھے ان کے وجود سے اپنی ماں کی مہک آنے لگی۔ دیر تک وہ میرا سر سہلاتی رہیں اور دعائیں دیتی رہیں۔ غالب نے اپنے مخصوص شرارتی لہجے میں ”کٹ“ کہہ کر

ہمیں گویا اس ماحول میں واپس بلا لیا۔

”اگر آپ لوگوں کا سینہ کھل ہو چکا ہو تو بیگم صاحبہ چائے پیادیتجئے!“

گھٹ نہا کر آئی تو وہ الگ شرمندہ ہو رہی تھی، تیمور بھی ”چائے بولا چائے بولا“ کہتا ہوا وہیں آگیا اور پھر ہم سب نے مل کر چائے پی۔ گھٹ ساتھ بسکٹ کا ڈبا اٹھالائی اور پھر ہر ایک نے حسب توفیق تعریفوں کے پل باندھ کر مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں تو کبھی چائے بنانے پر اتنی تعریف کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ گھر میں بھی اباجی کی عادت تھی کہ اولاد کے ذرا ذرا سے کارنامے پر دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ ”آئندہ سے اس گھر میں جتنی چائے بنے گی، بھابی بنایا کریں گی۔“ تیمور نے گویا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس پر گھٹ نے مصنوعی خوشی کا اظہار کیا تو امی جان خفا ہونے لگیں۔

”بے وقوف! ابھی اس کے اس گھر میں ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ ابھی سے اس کو ذمہ داریوں میں نہ جکڑو، اسی کا گھر ہے، اسی نے سنبھالنا ہے لیکن چار دن اس کے ہاتھ کی مہندی کی جج دھجج تو دیکھ لینے دو۔“ اب خوش ہونے کی باری غالب کی تھی۔

میں نے صدق دل سے دعا کی۔ ”امی جان آپ نے مجھے اتنا سکھ دینے کا سوچا رہا آپ کی بیٹی کو بھی اگلے گھر میں اتنا ہی سکھی رکھے۔ میرے جیسے نصیب ہر کسی کے ہوں۔“ چائے ختم ہوئی تو برتن امی جان نے نہیں سمیٹنے دیئے۔

”بس بیٹی، کافی ہے باقی گھٹ کر لے گی۔“ میں بیٹھ گئی تو امی جان نے کہا۔

”غالب! بہو کو ذرا گھما پھرا لاؤ، بہن جی سے بھی ملا لانا، اگر رہنا چاہے تو کچھ دن رہ بھی لے۔“ میں نے دل سے پھر ایک بار ان کے لیے دعا کی۔ میں خود چاہتی بھی تو غالب سے نہ کہتی۔ اصل میں، میں نہیں چاہتی تھی کہ ان دنوں میں میرے منہ سے ایسی کوئی بھی بات نکلے جو میری عادت قرار پا جائے اور مجھے آئندہ اس پر کوئی پریشانی اٹھانا پڑے۔ کچھ فرصت بھی نہ تھی اور پھر سچ بات تو یہ ہے کہ دل ہی آمادہ نہ ہوتا تھا کہ غالب کے بغیر تھوڑی دیر بھی گزاروں اور رہی بات کہ غالب ساتھ رہیں یہ بات میں ان پر مسلط نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب امی جان نے کہا کہ جاؤ تو میں نے حامی بھری۔ غالب نے شکوہ بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے ذہن میں شرارت آئی تو بڑی معصومیت سے بولی۔

”ٹھیک ہے امی جان میں تین چار دن رہ آؤں۔“ اصل میں شادی کے دن سے ایک رات

کے سوا والدہ کی طرف رہ بھی نہیں سکی۔ یہ آواز میرے اندر کی عورت کی تھی۔ عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ مرد کو آزمانا چاہتی ہے۔

اس کو اپنے وجود کی عادی بنالیتی ہے! پھر اس کو اس نشے سے دور کرتی ہے، وہ لپکتا ہے، یہ آگے آگے بھاگتی ہے، اسے اپنی تنہا کرتا مرد بہت بھاتا ہے۔ وہ مرد کی طاقت کو پسند کرتی ہے، لیکن خود اس کی کمزوری بن جاتی ہے۔ عورت کا عادی مرد بچے کی طرح ہو جاتا ہے، گداز ممتا بھرے وجود کے سہارے کا عادی، اسے اکیلے بستر پر نیند نہیں آتی۔ اس کے پسپوں میں بھی عورت ہوتی ہے اور حقیقت میں بھی، بیوی مرد کی عادت ہوتی ہے، جسے پورا کیے بنا اسے اپنا بستر بھی صحرا لگتا ہے، جہاں رات بھر وہ بیچ سراہوں کے بھٹکتا ہے، اور پھر ایسا مرد جو شرافت کا پتلا ہو، جس نے عورت کو پہلی بار بیوی کی حیثیت میں ہی دیکھا، چھو اور آزما یا اس کے لیے مرکز بھی وہی، محور بھی وہی، اور پھر اگر کھلونا ہی ضدی ہو جائے تو بچے کی ضد کیا کرے؟

امی جان تو آمادہ ہو گئیں بلکہ غالب سے بھی کہنے لگیں ”تم بھی دو چار دن رہ آؤ۔“ وہ بھی مرد اور پھر اپنے بیٹے کی کیفیت سے آگاہ تھیں، غالب جھجک گئے۔ ”نہیں امی! میں اسے چھوڑ کر آ جاؤں گا۔“ گھٹ کی مدد سے میں نے تین چار اچھے سوٹ بیک میں رکھے اور تھوڑا بہت زیور، میک اپ کا سامان رکھ کر میں تیار ہو کر باہر نکل آئی۔ امی جان سے ملی، تیمور کو خدا حافظ کہا۔

”بھابی چار دن رہیں گی؟“ اس نے سوال کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ خوب لمبا سا اچھا!!!!!! کہا۔ گھٹ سے مل کر میں غالب کی معیت میں باہر نکل آئی۔ غالب نے بیک پچھلی سیٹ پر رکھا اور گاڑی اشارت کرنے سے پہلے سرسری نظر ڈالی تو وہ نظر واپس جانا بھول گئی۔ میرے اندر کی عورت نے مجھے بہت بننے سنورنے پر مجبور کر دیا تھا، میرا حسن اس وقت دوا آتش ہو رہا تھا اور غالب کے اندر طلب کی آنچ کو محسوس کر رہا تھا۔

”چلیں، گاڑی اشارت کریں۔“ میں نے غالب کے گیر پر رکھے ہاتھ پر اپنی انگلیوں کی پوروں سے ہلکی سی لگدگی کی تو وہ گویا کسی خواب سے چونک کر جاگے۔ گاڑی چل پڑی۔

”کہاں گھومنے جانا ہے؟“ غالب نے عجیب لہجے میں پوچھا، آس اور یاس کے بین بین کوئی لہجہ تھا۔ مجھے تھوڑی شرم تو آئی اور قریب تھا کہ اس آزمائش سے اس غریب کو آزاد کر دیتی پھر ذرا شرارتی دل نے کہا۔ ”چلنے دے، یونہی چلنے دے ذرا!“

”گھر سے آپ لے کر نکلے ہیں گھمانے پھرانے اور پوچھ مجھ سے رہے ہیں۔“ میں نے سنجیدگی کا لبہ اوڑھا۔ اس کریم پارلر کے باہر گاڑی رکی تو میں نے منع کر دیا کہ اس کریم کو دل نہ چاہ رہا تھا اور کچھ میری طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی۔

”پھر کیا کھاؤ گی جانم؟“ غالب نے بڑے دلار سے پوچھا۔

”یوں کریں۔“ میں نے حل پیش کیا۔ ”وقت بہت ہو چلا ہے۔ سیدھے والدہ کی طرف چلتے ہیں، گھومنے پھرنے کبھی پھر سب لوگ مل کر چلیں گے۔“ کھانے کا وقت قریب تھا اور میں نے اس وقت بیٹی بن کر سوچا کہ بے وقت والدہ کے گھر جاؤں گی تو وہ اپنے داماد کی وجہ سے مشکل اور تکلیف میں پڑ جائیں گی۔ کم از کم قبل از وقت پہنچوں تو ان کو وقت بھی کافی مل جائے گا اور غالب پر بھی اچھا تاثر پڑے گا۔ میکا جیسا بھی ہو بیٹیاں اس کی جنک اور توہین کبھی نہیں چاہئیں۔ اپنے باپ کا اونچا شملہ، بھائیوں کی اونچی ناک اور ماں کی عزت و توقیر بیٹی کو پیاری ہوتی ہے۔ انہی کے دم سے میکا قائم ہوتا ہے اور میکے کے دم سے ہی سسرال میں اس کی عزت و توقیر ہوتی ہے۔ مضبوط میکا ہمیشہ سسرال والوں پر اچھا تاثر چھوڑتا ہے۔ انہی سوچوں میں غلطی تھی کہ گھر آ گیا۔

گھر پر والدہ اور ابو کے علاوہ علی بھائی تھے۔ سب لوگ بڑے تپاک سے ملے۔ والدہ اور ابو ہمارے پاس بیٹھے تھے۔ غالب ڈرائنگ روم کے بجائے ٹی وی لاونچ میں ہی بیٹھ گئے۔ میں اٹھنے لگی تو علی بھائی اٹھ گئے اور گلاسوں میں جوس ڈال کر لے آئے تھے۔ کافی دیر گپ شپ کرتے رہے۔ جب گفتگو سیاسی رخ اختیار کر گئی تو والدہ موقع پا کر کچن کی طرف چلیں، میں بھی ان کے پیچھے لپکی، کچن میں علی بھائی نے فریزر سے مرغی اور شامی کباب نکال کر رکھ دیئے تھے۔ مجھے ان کی ذہانت پر پیار بہت آیا اور ساتھ ہی ہمدردی بھی محسوس ہوئی کہ بہنیں گھر سے چلی جاتی ہیں تو پھر بیٹوں کو ہی ماں کے لیے بیٹیاں بننا پڑتا ہے۔ والدہ نے چاول نکال لے تو میں پیڑھی لے کر چٹنے بیٹھ گئی۔ مرغی کو والدہ نے جلدی جلدی لہسن، ادراک کا مسالہ لگا کر رکھا۔ دن کا گوشت کا سالن رکھا تھا اس پر تازہ دھنیا کاٹ کر ڈالا۔ ساتھ ساتھ ہم باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

میں اپنے گھر میں خوش تھی اس پر والدہ بہت مطمئن تھیں۔ جب میں نے ان کو بتایا کہ میں چار دن رہنے کے لیے آئی ہوں تو امی نے سرزنش کی۔ ”بیٹی، شروع دنوں میں شوہر کی آزمائش نہیں کرتے۔ وہ نیا نیا بیوی کا عادی ہوتا ہے۔ یہ دن ایک دوسرے کو سمجھنے کے ہوتے ہیں۔ ہر روز نیا

رخ، نیا انداز میاں بیوی کے تعلقات کا سامنے آتا ہے۔ تمہارا میکا تمہارے ماں باپ کا گھر ہے جگ جگ آؤ لیکن ابھی یہ مناسب نہیں کہ تم اپنے گھر کے بجائے یہاں رہو۔ چند دن ٹھہر کر آ جانا یا تو غالب بھی رہنے کو آتا۔“

”اس کا مطلب ہے والدہ۔“ میں روہانسی ہو گئی۔ ”میں وہاں سے رہنے کو آئی ہوں اور آپ رکھنے کو تیار نہیں ہیں۔“

”نہیں بچے!“ والدہ نے تاویل پیش کی۔ ”یوں نہیں کہتے۔ بیٹیوں کو اپنے گھر میں خوش دیکھ کر ماں باپ خوش ہوتے ہیں۔ ایک ہی شہر میں تو تمہارا گھر ہے جب چاہو آ سکتی ہو۔ سارا دن گزرا سکتی ہو۔ تم پر پابندی بھی کوئی نہیں ہے اور اگر تم میری بات کو اس نقطہ نظر سے سمجھ رہی ہو تو مجھے افسوس ہے لیکن یہ میں تمہیں بتا دوں، غالب تو مرد ہے ہی تم خود بھی ندرہ سوگی۔“ لیکن چونکہ میں گھر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس شرمندگی سے بچنے کے لیے کہ واپس کیونکر جاؤں یہی فیصلہ کیا کہ چلو چار دن کی تو بات ہے رک جاتی ہوں۔

ابو کے مقررہ وقت تک کھانا تیار تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو میں چائے بنانے کو اٹھنے لگی مگر والدہ نے منع کر دیا اور خود چائے بنانے چل دیں۔ ابو حسب معمول نماز پڑھنے کے لیے چل دیئے اور علی بھائی ہمارے پاس بیٹھے رہ گئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے غالب سے گاڑی کی چابی مانگی اور تھوڑی دیر کا کہہ کر چل دیئے۔ یہی تو دل چاہتا تھا کہ وقت رخصت میسر آئے کوئی موقع ملے تو ہم اس کا صبر آزمائیں، جلد سنی گئی، اس وقت تو کچھ اور مانگتے۔ غالب نے بے اختیار ہو کر میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا اور ان کی مدد بھری سرگوشیاں میری سماعت سے نکرانے لگیں۔

”چلو گی نہیں؟“

”ترساؤ، ترپاؤ“ میرے دل سے آواز اٹھی۔ ”دو چار دن کی تو بات ہے۔“ میں نے دل کی آواز دبا کر ہلکے سے کہا۔

”دو چار دن.....“ غالب نے التجا کی۔ ”دو چار دن کچھ نہیں ہوتے..... یہ بہت زیادہ ہیں۔ تم نے مل تو لیا اب چلو۔“

”پلیز“ میں نے احتجاج کیا۔ ”شاید والدہ آرہی ہیں؟“ والدہ کے چائے لانے تک ابو بھی نماز سے فارغ ہو کر آ گئے۔ والدہ تو غالباً برتن بھی دھو آئی تھیں۔



”والدہ میرے آنے کا کیا فائدہ؟“ میں نے شرمندگی سے کہا۔ ”آکر آپ کو مصروف کر دیا۔“  
 ”ارے نہیں بگلی۔“ والدہ نے خوش دلی سے کہا۔ ”یہ تو اب میرا روز کا معمول ہے۔ ہاں، تم  
 رہو گی کچھ دن۔“ انہوں نے شاید داماد کے سامنے میری لاج رکھنے کو پوچھا۔

”جی والدہ!“ میں نے خوشی سے بتایا۔ ”پورے چار دن۔“

”غالب سے پوچھا ہے بچے؟“ انہوں نے استفسار کیا۔

”جی والدہ! خود چھوڑنے ہی تو آئے ہیں مجھے۔ کیوں غالب؟“ میں نے سوال کھڑا کر دیا۔

”جی، جی ہاں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”ایک دم ہی بوکھلا گئے۔ تبھی علی بھائی پان لے کر آ گئے، ہم اس  
 کے بعد بھی گھنٹا بڑھ گھنٹا بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ اب اپنے معمول کے مطابق سو گئے۔ ان کی  
 زندگی اصول اور وقت کی پابندی کا بہترین نمونہ تھی۔“

والدہ نماز پڑھنے لگیں تو میں نے غالب کو سامان نکالنے کو کہا۔ ان کی فریادی نظروں نے مجھے  
 پھر ڈمگادیا لیکن ہائے ری ثابت قدمی۔ بیک لے کر علی بھائی اوپر چلے گئے تو میں اور غالب لان  
 میں نکل آئے۔ اندھیرا ملنے ہی غالب نے مجھے اپنے مضبوط حصار میں جکڑ لیا۔ ”ماہایہ ٹھیک نہیں،  
 میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گا؟ کروں گا کیا؟..... سوؤں گا کیسے؟“

”اچھا تو آپ نے اپنی عمر عزیز کے چھبیس سال جاگ کر گزارے ہیں۔ اب کیوں نہیں نیند  
 آئے گی؟“ میں نے چھیڑا۔

”تم بچی تو نہیں ہو۔“ غالب نے غالب آنا شروع کر دیا اور میں جواب بھی نہ دے سکی۔ ہم  
 نہ جانے اور کتنی دیر اسی طرح ہوش و خرد سے بیگانہ باتیں کرتے رہے کہ علی بھائی کے دھپ دھپ  
 سیڑھیاں اترنے کی آواز پر چونک گئے۔ میں نے غالب کی ہانہوں کے حلقے سے نکلنے ہوئے لان  
 کی طرف قدم بڑھائے۔ غالب نے میری تقلید کی۔ گیٹ کے نزدیک پہنچ کر غالب رکے۔ علی  
 بھائی باہر آ گئے۔ غالب ہمیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔ میرے سینے سے جیسے کچھ کم ہو گیا۔

تھوڑی دیر لان میں ہی گھومتی رہی۔ رات بھیگ رہی تھی اور میں جل رہی تھی اپنی ہی لگائی  
 ہوئی آگ میں۔

یہ عورت کا المیہ ہے کہ اپنی اداؤں کے جال پھینک کر مرد کو بھاتی ہے، چکا رتی ہے، اپنے  
 پاس بلاتی ہے، اس کو اپنا عادی بنانے کی کوشش میں خود اس کی عادی ہو جاتی ہے۔ نشے کی طرح۔۔۔

اسے ترسا کر خود خوش ہوتی ہے، لیکن دراصل اسے ترسانا خود کو ترپانا ہوتا ہے۔ مرد تو سوطرح سے  
 بہل جاتا ہے بچہ جو ہوا، مگر خود کو نہیں بہلا پاتی ہے، اپنی دانست میں وہ مرد کو خود سے محروم کرتی ہے،  
 مگر ہوتا یوں ہے کہ اس کا اپنا وجود خود خالی ہو جاتا ہے

کمرے میں آکر بھی میں بے کل سی رہی۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ دماغ کی مان کر کرک  
 تو گئی تھی اب دل دجان بس میں نہیں تھے۔ کاش میں غالب کا مان رکھ لیتی۔ کاش یوں ہوتا۔  
 سوچوں کا دائرہ بہت وسیع تر ہو جاتا..... اور رات کس قدر طویل ہو گئی تھی۔ صبح ٹی دی لاؤنج میں ابو  
 صبح کی نشریات دیکھ رہے تھے۔ جب میں اٹھ کر گئی تو والدہ میرے لیے چائے لے آئیں۔ میری  
 سوچی ہوئی لال آنکھیں میرے رت جگے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ کیا میری چار راتیں یوں ہی گزریں  
 گی؟ والدہ چپ چاپ بیٹھی تھیں شاید سب کچھ بھانپ گئی تھیں۔ جب میں ناشتا کرنے کو اٹھی تو  
 تھوڑی دیر بعد وہ بھی باورچی خانے میں آ گئیں۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ وہ متفکری تھی۔

”جی والدہ!“ میں نے انڈا بھینٹتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

”سوئیں نہیں رات بھر۔“ وہ تشویش سے بولیں۔ ”کوئی کھٹ پٹ تو نہیں ہو گئی غالب سے؟“

ماں! ماں! تو کیا چیز ہے؟ بیٹیوں کے کتنے اندر تک جھانک لیتی ہے۔ تیرے لیے تیری  
 ساری اولاد شاید ایسی ہوتی ہے، شفاف، ششے کی طرح، آر پار سے نظر آنے والی یا تیری ہی آنکھوں  
 میں اجسام کے آر پار دیکھنے کی صلاحیت ہے، تجھ سے اولاد کا کوئی بھید چھپا نہیں خواہ وہ جوان  
 ہو جائے، شادی شدہ ہو جائے، وہ تجھے بتائے نہ بتائے بھید کیونکر جان لیتی ہے؟

”نہیں والدہ، ایسی کوئی بات نہیں، میں خوشی سے رہنے کو آئی ہوں۔“ میں نے اپنے بازو  
 والدہ کے کندھوں کے گرد حائل کر دیئے۔

”تو پھر خوش ہو کر رہو۔“ والدہ مسکرائیں۔ ”اپنی ضد تو پوری کر لی مگر سوئیں سکی ہو رات بھر۔“

”بس والدہ!“ مجھے کچھ جواب نہ سوجھا اور خاموشی سے ناشتہ بنانے لگی۔ والدہ نے دوسرا چولہا  
 جلا کر میرے لیے ایک کپ دودھ گرم کر دیا۔ میں ناشتہ لے کر لاؤنج میں آ گئی۔ ابو کے ساتھ ہلکے  
 ہلکے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ علی بھائی آفس جا چکے تھے۔ وہی گھر تھا، وہی روٹین لیکن اس  
 روز مجھے اپنا آپ اجنبی لگ رہا تھا۔ وہی جگہ ہے جہاں سارا دن مصروفیت کی وجہ سے دن گزرنے کا

علم بھی نہیں ہوتا تھا، آج وہیں پر میں صبح ناشتے کے وقت ہی سوچ رہی تھی کہ دن کیونکر گزرے گا۔

ابو اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے تو میں نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے علی بھائی کے کمرے کا رخ کیا۔ ان کے کمرے کی صفائی کی، جھاڑ پونچھ کی، چیزیں ترتیب سے رکھیں۔ دھونے والے کپڑے اکٹھے کر کے نیچے لے آئی۔ والدہ کچن میں مصروف تھیں۔ میں نے غسل خانے میں مشین چلا کر تھوڑے سے کپڑے دھو ڈالے۔ نہا کر کپڑے تبدیل کیے اور والدہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ابھی صرف دس بجے تھے۔ اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ والدہ کے لیے چائے بنانے کو ابھی تو فون کی گھنٹی کی آواز آئی۔ چائے لے کر آئی، والدہ سے بڑی امید سے پوچھا۔ ”کس کا فون تھا؟“

”راگ نمبر تھا۔“ انہوں نے چائے تھام کر کہا۔ پھر خاموشی سے بیٹھ کر چائے پی۔

”ماہا! تمہیں تو پتا ہے کہ تمہارے ابو کو تمہارے ہاتھ کی بریانی کس قدر پسند ہے۔“

”کیوں نہیں والدہ، میں ابھی بتا لیتی ہوں۔“ ان کی بات کاٹ کر میں نے خوشی سے کہا۔ چائے ختم کر کے میں نے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹا اور کچن میں آ گئی۔ بریانی کی ابتدائی تیاری کی، چاول والدہ کو صاف کرنے کو لے آئی۔ پھر پوینے کی چٹنی اور دی کا رائتا بنایا۔ ابو بریانی کے ساتھ صرف یہی چیزیں پسند کرتے تھے۔ وہ بہت سادہ کھانا کھانے کے عادی تھے۔ بریانی بنا کر نکلی تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ والدہ نماز کی تیاری کرنے لگیں۔ ڈیڑھ بجے گھنٹی کی آواز آئی، انداز تو علی بھائی کا تھا۔ ابو ابھی کمرے سے نکلے تھے، گیٹ کھولنے چلے گئے اور میں میز پر برتن لگانے لگی۔ یکدم آوازیں لاؤنچ تک آئیں تو میرا دل دھک دھک کے بجائے ”دھڑ دھڑ“ کرنے لگا۔ یہ آواز یہ خوشبو تو میں ہزاروں میں پہچان سکتی ہوں۔ فوراً جاتی مگر ابو کی وجہ سے جھج گئی، سیدھی باورچی خانے میں گئی، دو گلاسوں میں مشروب ڈالا اور لے کر لاؤنچ میں آ گئی۔ اس وقت میں سادہ سے حلیمے میں تھی۔ اس پر ابھی کھانا پکا کر ہٹی تھی۔ کچھ وہ حدت تھی کچھ دل میں در آنے والے جذبوں کی تپش کہ میرا رنگ لال ہو رہا تھا۔ غالب کو سلام کیا، علی بھائی بھی تھے۔ فوراً باورچی خانے میں لوٹ آئی۔ والدہ نماز پڑھ کر غالب کو مل کر آئیں تو بیک کی ہوئی مچھلی اودن سے نکالی اور اسے بھی دوسری اشیاء کے ساتھ ٹرائی میں رکھ دیا۔

”یہ آپ نے کب بنائی والدہ؟“ میں بہت حیران تھی۔

”غالب کا فون آنے کے بعد۔“ انہوں نے بظاہر بے پروائی سے کہا لیکن میں سمجھ رہی تھی کہ

وہ اندرونی طور پر میری حیرت سے محظوظ ہو رہی ہوں گی۔ تب میں سمجھ گئی تھی کہ ہونہ ہو وہ راگ نمبر غالب کا تھا، تاہم میں اس وقت اتنی خوش تھی کہ اس بات کو محسوس بھی نہ کر سکی۔

بریانی کی غالب نے اس قدر تعریف کی کہ بیان سے باہر ہے۔ ابو تو خود بھی میرے ہاتھ کی بریانی کے شوقین تھے۔ غالب کی صحبت ملی تو دونوں نے پیٹ بھر کر کھائی اور دل کھول کر تعریف کی۔ کھانا ختم ہوا تو ابو اور والدہ حسب معمول قیلولہ کرنے چلے گئے۔ علی بھائی تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ گئے تو میں برتن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ غالب پہلے سے بیڈ پر براجمان تھے۔ دونوں بانہیں وا کیے ہوئے۔ ہونٹوں پر دہلی سی مسکراہٹ اور بند آنکھوں سے سونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے۔ میرے دماغ نے ابھی اس ڈرامے کو جاری رکھنے کو کہا مگر دل و جان نے بغاوت کر دی۔ کافی ہے، ”بس کافی ہے، اتنا امتحان ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ آنچ دی تو کچھ نہ پاؤ گی خود ہی جھلس جاؤ گی!“

کمرے میں گرمی کے موسم میں بھی سکون محسوس ہوا پھر یوں ہوا کہ لب کچھ کہہ نہ سکے الفاظ پابند ہو گئے۔ شکایتوں کے دفتر کھل گئے مگر آواز کوئی نہ تھی، صدا کوئی نہ تھی۔ دھڑکنیں دھڑکنوں کو پیغام دے رہی تھیں، دل دل سے شکوہ کناں تھا۔ خاموشی تھی مگر اداس آنکھیں بول رہی تھیں۔

”غالب، غالب، غالب“ میں نے اپنا سر غالب کے سینے پر رکھ دیا۔ ”کیوں میرے حواس پر غالب ہو رہے ہیں آپ۔“ مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں بول رہی ہوں، کیا پیار آدمی کو گویائی بھی عطا کر دیتا ہے، کیا پیار پا کر آدمی پیار کے اظہار کا طریقہ بھی پالیتا ہے؟ پھر میں نے سرکش طوفانوں کو گویا تھام لیا۔ ”آپ سو جائیں تھوڑی دیر!“

”پاس بیٹھو تو میں مرنے کو بھی.....“ غالب کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر میں نے اس فقرے کو گویا روک دیا باندھ دیا۔

”ایسی باتیں نہ کریں۔“ میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ میری آنکھیں اٹکلار ہو گئیں۔ ”آپ اب اس طرح کی بات نہ کریں۔ خدا کرے مجھے، میرے جنازے کو آپ کے کندھے نصیب ہوں۔“ اس بات پر غالب نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

”خبردار ماہا! اب جو ایسی بات کی تو۔ میری جان! میری زندگی! میری روح! میرے لیے تمہارے پاس یہ بد دعا ہی رہ گئی ہے۔ خدا را! مجھے ایسے لمحوں کا تصور بھی نہ کراؤ۔“ اور میں بے خود ہو گئی، غالب کے سینے پر سر رکھ کر سکون آیا تو نیند بھی آ گئی۔ گھٹنا بھر آرام کر کے غالب اٹھے تو میں

بھی ہاتھ منہ دھو کر چائے بنانے کو نکلی۔ کاش آج غالب مجھے جانے کو کہیں۔ خود چلی جاؤں، خود کہہ دوں لیکن میری انا..... پگلی پیار میں انا نہیں ہوتی۔ ہاں وہ کہے تو چلی جاؤں گی پر وہ کہے ایک بار..... چائے پی کر غالب نے اجازت چاہی، میرا دل یہی چاہ رہا تھا کہ میرا مان بھی رہ جائے، بھرم بھی نہ ٹوٹے اور دل کی بات بھی مانی جائے۔

”سنو ماہا! اگر تم برا نہ مناؤ تو چلی چلو، امی کی طبیعت کچھ ناساز تھی آج۔“ غالب نے آہستگی سے کہا۔

”آپ نے پہلے نہیں بتایا۔“ میں اس شفیق سی ہستی کی تکلیف کا سن کر بے چین ہو گئی۔ ”مجھے آپ آتے ہی بتاتے تو میں چلی چلتی۔“

”تو بیٹا دس منٹ کی تو بات ہے۔“ ابو نے مداخلت کی۔ ”تیار کر دو اور چلی جاؤ۔“

”اصل میں امی جان نے کہا تھا کہ بہو پہلی دفعہ میسکے کو گئی ہے اور میری تکلیف کا سن کر فوراً دوڑی چلی آئے گی اس لیے میں نے بات نہیں بتائی۔ ویسے بھی آنے سے پہلے میں ان کو دوا دے کر آیا تھا۔“ غالب نے وضاحت کی تو میں مطمئن ہو گئی اور اپنا بیک لینے چلی گئی۔ ابو، والدہ اور علی بھائی سے مل کر میں غالب کے ساتھ چلی۔

”بہن جی کو میری طرف سے پوچھنا۔“ والدہ نے کہا تو لیکن ان کے چہرے کی مسکراہٹ ان کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ گاڑی چلی تو غالب کا بایاں ہاتھ میرے ہاتھ پر آن لگا۔

”ناراض نہ ہونا میری جان! اصل میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے آپ کی والدہ کو ساتھ ملانا پڑا۔“ غالب نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”در اصل اور کوئی بہانہ نہیں تھا۔“ غالب مسکرائے۔ ”امی جان بالکل ٹھیک ہیں، میں ہی ٹھیک نہ تھا اس لیے یہ سارا چکر چلایا۔“ میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے مصنوعی غصے کا اظہار کیا تو غالب نے آکس کریم پارلر کے سامنے گاڑی روک لی۔

”اب آپ جناب کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو گھر جائیں گے ورنہ امی جان سے آپ کی شکایت پر جوتے بھی پڑ سکتے ہیں۔“ غالب نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ میں بدستور منہ پھلائے ہوئے گاڑی سے اترتی، آکس کریم بھی بڑے ”غصے“ سے کھائی۔ غالب سے بات تک نہ کی۔ مبادا میرا اپنا بھید

نہ کھل جائے۔“ اب جانے بھی دونوں یار۔ سچ میں رات بھر سو نہیں سکا۔“ غالب نے وضاحت کی۔ ”تم نے مجھے اپنے وجود کا اس قدر عادی بنالیا ہے کہ میں کروٹیں بدل بدل کر تمہیں ہی یاد کرتا رہا۔“

”چل اب خوش ہو جا، تیری ضد بھی پوری ہو گئی، تیرا مان بھی رہ گیا، اپنے وجود کی کشش کو آزمالیا۔ اب مان جا، مرد کے لیے اتنی آزمائش ہی کافی ہے۔ پورے کا پورا مرد تو نے نامکمل کر دیا۔“

آخرین ہے تجھ پر، تو نے اپنے وجود کو محتاج کر لیا اس کو۔ جیت گئی تو، جیت گئی، جیت گئی۔“ دل نے کہا۔

”غالب‘ میں نے، میں.....“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

”کیا میں نے؟“ غالب نے بے تاب سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ میں جھجک گئی۔

”بولو ناں، پلیز“ غالب کی بے تابی بڑھ گئی۔

”میں نے بھی آپ کو بہت مس کیا!“ میں نے ہمت کر کے کہہ دیا اور سر اتانے نیچے جھکا لیا کہ میرا شرم سے گلزار ہوتا چہرہ غالب نہ دیکھ پائے۔

”تھینک یو! تم نے میری رات بھر کی تھکن دور کر دی۔“ غالب کے لہجے میں دنیا بھر کا پیار تھا۔

دنوں پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ ہر نیا دن ہم پر چاہتوں کے نئے دروا کرتا تھا۔ دن طویل اور راتیں مختصر لگتیں۔ میں نے آہستہ آہستہ گھر کے کام کاج میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں امی جان، تیمور اور نگہت کے ساتھ اس قدر ہنسی مذاق ہو گیا تھا کہ مجھے محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ میں اس گھر میں بہو ہوں یا بیٹی۔ ہم اکثر مل کر غالب کے خلاف محاذ بنالیتے اور خوب نوک جھونک ہوتی۔ غالب کئی دفعہ سنجیدہ ہو جاتے اور تنہائی ملتے ہی شکوہ کر ڈالتے تو میں ان سے اتنے ناز سے معذرت کرتی کہ غالب مجھ پر نار ہو ہو جاتے۔

تیمور سے اتنی آزادی سے فرمائشیں ہوتیں کہ کئی دفعہ وہ میرے اور نگہت کے آگے ہاتھ باندھ کر معافی مانگتا اور پھر ”بھابی کے ہاتھ کی چائے“ پر سودا طے ہو جاتا۔ غالب اس روز دال چاول کی فرمائش کر گئے تھے۔ نگہت اور میں ناشتے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر دیگر کام کاج میں مصروف رہے پھر چائے پی کر کچن میں آگئے اور کھانا بنانے لگے۔ دال کو بگھار دیا تو میرا گویا سر گھوم گیا۔ طبیعت متلانے لگی۔ فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر پیا تو اور حالت خراب۔ ٹی وی لاؤنج میں آگئی، تیمور بیٹھا

ریڈ یو کھول کر مرمت کر رہا تھا۔ نگہت دبیں آگئی۔

”بھائی، چاٹ تو لا دو۔“ نگہت نے گویا میرے دل کی بات کہہ دی۔

”کون بولا ہے، بھابی؟“ تیمور کی آواز میں حیرت تھی۔

”میں نہیں، نگہت نے کہا ہے لیکن لا دو ناں! بھائی نہیں ہو۔“ میں نے نگہت کی سفارش کی۔

”میں سمجھا آپ نے کہا ہے۔“ تیمور نے مسرت سے کہا۔

”چلو یہی سمجھ لو۔“ میں نے بے خیالی سے کہہ دیا اور اس نے ”ہرا“ کا نعرہ لگایا تو میں شرم سے

لال ہو گئی۔ ابھی تو کوئی بات ہی نہ تھی اور وہ چاٹ کی فرمائش پر خوش ہو گیا۔

”گدھے! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں بیوقوفوں کی طرح خوش ہو رہے ہو؟“ میں نے مصنوعی

غصے سے کہا۔

”آج چاٹ، کل چٹنی، پرسوں اچار، میری بھابی جیسے ہزاروں سال۔“ اس نے اچھل اچھل

کر گانا شروع کر دیا اور میں ہاتھ کا پٹکھا پکڑ کر اس کے پیچھے مارنے کو لپکی۔

جانے نگہت نے کس انداز میں ای تک میری طبیعت کی بات پہنچائی تھی، میں چھوٹے سے

لان میں صبح کی نماز پڑھ کر بیٹھی ہی تھی کہ وہ آگئیں اور میں جو فرنگ سے لیموں نکال کر لائی تھی کہ

اکیلے میں چوسوں گی تو ذرا کی ذرا طبیعت سنبھل جائے گی تب ہی غالب کا ناشتا بنا سکوں گی۔ فوراً

مٹھی بند کر لی، جھجکی آگئی۔

”کیا بات ہے بیٹا طبیعت کچھ خراب ہے؟“ انہوں نے اتنی شفقت بھری آواز میں کہا کہ

میں شپٹا گئی۔

”نہیں ای! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”ڈاکٹر کی طرف چلی جاؤ، اپنی صحت کی طرف سے بے پروائی نہیں کرتے اور کھٹی چیزیں نہ

کھایا کرو معدے میں تیزابیت پیدا ہوتی ہے جو آگے چل کر تکلیف دیتی ہے۔“

”وہ امی!“ میں ہچکچا کر بولی۔ ”کچھ دنوں سے میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔ صبح صبح دل

خراب ہوتا ہے اور تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے، ڈاکٹر کے

پاس جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“

بات چیت ابھی مزید ہوتی لیکن مظہر کو ناشتا بنا کر دینا تھا کیونکہ آج کل وہ جلد اسکول جاتا

تھا۔ امتحان قریب تھے اور اس کی اضافی کلاسیں ہو رہی تھیں۔ مظہر جاگ کر کچن میں یہ تسلی کرنے

آیا تھا کہ اس کا ناشتا بن رہا ہے یا نہیں۔ ”بھابی! آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں اور خاص طور

پر جب صبح صبح ان میں سے پانی ٹپک رہا ہوتا ہے تو بالکل بارش کا سین لگتا ہے۔“ میں اس کی اس

معصوم ادا پر شرمائی اور ہلکی سی چپٹ لگا کر کہا۔

”چلو جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آؤ اور ہاں تمہارے لیے تو میں ایسی لڑکی لاؤں گی جس کے

بال اتنے لمبے ہوں، باقی چاہے اندھی ہو، گونگی یا بھری، ٹھیک ہے ناں؟“

”ابھی تو بہت دور کی بات ہے بھابی۔“ وہ اسی معصومیت سے کہہ کر بس پڑا اور بے اختیار

میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا تبھی غالب آگئے۔

مرد آخر مرد ہے، ذرا سا شبہ بھی ہو تو رقابت کا جذبہ عود کر آتا ہے، اپنی ملکیت کو کسی اور کی نظر

سے دیکھے تو حسد محسوس کرتا ہے۔ اپنی چاہت کی پھوار کسی دوسرے پر پڑنا دیکھے تو سوچ میں پڑ جاتا

ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں، ویسا تو نہیں، یہ ہنسی کے گلاب، یہ پیار کے پھول، کسی اور نے تو کھلتے ہوئے

نہیں دیکھے، کسی اور نے تو نہیں سونگھ لیے۔

”بڑی ہنسی آرہی ہے لڑکی! کیا بات ہے؟“ غالب بالکل میرے ساتھ آن کھڑے ہوئے۔

”کیا یاد کر کے ہنس رہی ہو؟“ وہ میرے اتنا قریب آگئے کہ مجھے دھکیل کر ان کو پرے کرنا پڑا۔

”خدارا! غالب کوئی آجائے گا تو؟“ میری نامکمل بات غالب نے اچک لی۔

”تو کہہ گا یہ غالب اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ اتنا فری کیوں ہے۔“

”پلیز غالب!“ میں نے ہاتھ باندھ کر ان کو پرے کیا۔ تب غالب نے ایک شرط منوا کر ہی

وہاں سے ہٹنے کی بات مانی اور میں ناشتا بناتی ہوئی اس شخص کی چاہتیں وصول کر رہی تھی۔ تبھی کچن کا

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور غالب یوں بن گئے جیسے بڑے شریف ہوں۔

”آؤ تیمور! باہر کیوں کھڑے ہو اور یہ دروازہ کیوں کھٹکھٹا رہے ہو؟“

”وہ دراصل“ وہ سنجیدہ سامنے بنا کر بولا۔ ”میں سمجھا شاید آپ کے بیڈروم میں آگیا ہوں۔“

”زیادہ بد معاشی نہیں چلے گی۔“ غالب مصنوعی غصے سے بولے۔ ”میں تو انڈیا نا سیکھ رہا تھا۔“

”لیکن بھابی تو پراٹھا پکا رہی ہیں۔“ میری ہنسی نکل گئی۔ غالب کی بدحواسی دیکھنے کے قابل تھی۔ مظہر بھی اتنی دیر میں تیار ہو کر آ گیا۔

”بھابی میں تیار ہو کر بھی آ گیا ہوا اور ابھی تک ناشتا نہیں بنا؟“

”یار ابھی صبح تو ہونے دے فلسفی۔“ تیمور نے تمسخر سے کہا۔ ”ابھی تو رات باقی ہے، ادھوری بات باقی ہے۔“ اس کا انداز نشے میں جھومتے ہوئے گانے والوں کا سا تھا۔ میں نے غصے سے کفگیر اٹھا کر اسے دکھایا تو یکدم چپ ہو گیا۔ نگہت بھی تیار ہو کر آ گئی اور ناشتے کی تیاری میں میری مدد کرنے لگی۔ غالب ناشتا کرتے ہوئے بھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور جب میری نظر پڑتی تو آنکھ ماردیتے۔ میں امی کی وجہ سے بہت خفیف ہو رہی تھی کہ اگر ان کا دھیان پڑ جائے تو۔

”امی، آپ اتنے ٹوٹے ٹوٹے بتاتی ہیں، ذرا یہ تو بتائیں کہ میری ایک آنکھ صبح سے پھڑک رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہوا سناپ پر لڑکیوں سے جوتے کھانے پڑ جائیں۔ اس کا علاج کیا کروں؟“ تیمور نے ایک ہاتھ سے ایک آنکھ ملتے ہوئے غالب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

”تیمور! بچے صبح سویرے اٹھ کر کوئی اللہ رسول کا نام لو تو صبح بھی اچھی گزرے اور یہ فضول خیالات اور عادات انسان پر حاوی نہیں ہوتے۔“ امی جی اس کا مذاق نہ سمجھ کر بولیں۔ غالب زیر لب مسکرا دیئے اور میری حالت تو یہ تھی کہ تیمور کو مارنے کو جی چاہ رہا تھا۔ نگہت بھی صورتحال کو کچھ سمجھ گئی تھی ہنس پڑی۔ مظہر اسی معصومیت سے بولا۔

”بھابی چائے بنا دیں ورنہ میں لیٹ ہو جاؤں گا اور آنکھ پھڑکنا شروع ہو جائے گی۔“ اس کی اس بات پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ گھر میں سب کے مذاق کا نشانہ بھی غالب اور میں ہی عموماً بنتے تھے اور وجہ غالب کی وارفتگی ہوتی تھی کہ ان کی چوریاں سرعام پکڑی جاتی تھیں۔ تیمور کے سامنے وہ ذرا کم مختاط رہتے تھے۔ البتہ امی کے سامنے بہت شرافت کا مظاہرہ کرتے تھے اور مظہر بیچارہ تو اتنا بھولا تھا کہ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا۔ میں غالب کی ان وارفتگیوں سے محظوظ بھی ہوتی تھی۔ ان کی شرافتیں میرے وجود میں عجب سی گدگدی کرتی تھیں اور پھر جب تیمور اور نگہت چھوڑ چھاڑ کرتے تو ہم غالب کی بدحواسیاں دیکھا کرتے تھے۔ مجھے اپنا آپ بہت اہم لگتا تھا، سب کی توجہ کا مرکز۔

سفید سفید برف پوش وادیوں میں، میں تنہا چلی جا رہی تھی ننگے پاؤں۔ ایک ننھا سا خرگوش میرے آگے آگے بھاگ رہا تھا اور میں اس کے تعاقب میں تھی، یکدم وہ خرگوش بلند چوٹی سے چھلانگ لگا گیا مجھے یوں خسوس ہوا گویا میرے سینے میں سے کسی نے ہاتھ ڈال کر دل کھینچ لیا ہو۔ میں چیخنے لگی، ”غالب غالب.....“ لیکن مڑ کر دیکھا تو غالب بھی نہ تھے۔ میں بھاگ رہی تھی۔ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی، یکدم آنکھ کھل گئی۔

لیپ آن کیا تو غالب نظر نہ آئے۔ اٹھ کر غسل خانے میں دیکھا وہ بھی خالی تھا۔ میں گھبرا کر کمرے سے نکلی تو امی ٹی وی لاؤنچ میں کھڑی تھیں اور غالب کچن میں سے نکل رہے تھے۔

”کیا بات ہے بیٹی پریشان کیوں ہو؟“ امی نے مجھے گھبرا کر اپنے ساتھ لگا لیا ”کیا ہو گیا؟“ ”وہ غالب.....!“ میرے منہ سے اس کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔

”پگلی میں تو پانی پینے کچن میں آیا تھا۔“ غالب بولے اور امی جو برتنوں کا کھٹکاسن کر آئی تھیں وہ مجھے پکڑ کر بٹھانے لگیں۔ میں نے غالب کو اشارہ کیا اور وہ بالٹی لے آئے اور میں نے سارا دن کا کھایا پیالہ الٹ دیا۔ امی میری حالت دیکھ کر بہت گھبرا گئیں۔ غالب نے ان کو دوسرے صوفے پر بٹھایا اور ہاتھ روم سے تولیا بھگو کر لائے، میرا منہ وغیرہ صاف کیا اور جیسے یہ بھول گئے کہ امی وہیں پر ہیں۔ صوفے پر بیٹھ کر میرا سراپنی گود میں رکھ لیا اور ہلکے ہلکے دبائے لگے۔ امی آ کر میرے پیروں کی طرف بیٹھ گئیں اور ہلکے سے میری ٹانگیں دبائے لگیں۔

”کب سے ہے اس کی یہ حالت؟“ وہ غالب سے پوچھ رہی تھیں۔ میں بالکل غنودگی میں تھی۔ ”امی چار پانچ دن ہو گئے ہیں، اسی طرح ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔“ غالب کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ”میں نے تو کہا کہ ڈاکٹر کے ہاں لے چلوں لیکن کہنے لگی کوئی ضرورت نہیں۔“ امی میری کمر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں پھر مجھے غالباً نیند آ گئی۔

عورت اے عورت! تو نے کتنی کائناتیں تسخیر کر لیں۔ سب سے بڑھ کر مرد کے دل کی کائنات۔ وہ ازل سے تیرا دیوانہ رہا ہے اور تجھے کتنی بھی تکلیفیں دے خود سے لیکن تجھے بیماری اور تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر تھی۔ میں نے انہیں اپنا رات کا خواب سنایا تو وہ بہت ہنسے۔



”افوہ تو وہ ساری پریشانی اس خرگوش کے لیے تھی۔“ میں ان کے سینے پر سر رکھے باتیں کرتی رہی۔ جب میری نظر گھڑی پر پڑی تو حیران رہ گئی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ ٹھیک ہے کہ اس روز جمعہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اتنی دیر تک سوتے رہیں۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا۔ بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے کی طرح باندھا اور کمرے سے نکلی تو سارا گھر پریشان حال بیٹھا ہوا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری سوالیہ نظریں دیکھ کر نگہت رو پڑی۔ ”بھابی! آپ بیمار نہ ہوں۔“

”کیا حال ہے بیٹی؟“ امی جان نے پوچھا تو میں شرمندہ ہو گئی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں امی جان!“ میں نے انہیں تسلی دی۔ تیمور بھی بہت پریشان لگ رہا تھا۔ چپ بیٹھا رہا، بولا کچھ نہیں۔

”تم کیوں مجنوں بنے بیٹھے ہو؟ صبح سے منہ بھی نہیں دھویا۔“ میں نے ماحول کو خوشگوار کرنے کو کہا۔

”ناشتا جو نہیں بنا بھابی!“ مظہر اپنے مخصوص انداز میں بولا جو بھی اٹھ کر آیا امی جان کو پریشان دیکھ کر کہیں بیٹھ گیا۔ اور میں ان کی محبتوں کو دیکھ کر رو ہی تو پڑی۔

”پلیز نگہت، تیمور یہ کیا بچوں والی حرکت ہے؟ اگر یوں بیٹھنا تھا تو مجھے بھی جگالیتے میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی.....“ میرے حلق میں پھندے پڑنے لگے۔ خود پر ضبط کر کے اٹھی۔

”میں ناشتا بناتی ہوں۔“

”ارے نہیں بھابی میں بناتی ہوں۔“ نگہت نے کہا تو امی جان نے اسے بھی منع کر دیا اور کہنے لگیں کہ آج وہ خود ہم سب کو ناشتا بنا کر دیں گی اور تیمور ان کی مدد کے لیے چل پڑا۔ نگہت مجھ سے رات کو طبیعت کی خرابی کی بابت پوچھنے لگی۔ میں نے اسے بھی اپنا خواب سنایا۔ ”بھابی خدا کرے میرا بھتیجا ایسا ہی ہوسفید اور خوبصورت، نرم اس خرگوش کی طرح۔“ اور میں خواب کی اس تعبیر پر ہنس پڑی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر امی جان نے کہا کہ جمعہ ہے جا کر ابو کی طرف سے ہواؤ..... سو میں اور غالب گھر سے روانہ ہوئے۔ نگہت سے بھی کافی اصرار کیا لیکن اس نے گھر کے کام کاج کا عذر پیش کیا۔ راستے میں ایک کلینک پر گاڑی روک کر میرا چیک اپ کروایا اور جب اس لیڈی ڈاکٹر نے ہم سب کے شہات کی تصدیق کر دی۔ دوا میں صرف خوراک بہتر کرنے کو کہا تو غالب وہیں جیکنگ

روم میں آگئے اور اتنے بے اختیار ہوئے کہ مجھے اپنی مسرت کا اظہار کرنا اور غالب کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ غالب کے جذباتوں پر میں آج تک بند نہیں باندھ سکی تھی اور آج تو ان کا شوق دیدنی تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی مسجد میں جا کر اعلان کروادیں۔

باپ بننے کا پہلا پہلا احساس مردانگی کی شان ہے اور ماں بننے کی خبر نسوانیت کی تکمیل۔ جب دونوں پہلی بار اس قابل فخر خبر کو سنتے ہیں تو ان جذبات کا اظہار یوں ہی کرتے ہوں گے، اک دو بے میں جو ہو کر ایک دوسرے کو اپنے وجود اپنی روح میں اترتا ہوا محسوس کر کے۔

غالب ڈاکٹر کی آواز کے ساتھ چونک گئے اور میں بیڈ سے اتر کر اپنا حلیہ درست کرتی ہوئی باہر آئی۔ ڈاکٹر نے مجھے اپنی خوراک کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی اور غالب کو مکمل احتیاط کے لیے کہا۔ والدہ کو بھی جا کر میں نے موقع دیکھ کر تھوڑی سی تفصیل بتائی اور ڈاکٹر کی ہدایات بھی بتائیں۔ شام کو واپسی ہونے لگی تو والدہ نے غالب سے درخواست کی کہ مجھے کچھ دن کو رہنے دیں۔ بڑی بہنوں کا بھی یہاں نہ کیا اور میں والدہ کا مقصد سمجھ گئی لیکن میرا اپنا دل بھی وہاں رہنے کو نہیں تھا۔

”والدہ کل پرسوں پھر آ جاؤں گی۔“ میں نے تاویل پیش کی۔ ”اپنے کپڑے وغیرہ بھی لے آؤں گی اور امی جان سے بھی پوچھ آؤں گی۔“

”ان سے میں نے بات کر لی ہے۔“ والدہ نے جواب دیا ”اور تمہارا سامان لے کر وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“ تبھی ٹیکسی کے ہارن کی آواز آئی اور امی جان، تیمور، نگہت، مظہر سب لوگ میرے کپڑوں کا بیگ لیے ہوئے آگئے۔

”بھابی آپ ہمارے ساتھ واپس چلیں ناں! یہاں کیوں رہ رہی ہیں۔“ مظہر معصومیت سے گویا غالب کے دل کی بات کر رہا تھا۔ ”گھر سے تو آپ کا کوئی پروگرام نہ تھا؟“ تیمور اور نگہت نے اس کی تائید کی لیکن دونوں مائیں شاید پروگرام بنا چکی تھیں کہ دو چاہنے والوں کو آج لازمی جدا کرنا ہے۔ اس لیے والدہ مجھے بھیجنے پر آمادہ نہ تھیں اور امی جان بھی اس حق میں تھیں کہ چلیں کچھ دن اگر ساری بہنیں مل کر رہنا چاہتی ہیں تو رہ لیں۔ میں بہت بے بس تھی، نہ جانے کی راہ سوچ رہی تھی نہ بزرگ اس پر آمادہ تھے۔

”امی جان یہ اتنی بیمار ہے، میں کچھ دن اس کے ساتھ ہی رک جاتا ہوں اگر کوئی پرالیم وغیرہ ہو تو۔“ غالب نے ایک نئی چال چلی لیکن مائیں اس حملے کے لیے تیار تھیں۔

”بیٹا تم جگ جگ رہو لیکن اپنے دفتر کا حساب کتاب دیکھ لینا۔ باقی اگر ڈاکٹر وغیرہ کی ضرورت ہو تو وہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے علی جو ہے اور پھر اپنی بہن اس کی ڈاکٹر ہے کل آجائے گی۔“ میری والدہ نے کہا تو امی جان بھی بولیں۔

”بیٹا تم دن رات میں جب چاہو آجایا کرنا لیکن ان دنوں تمہارا گھر پر ہونا ضروری ہے، نگہت کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں اور میں نے بہن جی کو بتایا ہے کہ شاید وہ جلد مگنی وغیرہ پر اصرار کریں تو ان دنوں کام بہت ہوگا بچے۔“ اس پر غالب بے بس ہو گئے اور میرا ایک اٹھا کر کمرے کی طرف چل پڑے۔ میں غالب کا اشارہ دیکھ چکی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہاں سے میرا ایک دم اٹھ کر جانا بے ٹکا سا لگتا۔ غالب ذرا دیر تک تو انتظار کرتے رہے لیکن کوئی ردِ عمل نہ دیکھ کر غصے سے لال ہوتے ہوئے واپس آئے۔ میں نے ہنسی چھپاتے ہوئے سر نیچے کر لیا اور یہی حرکت تیسرا اور نگہت نے کی جبکہ مظہر حسبِ معمول لاعلم ہی رہا۔

رات میں بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی اور سارے بدن پر گویا چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں غالب سے ہمکلام ہوں اور آج غالب کا کیا حال ہوگا۔ میں اپنے اندر تنہائی کا دکھ اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی اور بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر وہاں چلی جاتی۔ والدہ دودھ میں اودھن ڈال کر رکھ گئی تھیں، اس کو دوا کی طرح پی کر ختم کیا۔ ٹی وی لاؤنج میں فون کی کھنٹی کی آواز آئی تو بھاگ کر گئی اور فون اٹھایا، ”ہیلو! کون؟“

”میں ہوں جانم، نیند نہیں آرہی!“

”کیوں مجھ پر کاٹ رہے ہیں؟“ میں نے شرارت سے کہا۔

”نہیں جدائی کاٹ رہی ہے۔“ میں نے فون کا تار دیکھا اور اندازہ کر کے کہا۔

”ایک منٹ۔“ فون کمرے میں لے آئی۔ ”اب بولیں۔“

”کیا بولوں؟“

”یہی کہ فون کیوں کیا ہے؟“

”تمہیں علم نہیں ہے یا میرے منہ سے سننا چاہتی ہو؟“

”کس چیز کا علم؟“ میں نے غالب کی بے تابیوں کو اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

”بس جانو! کسی طرح میرے پاس آ جاؤ یا میں آ رہا ہوں۔ مجھے آج رات نیند نہیں آرہی ہے، آج کی رات تو ملن کی رات تھی، خوشی شیر کرنے کی رات تھی، اتنی بڑی خبر سن کر میرے اندر خوشی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، میرے اندر خون بھی ابل رہا ہے۔“ غالب بول رہے تھے اور میرے وجود میں ٹھنڈک اترنے کے بجائے گرمی اتر رہی تھی۔ ”غالب.....!“

”ہوں۔“

”میں جلدی آ جاؤں گی۔“ ہم رات دیر تک فون پر باتیں کرتے رہے گویا خود کو تسکین پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہفتہ بھر اسی روٹین میں گزرا۔ بہنوں کے آجانے سے دن اتنا مصروف گزرتا کہ وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا لیکن رات ہوتے ہی غالب اتنے غالب آجاتے کہ میں ٹیلیفون چرا کر لاتی اور نمبر ڈائل کرتی۔ غالب کو میں نے منع کر دیا تھا کہ جانے یہاں سے کون اٹھائے ویسے تو ہم ٹیلیفون کرنا چاہتے تو ہمیں منع کوئی بھی نہیں کرتا۔

آٹھویں دن نگہت کا فون آیا۔ یوں بھی روزانہ گھر سے کوئی نہ کوئی فون کرتا تھا لیکن اس روز نگہت نے بتایا کہ امی جان نے مجھے واپس بلایا ہے۔ وجہ اس نے ملاقات پر بتانے کا کہا اور مجھے تیار رہنے کو کہا۔ میں نے والدہ کو بتا کر تیاری شروع کی۔ کھانے پر غالب آگئے۔ وہ ہفتہ بھر نہ آکر گویا اپنی برداشت کا لوہا منوا چکے تھے۔ والدہ نے بہت سی چیزیں پھل، کپڑے، اودھن اور جانے کیا کیا میرے ہمراہ کر دیا اور صدف باجی نے علیحدگی میں بلا کر غالب کو وہ تمام ہدایات منتقل کیں جو اتنے دنوں تک وہ میرے گوش گزار کرتی رہی تھیں۔ خدا حافظ کہہ کر باہر نکلے تو غالب کی وارفتگی انہیں گاڑی چلانے نہیں دے رہی تھی۔ ”غالب پلیز گھر تو پہنچ لیں۔“

”ہاں“ وہ بولے۔ ”وہاں بھی ایک پولیس انسپکٹر موجود ہیں۔ انہوں نے بھی صدف باجی کی طرح ایک طویل لیکچر پچھلے ہفتے دو تین دفعہ گھول کر پلایا ہے۔ میری ذات سے تمہیں اتنا ہی خطرہ ہے تو مجھے زنجیروں میں جکڑ کر کہیں بند کرویں۔“ میں نے ہاتھ غالب کے منہ پر رکھ دیا۔

”خدا نہ کرے غالب! کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”اور کیا تو۔“ وہ بہت غصے میں لگ رہے تھے۔ ”شادی کس لیے کی تھی صرف نکاح کروا دیتے اور جب خطرہ ٹل جاتا تو رخصتی کروا دیتے۔“ میں ان کے غصے پر بھی ہنس رہی تھی اور

غالب میری ہنسی پر بھٹتا رہے تھے۔

گھر میں سب لوگ بہت تپاک سے ملے وہاں مجھے محسوس ہی نہ ہوتا تھا میں اس گھر کی بہو ہوں یا بیٹی۔ غالب نے مظہر کو ساتھ لے کر میرا سامان گاڑی سے نکلوایا۔ نگہت سیب کا جوس لے آئی اور تیمور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”بھابی میں آپ کو لینے آتا لیکن بھائی نہ مانے۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا تھی لیکن بھائی کی باتیں شاید اس سے بھی ضروری تھیں۔ تاہم کچھ مایوس سے لگ رہے ہیں۔“

”تیمور.....!“ میں نے اسے سرزنش کی۔ ”بڑے بھائی ہیں غصے میں بھی ہیں، لگتا ہے آج تم ہی زیرِ عتاب آؤ گے، ذرا بچ کے رہنا، لگتا ہے آج آفس میں کارکنوں اور ماتحتوں سے بہت مغز ماری کر کے آئے ہیں..... ہاں تم بولو کیا ضروری بات کرنا تھی۔“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”بعد میں بتاؤں گا۔“ وہ غالباً امی جان کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چائے پیتے ہوئے امی جان نے نگہت کو شام کے کھانے کی تیاری کرنے کو کہا اور مجھ سے گویا ہوئیں۔ ”بیٹی کافی رشتے ان دنوں آرہے ہیں۔ ایک گھرانے کی بڑی تسلی ہے۔ لڑکا انگلینڈ جا رہا ہے اور وہ لوگ نکاح پر مُصر ہیں تاکہ اگر کاغذات بن جائیں تو نگہت کو وہیں بلا لے۔“ امی جان نے دراز کھول کر ایک الم نکال کر مجھے دی۔ مجھے الم دیکھتے ہوئے اپنی ایک کلاس فیلو کا چہرہ نظر آیا۔ امی نے بتایا کہ وہ لڑکے کی بہن تھی۔ لڑکا ڈاکٹر ہے اور حکومت کی طرف سے اسکالرشپ پر اسپیشل رزیشن کے لیے انگلینڈ جا رہا ہے۔ لڑکے کو تو میں نے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کی بہن ماہِ رنخ اور اس کی امی کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اچھے لوگ تھے۔ امی کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کسی معتبر ذریعے سے اس گھر کے بارے میں معلومات ملی تھیں۔ ”کیا خیال ہے تمہارا؟“

”جو آپ مناسب سمجھیں، اگر نکاح میں کوئی حرج نہیں تو کر دیں۔ آخر گنتی اور نکاح میں فرق ہی کیا ہے؟“ میں نے رائے دی۔

”بیٹی، اللہ مقدر اچھے کرے لیکن نکاح کرنے سے دل ڈرتا ہے۔“ وہ فکر مند لہجے میں بولیں۔ ”بس امی جان یہیں پر آکر اٹک جاتی ہیں۔“ غالب بولے۔ ”ان کو یہ بات کھٹکتی ہے حالانکہ انہوں نے صاف کہا ہے کہ صرف کاغذات بنوانے کے لیے نکاح کا فارم ضروری ہے۔“ تیمور نے بھی غالب کی حمایت کی۔

”ٹھیک ہے امی جان!“ میں نے تائید کی۔ ”اللہ کا نام لے کر ہاں کر دیں۔ ویسے وہ لوگ کب آنا چاہتے ہیں؟“

”ایک ہفتے کے اندر اندر۔“ انہوں نے کہا اور پھر اسی سلسلے میں بات چیت ہوتی رہی۔ وقت بہت کم تھا اور لڑکی والوں کو بہت سی تیاری کرنا ہوتی ہے اسی حوالے سے پروگرام مرتب ہوئے۔ میں کچن میں گئی تو نگہت چاول چننے میں مصروف تھی، میں نے جا کر اسے گدگدی کی۔

”یہ پل میں ہی کیا ماجرا ہو گیا کہ اعجاز کا دل پہ قبضہ ہو گیا۔“ وہ بری طرح شرمائی۔

”بھابی پلیز!“

”جو تصویر دیکھی ہے موصوف کی؟“ میں نے پوچھا۔ پہلے تو جواب نہیں دیا پھر بولی۔ ”موصوف کو دیکھا بھی ہے اور ملی بھی ہوں۔ ایک سہیلی کے بھتیجے کی سالگرہ پر گئی تھی وہاں پر آئے ہوئے تھے۔ اس کے کزن ہیں، واپسی پر گھر ڈراپ کرنے بھی آئے تھے اور بقول ان کے پہلی نظر کا شکار ہو گئے تھے۔“

”اچھا تو یہ اسٹوری ہے۔“ میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ”بڑی پکی ہو آج تک بولی نہیں۔“ ”ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا۔“ اس نے صفائی پیش کی۔ ”اور پھر آپ کی طبیعت ایسی تھی کہ بات نہ کر سکی ورنہ آپ سے چچا سکتی تھی؟“

”یہ تو دھڑکا معاملہ ہے، یہاں کا کیا حال ہے۔“ میں نے پوچھا تو اس نے سر جھکا دیا۔ ”گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ میں نے کہا تو اس کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

غالب کی بے تائیاں عروج پر تھیں۔ بار بار وہ اپنی مسرت کا اظہار کر رہے تھے اس خبر پر کہ ہم دونوں ماں باپ کے عہدے پر فائز ہونے والے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ یہ خوشی ان کے گھر میں خوشیوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگی کیونکہ جب سے غالب کے والد کی وفات ہوئی تھی اس کے بعد سے گھر پر ایک خاموشی سی در آئی تھی اور اب اس گھر میں معصوم قفقاریاں گونجنے والی تھیں لیکن اس اہم ذمے داری کے بوجھ نے مجھے بہت ناتواں کر دیا تھا اور وہ میں کم از کم ایک بار تو میں کمزوری سے ضرور بے ہوش ہو جاتی تھی۔ ذرا سا کام مجھے مضحل کرویتا تھا اور بالکل ہمت نہ ہوتی

تھی کہ طبیعت پر کسی طرح کا بوجھ ڈالوں۔

میں نے غالب کو بتایا کہ مجھے ڈاکٹر نے اور صدف باجی نے بہت احتیاط کرنے کا بتایا تھا۔ خوراک کو بہتر کرنے کی خاص تاکید کی تھی لیکن بھلا ہو طبیعت کا ایک نوالہ ہضم نہ ہوتا تھا۔ فوراً قے ہو جاتی اور تو اور کھانا پکنے کی خوشبو سے بھی طبیعت متلاقی تھی اور دیر تک ابکائیاں آتی رہتی تھیں۔ طبیعت اگرچہ بہت خراب تھی لیکن جس طرح سے غالب خوش تھے مجھے خود پر ناز ہونے لگا کہ میں ممتا کے جس عہدے پر سرفراز ہونے والی تھی وہی غالب کی خوشی کا باعث تھا۔ میں جو ان کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی تب میں نے اُنھ کو ان کی کمر پر سر رکھ دیا۔

”شرارتیں مت کرو ورنہ پھر بے ہوش ہو جاؤ گی۔ مجھے تمہاری بے ہوشی سے ڈر لگتا ہے۔“ غالب مسکرائے۔ لیٹے ہوئے جو اٹھی تو طبیعت یکدم متلائی، سر بھاری ہو گیا اور میں اس مضبوط گرفت سے بمشکل نکل کر غسل خانے میں پہنچی۔ صبح ناشتے کی میز پر میں زرد چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ رات بھر الٹیاں آتی رہیں لیکن ہمت کر کے پھر بھی اٹھ گئی۔ میری حالت نے امی جان کے ذہن میں ساری کہانی مکمل کر دی تھی۔ غالب سر جھکائے ناشتے میں مصروف تھے اور میرا پیلا زرد رنگ کسی سے چھپا ہوا نہ تھا۔

”غالب“ امی جان نے کہا۔ ”میری بیٹی کی طبیعت لگتا ہے کہ ٹھیک نہیں ہے، اس پر خریداری وغیرہ کا بوجھ ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں نگہت کو ہی ساتھ لے جاؤں گی، تم چلے چلو یا تیور۔“ غالب شرمندہ نظر آ رہے تھے۔

”امی جان! مجھے تو آفس جانا ہے، تیور کو لے جائیں ورنہ شام کو میں لے جاؤں گا۔“

”امی جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ غالب کا دفاع کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”اور میں خود جاؤں گی نگہت کہاں جائے گی۔“ میں اور امی دو تین دن بازاروں کے چکر لگاتے رہے اور تمام شاپنگ مکمل کی۔ شام تک اتنے تھک جاتے کہ اپنا ہوش نہ رہتا۔ غالب اور تیور بھی مختلف کاموں میں مصروف رہتے۔ غالب اب بہت محتاط تھے۔ میری طبیعت بھی بالکل ٹھیک تھی۔ انہی مصروفیات میں نکاح کا دن آپہنچا۔

فنکشن ہوٹل میں تھا سو ہم بھی مہمانوں کی طرح وہاں پہنچے۔ لڑکے والوں کے ہمراہ تقریباً پچاس سے زائد مہمان تھے۔ والدہ، ابو اور علی بھائی بھی آئے ہوئے تھے۔ علی بھائی اور تیور کی

خوب دوستی تھی۔ اسی لیے وہ دونوں اس دن بے سنورے اپنی شرارتوں کے باعث ہر ایک کے مرکزِ نگاہ تھے۔ نگہت بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی تو اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ سب بے اختیار ماشاء اللہ کہہ اٹھے۔ اعجاز بہت اسماٹ اور خوب رو جو ان تھا۔ نکاح ہوا، اعجاز اور نگہت نے دستخط کیے۔ نگہت کے ہاتھ کپکپا رہے تھے پھر تصاویر کا دور چلا اور مختلف گروپ بنا کر مودی بنائی گئی پھر نکاح کی خاص ہیروں سے مزین انگوٹھی اعجاز نے اپنے ہاتھوں سے نگہت کو پہنائی اور دیر تک اس کا ہاتھ پکڑے رکھا کیونکہ سب نے اس موقع پر تصاویر بنانا تھیں۔ امی جان تو اسٹیج سے ہٹ چکی تھیں۔ البتہ غالب اور تیور کے چہروں پر میں نے ایک سایہ سالہا راتے دیکھا۔

ماہِ رخ سے بھی ملاقات ہوئی، کالج کے حوالے سے باتیں ہوئیں۔ کچھ پرانی یادیں تازہ ہوئیں اور کھانے کے بعد نکاح کی یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے تھے۔ اسٹیج پر اعجاز نگہت سے الوداعی کلمات کہہ رہے تھے، نگہت رورہی تھی۔ میں وہاں گئی اور اس کو تسلی دی۔ ”کیا بے وقوفی ہے، اب کیوں رورہی ہو؟“

”مجھ سے بچھڑنے پر“ اعجاز نے مسکرا کر کہا۔ ”حالانکہ اس سے وعدہ کیا ہے کہ بھابی کی مدد شامل حال رہی تو جاتے وقت مل کر جاؤں گا۔ شرعی طور پر تو اب کوئی پابندی نہیں ہے۔“ اور نگہت سر جھکا کر مسکرا دی۔

دن پر لگا کر اڑتے رہے تھے۔ تیور اس روز موقع دیکھ کر میرے کمرے میں چلا آیا۔ ”بھابی آپ کو بتانا تھا کہ میں فوج میں ایلانی کر رہا ہوں اور یہی وہ خاص بات ہے جو میں آپ سے کرنا چاہ رہا تھا۔“ میں حیران رہ گئی۔ ”ابھی امی کو نہ بتائیں میں ابتدائی ٹیسٹ کے لیے جا رہا ہوں، امی کو کسی دوست کے ہاں جانے کا بتایا ہے۔“

”لیکن تمہاری بی بی اے کی پڑھائی؟“ میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔

”بس بھابی، ایک کیرئیرز بن میں کلبلا رہا ہے۔ فوج میں جا کر ہی دم لوں گا۔“ مجھے اسی طرح

حیران چھوڑ کر وہ چلا گیا۔

اسی روز اعجاز کچھ کاغذات پر نگہت کے دستخط کروانے کے لیے فون کر کے آگیا۔ امی اور میں

نے ٹی دی روم میں اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی اور پھر اس نے نگہت کا پوچھا تو میں اسے ہمراہ لے کر نگہت کے کمرے میں چلی گئی۔ نگہت اسے دیکھ کر دل میں تو خوش ہوئی ہوگی، اوپر سے گھبراگئی اور جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی اسے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ..... کیسے؟ السلام علیکم۔“ اس پر اعجاز کا بھرپور قبضہ پڑا اور میں بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ اعجاز کو صوفے پر بٹھایا اور نگہت کو بھی ساتھ بٹھایا۔ تب اعجاز نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا اور کاغذات تھما دیے، نگہت دستخط کرنے کو تھی کہ اعجاز نے اس کا ہاتھ یکدم پکڑ کر روک دیا۔ نگہت نے گھبرا کر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکالا۔

”نگہت“ اعجاز گویا ہوا۔ ”عورت کمزور مخلوق اس لیے کہلاتی ہے کہ وہ اپنا برا بھلا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو رکھتی ہے لیکن اس کو بروئے کار نہیں لاتی۔ اپنی اس صلاحیت کو استعمال نہ کرنے کا یہ جواز پیش کرتی ہے کہ اسے مرد پر اعتماد ہے۔ میں تمہاری اسی چیز کو دیکھنا چاہتا تھا اور تم اگر ان کاغذات پر دستخط کر دیتیں تو مجھے بالکل موردِ الزام نہ ٹھہرا پاتیں کیونکہ بھابی سامنے بیٹھی ہیں اور بتا سکتی ہیں کہ میں نے تم پر کوئی زبردستی نہیں کی۔“ میں اور نگہت ٹکڑ ٹکڑ اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ان کاغذات کا گولسا بنایا اور نئے کاغذات کوٹ کی جیب سے نکال کر نگہت کے سامنے رکھے۔

”ان کا ایک ایک لفظ پڑھو اور پھر دستخط کرنا۔ اگر زیادہ وقت چاہیے تو میں شام کو آ جاؤں گا اور اگر تمہیں ابھی کوئی اور کام نہ ہو تو میں بیٹھ کر انتظار کر لیتا ہوں۔“ نگہت نے کاغذات اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیے۔ میں اور اعجاز باتیں کرتے رہے۔ میں اس کے پروگرام کے بارے میں پوچھتی رہی پھر سوچا دوپہر کے کھانے کے لیے تیاری بھی کرنا ہے۔ سو معذرت کر کے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ چولھے پر ہنڈیا چڑھائی اور پھل ٹرے میں رکھ کر امی جان۔ کمرے میں آئی۔

وہ روزانہ اس وقت قرآن مجید پڑھتی تھیں اور پھر تھوڑا سا پھل کھا کر آرام کرتی تھیں۔ انہیں پھل دے کر میں نگہت کے کمرے میں آئی تو باہر سے ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی اور ساتھ ہی ادھ کھلے دروازے سے میری نظر اعجاز اور نگہت پر پڑی۔ وہ شرعاً تو نہیں لیکن معاشرتی طور پر غلط انداز میں صوفے پر تھے۔ میرے جسم میں ایک دم جھرجھری سی دوڑ گئی کہ اگر غالب یا تیمور میں سے کوئی دیکھ لیتا تو میری بھی ساتھ ہی بے عزتی ہو جاتی۔ میں نے چار قدم پیچھے ہٹ کر چھری ٹرے سے نیچے پھینکی جس سے اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی پھر میں نے اس چھری کو اٹھایا اور قدم گھسیٹتے ہوئے نگہت

کے کمرے کے دروازے پر جا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

”ارے بھابی! دروازہ کھٹکھٹانے کی کیا ضرورت ہے؟“ اندر سے نگہت کی آواز سنائی دی۔ تب میں کمرے میں داخل ہوئی تو نگہت اپنے بید پر بیٹھی تھی اور اعجاز اکیلا صوفے پر رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ نگہت اسی طرح سر جھکائے کاغذات پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

”بھابی! آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں، بیٹھیں میں خود جا کر لے آتی.....“ میں نے ٹرے، رکھ کر پھل اعجاز کو دیا اور نگہت نے کاغذات پڑھ کر دستخط کیے۔ وہ کاغذات اس کے ویزا وغیرہ کے بارے میں تھے۔ اعجاز دس پندرہ منٹ اور بیٹھا اور جاتے ہوئے امی جان سے مل کر چلا گیا۔

دن اسی طرح پر لگا کر اڑتے رہے، میری طبیعت اب سنہلنے لگی تھی۔ اس رات میں سو نہیں پا رہی تھی کیونکہ نگہت اپنی کسی دوست کی طرف جانے کا کہہ کر گھر سے گئی تھی اور جب واپس آئی تو اس وقت میں چھت پر کسی کام سے گئی تھی۔ تب میری اتفاقاً نظر پڑی تو کافی فاصلے پر نگہت مجھے اعجاز کی گاڑی سے اترتی نظر آئی۔ مجھے اس کو اترتا دیکھ کر دل میں غصہ بھی آیا لیکن پھر میں جھکی جھکی چھت سے اتر آئی۔ نیچے آئی تو میں ہانپ رہی تھی، اپنے کمرے میں آ کر میں نے اپنی سانسیں درست کیں۔ تب کال بیل بجی اور امی نے جا کر گیٹ کھولا، نگہت ہی تھی۔

”کیسے آئیں نگہت؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹیکسی پر آئی تھی بھابی! ایک دو سہیلیاں بھی تھیں اس لیے میں موٹر پر ہی اتر گئی کیونکہ گلی میں آتے جاتے اسے مزید وقت لگتا۔“ اس نے بڑے اعتماد سے بہانہ گھڑا۔

”لوحد ہو گئی۔“ میں نے مزید کہا۔ ”اپنی سہیلیوں کو بھی لائیں۔ وہ بھلا کیا سوچیں گی کہ گھر کے نزدیک لا کر گھر آنے کو بھی نہ کہا۔ بڑی بری بات ہے۔ ویسے تھیں کون کون؟“

”وہ بھابی!“ وہ گڑ بڑا گئی۔ ”وہ آپ ان کو نہیں جانتیں، وہ میری اسکول کی دوست ہیں۔“ میں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا اور تب میں نے امی کو تھوڑی سی بھٹک دی تاکہ میں اکیلی ذمے دار نہ ہوں۔ امی نے میرے آگے ہاتھ باندھے۔

”بیٹی میں اسی دن کے لیے نکاح پر نہیں مانتی تھی۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میری وہ بھی بیٹی ہے تم بھی بیٹی ہو۔ میں آسنے سامنے اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ تم اس سے موقع دیکھ کر



بات کرو اور اسے سمجھاؤ کہ لڑکیوں کی عزت تو کالج کی طرح ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس.....“ اور مزید آنسوؤں نے انہیں بولنے نہ دیا۔

نچھے دل میں دکھ بھی ہوا کہ میں نے انہیں کیوں پریشان کیا اور اب سوچ رہی تھی کہ غالب کو بتاؤں مگر پھر یہ سوچ کر کہ بھائی ہے، جذبات میں آکر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کہیں بات اتنی نہ بڑھ جائے کہ ہم ان کا نکاح کرنے کے فیصلے پر پہنچتے ہوئے نظر آئیں۔ یہی سوچ سوچ کر نیند نہیں آرہی تھی اور میں محسوس کر رہی تھی کہ غالب بہت زیادہ کر دہیں بدل رہے ہیں۔ کبھی ان کے منہ سے خراٹوں کی طرح آواز نکلتی اور کبھی ان کی سانسیں بے ترتیبی ہو جاتیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کو کوئی تکلیف ہے۔

میرے اندر ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ غالب سوئے ہوئے مجھے کسی بچے کی طرح معصوم لگ رہے تھے۔ میں نے ان کا سراپے سینے سے لگالیا اور ہولے ہولے سر دبانے لگی۔ غالب کسمسا کر اٹھ گئے۔ ”کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ”میں تو ٹھیک ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔“

”نہیں تو..... میں تو سو رہا تھا بلکہ بڑا خوبصورت خواب دیکھ رہا تھا لیکن آنکھ کھلی تو حقیقت اس سے بھی بڑھ کر کئی درجے خوبصورت تھی۔“ انہوں نے ہنس کر کہا اور میں تھوڑی دیر پہلے کی تمام سوچیں ذہن سے جھٹک کر اس مہربان وجود کی چھاؤں میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔

تیور کی آئی ایس ایس بی کال آگئی تو امی کو بتانا پڑا۔ غالب کو بھی بتایا تو وہ خوش ہوئے لیکن امی تو رونا شروع ہو گئیں۔ ”اس کا باپ بھی جنگ میں ناموس وطن کی خاطر شہید ہوا، لیکن میرے پاس تو میرا یہی سہارا ہیں۔ میں اپنی اولادوں میں سے کسی کو بھیجنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ میں نے بیوگی کس طرح کاٹی میں ہی جانتی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور سب سے پہلے تو مالی مسائل..... پھر ایک جوان عورت کا بچوں کے ساتھ رہنا۔ تھوڑا احترام محلے والے اس لیے کرنے لگے کہ میں شہید کی بیوہ تھی۔ خدا نے انہیں شہادت کا رتبہ دیا لیکن اس ملک نے کہ جس کے لیے انہوں نے اپنی جان لٹادی، اس ملک کے صاحب اختیار لوگوں نے اپنے اس شہید کے لواحقین کو کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔“

تیور نے امی کو بہت دلاسا دیا، بہت تسلی دی، منت سماجت کی تو اتنا ہوا کہ انہوں نے مخالفت چھوڑ دی لیکن اس ذکر پر وہ اسی طرح رو پڑتیں۔ تیور کو کوہاٹ جانا تھا۔ مظہر نے اصرار کیا کہ اسے بھی ہمراہ لے جائے اور پنڈی پھوپھو کے گھر چھوڑ جائے کیونکہ وہ امتحان سے فارغ تھا اور آج کل کافی بور ہو رہا تھا۔ ”کیوں بھی پھوپھو کی بیٹیوں سے کوئی محبت کا سلسلہ تو نہیں چل پڑا۔“ اور مظہر اتنی بری طرح شرمایا کہ ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”نہیں بھائی جان! میرا تو ان کے بیٹوں کے ساتھ سلسلہ ہے۔“ اس پر ایک اور قہقہہ پڑا۔ غالب آفس گئے ہوئے تھے۔ جس دن سے تیور گیا تھا امی روزانہ بازاروں کی خاک چھان رہی تھیں۔ میں نہا کر نکلتی تھی کہ نگہت دودھ کا گلاس لے کر آگئی۔ جب سے میرے اندر کا وجود متحرک ہوا تھا امی نے میری خوراک میں تقریباً دو گنا اضافہ کر دیا تھا اور اپنے ہاتھوں سے، اپنی نگرانی میں وہ مجھے تمام چیزیں کھلاتی تھیں اور اگر خود گھر پر نہ ہوتیں تو نگہت یا غالب کو تاکید کر کے جاتی تھیں۔ میں نے دودھ کا گلاس لے کر دی سی آر پر گانے لگائے اور وہیں بیٹھ کر گانے سننے لگی اور انگلیوں سے اپنے بال سلجھانے لگی۔

باہر نیل ہوئی اور نگہت تیزی سے اٹھ کر باہر گئی، اندازے سے زیادہ وقت لگا کر اندر آئی تو اعجاز اس کے ہمراہ تھا۔ میں بڑے آرام سے صوفے پر دراز تھی۔ فوراً شرم سے سٹ گئی۔ اپنا دوپٹا پاس نہ تھا۔ تو لیا ہی کندھوں پر ڈالا اور اعجاز کو بیٹھنے کا کہا۔ نگہت میرا دوپٹا لے آئی۔ میں نے ململ کے دوپٹے کو پھیل کر اوڑھ لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ نگہت باورچی خانے میں چلی گئی۔ اعجاز نے بتایا کہ آخری کچھ کاغذات پر دستخط کر دانا تھے۔

”بہت جلد کاغذات بن جائیں گے بھابی، اور میں دو ماہ کے اندر اندر نگہت کو بلوالوں گا۔“

”بھئی یہ تو بہت جلدی ہے۔ ہمیں تیاری کے لیے کچھ وقت چاہیے ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”تیاری کیا بھابی؟ کون سا سامان بنانا ہے، یا فرنیچر بنانا ہے؟“ اعجاز نے کہا تو میں نے جواب دیا۔

”پھر بھی بیٹی والوں کو سوتیلیاریاں کرنی ہوتی ہیں، کپڑا اور زیور بنانے کو بھی وقت چاہئے ہوتا ہے۔“

”بھابی!“ اعجاز کا لہجہ راز دارانہ تھا۔ ”میں ذاتی اکاؤنٹ سے کچھ رقم نگہت کو دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ کچھ کپڑے، زیور وغیرہ میری طرف سے خود بنا لے اگر آپ برآمدہ مانیں تو.....“

”نہیں اعجاز!“ میرے لہجے میں سختی تھی۔ ”ایسا بالکل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لیے یہ بڑے شرم

کی بات ہے۔ اللہ کے فضل سے کسی شے کی کمی نہیں اور پھر نگہت ہر چیز اپنی پسند سے بنانے میں آزاد ہے، اس پر کوئی پابندی تو نہیں۔ باقی جو کچھ آپ کو بتانا ہے اپنی طرف سے وہ خود انگلینڈ سے لے لیتا یا شادی کے بعد مل کر شاپنگ کر لیتا۔“

”شادی تو ہماری ہو چکی۔“ اس کا لہجہ شرارتی تھا اور نگہت جو اسی وقت کو لڈ ڈرنک لے کر آئی تھی اس کے ہاتھوں میں گلاس کانپ گئے۔ ایک گلاس اس نے مجھے دیا، دوسرا اعجاز کو اور ایک گلاس خود لے کر وہیں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔

”اس میں کوئی شک نہیں، لیکن ابھی رخصتی باقی ہے۔ نکاح اور شادی میں تھوڑا فرق تو ہے اور پھر ہمارے معاشرتی حالات کے تقاضے ہیں کچھ چیزیں شادی کے بعد ہی اچھی لگتی ہیں۔“ میں نے اپنی وانست میں ایسی بات کہہ دی تھی کہ اگر دونوں غور کر لیتے تو سمجھ لیتے۔ تب مجھے اچھا نہ لگا کہ نگہت بار بار اٹھے، سو میں چائے بنانے کو اٹھی ویسے بھی گانے ایسے تھے کہ مجھے اعجاز کے سامنے وہاں بیٹھے رہنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ مصلحت کا تقاضا تو یہ تھا کہ بیٹھی رہتی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ چلو میں چکر لگاتی رہوں گی اور پھر یوں بھی ٹی وی لاؤنج میں ہیں۔ میں اٹھی تو اعجاز نے بیٹھنے کو کہا اور نگہت سے کہا کہ وہ چائے بنا لے، لیکن میں نے بعد اصرار اس کو بٹھا دیا اور خود کچن میں آ گئی۔ دو ایک دفعہ دو وہ اور کباب نکالنے کے لیے ڈائننگ روم میں گئی تو وہیں سے پکار کر اعجاز سے اس کے گھر والوں کی خبریت وغیرہ پوچھی۔

اعجاز ٹی وی دیکھ رہا تھا اور نگہت اپنے وہیان میں کڑھائی کر رہی تھی۔ میں تھوڑی مطمئن ہو گئی۔ اعجاز نے کہا کہ اگر میں برانہ مناؤں تو کچھ پکڑے تل لوں۔ میں نے اس کی فرمائش پر بیسن گھولا اور سبزیاں کاٹیں۔ تاہم یکدم میرے اندر کے تجسس نے مجھے مجبور کیا تو میں وبے پاؤں جوتے اتار کر ڈائننگ میں آئی۔ ڈائننگ میں قدرے اندھیرا تھا اور ٹی وی لاؤنج میں وہی سین میرا منتظر تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ دونوں گرد و پیش سے بے خبر تھے اور وی سی آر پر لگے ہوئے گانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، کانوں کی لویں تپنے لگیں اور میرے اندر کی حرکت کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ میں کچن میں آ گئی اور اپنی ذوقی ابھرتی سانسوں کو قابو کیا۔ پکڑے کڑاہی میں ڈالے اور نگہت کو آواز دی۔ جب وہ آئی تو میں نے کہا۔

”نگہت! مجھ سے کھڑ نہیں ہوا جا رہا ہے، ساری تیاری مکمل ہے تم صرف پکڑے تل کر لے

آؤ۔“ نگہت نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور گھبرا گئی۔ ”بھابی! کیا ہوا، گری تو نہیں کہیں آپ؟“ ”ارے نہیں! بس چکر سا آ گیا تھا۔“ کہہ کر میں ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ اعجاز بھی غالباً بور ہو رہا تھا۔

”کیا ہو گیا بھابی؟“ میری کیفیت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ ”زیادہ طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی۔“ بھاگ کر اپنی گاڑی سے اسٹیکتھسکوپ لے آیا اور میری نبض اور بلڈ پریشر وغیرہ چیک کر کے بتایا کہ بلڈ پریشر بہت لو ہو رہا ہے۔ مجھے اس نے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کو کہا لیکن میں نے کمرے میں جانے کے بجائے وہیں بیٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ نگہت بھی گھبرا گئی تھی۔ میرے لیے سیب کا جوس لے کر آئی۔ میری طبیعت بیٹھنے سے کچھ سنبھل گئی تھی، ہم نے چائے پی اور اعجاز نے اجازت چاہی۔ نگہت کو میں نے روکنا چاہا لیکن گیٹ بھی تو کسی نے بند کرنا تھا سو چپ کر گئی۔ جب نگہت واپس آئی تو میں پھٹ پڑی۔

”نگہت خدا کے لیے کیوں ہماری عزت کو خاک میں ملائی ہو؟ کیوں ہمیں ختم کرنا چاہتی ہو، کیوں تاریکیوں کی منزل پر چل نکلی ہو۔ خدا اس کے قدم نہیں پر روک لو، اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے روک دو، مت اس کی حوصلہ افزائی کرو! ورنہ اپنے بھائیوں کو جانتی ہو۔ امی تو نکاح کا مان ہی نہیں رہی تھیں۔“

”بھابی!“ اس نے اپنی گردن جھکا کر روتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا کروں بھابی، میں کہاں جاؤں، میں کس طرح روکوں اس کو وہ تو شرعی طور پر اپنا حق جتلاتا ہے۔“

”بس بہت ہو چکا۔“ میں نے اس کا سر اوپر کر کے کہا۔ ”یہ حق تو کسی حد پر ختم نہیں ہوتا۔ تم اس کو نہیں روکو گی تو مطالبہ بڑھتا ہی جائے گا اور ایک دن ایسا آئے گا کہ تم اپنا سب کچھ لٹا دو گی، پھر بھی مطالبات نہیں رکھیں گے۔ چند ہفتوں کی بات ہے اس کے مطالبات مت مانو پلیز۔“

”بھابی۔۔۔۔۔۔ بھابی“ وہ چپکوں سے رونے لگی۔ ”اب تو کچھ بھی نہیں رہا، سارے مطالبے وہ منوا چکا، میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب میں اس کے حوالے کر چکی۔“

میرے اوپر تو گویا بجلی گری یا سر پر کہیں بم پھٹ گیا۔ ہوش میں آئی تو کسی اجنبی جگہ پر تھی، سفید چھت، سفید بستر، سفید یونیفارم میں نرسیں۔۔۔۔۔۔ مگر میں اسپتال میں کیوں تھی؟ اٹھنے کی کوشش کی تو ڈرپ لگی ہوئی نظر آئی اور دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے غالب اور امی فوراً میرے

پاس آئے، والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ سب لوگ بہت پریشان تھے۔ مجھے پورے چھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تھا، غالب کا برا حال تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں کی مائیں پریشان حال اور ان کے چہرے دیکھ کر مجھے ایک دم عجیب سا خیال آیا، کہیں میرا.....؟ لیکن جب غالب نے اپنا لرزتا ہاتھ میرے چہرے پر پھیرا اور دوسرے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو تھاما تو میرے اندر کی حرکت نے میرے شہے کو دور کر دیا اور میرا ہاتھ غالب کے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر میرے چہرے پر غالب کے ہاتھ پر پڑا۔

”کیسی ہو؟“ غالب نے پوچھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے باعث کامیاب نہ ہوئی۔ والدہ نے میرے ماتھے پر پیار کیا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا کر رو پڑیں۔

”والدہ! کیا بات ہے؟“ مجھے ابھی تک کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ غالب کی امی نے آگے آ کر پیار کیا اور بولیں۔

”کیا ہوا بیٹی، ایک دم ایسی کون سی بات ہو گئی، ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ کسی صدمے کا اثر ہے، ادھر نگہت تمہاری حالت سے اتنی پریشان ہے کہ وہ بھی بیمار پڑی ہے اور اسے تو کچھ اندازہ نہیں کہ تمہاری یہ حالت کیوں کر ہوئی۔ میں گھر واپس آئی تو کہنے لگی کہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے بے ہوش ہو گئی تھیں۔“

”جی امی!“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا لیکن نگہت نے انہیں کچھ نہ بتا کر میرے سر پر بوجھ اور بھی بڑھادیا تھا۔ میں اس بوجھ کی کیونکر تحمل ہو سکتی ہوں؟ کیسے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی۔ بہر حال اس وقت تو شاید یہی بہتر تھا کہ خاموش رہتی۔ ”بس اچانک بیٹھے بیٹھے چکر آ گیا تھا۔“

”بیٹی خوش رہا کرو۔“ والدہ کہہ رہی تھیں۔ ”ڈاکٹر تمہاری حالت سے کافی مایوس نظر آ رہے ہیں۔ عورت پر تخلیق کی ذمہ داری ڈال کر خداوند کریم نے اس کا درجہ بہت بلند کر دیا ہے اور یہ عورت کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنا اور اپنے دنیا میں آنے والے بچے کا خیال رکھے تاکہ تخلیق کے فرض سے عہدہ برا ہو سکے۔“ میں نے ہلکے سے مسکرا کر آنکھیں موند لیں اور اپنی تخلیق کے وجود کو محسوس کرنے لگی، آئندہ میں اس کا بہت خیال رکھوں گی۔

ایک خالق ہے خداوند کریم کی ذات، اور پھر اس نے برداشت کی یہ صلاحیت دی عورت کو کہ وہ تکلیف اور کرب کے ساتھ نئے وجود کی خالق ہو اور اپنی تخلیق کا ثمر پا کر وہ اپنی ساری کدورتیں

اور تکلیفیں ایک بل میں بھول جائے.....

اگلے روز میں گھر واپس آئی اور اسی روز شام کو تیور واپس آیا، بہت خوش تھا کہ اس کا فوج میں انتخاب ہو گیا تھا۔ میڈیکل اور فائنل کال وغیرہ رہ گئی تھی لیکن گھر آتے ہی یہ خبر سن کر وہ بہت پریشان ہوا۔ ادھر علی بھائی بھی میرے بے ہوش ہونے کی خبر سن کر فوراً چلے آئے پھر تیور اور علی بھائی نے مل کر وہ رونق لگائی کہ میں تھوڑی دیر کو سارے دکھ اور سارے غم بھول گئی۔ ”اصل میں انہوں نے کچن کا دروازہ کھولا اور چچوں پر لال بیک پھر رہا تھا، بس یہ صدمہ ان کو لے بیٹھا۔“ تیور نے بڑی مستند رائے دی۔

”نہیں یار۔“ علی بھائی نے جو کروں والے انداز میں کہا۔ ”اصل میں شام کو باہر جانا تھا، سوٹ اور دو پٹا نکال لیا اور جب بیٹھ کر سوچا کہ اس کے ساتھ میچنگ جوتا نہیں ہے تو اس صدمے سے فوراً بے ہوش.....“

”بھائی جان۔“ منظر نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ”باجی اور بھابی گھر پر اکیلی تھیں اور بھابی نے فارغ بیٹھ کر یہ سوچا کہ ہوگا کہ کہیں کوئی ڈاکو گھر میں آ جائے تو یہ گھر کو لٹنے سے کیسے بچا سکتی ہیں۔“ منظر نے اپنی طرف سے مذاق کیا تھا، لیکن میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”خدا کی قسم! تم نے مذاق میں بہت بڑی حقیقت بیان کر دی۔“ اور نگہت کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

علی بھائی نے کچھ دن کے لیے ساتھ لے جانے کا کہا تو کوئی نہ مانا اور میرا اپنا دل کب چاہ رہا تھا۔ یوں بھی ڈاکٹر نے بہت احتیاط کے لیے کہا تھا۔ سب لوگ بہت زیادہ پیار کرتے اور خیال رکھتے تھے۔ تبھی اعجاز کا انگلیٹڈ جانے کا پروگرام فائنل ہو گیا تو ہماری طرف ان کی ساری فیملی کا رات کا کھانا تھا۔ میرے اصرار پر بھی مجھے کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیا گیا۔ ساری تیاری نگہت نے کی اور کچھ چیزیں بازار سے منگوائی گئیں۔ ساتھ امی نے کچھ چیزیں تیار کیں، میں نے بیٹھے بیٹھے سلاڈ تیار کیا۔ کھانا بڑا پر تکلف اور لذیذ تھا۔ سب لوگوں نے پیٹ بھر کر کھایا اور دل کھول کر سراہا۔ نگہت کھانے پر ہمارے ساتھ نہ تھی۔ اعجاز نے یقیناً اس کی کمی کو محسوس کیا ہوگا لیکن غالب اور تیور نے ایسا ہی چاہا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کن حدود سے تجاوز کر چکے تھے۔ اعجاز کی بے چینی کو بھانپ کر اس کی والدہ نے کہا۔

”نگہت بیٹی کھانا نہیں کھائے گی؟“

”جی وہ آتی ہی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا سوئیٹ ڈش کو دیکھ رہی تھی۔“

”بیٹھا تو دیر سے بھی کھایا جاسکتا ہے، کھانا وہ وقت پر اور سب کے ساتھ ہی کھا لیتیں۔“ اعجاز نے کہا تو غالب خاموش رہے البتہ تیور کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ امی نے اور میں نے یکدم اس بات کو محسوس کیا اور امی نے مجھے نظری نظر میں اشارہ کیا اور میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں دیکھتی ہوں اور کتنی دیر رہ گئی ہے؟“ اور پھر ہم سوئیٹ ڈش لے کر اس وقت کچن سے نکلے جب سب لوگ کھانا کھا کر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں دی روم میں بیٹھے تھے۔

اعجاز کی امی اور غالب کی امی، ایک گروپ میں تیور، مظہر، ماہ رخ اور اس کی چھوٹی بہن ستارہ بیٹھے تھے جب کہ اعجاز اور غالب علیحدہ بیٹھے تھے۔ میں اعجاز اور غالب کے پاس جا کر بیٹھ گئی جب کہ نگہت بیٹھا سر دکر کے لڑکیوں اور لڑکوں کے اس مشترکہ گروہ میں جا بیٹھی۔ سر جھکا کر بیٹھی سوئیٹ ڈش کھاتی ہوئی وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ معصوم تو وہ تھی اعجاز کے بہکاوے میں آ کر اپنی معصومیت کا گوہر کھو بیٹھی تھی لیکن ابھی بھی بھائیوں کے سامنے وہ اس غضب کی اداکاری کر رہی تھی کہ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں تو ایسی بات کا تصور کر کے بھی شاید سر نہ اٹھا سکتی، نہ ہی میرے میکے اور سسرال کا ایسا ماحول تھا لیکن اس لڑکی نے کوئی علیحدہ ہی خول خود پر چڑھا لیا تھا۔

بزرگوں کے درمیان رخصتی کا لائحہ عمل طے ہونے لگا تو غالب کو بلا لیا گیا۔ میں اور اعجاز اکیلے تھے۔ ”بھابی! معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ موت کے منہ سے واپس آئیں لیکن آپ نے ہمارا نام نہ لے کر جو احسان ہم پر کیا ہے وہ میں زندگی کے کسی موقع پر ضرور چکاؤں گا۔ ایک تو درخواست ہے کہ نگہت کو کل ایئر پورٹ پر ضرور لائیں اور دوسرے جس رقم کی میں نے بات کی تھی میں منہ دکھائی میں نگہت کو کچھ دینا چاہتا تھا لیکن حالات ہی ایسے ہو گئے کہ میرے اوپر منہ دکھائی ادھار ہو گئی۔“

”سوری اعجاز۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”میں آپ کی یہ دونوں خواہشات فی الحال پوری نہیں کر سکتی۔ پلیز آپ میری پوزیشن کو بھی سمجھیں۔“

”بھابی!..... چلیں خیر آپ کا بہت بڑا مقروض ہوں! اپنی صحت اور غالب بھائی کا بہت خیال رکھا کریں۔“

”کیوں؟“ میں نے ایک دم تشویش سے کہا۔ ”کیا ہوا غالب کو..... وہ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہاں! ہاں بالکل ٹھیک ہیں..... آپ خود کو سنبھالیں، وہ ذرا سے ٹینس ہیں اور ٹینس سے تو بہت سی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں..... آپ کم از کم پہلے خود اپنا تو خیال کریں۔“ اعجاز نے مسکرا کر کہا۔ میں بظاہر تو مطمئن ہو گئی تھی لیکن میرے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔ اگلے دن اعجاز چلا گیا، تیور اور مظہر اس کو ایئر پورٹ پر خدا حافظ کہنے کے لیے گئے۔

جھرات کو غالب کی ابو کی برسی تھی، میرے اٹھنے تک گھر میں ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کا فرنیچر نکال کر چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں۔ ناشتے سے فارغ ہوئے تو ختم کی تیاری ہوئی۔ محلے کی مسجد سے امام صاحب مع حافظوں کے آگئے اور دو قرآن مجید پڑھ کر ختم دلایا گیا۔

تین دن کے بعد غالب کے دادا کی برسی تھی پھر اسی طرح ختم دلایا گیا۔ دن بھر کام نہ بھی کرو تو اس طرح کے موقع پر تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ شام کے کھانے کی کسی کو بھوک نہ تھی۔ ٹی وی پر بھی کوئی خاص پروگرام نہ تھا۔ سوسب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے۔ میں نے کچن میں جا کر دودھ پیا اور کمرے میں آئی تو غالب کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

”اتنی بے چینی سے کس کا انتظار ہو رہا ہے؟“ میں نے شرارت سے کہا لیکن غالب شاید شرارت کے موڈ میں نہ تھے۔ میں نے تشویش سے انہیں دیکھا۔ ”کیا بات ہے غالب..... آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”پلیز تم پریشان نہ ہو..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری طرف سے ہی پریشان ہوں۔“ انہوں نے رخ پھیر کر جواب دیا۔ میں نے اٹھ کر انہیں دونوں ہاتھوں سے تھاما اور بیڈ پر لا بٹھایا۔

”غالب! آپ کو میری قسم ہے، اپنے بچے کی قسم ہے جھوٹ مت بولیں۔ مجھے بتائیں کیا بات ہے؟ مجھ پر اعتبار کریں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے.....“ ان کے کندھے پر سر رکھ کر میں رونے لگی۔

”پلیز! میری جان۔“ غالب نے میرے سر کو ہاتھوں سے اٹھایا۔ ”روؤ مت میں سب بتاتا ہوں..... اصل میں مجھے گزشتہ چند ماہ سے ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف ہو رہی ہے۔ بعض دفعہ سینے میں درد بھی ہوتا ہے، میں تو اسے اپنی مصروفیت کا رد عمل سمجھ رہا تھا اور تمہاری تکلیف پر پریشانی کی وجہ

سے سمجھتا رہا لیکن اس روز اعجاز کہہ رہا تھا کہ دل کی تکلیف بھی ہو سکتی ہے، چیک اپ کروانا.....“

”بس کریں!“ میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”پلیز اس طرح کی بری باتیں مت کریں۔“  
”حقیقت سے نظریں چار کرنا سیکھو۔“ میرے سر کو ہولے ہولے سہلاتے ہوئے وہ کہنے لگے۔ ”جب عملی زندگی میں قدم رکھ لیں تو عملی زندگی کے مصائب کا مقابلہ کرنا سیکھنا چاہیے۔ میں کل ہی چیک اپ کرواؤں گا تا کہ تمہارا وہم نکل جائے۔“ پھر ہم بہت سی باتیں کرتے رہے، آنے والے لکل کی، آنے والے بچے کی۔

”اچھا نام کیا سوچا ہے آپ نے؟“ میں نے غالب سے پوچھا۔

”بیٹی ہوئی تو خوشبو اور بیٹا ہوا تو مومن.....“ غالب نے اتنا خوبصورت جواب دیا کہ میں دنگ رہ گئی۔

”توبہ، کتنے چالاک ہیں، سب کچھ فائل کر کے بیٹھے ہیں اور ہمیں کچھ پتا ہی نہیں۔“  
”بس بس لڑائی نہیں، تمہارا کام صرف بچے پیدا کرنا ہے۔ میں نے اپنے چھ کے چھ بچوں کے نام سوچ لیے ہیں۔ یوں تو سب اللہ کی مرضی، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ پہلے مومن آئے گا پھر خوشبو۔“  
”اور وہ مومن..... آپ کی طرح مومن ہی ہوگا.....“ میں نے منہ بنا کر کہا اور غالب کو منانے کے سوطریتے آتے تھے۔

صبح جاگی تو غالب بالکل سیدھے لیٹے ہوئے تھے، ایک ہاتھ سے دل کو بھیجنے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا لیکن کتنا سرد ہاتھ تھا غالب کا۔ میں ایک دم گھبرا گئی۔ جلدی سے اٹھ کر باہر کو بھاگنے لگی تو پاؤں میں گلاس کی کرچی چبھ گئی جو نیچے ٹوٹا پڑا تھا۔ غالباً غالب نے پانی پینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہوگا تو نیچے گر کر گلاس ٹوٹ گیا ہوگا۔

”غالب..... غالب!“ میں نے دو ایک آوازیں دیں لیکن جواب نہ دارو، میں دیوانہ وار باہر بھاگی۔ ”تیور، تیور! امی جان.....!“ سب لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور میں تیور سے لپٹ کر کہہ رہی تھی۔ ”غالب کہاں ہیں تیور..... کہاں ہیں وہ؟“

”اندرو تو ہیں بھابی، وہ سامنے سو رہے ہیں..... پلیز بھابی آپ کو کیا ہو گیا ہے.....!“ اور امی جان نے جب غالب کو اور میرے زخمی پیر سے لال فرش کو دیکھا تو ان کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔ سب لوگ بیڈ کی طرف بھاگے جہاں غالب چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہمیشہ کے لیے سو رہے تھے۔ قمیض

کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، غالباً درد کی شدت سے قمیض اتنے زور سے پھینچی تھی۔ نگہت، مظہر اور تیور کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، امی جان کو گویا سکتہ ہو گیا تھا اور میں ہوش میں کہاں تھی۔

میں صبح سوکر ابھی، خدا یا گیا رہ بج گئے تھے، امی جان کیا سوچیں گی۔ باہر آئی تو لان میں چاندنیاں اور صفیں دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ بہت سی عورتیں بھی تھیں۔ لاؤنچ میں امی جان بیٹھی تھیں، ساتھ ہی میری والدہ بھی تھیں۔ ”والدہ آپ کب آئیں؟ اور ہاں آج برسی کی ہے؟“ میں دونوں ماؤں کو روتا دیکھ کر بہت حیران تھی۔ ”نگہت..... کہاں ہو؟“ میں نے نگہت کو آواز دی۔ نگہت بھی آئی تو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ پیلا رنگ، سیاہ حلقوں میں دھنسی آنکھیں، سلوٹیں پڑے ہوئے کپڑے اور بال گویا کبھی کنگھی ہی نہ کی تھی۔ وہ آئی اور مجھ سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

”بھابی..... ہوش کریں بھابی..... ہم لٹ گئے بھابی..... ہم اجڑ گئے۔“ میری آنکھوں میں حیرت کے سوا کچھ نہ تھا، آہستہ آہستہ سب عورتیں اندر آ کر مجھ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں، اس میں رشتے دار بھی تھیں، محلے دار بھی اور کچھ جاننے والی بھی تھیں۔ تب والدہ نے مجھے اپنے ساتھ لگایا اور میری سونی کلانیاں میرے سامنے کر کے کہنے لگیں۔

”تیرا سہاگ لٹ گیا میری بچی، تیری زندگی کا سہارا نہیں رہا، تو تنہا ہو گئی۔“ اور میرا گویا یاد داغ سن ہو گیا۔

”غالب..... وہ تو دفتر گئے ہوں گے امی جان، ابھی رات کو ٹھیک ٹھاک تھے، کیوں امی جان؟“ میں نے غالب کی امی کو جھنجھوڑا۔ ”والدہ جھوٹ بول رہی ہیں ناں؟ بتائیں امی جان، کچھ بولیں۔“ لیکن جب جواب میں وہ خاموش رہیں تو یہ حقیقت مجھ پر ہم بن کر پھٹی اور علم ہوا کہ آج غالب کے قتل تھے، ان کو دنیا سے گئے اس روز تیسرا دن تھا، اور میں نے وہ تین دن بیہوشی میں گزارے تھے، زندگی اور موت کے درمیان کشمکش کرتے، میرے پاؤں کا زخم بھی اتنا گہرا تھا کہ اس سے بہت خون بہہ چکا تھا اور پھر اس صدمے اور طویل بے ہوشی نے مجھ سے غالب کی آخری نشانی بھی چھین لی تھی لیکن میں اتنی سخت جان تھی کہ پھر بھی زندہ تھی، واقعی عملی زندگی میں قدم رکھ چکی تھی!!

میری آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے، مجھے بار بار وہم ہوتا کہ میرا بچہ ختم نہیں ہوا ہوگا۔ مجھ پر تو صد مومن کا وہ کوہ گراں گرا تھا کہ عام آدمی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ میں دن میں ساکن



بیٹھی رہتی تھی اور رات کو اپنے بستر پر اپنے غالب کو اپنے پاس محسوس کر کے ان سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ مجھے رات حقیقت لگتی اور دن خواب۔ آہستہ آہستہ وقت نے اپنا ہم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اب زبردستی مجھے چند نوالے کھانا بھی کھلایا جاتا تھا، اور بغیر طلب کے پانی بھی پلا دیا جاتا تھا۔ غالب کا دسواں بھی ہو گیا لیکن یہ حقیقت میرے لیے قابل قبول ہی نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں اس رات غالب سے باتیں کر رہی تھی کہ نگہت میرے پاس آگئی۔

”بھابی! اپنے آپ کو سنبھالیں بھابی.....“ ہم غالب کو یاد کرتے رہے، تب نگہت نے کہا۔

”بھابی! اس سے قبل آپ سے ایک بات کی تھی تو آپ پر طویل بے ہوشی طاری ہوئی تھی..... لیکن آج جو بات میں کرنے لگی ہوں وہ سن کر ممکن ہے کہ آپ زندہ ہی نہ رہیں.....“ میں نے چونک کر سراٹھایا۔

”زندہ تو میں اب ہوں ہی نہیں، تم بولو اگر تمہاری بات سن کر میں واقعی مرجاؤں تو میں تمہاری احسان مند ہوں گی.....“

”بھابی میں خطاوار ہوں، موت کی سزا مجھے ملنی چاہیے، کاش بھائی جان کی جگہ میں مرجاتی، بھابی..... میں امید سے ہوں.....“ دھڑام دھڑام کر کے کتنی چھتیں مجھ پر آن گریں۔ میں تو پہلے ہی بے سائبان ہو گئی تھی۔ نگہت کی بات نے تو مجھے گویا عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ سکتے کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔

میں اپنے بچے سے محروم ہو گئی تھی۔ میرے وجود سے چھ ماہ تک منسلک رہنے والا، میرے غالب کا مومن، اپنے باپ کے حسین خواب کی تعبیر میری بانہوں تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اور ایک یہ..... قبل از وقت تعلق کا ثمر، جسے شرع تو ماننی ہے لیکن دنیا کی انگلیاں کس انداز میں انھیں گی۔ جانے اعجاز نے کیا سمجھ کر اتنی حدیں پھلانگ لی تھیں اور اس احمق لڑکی نے تو میرے کرچی کرچی وجود پر وہ بار گراں ڈال دیا تھا کہ جو میری سکت سے بہت بڑھ کر تھا۔ میں کس طرح امی جان کو بتاؤں گی؟ وہ کیا سوچیں گی کہ میں اول روز سے اس قصے کو جانتی تھی۔ اب تو میں سرتاپا بے آسرا ہو گئی ہوں۔ کون سا ہاتھ ہوگا جو اس محاذ پر میری حفاظت کرے گا۔

”بھابی..... کچھ کریں درنہ میں.....“ نگہت اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو گھورے جا رہی تھی۔ آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا۔

”میں تو زندہ ہوں نگہت..... تم نے تو کہا تھا کہ میں شاید مرجاؤں لیکن دیکھو میں زندہ ہوئی..... میں کس لیے زندہ ہوں؟ تم سب نے غالب کو جاتے سے مجھ سے ملنے بھی نہیں دیا میں تو تب بھی زندہ رہی۔ میری کوکھ خالی ہو گئی میں تو پھر بھی زندہ رہی۔ اب..... اب تم..... میں مرکیوں نہیں جاتی..... کیوں نہیں؟“ جس دن سے میں تنہا ہوئی تھی آج پہلی بار اتنے کرب سے روئی تھی۔ نگہت بھی میرے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میں نے گھر میں سب کو بے حد افسردہ اور پریشان کر دیا تھا۔

تیوہرا اپنے جانے کی تیاریوں میں مشغول تھا اور ساتھ ساتھ اس بات پر پریشان کہ جانے اس کو اکیڑی جوانی کرنے کے بعد غالب کے چالیسویں میں شرکت کے لیے چھٹی ملے گی کہ نہیں۔ کوئی موقع شرارتوں کا تو تھا بھی نہیں لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ غالب کی موت نے تیوہر کو سرتاپا بدل دیا تھا۔ امی جان کے بڑھاپے کو تو بہت کاری چوٹ لگی تھی۔ میری طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھیں لبریز ہو جاتیں۔ ان کا نورانی چہرہ غم کی آمیزش سے بھرپور رہتا۔ میں ان کا دکھ سوچ کر ہولتی رہتی اور وہ مجھے دیکھ کر طول ہو جاتیں۔

انہوں نے بھی جوانی سے بیوگی کی چادر اوڑھی تھی اور جب اولاد کے جوان ہونے پر انہیں خوشیاں سینے کا موقع ملا تو خداوند کریم نے یہ دکھ دے دیا۔ ابھی تو ان کے بقول غالب کے سہرے کے پھول بھی نہ مرجھائے تھے، میری مہندی کی خوشبو بھیک کی نہ پڑی تھی۔ ان کے دل میں یہ حسرت ہی رہ گئی کہ ان کے پوتے پوتیاں ان کے آنکھوں میں قلقاریاں مارتے، بھیتے کووتے نظر آتے۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا ریت کے گھر وندوں کی طرح۔ نگہت کی طرف دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی، نہ ہی کچھ سمجھ میں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اگر میں خاموش رہتی اور وہ خود کو کچھ کر بیٹھی تو بھی اس بدنامی کے کچڑے کے سارے چھینٹے مجھ پر ہی گرتے۔ ہر طرف سے پریشانی ہی پریشانی تھی۔

غالب کے جانے سے میری زندگی ویرانہ ہو گئی تھی۔ نہ دن گزرتا تھا نہ رات کٹنے میں آتی تھی۔ سارے گھر کا ماحول ہی سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابھی تو میں نے شادی شدہ زندگی کی پہلی عید تک نہ دیکھی تھی۔ یہ سب کچھ کیسے آنا فانا ہو گیا تھا۔ پرانے وقتوں کو یاد کرتی تو غالب کی وارفتگیاں یاد آتیں۔ کس طرح میری تھوڑی دیر کی جدائی پر اداس ہوتے تھے اور

خود ہمیشہ کے لیے چھوڑ جانے سے قبل ایک بار بھی نہ سوچا۔

ایک روز میں برآمدے میں تخت پوش پردیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی کہ مجھے اپنے سامنے تیمور کھڑا نظر آیا۔

”بھابی میں کل اکیڈمی جا رہا ہوں۔“ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بڑھی ہوئی شیو اور پریشان حال۔ ”میں خاموش رہی۔

”بھابی!!!“ وہ پھر گویا ہوا۔

”ہوں.....؟“ میں جیسے نیند سے جاگ گئی۔

”آپ نے کچھ جواب نہیں دیا؟“ اس کا لہجہ غیر متوقع طور پر گھمبیر تھا۔

”یہ اجازت لینے کا انداز ہے یا اطلاع ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم ہی اچھے ہو، جانے سے قبل کم از کم اطلاع تو دے رہے ہو..... ایک غالب کو دیکھو.....“ وہ جھکا اور میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر دھواں دھار روئے لگا۔ میں بھی بے قابو ہو گئی اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر سکریاں لینے لگی۔

”میں آپ کو یہ تو نہیں کہتا کہ آپ بھائی کو بھول جائیں۔ میں تو خود بہت بری طرح ٹوٹا ہوں لیکن میں آپ کو کیسے تسلی دوں۔ امی کے لیے ان کے جگر کا ٹکڑا کہاں سے لاؤں.....؟“ وہ بری طرح سے رورہا تھا۔ تبھی امی اور نگہت بھی آگئیں اور مظہر آہستہ سے آکر میرے پاس بیٹھ کر کندھے دبائے لگا۔ گھر میں ہر کوئی دکھی تھا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون کس کو تسلی دے۔

”بیٹی، تیمور اکیڈمی جانا چاہتا ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟“ امی جان نے تھوڑی دیر تک سنبھل کر کہا۔ ”جیسے آپ کی اور اس کی مرضی، اسے شوق ہے تو جانے دیں۔“ میں نے اس کا سر اپنے گھٹنوں سے اٹھایا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”اگر یہ بھی چلا گیا تو کاروبار کون سنبھالے گا؟ گھر کا بڑا کون ہوگا؟“ امی کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”آپ جو ہیں امی، بھابی ہیں اور میں بھی تھوڑے عرصے میں بڑا ہوا جاؤں گا۔“ مظہر نے حسب معمول اتنی معصومیت سے کہا کہ بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر آگئی۔

ایک آدمی مرتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ قیامت آگئی ہو، حلق سے نوالہ اترنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جن کا وہ پیارا ہوتا ہے انہیں لگتا ہے شاید وہ جی بھی نہ سکیں۔ ایک آدھ دن گزرتا ہے تو زندہ رہنے کے لیے زور زبردستی سے کھانا اور چائے پلائی جاتی ہے اور زندہ لوگوں کے کام سب آہستہ آہستہ شروع ہو جاتے ہیں۔ وقت از خود بڑا مرہم ہے، آہستہ آہستہ زخم مندمل ہونا شروع ہوتے ہیں۔ جس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ آج غالب کو گئے تینیس دن ہو گئے تھے اور آج پہلے دن ہمارے گھر میں مسکراہٹ بے ساختہ ہوا کے جھونکے کی طرح آئی تھی۔ چاہے اس مسکراہٹ میں کتنے درد چھپے ہوئے تھے۔

”ہاں امی جان..... جب کسی گھر کا بڑا چلا جاتا ہے تو پھر چھوٹوں کو ہی بڑا ہونا پڑتا ہے۔ خدا تیمور کی عمر دراز کرے، اسے فوج میں جانے کا شوق ہے تو جائے۔ باقی رہا کاروبار تو جو ہماری قسمت میں لکھا ہو گا ملتا ہی رہے گا۔“ میں نے گویا تیمور کے دل کی بات کی۔ وہ نظروں ہی نظروں میں میرا ممنون ہو رہا تھا۔

جانے ہر شخص کو حادثات اور پے در پے واقعات یونہی پیش آتے ہیں جیسے میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ شاید میری ہی زندگی کی رفتار تیز تھی۔

○ میرے ہاتھ سے تیرا ہاتھ گیا

اور تن من اس کے ساتھ گیا

تو پاس نہیں تیری دید نہیں

کوئی خوشی نہیں میری عید نہیں

نہ دھرتی ہے نہ امبر ہے

دکھ کا اک گہرا ساگر ہے

جو آنسو آنکھ سے بہتا ہے

وہ اپنی زباں سے کہتا ہے

تو چھوڑ گیا مجھے یقین نہیں

یہیں پاس ہے پر کہیں نہیں

ایسا بھی نہیں تیری یاد نہیں

ہاں کچھ بھی تیرے بعد نہیں

میں تنہا ہوں، میں تنہا ہوں  
میں تنہا ہوں، میں تنہا ہوں O  
(شیریں حیدر)

ابو نے غالب کے فیجر صاحب سے کہہ کر وقتی طور پر دفتر کے کاغذات وغیرہ کی ذمہ داری خود سنبھال لی لیکن تمام تر کاروبار کی ذمہ داری فیجر صاحب پر ہی تھی اور خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ نوید صاحب بہت ایماندار اور جذبے اور لگن سے کام کرنے والے انسان تھے۔

عید بھی خاموشی سے گزر گئی۔ دن بھر لوگ پرسہ دینے آتے رہے۔ لوگوں کے آنے سے زخم تازہ ہونے لگتے ہیں اور عید والے دن ہی پرسہ دینے اعجاز بھی آ گیا۔ اس کے باقی اہل خانہ تو آتے رہتے تھے لیکن جو زخم اعجاز کو دیکھ کر تازہ ہوئے تھے ان کا مرہم کہاں تھا۔ سب لوگوں کو چائے پانی پلاتی ہوئی نگہت کا چہرہ مجھے بہت پرسکون لگا۔

”بھابی..... میں آپ سے بہت شرمسار ہوں۔“ اس نے تنہائی پاتے ہی مجھ سے کہا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں۔ آپ واقعی بہت عظیم ہیں۔ میں اپنی غلطی کا مداوا خود کروں گا۔“ میں اس کی بات کے جواب میں خاموش ہی رہی۔

”نگہت نے ماہ رخ کے ساتھ جا کر پبلک فون بوتھ سے فون کیا تھا۔ میں ہر کام ارجنٹ فیس پر جلد کروا کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کاغذات اور ٹکٹ لے آیا ہوں اور میں صرف ایک ہفتہ کے لیے آیا ہوں۔“ اس نے گویا میرے سر پر دودھماکے کیے۔

”نگہت!“ میں نے شام کو اس کے کمرے میں جا کر اس سے براہ راست بات چھیڑ دی۔ ”تم نے ماہ رخ سے کیوں بات کی؟“

”اور کس سے کرتی بھابی؟“ اس نے ناخنوں کو بستر پر رگڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے بات کی تھی..... اب دو ہی راستے تھے یا خود کو ختم کر لیتی یا اعجاز کو فون کرتی کیونکہ اب تو میری طبیعت بہت خراب رہتی ہے کسی دقت بھی یہ بھید کھل سکتا تھا۔“

”تمہیں اب بھید کھلنے کی فکر ہے، اس وقت تمہارا دماغ کہاں تھا جب تم اس بھید کی تخلیق میں مصروف تھیں؟“ میرا لہجہ آپوں آپ تلخ ہو گیا۔ ”مجھے اپنے راز میں شریک کر کے الجھن میں ڈال

دیا، میں کس سے بات کرتی؟ امی جان تو شاید اس عمر میں یہ صدمہ نہ سہا سکیں اور رہا تینور..... تو وہ شاید تم دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ میں کس سے مدد لوں، کس سے بات کروں۔ بات ہی اتنی رسوائی کی ہے۔“

”آپ اگر ٹھنڈے دل سے سوچیں تو اتنی رسوائی کی بات تو نہیں ہے آخر ہم میاں بیوی ہیں.....“ اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ میرا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔

”اچھا۔“ میں استہزائیہ ہنسی ہنسی۔ ”چلو میں موقع ملتے ہی امی جان کو بتا دوں گی کہ وہ ثانی بننے والی ہیں لیکن کم از کم اپنی سسرال میں ہی اپنی عزت رہنے دیتیں۔ تم نے وہاں جانے سے قبل ہی اپنے کردار کا غلط تاثر وہاں بھیج دیا۔“

”اعجاز کہتے ہیں ان کے گھر والے اتنے تنگ نظر نہیں ہیں۔“ وہ آہستہ سے گویا ہوئی۔ ”نگہت خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو..... ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ یہ بات تنگ نظری یا آزادی کی نہیں ہے۔ بات اخلاقی قدروں کی ہے۔ اگر اس نے نکاح کا کہہ کر سب کو نکاح پر آمادہ کر لیا تھا تو وہ اصرار کر کے رخصتی بھی کروا سکتا تھا۔“ میرا خون کھول رہا تھا۔ ”خدا نہ کرے کہ تم کبھی سسرال میں کسی کے طنز یا طعنوں کا نشانہ بنو۔“

میں اس کے کمرے سے غصے سے نکلی۔ برآمدے میں آ کر تخت پوش پر بیٹھی رہی پھر اسی طرح گرم حالت میں ہی اپنے کمرے میں آ گئی۔ امی جان میرے کمرے میں رکھے ایک طرف کے صوفے پر بیٹھی تسبیح گھمار ہی تھیں۔ ایک تسبیح وہ انگلیوں میں گھما رہی تھیں دوسری ان کی آنکھوں سے زار و قطار رواں تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور ایک سے مجھے ادراک ہو گیا کہ وہ میری اور نگہت کی گفتگو سن چکی ہیں حالانکہ وہ جلدی سونے کی عادی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ان کے قدموں میں آ بیٹھی اور سران کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ ان کے نرم شفیق ہاتھ میرے بالوں پر ہلکے ہلکے چہل قدمی کرنے لگے۔ ہم دونوں شاید صدیوں تک خاموش رہے۔ ”میں تو پہلے ہی کہتی تھی بیٹی.....“ ان کی آواز بھرا گئی۔ ان کا لہجہ شکوہ کناس تھا۔

”امی جان مجھے بہت دیر سے علم ہوا اور پھر میں کبھی کیا سکتی تھی۔ کس طرح بتاتی آپ کو جو اپنا جگر کا ٹکڑا کھو بیٹھی ہیں!“ میری آنکھیں بھی رواں ہو گئیں۔

”پرتو اپنے دل پر اتنے بڑے دکھ کے پہاڑ اکیلی اٹھاتی رہی۔“ انہوں نے رومال نکال کر

اپنے آنسو صاف کیے۔“ اعجاز کیا کہتا ہے کم بخت؟ ہماری عزت کا جنازہ نکالنے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔“

”وہ نگہت کو ساتھ لے جانے کو آیا ہے۔ اگلے اتوار کو اس کی واپسی ہے۔“ میں نے امی سے آہستگی سے کہا اور اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ امی حیران رہ گئیں۔

”ابھی تو اس کے بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا، اس کے باپ جیسا بھائی تھا، اگلی جمعرات کو اس کا چالیسواں ہے۔ کیا میں چالیسویں سے پہلے ہی اس گھر میں شادی کی تیاریاں شروع کر دوں؟ کیا ہو گیا ہے ان سب کی عقلوں کو؟“

”امی جان! اگر ہم ان چیزوں کو دیکھتے رہے تو پھر ہماری عزت بھی اس کی رخصتی سے قبل رخصت ہو جائے گی۔ بہتر ہے لوگوں کے منہ کھلنے سے قبل ہی یہ معاملہ منٹ جائے اور جب یہ ہوتا ہی ہے تو کل کا ہوتا آج کر دیں۔“ میں نے امی کو سمجھایا۔ ان کو میں نے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ ”وہ بھی دھوم دھڑکا نہیں چاہتے۔ ہم نے بھی نکاح پر اچھا خاھا فٹکشن کر دیا تھا جو نگہت کو دینا دلانا ہے دے کر خاموشی سے رخصت کر دیں۔“

”بیٹی میرا تو دل پھٹا جا رہا ہے، میں نے اپنی بیوگی اور بیٹے کی جواں مرگی کا صدمہ بھی شاید جھیل لیا ہے، لیکن یہ صدمہ تو میری جان لے لے گا۔“ امی جان کی طبیعت کافی خراب ہو رہی تھی۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ بھاگ بھاگ ان کے کمرے سے جا کر بلڈ پریشر کی گولی لے کر آئی اور ان کو اپنے بیڈ پر لٹا کر ہلکا سا کبیل اوڑھادیا۔ خود میں صوفے پر لیٹ گئی اور جاگتی آنکھوں سے خوفناک سنے دیکھنے لگی۔ کبھی دہنی رو بھٹک کر کہیں چلی جاتی۔ آج تک مجھے اپنے ہاتھ پر سوتے میں غالب کے ہاتھ کا وہ آخری سر دس یاد آتا ہے۔ آج تک دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ غالب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔

تیور کو ٹیلی گرام دے کر بلایا گیا۔ اصل بات کا تو اس کو علم ہی نہ تھا لیکن اس قدر اچانک یہ سب کچھ.....؟ اس کا ذہن اس بات کو ماننے پر تیار ہی نہ تھا کہ اعجاز کو اتنی بھی مجبوری ہو سکتی ہے۔

نگہت، ماہ رخ کے ساتھ جا کر اپنی شاپنگ کر رہی تھی۔ زیور پہلے سے بنا ہوا تھا۔ باقی کپڑے لے ہی اسے بنوانے تھے جو دو تین دن میں شاپنگ مکمل کر کے مختلف درزیوں کو ار جنٹ سلائی کے لیے دے آئی تھی۔ امی ان دنوں زیادہ تر اپنی عبادت میں ہی مصروف رہتی تھیں۔

غالب کے چالیسویں پر جو بھی رشتے دار آئے جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق ہر کسی نے حسبِ توفیق نگہت کی رخصتی کے فیصلے پر تنقید کی۔ کسی نے بظاہر کہا ”چلو اچھا ہے بیٹی کا فرض ہے سادگی سے منٹ جائے“، تو کسی نے کہا ”چار چھ مہینے اور صبر کر لیتے، چلو لڑکی لڑکے کے ساتھ نہ جاتی بعد میں چلی جاتی، نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔“ غرض ہم نے اپنی ایک خاموشی رکھی۔ امی جان نے چند ایک چنیدہ رشتے داروں کو بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر وداع کرنے کی زبانی دعوت دے دی۔

چالیسویں کی شام گھر پہلے سے زیادہ ویران لگ رہا تھا۔ میں برآمدے والے تخت پوش پر رات دیر تک بیٹھی تفکرات میں گم رہی۔ دن بھر کے خیالات، لوگوں کی باتیں، عورتوں کے محبوب موضوعات، فیشن اور رشتے..... گزرا ہوا ماضی، آنے والا وقت ہر چیز نظروں کے سامنے سے کسی فلم کی طرح گزر رہی تھی۔ موسم بھی بدل رہا تھا۔ برآمدے میں خنکی محسوس ہونے لگی۔ تب ہلکے سے ایک سایہ آیا، وہ تیور تھا۔ ”آؤ تیور، بیٹھو.....“ میں نے تخت پوش کی ایک طرف کھسک کر کہا۔

”بھابی آپ اتنی موٹی تو نہیں ہیں نہ ہی مجھے بیٹھنے کو اتنی جگہ چاہیے۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بچھا کر بیٹھ گیا۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی بھی ٹھٹھری ہوئی لگ رہی تھی۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں بھابی؟“ تیور نے گویا وضاحت چاہی۔ ”یہ یکدم اتنی تبدیلیاں اتنے بڑے بڑے فیصلے..... میں سمجھتا تھا کہ شاید اس گھر میں میری بھی کوئی اہمیت ہے؟“ میرے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ شکر ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے واضح نہیں دیکھ سکتے تھے۔

”بعض فیصلے حالات کے تحت فوری کرنا پڑتے ہیں۔“ میرے منہ سے یکدم نکل گیا۔

”کیا حالات اتنے برے ہو گئے ہیں کہ ہم نگہت کی شادی کے لیے ایک سال کا بھی انتظار نہیں کر سکتے؟ کیا اتنی سادگی اور اتنی خاموشی سے رخصت ہونا ہم تین بھائیوں کی بہن کے مقدر میں حالات نے لکھ دیا ہے؟“ تیور کا لہجہ گویا احتجاج لیے ہوئے تھا۔

”اپنے مقدر میں یہ تاریکی تو اس نے خود گھولی ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اب وہ تین نہیں دو بھائیوں کی بہن ہے اور مقدر کی ڈور تو بنانے والے نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ ہر کسی کا مقدر جدا جدا، میرا ہی دیکھ لو۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا بھابی، وہ اب شرمسار لگ رہا تھا۔“ ویسے ایمان سے مجھے اب تک یہ کہنا مشکل لگتا ہے کہ ہم دو بھائی ہیں۔ سچائی یہی لگتی ہے کہ ہم اب بھی تین ہیں۔ اب جو حقیقت

ہے اس سے نظر چرانے کو دل چاہتا ہے۔“

”نظریں چرانے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔“ میں نے سوگواری سے کہا۔

”خود کو سنبھالیں بھائی!“ اس نے عادت کے مطابق اپنا بھاری ہاتھ میرے سر پر رکھ کر کہا۔ ”اب آپ میں ہی ہمیں غالب بھائی نظر آتے ہیں۔ آپ ہی ہمارا سب کچھ ہیں۔ غالب بھائی کے جانے سے ہونے والا خلا بھی اب آپ ہی کو بھرنے ہے۔ امی کو بھی سنبھالنا ہے اور مظہر کو ماں اور باپ، بھائی اور بہن، دوست سب کا پیار دینا ہے۔“

دو ہی دن بعد نگہت کو رخصت ہونا تھا۔ چھوٹے پیمانے پر دعوت کا انتظار اعجاز کے گھر میں ہی تھا۔ ہم نے دوپہر کو نگہت کو گھر سے آہوں اور سسکیوں سے دواغ کیا۔ امی جان نے ہولے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور منہ پھیر کر رونے لگیں۔ میرے سینے سے لگی وہ دیر تک روتی رہی۔ نگہت اور اعجاز کی فلائٹ سے قبل ان کے ہاں کھانا تھا۔ امی جان نے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر انکار کر دیا۔ علی بھائی، ابو، والدہ، تیمور، مظہر اور آٹھ دس رشتے دار گئے۔ میں بھی عدت کی وجہ سے نہیں جاسکتی تھی۔ ایئر پورٹ جاتے ہوئے راستے میں نگہت اور اعجاز مجھے اور امی جان کو گھر پر ہی ملنے کے لیے آگئے۔ امی جان نماز پڑھ رہی تھیں اور میں اپنی تنہائی رول رہی تھی۔ امی جان نے سلام پھیر کر دونوں کے سر پر سری سا ہاتھ پھیرا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر دوبارہ نماز شروع کر دی۔

نگہت کی مستفسرانہ نظریں میری طرف اٹھیں تو میں نے سر جھکا لیا۔ اس پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سب نے اسے زبردستی گاڑی میں بٹھایا اور لے گئے۔ جانے مجھے یکدم یوں محسوس ہوا جیسے اسے کبھی واپس نہ لانے کے لیے لے گئے ہیں۔ شاید گھر سے ڈولی اور جنازہ اٹھنے کا منظر ایک ہی ہوتا ہے، ایک آدمی جاتا ہے اور لگتا ہے کہ سارا گھر ویران ہو گیا ہے۔ ایک کے آنے کی آس تو ہوتی ہے، پر دوسرے کے لیے تو آس کی ڈور بھی توڑنی پڑتی ہے۔

ڈولی بھی آنسوؤں کے سائے میں اٹھتی ہے، تو جنازہ آہوں اور سسکیوں کے ساتھ۔ مرنے والا بھی ایک جیون مرکروں میں شروع کرتا ہے، ابدی جیون۔ ڈولی میں جانے والی بھی ایک دنیا تیاگ کر دوسرا جیون شروع کرتی ہے۔ دونوں سفر پر خار ہیں، بل صراط بھی پار کرنا پڑتا ہے، ہر اچھے

برے عمل کا حساب کتاب دینا ہوتا ہے۔

میں نے بیوگی کی سفید چادر جو غالب کے بعد سے اوڑھی تھی اسی پر قائم تھی۔ عدت ختم ہوئی تو والدہ اور ابو مجھے لینے کو آگئے اور میں یہ سوچ کر ہی ہول گئی کہ یہ گھر جس کے چپے چپے پر غالب کی یاد کی روشنی ہے اس گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔ میرا مان میری ماؤں جیسی ساس نے رکھ لیا۔

”بہن جی، یہ تو میرے گھر کا نور ہے۔ ہمارے گھر میں اندھیرا نہ کریں، مجھے یہ نگہت سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اگر اس گھر میں اسے کوئی تکلیف ہوئی تو میں اسے کبھی نہیں روکوں گی۔ جم جم جانے، آپ کے ہاں لیکن عزت یہ میرے گھر کی ہے۔ آپ کا مجھ کا تپن پر یہ بڑا احسان ہوگا۔“

”آپ کی باتیں بجا آپا جان۔“ والدہ نے نخل سے کہا۔ ”لیکن ابھی مناسب ہوگا کہ یہ ہمارے ساتھ چلے، کچھ دن وہاں رہے تو جگہ کی تبدیلی سے بھی فرق پڑے گا۔“

”تھوڑی سی رد و کد کے بعد میں نے اپنے ہمراہ کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بیگ لیا اور والدہ کے ساتھ میکے آگئی۔ وہاں آ کر یوں ہی لگا جیسے کسی مفتوح ریاست کا ہار اہو بادشاہ۔ مجھے اپنا وجود بہت خالی بہت اکیلا اکیلا سا لگا۔ اپنے کمرے کے حوالے سے غالب کی یادیں، اب یہی تو میرا سر مایہ ہے۔ دوسرے دن صبح کا اخبار پڑھ رہی تھی کہ ابو آگئے۔ ”بیٹا آپ کے کالج میں آپ کے سبیکٹ کیا تھے؟“

”آپ بھی تو جانتے ہیں ابو.....؟“ میں ان کا سوال نہ سمجھی۔ ”اکنا کس اور نفسیات۔“

”ہوں۔“ ابو نے ہنکارا بھرا، ”جانتا ہوں..... اصل میں بیٹا چاہ رہا تھا کہ یا آپ مزید تعلیم حاصل کریں تاکہ آپ کا دل بہلا رہے یا پھر جو تعلیم حاصل کی ہے اس کا فائدہ اٹھائیں۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں نوکری کر لوں۔“ میں حیران رہ گئی۔

”نوکری بھی ہو سکتی ہے اگر ضرورت ہو تو..... لیکن بیٹا آپ کا تو اپنا جما جمایا کاروبار ہے۔“ ابو نے جواب دیا۔ ”اگر آپ دلچسپی لیں تو کاروبار سنبھال سکتی ہیں۔“

”میں اور کاروبار۔“ میرا لہجہ اپنی ہنسی اڑا رہا تھا۔ ”ابو کاروبار مردوں کے بس کا ہی روگ ہے اور پھر آپ جو ہیں۔ میں ان جھیلوں میں نہیں پڑ سکتی۔“

”بیٹا میں نے آپ لوگوں کی وقتی تکلیف اور مرحوم دوست کی دوستی کی خاطر چار ماہ سے یہ کبھی ٹراگلے میں ڈال رکھا ہے۔ اصل میں تو یہ ذمے داری تیمور کو اٹھانی چاہیے تھی۔ میں تو مستقلاً یہ کر

بھی نہیں سکتا۔ میرا اپنا بھی کاروبار ہے اور پھر آپ بیٹی ہو، دیکھنے والی دو آنکھیں ہوتی ہیں لیکن بات کرنے والوں کے دس منہ ہوتے ہیں۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ بیٹی اور داماد کے کاروبار پر قبضہ جمارکھا ہے۔“ ابو بولے۔

”نہیں ابو..... میں گھگھائی۔“ ایسے بھلا کوئی کیوں سوچے گا؟ جب ہمیں کوئی مسئلہ نہیں تو آپ لوگوں کی باتوں کی فکر نہ کریں۔“

”نہیں بیٹا! یوں نہیں چلے گا۔ آپ لوگ اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔“ ابو نے گفتگو کو آخری موڑ دے دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

میرے پاس کیا حل ہوتا اس مسئلے کا؟ الٹا یوں محسوس ہوا جیسے ایک نیا بکھیرا گلے پڑ گیا ہو۔ ہر وقت ذہن الٹی سیدھی سوچوں سے پرانگندہ رہتا۔ اپنے طور پر ہی کوئی نہ کوئی حل نکالنے کی کوشش میں سرگرداں تھی۔ کبھی تیور کا نام ذہن میں آتا تو اس کا شوق اور لگن دیکھ کر خود ہی سوچنے پر مجبور ہوتی کہ مجھ پر اسے اتنا مان تھا کیا میں اسے کہوں کہ آرمی چھوڑ کر کاروبار سنبھالو۔ مظہر تو اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ کیا نوید صاحب پر اتنا اعتماد کیا جاسکتا تھا کہ کسی سرپرستی کے بغیر پورے کاروبار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی جاتی اور میں خود کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے تو غالب کے بغیر سانس لینا، کھانا پینا سب فالٹو لگتا تھا۔ سانسیں ابھی تک غالب، غالب کا در کرتی ہیں۔“ والدہ! آپ ابو کو سمجھائیں۔“ میں نے ایک روز والدہ کو پکڑ لیا۔

”نہیں بیٹا!“ والدہ نے رسائیت سے کہا۔ ”تم بھلا دنیا داری کو کیا جانو۔ ابھی چاردن کی تو تمہاری عمر ہے پھر شادی کے بعد بھی تمہارا واسطہ اچھے لوگوں سے پڑا، خدا ان کو ہمیشہ اچھا رکھے۔ اس لیے حالات کے اتار چڑھاؤ کو تم سمجھ ہی نہیں پائیں۔ ہمیں تو تمہارے دکھ نے جیتے جی مار ڈالا لیکن ہم یہ کب چاہیں گے کہ کسی بات کو بنیاد بنا کر لوگ بے جا انگلیاں اٹھائیں۔“

”لیکن والدہ! جب ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا تو لوگوں کو کیا پڑی ہے؟“ میں گھگھگھائی۔

”اور ہم کون سا لوگوں کے حالات کی ٹوہ میں رہتے ہیں جو لوگ ہمارے بارے میں باتیں کریں۔“

”تم ابھی نادان ہو بیٹا۔“ والدہ نے کہا۔ ”دنیا میں سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو شر پسند ہوتے ہیں ان کا کام صرف باتیں چنا اور ان کو بکھیرنا ہوتا

ہے۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر وہ اپنے مردہ ضمیر کو گرم رکھتے ہیں۔“

”پر والدہ اگر ان حالات میں آپ لوگ ہی پیچھے ہٹ جائیں گے تو ہم کس سے اچھے رویے کی توقع کریں گے؟“ میں واقعی رو پڑی۔ والدہ نے مجھے ساتھ لگایا اور میرا سر ہلکے سے سہلانے لگیں۔ یہ والدہ کی پرانی عادت تھی۔ اس سے وہ ہمیں آرام سے قائل کر لیا کرتی تھیں۔

مہینہ مہر بھی نہ ہو پایا تھا کہ امی جان کا فون آ گیا۔ ”بیٹا واپس آ جاؤ تمہارے بغیر یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور مظہر چلا جاتا ہے تو میں بالکل تنہا ہو جاتی ہوں۔“ ان کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے ان سے واپسی کا وعدہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں پروگرام بنا کر انہیں بتا دوں تاکہ وہ مظہر کو بھجوا دیں۔

”میں خود آ جاؤں گی امی جان۔“ میں نے کہا تو ان کے پیارے بھرے لہجے کی ڈانٹ سننا پڑی۔ ”نہیں بیٹا، ہمیں بھائیوں کے ہوتے ہوئے اکیلی خوار ہوں۔“

اے رب.....! پالن ہار..... تیری ذات باکمال، تو نے اتنا کچھ دیا پھر ہمارے اندر داغ پیدا کیا، جو یہ پوچھنے سے باز نہیں آتا کہ وہ کیوں نہیں دیا..... یہ کیوں نہیں دیا۔ بستر تو وہی ہوتا ہے جس پر لڑکپن میں خوب خوب نیند آتی ہے، اکیلے ہی اپنے خوابوں کے ہمراہ، پر ایک دفعہ شادی شدہ زندگی گزار لو تو وہی بستر، تنہائی میں کانٹوں کی سیج کیوں بن جاتا ہے.....؟

گھر واپس آئی تو یادوں کے سنگریزے ہمہ وقت آنکھوں میں چبھتے رہتے گویا کسی نے مجھے تنہائیوں کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ امی جان کی تسلیاں، دلا سے اور مظہر کی باتیں جو معصوم ہوتیں وہ بھی پھاہے رکھنے میں ناکام ہو جاتیں۔ مظہر اب بہت کوشش کرتا کہ وہ بڑوں جیسی باتیں کرے لیکن اس کے لہجے کی بناوٹی پختگی بعض اوقات مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیتی۔ تیور جب بھی فون کرتا چند باتوں کے بعد اس کی آواز بھرا جاتی اور وہ اپنے لہجے پر لاکھ قابو پانے کی کوشش کرتا تب بھی ہمیں رلا دیتا۔ اس کی ٹریننگ بہت سخت تھی اور چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ یہاں تک کہ کئی دفعہ دو تین ہفتوں تک فون کرنے کے لیے بھی باہر آنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ فی الوقت ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ کاروبار سنبھالنے کا تھا۔ اب تک نوید صاحب ہی نظام چلا

ہیں۔ کیوں بھابی اگر ہم یوں سنجیدہ اور روتے رہیں گے تو کیا غالب بھائی واپس آجائیں گے؟“ تیمور بول رہا تھا تو میں سسک پڑی۔ ”کیا ہم اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کر پائیں گے کہ جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ کیا ہم سب باقی زندگی یوں ہی روتے روتے گزار دیں گے؟“ وہ بولے جا رہا تھا اور خود رو بھی رہا تھا۔ ساتھ میں ہم بھی یوں ہی رو رہے تھے جیسے ابھی غالب کا جنازہ اٹھا ہو..... ”رو لیں..... پلیز رو لیں اور جتنا رو سکتے ہیں رو لیں سارے آنسو بہا لیں لیکن خدا را اس کے بعد اس سلسلے کو بند کریں، دروازے اور کھڑکیاں کھولیں اس گھر کے تاکہ کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا، کوئی نوید، کوئی خوشی کی رقعہ آئے.....“ ایک طویل خاموشی کا سلسلہ ہم سب کے درمیان در آیا..... آنسو بہت بہہ چکے تو میں نے ٹھہرے ہوئے ماحول میں گویا کنکری پھینکی۔

”چلو اٹھو تیمور منہ ہاتھ دھولو..... کھانا تقریباً تیار ہے۔“

اگلے دن تیمور نے ناشتے کی میز پر حکم جاری کیا..... ”ناشتے کے بعد سب تیار ہو جائیں، پہلے بھابی کی امی کے گھر چلیں گے پھر کچھ شاپنگ کریں گے اور پھر دوپہر کا کھانا باہر کھا کر گھر واپس آئیں گے۔“ ہم سب نے بے چون و چرا سر تسلیم خم کر دیئے۔ ناشتے کے برتنوں سے فارغ ہوئی تو صفائی والی مائی آگئی۔ ڈسٹنگ کے لیے کپڑا لیا اور اس سے قبل کہ میں ڈسٹنگ شروع کرتی تیمور نے میرے ہاتھ سے کپڑا چھین لیا۔ ”بھابی..... لگتا ہے آپ نے میرا آرڈر نہیں سنا؟“

”کون سا آرڈر حضور؟ اور یہ آپ آرڈر دینے کی پوزیشن میں کب سے آگئے؟ میں تمہاری بڑی بھابی ہوں.....“ میں نے سنجیدگی میں مزاحیہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”دیکھیں بھابی میں آپ سے عمر اور قد دونوں میں بڑا ہوں اور ویسے بھی.....“ وہ ذرا انک سا گیا۔ ”میں اب بڑا تو ہوں ناں؟“ میں پھر شپٹا گئی، بکل ہی تو ہم نے رونا دھونا ختم کرنے کے بعد عہد کیا تھا کہ اب ہم ہر ممکن زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں گے۔ یہ تو ہم سب کا مشترکہ عہد تھا لیکن وہی دل میں تو ہر ایک نے ایک علیحدہ ہی فیصلہ کیا ہوگا جیسے میں نے سوچا تھا کہ اب سب کے سامنے آنسو نہیں بہاؤں گی۔ رات کی تنہائی ہی میرے لیے کافی ہے، میرا اکرا، میرا بستر، غالب کی تصویریں، ان کی یادیں..... ان سب کے ساتھ جب تنہا ہوں گی تو رولیا کروں گی کہ مجھے تو تمام عمر رونا ہی تھا، اگر غالب کی کوئی ”نشانی“ میرے پاس رہ جاتی تو میں اس کے سہارے اپنے تمام غم

رہے تھے لیکن یہ سچ ہے کہ کسی کی سرپرستی کی ضرورت تو تھی۔ کئی دفعہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوچا کہ تیمور کو واپسی کا کہوں اور یہی امی جان کی بھی رائے تھی لیکن پھر تیمور کی لگن دیکھ کر خاموش رہتی۔

تیمور ٹرم بریک پر گھر آیا تو میں بچن میں تھی، مگر کراسے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ پہلے سے کافی کمزور لگ رہا تھا۔ سلام دعا کا تبادلہ ہوا، وہ ہونٹوں کی طرح مجھے گھورے جا رہا تھا۔ ”آپ کو کیا ہوا بھابی؟“

”کیوں، کیا ہوا مجھے..... کیا ایسا غلط نظر آیا مجھ میں تمہیں؟“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”آپ تو ڈھانچا بن گئی ہیں، میری پیاری بھابی تو کبھی ایسی نہ تھیں۔“ اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا خلوص تھا اور میری آنکھوں سے بن بادل برسات شروع ہو گئی۔ تیمور نے مجھے دونوں کندھوں سے تھما اور ٹی وی روم میں امی جان کے پاس لا بٹھایا۔

”دیکھیں امی بھابی نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟“

”ہوں.....“ امی جان نے نتیجے کے دانے گھماتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ ”وہ کیا حال بنائے گی بیٹا، یہ روگ تو قدرت نے اس کے مقدر میں لکھ دیا ہے!“ امی جان ابدیدہ ہو گئیں۔

”پرائی“ وہ شپٹا گیا۔ ”کیا بھابی کھانا نہیں کھاتیں؟“

”کھانا تو بھابی کھاتی ہیں تیمور بھائی لیکن.....“ مظہر گویا ہوا۔ ”لیکن خوشی اور طمانیت کا جو رنگ بھابی کے چہرے پر بھائی جان کی زندگی میں جھلکتا تھا وہ اب ناپید ہے۔“ مظہر نے اپنی نقل تشریح کی کہ تیمور کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے مظہر کی ناک کو چٹکی میں پکڑا۔

”پر یہ تو کب سے اتنا فلاسفر ہو گیا ہے..... گدھے۔“

”جب سے بھائی جان کی وفات اور آپ کے گھر سے روانگی کے باعث اب امی جان اور بھابی کی تمام ذمے داری کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر پڑا ہے۔“ مظہر نے پھر وضاحت کی تو امی جان نے بے ساختہ اس کا سراپے کندھوں سے لگا لیا۔

”تم بھی تو کتنے کمزور ہو گئے ہو۔“ میں نے تیمور سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ارے نہیں بھابی، میں کمزور نہیں طاقتور ہو گیا ہوں۔ البتہ محنت و مشقت کے باعث ”وہ“

ہو گیا ہوں۔ کیا کہتے ہیں اسے.....؟“ تیمور کو مناسب لفظ نہیں مل رہا تھا۔

”خیف و زار تیمور بھائی!“ مظہر نے راہ بھائی تو ہم سب کو ہنسی آگئی۔

”امی کیا ہم سب یوں نہیں رہ سکتے؟ کیا ہماری کھوئی ہوئی مسکراہٹیں واپس نہیں آسکتی

بھول جاتی لیکن بہت سی باتیں تو ایسی ہیں جہاں لاکھ کوشش کروں کچھ کر نہیں سکتی۔

چوڑیاں تو کیا میں نے تمام زیورات اناڑ پھینکے ہیں۔ کانوں کی بالیاں غالب کی سرگوشیاں یاد دلاتی ہیں تو ننگن غالب کی قربت، جب وہ میرے پہلو میں میری کلای کے ننگن کو عادتاً خواہ مخواہ ہی گھماتے رہتے تھے اور وہ لاکٹ جس پر غالب کا اپنا نام تھا انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پہنایا تھا اور کہا تھا۔ ”آج میں نے تمہیں پکا پکا اپنے ساتھ باندھ لیا ہے۔“ سواتی یا دوں اور اداسیوں کا ازالہ یونہی ممکن ہے کہ ہر شے میں نے اتار کر رکھ دی اور رات کو ہر شے بستر پر پھیلا کر اپنی یادیں تازہ کرتی۔ ”تم اس رنگ میں نازک کلی جیسی لگتی ہو..... اس رنگ میں گلاب کا تازہ پھول لگتی ہو..... اس رنگ میں اپسرا دکھتی ہو..... خاک کی رنگ میں تو تم دھرتی کا ایک ٹکڑا لگتی ہو..... کالا رنگ پہن تو یوں لگتا ہے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہو۔“

غرض ایسی ہی باتیں غالب کی مجھے یاد آتیں تو مجھے رنگ پہننا مشکل محسوس ہونے لگا اور ہوتے ہوتے کچھ یوں ہوا کہ مہینوں ہی میں، میں نے ہلکے بلکہ زیادہ تر سفید اور آف وائٹ رنگ پہننا شروع کر دیے تھے اور واقعی شاید حقیقت ہے کہ رنگ آپ کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں نے جونہی شوخ رنگ پہننا چھوڑ دیے تھے میری شوخی کی ساری حسیں جو غالب کے جانے سے یوں ہی سو گئی تھیں اب گویا مری گئی تھیں اور اپنے اندر بزرگی کا احساس اتنی سی عمر میں اتر آیا تھا۔ ”میرا تو خیال ہے کہ میں بڑی ہوں تم سے۔“ میں نے تیمور کو جتلیا۔

”جی ہاں آپ بڑی ہیں رشتے میں، مرتبے میں اور جو مرتبہ آپ کا ہمارے دلوں میں ہے اس میں..... لیکن کچھ ایسا ہے ناں بھابی کہ ہمارے معاشرے میں مرد کو ہی بڑا سمجھا جاتا ہے۔“ اس نے یکدم موضوع بدلا ”لیکن اگر آپ اس بحث کو چھوڑیں اور جلدی سے تیار ہو جائیں.....“

”چھوڑو تیمور۔“ میں نے جیل و جت کی۔ ”گھر میں ہی جو تم کہتے ہو میں پکا لیتی ہوں۔“ ”ہاں بیٹا تیمور کل ہی تمہاری واپسی ہے۔ دو دن کی چھٹی میں سے بھی اگر سارا وقت یونہی نکل گیا تو..... مجھے تم سے کوئی ضروری بات بھی کرنی تھی۔“ امی جان نے آکر غالباً میرا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں تیمور، مجھے بھی تم سے ایک ضروری بات بلکہ تم سے کیا سبھی سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ مجھے یکدم ہی کچھ یاد آ گیا۔

”بات تو مجھے بھی آپ سے بے حد ضروری کرنی ہے لیکن سب ضروری باتیں شام کو، اس وقت کی ضروری بات صرف اور صرف جانے کی تیاری، اور مجھے اب کچھ نہیں سننا!“ تیمور نے حتیٰ فیصلہ دیا میں پلیز پلیز کرتی رہ گئی۔ تبھی مظہر سفید کلف لگے جوڑے میں تیار ہو کر آ گیا۔

”چلیں جی میں تو تیار ہوں۔“ اور اس کے اس انداز پر ہم سب کو ہنسی آ گئی۔

”کیوں بے!..... تو بروکھوے کو جا رہا ہے کہیں؟“ تیمور نے اس سے مذاق کیا۔

”تیمور بھائی میں تو آپ کے کہنے پر تیار ہوا ہوں..... اگر نہ ہوتا تو آپ کہتے کہ میں نا فرمان ہوں۔“ ازلی مصوویت سے مظہر بولا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔

”باز آؤ تیمور تم اپنی حرکتوں سے کیوں میرے بھائی کو تنگ کرتے ہو؟“ میں نے اس کا دفاع کیا جس پر اس کی ہمت بندھی۔ تب امی جان نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور مجھے بھی تیاری کا کہہ کر خود تیار ہونے چل دیں، اب میرے پاس بھی کوئی چارہ نہ تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے امی جان کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ وہ جلدی کے باعث اپنی دوا ساتھ رکھنا بھول گئی تھیں۔ سو ہم کھانا جلد ختم کر کے لوٹ آئے۔ امی جان کو دوا اور ٹھنڈا دودھ پلا کر میں نے بستر پر لٹا دیا۔ ٹی وی روم میں مظہر اور تیمور بیٹھے تھے میں بھی وہیں آ بیٹھی۔ دونوں کوئی پرانا میچ دیکھ رہے تھے۔ ”تیمور، میں نے صبح کہا تھا ناں کہ مجھے ایک ضروری بات کرنا ہے.....“ میں نے تمہید باندھی۔ تیمور نے میز سے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا اور دونوں بھائی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مجھے بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے میں چند سیکنڈ لگ گئے تو مظہر کا چہرہ پریشانی عیاں کرنے لگا۔

”بھابی..... کہیں آپ یہ گھر چھوڑ کے جانے کے بارے میں تو؟“ اس کی پریشانی کو الفاظ مل گئے۔ میری آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔

”ارے نہیں چاند..... تم نے جیسی پیاری زنجیروں میں مجھے باندھ رکھا ہے۔ میں ان کو کھول کیسے سکتی ہوں..... کیسے چھوڑ سکتی ہوں اس گھر کو، شاید چاہوں بھی تو نہیں چھوڑ سکتی۔“ اس پر مظہر کے گویا شکر کا سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ میں نے مزید تجسس پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔



”تیور اور مظہر! غالب کو اس دنیا سے گئے آج سات ماہ ہو گئے ہیں اور میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ ہم سب نے مل بیٹھ کر آج تک یہ نہیں سوچا کہ اس گھر کی ناؤ کا چاراب کن ہاتھوں میں ہو؟ تیرے تو فوج میں چلے جاؤ گے، مظہر ابھی فرسٹ ایئر میں ہے جانے اس کی منزل کب اور کہاں ہے.....“ میں نے ذرا خاموشی کا وقفہ دیا تو دونوں کے جھکے ہوئے سر ایک ساتھ اٹھے اور ان کی نگاہوں میں واضح سوال تھا۔

”میرا مقصد کاروبار سے ہے۔“ میں نے بہت سادگی سے اصل مدعا بیان کر دیا۔

”وہ تو انکل دیکھ رہے ہیں ناں بھابی..... تو مسئلہ کیا ہے؟“ تیور نے استفسار کیا۔

”نہیں تیور۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”کاروبار تو اب نوید صاحب کے سر پر ہی ہے، ابو نے تو تین مہینے ہونے کو ہیں مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اس ذمے داری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔“

”تو گویا۔“ تیور اس انکشاف پر بہت حیران تھا۔ ”کاروبار مکمل طور پر نوید صاحب ہی سنبھال رہے ہیں..... لیکن بھابی یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ وہ لاکھ ایماندار سہی لیکن آدمی کی نیت بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔“

”اسی لیے تو میں بات کر رہی ہوں کہ کوئی تو ہو، تا کہ نوید صاحب کو بھی احساس ہو کہ وہ کسی کو جواب دہ ہیں۔“ میں نے اس کی بات کو ٹوک کر کہا۔

”لیکن میرے سامنے تو انکل سے زیادہ مناسب آدمی اس کام کے لیے اور کوئی نہیں تھا پھر انہوں نے.....“ تیور کی بات کو پھر میں نے ٹوکا۔

”ابو کی اپنی مجبوریاں ہیں تیور اور پھر یہ ہماری تمہاری ذمے داری ہے۔ ان کی عراب اس طرح کے بوجھ اٹھانے کی نہیں۔“ میں نے ابو کی صفائی پیش کی۔

”لیکن میرا تو ذہن ماؤف ہو گیا ہے بھابی..... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ مظہر اس دوران بالکل خاموش ہی بیٹھا تھا۔ ”میرے پاس تو اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے کہ میں.....“ تیور نے اسی طرح سر پکڑے ہوئے کہا۔

”مگر میرے پاس اس مسئلے کا ایک حل ہے۔“ میرا اتنا کہنا تھا کہ دونوں بھائی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ”میرا مطلب ہے کہ میری نظر میں کوئی ہے تو لیکن امی جان کو منانا آپ کا کام ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ بتائیں تو.....“ تیور یکدم بے تاب ہو گیا۔

”میں..... میں خود“ میں نے گویا ان کے عین سروں پر دھماکا کر دیا تھا کیونکہ مظہر کا تو حقیقتاً منہ پورا کھل گیا اور تیور یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نہیں بھابی.....“ تیور گویا ہوا ”یہ کاروبار میں خود سنبھالوں گا۔“

”یہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گی تیور کہ تم اپنی خواہش کو گھر کی ضرورت پر قربان کر دو، اگر تم مجھے کمزور عورت سمجھتے ہو تو وہ الگ بات ہے، ہم کسی اور کا سوچیں گے۔ لیکن مجھے یہ دکھ ہے کہ مجھے اس معاملے میں مخالفت کی امید فقط امی جان کی طرف سے تھی۔ چلو بہر حال..... زندگی میں سب کچھ حسب توقع تو ہوتا بھی نہیں ہے۔“ میں نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

”تیور بھائی، ٹھیک ہی تو ہے آخر بھابی پڑھی لکھی ہیں..... اور پھر اس مصروفیت سے ان کا صدمہ اور دکھ کچھ کم ہو گا۔ ذہن دوسری باتوں میں مصروف ہو گا تو شاید بھابی خود ہی آہستہ آہستہ سنبھل جائیں۔“ مظہر نے سو باتوں کی ایک بات کی تھی۔ میں نے فوراً مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس نے بے ساختہ میرے ہاتھ پکڑ کر نعرہ بلند کیا۔ ”بھابی..... زندہ باد.....!“ تیور بالکل خاموش رہا۔

”اس بات پر ہو جائے ایک ایک پیپی..... میں خود لے کر آتا ہوں۔“ مظہر چلا گیا تو میں نے تیور سے پوچھا۔

”تیور تم صبح جانے سے پہلے امی جان سے بات کرو گے ناں؟“ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔

”تیور میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

”ٹھیک ہے بھابی، لیکن آپ کو کاروبار کی کیا سمجھ بوجھ ہے؟“ اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

”سمجھ بوجھ تو جب سر پر پڑے گا تو آتی جائے گی، لیکن اصل مسئلہ تو ہماری انوالومنٹ کا ہے۔ لیکن یہ کاروبار میرے پاس تم دونوں بھائیوں کی امانت ہو گا..... جب بھی تم دونوں میں سے کوئی اسے سنبھالنے کے قابل.....“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تیور نے میرے دونوں کندھے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔

”پلیز! بھابی یہ آپ نے سوچا بھی کس طرح؟ اتنی غیریت کی بات کرنے کا آپ کا حوصلہ کیسے پڑا..... آپ اور ہم، آپ ہم سے کچھ الگ چیز ہیں۔ خدا کے لیے آئندہ کبھی ایسی بات سوچئے گا بھی نہیں..... آپ تو ہمارے غالب بھائی کی اکلوتی نشانی ہیں ہمارے پاس.....“ تیور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”پپسی حاضر ہے تیور بھائی۔“ مظہر پپسی کے تین گلاس لے کر آگیا تھا۔ ”لیکن یہ تازہ تازہ وعدے کی وعدہ خلافی ہو رہی ہے۔“ اس بات پر تیور سنبھل گیا اور منہ ہاتھ دھو کر واپس آنے کا کہہ کر اندر چلا گیا۔

دوسرے روز دوپہر کے کھانے کے بعد تیور کی واپسی تھی۔ میں دانستہ تمام وقت کچن میں ہی تھی تاکہ تیور امی جان سے بات کر سکے۔ مظہر کالج گیا ہوا تھا۔ تیور دو تین دفعہ کچن میں آیا اور اصرار کیا کہ میں کچن سے نکلوں لیکن میں ”بس ابھی آئی“ کہہ کر پھر مصروف ہو جاتی رہی۔ مظہر کے آنے تک کھانا میز پر لگا کر میں ہاتھ دھو کر فارغ ہو گئی۔ تیور واپسی کے لیے تیار تھا۔ امی جان نے اس کے لیے موسی پھل، مٹھائی، بسکٹوں کے ڈبے اور جانے کیا کیا منگوا رکھا تھا۔ اور وہ بار بار یہی اصرار کر رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں لے کر جائے گا۔ لیکن امی کے آگے اس کی کہاں چلتی۔

کھانے کی میز پر امی معمول سے زیادہ خاموش اور سنجیدہ تھیں جس سے مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ تیور نے ان سے بات کی ہے۔ اب مجھے نتیجہ جاننے کی بے چینی تھی۔ اور تبھی یکدم یاد آیا کہ تیور کو بھی تو مجھ سے کوئی بات کرنا تھی۔ ”بھابی..... اکیڈمی میں مجھے صرف آپ کے ہاتھ کے کھانوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔“ تیور بے فکری سے کھانا کھا رہا تھا اور میں بے چین تھی۔ ”سچ میں اپنے دوستوں کو بھی بتاتا ہوں کہ میری بھابی جیسا کھانا دنیا کی کوئی عورت نہیں بنا سکتی۔“

”اچھا اب مکھن نہ لگاؤ.....“ میں نے اسے خاموش کرایا۔

کھانا قریب الانقضاء ہی تھا کہ اچانک بغیر اطلاع کے ماہ رخ آگئی اور اس کے اندر داخل ہونے پر جو جوت تیور کے چہرے پر روشن ہوئی تھی اسے کوئی بھی دیکھتا تو جان جاتا۔ سب کو سلام کر کے وہ امی جان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ارے آپ بھی آئے ہوئے ہیں، کب سے آئے ہیں اور کب تک ہیں؟“ ماہ رخ نے تیور سے پوچھا تو مظہر کو اسی دم اچھو لگ گیا۔ کھانے کے برتن اٹھا کر میں نے میز پر پھل رکھ دیے اور کچن میں چائے کا پانی چڑھا دیا۔ ماہ رخ نے بتایا کہ وہ کچھ دنوں تک انگلینڈ جا رہی ہے۔ کیونکہ گھٹت کی طبیعت اب کافی خراب رہتی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے کم سے کم کام کرنے کو کہا تھا۔ ماہ رخ

چونکہ فارغ بھی تھی اس لیے یہ ذمے داری سنبھالنے کا قریب اسی کے نام نکلا تھا۔ اور یوں بھی وہ سیر سپاٹے کی شوقین تھی۔

غالب کے انتقال کے بعد سے ماہ رخ نے میرا دھیان بنانے کی بہت کوشش کی، ہر دوسرے تیسرے دن وہ میرے پاس آ جاتی تھی۔ اور اس کے وجود سے مجھے کافی آرام ملتا، نہ صرف وہ میرا دل بہلاتی بلکہ کام کاج میں میرا ہاتھ بھی بٹاتی تھی۔ حالانکہ وہ میری بہت خاص عزیز دوست بھی نہ تھی لیکن میری زندگی کا یہ حادثہ ہم دونوں کو گہری دوست بنا گیا اور کچھ مجھے یہ بھی خیال رہتا تھا کہ وہ گھٹت کے ایک ایسے راز کی امین تھی جس کا راز رہنا ہی ہمیشہ کے لیے بہتر تھا۔

تیور اپنے سامان کی پیکنگ کے لیے کی طرف گیا تو میں فوراً کچن سے نکل کر اس کے سر پر جا پہنچی۔ اس نے مڑے بغیر میرے قدموں کی چاپ کو محسوس کر لیا اور بغیر میری طرف دیکھے فوراً کہا۔ ”میں نے امی جان سے بات کر لی ہے۔“ بڑا کالیاں ہے، فوراً میرے دل نے کہا، لیکن مجھے دل ہی میں شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔

”میں نے ان کو بہت مشکل سے منایا ہے۔ بھابی۔“ اس کی وضاحت سے میں شٹنگائی۔ ”میں اس لیے تو نہیں آئی..... میں تو یہ پوچھنے آئی تھی کہ تم نے مجھ سے ایک ضروری بات کرنی تھی..... وہ کیا ہے؟“ میں نے فوراً بات بدلی۔

”اوہ، ہاں..... وہ بات؟“ تیور جیسے ہنکانے لگا۔ ”وہ اگلی دفعہ تو بتاؤں گا۔“

”ابھی بتا دو مجھے یونہی اتنا عرصہ تجسس رہے گا۔“ میں نے اصرار کیا..... ”کچھ تھوڑا سا بتا دو کہ کس موضوع پر؟“

”کوئی خاص بات نہیں بھابی..... وہ ویسے ہی شاید کہہ دیا تھا“ وہ ٹال رہا تھا۔ ”ارے یہ تو بتائیں کہ یہ ماہ رخ کیسی لڑکی ہے؟“ اس نے اپنی دانست میں بات بدلی لیکن میں بات کی تہ کو پا گئی کہ اسے یہی بات شاید کرنا تھی۔

”اچھا تو گویا اس کا آج آنا اتفاق نہیں ہے۔“ وہ کھینے لگا۔ ”اور اس کا یوں اکثر آنا جانا بے معنی نہیں ہے۔“ میں اسے تنگ کرنے لگی۔

”بس بھابی اب بال کی کھال تو نہ اتاریں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”جاؤ معاف کیا۔“ میں نے سخاوت کا مظاہرہ کیا ”اچھا بتاؤ اب کب آؤ گے؟“

”اب تو عید سے قفل مشکل ہے بھابی! اب تو سخت وقت آ رہا ہے جس میں چھٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ عید پر بھی نہ آسکوں تاہم کوشش ضرور کروں گا۔“ میں نے اسے بہت سی دعائیں دیں۔

”شکریہ بزرگو!“ تیمور ہنس کر بولا ”اب چل کر چائے پلائیں تاکہ بندہ نوکری پر روانہ ہو۔“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں تشریف لائیں جناب“ میں نے ہنس کر کہا اور پھر سب نے مل کر چائے پی اور تیمور روانہ ہوا اور اس کے تھوڑی دیر کے بعد ماہ رخ بھی روانہ ہوئی تو میں امی کے پاس آ بیٹھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اس بات کو چھیڑیں۔ لیکن مجھے اس کے لیے طویل انتظار کرنا پڑا۔

ایسے لمحات میں انتظار کس قدر طویل ہو جاتا ہے جب دو لوگ پاس پاس ہوں۔ اور صرف ایک بات کہنے کو الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔ یا یہ سوچ رہے ہوں کہ ابتدا کون کرے۔ بالآخر میں نے ہی اس سکوت کو توڑا۔ ”امی جان! آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”کس بارے میں بیٹا؟“ وہ گویا جان بوجھ کر انجان بن گئیں۔

”جوابات تیمور نے آپ سے کی ہے اس سلسلے میں۔“ میں نے دھیمے سے کہا۔

”ہوں“ انہوں نے ہنکارا بھرا ”بیٹے میرے لیے تو یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ تم نے یوں سوچا۔ کیا تمہیں یہاں کسی چیز کی کمی ہے؟“

”ارے نہیں امی جان!“ میں نے ان کے ہاتھ تھام لئے، ”میرے لیے تو کوئی کمی نہیں اور اگر ہو بھی تو اس خلا کو تو آپ کی محبت کا خزانہ ہی پر کر دیتا۔ مجھے اس گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں، کسی بھی چیز کی نہیں..... یہ تو میں نے سوچا کہ اس گھر کا فرد ہونے کے ناتے یہ میرا فرض بھی ہے اور شاید حق بھی.....“

”اچھا اب تم مجھے اپنے الفاظ سے جذباتی طور پر بلیک میل نہ کرو۔“ امی جان مسکرائیں ”سارے کے سارے حقوق تمہارے اس گھر پر ہیں اور رہیں گے، جو تمہاری خوشی ہے ویسے ہی کرو۔ لیکن بیٹا ہر قدم کو پھونک پھونک کر اٹھانا، ہر راہ پر سنبھل کر چلنا، جو بیوگی کی چادر قسمت نے تمہیں اوڑھادی ہے اس پر تو لوگوں کی نظروں کے کانٹوں سے بھی نچھید بن جاتے ہیں۔“

”آپ میرے لیے دعا کیا کریں امی جان کہ میں ہر طرح کے حالات پر فتح پالوں اور ہمیشہ سرخرو رہوں۔“ میں نے ان کے ہاتھوں کو پٹکے سے دبایا۔

”تمہارے کہے بغیر میرے جسم کا پور پور تمہارے لیے دعا گور ہوتا ہے، شاید یہ بھی شان کریں ہے کہ اس نے جس آزمائش میں ہمیں ڈال دیا ہے۔“ وہ پھر اداس ہونے لگیں تو میں چائے بنانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غالب شاید بہت زیادہ اچھے تھے۔ اس لیے زیادہ جیسے نہیں، کیونکہ ان کے تمام ماتحت ان کے کلمے اور قہیدے پڑھتے تھے۔ صرف ہمارے گھر میں ہی نہیں بلکہ دفتر میں بھی ان کے نام پر لوگوں کی آنکھوں میں اب تک جگنو جگنا لگتے تھے۔

جس دن میں پہلی دفعہ دفتر آئی تو تمام عملہ استقبال کو موجود تھا۔ میں نے دل میں ایک عہد کیا تھا کہ دفتر میں ہمیشہ سوتی لباس پہنوں گی اور ہمیشہ اپنے کام کے علاوہ کسی سے بے مقصد بات نہیں کروں گی۔ گویا یہ دو پہلے اصول تھے جو میں نے اپنے دل میں وضع کئے تھے۔

کشادہ صاف ستھرے دفتر میں پہلی دفعہ داخل ہوتے ہی میری ہڈیوں میں ٹھنڈک سی اتر گئی اور غالب کی یاد کا ایسا غلبہ ہوا کہ مجھے اپنے ارد گرد سے غالب کی خوشبو آنے لگی۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے غالب اس دفتر میں موجود ہیں، دفتر کی وہ کرسی جو نوید صاحب مجھے بیٹھنے کے لیے آفر کر رہے تھے اس پر غالب کے بعد آج تک کوئی نہ بیٹھا تھا۔ جونہی میں اس پر بیٹھی مجھے لگا جیسے غالب نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا ہو۔ ششے کی شفاف میز پر میرے ہاتھ پتھر کی بے جان سلوں کی طرح پڑے تھیاورد ماغ کہہ رہا تھا ”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں! یہ رونے کا مقام نہیں، کسی پر اپنی کمزوری ظاہر کرنے کی جانیں، جب رودوگی، جب آنسو بہانے لگو گی تو تمہارے اندر کی کمزور عورت تمہارے ارد گرد سہارے تلاش کرنے لگے گی!“

ایک بار غالب نے کہا تھا ”تم میری کمزوری ہو۔“

”اوہو، مجھے دکھ ہوا، میں تو سمجھی کہ میں آپ کی طاقت ہوں؟“ میں نے ہنس کر کہا تھا۔

”نہیں عورت مرد کی کمزوری ہوتی ہے اور مرد عورت کی طاقت.....“ غالب کا جواب تھا۔

میری طاقت تو مٹی کی کٹی من گہری تہہ میں ابدی نیند سو رہی تھی لیکن اس وقت غالب کی یہ بات یاد آتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کا وجود یہیں پر ہے، مجھے ایک غیر مرئی سی طاقت کا احساس ہونے لگا۔ نوید صاحب نے بتایا کہ انہوں نے تمام فائلیں دفتر میں رکھ دی تھیں جن میں

سے بہت اہم فائلیں میز پر رکھی تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے یہ سب سمجھنے کے لیے کچھ دن چاہئیں اور مجھے کسی چیز کی جلدی نہیں اس لیے وہ مجھے بار بار ہر چیز کے لیے ڈسٹرب مت کریں۔ ”ٹھیک ہے میڈم! لیکن آپ خود کو تنہا مت سمجھیں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں اور جہاں آپ کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو ہم سب دل و جان سے حاضر ہیں۔“ نوید صاحب نے تمام اسٹاف کے جذبات کی ترجمانی کی۔

”بہت بہت شکریہ، نوید صاحب، آپ سب لوگوں کی راہنمائی کی مجھے قدم قدم پر ضرورت پڑے گی۔“ سب لوگ ایک ایک کر کے دفتر سے نکل گئے۔ جب میں بالکل تنہا رہ گئی تو ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ میں نے میز سے سر ٹکادیا اور آنسوؤں کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے یہ مصروفیت میرا وقت اچھا کٹنے کا بہانہ بننے لگی۔ میں نے کاروبار کی سمجھ بوجھ کے لیے ایک پرائیویٹ ادارے میں ایم بی اے میں داخلہ بھی لے لیا۔ گھر میں یا دفتر میں جب بھی وقت میسر ہوتا میں کتابوں کا مطالعہ کرتی اور اپنے نوٹس بھی بناتی۔ زندگی گویا گھر اور دفتر دو محاذوں میں بٹ گئی تھی۔

میری پوری کوشش یہی ہوتی کہ امی جان کو کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ اگلے دن کے کھانے کی تیاری میں ایک شام پہلے ہی کر لیتی تھی اور شام کا کھانا ہر روز تازہ بناتی تھی۔ امی جان تو شام کا کھانا کم ہی کھاتی تھیں مگر میں طبیعت نہ چاہتے ہوئے بھی مظہر کی خاطر کچھ نہ کچھ بنا لیتی تھی اور کبھی کبھار امی جان بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا کھا لیتیں۔ دفتر میں، میں نے شروع سے ہی یہ معمول رکھا کہ صبح نو بجے پہنچتی تھی اور پورے ایک بجے دفتر سے اٹھ کھڑی ہوتی۔

○ زندگی کیا ہے؟

غم کا سمندر ہے!!!

فقط وہ جانے جس نے

اس سمندر میں غوطہ لگایا

اسے کیا معلوم

جس نے زندگی کو برتا ہی نہیں!!!! ○

اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی اور دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ کاروبار سنا تھا پھر بھی میں نے سارے حساب کتاب بہت شفاف طریقے سے رکھے تھے، ہر لین دین اور نفع نقصان کا مکمل ریکارڈ تیار کروا کر اپنی نگرانی میں نوید صاحب سے چیک کرواتی اور رکھتی۔ نوید صاحب بہت سلجھے ہوئے انسان تھے، بہت مددگار..... اس کے باوجود میرا رویہ ان کے ساتھ باس اور ماتحت کارہا، یہی رویہ میں نے دفتر میں سب کے ساتھ روا رکھا تھا۔ میرا مزاج قطعی حکمانہ نہیں تھا لیکن مجموعی طور پر میں نے جو رویہ شروع دن سے اختیار کیا وہ ایک حد فاصل لیے ہوئے تھا جس نے سب لوگوں کے ساتھ خود بخود میرا مقام متعین کر دیا تھا۔

نگہت کی بیٹی کی ولادت ہم سب کے لیے نوید بن کر آئی۔ امی جان بچی کی ”قبل از وقت“ ولادت پر کچھ پریشان تو ہوئیں لیکن ماں بیٹی کی صحت کی خبر سن کر مطمئن ہو گئیں۔ نگہت گھر آئی تو ٹیلی فون پر امی جان سے بھی بات کی اور مجھ سے بھی۔ امی جان نے اسے ”قبل از وقت“ پیدا ہونے والے بچوں کی دیکھ بھال پر لیکچر دیا، جسے سن کر وہ دل ہی دل میں یقیناً ہنس رہی ہوگی۔ مجھ سے بھی بات ہوئی، میری مصروفیت کا اسے علم تھا، اس لیے مجھے اپنا خیال رکھنے کی بہت نصیحتیں کرتی رہی۔ ”اچھا بڑی بی! یہ بتاؤ خود کیسی ہو؟ نام کیا سوچ رکھا ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بھابی! بیٹی ہو بہو آپ کی کاپی ہے اور ہم نے کوئی نام نہیں سوچا۔ اس کا نام آپ رکھیں گی اگر آپ اس قابل سمجھیں تو.....“ وہ اداسی سے بولی۔

”ارے بھئی!“ میں صرف اتنا ہی کہہ سکی کیونکہ امی جان کی موجودگی کی وجہ سے یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی کہ اس میں بھلا بچوں کا کیا تصور ”اچھا میں خوبصورت سا نام تلاش کر کے بتاؤں گی۔“ کہہ کر میں نے خدا حافظ کہا۔

تیمور نے بھی فون کر کے ہمیں نگہت کی بیٹی کی مبارک باد دی، مظہر ماموں بن کر بہت خوش تھا اور ہر وقت مجھے نئے نئے نام اور ان کے مطلب بتاتا رہتا تھا۔ ”اچھا مظہر جو نام تمہیں سب سے اچھا لگے مجھے بتانا پھر میں نگہت کو لکھ دوں گی۔“ میں نے اسے یہ ذمہ داری سونپ دی۔

زندگی کا پہیہ تو روزِ ازل سے گردش میں ہے سوا ب بھی تھا۔ امی جان روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ میری حتی الامکان کوشش ہوتی کہ جو وقت گھر پر گزرتا ہے اسے امی جان کے ساتھ ہی گزاروں۔ اب گھر میں تھا ہی کون، تین کمزور سے زاویوں کی مثلث۔ شہر کے حالات بھی اتنے پرسکون نہیں رہے تھے، ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ ابو نے رات کے لیے ایک سیکورٹی ایجنسی سے گارڈ کا بندوبست کر دیا تھا۔ دن میں جب امی جان گھر میں اکیلی ہوتی تھیں اس وقت اہل محلہ ان کا بہت خیال کرتے لیکن یہ انتظام پائیدار یا مستقل تو نہ تھا۔ میں دفتر سے دن میں دو تین دفعہ فون کر کے ان کی خیریت پوچھتی تھی۔

کاروبار کی اب سوجھ بوجھ ہو رہی تھی اور جو مسائل شروع میں مجھے بڑے لگتے تھے اب روزمرہ معمول کا حصہ نظر آنے لگے۔ نوید صاحب بہت محنت اور تندہی سے کام کرتے تھے اور واقعی بہت ایماندار تھے۔ میں نے کئی بہانوں سے انہیں آزما کر بھی دیکھا، اور بلاشبہ کاروبار کو سنبھالنا میرے بس کا روگ کبھی نہ ہوتا اگر مجھے ابو کی رہنمائی میسر نہ ہوتی۔ تیمور بھی گاے بگاے فون کر لیتا تھا، ٹریننگ کے مراحل یا تو اب آسان ہو گئے تھے یا پھر اس کو ان کی عادت ہو گئی تھی۔

”بھابی ہم نگہت آپا کی بیٹی کا نام مسرت کیوں نہ تجویز کریں۔“ منظر نے کھانا کھاتے ہوئے تجویز کیا تو مجھے اس کی تجویز پر ہنسی آگئی۔

”دیکھیں امی جان! منظر نے نگہت کے ساتھ قافیہ کتنا اچھا جوڑا ہے۔“ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

”ارے نہیں بھابی! میں نے قافیہ تو نہیں جوڑا.....“ اس نے صفائی دی۔

”تو پھر؟“ حیرت میرے لہجے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”اصل میں وہ..... غالب بھائی کی وفات کے بعد ہمارے گھر کی پہلی خوشی.....“ اس کا جملہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ امی کی آنکھیں لبریز ہو گئیں اور میری جل تھل۔ منظر شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے شرمندگی سے بچانے کو کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو منظر۔“

”مگدھے گا گدھا ہے یہ.....“ امی جان بولیں۔ ”سترھویں برس میں لگنے کو ہے لیکن بات

کرنے کا سلیقہ نہیں اور نہ ہی بات کرنے کا موقع مل دیکھتا ہے۔“

”ارے نہیں امی، میرا بھائی تو بہت سیانا ہے۔ اتنی اچھی باتیں کرتا ہے۔“ میں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”شکریہ بھابی! اس گھر میں صرف آپ ہی میری قدردان ہیں۔“ منظر خوش ہو گیا تھا۔

”لیکن ایک بات ہے..... یہ مسرت کچھ پرانا سا نام نہیں اور پھر انگلینڈ میں ذرا نیا سا نام ہونا چاہئے نا؟“ میں نے وضاحت کی۔

”مثلاً، اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”خوشی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے کہا تو وہ واقعی خوشی سے اچھل پڑا۔

”زبردست بھابی! بہت اچھا خیال ہے، میری بھابی باکمال ہیں۔“ امی جان بھی مسکرا دیں۔

”کیوں امی جان! اچھا نام ہے؟ نگہت کو بتا دیا جائے.....؟“ میں نے امی جان سے پوچھا تو انہوں نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

اگلے ہی دن فون پر ہم نے نگہت کو نام تجویز کیا تو ان دونوں کو بھی یہ نام بہت ہی پسند آیا اور یوں خوشی بہت اعجاز نام فائل کر دیا گیا۔ تیمور کا فون آیا تو اسے بھی منظر نے نہ صرف نام بتایا بلکہ پوری تفصیل اس طرح بتائی کہ جیسے اس نے بہت عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ تیمور نے مجھ سے بھی بات کی اور پوچھا کہ دفتری کام کیسا چل رہا ہے اور مجھے اس سلسلے میں کوئی مشکل تو نہ تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے اگر کوئی مسئلہ ہو تو نوید صاحب سے بلا جھجک کہوں، وہ ہمارے ملازم نہیں بلکہ غالب کے دوست اور دستِ راست بھی تھے۔

اگلے دو ماہ بہت مصروف رہے تھے، منظر کے امتحانات، میرے پہلے سمسٹر کے امتحانات اور پھر غالب کی برسی۔ یادوں کے دیے کبھی بجھے ہی نہ تھے ان کی لوتیر تر ہو گئی۔ کتابوں پر ایک ہی چہرہ سجا نظر آتا، حرفِ غالب کا نام بن جاتا، کچھ پڑھ ہی نہ پاتی تھی۔

میں نے دنیاوی کاموں کے ساتھ ساتھ یادِ الہی میں بھی سکون تلاش کر لیا۔ قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر اپنا روز کا معمول بنالیا خواہ ایک صفحہ ہی پڑھتی۔ غالب کی برسی پر تیمور بھی آیا تھا، تقریباً

کبھی رشتے دار، دوست احباب جمع تھے۔ مجھے لوگوں کی نہ صرف کھوجتی نظروں کا سامنا تھا بلکہ چبھتے سوالات کا بھی۔ عجیب ذہنیت ہے ہمارے لوگوں کی بھی، آپ کے ارد گرد بیٹھ کر سرگوشیاں اس طرح کرتے ہیں کہ گویا آپ کی دل آزاری نہ کرنا چاہتے ہوں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان کی تمام تر احتیاط کے باوجود بھی یہ سرگوشیاں آپ کیے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ عجیب سی باتیں..... ”کب تک یوں ہی بیٹھی رہے گی؟“ ”جوان جہان ہے، خوبصورت ہے“..... ”بھئی کاروبار پر قبضہ ہے“..... ”گھر میں جوان دیور ہے۔“ غرض وہ باتیں جو شاید میں نے ایک سال میں سوچی بھی نہ تھیں کس قدر گھٹیا سوچیں ہیں لوگوں کی۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں..... لیکن اور کچھ نہیں تو ضبط کرنا تو آئی گیا تھا۔ غالب میری ساری طاقت لے گئے تھے اور میں کمزور ہونے کے باوصف حالات کا مقابلہ کرتے کرتے مضبوط ہو گئی تھی۔

امی بھی میرے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ یہ سرگوشیاں اور بیانات وہ بھی سن رہی تھیں۔ اشارے سے ہی مجھے خاموش رہنے کو کہا اور میں خاموشی سے کھجور کی گھلیوں کو مٹھی میں بھر کر ایک ایک کر کے اپنے ہاتھ سے پھینکنے لگی، خالی دماغ سے، بغیر کچھ پڑھے، فقط آنسو بہاتے اور سوچتے۔ بے وقوف! میں تو اس کو بھائی سمجھتی ہوں۔ بیڑوں کی طرح پیار کرتی ہوں۔ کیا ہوا جو میں ماں نہ بن سکی۔ مامتا کا سمندر تو میرے اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ مامتا کے پیار کے خزانے جو مجھے اپنے بچے پر لٹانے تھے، میرے اور بہت سے ششہ جذبوں کی طرح مکرمتا کے جذبے کی تسکین تو میں کر لیتی ہوں۔

منظر مجھے بالکل پچھلے تھا، جو باپ کی شفقت سے تو بچپن میں محروم ہوا ہی تھا، اسے ماں کا پیار بھی جی بھر نصیب نہیں ہوا تھا کہ امی جان بہت عرصے تک اس صدمے کی وجہ سے اسے وہ توجہ نہ دے سکی تھیں بعد میں وہ کافی ازالہ کرنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن بچپن کی عدم توجہ نے منظر کی شخصیت میں ایک غیر محسوس سا خلا پیدا کر دیا تھا۔ برسی..... پھر میرے امتحان اور منظر کے امتحان بھی بالآخر ختم ہوئے تو تیور کی ٹرم بریک آگئی۔

خوب ہمارا ساتھ نبھایا بیچ بھنور کے چھوڑا ہاتھ  
ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا نکلے ہو اچھی بات!

شام سے لے کر پو پھٹنے تک کتنی رتیں بدلتی ہیں  
آس کی کلیاں یاس کی پت جھڑجھک کے اشکوں کی برسات  
اپنا کام تو سمجھانا ہے اے دل رشتے جوڑ کہ توڑ  
ہجر کی راتیں لاکھوں کر دوڑوں، وصل کے لمحے پانچ کہ سات  
انشاء صاحب صبح ہوئی ہے اٹھو بھی اب کوچ کرو  
اس منزل پر قافلے والے رکتے ہیں بس رات کی رات  
(انشاء جی)

غالب کے بعد اب جینے کی خواہش نہیں رہی تھی مگر جینا اپنے اختیار میں ہے نہ مرنا۔ یہ تو تقدیر ہے، خودکشی کی کوشش میں بھی وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کا ساتھ تقدیر دیتی ہے۔ خودکشی کا تو میں نہ سوچ سکتی تھی لیکن زندگی کا نام لگتا تھا صرف سانس لینا ہی رہ گیا ہے۔ میں سب کے ساتھ دن کے اجالوں میں ہنسی مسکراتی بھی تھی اور ہر سرگرمی میں حصہ بھی لیتی تھی مگر رات اپنا آنچل پھیلاتی اور میں تنہا ہوتی تو مجھے یوں لگتا کہ میری ماں نے اپنی بانہیں وا کر دی ہوں مجھے سمیٹنے کے لیے۔

تیور ٹرم بریک میں دس دن کے لیے آیا تھا۔ اس کے آنے سے گھر کی ایک لگی بندھی روٹین میں گویا حرکت پیدا ہوئی۔ شام میں ہم سب اکٹھے چائے پیتے، اکثر ماہ رخ بھی ”اتفاقا“ ہی آ جاتی تھی۔ ایسے میں تیور کے چہرے پر خوبصورت جذبوں کے رنگ کبھی مجھ سے چھپے نہ رہتے تھے۔ ماہ رخ اکثر ہی تیور کی جملہ بازی سے بلش کر جاتی تھی لیکن وہ کوئی ایسی دبوڑ کی نہ تھی۔ اچھی بولڈ اور کھلی ڈلی عادت تھی اس کی لیکن یہ محبت بسا اوقات چہرے پر ایسے ہی رنگ بکھیر دیتی ہے۔ دوا ایک دفعہ باہر آئیں کریم کھانے کے لیے جانے کا پروگرام بنا تو میں نے سردی کی وجہ سے معذرت کی۔

”مگر بھابی! آئیں کریم کا تو مزہ ہی سردی میں ہے؟“ منظر مصومیت سے کہتا۔

”تو اور کیا! گرمیوں میں تو آئیں کریم کبھی ڈھنگ سے جی ہوئی بھی نہیں ہوتی۔“ ماہ رخ بولی۔

”بھابی! جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، اسی طرح سردی، سردی کو کاٹتی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ کس طرح ایٹ آباد کی شدید سردی میں جب برف بھی پڑی ہوتی ہے اور ہمیں سطح پر جی ہوئی برف کی نہ کوڑ کر اس بخ بستہ پانی میں غسل دیا جاتا ہے..... واہ واہ کیا لطف آتا ہے۔“ تیور بتا رہا تھا اور مجھے اس خیال سے ہی پھریری سی آگئی۔

”لیکن اس طرح تو تیمور بھائی کچھ لوگوں کے وفات پا جانے کے قوی امکانات ہوں گے؟“  
مظہر کے ذہن میں دلچسپ سوال آیا تھا۔

”ارے نہیں بقرابطہ!“ تیمور نے مظہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”جس طرح سونا آگ میں پک کر ہی کندن بنتا ہے۔ اسی طرح فوج ہمیں تراش کر ہیرے بنا دیتی ہے.....“ تیمور نے فرضی کارل جھاڑا۔

”ہونہہ ہیرے!“ ماہ رخ نے طنز سے تیمور کی اٹھلاہٹ پر ہونٹ سکڑے۔

”نتیجہ یہ نکلا! بھائی کہ ہم سب آئس کریم کھانے جاسکتے ہیں!“ مظہر نے فریادی انداز میں کہا۔  
”تم تینوں جاؤ، سچ مجھے بہت سردی لگتی ہے۔“ میں نے منت کی۔

”آپ کو نہیں لگتا کہ میں ان کے ساتھ کباب میں ہڈی لگوں گا؟“ مظہر نے بے چارگی سے کہا۔  
”تو میرے جانے سے تو کباب میں دو ہڈیاں ہو جائیں گی؟“ میں نے اسی کے انداز میں کہا۔

”نہیں پھر تو ہم دونوں ایک دوسرے کو کمپنی دیں گے تاکہ یہ دونوں ڈسٹرب نہ ہوں۔“ مظہر کے کہنے پر ماہ رخ کی ہنسی نکل گئی۔

”بڑا سمجھ دار ہے تو یار! اور تعاون کتنا کر رہا ہے میرے ساتھ۔ مجھے بھی تمہارے ساتھ کل کو اسی طرح تعاون کرنا پڑے گا۔“ تیمور نے بھی ہنس کر کہا۔

”جانے وہ کل کب آئے گا؟ ابھی تو میں صرف سترہ سال کا ہوا ہوں اور میں کوئی لڑکی بھی کیسے ڈھونڈوں گا.....؟“ اس کی یہ بات کہتے ہوئے کا طوفان اٹھانے کو کافی تھی۔

پتا بھی نہیں چلا اور تیمور کی چھٹی ختم ہونے پر آگئی۔ اس روز امی کتنی اداس تھیں۔ ”اب تو اس گھر میں خوشی بھی چند دن کی مہمان ہوتی ہے۔“ وہ اداسی سے کہنے لگیں۔

”امی! زندگی اسی کا نام ہے۔ میں پھر تین ماہ کے بعد آ جاؤں گا۔“ تیمور کہہ رہا تھا ”اور ہاں نگہت سے کہیں کہ وہ ”خوشی“ کو لے کر پاکستان آئے اور پھر اسے مستقل یہیں پر چھوڑ جائے۔“

”باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ دیکھو تو سہی جس کی معصوم جان پر تم نے اتنے بوجھ ڈال رکھے ہیں وہ تنہا انہیں سہارنے کے قابل ہے بھی کہ نہیں؟“ امی تیمور کی کلاس لے رہی تھیں۔

”ہماری بھابی بہت بہادر ہیں امی، مجھے ان پر فخر ہے۔ یقین کریں کہ میں انہیں دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں غالب بھائی کو دیکھ رہا ہوں۔“ تیمور جذباتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں نے بھی کہیں پڑھا تھا کہ شادی کے کچھ عرصے کے بعد میاں بیوی کی شکلیں ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔“ مظہر نے حسب عادت ہماری علمی قابلیت میں اضافہ کیا تو ہمیں ہنسی آگئی۔ یوں بھی غالب کے ذکر پر اندر سے توجہ دل کی حالت ہوتی تھی سو ہوتی تھی مگر میں نے اب اپنی کیفیات کو چھپانے کا فن سیکھ لیا تھا۔

”بھابی اپنے ہاتھوں کی چائے تو ایک دفعہ پلا دیں، تین ماہ اچھے گزر جائیں گے۔“ تیمور نے کہا، میں انھنے لگی تو اس نے مظہر سے بھی کہا کہ وہ میری مدد کرے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ تجلیہ میں امی سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوگا، لیکن میں نے اپنے سر کو جھٹک دیا۔ چائے بنا کر میں اور مظہر لاؤنج میں لائے تو ماں، بیٹا باتوں میں مصروف تھے، ہمیں دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ چائے پی لی تو تیمور نے اپنی فائل تیار کرنا شروع کی۔ اس کے جانے میں تھوڑی ہی دیر ہو گئی تھی کہ اس نے مجھے باہر لان میں بلایا۔ اچھی خاصی سردی تھی مگر وہ بغیر سوئٹر کے کھڑا تھا، اس کے لیے لاہور کی سردی تو سردی ہی نہ تھی۔

”کیا بات ہے تیمور؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ بتائیں کیا جا رہا ہے کاروبار؟ سوری میں اتنے دنوں سے پوچھ ہی نہیں سکا کہ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“ وہ کہہ رہا تھا اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے اس بات کے لیے تو قطعی نہیں بلایا ہے۔

”یہ تو تم مجھ سے اندر بیٹھ کر بھی پوچھ سکتے تھے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اصل بات کرو جس کے لیے تم نے مجھے بلایا ہے۔ تمہارے جانے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔“

”بھابی! اصل میں امی کی بھی اور میری بھی یہی سوچ ہے کہ ایسا کب تک چلے گا؟“ تیمور نے ناکمل بات کی۔

”کیسا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ آپ اس طرح تو زندگی نہیں گزار دیں گی؟ کوئی مستقبل کا خاکہ آپ کے والدین کی طرف سے..... میری بات سمجھ رہی ہیں ناں آپ؟“ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا نہ کہہ پارہا

تھا اور مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ادھوری بات کا مطلب کیا تھا۔  
”نہیں! میں سمجھی نہیں!“ میں نے مختصراً کہا۔

”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ آپ کب تک یوں تباہ“ وہ اتنا ہی بولا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔  
”بس تیمور اس سے آگے نہ کچھ کہنا۔ میں تو خود کو تباہ نہیں سمجھتی۔ تم میرے بھائی نہیں ہو کیا؟ امی  
ہیں، مظہر ہے، ماشاء اللہ وہ بھی جوان ہو گیا ہے، اگر میرے یہاں رہنے سے آپ لوگوں کو کوئی مسئلہ  
ہے تو الگ بات ہے!“ میں نے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”پلیز بھابی!“ وہ بھی رونے لگا۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ میرے لیے تو آپ میرے  
بھائی کی جگہ ہی ہیں لیکن ایسا عمر بھر تو نہیں چل سکتا۔ کل کو میری شادی ہوگی، پھر مظہر کی ہوگی۔ امی  
بھی عمر کی اس منزل پر ہیں کہ کچھ علم نہیں کل کیا ہوگا، پھر آپ چند سالوں بعد بہت تباہ ہو جائیں گی  
بھابی۔“ اس نے میرے سامنے میرے مستقبل کا خوفناک نقشہ کھینچا۔

”واقعی تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے تو کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔ واقعی میں کچھ سال  
بعد تو بہت تباہ ہ جاؤں گی۔ تم لوگوں کی اپنی زندگیاں ہوں گی، اپنے مسائل اور اپنی خوشیاں، تب  
میں تو کسی بھی خانے میں فٹ نہ ہوں گی۔ واقعی میں اب اس کے بارے میں سوچوں گی۔“ میں  
نے اسے یقین دلایا۔

”ایسی بات نہیں ہے بھابی کہ ہماری زندگیوں میں آپ کے مقام میں کوئی تبدیلی آجائے گی  
یا آپ کی حیثیت نہ ہوگی۔ میں اصل میں چاہتا ہوں کہ آپ ابھی اپنے بارے میں سوچ لیں۔“  
تیمور نے وضاحت کی۔

”یہ تم چاہتے ہو یا امی چاہتی ہیں۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہم دونوں ہی یہ چاہتے ہیں۔ ہم آپ کو خوش اور آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ پلیز!“ اس نے  
مدعا واضح کیا اور پھر وہ چلا گیا میرے ذہن کو سوچوں کے نئے رخ دے کر۔

○ میں زندگی کیسے گزاروں گی؟

نہ سر پر سناں ہے نہ پیروں تلے زمیں

تشنہ ہیں جذبے، نیکراں ہیں خواہشیں

میں کھلے آسمان تلے

اور غم کی شدید بارشیں

لب پر اک مسکراہٹ آتی ہے!

سینے میں ہزار نوحوں کا گلا گھونٹ کے

میں زندگی کو بھلا کیسے گزار سکتی ہوں

تشکیلوں کا بھفل ٹاؤر ہے

اہرام مصر کی طرح دفن ہیں مجھ میں میری تمنائیں

سوچوں کے سامنے حائل ہے دیوار چین

جسم ویران ہے بابل کے باغات کی طرح

اپنے ہی بوجھ سے پیسا ٹاور کی طرح جھکی جاتی ہوں

کوئی ویرانی سی ویرانی مجھ پر طاری ہے

میں کس طرح ویرانی کی یہ قبا تاروں

تمہی بتاؤ میں زندگی کس طرح گزاروں؟

میں زندگی کو نہیں گزار رہی

زندگی مجھے گزار رہی ہے! ○ (شیریں حیدر)

مظہر کا ایف ایس سی رزلٹ ہمارے لیے یوں خوشی لے کر آیا جیسے ویرانے میں بہار آجائے۔

مظہر اپنی باتوں سے اتنا سیدھا لگتا ہے مگر پڑھائی کے میدان میں اس نے خوب جھنڈے گاڑے۔

امی جان بھی بہت خوش تھیں اوپر سے ان دنوں نگہت بھی آنے والی تھی۔ نگہت کی آمد پر تیمور کو بھی آنا

تھا۔ اس لیے پارٹی تو ہم نے تب تک ادا کر لی۔ البتہ میں دفتر سے واپسی پر کیک اور کچھ نمکین

لوازمات لیتی ہوئی آئی۔ اس کے علاوہ میں مٹھائی کے بھی بچیس ڈبے ایک کلو والے بنوا کر لائی کہ

محلے میں اور قریبی عزیزوں میں بانٹ دی جائے۔ تحفے میں، میں نے ایک خوبصورت گھڑی

خریدی تھی جو مظہر کو دی تو وہ میرا بہت مشکور تھا۔ میں نے شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا

تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شیو بھی کرتا تھا۔



”ارے چھوٹو! تم نے شیو کرنا کب سے شروع کر دی؟“ میں بہت حیران تھی۔

”کچھ مہینوں سے بھابی! سوری میں نے آپ سے پوچھے بغیر!“ وہ کچھ ادھر ہی سمجھ رہا تھا۔

”ارے نہیں! یہ بات نہیں، مجھے تو اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہمارا چھوٹا تاتا بڑا ہو گیا ہے اور تمہیں طریقہ کیسے آیا شیو کرنے کا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”تیمور بھائی نے امی جان سے اجازت لے کر میری شیو کی تھی پہلی دفعہ اور مجھے سکھایا بھی تھا۔“ وہ فخر سے بتا رہا تھا۔

”اور دیکھو مجھے پتا ہی نہیں چلا، میں سمجھی کہ ابھی تمہاری داڑھی نکلی ہی نہیں۔“ میں نے سچ بولا۔

”ارے نہیں بھابی! مابدولت جلد ہی اٹھارہ سال کے ہونے والے ہیں۔ ڈرائیونگ بھی سیکھ

لی ہے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ادراپ میں بی۔بی۔اے میں داخلہ لوں گا تو آپ سے گاڑی مانگوں گا۔ پلیز بھابی! لے ویں ناں گاڑی، امی جان تو نہیں مان رہیں۔“ وہ میری منت کر رہا تھا اور مجھے اس گھر میں اپنی اہمیت کا اپنے مقام کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میرے اندر کہیں سکون اترنے لگا۔

”دیکھیں گے!“ میں نے جان بوجھ کر بے پروائی سے کہا۔

”کیا دیکھیں گے بھابی اور کب دیکھیں گے؟“ وہ مضطرب ہو کر بولا۔

”کسی دن جلد ہی دیکھیں گے کہ ہمارا چھوٹو گاڑی کیسے چلاتا ہے۔ میں خود تمہارا ڈرائیونگ ٹیسٹ لوں گی۔“ میں نے اسے کہا۔

”ابھی لے لیں! بھابی پلیز!“ اس نے اصرار کرتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے امی جان کی طرف دیکھا، انہوں نے نظروں ہی نظروں میں مجھے نفی کا اشارہ کیا۔

”پھر کبھی سہی مظہر، جلدی کیا ہے؟“ میں نے اسے کہا۔

”پلیز بھابی! اس نے اتنی انتہا سے کہا کہ میں نے دوبارہ امی جان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

”اچھا جاؤ لے کر آؤ چابی اور گیراج کھولو، میں آتی ہوں.....“ یا ہو کا نعرہ لگا کر وہ چابی لے کر باہر کو بھاگا۔

”ماہا بیٹا، تمہیں پتا ہے کہ آج نکل کے نوجوان لڑکے کس طرح گاڑیاں چلاتے بلکہ اڑاتے ہیں سڑکوں پر، میں تو کہتی ہوں کہ اسے مت اجازت دو۔ آج ٹیسٹ لوگی کل سے وہ تمہاری گاڑی تمہاری اجازت کے بغیر لے جانا شروع کر دے گا۔ ترکش سے نکلا ہوا تیرا پس نہیں آتا بیٹا، اس کو

ابھی روک لو اور پھر گاڑی کوئی سستا شوق بھی تو نہیں ہے، نہ ہی تم اتنی محنت اس لیے کرتی ہو۔ جب تک یہ خود اس قاتل نہ ہو جائیں تمہاری جان عذاب کیے رکھیں گے۔“ امی جان مجھے سمجھا رہی تھیں۔

”یہ سب انہی کا تو ہے امی جان، میں ہر ماہ ان دونوں بھائیوں کا حصہ ان کے اکاؤنٹ میں ڈالتی ہوں۔ آپ کو ظلم ہے، تیسرے حصے سے ہم سب کے خرچے چل رہے ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”تو وہ تیسرا حصہ ہے تو دراصل تمہارا ہی ناں؟ تم کیوں اپنے حصے کو خرچ کرتی ہو۔ اس کا بہتر حل یہ ہے کہ ہر ماہ چار حصے کر کے چوتھا حصہ گھر پر خرچ کر دو اور ان کے دو حصوں کے ساتھ تیسرا حصہ اپنا بھی بینک میں جمع کیا کر دو۔“ امی جان نے سمجھایا۔

”میں نے اپنا حصہ لے کر کہاں جانا ہے امی جان؟ میں اس گھر کی فردہوں، میرے اور آپ کے اخراجات الگ تو نہیں اور پھر میرے کورس کی فیسیں، آمدورفت کا خرچہ، کپڑاں سب اسی حصے میں سے ہی تو ہوتا ہے۔ میں کون سا اپنے میکے سے لے کر آتی ہوں!“ انہوں نے میری اس بات پر پیرامانا تھا جو مل لیا۔

”اللہ تیرا میکا سلامت رکھے بیٹی! مجھے تو تم نکمٹ سے بھی بڑھ کر اپنی بیٹی لگتی ہو۔“

”وہ تو میں ہوں ظاہر ہے۔“ میں نے ان کے گلے لگ کر اتر کر کہا۔

اور میں جو یہ سوچتی ہوئی باہر آ رہی تھی کہ گیراج سے گاڑی ریورس کر کے نکال کر مظہر کو سیدھی کھڑی کر کے دوں گی، حیرت سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی جب دیکھا کہ اس نے نہ صرف گاڑی گیراج سے نکال لی تھی بلکہ ڈرائیوے پر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے میرا منتظر تھا۔

”تم نے چلا کر گاڑی گیراج سے نکالی ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تو اور کیا دھکا دے کر نکالتا؟“ اس کے انداز پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو دروازہ کھول کر پچھلی طرف سے گھومتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اجازت ہے بھابی!“

”ہاں چلو بسم اللہ کر کے۔“ میں نے کہا تو اس نے بسم اللہ پوری پڑھ کر پورے اعتماد سے

گاڑی اسٹارٹ کی۔

”اگر ڈر لگے تو بے شک آنکھیں بند کر لیں۔“ اس نے مجھے دارنگ دی۔

”شرارت نہیں، شرافت سے اور حد میں رہ کر گاڑی چلاتا۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ایک گھنٹے

میں اس نے مجھے اپنا نیا کالج جہاں وہ جانے والا تھا دکھایا، مجھے دفتر کی طرف بھی لے کر گیا، کھلی سڑکوں پر بھی اور ٹریفک جام میں بھی اس نے اتنے اعتماد سے اور اتنے اچھے طریقے سے مناسب رفتار سے گاڑی چلائی کہ میں حیران ہی رہ گئی۔ گھر آ کر پورچ میں گاڑی رکھ کر تو میں اس حیرت کے سحر سے آزاد ہوئی۔

”سچ چھوٹو! تم رازداری سے بہت بڑے ہو گئے ہو، مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔ ”واقعی تم بہت اچھی ڈرائیونگ کر لیتے ہو۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”میں ہوں ہی اچھا بھائی! پڑھائی بھی اچھی کرتا ہوں، ڈرائیونگ بھی اور باتیں بھی۔“ وہ بولا۔

”اچھا یہ کس نے کہا کہ تم باتیں اچھی کر لیتے ہو؟“ میں نے اسے چھیڑا۔

”اصل میں جو بات کسی کے چہرے پر مسکراہٹوں کے پھول بکھیر دے وہ ہوتی ہی اچھی ہے اور میں نے بارہا اپنی باتوں سے آپ کے اور امی جان کے چہرے پر مسکراہٹوں کے پھول بکھیرے ہیں۔“ وہ پورے یقین سے بولا۔

والدہ کچھ دنوں سے بیمار تھیں اور ہر بار میں اپنی مصروفیت کے باعث ”کل آؤں گی!“ کہہ کر وعدہ کر لیتی مگر وہ کل آ کر ہی نہ دے رہی تھی۔ تبھی ابو کا فون آیا کہ بیٹا والدہ کافی بیمار ہیں آ کر دیکھ جاؤ۔ تمہاری ساری بہنیں باری باری کئی دفعہ ہو کر چلی گئی ہیں اور تم سستی کی انتہا کر رہی ہو۔ تب مجھے خود پر بہت شرمندگی ہوئی اور اس روز نوید صاحب کو کام سمجھا کر میں دفتر سے ذرا جلدی اٹھ آئی کہ والدہ کی طرف جاؤں۔

والدہ ناراض ہوں گی!“ دل میں سوچا اور راستے میں ایک دکان سے خوبصورت سا گلہ ستر خریدنے کو رکھی، والدہ کو پھول بہت پسند تھے اور میں نے سوچا کہ رشوت لے کر ان کی ناراضی رفع ہو جائے گی۔ میرے لیے اپنے کسی پیارے کے لیے تحفہ لینا ہمیشہ ہی مسئلہ ہوتا ہے، کوئی چیز بیچ کر ہی نہیں دیتی۔ کافی دیر سے کبھی کوئی پھول پسند آ رہا تھا، کبھی کوئی رنگ۔

”میڈم! آپ کو پھول کس کے لیے لینے ہیں؟ اگر اپنے شوہر کے لیے لینے ہیں تو میرے پاس بہت خوبصورت لال گلاب ہے جو نایاب ہونے کے باعث ہم ڈسپلے پر بھی نہیں رکھتے۔“ اس کے الفاظ نے مجھے وہیں ساکت کر دیا۔ وہ دکاندار تھا یا چہرہ شناس۔ میرے اوپر غالب کی یاد۔

کسی شال کی طرح پھیل گئی۔ میں لال گلاب ہی ڈھونڈ رہی تھی جو کہ نظر نہیں آرہے تھے۔ لال گلاب غالب کو بھی بہت پسند تھے اور والدہ کو بھی۔ مجھے لگا میرا پورا جسم کانپ رہا ہے، میں نے نظر دوڑائی کہ کچھ آسرا ملے تو ٹیک لگا لوں۔ ”پانی!“ بمشکل میرے منہ سے نکلا۔ اس نے لپک کر کرسی اٹھا کر لا کر میرے پاس رکھی اور ہاتھ بڑھا کر جھک گیا۔

”بیٹھیں! آپ بیٹھیں میں پانی لاتا ہوں۔“ میں نے اپنے لرزتے وجود کو سمیٹ کر کرسی پر گر ادیا۔ وہ جلدی سے کولڈ ڈرنک لے کر آیا، ٹھنڈی ٹھنڈی بوتل سے میرے اندر سکون اترنے لگا۔

”سوری! بھائی، ویری سوری۔“ میں نے آدھا ڈرنک پی کر اسے بوتل واپس کی۔ ”بہت شکریہ۔“ تھوڑی دیر میں حالت سنبھلی تو میں نے لٹی کے سفید پھول اسے پیک کر کے گلہ ستر بنانے کو کہا۔ اس کی ادائیگی کرتے ہوئے میں نے اس سے کولڈ ڈرنک کی قیمت پوچھی تو اس نے بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

”میڈم! میں غریب ضرور ہوں پر اتنا کم ظرف نہیں! وہ ڈرنک میں اپنی جیب سے لایا تھا۔“ دکان کے حساب سے نہیں.....“ وہ بولا تو اس کی آواز میں دکھ مجھے محسوس ہوا۔

”تو کیا یہ دکان تمہاری نہیں ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں تو جی آئندہ سو برس میں بھی ایسی دکان اور وہ بھی اس طرح کے علاقے میں بنانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں تو جی بارہ سو روپے ماہوار پر ملازم ہوں اور اس کے علاوہ جو کچھ بیچتا ہوں اس پر دو فیصد مجھے ملتا ہے۔“ اس نے وضاحت کی تو میں حیران رہ گئی۔ فی زمانہ وہ کس طرح اتنے میں گزارہ کرتا ہوگا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟ کچھ پڑھے لکھے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔ اصل میں مجھے نقاہت ہی اس قدر ہو رہی تھی کہ میں جان بوجھ کر کچھ وقت یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزارنا چاہ رہی تھی۔

”میرا نام مظہر ہے جی! میں نے بی کام کیا ہے۔ بھائی بڑے تھے اور والد صاحب کی وفات کے بعد انہی کے دم سے گھر کی گاڑی چل رہی تھی لیکن بھائی صاحب فیکٹری میں ہی پاؤں پھسل کر گرنے کے باعث مشین کی زد میں آ گئے، جس کی وجہ سے ان کی ٹانگ کٹ گئی اور یوں وہ کافی عرصے اسپتال میں پڑے رہے، ٹانگ کا زخم خراب ہو کر کینسر بن گیا اور بالآخر وہ موت کا شکار ہو گئے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”اوہو! بہت افسوس ہوا! کون کون ہے گھر پر تمہارے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ماں ہے جی اور تین جوان بہنیں! بھائی فیکٹری میں منیجر تھے، اچھی نوکری تھی اور کبھی برے دنوں کا تصور ہی نہ کیا تھا۔“ وہ جانے کیوں مجھے بتا رہا تھا۔

”تو فیکٹری کی طرف سے آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں ہوئی؟“ مجھے فیکٹری مالکان کی بے بسی

پر افسوس ہو رہا تھا۔

”جی کافی مدد کی تھی لیکن سب بھائی کی بیماری پر خرچ ہو گیا پھر فیکٹری کے مالک کا انتقال ہو گیا اور فیکٹری کے مالک تبدیل ہو گئے۔ میں ان کے پاس مدد کے لیے گیا تو انہوں نے کہا کہ جو مدد وہ کر چکے تھے وہ پہلے ہی صفر بھائی، میرے بڑے بھائی کے حق سے زیادہ تھی۔ تب میری انانے گوارا نہ کیا کہ میں بار بار اس فیکٹری میں بھیک مانگنے جاؤں۔ تین جوان بہنیں ہیں اس لیے کچھ نہ کچھ آسرا تو کرنا ہی تھا۔ نوکری ڈھونڈنا شروع کرو تو وہ دنیا کی ناپید ترین چیز بن جاتی ہے۔ صبح ایک ادارے میں دو کلاسیں لیتا ہوں تو چار ہزار وہاں سے مل جاتا ہے، بارہ سو یہاں سے مل جاتا ہے اور چار پانچ سو یہاں سے دو فیصد کے حساب سے اور بھی مل جاتا ہے بس اتنا ہو جاتا ہے کہ بھیک مانگنے سے بچ گیا ہوں۔“ وہ جانے فارغ ہونے کی وجہ سے یا پھر ذرا سی ہمدردی پا کر اپنا سارا حال مجھے کہہ رہا تھا یا شاید اس کی چہرہ شناسی تھی کہ میں اسے اس قابل نظر آئی تھی کہ اس کی بات توجہ سے سنوں گی۔

مظہر اور اس کے ناموں کی مماثلت سے مجھے قسمت کے اتار چڑھاؤ کا خیال آیا۔ وہ لڑکا مظہر سے چند سال ہی بڑا ہوگا اور اس پر ذمے داریوں کا کتنا بوجھ آ پڑا تھا۔ میں نے اسے پرس سے اپنا کارڈ نکال کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ اگلے آٹھ دس روز میں مجھ سے دفتری اوقات میں ملے۔ دفتر کا پتا اور دفتر کا فون نمبر کارڈ پر لکھا تھا۔ اس نے کارڈ ہاتھوں میں لے کر پڑھا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”ماہا احمد۔ ایم ڈی، جی ٹی ایم گروپ آف کمپنیز۔“

”یقین نہیں آ رہا!“ اس نے میرا کارڈ پڑھ کر حیران ہو کر کہا۔ میں سمجھی میری ظاہری حالت سے میں اسے ایم ڈی نہیں لگ رہی ہوں گی کیونکہ دیکھنے میں، میں کالج کی لڑکیوں کی طرح لگتی تھی۔ یہ تو قسمت اور تجربے نے اتنا عقلمند بنا دیا تھا، ورنہ میں زیادہ سے زیادہ اس وقت یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوتی اور عام لڑکیوں کی طرح بے پروا اور کھنڈری سی ہوتی لیکن میں نے زندگی میں گزشتہ دو سالوں میں ہر طرح کے اتار چڑھاؤ دیکھ لیے تھے۔

”کیا یقین نہیں آ رہا؟“ میں نے اسی کے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”کہ آپ جی ٹی ایم کی ٹینگ ڈائریکٹر ہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی اور سوال بھی۔

”اس میں ناقابل یقین بات کون سی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”غالب صاحب کے بعد تو کمپنی کے ٹینگ ڈائریکٹر کوئی اور تھے جن سے میں ملا تھا، سلطان

احمد صاحب!“ اس نے تصدیق چاہی۔

”وہ میرے والد ہیں، غالب احمد کے بعد انہیں کچھ عرصہ ذمے داری سنبھالنا پڑی۔ اب یہ

سب میری ذمے داری ہے، میں غالب احمد کی.....“ میں بیوی کہتے کہتے رک گئی۔ ”بیوہ ہوں“

اس کی نظروں میں میرے لیے ہمدردی کا جذبہ جاگا۔

”میرے بھائی اسی کمپنی کی ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”اوہ!“ میں نے افسوس کیا۔ ”بہر حال تم آنا، میں دیکھتی ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی

ہوں۔“ میں کافی بہتر محسوس کر رہی تھی اس لیے دکان سے نکل آئی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھولوں

کا گلہ ستر رکھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ مجھے گاڑی چلانا بھی محال لگنے لگا۔ مجھے قدم قدم پر

اندازہ ہوگا کہ بیوگی کتنی بڑی ذہنی اور جسمانی کمزوری کا نام ہے۔ جب زندگی میں بارہا مجھے ایسے

لمحوں کا سامنا کرنا پڑے گا کہ غالب کی یاد آتے ہی میری ٹانگیں بھی میرے جسم کا بوجھ سنبھالنے

سے عاری ہو جائیں گی اور مجھے یوں لگا کہ نہ میں گاڑی میں ہوں، نہ گاڑی کہیں سرباز کھڑی

ہے، بس میر تھی اور میری تنہائی۔

میں نے بسٹکل گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی کا رخ قبرستان کی طرف موڑ لیا۔ جانے کینٹ

سے گاڑی ڈیفنس کی طرف کیسے مڑ گئی مجھے اندازہ ہی نہ ہوا اور پھر قبرستان کے پاس پہنچ کر گاڑی

باہر ہی روک لی۔ باہر کھڑے ہو کر ہی فاتحہ پڑھی۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو سوروپے کا ایک لال

نوٹ دیا وہ ہمیں پہچانتا تھا۔ شکریہ کہہ کر اس نے سیلوٹ مارا۔ میں دوبارہ کینٹ کی طرف روانہ

ہوئی، جانے میں کس دھیان میں تھی اور جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے غائب دماغی سے گاڑی

چلاتے ہوئے لال بسٹکل بھی نظر نہیں آیا اور میں اسی رفتار سے گاڑی چلاتی ہوئی عین چوک کے

درمیان میں ایک تیز رفتار بس کی زد میں آ گئی اور اس کے بعد چرانگوں میں روشنی نہ رہی۔

جب ہوش آیا تو خود کو ہر طرف سفید سفید ماحول میں پایا، دماغ بالکل خالی تھا۔ پہلا خیال تو یہی آیا کہ شاید میں مرچکی ہوں پھر ماحول میں رچی دواؤں کی بونے بتایا کہ میں زندہ تھی اور کسی اسپتال میں تھی، ورنہ مجھے سفید کپڑوں میں چلتی پھرتی نرسیں فرشتے ہی لگ رہی تھیں۔ والدہ میرے پاس ہی بیٹھی تھیں تسبیح ہاتھ میں لیے ہوئے، چہرے سے ہی برسوں کی بیمار نظر آرہی تھیں۔ جانے کس دھیان میں تھیں، ان کا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا تھا۔ انہیں متوجہ کرنے کو میں نے اپنے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دی۔ وہ فوراً چونک کر اٹھیں۔ مجھے آنکھیں کھولے دیکھا تو بے اختیار جھک کر میری آنکھوں کا بوسہ لیا۔ ”ماہا! میری بیٹی، تم ٹھیک تو ہونا؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ان کا ہاتھ دبایا، مجھ میں ابھی بولنے کی طاقت نہ تھی۔

”میں صدقے جاؤں، میری جان! کیا ہو گیا تھا تمہیں؟ تم تو عرصے سے اتنی اچھی ڈرائیونگ کر رہی ہو؟“ انہیں یقیناً میری غلطی پر حیرت ہو رہی تھی۔ جواب میں میری آنکھوں سے فقط آنسو نکل کر میرے کانوں تک بہنے لگے۔ انہوں نے ٹشو پیپر لے کر میری آنکھیں اور کان صاف کیے اور بیڈ کے کنارے لگی گھنٹی بجا کر نرس کو بلا کر بتایا کہ میں ہوش میں آ گئی تھی۔ نرس نے ڈرپ اور آکسیجن چیک کی پھر ہاتھ رکھ کر نبض چیک کی، آنکھیں کھول کر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کیسا محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے بولنے کی کوشش کی مگر میری بھٹکل ”ہوں“ کی آواز نکلی۔

”آپ اطمینان رکھیں، ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے۔“ اس نے میرا کبل ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ”آئی آپ بھی تھوڑی دیر آرام کر لیں، تین دن سے اسی بیچ پر بیٹھی ہیں۔“ اور والدہ کے ساتھ اس کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں تین دن سے اسپتال میں تھی اور وہ بھی بے ہوش۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ والدہ سے پوچھ پاتی کہ مجھے ہوا کیا تھا، چوٹوں کی نوعیت کیا تھی۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! اب جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گی! اللہ نے میری بیٹی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے مجھے لوٹا دی ہے۔ اب میں گھر چلی جاؤں گی۔ بہت شکریہ بیٹا!“ والدہ نے نرس سے کہا۔

”والدہ!“ میں نے اپنی ہمت مجتمع کر کے آواز نکالنے کی کوشش کی۔ کچھ مبہم سا میرے منہ سے کلمہ ادا ہوا اور والدہ لپک کر آئیں۔

”کیا بات ہے میری جان؟“ انہوں نے اپنا کان میرے منہ کے نزدیک کر لیا۔

”کیا ہوا؟“ بھٹکل میں نے پوچھا۔

”ہٹا نہیں بیٹا، سمجھ میں نہیں آیا۔ بری طرح تمہاری گاڑی بس سے ٹکرائی تھی۔ وہ ڈرائیور تو درست تھا، تمہاری طرف کا سگنل بند تھا پھر بھی تم..... اچھا چھوڑو، تم ٹھیک ہو جاؤ گی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے میری توجہ بٹانی چاہی۔

”والدہ!“ میں نے پھر پکارا۔ ”میں ٹھیک ہوں؟“

”ہاں بیٹا تم بالکل ٹھیک ہو؟“ انہوں نے بتایا اور مجھے بھی اندازہ ہوا کہ مجھے کہیں درد نہ ہو رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں مسکن دواؤں کے زیر اثر تھی۔ میرے ذہن کو یہ یقین ہو گیا کہ ایسا ہی تھا۔ مجھے مسکن دواؤں کے تحت رکھا گیا تھا اور یقیناً اس لیے رکھا گیا تھا کہ میں زیادہ تکلیف محسوس نہ کروں۔ جانے میں کتنی زخمی تھی۔ شاید کوئی عضو کاٹ دیا گیا ہو یا ہڈیاں فریکچر ہو گئی ہوں۔ مجھ میں اس سے زیادہ تفصیل پوچھنے کی سکت نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر آئے اور انہوں نے مجھے ہوش میں آنے پر مبارک باد دی۔ میں نے بصد کوشش مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس سے زیادہ کی ہمت ہی نہ تھی اور ہوش میں آنے کے بعد مجھے باری باری سب لوگ ملنے آتے رہے، تیور کی بھی کال آئی تھی۔

مجھے ہوش میں آئے دو دن ہو چکے تھے اور مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ میں اندرونی چوٹوں سے توجع گئی تھی ماسوائے ایک پنڈلی کی ہڈی کے فریکچر کے، البتہ بیرونی چوٹیں کافی آئی تھیں اور زخموں پر ٹانگے لگائے گئے تھے، خون کے زیاں کی وجہ سے کمزوری بہت ہو گئی تھی۔ بے ہوشی کے تین دنوں میں کتنی ہی بوتلیں خون کی بھی لگائی گئی تھیں۔ اس روز صدف آپی میرے پاس تھیں، لیور گھا کر انہوں نے میرا بیڈ اونچا کیا اور کمرے کی کھڑکی کے پردے ہٹائے، باہر لان کی طرف کھڑکی تھی۔ کتنے ہی دنوں کے بعد میں دنیا کی خوبصورتیاں دیکھ رہی تھی۔

”آپی آئینہ ہے آپ کے پاس؟“ میں نے صدف باجی سے پوچھا۔

”کیا کرنا ہے؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”آئینے کو کیا کرتے ہیں؟“ میں نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

”وہ تو دیکھتے ہیں مجھے علم ہے مگر میرا مطلب ہے کیا دیکھنا ہے؟“ وہ حیرت سے بولیں۔

ہے تو ڈرپ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے ڈرپ اترادی اور بلڈ پریشر والا آلہ بھی اور نرس سے کہا کہ دن میں تین دفعہ بلڈ پریشر چیک کرتی رہے۔

میں نے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے دست و بازو آزاد ہوئے۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی میں نے اٹھا کر انہیں سامنے لا کر دیکھنے کی کوشش کی تو نا طاقی کے سبب بازو اٹھائے نہ گئے۔

”آپی!“ میں نے صدف آپی کو پکارا۔ ”میرے بازو اور ہاتھ مجھے دکھادیں، مجھ سے اٹھائے نہیں جا رہے۔“ انہوں نے آکر پہلے میرا دایاں بازو اٹھا کر میرے سامنے کیا تو کندھے سے درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ میرے بازو پر دو تین جگہ ایک دو ٹانگے لگے ہوئے تھے، نیل اور سوجن بھی تھی۔ یہی حال بائیں بازو کا تھا اور اس سے بڑھ کر درد تھا بائیں کندھے میں۔

”میرے کندھوں پر بھی زخم ہیں کیا؟ بہت دکھ رہے ہیں۔“ میں نے آپی سے پوچھا۔

”زخم نہیں ہیں بس کوئی دب لگ گئی ہوگی اور اس کے علاوہ اتنے دنوں سے ایک ہی پوزیشن میں لیٹے رہنے کے باعث بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کوئی تیل لوشن وغیرہ ملے تو تمہارے کندھوں کی مالش کر دیتی ہوں۔“ انہوں نے اپنا پرس منڈلا تو اس میں سے بڑی سی بوتل لوشن کی نکل آئی۔

”اتنی بڑی لوشن کی بوتل رکھی ہوئی ہے آپ نے اور ایک چھوٹا سا آئینہ بھی نہیں ہے آپ کے پاس۔“ میں نے صدف آپی سے شکوہ کیا۔

”کہا تو ہے کل لادوں گی۔“ انہوں نے مجھے پھر بہلایا اور لوشن لگا کر میری گردن کے گرد مساج کرنے لگیں۔ مجھے مزید درد ہونے لگا پھر انہوں نے نرس کو بلایا اور اس کی مدد سے میری کروٹ بدلی اور کروٹ بدلنے کے عمل سے مجھے اندازہ ہوا کہ سب سے زیادہ تکلیف مجھے بائیں ٹانگ میں ہو رہی تھی۔ یقیناً میری بائیں ٹانگ کی پنڈلی کی ہڈی فریکچر ہوئی تھی۔ میں شدید تکلیف سے کراہی۔ صدف آپی خود بھی ڈاکٹر تھیں اور جانتی تھیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوگی لیکن ان کے خیال میں بہت دن گزر گئے تھے اور میرا کروٹ بدلنا بہت ضروری تھا۔

”دھیرج چندا دھیرج!“ میری ٹانگ کے نیچے انہوں نے ایک ٹکیہ رکھا۔ پلاسٹر کی وجہ سے ٹانگ کو حرکت دینا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ کروٹ بدلی تو دائیں طرف بیڈ کے ساتھ ہی ٹرے میں کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ میری نظر ان پر جم گئی۔ آپی میری ٹانگ سیٹ کر رہی

”ذرا دیکھوں کہ آئی بروٹھیک بنی ہوئی ہیں کہ نہیں؟“ میں نے مذاقاً کہا۔

”دیکھتی ہوں!“ کہہ کر انہوں نے پرس میں ادھر ادھر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔

”سوری ماہا! اس وقت تو نہیں ہے، میں کل لے کر آؤں گی۔ ہاتھ روم میں ہے تو سہی مگر میں کیسے تمہیں اٹھا کر لے جاؤں؟ ویسے تمہاری آئی برو بالکل ٹھیک ہیں۔“ صدف آپی نے مجھے تسلی دی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صدف باجی کے اتنے زنبیل نما پرس سے آئینہ نہ نکلتا۔ یقیناً وہ مجھے آئینہ دینا نہ چاہ رہی تھیں۔ اسی بات نے مجھے شبہ میں ڈال دیا کیونکہ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ میرے چہرے کی کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ عجیب سا احساس ہوتا تھا اور مائع خوراک ہی کھا رہی تھی مگر اسے نگلتے ہوئے بھی چہرے اور جڑے میں درد ہوتا تھا۔ میرے ہاتھ میری اطراف میں بیلٹ سے بندھے ہوئے تھے ورنہ میں چہرے کو ہاتھ لگا کر ہی محسوس کر لیتی۔

”آپی! میرے بازو کب آزاد ہوں گے؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔

”جلدی! چندا بہت جلد، جونہی تمہاری ڈرپ اترے گی۔ ایک بازو پر بلڈ پریشر چیک کرنے کا آلہ لگا ہوا ہے اس لیے تمہارے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔“ انہوں نے مجھے تسلی دی۔

”آپی! کیا میرے چہرے پر بھی ٹانگے لگے ہوئے ہیں؟“ میں نے امید اور ناامیدی کی کیفیت کے بین بین جھولتے ہوئے کہا۔

”بس دو ایک ماہ! زیادہ نہیں، اصل میں ونڈ اسکرین ٹوٹ کر اس کی کڑیاں تمہارے چہرے پر گری ہوں گی تو تم نے گھبرا کر چہرہ نیچے کر لیا ہوگا اور تمہارا چہرہ اسٹیرنگ سے ٹکرا گیا۔ اگر تم گاڑی کی حالت دیکھو تو سب سے پہلے اپنے زندہ بچ جانے پر ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔“ صدف آپی نے وضاحت کی۔ ”تمہارا بچ جانا جانے کن دعاؤں کا معجزہ ہے۔“ اس میں تو کوئی شک نہ تھا مجھے کہ والدہ اور امی جان دونوں میری صحت، سلامتی اور سکون کے لیے دعا گورہتی تھیں اور میرے زندہ بچ جانے میں بھی سب سے بڑھ کر ان کی دعائیں ہی مدد و معاون ثابت ہوئی ہوں گی۔

”ڈاکٹر تو مایوس ہو گئے تھے۔“ صدف آپی نے اضافہ کیا۔ میں نے آہستگی سے ہوں کہہ کر آنکھیں مونڈ لیں اور اسی روز دوپہر کے کھانے سے ذرا دیر پہلے ڈاکٹر زراؤنڈ پر آئے تو انہوں نے میری درخواست پر نرس سے میرے بازو آزاد کرنے کو کہا۔

”بی بی! اگر آپ بہتر محسوس کر رہی ہیں اور مائع خوراک لے رہی ہیں، الٹی متلی کی کیفیت نہیں

تھیں۔ میں نے بازو لمبا کر کے ہاتھ بڑھایا تو اسٹیل کی پلیٹ میرے ہاتھ میں آگئی، میں نے اسے اپنے چہرے کے سامنے کیا اور غور سے دیکھتے ہی پلیٹ میرے ہاتھ سے گر گئی اور اسپتال کا وہ کمرہ چیخوں سے گونج اٹھا۔ یہ وہ بھیاں تک حقیقت تھی جس کا سامنا کرنے سے بچانے کے لیے آپنی نے مجھے آئینہ نہیں دیا تھا۔ میرے خوبصورت چہرے پر لالی، نیلا ہٹ اور چھوٹے چھوٹے کئی کٹ تھے مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز میرے جڑے پر لگے ہوئے ٹانگے تھے جو ایک کان کی لو کے نیچے سے شروع ہو کر دوسرے کان کی لو تک چلے گئے تھے۔

”پاگل مت بنو ماہا!“ آپنی مجھے سنبھال رہی تھیں۔ ”میں تمہیں اتنا بے وقوف تو کبھی بھی نہیں سمجھتی تھی۔“ چیخنے سے میرے جڑوں میں تکلیف اور چہرے پر جلن ہونے لگی، مجبوراً مجھے اپنی چیخیں روکنا پڑیں اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر خاموشی سے سکھنے لگی، آنسو بہے جا رہے تھے۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا..... میں تمہیں بتا رہی ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے میرے ماتھے سے بال ہٹا کر میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”کیا ٹھیک ہو جائے گا آپنی؟“ میں آہستگی سے رو رہی تھی۔

”سب زخم بھر جائیں گے، میری چندا!“ انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اب میں چندا کہاں رہ گئی ہوں۔ میرا تو چہرہ ہی خراب ہو گیا ہے۔“ میں نے سسک کر کہا۔

”یہ سب عارضی ہے میری جان، کچھ عرصہ لگے گا تمہارے سب زخم ٹھیک ہو جائیں گے، ٹانگوں کے نشان بھی رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے۔ خصوصاً تمہارے چہرے کے ٹانگے تو شہر کے مشہور پلاسٹک سرجن نے لگائے ہیں۔“ وہ مجھے تسلی دے رہی تھیں۔

”آپ مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہی ہیں؟“ میں نے آنسو بھری نگاہیں ان کے چہرے پر جمائیں۔

”ارے نہیں جھوٹ کیوں بولوں گی میں؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالی۔

”اور تمہارے ہاتھ اور بازو جکڑے رہتا تمہارے ہی فائدے کے لیے تھا، کیونکہ زخم ٹھیک ہو رہے ہوتے ہیں تو ان میں خارش اور کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور نادانستگی میں انسان بسا اوقات انہیں چھیل دیتا ہے اور پھر اس کا نشان باقی رہ جاتا ہے۔“ باجی مجھے سمجھا رہی تھیں۔

”تو کیا میرا چہرہ بالکل پہلے جیسا ہو جائے گا؟“ میں اب بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

”انشاء اللہ!“ انہوں نے پورے یقین سے کہا ”مگر اس کے لیے شرط ہے کہ تم اپنے ہاتھ

قابو میں رکھو اور کچھ بھی ہوزخم کو کھچاؤ نہیں۔“

”تو کیا میں دوبارہ ڈرپ اور بلڈ پریشر کا آلہ لگوالوں؟“ میں نے سادگی سے آپنی سے پوچھا تو وہ ہنس پڑیں۔

”نہیں دوبارہ ڈرپ وغیرہ لگوانے کی ضرورت نہیں، میں تمہارے ہاتھوں کا کوئی بندوبست کرتی ہوں۔“ باجی نے کہا۔

”تھکڑی لگوا دیں؟“ میں نے آنسو پی کر ہنسنے کی کوشش کی، وہ بھی میری اس بات پر ہنس پڑیں۔

”نہیں میں دیکھتی ہوں کہ کسی طرح تمہارے ہاتھ تمہارے چہرے کی طرف نہ جا سکیں۔“

رات کو تانیہ تمہارے پاس ہوگی تو میں اسے سمجھا دوں گی کہ وہ تمہارے ہاتھوں کو قابو میں رکھے۔“

صدف آپنی نے کہا۔ رات تانیہ آپنی میرے پاس تھیں اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور۔ وہ کوئی

کتاب پڑھنے کو لائی تھیں، لیپ جلا کر وہ کتاب پڑھ رہی تھیں اور بار بار مجھے سو جانے کا کہہ رہی

تھیں لیکن مجھ سے تو نیند کسی ضدی دوست کی طرح ناراض تھی۔

دفتر کے اسٹاف کے لوگ بھی مجھے دیکھنے اسپتال آتے رہے۔ عائشہ باجی امید سے تھیں اس لیے نہیں آسکیں۔ ان کی شادی کے دس سال کے بعد وہ پہلی بار اس خوشی کا انتظار کر رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے انہیں سفر سے منع کیا تھا۔ مظہر اور امی جان بھی ہر روز آتے تھے، والدہ، علی بھائی، صدف

آپنی اور ابو بھی ہر روز آنے والوں میں سے تھے۔ البتہ تانیہ آپنی اپنے سسرال کی مجبوریوں کی وجہ

سے فقط دو ایک دفعہ میرے پاس رات رہ سکیں۔ باقی وقت باری سے امی اور صدف آپنی میرے

پاس رہ رہی تھیں۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے زخم بھرنا شروع ہو گئے تھے، چہرے کے نیل، لالیاں اور

سوجن کافی حد تک مندر ہو رہے تھے اور زخم بھرنے کے وقت میں کھنچاؤ اور خارش کی برداشت بھی

ختم ہو جاتی تھی۔ صدف آپنی لوٹن، کریمیں اور جانے کیسی کیسی دوائیں خود استعمال کر رہی تھیں کہ

میری اذیت ذرا کم ہو جاتی تھی اور میں خود بھی جانتی تھی کہ زخموں کو چھوؤں گی تو خراب ہو جائیں

گے۔ آئینے کا بار بار سامنا کرنے کی ہمت بھی نہ تھی اور میرے لیے تو ہر آنے والے کی نظر ہی آئینہ

تھی۔ جس طرح مجھے دیکھ دیکھ کر ہر آنے والے کے چہرے پر ترس اور ہمدردی کے جذبات

”ابھرتے تھے وہ مجھے بتانے کو کافی ہوتے تھے کہ میری حالت کافی قابلِ رحم ہے۔ وہیل چیئر اور کبھی بیساکھوں کے ساتھ میں نرس کی مدد سے ہاتھ روم بھی چلی جاتی تھی اور دو تین دن کے بعد نرس سے کہہ کر جسم پر نیم گرم تولیے سے صفائی کروا کے کپڑے بھی تبدیل کرواتی۔ اس روز میں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بیساکھیاں لے کر کھڑی ہوئی، ہاتھ روم جانے ہی والی تھی کہ ٹھنک گئی، نرس باہر جاتے ہوئے دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی اور اس کھلے دروازے میں تیمور کھڑا تھا، اس کے ساتھ ہی مظہر بھی تھا۔ تیمور کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میری کیفیت کے اس قدر ”خراب“ ہونے کا اندازہ نہ تھا ورنہ وہ اس طرح شک کی حالت میں نہ آ جاتا۔

”بھابی! یہ کیا ہو گیا ہے، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔“ وہ بمشکل بولا۔

”بس ویکہ لونچ گئی اور زندہ تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ آگے بڑھا

اور میرے ایک ہاتھ سے بیساکھی لے کر مجھے قہام لیا اور بیڈ پر بیٹھنے میں میری مدد کی۔

”یہ سب کیسے ہوا؟ اتنا شدید حاوشہ! گاڑی تو بری طرح تباہ ہوئی ہے، اس حساب سے تو

آپ کی حالت قدرے بہتر لگ رہی ہے، مگر پھر بھی!“ وہ رک گیا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں تو ایک سرساز پر گیا ہوا تھا، واپس آ کر خود ہی خیریت معلوم کرنے کو فون کیا تو علم ہوا.....

لیکن امی جان نے یہی بتایا کہ اللہ نے آپ کو بچا لیا۔“ وہ بتا رہا تھا۔

”ابھی تو بھابی کی حالت بہت بہتر ہے تیمور بھائی، پہلے دن جب میں نے بھابی کو ہوش میں

آنے کے بعد دیکھا اس دن تو یہ بالکل بھوت لگ رہی تھیں اور اس سے قبل تین دن تو ڈاکٹروں

نے گھر کے کسی بھی فرد کو زندہ دیکھنے نہیں چھکنے دیا۔ ڈاکٹر تو ان کی زندگی سے بھی مایوس تھے۔“ مظہر

نے میری تمام کیفیت بتا کر میری مشکل آسان کر دی۔

”بھوت تو ابھی تک لگ رہی ہوں مظہر! بلکہ اب تو لنگڑا بھوت لگ رہی ہوں۔“ میں نے

ہنس کر کہا۔

”ارے نہیں بھابی، میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ انسان کا اندر خوبصورت ہونا

چاہئے۔ ظاہری شکل صورت کی تو اتنی اہمیت بھی نہیں ہوتی۔“ مظہر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”مظہر باہر کینٹین سے کوئی جوس وغیرہ ہی لادیتے تیمور کو۔“ میں نے مظہر سے کہا کیونکہ میرے

خیال میں تیمور سیدھا اسپتال ہی آ رہا تھا۔ ”سیدھے اسپتال ہی آرہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جی! اس لیے کہ وقت ہی مختصر تھا اور ای جان کو بھی کہہ دیا ہے کہ یہیں آ جائیں، مجھے آج ہی

واپس جانا ہے، پھٹی نہیں ملتی ان دنوں، کافی مشکل روٹین ہے۔ بیس دن کے بعد ٹرم بریک آرہی

ہے، پھر آؤں گا۔ انہی دنوں غالباً نگہت بھی آرہی ہے، ابھی مظہر بتا رہا تھا۔“ نگہت کے آنے کا سن

کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مظہر جوس لینے چلا گیا تھا۔

”کیا بات ہے بھابی! کیوں کیا آپ نے یہ؟“ تیمور نے سوال کیا تو میں حیران رہ گئی۔

”کیا.....؟ کیا کیا میں نے؟“ میں حیران تھی۔

”یہ جو آپ نے مرنے کی کوشش کی ہے؟ آپ کو لگتا ہے کہ آپ کو کچھ ہو جائے تو کسی کو کوئی

تکلیف نہیں ہوگی؟ ہم سب اس طرح کے سانچے کو برواشت کر سکتے ہیں؟“ وہ میرے سامنے بیٹھا

مجھ سے عجیب سا سوال پوچھ رہا تھا۔

”کیا تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے خودکشی کی کوشش کی ہے؟“ حیرت سے میرے منہ سے بات

ہی نہیں نکل پارہی تھی۔

”تو اور وہ سب کیا تھا؟ اتنی بے پروائی سے گاڑی تو آپ کبھی نہیں چلاتیں؟“ وہ مجھ سے

پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک کہتے ہو!“ مجھے اس کی بات کا کوئی جواب نہ سوجھ رہا تھا۔ ”لیکن میں بھلا خودکشی

کیوں کروں گی؟“

”یہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں؟“ تیمور نے سوال کیا۔

”اگر مجھے خودکشی کرنا ہوتی تو اس کے لیے بہترین وقت غالب کی وفات کے بعد تھا۔ وہ تو

میرے لیے ایسا صدمہ تھا کہ شاید میں دکھ سے مر جاتی، اگر میں اس دکھ کو جھیل گئی تو اب اتنا وقت

گزارنے کے بعد خودکشی کا کیا جواز ہے.....“ میں نے تاسف سے کہا۔

”کچھ کہنا مشکل ہے، بسا اوقات جانے کون سی بات انسان کو مایوسی کے گہرے غاروں میں

لے جاتی ہے اور پھر اس عالم میں کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔“ تیمور نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے تیمور! اور جب میں نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا عزم

کر رکھا ہے۔ تو مجھے کوئی بھی بات کمزور نہیں کرتی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”پھر بھی اگر کوئی مسئلہ ہے تو پلیز مجھ سے مت چھپائیں۔“ تیمور نے برادرانہ شفقت کے انداز میں کہا۔

”کوئی ایسی بات نہیں، بس دھیان سنگل کی طرف نہیں تھا۔“ میں نے حقیقت بیان کی۔

”قبرستان گئی تھیں آپ؟“ تیمور نے پوچھا۔

”ہوں“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”آئندہ اکیلی نہیں جائیں، اسی وجہ سے واپسی میں آپ کا دھیان بھٹک گیا۔“ وہ مجھے

سمجھا رہا تھا۔

”اوکے! آئندہ خیال رکھوں گی جناب!“ میں نے خوش دلی سے کہا۔

”میں نے مظہر سے کہا ہے کہ وہ گاڑی وغیرہ اپنی نگرانی میں اچھی ورکشاپ سے مرمت کروالے گا۔“ تیمور نے کہا۔ تبھی مظہر جو سز لے کر آگیا اور تھوڑی دیر میں ہی امی جان آگئیں، ان کے ہمراہ ماہ رخ تھی۔ ادھر علی بھائی کے ساتھ والدہ بھی آگئیں اور پھر اس کمرے میں گویا محفل ہی جم گئی۔ علی بھائی اور تیمور کی آپس کی نوک جھونک، والدہ اور امی جان کی میرے لیے تشویش، ماہ رخ اور تیمور کی نگاہوں کی چوریاں اور مظہر کی محسوس شرارتیں۔ یہ سب بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا اس لیے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

دو گھنٹے سے بھی کم عرصے میں تیمور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ علی بھائی اسے بس اسٹینڈ تک چھوڑنے جا رہے تھے۔ میں نے تیمور کو جاتے ہوئے روک کر پاس بلایا اور کہا کہ وہ ماہ رخ کو بھی ساتھ لے جائے۔ بے چاری خاص طور پر ملنے آئی تھی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ واپسی پر علی بھائی کے ساتھ اکیلی کیسے آئے گی؟

”تو مظہر کو بھی ساتھ لے جاؤ۔۔۔۔۔“ میں نے اصرار کیا۔

”نہیں مظہر کو امی اور آنٹی کو گھر چھوڑنا ہے اور ماہ رخ غالباً ابھی رکے گی آپ کے پاس۔“

اس نے جواب دیا۔

”مگر وہ کیا سوچے گی؟“ مجھے ماہ رخ پر ترس آیا۔

”وہ کچھ سوچے نہ سوچے آپ ضرور سوچ سکتی ہیں۔“ اس نے شرارت سے کہا۔

”میں کیا سوچوں گی بھلا؟“ میں حیران ہوئی۔

”کہ شاید میں اس سے ملنے آیا ہوں۔“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔ ”مگر مجھے آپ کو یقین دلانا ہے کہ میں آپ سے ملنے آیا ہوں اس دفعہ کسی اور سے نہیں۔“

”میں نے کب شک کیا ہے کہ تم مجھ سے ملنے نہیں آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی نہیں کر رہی لیکن اگر میں ماہ رخ سے ملنے کو بے تاب ہوں گا تو تب تو آپ شک

کریں گی ہی ناں؟“ وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

”بالکل بھی نہیں! ہرگز شک نہیں کروں گی، پکا وعدہ!“ میں نے اصرار کیا۔

”اونہوں، مناسب نہیں۔ ویسے بھی امی کو اس طرح اس کا ہمارے ساتھ جانا شک میں

جتلا کر دے گا۔ یوں بھی میں اور علی ہو سکتا ہے کہ راستے میں کسی دوست سے بھی ملنے کو کہیں۔“ اس

نے وضاحت کی تو گویا وہ اس کو ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ مجھے اس وقت ماہ رخ سے بہت ہمدردی

محسوس ہوئی۔ تیمور اور علی بھائی کے روانہ ہونے کے بعد جلد ہی امی جان اور والدہ بھی مظہر کے

ساتھ چلی گئیں۔ ماہ رخ میرے پاس رہ گئی تھی۔ ہم ابھی ”خوشی“ کے بارے میں ہی باتیں کر رہے

تھے کہ صدف آپنی آگئیں اور تھوڑی دیر مزید بیٹھ کر ماہ رخ نے اجازت چاہی۔

صدف آپنی نے اس دن ڈاکٹر کے پاس بیٹھ کر تفصیلی بات چیت کی اور کمرے میں واپس آ کر

مجھے خوش خبری سنائی کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔ ضروری

دوائیں وغیرہ لکھوا کر مجھے دو دن کے بعد اسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا اور جب تک ضرورت

رہے گی میں معائنہ وغیرہ کے لیے آتی رہوں گی۔ فریکچر والی ہڈی کے جڑنے میں کم از کم چھ ہفتے کا

عرصہ درکار تھا اور اتنا وقت اگر میں اسپتال میں گزارتی تو بوریت کے مارے نیم پاگل ہو جاتی۔

”اسپتال سے فارغ ہو کر کہاں جانا پسند کرو گی؟ والدہ کے گھر یا سسرال؟“ صدف آپنی مجھ

سے پوچھ رہی تھیں۔

”آپ بتائیں کیا کروں؟“ میں نے سوال کیا۔

”تم اپنی سہولت کے مطابق فیصلہ کرو۔“ انہوں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

”میرے لیے دونوں گھر ایک جیسے ہیں اس لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔“ میں سوچ رہی تھی۔

”میرے خیال میں والدہ کی طرف چلی چلو۔ جب تک تم خود کو مکمل طور پر بیساکھیوں کی



عادت ڈال لو اور تمہارے زخم کچھ بہتر ہو جائیں۔ مجھے بھی امی کا گھر نزدیک پڑے گا میں چکر لگاتی رہوں گی۔ تھوڑے دنوں میں عائنہ بھی ڈیوری کے لیے آنے والی ہے۔“ صدف آپنی نے میری، مشکل آسان کی۔

”ٹھیک ہے ایسا ہی کر لیتی ہوں۔“ میں مطمئن ہو گئی۔ دودن کے بعد صدف آپنی بڑی گاڑی لے کر آئیں اور مجھے میرے سامان سمیت اسپتال سے گھر منتقل کر دیا۔ میں نے گھر پہنچ کر سکون کا سانس لیا۔ واقعی گھر اور اسپتال کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر میں نے صدف آپنی سے کہا کہ کسی طرح مجھے نہلا دیں۔ انہوں نے بھد مشکل میرے چہرے کے زخموں کو بچاتے ہوئے لٹا کر میرے بال شیمو کیے اور پھر انہیں سکھا اور سمیٹ کر مجھ کرسی پر بٹھا کر ٹانگ میز پر رکھ کر احتیاط سے نہلایا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اسپتال کا ماحول، دواؤں کی بو اور اسپرٹ وغیرہ کے استعمال سے یوں لگ رہا تھا جانے مجھے کیا چٹ گیا ہے۔ اب اپنا آپ ہلکا لگنے لگا۔ نہانے کے بعد صاف کپڑے پہنے۔ والدہ نے دودھ گرم کر کے زبردستی پلایا، پھر والدہ نے مجھے کہا کہ میں فون کر کے امی جان کو گھر آنے کی اطلاع کر دوں۔ کافی دیر تک فون کرتی رہی لیکن کوئی فون اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہیں امی جان بیمار نہ ہو گئی ہوں۔ کوئی بھی گھر پر نہ تھا۔ ابھی تو مظہر کا کالج بھی شروع نہ ہوا تھا۔ تبھی گیٹ پر کھنٹی کی آواز سن کر ابو باہر گئے تو واپسی پر ان کے ساتھ امی جان اور مظہر تھے اور وہ حیران تھیں کہ میں گھر کیسے پہنچ گئی۔

”بیٹا ہم تو آپ کو اسپتال سے لینے کے لیے گئے تو علم ہوا کہ آپ صبح ہی چلی گئی تھیں؟“ امی جان نے شفقت سے کہا۔

”جی وہ صدف آپنی آگئی تھیں بچوں کو اسکول اور کالج ڈراپ کر کے مجھے لینے کیونکہ دوپہر میں انہیں اپنے کلینک جانا ہوتا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”ہم اسپتال گئے تو علم ہوا کہ بھابی وہاں سے فرار ہو چکی ہیں۔“ مظہر نے مسکرا کر کہا۔

”فرار ہونے کی پوزیشن میں تو بالکل نہیں ہوں مظہر! دیکھ لو۔“ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

”مگر بیٹا تم یہاں کیوں آئیں، بہن جی کو خواہ مخواہ زحمت دی۔ تھوڑے دنوں میں عائنہ بھی آنے والی ہے خیر سے، تو وہ ان کی کافی مصروفیت ہے۔“ امی جان نے مجھ سے پوچھا۔

”ایک ہی بات ہے امی جان! اصل میں والدہ کی طرف آنے کے لیے ہی اس روز دفتر سے نکلی تھی تو سوچا چلو اپنا وعدہ نبھاتی ہوئی چلوں۔ چند دنوں میں گھر آ جاؤں گی۔ وہیں تو مجھے جانا ہے بالآخر۔“ میں نے ان کو تسلی دی۔

”میں نے تو بیٹا خاص طور پر تمہارے لیے ملازمہ بھی رکھی ہے جو صرف تمہارا خیال رکھے گی اور یہ چھوٹو تمہارے لیے وہیل چیئر بھی لایا ہے تاکہ تمہیں سہولت رہے۔ بہر حال جہاں تم آرام محسوس کرو، میں اصرار نہیں کرتی۔“ انہوں نے شفقت سے کہا۔

”ارے نہیں امی جان! اپنے گھر سے زیادہ مجھے کہاں آرام ہو سکتا ہے۔ یوں بھی نگہبانی والی ہے میں اس سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔ عائنہ باجی آئیں گی تو میں مل کر آ جاؤں گی۔“ میں نے فوراً بات کو سنبھال دیا۔

”نہیں بیٹا، میں کوئی ناراض تو نہیں ہوں۔ بخوشی تمہیں اجازت دے رہی ہوں جب تک جی چاہے رہو۔“ امی جان نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”بس اللہ کرے تمہارے زخم جلد ٹھیک ہو جائیں اور ٹانگ کی ہڈی بھی ٹھیک سے جڑ جائے۔“

”شکریہ امی جان! بس مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ”میں جلد ہی گھر واپس آ جاؤں گی۔“

”مظہر کل ہی آج شام کو تمہیں وہیل چیئر دے جائے گا۔“ امی جان کہنے لگیں۔

”مظہر میری کتابیں بھی دوا یک دے جانا، یوں فارغ دن گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ میں نے مظہر سے کہا۔

”گویا آپ کا ارادہ لمبا عرصہ رہنے کا ہو رہا ہے۔“ مظہر نے سوال کیا۔

”ارے نہیں، اس لیے کہہ رہی ہوں کہ فارغ بیٹھنے کی بالکل عادت نہیں۔ ذرا وقت کاٹنا آسان ہو جائے گا۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”اور آفس کال کر کے نوید صاحب سے پوچھ لینا اگر کوئی فائل میری توجہ کی منتظر ہو تو مجھے بھجوا دیں۔“

”بس رہنے دو ماہیٹا! آرام کرو، خود کو ذہنی اور جسمانی سکون دو۔ سچ! میں تو یہ سوچ کر ہی ہوتی تھی کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو یہ دنیا کے دھندے اور جھیلے یہیں دھرے کے دھرے رہ جاتے۔“ امی جان گویا ہوئیں ”مجھ میں اب کسی اور صدمے کو سہارنے کی سکت نہیں اس عمر میں۔“

”آپ ماؤں کی دعائیں تو مجھے موت کے منہ سے بھی کھینچ لائیں اور آئندہ بھی مجھے انہی پر یقین ہے۔“ میں نے پوری صداقت سے کہا۔

”اللہ تمہیں سلامت رکھے اور اب تم ٹھیک ہو کر گھر میں آرام سے بیٹھو، گاڑی چلانے کے لیے ڈرائیور رکھو، کوئی ضرورت نہیں خود کو یوں تھکانے کی۔“ امی جان نے حکم صادر کیا اور والدہ صاحبہ نے تائید کی۔

”امی جان! اگر میں فارغ بیٹھوں تو وقت نہ گزرنے پائے گا۔ زندگی بیٹھ کر گزارنے کا عزم کروں گی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔“ میں نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا ضرورت ہے فارغ بیٹھ کر زندگی گزارنے کی؟“ امی جان نے کہا۔ ”بس تم ٹھیک ہو جاؤ تو تمہارے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈتے ہیں۔“

”یہ بھی خوب کہی، کبھی کہتی ہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، پھر کہتی ہیں کہ مجھے مصروفیت ڈھونڈ کر دیں گی۔ کم از کم اس طرح ہیر پھیر کر بات تو نہ کریں امی جان!“ میں واقعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ والدہ اور امی جان نے نظر ہی نظر میں کوئی اشارہ کیا، میں ابھی ان کے اشارے کے مطالب سمجھنے میں کوشاں تھی کہ والدہ نے مظہر سے کہا کہ وہ صدف آپنی کو گھر چھوڑ آئے۔ صدف آپنی ہم سب سے مل کر خدا حافظ کہتی ہوئی مظہر کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ گاڑی تو فیکٹری کا ایک ڈرائیور چلا رہا تھا تو پھر مظہر کو ساتھ بھیجنے کی تک مجھے سمجھ میں نہ آئی تھی اور پھر صدف آپنی کو ہر روز ہی دوپہر کے وقت علی بھائی چھوڑنے جاتے تھے۔ پھر بھی میں خاموش رہی، سمجھ گئی کہ مقصد مظہر کو وہاں سے ہٹانا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی بات جو مظہر سے چھپانا مقصود ہے۔

”ماہا بیٹا، بات یہ ہے“ والدہ بولیں۔ ”آپا جی (امی جان) چاہتی ہیں کہ ابھی تم جوان ہو اور بیوگی کی زندگی گزارنا کوئی اتنا آسان کام نہیں، پھر یہ عین شرعی بھی ہے کہ تم عقد ثانی کر لو۔۔۔۔۔ اور ابھی تمہاری عمر ایسی ہے کہ رشتہ ملنا مسئلہ نہ ہوگا، پھر ہر گز رتا دن عمر کو بڑھاتا ہی ہے“ میرے اندر جیسے کچھ کٹنے لگا، میرے سارے زخم۔۔۔۔۔ ٹانگ، جڑے سب دکھنے لگے۔ سارے حواس حقل ہو گئے تھے، بولوں بھی تو کیا بولوں؟ ”یوں تو بیٹا کچھ اچھے رشتے میری نظر میں بھی ہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے والدین حیات ہیں تو ان کا پہلا حق ہے تمہارے لیے فیصلہ کرنے کا، مگر اس سے بڑھ کر تم سمجھ دار ہو، عاقل اور بالغ ہو اس لیے ان سے بھی بڑھ کر بہتر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تم۔“

خود ہو۔“ امی جان نے تمہید باندھی۔

”امی جان آپ نے بھی تو میری عمر کی نہ سہی مگر جوانی کی بیوگی کاٹی ہے“ میں نے بمشکل گستاخانہ سوال کیا۔

”بیٹا بالکل درست کہتی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ میں نے بھی جوانی کی بیوگی کاٹی ہے اور یہ حقیقت بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ بجر کا ایک ایک پل وصل کے سالوں پر بھاری ہوتا ہے۔ اس عمر میں آکر بھی اپنے رفیق زندگی کے کندھے کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ جس پر سر رکھ کر بیوی آنسو بہا لیتی ہے تو بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور پھر میرے پاس تو آسے بھی تھے، ذمے داریاں بھی تھیں۔ تم تو کسی چیز کی پابند نہیں ہو۔“ امی جان نے وضاحت کی۔

”بہت مشکل ہے۔۔۔۔۔ آپ لوگ تو سمجھتے ہیں، غالب جیسا اور کون ہوگا دنیا میں۔۔۔۔۔ میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔“ میں رونے لگی تو ان دونوں کے لیے بھی آنسو روکنا مشکل ہو گیا۔

”بیٹا! غالب میرا بیٹا تھا، وہ خاک کی جن تہوں تلے جاسویا ہے اور میرے وجود کو بھی قبر کی طرح کر دیا ہے۔ میرے لیے تو خاک ہی مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب ہے جس کی آغوش میں وہ سو رہا ہے۔ میں ماں ہو کر بھی ہر روز کانٹوں کے بستر پر سوتی ہوں کیونکہ میرا لال تھا ہی ایسا پیارا۔ میں جانتی ہوں بیٹا، اسے تم سے کتنا پیارا تھا اور پھر اس کی زندگی ہی اتنی مختصر تھی کہ اس نے برسوں کا پیار تم پر مہینوں میں لٹا ڈالا۔ میں اپنے بیٹے کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر شب سے صبح کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اندر کا کیا حال ہے۔ میں اس کرب سے گزر چکی ہوں۔۔۔۔۔“ امی جان رورہی تھیں، والدہ انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ آج پہلی بار غالب کی وفات کے بعد وہ یوں اپنے دل کا درد زبان پر لائیں تھیں۔ واقعی وہ سب سچ کہہ رہی تھیں۔ میں سمجھتی تھی کہ سب سے بڑی محروم میں ہوں کہ شوہر بھی کھو دیا اور ہونے والا بچہ بھی۔ مجھے اپنے دنیا میں نہ آسکنے والے بچے کی اتنی تڑپ تھی تو ان کا تو اپنا پلا پلا یا بیٹا تھا۔

ان کی امیدوں کا مرکز، ان کے بڑھاپے کا آسرا۔ کس طرح انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ اس خوشی کی خبر کو شیئر کیا ہوگا کہ وہ ماں باپ بننے والے تھے۔ کیسے ایک ایک دن انتظار کا بتایا ہوگا، خوشی خوشی اس کے استقبال کی ساری تیاریاں کی ہوں گی۔ کتنے تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر اسے جہنم دیا ہوگا اور کیسے اسے دیکھ کر اپنی ساری تکلیف بھول گئی ہوں گی۔ اپنے وجود سے سچ کر

اسے پروان چڑھایا ہوگا۔ اس کی ایک ایک قلعاری اور ایک ایک مسکراہٹ پر زندگی سے بھرپور وقت گزر رہا ہوگا۔ اس کے وجود سے انہیں مامتا کا مان ملا۔ اسے بیٹھے، ریختے، کھڑا ہوتے، چلتے اور بھاگتے دیکھ کر زندگی کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہوگا۔ اسے راحت دینے کے لیے خود راتوں کو بے آرام ہوئی ہوں گی۔ اس کی تکلیف پر بے چین ہوتی ہوں گی۔ دوسرے بچوں کی آمد پر ذمہ داریاں بڑھی ہوں گی تو یہ بھی ذہن میں رہا ہوگا کہ اسے اپنے کم اہم ہونے کا بھی احساس نہ ہو۔ وہ ان کا بڑا بیٹا تھا۔

باپ کی وفات پر جب اس نے ماں کو کندھوں سے تھا ماہوگا تو کیسے اپنے جگر کے کٹوے کے ساتھ لگ کر بلک کر روئی ہوں گی مگر پھر اپنے بچوں کو دیکھ کر خود کو سمیٹ لیا ہوگا، پھر اپنی امیدوں کا محور اپنے اسی بیٹے کو سمجھ لیا ہوگا اور پھر ان کی دعاؤں اور کوششوں سے ایک دن اس قابل ہو گیا کہ گھر بھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گیا تو ان کی آنکھوں میں اس کے سر پر سہرا سجانے کے خواب سج گئے ہوں گے۔ پھر جب وہ اس کی دلہن لے کر آئی ہوں گی تو ان کی آنکھوں میں اس کی اولاد دکھانے کے سنے آباؤ ہو گئے ہوں گے۔ وادی بننے کی خبر نے جہاں ان کو زندگی کی نئی رنق دی ہوگی وہاں پر انہیں یہ خیال بھی ستایا ہوگا کہ وہ اپنے پوتی یا پوتی کا اکیلے استقبال کریں گی۔ اپنے شوہر کی روح کو رخصت کرنے کے بعد جانے کتنے سال کے بعد اس گھر میں ایک نئی روح کے استقبال کی تیاریاں ہوئی ہوں گی، مگر ان کے سنے بکھر کر رہ گئے جب وہ اپنا پوتا یا پوتی تو کیا دیکھتیں، بیٹا بھی کھو بیٹھیں۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے لحوں میں سالوں کا سفر طے کر لیا، اپنے سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے مجھے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگا کہ میرا غم چوڑا ہے، پوری کائنات پر پھیلا ہوا غم تو امی جان کا تھا۔ اولاد کے دکھ تو یوں بھی ماں باپ کے دلوں پر انٹ رو شنائی سے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ماں باپ تو آئینے کو بھی دیکھ کر خود سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہم ہی ہیں، کیا ہم زندہ ہیں، کیسے زندہ ہیں اور کس لیے زندہ ہیں؟ مگر وہ زندہ رہتے ہیں کہ زندگی اور موت پر اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

”امی جان!“ کہہ کر میں چبکوں پہکوں رونے لگی۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آئیں اور مجھے ساتھ لگا لیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ مجھے ان کے لمس سے سکون ملنے لگا۔ مجھے ہمیشہ ان کے پاس ہونے سے بہت سکون اور شفقت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ بھی مجھے نگہت سے بڑھ

کر چاہتی تھیں۔

”پلیز بیٹا! خود کو سنبھالو، مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے تمہیں اس طرح دیکھ کر.....“ امی جان نے کہا۔ میں سسکیاں لینے لگی۔ والدہ بھی اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھیں۔

”بیٹے زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ آتے ہیں اور انسان بڑے مشکل مراحل سے گزر کر فیصلوں تک پہنچتا ہے لیکن بعض فیصلوں تک پہنچنے کے لیے روح بھی سولی پر تنگ جائے تو بھی وہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ بھلا کون سے ماں باپ ہیں جو ایسا چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹیوں پر یہ وقت آئے، لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تم اسی طرح رہیں تو ہم تمہارے تین بزرگ روز قیامت اللہ کو جواب دہ ہوں گے۔“ والدہ کہہ رہی تھیں۔

”بیٹا! زندگی میں بعض فیصلے ہمیں جبراً کرنا پڑتے ہیں اور بعض مصلحت۔ نہ تم مجھے بھاری ہونہ ماں باپ کے لیے تمہارا بوجھ اٹھانا مشکل ہوگا، پر وقت سدا ایک سانہیں رہتا۔ ہم اپنی عمر کی شام پر ہیں جانے کب رات ہو جائے پھر اس کے بعد زندگی کی تاریخ اختیار کرے۔ اس لیے تم سکون سے سوچو اور اپنے لیے جو بہتر سمجھو وہ فیصلہ کرو۔“ امی جان نے بھی والدہ کی تائید کی اور مجھے ایک نئے گرداب میں دھکیل دیا۔

شام کا وقت تھا، ابو جان گھر پر ہی تھے۔ میں وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی ان کے کمرے تک گئی اور دروازہ کھٹکھٹایا تو انہوں نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں اندر داخل ہوئی تو وہ سیٹی پر نیم دراز کچھ پڑھ رہے تھے۔ ”آہ! میرا بیٹا تو اب موبائل ہو گیا ہے۔“ انہوں نے میری وہیل چیئر دیکھ کر کہا۔

”جی ابو مظہر چھوڑ گیا تھا وہیل چیئر!“ میں نے مختصر اکہا۔ ”ابو میں آئی تھی یہ پوچھنے کے کچھ عرصہ قبل جب آپ ہمارا کاروبار سنبھال رہے تھے تو ایک صفدر نامی کارکن کی حادثاتی موت ہو گئی تھی.....“ میں نے بات شروع کی۔

”نہیں بیٹا حادثے میں تو اس کی ٹانگ متاثر ہوئی تھی البتہ اس کی ٹانگ کٹنے کا باعث اسپتال والوں کی غفلت تھی جنہوں نے بروقت انفیکشن کی تشخیص نہ کی اور انفیکشن اس کے سارے جسم میں پھیل گیا۔“ ابو نے وضاحت کی۔

”پھر اس کا بھائی، اس کا نام مظہر تھا آپ کے پاس مدد کے لیے آتا رہا تھا یا وہ آپ

کو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا! میں جانتا ہوں اس کو بھی۔ اچھا بچہ تھا۔ ان دنوں بی کام کر کے فارغ ہوا تھا اور غالباً ایم بی اے میں داخلہ لینے والا تھا۔ جتنی دفعہ بھی وہ آیا میں نے کمپنی کی پالیسی کے مطابق اور پھر بعد میں اس سے بھی بڑھ کر اس کی مدد کی۔ اس کے لیے میں نے نوید کو بھی بتا دیا تھا اور تمام تر فنڈ زان کی رضامندی سے استعمال ہوئے تھے۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا؟“ ابو نے وضاحت کر کے سوال کیا۔

”نہیں ابو! گڑبڑ کوئی نہیں بلکہ نوید صاحب نے تو مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ وہ تو اتفاقاً حادثے کے روز میں والدہ صاحبہ کے لیے پھول لینے گئی تو پھولوں کی دکان پر وہ سیلز مین کی حیثیت سے مجھے ملا۔ اس نے مجھے اپنے بھائی اور اپنے گھر کے حالات کی بابت بتایا۔ تفصیل جاننے پر علم ہوا کہ اس کا تعلق ہمارے ادارے سے ہی نکلتا ہے تو میں نے سوچا کہ اس بے چارے کی کوئی مدد کی جائے کیونکہ اس کے گھر میں تین جوان بنیں بھی ہیں.....“ میں نے وضاحت کی۔

”نوید نے اور کچھ لوگوں نے بھی بتایا تھا کہ صفر بہت اچھا بچہ تھا، محنتی اور ایماندار اور اس کا تعلق بھی کسی اچھے گھرانے سے تھا۔ تاہم بیٹا میں نے جو مدد اس کے بھائی کی، کتنی وہ بھی اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے کتنی اور یوں بھی پھر جب صفر کی وفات ہوئی تو اس کے بعد وہ آیا بھی نہیں، میرے پاس اس کا رابطہ نمبر بھی نہیں تھا ورنہ میں علی سے کہتا کہ کسی طرح اسے اپنے بینک وغیرہ میں کوئی نوکری دلوا دیتا۔“ ابو نے وضاحت کی۔

”لیکن فیکٹری کے کاغذات کے ریکارڈ میں تو اس کا اتنا پتا ہو گا ہی ناں۔“ میں نے ابو سے پوچھا۔

”ہاں یقیناً ہو گا۔“ ابو نے مختصر اُکھا۔

”چلیں میں کسی وقت نوید صاحب کو کال کر کے کہہ دوں گی۔ وہ پتا ڈھونڈ لیں گے اور پھر مظہر کو ڈھونڈنا آسان ہو جائے گا۔“ میں نے بے فکری سے کہا۔

”ماہا بیٹا یہ نوید کیسا لڑکا ہے؟“ ابو نے اچانک استفسار کیا۔

”اچھے بھروسے کے آدمی ہیں ابو! آپ کے بعد بھی انہوں نے کاروبار ٹھیک سنبھالا اور آج کل بھی سارے کام کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں ہے.....“ میں نے جواب دیا۔

”میں کاروبار کے حوالے سے نہیں پوچھ رہا ہوں بیٹا..... ویسے وہ کیسا لڑکا ہے؟“ ابو نے سوال دہرایا۔

”ابو میرا تو انسانوں کو پرکھنے کا کوئی زیادہ تجربہ نہیں ہے لیکن نیک نیت اور دیانتدار ہیں۔ غالب کے دوست بھی تھے شاید اس لیے بھی احترام کرتے ہیں اور جہاں مجھے ضرورت پڑتی ہے میں بھی ان سے رہنمائی لینے سے گریز نہیں کرتی۔“ میں نے وضاحت کی۔

”بیٹا آپ کی والدہ نے بھی آپ سے بات کی ہوگی اور غالب کی والدہ نے بھی۔ ہم سب کا مشترکہ خیال ہے کہ نوید بہت اچھا انسان ہے، دیانتدار بھی ہے۔ غالب کی والدہ اسے بہت بچپن سے جانتی ہیں۔ غالب کا قریب ترین دوست بھی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سارے حالات جانتے ہوئے خواہشمند بھی ہے۔ اپنے والدین کی وفات کے باعث بہن بھائیوں کی ذمہ داریوں میں ایسا الجھا کہ اپنی خواہشات پس پشت ڈال کر فرائض کو نبھایا۔ اب وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ بیٹا میں نے بھی اسے بہت قریب سے جانچا ہے۔“ ابو کہہ رہے تھے اور میرا سر جھکتے جھکتے میری ٹھوڑی سینے سے جا لگی، آنسو اتار سے بہہ رہے تھے۔

”ابو، پلیز مجھے ان دنوں اس الجھن میں نہ ڈالیں۔ ابھی تو مجھے یہ علم نہیں ہے کہ میں کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو پاؤں گی کہ نہیں۔ میرا چہرہ کس حد تک بگڑ گیا ہے یہ بھی نہیں جانتی۔“ میں نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا۔

”ایسا نہ کہو بیٹا! تم انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی پہلے جیسی ہو جاؤ گی۔ یہ سب تو عارضی تکلیفیں ہیں اور پھر نوید ان سب باتوں کو جانتا ہے۔ اس نے دو تین روز قبل ہی پیغام بھیجا ہے بلکہ آج شام کو وہ تمہیں دیکھنے آ رہا ہے اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو؟“ ابو پوچھ رہے تھے۔

”ابو وہ مجھ پر ترس کھا کر ہمدردی جتلاتے ہیں۔ یقین کریں میں خود کو ہمدردی کے قابل ہرگز نہیں پاتی۔“ میں نے کہا۔

”یہ تمہاری اپنی سوچ ہے بیٹا!“ ابو نے کہا۔ ”تو کیا وہ شام کو گھر پر آ سکتا ہے؟“

”اگر وہ صرف میری خیریت معلوم کرنے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور اگر آپ اور امی انہیں بردھوے کے لیے بلارہے ہیں تو مجھے اعتراض ہے۔“ جانے کہاں سے مجھ میں ایسی بات کرنے کی ہمت آ گئی تھی۔

”ہمارا دیکھا بھالا بچہ ہے ہمیں بردھوے کی کیا ضرورت ہے بیٹا؟ وہ تمہاری خیریت معلوم کرنے اور کچھ دفتری امور پر بات کرنے کے لیے آنا چاہتا ہے۔“ ابو نے مسکرا کر کہا۔

”ٹھیک ہے اس مقصد کے لیے وہ آسکتے ہیں۔“ میں نے گویا سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ اس پر ابو نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ پہلا مرحلہ طے ہو گیا ہوگا، جب کہ میں کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی۔

شام کو مغرب کے بعد نوید صاحب آئے تو والدہ اور ابو کے انداز میں خواہ مخواہ ہی مجھے شفقت اور بزرگی کا رنگ غالب نظر آ رہا تھا جب کہ میرا ان کے ساتھ رویہ وہی دفتری انداز لیے ہوئے تھا۔ وہ لاؤنج میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں سفید پھولوں کا ایک خوبصورت سا گلہ سترہ تھا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ وصول کر کے اسے میز پر رکھا۔ والدہ نے جوس سرو کیا اور چائے کا پوچھا تو نوید صاحب نے انکار کر دیا پھر یونہی تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں رہیں تو میں نے وقت ضائع ہونے سے بچانے کے لیے نوید صاحب سے فائلیں لے کر ان کی ورق گردانی شروع کر دی۔ میرا دھیان فائلوں میں ہی تھا اور اذان ہوئی تو ابو معذرت کر کے نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور والدہ کچن میں۔ عجیب سی ان چاہی تنہائی ہم دونوں کو میسر آگئی تھی۔

میری نظروں کے سامنے تھیں تو فائلیں لیکن اندر عجیب سا جوہر بھانا اٹھ رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہ کس طرح بات شروع کروں۔ ”نوید صاحب ہمارے ایک ورکر کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہو گیا تھا، فیکٹری میں حادثے میں اس کی ٹانگ متاثر ہوئی تھی اور بالآخر اسپتال میں اس کی وفات ہو گئی تھی۔“ میں نے بات شروع کرنے کو کہا ”عالمیہ غالب کی زندگی میں ہوا تھا۔“

”جی، میڈم! بعد ازاں جب سلطان صاحب کاروبار کی دیکھ بھال کر رہے تھے تو ہم نے ان کی کافی مدد کی تھی۔“ نوید صاحب بولے تو مجھے دل ہی دل میں ہنسی آئی، مودب کیسے بنے پھر رہے تھے اور اندر سے کیسے گھٹے تھے، میرے لیے رشتہ بھجوار کھا تھا۔

”اس کا چھوٹا بھائی مظہر تو ان دنوں نہیں آیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”میڈم مجھ سے اس کی ملاقات تو نہیں ہو سکی لیکن ہمارے ایک کلرک ہیں مظفر صاحب انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کئی بار آیا تھا اور اس نے آپ کا حوالہ دیا تھا کہ آپ نے اسے آنے کو کہا تھا لیکن ایک بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کا اس کی مدد کرنے کا ارادہ ہے تو خیال رہے کہ ہم نے بہت دفعہ اس کی کافی مدد کی ہے۔“ نوید صاحب نے بتایا۔

”نوید صاحب! وہ کافی خوددار لڑکا ہے۔ اپنے بھائی کے علاج کے سلسلے میں مدد کے لیے آتا۔“

رہا ہوگا کہ تب تک وہ مجبور تھا مگر اب میں چاہ رہی ہوں کہ اس کی تعلیمی قابلیت کے مطابق اسے نوکری دے دیں کیونکہ ابو نے بھی بتایا ہے کہ اس کا بھائی صفر بھی کافی محنتی اور ایماندار آدمی تھا۔ اس کا تعلق بھی اسی گھر سے ہے تو یہ خوبیاں اس میں بھی ہونی چاہئیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ نوید صاحب نے تائید کی۔

”تو گویا آپ کو میرے اس فیصلے میں کوئی مناسب بات نظر نہیں آتی؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایسا تو میں نے بالکل نہیں کہا میڈم! میں تو آپ کے فیصلے کی تائید کر رہا ہوں۔ آپ ویسے بھی کاروبار سے متعلق کوئی بھی فیصلہ اکیلی بھی کر سکتی ہیں، آپ کو اس سلسلے میں تائید کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ نوید صاحب نے وضاحت کی۔

”آپ کے اس فقرے کا اطلاق صرف کاروبار سے متعلق فیصلوں پر ہوتا ہے؟“ میں نے مبہم سا سوال کیا تو انہوں نے گڑبڑا کر سر اٹھایا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”نوید صاحب کیا میں اپنے بارے میں فیصلے کرنے کی بھی مجاز ہوں کہ نہیں؟ یا پھر میرے ذاتی فیصلے آپ کی رضا سے ہوں گے؟“ میں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھ کر بلا واسطہ سوال کیا اور عالمیہ مطلب سمجھ گئے تھے۔

”ماہا! میرا مطلب ہے.....“ وہ گڑبڑا گئے، عالمیہ گھبراہٹ میں ان کے منہ سے میرا نام نکل گیا تھا ایسی بات کے لیے انہیں میڈم کہنا مناسب نہیں لگا۔ ”میں نے بڑا مناسب اور جائز انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے، دست سوال دراز کیا ہے..... اور یہ بات فقط میرے اور آپ کے تین بزرگوں کے درمیان ہے۔“

”کیا میں بھی اپنا جائز حق اختیار کرتے ہوئے آپ کو بتا سکتی ہوں کہ میں نے کبھی آپ کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔“ میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

”اچھی طرح جانتا ہوں، اگر پہلے نہیں دیکھا تو اب دیکھ سکتی ہیں۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”نوید صاحب مجھے ترس اور بھیک میں طے ہوئے سہارے کی ضرورت نہیں، میرے لیے غالب کی یادوں کا سہارا ہی کافی ہے۔..... آپ غالب کے دوست تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب آپ دوستی نبھانے کے لیے ایسی ترکیب سوچیں۔“ میرا لہجہ شاید تلخ ہو گیا تھا۔

”دوستی میں اس سے کیا نبھاؤں گا وہ تو عہد و پیمان اور بندھن توڑ کر چلا گیا۔ میں تو خود ایک محروم شخص ہوں میں کسی کو کیا دے پاؤں گا، البتہ میں نے اپنا دامن خوشیوں کی بھیک کے لیے پھیلا یا تھا۔“ نوید صاحب کے لہجے میں محرومی تھی۔

”سوری نوید صاحب! اسے آپ میری طرف سے انکار سمجھیں اور پلیز آئندہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ کریں۔“ میں نے بات ختم کی ہی تھی کہ والدہ کچن سے تشریف لائیں۔

”نوید بیٹا کھانا تو کھا کر ہی جاؤ گے ناں؟“ والدہ نے سوال کیا۔

”بہت شکریہ آئی، میں ذرا جلدی میں ہوں۔“ نوید صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

”نوید صاحب! براہ مہربانی ریکارڈ میں سے صفدر صاحب کا ایڈریس نکوادیں اور کلرک کو بتادیں کہ آئندہ اگر اس کا بھائی مظہر دفتر آئے تو اسے بے شک گھر بھجوادیں۔“ میں نے آخری فقرہ کہہ کر انہیں خدا حافظ کہا۔ والدہ صاحبہ ککھش میں تھیں لیکن کچھ پوچھ بھی نہیں رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ہی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ان کی فراہم کردہ تہائی میں کوئی مثبت پیش رفت ہوئی کہ نہیں۔

تین چار روز کے بعد مجھے اسپتال جانا پڑا، پلاسٹر وغیرہ چیک ہونا تھا اور ٹانگے کھلنے تھے۔ صدف آپ ہی مجھے اسپتال لے کر جانے والی تھیں لیکن عین روانگی سے قبل امی جان اور مظہر آگئے پھر ہم گھر سے اکٹھے اسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ میرا مکمل طبی معائنہ ہوا، ڈاکٹر زکائی پر امید تھے۔ میرے زخم کافی حد تک مندمل ہو چکے تھے۔ پلاسٹر ابھی دو ہفتے اور رہنا تھا۔ جڑوں کے ٹانگے کھول دیئے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے مختلف دوائیں اور کریمیں دی تھیں لیکن سب سے اہم یہ ہدایت تھی کہ مجھے اپنے ناخن چھوٹے کاٹنا تھے اور ہاتھوں کو چہرے سے دور رکھنا تھا۔ اسپتال سے لے کر امی جان اور مظہر گھر پہنچے تو میں جو یہ سمجھ رہی تھی کہ تالا لگا کر آئے ہوں گے گھر کے پورچ میں دو کھڑی گاڑیاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ”شاید کوئی مہمان ہوں گے!“ دل میں سوچا۔ ”کون مہمان ہو سکتے ہیں؟“ اگلا سوال آیا۔ ”شاید..... ماہ رخ ہو.....“ خود کو بتایا۔ ”چلو جو بھی ہے۔“ ذہن سے بات نکالنے کو سوچا۔

”امی جان کون آیا ہوا ہے.....؟“ میں پوچھنے بنا نہ رہ سکی۔

”کوئی رشتے دار ہیں ہمارے بیٹا.....“ امی جان نے مختصر کہا۔ مظہر نے گاڑی سے نکال کر۔

مجھے وہیل چیئر میں بٹھایا۔ اب ماشاء اللہ اس میں اتنی طاقت اور ہمت آگئی ہے کہ مجھے اس نے پھولوں کی طرح اٹھالیا اور وہیل چیئر چلاتا ہوا اندر کی جانب چلا اور جونہی اندر کا دروازہ کھلا ہلکی سی روشنی میں مجھ پر پھولوں کی پتیوں کی بارش ہو گئی..... اور میرا دھیان پیچھے چلا گیا جب میں اسی طرح اپنے قدموں پر چلتی ہوئی غالب کی بانہوں کے حلقے میں اسی داخلی دروازے سے پہلی بار اس گھر میں داخل ہوئی تھی اور اسی طرح مجھ پر پھول نچھاور کیے گئے تھے اور نگہت نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام کر استقبال کیا تھا اور اس روز بھی نگہت میری آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ اعجاز نے اسے ہٹایا اور سعادت مندی سے سر نیچے کیا۔ میں نے بزرگوں کی طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے پیچھے پیچھے ماہ رخ اور میرے لیے سر پر انز تیور کی موجودگی تھی۔ جس نے خوشی کو اٹھا رکھا تھا۔ ماہ رخ سے مل کر میں نے خوشی کو گود میں لے لیا۔ پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں مگر جونہی اس نے غور سے میرے چہرے کو دیکھا تو وہ ڈر گئی۔ شاید چہرے پر لگی ہوئی کریم کو دیکھ کر یا پھر ٹانگ کا پلاسٹر۔

سب مجھے ساتھ لیے ہوئے لاؤنج میں آگئے۔ میں تقریباً پانچ ہفتے کے بعد گھر لوٹی تھی اور مجھے یہاں پہنچ کر والدہ کے گھر سے زیادہ سکون ملا تھا۔ نگہت مجھ سے لپٹی بیٹھی تھی۔ میں وہیل چیئر سے کرسی پر شفٹ ہو گئی تھی۔ خوشی نگہت کی گود میں تھی اور بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ مظہر اور اعجاز دو پہر کا کھانا باہر سے لینے چلے گئے تھے، لاؤنج میں ہمارے علاوہ ماہ رخ اور تیور تھے۔ امی جان نماز کے لیے گئی تھیں۔ تیور کی والہانہ نگاہیں اور ماہ رخ کا شرماتا چہرہ مجھ سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یوں تو ماہ رخ ایسی شرمیلی نہ تھی لیکن شاید تیور کی نظروں کا تاثر تھا کہ وہ بار بار بارش کر رہی تھی۔

”کب آئے تم تیور؟“ میں نے تیور سے پوچھا۔

”میں کل رات کو ہی پہنچا ہوں، نگہت پرسوں آئی تھی اور ہم سب آپ کو سر پر انز دینا چاہتے تھے۔ میری ٹرم بریک چار ہفتوں کی ہے اور نگہت غالباً دو مہینوں کے لیے آئی ہے، کیوں نگہت؟“ تیور نے اپنا پروگرام بتا کر نگہت کے پروگرام کی تفصیل چاہی۔

”دیکھو کیا پلان بنتا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور کچھ ضروری معاملات نمٹانا تھے اس لیے آئی۔ ہم دونوں کو بلوایا ہے۔ اعجاز تو چار ہفتے کے بعد چلے جائیں گے البتہ میری طبیعت پر منحصر ہے۔“ نگہت نے وضاحت کی۔

پاتیں۔“ نگہت نے کہا۔

”اللہ انہیں سلامت رکھے۔ میرے لیے بھی وہ ایسے ہی ہیں جیسے میری اپنی ماں! بلکہ اس سے بڑھ کر.....“ میں نے صدق دل سے کہا۔

”خیر اپنی ماں جیسا تو کوئی نہیں ہو سکتا اور کجا یہ کہ اس سے بڑھ کر.....“ ماہ رخ نے لقمہ دیا۔  
”یقین کر وہ ماہ رخ وہ مجھے اپنی ماں سے بڑھ کر عزیز ہیں کیونکہ وہ غالب کی ماں ہیں، اس شخص کی ماں ہیں جسے میں نے سب سے بڑھ کر چاہا تھا۔“ میں نے وضاحت کی۔

”یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں ماہا، اپنی ماں ہی اپنی ماں ہوتی ہے۔“ ماہ رخ بضد تھی۔  
”اپنی اپنی سوچ ہے، مجھے یوں بھی تمہیں یقین دلا کر کون سا میڈل لینا ہے.....“ میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

”بحث میں تو تم مجھ سے جیت نہیں سکتی ہو، کبھی اسکول، کالج کے زمانے میں بھی نہیں.....“  
ماہ رخ نے تفاخر سے کہا۔

”چلو بھی اب بھی تم جیت گئیں اور میں ہار گئی، اگر تم اس بات پر خوش ہوتی ہو.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”کوئی ایسی پابندی ہے بھی نہیں تم پر مجھے خوش کرنے کی۔“ اس نے بھی مسکرا کر کہا۔  
”پابندی تو ہے..... ناں! سمجھا کر دیکھو۔ مستقبل میں ہم جس رشتے میں بندھنے جا رہے ہیں اس میں مجھے تمہاری اور تمہیں میری خوشی کا احساس تو کرنا ہوگا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کون سا رشتہ؟“ نگہت نے انجانے پن سے پوچھا تو ماہ رخ نے نظروں ہی نظروں میں مجھے اشارہ کیا، میں اشارہ نہ سمجھ سکی اور خاموش رہی۔

”نیا رشتہ تو ہمارے درمیان دوستی کے علاوہ قائم ہو ہی چکا ہے ناں! بھی میں اعجاز بھائی کی بہن اور نگہت بھابی کی بھابی آپ محترمہ!“ ماہ رخ نے بات کو سنبھالا دیا۔

نوید صاحب اب ہر روز شام کو اہم فائلیں بھجوا دیتے تھے، جنہیں میں تھوڑی دیر کے لیے دیکھ کر دستخط وغیرہ کر دیتی تھی یا پھر اپنے ریمارکس لکھ دیتی تھی۔ میرے امتحان بھی نزدیک ہی تھے لیکن

”تمہاری طبیعت کو کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔“ مجھے یکدم تشویش ہوئی۔

”ٹھیک ہوں، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ خوشخبری ہے.....“ اس نے شرما کر کہا۔ تیمور بہانے سے وہاں سے اٹھ گیا۔ ”بس کمزوری ہے اور طبیعت گری گری سی رہتی ہے۔ اس حالت میں خوشی کو بھی نہیں سنبھال پاتی۔“  
”لو ایک خوشی تم سے نہیں سنبھالی جا رہی اور دوسری خوشی کی تیاری۔ ذرا صبر تو کرتیں کچھ عرصہ!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”صبر ہی تو بھابی سے ہوتا نہیں ہے۔“ ماہ رخ نے مذاق ہی مذاق میں ایسا فقرہ کہہ دیا کہ میرا سارا بدن سن ہو گیا اور نگہت کی حالت تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”بس بھابی! ہر روح نے تبھی آنا ہوتا ہے جب اللہ کی رضا ہوتی ہے اور اتفاق سے ماہ رخ میں تو صبر کر لوں مگر تمہارے بھائی جان سے ہی صبر نہیں ہوتا۔“ نگہت سے نندا کا طنز برداشت نہ ہوا اور فوراً جوابی حملہ کیا۔ تاہم میں نے بیچ میں دخل اندازی کی تاکہ بات نہ بڑھے۔

”تو اچھا ہے ناں نگہت، جتنے بچے اعجاز کو پسند ہیں تم لوگ سال کے سال لاکر ٹوٹل پورا کر لو اور پھر مل کر ان کو پالو۔ کم از کم کچھ سال مشکل کے گزریں گے پھر بچے سنبھل جائیں گے تو تم بھی بے فکر ہو جانا اور اگر خوشی تمہیں تنگ کرتی ہے تو وہ مجھے دے جاؤ۔ ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔“ میں نے خوشی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

”ماہا، تمہارا پلاسٹر کب کھلے گا۔“ ماہ رخ نے فوراً بات پلٹی۔  
”میرا خیال ہے کہ دو تین ہفتے تک انشاء اللہ بس دعا کرو کہ سب ٹھیک ہو جائے۔ بڑا مشکل اور آزمائش کا وقت ہے یہ بھی۔ نماز بھی بمشکل پڑھتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اللہ کرے گا تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ اس نے میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔  
”میں تو آپ کو دیکھ کر پریشان ہی ہو گئی ہوں بھابی! جانے اللہ کو اور آپ کی کتنی آزمائشیں منظور ہیں؟“ نگہت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”بس تم دعا کیا کرو! پریشان نہ ہوا کرو..... دیکھو مجھے کس طرح بزرگوں کی دعائیں موت کے منہ سے کھینچ کر لائی ہیں۔“ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔

میری ماں کے لیے تو آپ بیٹوں اور بیٹی سے بڑھ کر ہیں، آپ کو کچھ ہو جاتا تو وہ بھی نہ بیچ

ان دنوں گھر میں ہر وقت ایسے گہما گہما رہتی تھی کہ پڑھنے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ فجر کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں بیٹھ جاتی اور وہیں گھنٹا دو پڑھ لیتی تھی۔ اس وقت امی جان کے علاوہ سب ہی سو رہے ہوتے تھے۔ میرے چہرے کے زخم اب کافی مندمل ہو رہے تھے اور اچھی بات یہ تھی کہ میں بہت احتیاط کر رہی تھی اور نتیجتاً چہرے کے تمام زخم بلا نشان چھوڑے غائب ہو رہے تھے۔ صرف جڑوں پر ٹانگوں کے نشانات تھے جو شاید ابھی مزید چند دن لیتے۔

اس روز بھی میں حسب معمول برآمدے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ دھیان یکدم اپنی ماہ رخ اور نگہت کی باتوں کی طرف چلا گیا۔ اس وقت بھی میں بعد میں یہی سوچتی رہی تھی کہ زندگی کیارخ اختیار کرنے جا رہی تھی۔ ماہ رخ کو میں بہت پہلے سے جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی عادتیں شاید کچھ بدل گئی ہوں تاہم مکمل طور بدنامی ممکن نہیں۔ وہ اسکول اور کالج میں بھی منہ پھٹ، زبان اور مزاج کی تیز تھی اور ابھی تک وہ ویسی ہی تھی۔ تیور سے شادی کے بعد جانے اس کا یہ مزاج کیارنگ دکھائے گا؟ بہت مشکل گزارہ ہوگا۔ وہ تو کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ جانے ہمارے ساتھ کیسے کھل مل کر رہے گی۔ چلو کون سا اسے ہمیشہ ہمارے پاس رہنا ہے، جہاں جہاں تیور کی پوسٹنگ ہوگی وہ تو وہیں رہے گی اور میں چونک کر سیدھی ہو گئی جب مجھے تیور کی بلند آواز آئی۔

”بھابی! کہاں گم ہیں؟“

”کیا ہوا؟“ میں یکدم بوکھلا گئی۔ ”تم صبح ادھر کیوں؟ خیریت تو ہے؟“

”بالکل خیریت ہے۔ دن میں تو آپ قابو میں نہیں آتیں۔ صبح کم از کم آپ کے پاس بیٹھ کر ڈھنگ سے بات تو ہو سکتی ہے.....“ تیور نے کہا۔

”کیا بات کرنی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”چائے پیئیں گی آپ؟“ اس نے سوال کیا۔

”تو کیا تم یہ بات پوچھنے کے لیے اتنی صبح اٹھ گئے ہو؟“ میں حیران تھی۔

”آپ بھی تو ہر روز صبح اٹھتی ہیں“ تیور نے مسکرا کر کہا۔

”میرے تو امتحان سر پر ہیں اس لیے۔ چلو جاؤ پھر چائے بناؤ۔“ میں نے فرمائش کی۔

”اگلی دفعہ نہیں بناؤں گا، آپ کے ہاتھوں کی چائے پیوں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”وہ تو میں تمہیں اس دفعہ بھی پلا دیتی ہوں..... ذرا اندر سے میری بیساکھیاں لا دو۔“ میں۔

نے تیور سے کہا۔

”رہنے دیں! معاف کیا، آتا ہوں دس منٹ میں چائے کے ساتھ“ کہہ کر وہ چلا گیا۔ یقیناً ماہ رخ کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوگا۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ واقعی دس منٹ میں وہ ٹرے میں دو کپ چائے، پاپے اور بسکٹ لے کر آ گیا۔

”جیتے رہو! میرے بھائی!“ میں نے دعا دی۔ ”ویسے تمہاری بیوی بڑی خوش قسمت ہوگی۔ تم جیسا خدمت گزار شوہر ملے گا۔“

”خدا کے لیے بھابی!“ اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔ ”اب آپ ہر ایک کی عادتیں نہ خراب کر دیں۔ میں نے یہ کام صرف آپ کے لیے کیا ہے کیونکہ جو آپ ہیں وہ کوئی نہیں ہے۔“

”اچھا مسکہ نہ لگاؤ، بناؤ کیا بات کرنی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہوں! آپ چائے پی لیں پھر بات کرتا ہوں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے کوئی مشکل بات ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اوکے! کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے نوید صاحب کے لیے انکار کیوں کیا؟“ وہ ڈائریکٹ میرے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ میں ذرا سا ہچکچا گئی، کم از کم اس سوال کی توقع نہ کر رہی تھی۔

”تم ان کی نمائندگی کر رہے ہو یا سفارش؟“ میں نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

”کچھ بھی نہیں، صرف وجہ جاننا چاہ رہا ہوں کیونکہ میرے خیال میں بھی وہ اچھے انسان ہیں اور پھر میری بھی یہ خواہش ہے باقی سب کی طرح کہ آپ اپنی زندگی کے بارے میں کوئی بہتر فیصلہ کر لیں۔“ تیور نے کہا۔

”بو جھ ہو گئی ہوں کیا میں سب کے لیے؟“ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”شاباش، ویل ڈن! بہت اچھی سوچ ہے آپ کی، یہ آپ کا اس طرح رہنا ہمارے ذہنوں پر بوجھ ہے۔ آپ جوان ہیں، پڑھی لکھی ہیں اور خوبصورت بھی ہیں۔“ وہ بولا۔

”ہونہر خوبصورت! مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں رہی تیور! خوبصورت میں تھی اب نہیں ہوں۔“ میں نے درشتی سے کہا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے۔ آپ کے سارے زخم مندمل



ہو جائیں گے اور سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔“ تیمور نے دھیرے سے کہا۔

”تمہیں شاید خود بھی اس پر اتنا یقین نہیں جو تم کہہ رہے ہو۔“ میں نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں نے ایک بالکل مختلف سوال پوچھا تھا۔“ تیمور نے بات بدلی۔

”میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ میں نے کبھی نوید صاحب کے بارے میں اس

انداز سے نہیں سوچا۔“ میں نے بصد کوشش لہجہ نرم کیا۔

”کوئی اور ہے؟“ تیمور نے مختصر سوال کیا۔

”ابھی تک تو میں نے اس بات کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ کیونکہ مجھے اپنی زندگی کے ساتھ نئے

نئے تجربے کرنے کا شوق نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس میں تجربے کی کیا بات ہے؟ اور پہلے تجربے کی ناکامی کے اسباب بالکل قدرتی

ہیں، آپ کا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔“ تیمور نے مجھے سمجھانا چاہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں غالب کی یادوں کے سہارے زندگی گزار سکتی ہوں۔“ میں نے دثوق

سے کہا۔

”جو آج آپ دثوق سے کہہ رہی ہیں، اتنے ہی دثوق سے ہمیشہ نہ کہہ پائیں گی، یہ میرا آپ

کو چیلنج ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے جس دن میں یہ چیلنج ہار گئی اس روز سب سے پہلے تمہی کو بتاؤں گی۔“ میں نے

اس سے وعدہ کر کے جان چھڑوائی۔

پلاسٹر کھلا تو علم ہوا کہ اللہ کے فضل سے میری ٹانگ بالکل ٹھیک چڑ گئی تھی۔ اگرچہ ٹانگ

دیکھنے میں دوسری ٹانگ سے کمزور رہی تھی، خشکی کی تھیں بھی جی ہوئی تھیں اور ابھی ٹانگ مکمل دزن

نہیں اٹھا پار رہی تھی کچھ دن مجھے ابھی مزید بیساکھیاں استعمال کرنا تھیں، جب تک کہ ٹانگ بوجھ

اٹھانے کی عادی نہ ہو جائے۔

چہرے کے زخم بھی حیرت انگیز طور پر مندمل ہو گئے تھے۔ ٹانگوں کے نشان ہلکے ہو گئے تھے اور

کچھ عرصہ مزید کریمیں استعمال کرنے سے نہ ہونے کے برابر رہ جاتے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ یہ نشان

اتنے معمولی ہو جائیں گے کہ فوٹو ڈیشن کی بلکی سی تہ سے بھی چھپائے جاسکیں گے۔ میرے لیے یہ

سب کچھ بہت خوشگوار تھا۔ مجھے امید بھی نہ تھی کہ میں دوبارہ اس طرح چل سکوں گی اور چہرہ بھی

قدرے بہتر ہو گیا تھا۔

میرے اللہ نے میرے لیے ہمیشہ بہتر ہی کیا تھا اور اب بھی اس کی رحمت نے مجھے مایوس نہیں

کیا تھا۔ میں اس کا کیسے شکر ادا کروں۔ امی جان نے صدقہ دیا تھا، مظہر اور نگہت بھی بہت خوش

تھے۔ گاڑی بھی ٹھیک ہو کر گھر آچکی تھی اور عارضی طور پر ایک ڈرائیور رکھا گیا تھا۔ امی جان کا کہنا تھا

کہ حتمی تو مجھے ہی فیصلہ کرنا تھا، فی الحال وہی گاڑی چلا رہا تھا۔ میں نے شکرانے کے نوافل ادا

کیے، رات سونے ہی والی تھی کہ تیمور کا فون آ گیا۔ نگہت نے لاؤنج سے مجھے آواز دی، میں دیوار کا

سہارا لیتی ہوئی ایک بیساکھی کے ساتھ آہستہ آہستہ وہاں پہنچی۔

”السلام علیکم بھابی! اور بہت مبارک ہو!“ تیمور کا لہجہ اس کی خوشی کا غماز تھا۔

”وعلیکم السلام! بہت شکریہ! کیسے ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”اتنا خوش کہ دل چاہتا ہے اڑ کر آ جاؤں اور آپ کو چلتے ہوئے دیکھوں۔“ وہ جوش سے بولا۔

”جیسے میں پہلے کبھی چلتی ہی نہ تھی یا تم نے مجھے چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ میں ہنسی۔

”آپ کے چہرے پر جو اداسی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی وہ اب جھٹ گئی ہوگی، وہ دیکھنا چاہتا

تھا۔“ تیمور نے کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو، مگر اللہ نے بہت کرم کیا ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”اب تو ہمیں چھٹی نہیں ملے گی پاسنگ آؤٹ سے پہلے، یہی ملاقات ہوگی اور ہاں میری

اسپیشل بات کو نہیں بھولنا۔“ تیمور مجھے یاد دہانی کر دانا نہیں بھولا۔

”مجھے تو اب بھی یاد نہیں آ رہا کہ تم نے کون سی ایسی خاص بات کی تھی مجھ سے!“ میں نے

اسے چھیڑا۔

”خاص بات جو آپ کے بارے میں تھی!“ تیمور نے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ”ایسا نہ

کہیں، جو بات میں نے کی تھی وہ اتنی آسانی سے بھلانے والی تو نہیں ہے۔“

”ابھی تو میں اپنے امتحانوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں، اس سے فارغ ہو کر تمہاری

بات پر بھی سوچوں گی اور اپنے بارے میں بھی!“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”اللہ آپ کو امتحان میں بھی کامیابی دے۔ اپنا خیال رکھا کریں۔“ تیمور نے دعا دی۔

”تمہیں بھی اللہ کامیاب کرے، صحت مندر رکھے اور زندگی دے.....“ دعا دیتے ہوئے میری آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔ تیمور سے میری جذباتی وابستگی بہت مختلف نوعیت کی تھی۔ خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا تو نگہت مستفسرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”خوشی سو گئی کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی بھابی! سو گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہاری اپنی صحت تو ٹھیک رہتی ہے نا؟“ میں نے اس کے پھیلے ہوئے وجود کو دیکھ کہا۔

”جی اب بہتر ہوں، سوچتی ہوں اب جانے کی تیاری کروں۔ اعجاز کے لیے بھی اکیلے رہنا بہت مشکل ہے۔“ نگہت نے اپنا پلان بتایا۔

”تو کیا تیمور کی پانسنگ آؤٹ پر پھر آؤ گی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کب آپاؤں گی بھابی اور پھر میری حالت ہوگی پانسنگ آؤٹ اٹینڈ کرنے والی۔ وہیں پر کچھ ہو گیا تو؟“ نگہت نے ہنس کر کہا۔

”تم تو بہت اہم موقع مس کرو گی؟“ میں نے تاسف سے کہا۔

”بس بھابی یہ تو اللہ کی طرف سے وقت مقرر ہوتے ہیں ناں۔“ اس کے لہجے میں بھی افسوس تھا۔ ”ایک بات پوچھوں بھابی؟“

”ارے پوچھو! پہیلیاں کیا بھجوا رہی ہو؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بھابی! آپ کو تیمور اچھا لگتا ہے نا؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیا مطلب؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تمہیں علم ہے کہ وہ مجھے کیسا لگتا ہے؟ اس گھر میں میری اس کے ساتھ جذباتی وابستگی سب سے زیادہ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے دوستوں کی طرح ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کا کہنے کا مطلب ہے کہ آپ کو تیمور اچھا لگتا ہے؟“ نگہت نے پھر سوال کیا۔

”ہاں بھئی! یہی مطلب ہے، لیکن میں تمہارے سوال کا مقصد نہیں سمجھی؟“ میں حیران تھی۔

”بھابی! آپ تیمور سے شادی کر لیں.....!“ نگہت نے کہا تو مجھے لگا میرے جسم کو کسی نے ہوا میں معلق کر دیا ہو۔ میری تمام حسیں موجود تو تھیں پر کام کرنے سے قاصر ہو گئیں۔ میں نگہت کو دیکھ تو رہی تھی مگر بھئی ہوئی آنکھوں سے بولنے کی کوشش کی تو بول نہ سکی۔ جانے کتنی ہی دیر یونہی گزر گئی۔

”پلیز بھابی! ناراض نہ ہوں، اگر میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہو تو مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے پکڑ کر مجھے ہلایا تو مجھے یقین ہوا کہ میرا وجود وہیں پر تھا۔

”یہ تم سے کس نے کہا ہے نگہت؟“ میرے منہ سے صرف یہی الفاظ نکلے۔

”خیال تو میرے ذہن میں ہی آیا تھا تب میں نے امی جان سے بات کی تھی اور ان کو بھی میرا یہ خیال بہت پسند آیا ہے۔“ نگہت نے وضاحت کی۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟“

”نگہت اگر میرا کوئی ایسا خیال ہوتا تو کیا میں اس طرح کل کر تیمور سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کر رہی ہوتی۔ جس حوالے سے وہ مجھے عزیز ہے وہ ہرگز ایسا حوالہ نہیں ہے۔ مجھے وہ اپنے چھوٹے بھائی جیسا عزیز ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن بھابی جیسا عزیز ہونے سے وہ آپ کا بھائی تو نہیں ہو گیا نا؟“ نگہت مسرہ تھی۔

”یوں بھی اگر یہ وجہ ہم پس پشت ڈال دیں تو اور بھی وجہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور کیا وجہ ہے؟“ کیا آپ کے خیال میں کوئی اور.....“ نگہت نے سوال کیا۔

”ہاں میرے خیال میں کوئی اور ہے تو سہی مگر وہ میرے نہیں بلکہ تیمور کے لیے ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”کیا تیمور کے لیے کوئی اور لڑکی آپ کے خیال میں ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”کون ہے وہ؟“

”ماہ رخ! تمہاری نند!“ میں نے کہا تو اس کے چہرے کا رنگ دیدنی تھا۔

”کیا تیمور بھی آپ کی پسند کو جانتا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”ماہ رخ میری نہیں بلکہ تیمور ہی کی پسند ہے.....“ میں نے وضاحت کی۔

”ایسا کیسے ممکن ہے بھابی! آپ کیا نہیں جانتیں ماہ رخ کی طبیعت کو؟ اور پھر یہ تو صاف صاف وندہ سٹہ ہے۔“ نگہت نے کہا ”آپ پلیز تیمور کو خود اس ارادے سے باز رکھیں۔“

”دل کے ارادوں پر کب کسی کا زور چلتا ہے نگہت! یہ واردات تو کافی پرانی ہے۔ میں سمجھی کہ تم واقف ہو گی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”نہیں بھابی! میں اتنی غلط نہیں اور نہ ہی کسی نے مجھے اس قابل سمجھا کہ بتائے۔ نہ تیمور، نہ آپ نے نہ امی نے۔“ نگہت ناراضی سے بولی۔

”امی جان، بے چاری تو جانتی ہی نہیں اور تیمور ابھی تک مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔“  
میں نے کہا۔

”ابھی اگر تیمور مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے پھر تو شاید وہ لیٹ ہو جائے بلکہ خدا کرے وہ لیٹ ہو جائے۔ بھابی، ماہ رخ اکثر بڑے بھائی سے بھی بدزبانی کرتی ہے۔ زبان کی بہت تیز ہے۔ اس کا ہمارے ہاں بلکہ آپ لوگوں کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں۔“ نگہت نے التجا کی۔

”لیکن یہ معاملہ تیمور کی پسند کا ہے اور اگر تم سمجھتی ہو کہ ماہ رخ کے لیے رشتے آرہے ہیں تو پھر ہمیں ابھی سے بات کر لینی چاہیے۔ رہی بات زبان کی تیزی کی تو وہ ہمیں کیا تیزی دکھائے گی جب ہم ہی دو بدو مقابلہ نہ کرنے والے ہوں تو؟ اور یوں بھی اسے کون سا ہمارے پاس بیٹھے رہنا ہے۔ جہاں کہیں تیمور رہے گا وہیں اس کے ساتھ رہے گی۔“ میں نے نگہت کو سمجھایا۔

”مجھے نہیں علم بھابی لیکن وہ مختلف المزاج لڑکی ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کو سمجھاؤں کہ آپ اپنی والدہ کو بھی منع کر دیں۔“ نگہت نے انکشاف کیا مگر مجھے سمجھ میں نہ آیا۔

”آئی نے بھی علی بھائی کے لیے ہمارے ہاں رشتہ ڈالا ہے۔ انہیں بھی ماہ رخ پسند آئی ہے۔ وہ ہے ہی ایسی چالاک لڑکی کہ لوگ اس سے دو ایک ملاقاتوں میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔“ نگہت نے وضاحت کی۔

”حیرت ہے کہ والدہ نے رشتہ بھجوا دیا اور مجھ سے بات کرنے کی بھی زحمت نہیں ہوئی۔“ میں تقریباً بڑبڑائی۔ ”والدہ کو تو مجھے خود ہی منع کرنا ہوگا۔“

”دیکھا بھابی! جس طرح آپ علی بھائی کے لیے سوچتی ہیں ویسے تیمور کے لیے نہیں سوچتیں ناں!“ نگہت نے طنز سے کہا۔

”تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو، میں اس لیے ایسا کہہ رہی ہوں کہ نہ صرف تیمور کو ماہ رخ پسند ہے بلکہ ان کی پسندیدگی دو طرفہ ہے اور میں یہ نہیں چاہوں گی کہ ماہ رخ کے دل میں تو تیمور رستا ہو اور وہ گھر علی بھائی کا بسا نہ چل دے۔ یہ نا انصافی ہوگی۔“ میں نے نگہت کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”بھابی پلیز! یہ صرف آپ ہی کر سکتی ہیں، آئی کو بھی منع کر دیں اور تیمور کے بڑھتے ہوئے قدم بھی روک لیں۔ ماہ رخ کے لیے بہت سے رشتے آئے ہوئے ہیں، اس کی کہیں بھی اچھی جگہ پر شادی ہو جائے گی اور وہ ہر جگہ ایڈ جسٹ کر لے گی۔ شاید اسے اپنے جیسے لوگ مل جائیں لیکن نہ

ہمارا گھر اور نہ آپ کی والدہ کا گھر ایسا ہے کہ ماہ رخ ایڈ جسٹ ہو جائے۔ وہ تو اپنے سکے بہن بھائیوں سے بھی نہیں مل کر بیٹھ پاتی۔“ نگہت مصر تھی۔

”تمہارے خدشات بے بنیاد ہیں نگہت۔“ میں نے اسے تھکی دی۔ ”چلو اب اٹھ کر سو جاؤ۔ تھک جاؤ گی اور خوشی کہیں جاگ کر رونا نہ شروع کر دے۔“

”آپ سوچتی ہوں گی کہ میری منہ ہے اس لیے میں اس کی برائیاں کر رہی ہوں۔“ نگہت نے افسردگی سے کہا۔

”ہرگز یہ نہیں سوچ رہی میں، میں امی جان سے بھی بات کروں گی اور تیمور کو بھی سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ اگرچہ مجھے امید ہے کہ اس کا معاملہ کافی بڑھ چکا ہے۔ غالباً وہ باہر ملے جلتے بھی ہیں لیکن مجھے اس کا پورا یقین نہیں ہے۔“ میں نے نگہت کو امید کا سرا پکڑایا۔

”مجھے معلوم ہے کہ آپ تیمور کو اصرار کر کے منع نہیں کریں گی، میرا خیال ہے کہ مجھے امی جان کو ہی ساری بات بتا کر سمجھانا ہوگا۔“ نگہت نے کہا۔

”پلیز! تم اس طرح امی جان سے بات کرو گی تو بات بگڑ بھی سکتی ہے۔ تھوڑا عرصہ ٹھہر جاؤ۔ میں تیمور کی پانگ آؤٹ کے بعد اس سے خود بات کروں گی۔ اس وقت سمجھانے سے وہ اپ سیٹ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ وقت اس کے لیے بہت اہم ہے۔ میرا پکا وعدہ ہے تم سے!“ میں نے نگہت سے وعدہ کیا، جس پر جانے اس کو یقین آیا کہ نہیں؟

دوسرے ہی روز سوچا کہ والدہ سے بات کروں اور انہیں ان کے ارادے سے باز رکھوں۔ دیر تک گھنٹی بجتی رہی، کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ ”جانے سب لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟“ خود ہی سوچا اور تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ ہمارے ہاں پہنچ گئے، ابو، والدہ، علی بھائی اور عائشہ باجی..... متا کے عہدے پر سرفراز ہونے کی خوشی سے بھرپور وہ اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ میں دیر تک ان سے لپٹی رہی۔ سب لوگ میری صحت یابی کی مبارک باد دینے آئے تھے۔ ساتھ میں ڈھیروں ڈھیر تحائف۔ عائشہ باجی اب کسی بھی وقت اسپتال جاسکتی تھیں مگر اس حالت میں بھی ان کو مجھے دیکھے بناجین نہیں آیا تھا۔

”آپ مجھے بتاتیں تو میں آجاتی.....“ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”دوبارہ گاڑی چلا کر؟“ مظہر نے سوال کیا تو سب ہنس پڑے۔

”ظاہر ہے گاڑی چلا کر، چھوٹو! تم نے میرا مذاق اڑایا؟“ میں نے مصنوعی غصے کی ایکٹنگ کی۔

”میں نے آپ کا مذاق بھی نہیں اڑایا اور میں چھوٹو بھی نہیں رہا..... میں نے سادہ سا سوال

پوچھا ہے کہ کیا اب بھی آپ گاڑی چلائیں گی؟“ مظہر نے سنجیدگی سے کہا۔

”سوری بھئی! بڑے سارے چھوٹو!“ میں نے اس سے معذرت کی۔ ”تمہارے خیال میں

مجھے گاڑی چلانی چاہیے کہ نہیں؟“ میں نے اسی سے سوال کیا۔

”اگر میری حقیقی رائے پوچھیں تو بالکل چلانی چاہیے، کیونکہ آپ نے سنا ہے ناں، گرتے ہیں

شہسوار ہی میدان جنگ میں۔“ مظہر نے بہت عمدہ مثال دی۔

”مظہر یار جو شہسوار میدان جنگ میں ایک بار گر جاتا ہے تو وہ دوبارہ اٹھ نہیں پاتا لیکن ماہا

جیسے شہسوار جو گر کر دوبارہ اٹھ جائیں ان کے لیے کیا کہا جاتا ہے؟“ علی بھائی نے مذاقاً سوال کیا۔

”ایسے شہسوار اللہ کا شکر ادا کریں اور کسر کس کے دوبارہ میدان میں اتر پڑیں۔“ مظہر نے

دوبارہ جواب دیا۔

”بھابی! دیے آپ کا گھوڑا بالکل تیار ہے، آپ کسی بھی وقت میدان میں کود سکتی ہیں“ اس

نے میری گاڑی کے بارے میں کہا۔

”دیکھتی تھی میں نے گاڑی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن اب میدان میں، میں امتحان کے

بعد اتروں گی۔ جب تک تم بے شک یہ گاڑی استعمال کرلو۔“

”ارے نہیں بھابی! فی الحال تو میں دوستوں سے لفٹ وغیرہ لے کر چلا جاتا ہوں، آپ دفتر

جوائن کریں گی تو پھر اس پر بات کریں گے۔“ مظہر نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

”یوں کہو کہ ماں کے سامنے بات نہیں کرو گے اس بارے میں مگر اکیلے میں بھابی کو منالو

گے۔“ امی جان کی اس بات پر سب ہنس پڑے تو وہ کھسیانا سا ہو گیا۔

”امی ایسے نہ کہیں، بھابی سمجھدار ہیں، وہ جو مناسب سمجھیں گی کریں گی اور پھر مظہر بھی ضدی

بچہ تو ہرگز نہیں ہے۔“ نگہت نے بھائی کی حمایت کی۔

”دیکھا امی!“ اس نے فخر سے کہا۔ ”دنیا میں بہت کم لوگ مجھے سمجھتے ہیں اور آپ ان لوگوں۔“

میں شامل نہیں ہیں۔“ اور اس کی اس بات پر بھرپور تہقید پڑا۔

”بہت پیارا اور برخوردار بچہ ہے، بہن! مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے،“ بونے واپسی کے لیے اٹھتے

ہوئے مظہر کو ساتھ لگا کر کہا۔ باقی سب لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ میں نے بیساکھی پکڑنا چاہی تو

مظہر نے اس طرف سے آکر مجھے تھام لیا اور باہر کی طرف چلے۔ عائشہ باجی میرے ساتھ ساتھ ہی

چل رہی تھیں۔

”عائشہ باجی آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ میں نے ان کی تعریف کی۔

”بھابی! مجھے بھی عائشہ باجی اچھی لگی ہیں۔“ مظہر نے صاف گوئی سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے مظہر کہ تمہیں موٹی عورتیں اچھی لگتی ہیں؟“ عائشہ باجی نے مسکرا کر پوچھا۔

”آپ موٹی تو نہیں ہیں“ مظہر بولا۔ ”آپ کو نہیں پتا کہ آپ ایسے کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔“

”مظہر تم ذرا زیادہ ہی نہیں پھیل رہے ہو؟“ میں نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

”یونہی ایک سچی بات کہہ رہا تھا۔ آپ کو بری لگی ہے تو نہیں کہتا۔“ اس نے منہ بسور کر کہا۔

”واہ بھئی! بڑی تابعداری ہے.....“ عائشہ باجی ہنسیں۔

”بھابی کی تابعداری تو کرنی پڑتی ہے، اسی میں بہتری ہے۔“ مظہر نے بھی ہنس کر کہا۔

”ہاں گاڑی جو لیتی ہے.....“ میں نے اس کا کان کھینچا۔

”تو کیا میں اس کے علاوہ آپ کی تابعداری نہیں کرتا۔“ وہ منہ بسور نے لگا۔

”مذاق کر رہی ہوں میرے چاند.....“ میں نے اسے تسلی دی۔

ابو لوگ روانہ ہو گئے اور مجھے ایک لمحے کے لیے بھی موقع نہ مل سکا تھا کہ والدہ سے بات

کر سکتی۔ واپس لاؤنج میں آکر ہم نے تحائف کھولے تو خوبصورتی سے پیک کیے گئے ڈبوں میں

تیور اور مظہر کے لیے شرتیں اور ٹائیاں، نگہت اور امی جان کے لیے خوبصورت جوڑے، خوشی کے

لیے پیاری سی گڑیا جو فیڈر سے دودھ پی رہی تھی اور فیڈر نکالو تو رونا شروع کر دیتی تھی اور میرے

لیے ایک خوبصورت اور قیمتی گھڑی بالکل ویسی ہی جیسی حادثے کے وقت میں نے پہن رکھی تھی۔ وہ

گھڑی مجھے غالب نے دی تھی اور کئی گھڑیاں ہونے کے باوصف بھی میں غالب کی نشانی ہونے

کے باعث ہمہ وقت اسے ہی پہن رکھتی تھی۔ حادثے میں وہ گھڑی جانے کیسے ٹوٹ گئی اور کھل کر

سڑک پر گر گئی اور کسی کے پیروں تلے آکر چکنا چور ہو گئی تھی، اس گھڑی کا انجرجنر چکنا چور دیکھ کر

میرے دل میں کتنی ہی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔

یونہی اسپتال میں ایک دن میں نے صدف آپنی سے اکیلے میں ذکر کر دیا تھا اس گھڑی کی، میری زندگی میں اہمیت کا اور پھر نہ جانے انہوں نے کس رنگ میں والدہ کو بتایا ہوگا کہ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر میرے لیے دیسی ہی گھڑی لے کر آئی تھیں۔ گھڑی کا بکس کھلتے ہی کتنے آنسو میری آنکھوں میں چمکے اور قید کرنے کی کوشش کرنے میں وہ پلکوں کی جھال سے لپٹ کر گالوں پر بہنے لگے۔ میں نے ڈبیا میں رکھی اس خوبصورت گھڑی پر ہاتھ پھیرا تو میرے ہاتھوں پر میری کلائی پر غالب کا وہ لمس تازہ ہو گیا جب انہوں نے میری سالگرہ پر گھڑی خرید کر دکان میں ہی کھڑے کھڑے مجھے پہنائی تھی۔ میں دکاندار کی طرف دیکھ کر ذرا شرمساری ہو گئی تھی۔

”سامنے دیکھو ماہاشیشے میں، کتنی خوبصورت لگ رہی ہے.....“ غالب نے کہا تھا۔

”غالب آپ نے سن رکھا ہے ناں، ہاتھ کنگن کو آری کیا تو اس کا مطلب ہے کہ ہاتھ پر پہنی ہوئی چیز ویسے بھی نظر آ رہی ہے۔“ میں نے ہنس کر غالب سے کہا تھا۔ ”یہ آئینہ عینکیں پہن کر دیکھنے کے لیے ہے۔“

”میں گھڑی کی خوبصورتی کی بات کب کر رہا ہوں؟“ غالب مسکرائے تھے۔ ”میں تو کہہ رہا ہوں، دیکھو ہم دونوں کی جوڑی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔“

”غالب!“ میں ہلکے سے چیختی تھی۔ ”کوئی سنے تو کیا سوچے گا کہ کوئی دیوانہ ہے کیا۔“

”سو تو میں ہوں! کسی کے سوچنے یا نہ سوچنے کی پروا کب ہے مجھے۔“ غالب نے کہا تھا۔

”بھابی! لگتا ہے آپ کو گھڑی پسند نہیں آئی اس لیے رو رہی ہیں؟“ مظہر کی آواز نے مجھے تقریباً دو سال پیچھے سے لا کر حال میں لا چٹا۔ میں نے انگلیوں کی پوروں سے آنسو سیٹے۔

”بس یونہی.....“ میں ہنسنے لگی۔

”بھابی پلیز! ردیانا کریں۔ آپ روتی ہیں تو میں خود کو بہت بے بس پاتا ہوں۔ ہم آپ کے آنسو میٹھے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ مظہر میرے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا اور اس کی آواز بھی بھرا رہی تھی۔

”ماہا بیٹا! اللہ نے تمہیں صحت اور زندگی دی ہے۔ بس تم اس کا شکر ادا کر دو اور یوں نہ پریشان ہو کرو۔ وہ بڑا سبب الاسباب ہے وہ سب بہتر کرے گا۔“ امی جان بھی مجھے ساتھ لگا کر تسلی دینے

لگیں۔ اس کے بعد سب تحائف پر تبصرہ کرنے لگے جو کہ امی جان کے مطابق میرے میکے والوں نے زیادتی کی انتہا کر دی تھی کیونکہ میرے علاج کا سارا خرچ بھی ابو نے اٹھایا تھا، تیور اور امی جان کے بے حد اصرار پر بھی رقم نہیں لی تھی اور اب سب کے لیے قیمتی تحائف۔

”امی جان تحائف لینا اور دینا تو محبت کی نشانی ہے اور سنت بھی ہے۔“ میں نے انہیں کہا۔

”لیکن بیٹا جس روز سے تمہیں بیاہ کر لائے ہیں بلکہ اس سے پہلے سے بھی وہ خود تو بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہمیں تحائف دیتے ہیں مگر ہماری طرف سے تحائف قبول کرنے پر ہمیشہ معذرت کر لیتے ہیں۔“ امی جان نے شکوہ کیا۔

”تو امی جان! آگے بڑے مواقع ہیں، عائشہ باجی آئی ہوئی ہیں، کوئی خوشخبری ہوگی تو تب، پھر علی بھائی کی شادی سے تو ہم بھی حساب برابر کر دیں گے پھر والدہ کے پاس ہمارے تحائف لوٹانے کا کوئی بہانہ نہ ہوگا۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”اللہ خیر کا وقت لائے بیٹا! تم تھوڑی بہتر ہو لو تو پھر نگہت اور مظہر کے ساتھ جا کر تم بھی سب گھر والوں کے لیے اچھے اچھے تحائف لے کر آؤ۔“ امی جان نے مجھ سے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی ہے امی جان! میں امتحانات سے فارغ ہو لوں تو.....“ میں نے انہیں یقین دہانی کروائی اور پھر پورے اٹھماک سے اپنے امتحانات کی تیاریوں میں مشغول ہو گئی۔

نگہت واپس چلی گئی اور ہمارے گھر کی وہی روٹین لوٹ آئی، ابھی میں دفتر نہیں جا رہی تھی۔ پوری تندہی سے امتحانات کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ امتحانات سے فارغ ہو کر امی جان کی اجازت سے چند دن کے لیے ابو کی طرف چلی گئی جہاں اب عائشہ باجی کا اٹھنا بیٹھنا تک محال ہو رہا تھا۔ کمر درد سے وہ زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتی تھیں۔ پاؤں سوج سوج کر برا حال تھا۔ ایک دن کے لیے صدف آپنی اور تانی آپنی بھی آئیں تو وہ دن ہم سب بہنوں نے خوب گپ شپ لگا کر گزارا۔ صدف آپنی نے بھی اچانک ہی موضوع چھیڑ دیا اب میرا کیا ارادہ ہے۔

”بس اب دوبارہ دفتر جوائن کروں گی!“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”ماہا! تم اتنی چھوٹی بچی تو نہیں ہو کہ میرا سیدھا سوال نہ سمجھ سکو اور نہ میں نے گھما پھرا کر بات کی ہے۔“ صدف آپنی نے غصے بھری آواز میں کہا۔

”صدف آپنی پلیز.....“ میں نے سر گھٹنوں میں دے لیا۔ مجھے علم تھا کہ اب یہ سب مل کر اس

موضوع پر اپنی تیار شدہ تقاریر کریں گی۔ میرے لیے فرار کے سب راستے مسدود ہو رہے تھے۔  
 کیا ہے عورت کی داستان، ایک مجبور اور بے زبان جانور کی طرح کبھی کہیں ہانک دو، کبھی کسی  
 کھونٹے سے باندھ دو۔ مگر میرے ساتھ تو مسئلہ یہ تھا کہ جس کھونٹے سے ایک بار بندھ گئی تھی، اب  
 وہی میرا مستقل ٹھکانا تھا۔ وہیں میرے پاس یادیں تھیں، جو میرے جینے کا سرمایہ تھیں، اس گھر کے  
 مکینوں کی امیدیں تھیں جن کا مرکز و محور میں تھی، اور میں کس طرح اس گرداب سے نکلوں؟  
 ”ماہا!“ عائشہ باجی نے پکارا اور میں نے سر اٹھایا، آنکھیں یقیناً ضبطِ گریہ سے لال ہو رہی  
 ہوں گی۔ ”دیکھو تم ہم سب کی چھوٹی اور لاڈلی بہن ہو، والدین کی تم میں جان ہے..... ہم سب  
 تمہاری وجہ سے تکلیف میں ہیں۔“

”صرف تم ہی کانٹوں کے بستر پر نہیں سوتی ہو ماہا“ صدف آپنی بولیں۔ ”تمہارے والدین  
 کے لیے بھی ان کا بستر کانٹوں کا بستر ہوتا ہے۔ جوان جہان بیٹی کی بیوگی کا دکھ انہیں اندر ہی اندر  
 گھول رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے کدامل کی مریضہ بن گئی ہیں.....؟“  
 ”آپ سے کس نے کہا؟“ میں ان کے انکشاف پر پریشان ہو گئی۔

”سبھی جانتے ہیں، صرف تم سے چھپا رکھا ہے کہ تم مزید پریشان نہ ہو۔ پہلے ہی تمہاری  
 زندگی میں کم پریشانیاں اور ذمے داریاں نہیں ہیں۔ جانے کس بوجھ تلے تم نے خود کو دبا رکھا ہے۔“  
 صدف آپنی نے کہا۔

”کسی نے کوئی بوجھ نہیں ڈالا مجھ پر، میں خود ذمے داریاں سنبھالنے کو اپنا فرض سمجھتی ہوں۔  
 مجھے اس گھر سے پیار، اپنائیت اور انس ملتا ہے۔ وہ لوگ مجھے گھر کے سربراہ کی طرح سمجھتے ہیں حتیٰ  
 کداملی جان بھی۔“ میں نے صورتِ حال واضح کی۔

”اوکے! تمہیں اس گھر سے پیار اور اپنائیت ملتی ہے، وہاں خوش ہو تو وہیں رہو پھر!“ صدف  
 آپنی نے کہا۔ ”اور تیمور سے عقدِ ثانی کرلو۔ اسی گھر میں اسی طرح اپنی ذمے داریاں نبھاتی رہو۔“  
 ”تیمور میرے لیے بھائی کی طرح ہے.....“ میں نے احتجاج کیا۔  
 ”بھائی تو نہیں ہے ناں!“ عائشہ باجی بولیں۔ ”تانی آپنی خاموش تھیں۔“

”ماہا! تم نے نوید کے رشتے کو بلا وجہ انکار کر دیا۔ تیمور کو تم نے بھائی بنا لیا ہے۔ اب اس گھر  
 میں لے دے کے مظہر بچا ہے جو تمہارے بیٹوں جیسا ہوگا کیونکہ وہ تم سے چار پانچ سال چھوٹا

ہوگا..... تو تم چاہتی کیا ہو؟“ صدف آپنی چڑسی گئیں۔  
 ”یقین کریں کہ میں نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں!“ میں نے سچائی سے کہا۔  
 ”تو اب سوچ لو ناں! تیمور بہت اچھا لڑکا ہے اور پھر تم دونوں کی آپس میں دوستی بھی  
 ہے.....“ صدف آپنی نے کہا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب کچھ سوچوں گی، مگر تیمور..... ہرگز نہیں!“ میں نے ہتھیار ڈال کر  
 اپنی جان چھڑوائی۔ صدف آپنی اور تانی آپنی چلی گئیں اور عائشہ باجی لینے کے لیے کمرے میں چلی  
 گئیں تو میں والدہ کے کمرے میں گئی۔ وہ نیم دراز و طیفوں کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ ابوتانی  
 آپنی کو چھوڑنے گئے ہوئے تھے اور علی بھائی دفتر سے نہ آئے تھے۔

”آؤ بیٹا! بیٹھو..... جارہی ہو کیا تم بھی؟“ والدہ نے پوچھا۔  
 ”نہیں والدہ! سوچا ہے صبح جاؤں گی اب دیر ہو گئی ہے.....“ میں نے جواب دیا۔  
 ”عائشہ کیا کر رہی ہے.....؟“ امی نے پوچھا۔

”لیٹ گئی ہیں ذرا۔“ میں نے بتایا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں اللہ کوئی خیر کی خبر دے گا، اس کی حالت سے  
 اندازہ ہو رہا ہے۔“ والدہ نے اندازہ لگایا۔

”اللہ بہتر کرے گا.....“ میں نے مختصر آکھا۔  
 ”تم ٹھیک تو ہو..... ست لگ رہی ہو؟“ والدہ نے پوچھا۔  
 ”بس یونہی والدہ! ذرا تھک سی گئی ہوں“ میں نے ان کے پاس لیٹتے ہوئے کہا۔  
 ”میرے بس میں ہو بیٹا تو میں تمہاری ساری تھکاوٹ اپنی پلکوں سے چن لوں۔“ وہ میرے  
 کندھے کو سہلانے لگیں۔

”والدہ! آپ سے ایک بات کرنی ہے.....“ میں نے لاڈ سے کہا۔  
 ”کہو میری جان!“ انہوں نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔  
 ”والدہ! آپ نے ماہِ رخ کے لیے رشتہ بھیجا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔  
 ”ہاں! تمہیں کس نے بتایا؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔  
 ”نگہت نے! تو کیا آپ مجھ سے چھپانا چاہتی تھیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اصل میں بیٹا ابھی تو صرف سوال کیا تھا، لڑکیوں کی عزت کے آگے ایسے ہی نازک ہوتے ہیں، سوچا اقرار کی صورت میں تو سب کو علم ہو جائے گا اور اگر انکار ہوا تو خواہ مخواہ پہلے سے بات نہ پھیل جائے۔ کسی بیٹی سے بات نہیں کی ابھی تک۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

”علی بھائی جانتے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”اسی کی تو خواہش ہے چندا! اور نہ میں تو اس بچی کو ایک آدھ دفعہ ملی ہوں اور باقی اس کے گھر والوں سے بھی سرسری ملاقات ہے۔ البتہ ڈاکٹر اعجاز سے ابھی حال ہی میں تفصیلی ملاقات بھی ہوئی ہے۔“ انہوں نے وضاحت کی تو مجھے یکدم کچھ یاد آ گیا۔

”والدہ! آپ نے اس عمر میں ہی اپنے دل کو روگ لگا لیا؟“ میں نے مذاق سے پوچھا۔

”دل کو روگ تو دو سال قبل ہی لگ گیا تھا جب تیرے نصیب میں تنہائی لکھ دی گئی تھی۔“

انہوں نے اواسی سے کہا۔

”کیا محسوس کرتی ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”بس بیٹھے بیٹھے دل تیزی سے دھڑکنے شروع کر دیتا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”یہ اس عمر میں بھی نوجوان اور ٹین ایجر لڑکیوں کی طرح دھڑکنے بے قابو ہو جانا..... ٹھیک علامت نہیں والدہ محترمہ، ذرا دل کو سنبھالیں۔“ میں نے ہنس کر انہیں بہلانے کی کوشش کی۔

”باتیں ٹالنا تمہیں بہت اچھی طرح آ گیا ہے۔“ انہوں نے مجھ سے کہا، ”والدہ! اصل بات آپ سے یہ کرنا تھی کہ ماہ رخ اور تیمور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور علی بھائی کی پسندیدگی ابھی نئی بات ہے مگر ان کا سلسلہ ذرا پرانا ہے۔ اس لیے آپ اپنی درخواست واپس لے لیں۔“ میں نے ان سے کہا۔

”بیٹا! اس طرح تو نہیں ہوتا اس طرح کے کاموں میں۔ ہم نے ان سے درخواست کی ہے تو اب ہم کیا یہ کہہ کر واپس لے لیں کہ ہمارا ارادہ بدل گیا ہے.....؟ اور یوں بھی تیمور کے لیے تو اس کی والدہ نے مجھ سے تمہارے لیے بات کی ہے۔“ والدہ نے مجھ پر ایک اور انکشاف کیا، تو گویا جگہت باز نہ آئی تھی۔

”والدہ! میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ تیمور ماہ رخ کو پسند کرتا ہے اور ماہ رخ تیمور کو، کیسے تیمور کی امی کی بات مان سکتی ہوں۔ ابھی تک وہ اپنے بیٹے کی پسند سے ناواقف ہیں اس لیے انہوں۔

نے ایسی بات کی ہے مگر اب میں ان کو بتاؤں گی تاکہ ہم تیمور کے لیے ماہ رخ کے ہاں رشتہ سمجھوا سکیں اور والدہ آپ خود ہی علی بھائی کو سمجھاویں.....“ میں نے تیمور کی وکالت کی۔

”ماہا! بیٹا تم اس گھر میں اپنی حیثیت منوانے کی کوشش میں اپنا آپ تاج پگھلی ہو۔ ہمارے لیے یہ بہت بڑی پریشانی ہے۔ ہم جیتے جی تو بے سکون ہیں ہی کم از کم ہمیں سکون سے مرنے تو دو۔“ والدہ سسک پڑیں۔

”میں نے کچھ نہیں کیا والدہ! نہ ہی مجھے کوئی فالتو کوشش کرنے کی ضرورت ہے اپنی حیثیت منوانے کے لیے۔ اگر آپ کے لیے خیال میں ایسا ہے تو ٹھیک ہے میں واپس آ جاتی ہوں آپ کے پاس، وہاں رہتی ہی نہیں۔“ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہیں اگر وہیں رہنا ہے تو پھر تیمور سے شادی کر لو بیٹا۔ تمہاری حیثیت شرعی لحاظ سے بھی وہاں ٹھیک ہو جائے گی اور ہمارا دیکھا بھالا گھرانہ ہے ہمیں بھی سکون اور بے فکری ہوگی۔“ انہوں نے بدستور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”شرعی حیثیت؟“ میں چونک اٹھی۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟“

”بیٹا گھر میں جوان و یوروں کی موجودگی میں تمہارا وہاں رہنا، لوگوں کے منہ تو نہیں بند کیے جاسکتے۔“ انہوں نے کہا۔

”کسی نے کچھ کہا؟“ میں حیران ہی تو رہ گئی۔

”کوئی کیا کہے گا بیٹا اور کہے گا تو کون سا ہمارے منہ پر کہے گا۔“ والدہ بولیں۔

”جس کی جرأت ہے وہ میرے سامنے کہے تو میں اسے اس بات کا جواب دوں گی۔“ میں روہانسی سی ہو گئی۔

”کیا جواب دو گی تم اس بات کا؟“ انہوں نے مجھ سے سوال پوچھا۔

”والدہ! وہ میرے لیے بھائیوں کی طرح ہیں دونوں، تیمور بڑا ہے مگر وہ گھر میں نہیں ہوتا اور مظہر مجھ سے پانچ چھ برس چھوٹا ہے.....“ میں نے دلیل دی۔

”تمہیں یاد ہے اپنی کبریائی؟“ والدہ نے پوچھا۔

”ان کا یہاں کیا ذکر آ گیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ان کی شادی پہلے تمہارے بڑے تایا سے ہوئی تھی، ایک بچہ ہوا تو تمہارے تایا کا انتقال

ہو گیا پھر تمہاری چار پھوپھوں کے بعد عبدالرحمان چچا تھے جو عمر میں کبریٰ تائی سے نو برس چھوٹے تھے۔ ان سے کبریٰ تائی کا نکاح کر دیا گیا..... انہوں نے مجھے تفصیل بتائی۔

”عبدالرحمان چچا نو برس چھوٹے تھے کبریٰ تائی سے؟ لگتا تو نہیں والدہ!“ میں نے حیرت سے کہا۔

”اس لیے کہ جوان مرد اور دھان پان سی عورت اس سے دس برس بڑی بھی ہو تو بڑی نہیں لگتی اور اگر بڑی لگتی بھی ہو تو کون سا شرعی طور پر اس کی ممانعت ہے۔ صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ بیوہ عورت پر خواہ مخواہ لوگوں کو ہر بات کی الزام تراشی کی عادت ہوتی ہے۔ پھر تم جہاں دفتر جاتی ہو وہاں دن بھر مردوں سے واسطہ رہتا ہے لوگ جانے پیٹھ پیچھے کیا کیا باتیں کرتے ہوں گے۔“ میں ان کی بات سن کر خاموش ہی رہی۔ میں نے تو کبھی اس سے قبل اس نقطہ نظر سے نہ سوچا تھا۔ دفتر میں نوید صاحب سے میرا دن بھر کئی مرتبہ رابطہ ہوتا تھا کیونکہ وہ میرے بعد سب سے اہم ذمے دار پوسٹ پر تھے۔ اب اگر کوئی یہ سنے کہ انہوں نے میرے لیے رشتہ بھجوا دیا ہے تو میری صورت حال کیسی عجیب سی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لوگ جانے کیا سوچتے ہوں گے کہ میں گھر میں ہوتی ہوں اور تیور بھی آتا رہتا ہے، مظہر تو چلو بچہ ہے..... لیکن اب تو مظہر بھی ایسا بچہ نہیں رہا، اس کے بارے میں بھی لوگ باتیں تو کر سکتے ہیں۔ والدہ ٹھیک ہی کہتی ہیں، لوگوں کو تو سایہ بھی نظر آ جائے تو اسے بندہ بنا کر بیوہ کے ساتھ نتھی کر دیتے ہیں۔ بظاہر تو میں نے آنکھیں موند لیں اور والدہ سمجھیں کہ میں سو گئی ہوں لیکن حقیقتاً میرا دل ان سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھو کر تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے دھڑک رہا تھا اور میں سوچوں کی گھسن گھیریوں میں گم تھی۔

کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کیسے جیوں؟ یہ دنیا تو چاہے کہ میں سانس بھی نہ لوں، سانس ہی تو صرف آ جا رہی ہے تیرے بعد۔ ورنہ جسم تو ایک صحرا ہے، جس کی زمین بنجر ہے، دل میں خواہشوں کے سراب بھی نہیں ہیں، کبھی جذبے اس بدن پر اب بارش کی طرح نہیں برستے۔

نوید، تیور اور مظہر..... ایک بھنور کی طرح میرے ذہن میں یہ تینوں نام گردش کر رہے تھے۔ میں دیر تک پڑی سوچتی رہی کہ والدہ تو میری ماں ہیں اور انہوں نے بہت محتاط طریقے سے مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی ہے۔ لوگوں کے الفاظ کے نشتر اگر مجھے سہنے پڑے تو میں مجروح ہی ہو جاؤں گی۔ اور جانے میں کن گردابوں میں بھٹک رہی تھی اور کیا سوچ رہی تھی کہ یکدم میری سوچ

بہ آواز بلند میری زبان پر آ گئی۔ ”میں اب اس کے بارے میں سوچوں گی والدہ!“

”کس بارے میں بیٹا؟“ والدہ نے پوچھا تو میں چونک گئی اور سیدھی ہو کر اٹھ بیٹھی۔

”آپ نے جو کچھ کہا ہے اب اس پر غور کروں گی۔ میں جلد ہی آپ کو کوئی فیصلہ کر کے بتاؤں گی مگر تیور نہیں..... اور نہ ہی نوید صاحب!“ میں نے حتمی انداز میں کہا۔

”تم سمجھ دار ہو بیٹا اور مجھے امید ہے کہ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، تاہم اچھے انسان کی پرکھ کے لیے معیار مختلف ہوتے ہیں بیٹا اور پھر یہ یاد رکھنا کہ دوسری شادی، پہلی شادی سے بڑا جوا ہوتی ہے۔“ والدہ نے کہا۔

”بس والدہ! آپ میرے لیے دعا کیا کریں۔“ میں نے ان کے گال پر پیار کیا۔

”میرے جسم کا رواں رواں تمہارے لیے دعا گورہتا ہے بیٹا!“ انہوں نے مجھے لپٹا لیا۔

”مجھے اس کا پورا یقین ہے والدہ۔“ میں نے بھی اپنی بانہیں ان کے گرد حائل کر دیں۔

ان سے اجازت لے کر میں اپنے کمرے میں آ گئی جہاں عائشہ باجی نیم دراز تھیں۔ میں نے اپنا سامان سینٹنا شروع کر دیا کیونکہ صبح مجھے روانہ ہونا تھا۔ سامان کی پیکنگ کے دوران بھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ اب مجھے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا ہو گا..... اور کچھ نہیں فقہا یہ کہ اب مجھے کس گھر میں رہنا تھا؟ واقعی کیا میرا اب سسرالی گھر میں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ والدہ کی باتوں نے میرے دماغ کی بہت سی بند کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ سامان پیک کر کے سکون سے بیٹھی ہی تھی کہ مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔ غور سے دیکھا تو عائشہ باجی درد کی شدت سے دوہری ہو رہی تھیں۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”عائشہ باجی! کیا ہوا؟“ میں لپک کر ان کے نزدیک گئی۔

”ماہا! میں مر رہی ہوں! میں نہیں بچنے والی۔“ ان کی آواز درد اور کرب سے لبریز تھی۔ تھبی درد کی لہر ان کے جسم میں بیدار ہوئی اور وہ تڑپ اٹھیں۔ میرے لیے یہ تجربہ بالکل نیا تھا، میں تو گھبرا گئی اور چیختی ہوئی والدہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”والدہ! عائشہ باجی کو کچھ ہو گیا ہے شاید وہ مرنے والی ہیں.....“ میں بلند آواز سے بول رہی تھی اور ان کے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچی تو مزید گھبرا گئی۔ والدہ میری چیخیں سن کر غالباً اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہیں بیڈ کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ غالباً انہیں



ہارٹ ایک ہوا تھا۔ میں عائشہ باجی کی پریشانی بھول کر والدہ کی طرف لپکی۔

”کیا ہوا والدہ؟“ میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”تمہاری چیخوں کی آواز سن کر میں اٹھی تو فوراً چکر سا آگیا اور یہ سوچ کر کہ کہیں گرنہ جاؤں میں نے بیڈ پکڑ کر بیٹھنا مناسب سمجھا۔“ والدہ نے وضاحت کی۔

”شکر ہے اللہ کا میں تو گھبراہٹ میں تھی۔“ میں نے انہیں بھینچ لیا۔

”تم کیوں چیختی تھیں؟ کیا ہوا عائشہ کو؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”وہ عائشہ باجی! وہ بہت تکلیف میں ہیں والدہ! کہہ رہی تھیں کہ وہ درد سے مر رہی ہیں۔“

میں نے جلدی سے بتایا۔

”اللہ بہتر کرے گا، تم اس کے پاس ہی جاؤ، ذرا ہلکے ہلکے اس کی کمر دباؤ میں آتی ہوں۔“

انہوں نے کہا تو میں نے اٹھنے میں ان کی مدد کی، انہیں کرسی پر بٹھا کر میں اپنے کمرے میں لوٹی جہاں عائشہ باجی اس وقت پرسکون بیٹھی تھیں۔

”آپ ٹھیک ہیں عائشہ باجی؟ مجھے تو آپ نے پریشان ہی کر دیا تھا۔“ کیسے آرام سے بیٹھی تھیں اس وقت۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

”تم والدہ کو بلاؤ، میری طبیعت ٹھیک نہیں مجھے اسپتال لے کر جانا ہوگا۔“ عائشہ باجی نے کہا۔

”مگر آپ تو ابھی ٹھیک ہیں۔“ میری بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پھر تکلیف سے

دوہری ہونا شروع ہو گئیں۔ تبھی والدہ ہاتھ میں دودھ کا گلاس لیے ہوئے آئیں اور اس گلاس کو میز

پر رکھ کر آگے بڑھ کر عائشہ باجی کو تھام لیا وہ درد سے دوہری ہو رہی تھیں اور والدہ آنکھیں بند کیے

زیر لب کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی حالت پھر سنبھل گئی تو والدہ نے

انہیں دودھ کا گلاس زبردستی پلایا جو عائشہ باجی سے پیا نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس میں

دلیسی گھی اور انڈا اڈال کر ابالا تھا اور ڈالتے کے لیے چینی بھی ڈالی تھی۔ عائشہ باجی نے ناک منہ

چڑھا کر اور آنسو بہا بہا کر بے شکل گلاس خالی کیا۔ تھوڑی دیر میں وہ پھر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔

”والدہ! یہ کیا ڈراما کر رہی ہیں عائشہ باجی۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”یوں نہیں کہتے بیٹا! اسی طرح ہوتا ہے زہ درد، قدرت کی طرف سے ایسا ہی ہے، رک رک

کر درد ہوگا اور جب درد ختم ہوتا ہے تو سکون ہوتا ہے۔“ والدہ نے کہا تو میں ذرا شرمندہ ہوئی۔

ظاہر ہے جب میں ایسے مراحل سے گزری ہی نہ تھی تو بھلا کیونکر جانتی۔

”تم تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھو میں اپنے کپڑے تبدیل کر کے آتی ہوں تو پھر تم بھی کپڑے

تبدیل کر لو، پھر علی کو بتاؤ اور اسپتال نکلنے کی تیاری کرو۔“ والدہ نے ہدایات جاری کیں۔ وہ خود تیار

ہونے چل دیں اور میں عائشہ باجی کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر گھبرا گئی۔ ان کے پاس بیٹھ کر ہلکے ہلکے

ان کے ہاتھ سہلانے لگی۔ والدہ تیار ہو کر آئیں تو میں نے بھی اٹھ کر علی بھائی کو اطلاع دی اور پھر

خود تیار ہو کر ساتھ ہی اسپتال لے جانے والا سامان تیار کیا۔ عائشہ باجی کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔

والدہ نے ابو کو بتایا اور ہم گھر سے روانہ ہوئے۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی جب کہ والدہ عائشہ

باجی کو ساتھ لے کر پیچھے بیٹھ گئیں۔ کال کر کے شاید والدہ نے صدف آپ کی کو بھی بتا دیا کیونکہ اسپتال

پہنچنے کے تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی پہنچ گئیں۔

علی بھائی وینٹگ روم میں بیٹھے تھے جب کہ میں، صدف آپ اور والدہ عائشہ باجی کے ہمراہ

تھے۔ جب عائشہ باجی کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی تو میں گھبرا گئی، تب صدف آپ نے مجھے

وینٹگ روم میں چلے جانے کو کہا۔ میں بھی علی بھائی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ مجھے شدید خوف آرہا

تھا۔ یہی لگ رہا تھا کہ عائشہ باجی نہ چننے والی نہیں ہیں۔ تسلی ہاتھوں میں رو لے جا رہی تھی مگر سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ اس پر پڑھ کیا رہی ہوں۔

گھنٹوں یونہی بیٹھے گزر گئے، یوں لگتا تھا کہ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ علی بھائی بیچ میں ایک

دفعہ جا کر کینیڈین سے چائے بھی بنا کر لائے جو والدہ اور صدف آپ کی کو بھی باری باری بلوا کر

پلا دی۔ دل چاہ رہا تھا کہ میں علی بھائی سے ماہ رخ کے بارے میں بات کروں لیکن یہ سوچ کر

خاموش ہو رہی کہ والدہ یہ بات بہتر طریقے سے کر سکیں گی۔ گھنٹوں میں ہمارے درمیان چند

جملوں کا بے شکل تبادلہ ہوا تھا۔ ”استحسان کیسے ہوتے؟“

”آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے؟“

”دفتر کب سے جوائن کر رہی ہو؟“

”والدہ کی طرف سے میں پریشان ہوتی ہوں ان کی بیماری کا سن کر۔“

”تیور کی پائنگ آؤٹ کب ہے کون کون جائے گا؟“

غرض یونہی ادھر ادھر کی باتیں ہم اپنی کرتے رہے، وقت جو نہ گزر رہا تھا۔ جب ڈاکٹر ز نے

یہ بتایا کہ عائشہ باجی کی حالت کے پیش نظر فوری آپریشن کی ضرورت ہے اور انہیں آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تو والدہ اور صدف آپنی بھی دیننگ روم میں آگئیں۔ والدہ بہت گھبراہٹ میں تھیں۔ صدف آپنی نے انہیں زبردستی سکون آدرودا کی ایک گولی کھلا دی تھی پھر بھی وہ بیٹھی ہاتھوں سے تسبیح اور آنکھوں سے آنسو رول رہی تھیں۔

کمرے میں ہم چار نفوس تھے اور بالکل خاموش۔ ایسا سا نا سادل میں اتر آیا تھا۔ دل اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہر کوئی جانے کیا سوچ رہا تھا اور میں..... سوچ رہی تھی کہ اب ہم کبھی عائشہ باجی کو نہ دیکھ پائیں گے۔ ڈاکٹر ز کے مطابق ان کی حالت تشویش ناک تھی۔ انہیں خون بھی لگایا جا رہا تھا۔ عائشہ باجی نہ بچیں اور ان کا بچہ بچ گیا تو.....؟ اسے میں لے لوں گی، میں پالوں گی، اپنے بچوں کی طرح!! اچھا ہے کہ مجھے بھی مصروفیت مل جائے گی اور میرے لیے جو ہر کوئی شادی کا اصرار کر رہا ہے وہ بند ہو جائے گا..... لیکن عثمان بھائی کیا مجھے اپنا بچہ دے دیں گے۔ وہ بھی پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا بچہ لینے پر اصرار کریں، پھر میں کیا کر دوں گی؟

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجھے سب لوگ کہیں کہ بچے کی خاطر عثمان بھائی سے شادی کر لو۔ کتنا مشکل فیصلہ ہو گا میرے لیے، بچے کی محبت میں، میں تو بٹ کر رہ جاؤں گی۔ میرے تو اپنے ہی دل اور دماغ کے مابین کشمکش شروع ہو جائے گی۔ عثمان بھائی مجھ سے پندرہ بیس برس بڑے ہوں گے اور جانے دی مجھ سے شادی کرنے کو تیار نہ ہوں۔ اتنا عرصہ وہ عائشہ باجی کی رفاقت میں رہے۔ کسی کے کہنے پر بھی دوسری شادی کا نہ سوچا، اب بھی ہو سکتا ہے بچے کی خاطر نہ مانیں۔

میری سوچوں کا تسلسل ”السلام علیکم“ کی آواز پر ٹوٹا۔ والدہ نے اٹھ کر عثمان بھائی کی بلائیں لیں، علی بھائی اٹھ کر گلے ملے، صدف آپنی نے بھی کھڑے ہو کر آداب کہا اور میں جو ہمیشہ آگے بڑھ کر سر جھکا کر سر پر ہاتھ پھر دو کر دعائیں لیتی تھی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی، جس سے پریشانی مترشح تھی۔ کتنا پیار کرتے تھے وہ عائشہ باجی سے، کیا وہ میری رفاقت میں عائشہ باجی کو بھلا پائیں گے؟

”کیسی ہو گڑیا؟“ انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”جی ٹھیک ہوں!“ میں نے بے شکل مری مری آواز نکالی۔

”اللہ نے تمہیں بڑی مشکل سے بچالیا ہے، ہم تو دعا کرتے ہیں کہ اب تم پر کسی دکھ اور تکلیف

کا سایہ بھی نہ پڑے۔“ عثمان بھائی مجھے دعا دے رہے تھے۔ ان کی ہمدردی پا کر میرے آنسو چھلک پڑے۔

”اللہ آپ کو بھی صبر دے!“ میں نے صرف دل میں سوچا۔

”کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟“ وہ صدف آپنی سے پوچھ رہے تھے۔ صدف آپنی انہیں کچھ بتا رہی تھیں اور میں تک تک دیدم بنی اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو آنے والے وقت میں جانے کن حالات کا شکار ہونے جا رہا تھا۔ تبھی کارڈر میں آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ہم سب تیر کی طرح اس طرف بھاگے۔ تھیٹر سے سرجن اور لیڈی ڈاکٹر باہر نکلے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ آپس میں بات کرتے کرتے چپ ہو گئے، میرے کان ہمتن گوش ہو گئے اگلے ڈائلاگ سننے کے لیے، کتنی فلمی سچویشن تھی۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا پسلیوں کی دیوار یوں توڑ کر باہر آنے کو بے چین ہو۔

”عائشہ کے شوہر کون ہیں؟“ سرجن نے پوچھا تو عثمان بھائی تیزی سے آگے بڑھے۔

”عائشہ ٹھیک ہے ناں ڈاکٹر؟“ مجھے ان پر ترس آیا، جانے اگلے لمحے ڈاکٹر کیا کہنے والے تھے۔

”الحمد للہ!“ ڈاکٹر کا اتنا ہی کہنا تھا کہ والدہ اور صدف آپنی نے کلمہ شکر بلند کیا۔

”مسٹر عثمان! آنول دونوں بچوں کے گرد بری طرح لپٹی ہوئی تھی جس سے اتنی پیچیدگی پیدا ہوئی، تاہم اب عائشہ کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“ آئی سی یو میں چوبیس گھنٹے رہیں گی اور آپ کے ننھے فرشتے زسری میں۔“ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا۔

”دو بچے؟“ میں حیرت سے چیخی۔ ”اللہ کتنے کیوٹ ہوں گے، میں انہیں کب دیکھ سکوں گی؟“

اچانک ملنے والی خوشی سنبھل ہی نہ پارہی تھی۔ علی بھائی اور عثمان بھائی آپس میں لپٹ گئے، والدہ نے عثمان بھائی کو مبارک باد دی اور ماتھے کا بوسہ لیا۔ صدف آپنی اور میں نے بھی مبارک باد دی۔

”آپ میں اے کسی کو یہ جاننے سے دلچسپی نہیں کہ کیا ہوا؟“ ڈاکٹر نے ہنس کر سوال کیا تو ہماری سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں۔

”عثمان صاحب پیچیدگی کی وجہ سے آپ کے پہلے بچے ہی آپ کے آخری بچے بھی ہیں، اس لیے اللہ نے آپ کو بیٹی اور بیٹا دے کر آپ کی فیملی مکمل کر دی ہے۔“ ڈاکٹر نے بتایا تو ہم سب خوشی سے چیخ اٹھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عائشہ باجی کی زندگی کی یہ کمی پوری ہو گئی تھی، اللہ نے انہیں ماں کے عہدے پر فائز کیا تھا اس سے ہمیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ بیٹا ہو یا بیٹی، ایک بچہ ہو یا دو۔ شکر کی

بات تو یہ تھی کہ بچے صحت مند اور نارمل تھے۔ اس پر ہم جتنا بھی رب کا شکر ادا کرتے کم تھا۔  
دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ عائشہ باجی سے ملیں لیکن ممکن نہ ہوا، عثمان بھائی کو دو منٹ کے لیے اندر جانے کی اجازت ملی اور بچے بھی ہمیں زسری میں دور سے دکھائے گئے۔ ایسی صورت میں اسپتال میں کسی کے ٹھہرنے کی ضرورت تھی نہ فائدہ، سو علی بھائی صدف آپنی کو چھوڑنے ان کے ہاں چلے گئے اور میں اور والدہ عثمان بھائی کے ساتھ گھر روانہ ہوئے۔ والدہ فرنٹ سیٹ پر تھیں اور میں پیچھے بیٹھی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے عثمان بھائی کا چہرہ مجھے مسکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ کتنے خوش تھے، میں کیسی پاگل تھی جانے کیا کیا سوچ بیٹھی تھی۔ ”اللہ ان کی خوشیاں سلامت رکھے۔“ میرے دل سے دعا نکلی۔ ”آپ خوش ہیں عثمان بھائی؟“ اچانک میرے منہ سے بے وقوفوں والا سوال پھسل گیا۔ اس پر وہ ہنس پڑے۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ ہنسے۔ ”میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ خوش ہو، خالہ بن کر.....“  
”خوش تو میں بھی بہت ہوں، لیکن میں تو پہلے سے ہی خالہ ہوں آپ پہلی دفعہ پاپا بنے ہیں اس لیے آپ مجھ سے زیادہ خوش ہوں گے۔“ میں نے بھی ہنس کر کہا۔  
”وہ تو ہے، ویسے تم سمجھ دار بہت ہو۔“ انہوں نے میری تائید کی تو والدہ بھی مسکرا دیں۔  
”عثمان بھائی! کیا معلوم تھا کہ آپ کے ہاں جڑواں بچے آنے والے ہیں؟“ میں اپنے ذہن میں اٹکا ہوا سوال پوچھنے سے باز نہ رہ سکی۔  
”ہاں مجھے معلوم تھا، صدف کو اور آنٹی کو.....“ انہوں نے انکشاف کیا۔

”تو مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ میں نے منہ بسورا۔

”عائشہ کو بھی نہیں بتایا تھا، آنٹی کا کہنا تھا کہ بعض عورتیں یہ سن کر پریشان ہو جاتیں ہیں اور عائشہ کو پریشانی سے بچانے کے لیے نہیں بتایا اور تمہیں نہ بتانے کی ایک اور خاص وجہ ہے۔“ عثمان بھائی ہنس کر بولے۔

”وہ کیا وجہ ہے جناب؟“ میں نے چڑ کر پوچھا۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ آنٹی کہتی تھیں کہ زیادہ لوگوں کو بتائیں تو نظر لگ جاتی ہے۔“ عثمان بھائی نے وضاحت کی۔

”اچھا تو کیا میری نظر ہی زیادہ لگتی تھی؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”ظاہر ہے بڑی آنکھوں سے نظر لگنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔“ عثمان بھائی پھر ہنسے۔  
”بہت ہلکی آرسی ہے آپ کو؟ اب تو میں ان کو نظر لگا کر ہی چھوڑوں گی بلکہ اغوا کر کے لے جاؤں گی۔“ میری عثمان بھائی سے ہمیشہ یونہی بچکانہ سی لڑائی ہوتی تھی کیونکہ میں ان سے کافی چھوٹی تھی اور وہ مجھے بالکل بچی ہی سمجھتے تھے۔  
”معاف کر دو بھئی! ایسا نہ کرنا۔“ گھر آگیا تھا، عثمان بھائی نے گاڑی روک کر باقاعدہ میرے سامنے ہاتھ باندھے۔

”بس میں آپ سے ناراض ہوں۔“ میں نے منہ پھیر لیا۔

”اچھا چلو گڑیا! تم دونوں کو ہی لے جانا، ہمیں تو یوں بھی عادت ہے بغیر بچوں کے رہنے کی۔“ انہوں نے مجھے منانے کے لیے مصنوعی لالچ دیا تو میں تڑپ اٹھی۔

”اللہ نہ کرے عثمان بھائی! آپ کبھی اپنے بچوں کے بغیر رہیں میں تو مذاق کر رہی تھی۔ اللہ آپ اور عائشہ باجی کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔“ میں نے دل سے دعا کی۔  
”اللہ تعالیٰ تمہیں بھی بہت سی خوشیاں دے، اب تمہارے دکھ نہیں دیکھے جاتے!“ انہوں نے گھر کے اندر جاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ان کی شفقت سے بڑے بھائی جیسی شفقت کا احساس ہوا تھا۔

صبح اٹھ کر فون کر کے امی جان کو خوشخبری سنائی تو انہوں نے والدہ اور ابو سے بات کی، عثمان بھائی کو بھی بچوں کی مبارک باد دی۔ عثمان بھائی تو ناشتے کے بعد بتا کر اسپتال کا چکر لگانے کو چلے گئے۔ اسپتال کی اجازت تو شام کو ہی ملنی تھی اس لیے میں والدہ سے کسی کام کا کہہ کر علی بھائی کے دفتر سے گاڑی اور ڈرائیور منگوا کر بازار چلی گئی کیونکہ امی جان نے کہا تھا کہ میں موقع کی مناسبت سے بہترین تحائف خرید کر لاؤں۔ خود تو وہ کم ہی بازار جاتی تھیں مگر انہوں نے کہا کہ میں مظہر کو بھیج دیتی ہوں تاکہ ہم دونوں شاپنگ کریں اور یوں بھی مظہر پیسے لے آئے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس کافی رقم تھی اور کریڈٹ کارڈ بھی تھا اس لیے مظہر کو کالج جانے دیں میں خود ہی سب کر لوں گی۔

عثمان بھائی کی والدہ نہیں تھیں، میں نے ان کے، ان کے والد اور اپنے ابو کے لیے خوبصورت سوٹ خریدے۔ والدہ کے لیے نفیس سی شال اور سوٹ، علی بھائی کے لیے پینٹ، شرٹ

اور نکلائی، عائشہ باجی کے لیے سونے کی چین لی۔ یہ سب تحائف خوشی کے اظہار کا ذریعہ تھے کوئی رسم نہ تھی۔ ایک ایک جوڑا میں نے والدہ کے گھر کے تمام ملازموں کے لیے لیا کہ والدہ بھی خوشی کے ہر موقع پر ہمارے ملازمین کو کبھی فراموش نہیں کرتی تھیں۔ ایسی خوشیوں کے موقع پر ملازموں کو بھی دیا جائے تو نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ خود کو اہم سمجھتے ہیں۔ بچوں کے کپڑوں کی ایک بڑی سی دکان میں گئی تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی جادوئی دیس میں آگئی ہوں۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں نے بچوں کی ایسی پیاری پیاری چیزیں دیکھی تھیں۔ نرم نرم، خوبصورت رنگوں کے چھوٹے چھوٹے کپڑے، کھلونے، بستر، تو لیے کیسے خوبصورت لگ رہے تھے۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا۔

کیا میرا وجود ہمیشہ ہی محروم رہے گا؟ کیا یہ ننھے ننھے وجود کبھی میرے پاس بھی ہوں گے، مجھے ماما کا مان کبھی ملے گا! مل تو سکتے ہیں، مگر اتنا بڑا جو اکون کھیلے! میرے اندر سناٹے سے اتر آئے، مجھے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں تھی اور کیوں تھی؟ تبھی ایک سیلر گرل نے آکر مجھے چونکا دیا۔ ”میڈم کیالیں گی؟ بابا ہے یا بے بی اور عمر کیا ہے؟“ اس نے پیشہ ورانہ معمول کے سوال کیے۔ ”مجھے کپڑے بھی لینا ہیں، تو لیے بھی، کھلونے بھی، بابا بھی ہے اور بے بی بھی اور نو زائیدہ ہیں.....“ میں نے اپنی مطلوبہ اشیا کی وضاحت کی تو وہ چونک کر میرا منہ دیکھنے لگی۔

”گویا آپ نے کسی اور کے بچوں کے لیے گفت لینا ہے؟ کتنی رقم کا بجٹ ہے آپ کا؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”کوئی بجٹ نہیں ہے، ہر اچھی چیز دکھا دو۔ وہ کوئی اور نہیں ہیں میں خالہ ہوں ان کی.....“ جانے میرا لہجہ درشت ہو گیا تھا یا آواز میں غصہ دیکھ کر وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”آئی ایم سوری میڈم! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ خالہ بھی تو یقیناً ماں جیسی ہوتی ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے میڈم؟“ اس نے نرمی سے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں، میں تھک گئی ہوں ذرا.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”آپ بیٹھے میڈم! اس نے کرسی میرے پاس لا کر رکھی۔“ کیالیں گی آپ تازہ جوس یا کافی؟“

”بہت شکریہ.....“ میں نے کہا۔

”زارا! زارا نام ہے میرا۔ آپ تکلف نہ کریں پلیز!“ اس نے انتہائی پیار سے کہا۔

”بڑی اچھی دکان ہے زارا آپ کی جہاں آپ گا کہوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔“ میں نے تعریف کی۔

”شکریہ میڈم! دکان پر میں ملازم ہوں۔ ہم گا کہوں کا خیال تو رکھتے ہیں لیکن جوس یا کافی پلانا ہمارے فرائض میں نہیں ہے۔ میں خود اپنے پاس سے آپ کی خاطر کرنا چاہتی ہوں، اگر آپ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھیں تو.....“ اس نے وضاحت کی۔

”بس مجھے سادہ پانی پلا دو، ٹھنڈا نہ ہو۔ ذرا طبیعت سنہیلے تو میں شاپنگ کر لوں۔“ میں نے اس سے کہا۔ پانی پی کر میری حالت قدرے بہتر ہوگئی تو میں نے لڑکیوں اور لڑکوں کے رنگوں کی مناسبت سے نو مولودوں کے لیے پانچ پانچ جوڑے، ایک ایک تولیا دو دو بستر اور جڑواں بچوں والی پرام خریدی۔ کھلونوں کی تو ابھی ان کی عمر ہی نہ تھی۔ ادائیگی کر کے میں نے زارا کا شکریہ ادا کیا اور کیش کاؤنٹر پر موجود مالک کو بتایا کہ زارا نام کی ان کی کارکن بہت اچھی لڑکی ہے اور اس کا اخلاق مجھے بہت پسند آیا ہے۔ والدہ کہتی ہیں کہ حدیث کے مطابق ہمیں جو چیز اچھی لگے اس کی تعریف کرنا چاہیے اور اگر کوئی آدمی اچھا لگے تو بھی اسے بتانا چاہیے۔ دکان کے مالک میری زبان سے زارا کی تعریف سن کر بہت خوش ہوئے۔ سامان گاڑی میں رکھوا کر میں نے گاڑی کا رخ اپنے سرسالی گھر کی طرف کر دیا۔ سامان وہاں چھوڑا اور واپس والدہ کے گھر کے لیے روانہ ہوئی۔

”گھر کب آؤ گی بیٹا؟“ امی جان نے پوچھا۔

”بس عائشہ باجی گھر آجائیں تو اس کے ایک دو دن کے بعد..... اگر کوئی کام ہے تو میں رک جاتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جگ جگ جو بیٹا! یونہی پوچھ رہی تھی۔ جو تمہارا پروگرام ہے وہ ٹھیک ہے۔ چند دن اور رہ لو۔ عائشہ کو گھر آئے جب تین چار دن ہو جائیں گے تو میں آجاؤں گی، واپسی پر تمہیں بھی لیتی آؤں گی؟“ انہوں نے گویا استفسار کیا۔

”ٹھیک ہے ای جان!“ میں نے ان کی تائید کی۔

والدہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچا کہ راستے میں اسی پھولوں کی دکان سے پھول لے لوں تو مظہر علی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کم از کم میں اس کو بتا دوں کہ میں دفتر نہ جا رہی تھی۔ رابطہ نہ ہونے پر وہ کس قدر پریشان ہوگا۔ ڈرائیور سے گاڑی دکان کے عین سامنے رکوائی

اور دکان کے اندر گئی تو ایک مستعد سے نوجوان نے آکر پوچھا کہ مجھے کیا لینا ہے۔

میں نے اسے گلابوں کا ایک گلدستہ تیار کرنے کو کہا اور دکان میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مظہر علی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ رقم کی ادائیگی کرتے ہوئے میں نے دکان کے مالک سے پوچھ ہی لیا کہ مظہر علی کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ وہاں سے نوکری چھوڑ چکا ہے میں نے سلیز مین سے کہا کہ وہ گلدستہ گاڑی میں رکھ دے۔ خود بھی گاڑی میں آئیٹھی اور ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میرے حافظے میں گزشتہ دواڑھائی ماہ کے واقعات گردش کرنے لگے۔ کتنی مشکل سے میں موت کے منہ سے بچ کر آئی تھی۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے نوید صاحب اور تیور کے رشتوں کے انکشافات تھے اور سب کی طرف سے اب مجھے یہی تاثر دیا جا رہا تھا کہ میرے لیے یہی وقت ہے کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لوں۔

شام کو اسپتال گئے تھے ہمیں عائشہ باجی سے ملنے کا موقع بھی ملا اور ان کے پیارے پیارے گلابی بچوں سے بھی۔ جن کے نام رکھنے کے معاملے پر خوب ہنسی مذاق ہوا، تاہم عائشہ باجی نے فیصلہ سنایا کہ بچوں کے دادا بچوں کا نام رکھیں گے۔ اس لیے ہم نے انہیں تب تک کے لیے گڑیا اور گپلو کہنے کا فیصلہ کیا۔ عائشہ باجی زیادہ دیر تک نہیں بول سکتی تھیں، انہیں ابھی کمزوری تھی۔ تاہم اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی مل جانے پر وہ جتنا بھی فخر کرتیں کم تھا۔ خصوصاً جب قدرت نے انہیں ایک ہی دفعہ میں بیٹے اور بیٹی دونوں سے نوازا دیا تھا اور مزید خوشی انہیں اس لیے بھی تھی کہ انہیں اس سے قبل دو بچوں کا علم بھی نہ تھا۔

تین چار دن بعد ڈاکٹر نے عائشہ باجی کو گھر بھجوا دیا۔ عائشہ باجی کے گھر آنے کے بعد دو ہی دن گزرے تھے کہ امی جان اور مظہر تحائف کے ساتھ ڈھیروں مٹھائی اور پھول وغیرہ لے کر آئے۔ تحائف کے ساتھ کچھ رقم امی جان نے عائشہ باجی کو دی۔ عائشہ باجی کے سر نے بچوں کے نام احمد عثمان اور فاطمہ عثمان رکھے تھے اور دونوں نام سب کو بہت پسند آئے تھے۔ بچے ساز میں چھوٹے اور قدرے کمزور تھے لیکن اللہ کے فضل سے صحت مند تھے۔ سکون سے سوئے رہتے۔ والدہ اور عائشہ باجی ان کے پاس ہوتی تھیں لیکن بقول والدہ وہ بڑے ہی ”بببے“ بچے تھے، جنگ نہ کرتے

تھے۔ واپسی پر مجھے امی جان اور مظہر کے ساتھ ہی جانا تھا۔ سامان میں نے سمیٹ رکھا تھا۔ سارا سامان مظہر نے گاڑی میں رکھوایا۔ بیساکھیاں اور وٹیل چیئر کے لیے میں نے ابو کو بتایا کہ کسی مستحق کو دلوادیں۔ سب سے مل کر اور ان دونوں ٹھہ گئے تو ہتھوں جیسے بچوں کو پیار کر کے میں روانہ ہوئی۔

کتنے ہی عرصہ کے بعد گھر آئی، اس گھر میں میرے لیے سکون کا احساس تھا کہ یہاں غالب کی یادیں میری رفیق ہوتی تھیں۔ مجھے ابھی تک ان کی خوشبو آتی تھی اور کبھی ان کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ اگرچہ اب مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ سب میرا دواہمہ تھا مگر کبھی ہم سہراہوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے بھی طمانیت محسوس کرتے ہیں۔

دو ماہ سے بھی زائد عرصہ غیر حاضر رہ کر میں اس روز دفتر گئی تو ہر شخص کا چہرہ مجھے خوش آمدید کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ لوگ خوش تھے اور خوش نظر آ رہے تھے۔ ایسا نہ تھا کہ میری غیر حاضری میں انہیں کوئی مسئلہ ہوتا تھا مگر میں نے اپنے اور اپنے ماتحتوں کے درمیان حد فاصل بھی قائم رکھی تھی اور ان سے قربت بھی ایسی تھی کہ وہ اپنے ہر طرح کے ذاتی مسئلے اور پریشانی کو بھی میرے ساتھ بانٹ لیتے تھے۔ ایک اچھے باس کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ لوگ اس سے خوف زدہ نہ ہوں بلکہ یہ کہ وہ لوگوں کی عزت کرے اور ان سے عزت کروائے۔ میں نے ایک محتاط رویہ بھی سب سے اپنا رکھا تھا خصوصاً مردانہ اسٹاف سے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ میں اس بات کو بھی یقینی بناتی تھی کہ میرے علاوہ بھی باقی سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کی عزت کریں، برداشت سے کام لیں اور کسی کو کمتر نہ سمجھیں۔ پرانے لوگ نئے آنے والوں کے لیے معاون ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دفتر میں سینئرز بھی ماتحتوں کی عزت اور احترام کرتے تھے، ان کی غلطیوں پر ٹوکنے کے بجائے ان کی اصلاح کا عمل روارکھا جاتا تھا۔ میرے دفتر میں جا کر بیٹھنے کے بعد سب لوگ ایک ایک کر کے آئے، سب نے مجھے صحت یاب ہونے کی مبارک باد دی اور اپنی سیٹ پرواپس آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔

”میڈم، ہم بہت دعا کرتے تھے آپ کے لیے.....!“

”خدا کا شکر ہے میڈم کہ آپ اتنے شدید حادثے سے بچ گئیں۔“

”آپ کے بغیر دفتر بہت مختلف لگتا تھا۔“ غرض اسی طرح کی بہت سی رسمی باتیں اور فقرے۔

لیکن مجھے علم تھا کہ وہ سب یہ باتیں خلوص سے کر رہے تھے۔ ہمارے ایک بہت سینئر اسٹاف ممبر شیروانی صاحب نے مجھ سے درخواست کی کہ اس روز کی چائے میں دفتر کے تمام کارکنوں کی طرف سے پیوں۔ وہ سب مل کر تھوڑی تھوڑی رقم ملا کر پارٹی کا اہتمام کرنا چاہ رہے تھے۔

”شیروانی صاحب! آج کی پارٹی میری طرف سے کر لیتے ہیں۔“ میں نے تجویز دی۔

”میڈم! دفتر کا ہر شخص خواہ وہ چہرہ ہی ہو اپنی خوشی سے کچھ نہ کچھ حصہ ڈالنا چاہتا ہے تاکہ آپ کے لیے ہم سادہ سی پارٹی کر سکیں۔ ان کے خلوص کو نہ ٹھکرائیں۔“ شیروانی صاحب نے کہا۔

”ارے نہیں شیروانی صاحب! میں کسی کا خلوص نہیں ٹھکرا رہی ہوں لیکن..... ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ہر کسی کے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔“ میں نے رمان سے کہا۔

”آپ کی بات بھی بجا ہے میڈم! لیکن ہم پارٹی سادہ رکھتے ہیں اور ہر کسی سے اس کی حیثیت کے مطابق ہی حصہ لیں گے اور کچھ مقصد نہیں،، صرف آپ کی صحت یابی کا جشن ساوگی سے منانا مقصود ہے۔“ شیروانی صاحب بضد تھے۔

”چلیں ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی!“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”شیروانی صاحب ذرا نوید صاحب کو بھیجے گا۔“ تھوڑی دیر میں نوید صاحب آگئے، میں نے حسب عادت فائلیں دیکھتے ہوئے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ میں دانستہ بھی ان کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی کہ کہیں مجھے ان کے چہرے پر ایسا کچھ نظر نہ آجائے جو میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے انہیں اس روز کی پارٹی کے متعلق کچھ ہدایات دیں پھر یکا یک مجھے کچھ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

”نوید صاحب رکے!“ وہ وہیں رک گئے۔ ”مجھے آپ سے ایک اور اہم بات پوچھنا تھی۔“

”جی، فرمائیے.....!“ وہ واپس مڑے اور میری میز کے سامنے آگئے۔

”آپ سے میں نے کہا تھا کہ مظہر علی کے بارے میں رابطہ کریں اور اسے بلائیں کسی

وقت؟“ میں نے پوچھا۔

”جی میڈم! یا نہیں رہا، اب چیک کروا کے اسے بلواتا ہوں اگلے دو ایک دن میں ہی۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”آپ اس کا ایڈریس چیک کر کے مجھے دیں، میں خود ہی چیک کر لوں گی۔“ میں نے کہا۔

”میں بھول گیا تھا۔ لیکن اب اس سلسلے میں تاخیر نہ ہوگی.....“ نوید صاحب سمجھے کہ میں

ناراض ہو رہی ہوں۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں جا کر اس کے گھر کے حالات کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا تو ان کو کچھ اطمینان ہوا۔ تمام اسٹاف کی طرف سے ساوہ سی پارٹی تھی، مجھے ان لوگوں کے خلوص کا خوب اندازہ تھا اور مجھے ان سب کا پیار شرمندہ کیے جا رہا تھا۔ تب میں نے نوید صاحب سے کہا کہ وہ اعلان کریں جو میں ان کو بتا چکی تھی اور سب سے پہلے میں اس طرح کا کوئی بھی کام کرنے سے پہلے امی جان سے مشورہ کر لیتی تھی۔ نوید صاحب نے چچا اٹھا کر ایک پلیٹ پر بجایا تو خاموشی چھا گئی۔

”خواتین و حضرات! میڈم کی طرف سے آپ سب لوگوں کے لیے اظہار تشکر کے لیے اور ان کی صحت یابی کی خوشی میں آپ سب کے لیے خوشخبری ہے کہ آپ سب کو اس ماہ کی تنخواہ کے ساتھ پانچ پانچ روز کی اضافی تنخواہ ملے گی۔ اس کا اطلاق چہرہ ہی سے لے کر مجھ ناچیز تک ہوتا ہے۔ یعنی پانچ روز کی تنخواہ اس ماہ کی تنخواہ کے ساتھ اضافی ملے گی۔“ ان کی آخری بات پر لوگ ہنسے اور بات مکمل ہونے پر سب کارکنوں نے زوردار تالیاں بجا کر مسرت کا اظہار کیا۔ یہ خوشی سب کے چہروں پر ہوید اٹھی۔

نوید صاحب نے اگلے ہی دن مجھے ایک پرچہ تھمایا جس پر مظہر علی کے گھر کا پتہ درج تھا۔ میں نے پرچہ لے کر پرس میں رکھ لیا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ پہلی فرصت میں ہی جاؤں گی پر پہلی فرصت مجھے چھٹی کے دن یعنی اتوار تک میسر نہ آسکی۔ ایڈریس کچھ ایسا مشکل تھا۔ گاڑی میں خود ہی چلا رہی تھی۔ چھاؤنی میں صدر کے بعد نسبتاً زیادہ آبادی والا علاقہ تھا، دھرم پورہ کی طرف۔ وہاں پر گھروں کے نمبر کافی واضح لکھے ہوئے تھے اس لیے مجھے گھر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی تھی۔ زیادہ تر گھر وہاں ایسے تھے جو کینوں کے کمزور مالی حالات کی عکاسی کر رہے تھے۔ میں گاڑی سے باہر نکلی تو بچے بڑے جو اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے یوں کھڑے ہو کر مجھے دیکھنے لگے جیسے چڑیا گھر سے زرافہ باہر آگیا ہو۔

میں ذرا جھینپتی ہوئی آگے بڑھی اور مطلوبہ گھر کے باہر گھنٹی کا بٹن دیکھنے لگی۔ گھنٹی کا بٹن تو مجھے نظر نہ آیا البتہ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر باہر کا کنڈامیرے لیے رضا کارانہ طور پر کھٹکھٹا ڈالا۔ جس کے جواب میں اندر سے نسوانی آواز میں دریافت کیا گیا کہ دروازے پر کون ہے۔ میں نے جواب میں پہلے تو اپنا تعارف کروانے کا سوچا لیکن اتنے لوگ ہمہ تن گوش تھے، پوچھنے ہی والی تھی مظہر علی

گھر پر ہے کہ مجھے اندازہ ہوا، یہ بھی غلط ہوگا۔

”صنذر صاحب کا گھر یہی ہے جی؟“ مجھے فوراً ترکیب سوچھ گئی۔ جلد ہی جواب میں دروازہ کھلا اور دروازے میں ایستادہ خاتون جو میری والدہ کی عمر کی تھیں، ان کا چہرہ مجھے بہت شناسا لگا۔ ”شاید غالب کی وفات پر ہمارے ہاں آئی ہوں؟“ میں نے سوچا۔

”آپ کون ہو بیٹا؟“ انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں اندر آ کر بات کر لوں؟“ میرے کہنے پر انہوں نے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔ میں اندر داخل ہوئی تو انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ گھر صاف ستھرا تھا، مختصر سا اور ایک ہی نظر میں مجھ پر گھر والوں کا سلیقہ اور غربت دونوں عیاں ہو گئے۔

”مجھے ماہا کہتے ہیں آئی!“ میں نے ان سے کہا۔

”آپ صنذر کو کیسے جانتی ہیں؟“ ان کے لہجے میں غم سے لبریز استفسار تھا اور شاید اس میں کوئی رشتہ کسی بے نام سے شک کی تھی۔

”جی میں نے صنذر کا نام کسی مصلحت کی وجہ سے لیا تھا، اصل میں مجھے مظہر علی سے ملنا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں مظہر علی سے ملنے کا کہوں تو باہر کھڑے ہوئے لوگ خواہ مخواہ متوجس ہوں گے۔“ میں نے وضاحت کی تو وہ ہنس پڑیں۔

”ویسے تمہاری عمر کی لڑکیوں سے ایسی سمجھداری کی توقع کم ہی ہوتی ہے! سوری بیٹا میرے کہنے کا تم نے برا تو نہیں منایا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ارے نہیں بالکل بھی نہیں، میری والدہ کی طرح ہیں آپ! اور وہ بھی مجھے اسی طرح مخاطب کرتی ہیں۔“ میں نے ان سے کہا۔

”شکریہ بیٹا!“ وہ بولیں۔ ”مظہر علی سے تمہیں کیوں ملنا ہے؟ کوئی ٹیوشن وغیرہ؟ کون سی کلاس میں پڑھتی ہو بیٹا؟“ ان کی باز پرس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔

”میں دکان پر بھی گئی تھی جہاں وہ کام کرتا تھا مگر وہ وہاں نہیں ملا اور اس وقت غالباً وہ گھر میں نہیں ہے!“ میں نے ان کے سوال پر سوال کر دیا۔

”وہ بہنوں کو لے کر ذرا اتوار بازار تک گیا ہے، بیٹا سفید پوش لوگ ہیں اس لیے بہت سی ضروریات وہاں سے سستے میں پوری ہو جاتی ہیں۔ بس قدرت نے سر چھپانے کو یہ چھوٹا سا ٹھکانا

دے رکھا ہے، وہ بھی شاید بک جاتا اگر صنذر علی کی زندگی رب سوہنے کو مقصود ہوتی تو، اس گھر کا بھی سودا کر رکھا تھا مگر اس نمائے کی زندگی نے ہی ختم ہو جانا تھا۔ میں اپنا آپ ختم کر کے بھی اس کی جان بچا پاتی تو بچا لیتی۔“ وہ یہ سب بتاتے ہوئے رونے لگیں تو میرے اندر غم کی برسات ہونے لگی۔ میں نے انہیں تسلی دی، وہ چپ ہو گئیں۔

”اوہو! یاد ہی نہیں رہا کہ کوئی چائے پانی ہی بنالوں۔“ انہوں نے فوراً بات بدلی۔

”میں چائے لوں گی آئی! بس ایک کپ چائے۔“ میں نے کہا۔ وہ چائے بنانے کو اٹھیں اور ایک کونے میں بنے ہوئے تین دیواروں والے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ابھی وہ چائے لے کر بھی نہ آئی تھیں کہ بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور انہوں نے جا کر دروازہ کھولا تو تین لڑکیاں بڑی بڑی چادروں میں ملبوس مظہر علی کے ہمراہ داخل ہوئیں۔ لڑکیوں نے گھر میں داخل ہو کر چادریں اتاریں، مجھے دیکھ کر وہ تھکنیں اور ان میں سے ایک لڑکی کو دیکھ کر میں چونکی۔ مظہر علی بھی حیرت سے تقریباً شک میں چلا گیا۔

”میڈم آپ یہاں کیسے؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

”بھئی اپنی بہنوں کا تعارف تو کرواؤ!“ میں نے بات بدلی۔

”زارا! جی ہیں سب سے بڑی، ثانیہ! جی دوسرے نمبر پر اور سب سے چھوٹی ثنا ہے!“ مظہر علی نے تعارف کروایا تو وہ باری باری مجھے ملیں۔

”میں ماہا ہوں!“ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ ”زارا! آپ سے ملاقات ہے ناں پہلے سے؟“

”آپ کو یاد ہے میڈم!“ زارا حیران تھی۔

”یاد نہ رہنے کی کوئی وجہ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اصل میں میڈم!“ اس نے بھائی کی تھلید میں مجھے میڈم کہا۔ ”کسی چیز کو یاد رکھنے کے لیے اس میں کچھ خاص ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مجھ میں ایسا کچھ خاص نہیں، البتہ آپ مجھے اس دن سے یاد ہیں.....“

”مجھ میں بھی ایسا کچھ خاص تو نہیں! شاید میں آپ کو اپنے جبروں کے ٹانگوں کے نشانات

کے باعث یاد رہی۔“ میں نے پوچھا۔

”آپ میں جو خاص بات ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتی، لیکن یہ مجھے علم ہے کہ آپ اتنی خاص

ہیں کہ ہم عام لوگوں کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہیں۔“ زارا نے کہا۔

”ارے کچھ ایسی خاص نہیں میں! مظہر علی کو ڈھونڈتی ہوئی آگئی..... اب چائے کون بنائے گا؟ آئی چائے بنانے والی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ثانیہ اٹھ کر ماں کی مدد کرنے کو چلی گئی، ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے، میں نے اپنے ایکسڈنٹ کے بارے میں بتایا، وہ لوگ صفدر علی کی باتیں بتاتے رہے۔ تھوڑی دیر لگا کر چائے آئی تو اس کے ساتھ بسکٹ، ابلے ہوئے انڈے اور تازہ بنے ہوئے پکڑے بھی تھے۔ یوں تو ان لڑکیوں اور ان کی ماں کا سلیقہ اس گھر کی سفید پوشی میں بول رہا تھا مگر ثانیہ کی اس لذیذ سروں نے چائے کا لطف دو بالا کر دیا۔ ”تو گویا آپ سب میں سے سب سے زیادہ ذائقہ ثانیہ کے ہاتھ میں ہے؟“ میں نے پکڑوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا! میری تینوں بیٹیاں گھڑ ہیں، گھر واری میں بھی اور گھر کا بوجھ بھی بانٹ رکھا ہے۔ چونکہ زارا نوکری کر رہی ہے اور ثنا ایک ٹیوشن سینٹر میں پڑھا رہی ہیں اس لیے ان کے بجائے ثانیہ کا کام آسان ہے تو وہ ساتھ گھر واری بھی دیکھ لیتی ہے۔“ ان کی امی نے وضاحت کی۔ اسی اثنا میں ثانیہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں چائے اور باقی لوازمات رکھ کر لائی اور ٹرے مظہر کے حوالے کی کہ وہ ڈرائیور کو بھی چائے دے آئے۔ مجھے اس بات نے بھی متاثر کیا۔ تاہم میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ ڈرائیور نہ تھا۔ ثانیہ بھی آکر ہمارے پاس بیٹھ گئی۔

”آپ کیا کرتی ہیں ثانیہ؟“ میں نے ثانیہ سے پوچھا۔

”جی میں گھر پر ہی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی ہوں۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”بہت زیادہ کام نہیں ہے کیونکہ جہاں ہم رہ رہے ہیں وہاں پر لوگ بہت زیادہ کپڑے نہیں بنواتے پھر بھی مہینے میں ہزار سے پندرہ سو تک کمائی لیتی ہوں۔“

”تو اچھے علاقوں سے کیوں نہیں کام لے لیتیں آپ؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں نے یہ کام کوئی باقاعدہ سیکھا تو نہیں، بس میرا استاد وقت اور حالات ہی ہیں..... ویسے بھی اس سے زیادہ کام شاید مجھ سے ہوگا بھی نہیں۔“ ثانیہ نے وضاحت کی۔

”کہاں تک پڑھا آپ نے ثانیہ؟“ میں نے پوچھا۔

”میں فورٹائر میں تھی، زارا بابا جی گریجویشن کر چکی تھیں اور ثنا گیارھویں میں جب صفدر بھائی کا حادثہ اور پھر انتقال ہوا۔ میں امتحان بھی نہ دے سکی اور پھر زندگی ایسی گردش میں آئی کہ سب کچھ

تہیں نہیں ہو گیا۔“ ثانیہ نے وضاحت کی۔

”مگر آپ کو امتحان دینا چاہیے تھا..... اب ہی دے لیں۔“ میں نے کہا۔

”اب تیاری کر رہی ہوں امتحان کی، جب تک زندگی کی گاڑی کسی ہموار سڑک پر نہ چلنے لگے سبھی کچھ ناہموار لگتا ہے۔ کوشش کر رہی ہوں کہ امتحان دے لوں تو کوئی بہتر نوکری مل جائے گی۔“ ثانیہ نے وضاحت کی۔ میرا اندازہ تھا کہ ثانیہ میری ہم عمر یا مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہوگی اور زارا مجھ سے غالباً دو تین سال بڑی۔

”آئی آپ نے زارا کا رشتہ وغیرہ نہیں طے کیا تھا؟ وہ تو گریجویشن کر چکی تھیں۔“ میں نے ذاتی سا سوال کیا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ وہ برائیاں منائیں گی، جس طرح مجھے ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنائیت محسوس ہو رہی تھی وہ بھی مجھ سے جھگ نہیں رہے تھے۔

”زارا کا نکاح ہوا تھا لیکن ہمارے مالی حالات تبدیل ہونے کے بعد اس کے سرال والوں نے خود ہی پہلے ہم سے رابطہ منقطع کیا اور بالآخر بغیر کسی وجہ کے طلاق بھجوا دی۔“ میرے سوال پر زارا وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھیں اور ان کی والدہ نے مختصر آجھے حقیقت بتا دی۔ ”اور اب ایک طلاق کی سند کے ساتھ میری بچی کے لیے جو بھی رشتہ آتا ہے وہ غم دے یا دوہا جو ہیں، میرا دل ہی نہیں مانتا۔ بس اللہ کی ذات کا آسرا ہے، اس نے جو وقت اور جو شخص اس کے نصیب کا مقرر کر رکھا ہے اسے ضرور ملے گا۔“

”انشاء اللہ!“ میں نے کہا۔ میں اس عورت کی قناعت اور یقین پر حیران تھی۔ وہاں سے واپسی پر بھی میں تمام رات یہی سوچتی رہی تھی کہ قناعت کی دولت کے آگے دنیا کی ہر دولت بیچ ہے۔

اگلے ہی روز مظہر علی دفتر آیا اور میں نے نوید صاحب کی موجودگی میں اس کا انٹرویو کیا۔ نوید صاحب سے ہی صلاح مشورہ کر کے اسے ایک مناسب نوکری کے لیے اپنا کنٹیکٹ لیٹر دے دیا گیا۔ اس کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔ ہم نے جو تنخواہ اسے دینے کا ارادہ کیا تھا وہ بہت زیادہ نہ تھی لیکن اس کی دو تین نوکریوں کی تنخواہیں ملا کر بھی وہ اتنی تنخواہ نہ لے رہا تھا۔ میں نے سب کام نوید صاحب کے مشورہ سے ہی کیے تھے۔ کوئی غیر ضروری حمایت بھی نہ کی تھی اور مظہر علی کے چہرے پر خوشی دیکھی تو مجھے اطمینان ہوا کہ یہ میرا پہلا قدم تھا۔ میں ابھی اس کے گھر والوں کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی لیکن ہر کام کا ایک وقت اور طریقہ کار ہوتا ہے، مجھے ہر طرح سے سوچ سمجھ کر ان



کی مدد کرتا تھی۔

”مظہر صاحب! میں نے انٹرویو کے آخر میں کہا۔ ”اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھیں، کیونکہ اگر آپ اپنی تعلیمی استعداد بڑھائیں تو ترقی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔“ اس نے میرا اور نوید صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

میں نماز پڑھ رہی تھی، مظہر اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں باہر نکلا ہوا تھا، امی جان بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے مارے باندھے سلام پھیرا اور بھاگی، دھیان نگہت کی طرف ہی رہتا تھا۔ جانے کب اس کی طرف سے کوئی خبر آجائے۔ فون اٹھایا تو نگہت ہی تھی۔ سلام دعا کے تبادلے کے بعد اس نے سب کی خیریت پوچھی۔ ”ہم سب تو خیریت سے ہیں، تم بتاؤ تمہاری طرف کیا حالات ہیں؟“ میں بے تاب ہو رہی تھی کہ اس نے فون کیوں کیا ہے۔ اس کی آواز سن کر یہ علم بخوبی ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک تھی۔

”میں فی الحال ٹھیک ہوں، آپ بتائیں تیمور صاحب کی پانسنگ آؤٹ کی تیاریاں کیسی جاری ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”لو اس کی پانسنگ آؤٹ کی تیاریاں کا کول میں ہوں گی کہ یہاں ہوں گی؟“ میں ہنسی۔  
”پھر بھی! آپ لوگوں کے ملبوسات، فنکشن کے حساب سے اور لوازمات وغیرہ وغیرہ.....؟“  
”ملبوسات تو ہر وقت تیار ہوتے ہیں ہمارے پاس! تم بتاؤ فون کیوں کیا ہے؟ ادھر ادھر کی باتیں کر کے تم اصل موضوع سے ہٹ رہی ہو۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”ابھی مجھے نماز بھی پڑھنی ہے۔“  
”میں نے یہ پوچھنے کے لیے کال کی ہے کہ آپ نے کیا سوچا ہے میری بات کے جواب میں؟“ نگہت نے سوال کیا۔

”کون سی بات کے جواب میں؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”تیمور والی بات، میرا مطلب کہ آپ اور تیمور کی شادی والی بات، امی جان نے آپ سے بات نہیں کی؟“ نگہت نے بے یقینی سے کہا۔

”نگہت میں نے تمہیں اسی روز جواب دے دیا تھا، رہی بات امی جان کی تو انہوں نے مجھ

سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ انہیں میرے جواب کا یا تو خود اندازہ ہے یا پھر میں سمجھی کہ تم نے انہیں بتا دیا ہو گا؟“ میں نے رمان سے کہا۔

”امی جان کو اگر آپ کے جواب کا اندازہ ہوتا تو وہ اس موضوع پر مجھ سے بات ہی نہ کرتیں۔ اصل میں یہ امی جان کا ہی آئیڈیا تھا کہ آپ کی مرضی پہلے جان کر پھر تیمور بھائی سے بات کر لی جاتی۔“ نگہت نے کہا۔

”نگہت پلیز امی جان سے بات کرنا اور انہیں کہنا تیمور سے بالکل بات نہ کریں ورنہ مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرمندگی ہوگی۔“ میں نے التجا کی۔ ”اور جب خصوصاً میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تیمور ماہ رخ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے اس کے سامنے آنے سے بھی جھجک محسوس ہو۔“  
”بھابی! آپ چاہے اس بات سے انکار کریں، بے شک تیمور بھائی کے لیے اور لڑکی دیکھ لیں لیکن ماہ رخ کے بارے میں پلیز نہ سوچیں..... اس لیے نہیں کہ میری نند ہے، لیکن یقین کریں کبھی وقت آئے گا کہ آپ اپنے اس فیصلے پر پچھتائیں گی۔“ نگہت نے ہر یقین لہجے میں کہا۔

”اللہ نہ کرے!“ میں نے فوراً کہا۔ ”بس تم بہتری کے لیے دعا کیا کرو، جو اللہ کو منظور ہو وہ ہمارے لیے بہتر ہو۔“

”امی سے بات ہو سکتی ہے؟“ نگہت نے پوچھا تو ہولڈ کر دیا امی جان کے کمرے میں گئی تو وہ وہیں پر ٹیک لگائے ہوئے سو گئی تھیں۔ میں نے واپس آ کر نگہت کو بتایا کہ وہ سو گئی ہیں۔  
”چلیں بھابی پھر آپ بھی نماز وغیرہ پڑھ لیں۔ آپ کا بہت وقت لے لیا۔“ خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور میں نے اٹھ کر نماز مکمل کی پھر لاؤنج میں آ کر تسبیح وغیرہ پڑھنا شروع کر دی۔ مظہر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اب مجھے پریشانی بھی شروع ہو گئی تھی۔ جب سے اسے گاڑی لے کر دی تھی وہ اسی طرح دیر تک اور رات گئے دوستوں کے ہمراہ غائب رہتا۔ کبھی پڑھائی کا بہانہ، کبھی فلم کا تو کبھی کسی پارٹی کا۔ گاڑی اگر چہ سینڈ بینڈ لے کر دی تھی لیکن گاڑی اچھی حالت میں تھی اور یوں بھی ہمیشہ ڈر رہتا ہے کہ جوان بچے گھر سے باہر جانے کیسی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ خصوصاً مظہر جیسے نوجوان کہ سر پر نہ باپ کا سایہ تھا نہ بڑے بھائی کا۔ دیر سے وہ لوٹا تو میں نے دروازہ کھول کر اس کے اطوار کی بابت اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں وہ سگریٹ پی کر تو نہیں آیا، یا شراب کے نشے میں نہ ہو۔ ایسی تو کوئی بات نظر نہ آئی لیکن بغیر کسی وجہ

کے بھی وہ مجھ سے نظر ملا کر بات نہ کر پار ہا تھا۔  
 ”کہاں تھے ابھی تک تم؟“ میں نے سختی سے کہا۔  
 ”دوستوں کے ساتھ!“ مختصر سا جواب تھا۔

”دوستوں کے ساتھ کہاں؟“ میں نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

”کسی غلط جگہ نہیں تھا، ہو سکتا ہے کسی نیک کام میں ہی مصروف ہوں خواہ مخواہ آپ مجھ پر شک نہ کریں۔“ اس نے نظر چراتے ہوئے کا۔

”کن دوستوں کے ساتھ تھے تم، بتاؤ ذرا مجھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے کلاس فیوز ہی تھے، کوئی لڑکیاں نہیں تھیں.....“ اس نے بتایا۔

”کب میں تم سے یہ کہا کہ تم لڑکیوں کے ساتھ تھے.....؟“ میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

”تفتیش تو اسی طرح کر رہی ہیں آپ؟“ وہ اسی ڈھٹائی سے بولا۔

”ٹھیک ہے نہیں پوچھتی میں۔“ میں نے پلٹتے ہوئے کہا۔ ”میں ہوں کون تم سے پوچھنے والی۔“

”پلیز بھائی! آئی ایم سوری، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ آپ یقین کریں میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔“ اس نے سامنے آ کر میرے سامنے ہاتھ باندھے۔ میرے دل میں اس کے بعد ایک اندیشے نے گھر کر لیا تھا، جانے کیا بات تھی کہ مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا تھا یا شاید مکمل طور پر یقین نہ آیا تھا۔ کم از کم اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مجھے ایسا ضرور لگا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا تھا، ہو سکتا ہے کہ کوئی غلط بات نہ ہو اور نہ ہی کوئی بڑی بات ہو۔

اس رات میں یہی سوچتی رہی کہ میں کس سے بات کروں، کس سے یہ بوجھ بانٹوں۔ میرے ذہن میں ہزاروں اندیشے اس سلسلے میں کلبلا رہے تھے کہ مستقبل میں میرا اس گھر میں کیا مقام ہوگا؟ میں جو اس غلط فہمی میں تھی کہ ہمیشہ ہی میرا اس گھر میں مقام سربراہ کا سارہے گا اور اسی سوچ میں اپنی زندگی کا کوئی اور لائحہ عمل طے نہیں کر رہی تھی۔ یقیناً یہ وقت ایسا تھا کہ مجھے اپنی سوچ پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ بارہا سوچا کہ صبح اٹھ کر امی جان سے بات کروں تو پھر یہ سوچ کر رک جاتی کہ شاید میری سوچ مظہر کے بارے میں غلطی ہے اور پھر وہ ماں ہیں خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی پھر یہی سوچا کہ چلو تھوڑا وقت ہے تیمور کی پانگ آڈٹ ہو جائے اور پھر وہ آجائے تو اسی سے بات کروں گی۔ تیمور سے میں امی جان کی نسبت بہتر انداز میں بات کر سکوں گی اور یونہی یہ سب کچھ

سوچتے ہوئے جانے کیسے نادانستگی میں، میں نے یہ سوچ ڈالا کہ کیا میں تیمور کے ساتھ..... میرا مطلب ہے کہ زندگی گزار سکتی ہوں؟ لیکن تیمور تو میرے بھائیوں جیسا ہے..... میں یہ کیسی فضول قسم کی باتیں سوچ رہی تھی، خواہ مخواہ۔

اکتوبر کے مہینے کی ایک خوبصورت سی شام کو والدہ، ابو، علی بھائی، امی جان، مظہر، میں، ماہ رخ اور اس کی والدہ کے علاوہ تیمور کے دو ایک قریبی دوستوں کا قافلہ ایبٹ آباد پہنچا اور وہاں پہنچ کر ہم نے ایک خوبصورت ہوٹل میں قیام کیا۔ اکتوبر کا مہینہ لاہور میں تو گرمیوں کا اختتامی مہینہ ہوتا ہے جب کہ ایبٹ آباد میں شام اچھی خاصی خنک تھی، اکلوتے سویٹر میں گزارہ نہ تھا، شال یا کوٹ کی ضرورت تھی۔ ہوٹل میں ہم پانچ کمروں میں ٹھہرے تھے، ایک کمر والدہ اور ابو کا تھا، ایک میں مظہر اور علی بھائی، میں اور ماہ رخ ایک کمرے میں تھے اور ماہ رخ کی والدہ اور والد ایک کمرے میں جب کہ تیمور کے دوستوں کا علیحدہ کمر تھا۔

پانگ آڈٹ کے دن میں نے فجر کے بعد اپنی تیاری شروع کی، ماہ رخ مجھ سے پہلے غسل لے کر اپنے زلف و رخسار کی تزئین میں مصروف تھی۔ اسے آج اپنے روپ کو خاص قاتلانہ ادائیگا تھی۔ میں نے بھی سادہ سا میک اپ کیا، بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی اور میں تیار تھی۔ ماہ رخ تیار ہوئی تو وہ مجھ سے کئی برس چھوٹی لگ رہی تھی حالانکہ وہ عمر میں میرے برابر ہی تھی۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے شال اوڑھی جب کہ ماہ رخ نے آدھی آستین کی قمیض پر سویٹر بھی نہیں پہنا تھا۔

”سردی نہیں لگ رہی ماہ رخ تمہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ابھی میری کون سی عمر ہے سردی لگنے والی!“ اس نے ہنس کر کہا۔

”عمر تو میرا خیال ہے کہ میری اور تمہاری برابر ہے۔“ میں نے بھی ہنس کر کہا۔

دیکھنے میں تو اس وقت غالباً دس پندرہ برس کا فرق لگتا ہوگا!“ اس نے یقین سے کہا۔

”اچھا! بہت خوش فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں؟“ میں نے سوال کیا۔

”ارے نہیں!“ اس نے معذرتی انداز میں کہا۔ ”اصل میں تم نے اس عمر میں جو خول بردباری

اور سنجیدگی کا چڑھالیا ہے، اس نے تمہیں ایسا کر دیا ہے۔“ اس نے مجھے پکڑ کر اپنے ہمراہ آئینے کے

سامنے لاکھڑا کیا، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے اس کے الفاظ کی صداقت پر یقین آ گیا۔

”مجھے ایسے ہی رہنے دو ماہ رخ!“ میں نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی کہ ایسے ہی رہنے دو، کچھ ایسا تو نہیں ہوا کہ جس کی قصور دار تم ہو اور اس کی پاداش میں تم عمر بھر کے لیے جوگ لے لو۔ غالب بھائی کی زندگی ہی اتنی تھی، تمہاری ان سے رفاقت کا عرصہ بھی مختصر تھا اور پھر ان کی کوئی نشانی بھی تو تمہارے پاس نہیں ہے.....“ اس کی بات سے میرے نینوں کے کٹورے بھرنے لگے۔ ”بس اب پلیز رونا نہ شروع کر دینا۔ آج کے دن کا آغاز رو کر بدشگونی سے نہ کرو۔“

اس کے یوں کہنے پر مجھے عجب سا احساس ہوا۔ ایک تو اس نے بات ہی ایسی کر دی تھی، اوپر سے یہ حکم کہ رو بھی تاں اور پھر میرے رونے کو بدشگونی کہنا..... ”آج کا دن!“ تو گویا آج کا دن صرف اسی کے لیے کسی خاص اہمیت کا حامل تھا اور میں بدشگونی کر رہی تھی۔ رویوں کی اور الفاظ کی بد صورتی چہروں کی بد صورتی سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، الفاظ کے گھاؤ شاید کبھی نہ بھرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ میں نے ٹشو پیپر لے کر آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے باہر نکل آئی، جہاں باقی سب قافلے والے تیار تھے اور بقول ان کے صرف ہم دونوں نے ہی اپنے چہروں کی لپیا پوتی میں زیادہ وقت لگایا تھا۔ سورج بھی ٹھٹھرا ہوا لگ رہا تھا اور ایک ہلکی سی دھند وادی کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

اس روز سیکڑوں گاڑیاں ملٹری اکیڈمی کی خوبصورت سڑک پر رواں دواں تھیں۔ ہر گاڑی میں پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹس کے والدین، عزیز واقارب اور دوست احباب تھے اور سب کی خوشی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ سیکڑوٹی کے مراحل طے کرتے ہوئے ہم اپنے انکلوژر تک جا پہنچے اور سیٹیں سنبھال لیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ شاید میں جاتے ہی تیمور کو پہچان لوں گی اور ہاتھ ہلاؤں گی اور جواب میں وہ بھی مجھے ہاتھ ہلا کر جواب دے گا مگر میں تو حیران رہ گئی کہ وہاں بڑا سا گراؤنڈ تھا جس کے دو اطراف نشستیں لگا کر سب لوگ بیٹھے تھے اور گراؤنڈ میں ہم سب سے قدرے فاصلے پر سیکڑوں کی تعداد میں کیڈٹس یوں کھڑے تھے جیسے ایک ہی سانپے میں ڈھلے ہوئے مٹی کے بے جان مجسمے! کیونکہ سب کے یونیفارم تو ایک تھے ہی، شکلیں بھی ایک جیسی لگ رہی تھیں اور حرکت تو وہ بالکل بھی نہیں کر رہے تھے۔

ماہ رخ نے اپنے بیگ سے دو ربین نکالی اور جائزہ لینے لگی۔ یقیناً اسے اندازہ ہو گا کہ اس کی ضرورت پڑے گی۔ جب وہ سب دیکھ کر ناکام ہو چکی تو میں نے اس سے دو ربین مانگی اور دیر تک تیمور کو پہچاننے کی کوشش کرتی رہی اور پھر باری باری سب نے کوشش کر لی مگر کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ پریڈ شروع ہوئی تو ہیبت اور تنظیم کا ایک سحر طاری ہو گیا۔ زمین اور آسمان قدموں کی دھمک سے لرزاں تھے، اس کے سوا کوئی اور آواز نہیں آرہی تھی۔ خاموشی میں پریڈ کمانڈر کی آوازیوں کو منجھتی تھی جیسے ارد گرد کے پہاڑوں سے ٹکرا کر لوٹتی ہو۔ پریڈ کے بعد اعزازات تقسیم ہوئے اور پھر اعزاز ہوا کہ سب لوگ میس کی طرف چلیں، جہاں نہ صرف چائے پیش کی جاتی تھی بلکہ ہمیں اپنے کیڈٹ سے ملاقات بھی کرنا تھی۔

بلاشبہ یہ وقت تمام عزیز واقارب کے لیے انتہائی مسرت اور طمانیت کا ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کا ایک بچہ اپنی زندگی کے ایک اہم اور ابتدائی مرحلے سے بہ عافیت سرخرو ہوا۔ تیمور سے ہم سب خوشی سے ملے، اس کے چہرے پر بھی خوشی کا رنگ چمک رہا تھا، حالانکہ وہ قدرے کمزور اور رنگ کافی حد تک خراب نظر آ رہا تھا جو کہ پاسنگ آؤٹ پریڈ کی ریہرسلز کا مہولہ منت تھا۔ امی جان نے اور ہم سبھی نے پہلی دفعہ اپنی نظروں کے سامنے اسے یونیفارم میں دیکھا تھا۔ وہ نظر لگ جانے کی حد تک اسمارٹ لگ رہا تھا۔ تیمور اور باقی سب لڑکے بھی میس میں چائے کے دوران ایک دوسرے کو اپنے اپنے اہل خانہ اور اپنے مہمانوں سے ملوا رہے تھے۔ اپنے قریبی دوستوں سے تیمور نے ہمارا تعارف کرایا تو میں نے ایک بات نوٹ کی کہ اس نے ماہ رخ کے لیے فقط اتنا کہا۔ ”یہ ہے ماہ رخ!“ تو گویا اسے اس سے زیادہ تعارف کروانے کی ضرورت نہیں تھی۔

سب کیڈٹس کو اب چھٹی مل گئی تھی اس لیے تیمور بھی ہمارے ساتھ ہی گھر آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ اسے چھٹی کے بعد بہاولپور جانا تھا کیونکہ جس یونٹ میں اس کا تبادلہ ہوا تھا وہ یونٹ بہاولپور میں تھی۔ تیمور دو ہفتے کیلئے گھر پر ہی تھا اور اس دوران مجھے اس سے بہت اہم باتیں کرنا تھیں۔ ساری پارٹی ہی ہمارے ساتھ گھروٹھی تھی، گھر پر ہی باہر سے کھانا منگوا لیا گیا تھا۔ جب سب مہمان رخصت ہو گئے تو میں نے تیمور سے کہا۔ ”تیمور کل سے تم دفتر آیا کرو گے۔“

”بھائی، میں ابھی بہت تھکا ہوا ہوں، آپ کو پتا ہے فوجی چھٹی پر آئیں تو ان کی سب سے پہلی ترجیح ہوتی ہے اپنی نیندیں پوری کرنا۔“ تیمور نے شدید احتجاج کیا۔

”تیور! میں تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک دن کی چھٹی دے سکتی ہوں، وہ بھی اس شرط پر کہ مجھے دوبارہ تم سے نہ کہنا پڑے اور پرسوں تم خود بخود دفتر آ جاؤ.....“ میں نے انگلی کھڑی کر کے کہا۔

”یہ ظلم ہے بھابی! امی آپ سفارش کریں ناں میری!“ تیور نے امی جان سے لاڈ سے کہا۔

اس لمحے میں تو وہ ان سے ہر بات منوالیتا تھا۔

”تیور! ماہا کہہ رہی ہے تو تمہیں اس کی بات ماننی ہی ہوگی۔“ امی جان نے خلاف توقع کہا۔

”امی پلیز! مظہر یار تو ہی میری مدد کر، بھابی تیری بات تو بہت مانتی ہیں۔“ تیور نے مظہر کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

”بھابی! اب کسی کی بات نہیں مانتیں، وہ اس گھر کی بڑی ہیں اور اس گھر میں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتی ہیں..... وہ اس گھر کی سپر پاور ہیں!“ کہہ کر وہ تو وہاں سے چلا گیا لیکن ہم تین نفوس سنائے میں آگئے، ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے اور شاید خود سے بھی۔

مجھے علم تھا کہ میں چاہے کتنے ہی دن منتیں کرتی رہتی اور باوجود اس کے کہ امی جان نے بھی تیور سے میری بات ماننے کو کہا تھا تب بھی وہ کبھی بھی اگلے ہی روز اس طرح دفتر نہ پہنچ جاتا، جب کہ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ ایک چھٹی کرلو۔ یہ سب ”کرامات“ مظہر کے منہ سے نکلے ہوئے ایک جملے کی تھیں جسے شاید امی جان اور تیور نے تو گستاخی پر محمول کیا ہوگا جب کہ میں اسے کوئی معما ہی سمجھ رہی تھی۔

کافی عرصے سے میں اس کی شخصیت میں تبدیلیاں نوٹ کر رہی تھی، اگرچہ اس نے کبھی براہ راست ایسی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن کچھ تھا ضرور جسے میں محسوس تو کر رہی تھی مگر خود سے بھی وضاحت نہیں کر پار ہی تھی۔ اسی لیے یہ معاملہ میں نے تیور کے گھر آنے تک مؤخر کر دیا تھا۔ قبل اس کے کہ میں تیور سے کوئی بات کرتی یا شاید میں یہ کہتی کہ اسے مظہر کچھ مختلف تو نہیں لگ رہا تو وہ جواب میں یہ کہہ دیتا کہ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، خود ہی مظہر نے اچانک ایسی بات کر دی کہ دونوں ماں بیٹے کو اس میں تبدیلی کا اندازہ ہو گیا۔

تیور کے دفتر آتے ہی سارا اسٹاف ایک ایک کر کے مبارک باد دینے آتا گیا۔ میں نے

مٹھائی منگوا کر سب کا منہ میٹھا کر دیا۔ مجھے تیور کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس سب عمل سے بہت بیزار تھا اور دفتر آ کر جو وہ یہ توقع کر بیٹھا تھا کہ بیٹھ کر مجھ سے بات کر سکے گا، الٹا دفتر آ کر پچھتا رہا تھا۔

”آپ سے اکیلے میں کہاں تفصیل سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ تیور نے ذرا رش کم ہونے پر مجھ سے پوچھا۔

”ابھی ہم اکیلے ہی ہیں کہو کیا کہنا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ دفتر میں اس طرح کے حالات کا سامنا ہوگا تو میں آپ سے اپنا ٹکٹ لے کر آتا!“ تیور کے لہجے سے ہی بیزاری پک رہی تھی۔

”طنز کر رہے ہو کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جرات نہیں کہ ایسا کروں!“ تیور نے فی الفور کہا۔ ”لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے مجھے دفتر کیوں بلایا؟“

”اصل میں تم بہت عرصے کے بعد دفتر آئے ہو اور پھر پاس آؤٹ ہو کر آئے ہو تو ہر کوئی تمہیں مبارک باد دینے کو آ رہا ہے۔ بلایا تو میں نے اسی لیے تھا کہ ایک تو مجھے بہت ضروری بات کرنا تھی تم سے اور دوسرے میں چاہتی تھی کہ تمہیں بھی اپنے کاروبار کی بابت کچھ علم ہونا چاہیے۔ میری زندگی نہ رہے تو.....“ میں نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ تیور بول پڑا۔

”پلیز بھابی! ایسی بات کیوں کر رہی ہیں آپ؟“

”تیور اتنا بڑا حادثہ میرے ساتھ ہوا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا.....“ میں نے کہا۔

”بس آپ ایسا نہ سوچا کریں۔ اپنی مدد کے لیے کبھی کبھار مظہر کو دفتر بلالیا کریں، اس کی فیلڈ بھی ہے، اسے آخر کار یہ کاروبار سنبھالنا ہے، ہمیشہ یہ بوجھ آپ پر ہی تو نہیں رہے گا۔“ تیور نے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو، میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ اسی سلسلے میں تم سے بات بھی کرنا چاہ رہی تھی۔ گھر پر تو بات نہیں ہو سکتی، میں نے سوچا کہ دفتر میں ہی ہو جائے گی، یہاں ہمیں ایسا موقع بخوبی میسر ہو سکتا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”یہاں کے حالات تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ میں بھی آپ سے مظہر ہی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا مگر دفتر میں مجھے یہ موقع ملتا نظر نہیں آتا، میرا خیال ہے کہ کہیں تیسری جگہ مل لیتے

ہیں؟“ تیمور نے سوال کیا۔

”دفتر میں صرف آج تمہیں رش لگا، روٹین میں ایسا نہیں ہوتا، ہم یہ آسانی ہر طرح کا مسئلہ زیر بحث لاسکتے ہیں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”آپ کے پاس جم خانہ کی مہر شپ ہے ناں؟“ تیمور نے سوال کیا۔

”ہاں، ہے تو.....!“ میں نے جواب دیا۔

”بس ٹھیک ہے وہیں پر آج ڈنر کے وقت مل لیتے ہیں!“ تیمور حتی انداز میں کہہ کر اٹھ گیا۔

”ابھی تم کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے تیمور سے پوچھا۔

”کسی دوست سے ملنا ہے!“ اس نے مختصر ا کہا۔

”دوست سے یاد دہی سے؟“ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”دوست سے! کہیں تو رابطہ نمبر دے دوں؟“ اس نے بھی ہنس کر کہا۔

”مان لیتے ہیں چلو!“ میں نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔

”کس وقت ملیں ڈنر پر؟“ تیمور نے پوچھا۔

”گھر سے اکٹھے چلے چلیں گے!“ میں نے گویا استفسار کیا۔

”چلیں ٹھیک ہے۔“ کہہ کر وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

شام کو میں نے امی جان کو بتایا کہ ایک ڈنر رکھا تھا کچھ کاروباری لوگوں کے ساتھ تیمور کو ملوانے کے لیے۔ انہیں اس پر ظاہر ہے کیا اعتراض ہوتا اور مظہر تو گھر پر تھا ہی نہیں۔ میں نے کھانا بنوا کر امی جان کو دیا اور ملازمہ کو اپنی واپسی تک وہیں رکنے کا کہا۔ ہلکے سے رنگ کا جوڑا پہن کر میں حسب معمول سادگی سے تیار ہوئی۔ گاڑی تیمور چلا رہا تھا اور میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہ تیمور کو مظہر کے بارے میں کس طرح بتانا ہے۔

”بھائی! میں نے ماہ رخ کو بھی بلا لیا ہے ڈنر پر!“ تیمور نے مجھے بتایا۔

”وہ کس لیے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہمیں مظہر کے بارے

میں بات کرنی ہے..... اور یہ ہمارے گھر کا انتہائی اندرونی معاملہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم اسے

کسی تیسرے کے سامنے زیر بحث نہ لائیں۔“

”تیسرا کون؟ ماہ رخ ہمارے گھر کا ایک حصہ بن جائے گی شادی کے بعد۔ اے ابھی ہمارے خانگی مسائل کا اندازہ ہونا چاہیے۔“ تیمور نے حیرت کا اظہار کیا۔

”جب شادی کے بعد وہ اس گھر کا حصہ بن جائے گی تو پھر اس کے اور ہمارے گھر کے مسائل ایک ہی ہوں گے! لیکن میں چاہتی ہوں کہ اسے کسی بات کا علم نہیں ہونا چاہیے، کم از کم شادی سے قبل..... پلیز تیمور!“ میں نے منت کی۔

”میرے لیے آپ کا رویہ ناقابل فہم ہے..... جانے آپ ماہ رخ سے گریز کیوں کرتی ہیں؟“ تیمور کے الفاظ نے مجھ پر عجیب سا اثر کیا۔

”میں ماہ رخ سے کس وجہ سے گریز کروں گی..... یہ جان کر بھی کہ وہ تمہاری پسند ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”تو پھر آپ نے نگہت سے کیوں کہا کہ وہ مجھے ماہ رخ سے شادی سے منع کر دے.....؟“ اس کا سوال تھا یا ہم۔

”میں نے نگہت سے یہ کہا، یہ تم سے کس نے کہا؟“ میں حیرت کی انتہا پر تھی۔ ”کیا نگہت نے تمہیں بتایا؟“

”یہ تو اس نے نہیں کہا۔“ تیمور بولا۔ ”لیکن اس نے مجھ سے درخواست بلکہ التجا کی کہ میں ماہ رخ سے شادی کی بابت سوچوں بھی نہیں، حالانکہ اس کی نند سے میری شادی ہو جائے تو یہ اس کے رشتے کی مضبوطی کی بنیاد ہوگی.....“

”نگہت کا رشتہ اعجاز سے اتنا کمزور نہیں کہ اسے مضبوط کرنے کے لیے تمہارا اور ماہ رخ کا رشتہ کر دیا جائے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ خیال قطعی میرا نہیں بلکہ نگہت کا اپنا ذاتی خیال ہے کہ اگر تمہاری اور ماہ رخ کی شادی ہوئی تو دو ٹوٹے ٹکڑے کا رشتہ بن جائے گا اور دونوں میں سے کسی بھی جوڑے کے مابین اختلافات کا اثر دوسرے جوڑے پر پڑ سکتا ہے۔ میں نے اس بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے ایسا سوچا بھی کیونکر۔“ مجھے اس کی سوچ پر بہت حیرت ہوئی۔

”آئی ایم سوری! میرا مطلب ہرگز آپ کو تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔“ تیمور نے کہا۔ ”یونہی میرے ذہن میں یہ خیال آ گیا تھا۔“

”اٹ ازاد کے!“ میں نے کہہ تو دیا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ”سوری“ تیمور کی طرف سے آخری دفعہ نہ تھی۔ آئندہ زندگی میں جانے کتنے مواقع آئیں گے جب وہ یہ الفاظ میرے ساتھ بولے گا۔ کلب پہنچے تو ماہ رخ پہلے سے ہماری منتظر کھڑی بلکہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ہمیں دور سے دیکھ کر ہی لپک کر..... ہماری طرف آئی۔ میں آگے بڑھ کر اس سے ملی، تیمور اور اس کی نظروں کا تبادلہ ہوا اور ایک مسکراہٹ دونوں کے لبوں پر نکھر گئی۔ ”اللہ انہیں ہمیشہ یونہی مسکراتا رکھے.....“ میں نے دل سے دعا دی۔

”زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟“ تیمور نے پوچھا۔

”تم لوگ پورے پندرہ منٹ لیٹ ہو۔“ ماہ رخ نے گھڑی دیکھ کر بتایا۔

”اصل میں بھابی امی جان کو کھانا کھلا رہی تھیں۔“ تیمور نے صفائی دی۔

”کھلا رہی تھیں! کیا مطلب؟ امی جان کوئی بچی تو نہیں ہیں اور پھر گھر پر ملازمہ بھی تو ہے؟“

ماہ رخ نے کہا۔

”رات کا کھانا میں خود ہی انہیں کھلاتی ہوں۔ دن میں تو میں گھر پر نہیں ہوتی۔ وہی وقت ہے جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے ہیں اسی وقت ہم گپ شپ بھی لگاتے ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اگر تمہارا موڈ گپ شپ کا تھا تو مجھے بھی بتا دیتے، میں تو کم از کم پندرہ منٹ سے یہاں نہ سوکھ رہی ہوتی۔“ ماہ رخ نے نخوت سے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے ماہ رخ، پندرہ منٹ ہی تو فالتو لگ گئے ہیں، اتنا وقت تو ہمیں ٹریفک کا رش ہونے وجہ سے بھی لگ سکتا تھا۔“ تیمور اس بے مقصد بحث سے چڑ گیا۔

”اصل میں اگر تیمور مجھے بتا دیتا کہ تم بھی مدعو ہو تو میں ملازمہ کو بتا کر آ جاتی۔ اس نے بھی مجھے راستے میں آ کر بتایا کہ اس نے تمہیں بھی بلایا ہے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”مجھے“ بھی“ بلایا ہے کا کیا مطلب ہے اور کس کو بلایا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اور کسی کو بھی نہیں.....“ میں نے کہا۔ ”کیوں تیمور؟“ میں نے تیمور سے تائید چاہی۔

”جی نہیں! اور کسی کو نہیں بلایا.....“ تیمور نے جواب دیا۔

”تو گویا تمہیں علم نہیں تھا کہ تیمور نے مجھے بھی بلا رکھا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے خیال میں صرف تم اور تیمور کو ہی اس ڈنر پر ہونا تھا؟“ عجیب سا لہجہ تھا اس کا، میرے سر میں

سرسراہٹ سی ہونے لگی۔

”ہاں میں سمجھی میں اور تیمور ہی ہوں گے، دونوں بہن بھائی!“ میں نے بات کو سنبھالا۔ تیمور خاموشی سے ہم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ کھانے سے قبل بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور تیمور نے کوئی بات نہ چھیڑی۔ مجھے اطمینان ہوا اور نہ میں اس بات سے ڈر رہی تھی کہ کہیں کوئی غلط بات ماہ رخ کے سامنے نہ چھڑ جائے۔

”تیمور تمہیں معلوم ہے کہ ماہا کے بھائی علی کا رشتہ آیا ہے میرے لیے؟“ کھانے کے دوران ماہ رخ نے پھلجوزی چھوڑی۔ اس بات پر تیمور نے اصلی اور میں نے مصنوعی چونکنے کی اداکاری کی۔ تیمور نے میرے چہرے کو دیکھ کر پھر ماہ رخ سے پوچھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”میری امی نے میری رائے پوچھی ہے اس بارے میں، انہیں لڑکا پسند ہے، تمہیں نہیں بتایا ماہا نے؟“ اس نے وضاحت کر کے یکدم سوال کر دیا۔

”میں تو تم سے اب سن رہی ہوں۔“ میں نے اعتماد سے کہا۔

”کیوں تمہاری امی نے تم سے مشورہ کیے بغیر ہی رشتہ ڈال دیا؟“ ماہ رخ نے طنز سے کہا۔

”اگر تمہیں میری بات کا یقین ہے تو پھر مان لو کہ واقعی والدہ نے مجھ سے نہیں پوچھا۔“ میں نے صفائی دی۔

”تیمور تم بے شک والدہ سے پوچھ لو..... اور پھر انہیں بھلا کیا علم ہو گا تمہارے اور تیمور کے بارے میں۔“ میں نے ماہ رخ سے سوال کیا۔

”تو تمہیں تو علم ہے ناں! تم منع کر دو اب انہیں!“ ماہ رخ نے مجھ سے کہا۔

”میں کیسے منع کر دوں اگر انہوں نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں، تم اپنی امی کو بتا کر انکار کہلوادو ناں۔“ میں نے اسے ترکیب بتائی۔

”میں کیا جواز بنا کر انکار کر دوں، جب کہ علی برسرِ روزگار ہے کب سے اور تیمور تو ابھی مزید جانے کتنے سال لگا کر اس قابل ہو گا کہ شادی کر سکے۔ اچھا خاصا کاروبار ہوتے ہوئے بھی اسے جانے نوکری کی کیا سمجھی اور پھر آپ لوگوں کی طرف سے کوئی پیش رفت ہوتی تو میں اپنی امی کو کوئی وجہ بنا کر انکار کرتی۔“ ماہ رخ کے لہجے میں بے بسی بھی تھی اور قدرے طنز بھی۔

پانا چاہتا تھا لیکن اس کے کمرے کا لاک ہوتا میرے لیے بھی بہت بڑا انکشاف تھا۔ تیور وہیں نیم تاریکی میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات جانے کب مظہر لوٹا ہوگا اور بھائیوں کے مابین کیا گفتگو ہوگی مجھے علم نہیں کیونکہ میں حسب معمول دفتر چلی گئی تھی۔

لنچ بریک سے ذرا ہی دیر پہلے تیور کی کال آئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے مجھ سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔ وہ لنچ کے بعد آئے گا اور اس سے قبل مجھے نوید صاحب سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔ میں نے گھنٹی بجا کر چرائی کو بلایا اور اسے نوید صاحب کو بلانے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں نوید صاحب اپنی ڈائری سمیت موجود تھے۔ حسب عادت انہوں نے کھڑے ہو کر طلبی کا سبب پوچھا اور میں نے خلاف عادت انہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ”نوید صاحب! مجھے آپ سے ایک بہت اہم اور پرسلی بات کرنی ہے، اگر آپ کو بری لگے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔“ میں نے تمہید باندھی۔

”جی۔۔۔۔۔“ جواب میں انہوں نے صرف اتنا ہی کہا اور میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے لگادہ کہہ رہے ہوں ”اب اور برا لگنے کو رہے ہی کیا گیا ہے۔“

”یہ مظہر علی کیا لڑکا ہے؟“ مجھے سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں۔

”جی، اچھا لڑکا ہے بہت اچھا کام کرتا ہے اور محنتی ہے۔“ انہوں نے حسب عادت مختصر بات کی اور پیشہ ورانہ انداز میں جواب دیا۔

”اصل میں، میں اس کے گھر گئی تھی ایک بار۔۔۔۔۔“ میں نے بات شروع کی۔ ”حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ غربت نے ان کے ہاں ڈیرے ڈال لیے ہیں ورنہ بے چارے بہت خوددار لوگ ہیں۔ سر پر باپ کا سایہ بھی نہیں اور بڑا بھائی بے چارہ حادثے کی نذر ہو گیا۔“ نوید صاحب خاموش تھے گویا میری اس بات چیت کا مطلب جاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”نوید صاحب، مظہر علی کی تین جوان بہنیں ہیں۔ خوبصورت ہیں، پڑھی لکھی ہیں اور سلیقہ شعار ہیں۔ مجھے تو بہت اچھی لگی ہیں۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ درمیان والی کے لیے اپنی والدہ سے کہوں علی بھائی کے لیے انتخاب کر لیں۔“ میں نے بمشکل بات کی۔ اصل میں مجھے اپنی ذاتی اور گھریلو باتیں

”تم فکر نہ کرو، میں جلد ہی مناسب موقع دیکھ کر امی جان سے بات کرتی ہوں اور جلد ہی ہم انشا اللہ تمہارے ہاں آئیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”کتنی جلد؟ اگلے ہفتے میں لندن جاری ہوں گھٹ بھائی کی ڈیوری کے وقت مجھے خوشی کو سنبھالنا ہے اور پھر دو تین ماہ مجھے وہاں لگ جائیں گے۔“ وہ تشویش سے بولی۔

”دیکھیں بھائی! لوگ کیسے تشویش سے غڑھال ہو رہے ہیں۔ آخر آپ کا دیور ہے ہی اتنا پرکشش اور اسرار۔“ تیور نے کالر جھاڑا۔

”ہاں جی! ہر قدم پر حسینائیں پیچھا کرتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن یہ بے چارہ صرف ایک ہی حسینہ کے پیچھے ہے۔“ میں نے بھی ماہ رخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذاق سے کہا۔

”اور لگتا ہے کہ حرکت کی رفتار یہی رہے تو یہ اکلوتی حسینہ بھی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے اسے بھی اس کو بھائی کہنا پڑ جائے گا، اگر علی لے آتا تو۔۔۔۔۔“ ماہ رخ نے کہا تو ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”واللہ غرور کا کیا عالم ہے۔۔۔۔۔!“ تیور نے اوا سے کہا۔

”غزختم کر کے باہر نکلے تو میں بل کی اوائیگی کے لیے کاؤنٹر پر رکی، کارڈ پیش کر کے بل سائن کیا اور باہر نکلے تو کار پارک کے احاطے میں ہماری گاڑی کے پاس مجھے دونوں کافی نزدیک کھڑے نظر آئے، میں جھج گئی اور پلٹ کر واپس تھوڑی دیر کا ریڈور میں گردش کرتی رہی، دوبارہ باہر نکل کر دیکھا تو وہ اسی طرح تھے لیکن دیر کا ریڈور ہی تھی، اسی لیے میں باہر والی سیڑھیاں اترتی ہوئی اپنی کار کی طرف بڑھی۔ تیور نے مجھے دیکھ لیا تو وہ دونوں میری طرف بڑھے۔ ماہ رخ مجھے خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوئی۔ میں اور تیور اپنی گاڑی میں گھر روانہ ہوئے۔ واپسی کا سفر تقریباً خاموشی میں ہی کٹا۔

اپنی اپنی جگہ دونوں ہی کچھ سوچ رہے تھے۔ گھر پہنچے تو ملازمہ نے دروازہ کھولا، اس نے بتایا کہ امی جان سوچکی تھیں البتہ مظہر ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اتنا اور بے کی پریشانی ہوئی۔

”بھابی! آپ کو اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ علم ہے، کون کون ہیں؟“ تیور نے مجھ سے پوچھا۔

”اسکول اور کالج کی حد تک جو اس کے دوست تھے انہیں تو میں جانتی ہوں اور وہ ایسے دوست تھے بھی نہیں لیکن اب یہ نئے بننے والے دوست، انہیں میں نہیں جانتی۔“ میں نے حقیقت بتائی۔ تیور برہمی کے ساتھ مظہر کے کمرے کی طرف گیا، غالباً وہ کمرے کی تلاشی لے کر کوئی سراغ

کسی سے یوں ڈکس کرنے کی عادت ہی نہ تھی اسی لیے نوید صاحب بھی حیران ہو رہے تھے۔  
 ”تو اس کے لیے تو آپ کو اپنے والدین یا پھر علی بھائی سے بات کرنی چاہیے!“ انہوں نے کہا۔  
 ”وہ تو میں کروں گی نوید صاحب! لیکن اس وقت میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ مجھے آپ سے آپ کے بارے میں بات کرنا تھی!“ میں نے بمشکل فقرہ مکمل کیا۔  
 ”مجھ سے اور میرے بارے میں بات، میں سمجھا نہیں؟“ انہوں نے نظر اٹھا کر ایک زخمی مسکراہٹ سے دیکھا۔

”نوید صاحب! مظہر علی کی بڑی بہن ہے زارا..... بہت اچھی لڑکی ہے اور ایک ناکردہ جرم کی سزا میں اب تک شادی نہیں ہو سکی۔“ میں نے وضاحت کی۔  
 ”تو؟“ نوید صاحب کی سوالیہ نظریں انھیں۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں؟“  
 ”آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں نوید صاحب!“ میں نے فوراً کہا۔ ”غربت کی پاداش میں اس کا نکاح ختم ہو گیا تھا، آپ چاہیں تو اسے سہارا دے سکتے ہیں..... اس سے شادی کر کے!“  
 ”میں چاہوں تو.....؟“ وہ حیرت سے بولے۔ ”مگر میں کیوں چاہوں گا؟“  
 ”اسے آپ میری طرف سے درخواست سمجھ لیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔  
 ”آپ ایک باس کی حیثیت سے مجھے حکم دے سکتی ہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”مگر اگر زارا اتنی ہی اچھی ہے تو آپ نے علی بھائی کے لیے زارا کا ہی انتخاب کیوں نہیں کیا؟“  
 ”علی بھائی کی سوچ ہو سکتا ہے کہ آپ جیسی نہ ہو.....“ میں نے کہا۔  
 ”وضاحت کریں گی ذرا اس سوچ کی؟“ نوید صاحب نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”میرا مطلب ہے کہ ممکن ہے وہ ایک مطلقہ سے شادی نہ کریں اگرچہ اس کی رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر آپ..... آپ کو تو غالباً کسی کے مطلقہ یا بیوہ ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہو۔“ میں نے شش و پنج کی کیفیت میں بات کی وضاحت کی۔

”اما میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں!“ وہ یکدم ماہر پر اتر آئے۔ ”اور آپ کی اس بات کو حکم سمجھ کر قبول بھی کروں گا مگر میری آنکھوں نے شریک زندگی کے حوالے سے مختلف خواب بنے تھے۔“  
 ”لازم نہیں نوید صاحب کہ ہر خواب کی تعبیر بھی وہی ہو جو ہم چاہیں..... اور زارا کو آپ زندگی کے لیے بہترین ساتھی پائیں گے، تاہم آپ ایک دفعہ زارا کو دیکھیں اور ملیں تو پھر فیصلہ کرنے میں

آسانی ہوگی۔“ میں نے بڑی صفائی سے اپنا دامن بچایا۔  
 ”میں اگر زارا سے شادی کروں گا تو اسے دیکھے بغیر ہی کروں گا، آپ کا حکم سمجھ کر کروں گا..... اور اسے جیسا بھی پایا اپنے نصیب کا لکھا سمجھوں گا۔ البتہ اپنی بہنوں سے کہوں گا کہ وہ اپنی کارروائی پوری کر لیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ بہنوں کو بھائیوں کے لیے لڑکیاں دیکھنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ مجھے آپ کی بات پر انکار کی کوئی ہمت ہے نہ جواز.....“ وہ مجھے حیران چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔

جانے کیوں میری آنکھیں ڈبڈبائیں اور جانے کیوں میز پر سر رکھ کر میں نے ان آنسوؤں کو بہہ جانے دیا..... اور میری سوچوں کی روکن کن صحراؤں میں بھٹک رہی تھی۔ ”شاید مجھے نوید صاحب کا ساتھ قبول کر لینا چاہیے تھا؟“ خود سے ہی میں پوچھ رہی تھی۔  
 لیکن میں نے اس رشتے سے انکار کیا اس وجہ سے کر دیا تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ دفتر میں ساتھ کام کرتے تھے تو شاید وہیں سے کوئی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کیا اتنی سی بات پر میں نے اتنے مخلص آدمی کا ہاتھ جھٹک دیا تھا جو میرے انکار کے باوصف بھی میری محبت کا دیا دل میں جلانے بیٹھا تھا اور مجھے اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار سونپ کر مجھے اپنی ہی نظروں میں بے وقعت کر گیا تھا۔  
 دیر تک میں خود سے جنگ سے لڑتی رہی اور پھر ایک بارے ہوئے سپہ سالار کی طرح بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔ اٹھ کر دفتر کے ساتھ والے ہاتھ روم میں ہاتھ منہ دھویا اور لٹچ کا وقت شروع ہونے سے قبل ہی طبیعت کی خرابی کا کہہ کر دفتر سے نکل آئی۔ تیمور کو میں نے کال کر کے بتا دیا کہ وہ نہ آئے مجھے والدہ کی طرف جانا تھا۔ میں جانتی تھی کہ روئی ہوئی آنکھیں میں تیمور سے چھپا نہیں پاؤں گی۔ والدہ کی طرف جاتی تو وہ بھی پریشان ہوتیں۔

○ یہ آنسو.....!

کیوں کرتے ہیں شکایتیں

یہ روئے ہوئے چہرے

کیوں کہہ دیتے ہیں حکایتیں

یہ آنکھیں آنسو بھری

○ کیوں راز کھولتی ہیں.....؟؟



مجھے تنہائی چاہیے تھی اور یکسوئی۔ تھوڑی دیر آرام کرنا تھا، دل کو سنبھالنا تھا، اسے سمجھانا تھا۔ دماغ کو حساب کرنا تھا کہ سودوزیاں کیا ہے؟ ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی ایک چھوٹے سے فیملی بار کے باہر رکوائی اور خود اندر جا کر دو سیٹوں والی گول میز کی طرف بڑھی۔ پیر آیا تو اسے تازہ جوس کا آرڈر دیا اور بیرے کے آنے سے قبل ہی نظر اٹھی تو تیمور اور علی بھائی سر پر کھڑے نظر آئے۔ میں تو حیران ہی رہ گئی کہ کہاں سے وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے آئے تھے اور کیوں؟

”کیا بات ہے بھابی طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ لیکن تم کیوں آئے ہو؟ میں نے تو تمہیں منع کر دیا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”مجھے آپ سے آپ کے دفتر میں ملنا تھا بھابی! اور جب آپ نے منع کر دیا تو میں تیار تو تھا

ہی، سو چاؤرا آؤنگ ہو جائے، علی بھائی کے پاس بینک آیا اور وہ مجھے عیاشی کرانے یہاں لے

آئے۔ مگر آپ تو اپنی امی کی طرف جارہی تھیں؟“ اس نے وضاحت کی اور پھر حیرت سے پوچھا۔

”وہ..... ہاں..... اصل میں طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ پروگرام ڈراپ کر دیا..... اور

راستے میں پیاس لگی تو یہاں رک گئی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اکیلی ہو تم ماہا؟“ علی بھائی نے پوچھا۔ ”طبیعت خراب تھی تو گھر چلی جاتیں چندا! کیوں خود

پر اتنا بوجھ ڈالتی ہو؟“

”ارے نہیں اب میں بہتر ہوں.....“ میں نے فوراً کہا۔ انہوں نے بھی جوس اور سینڈوچ

آرڈر کیے اور پھر میں تیمور کو بتا کر والدہ کی طرف چلی گئی۔ تیمور نے علی بھائی کو واپس ان کے دفتر

ڈراپ کرنا تھا۔ والدہ کی طرف پہنچ کر ڈرائیور کو فارغ کر دیا۔

اس وقت میں اور والدہ اکیلے تھے اس لیے ان کے ساتھ چائے پیتے ہوئے میں نے مختصراً

مظہر علی کے گھر کے حالات وغیرہ کی بابت بتایا اور اس کی بہنوں کا ذکر کیا، ساتھ ہی میں نے

انہیں ثانیہ کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ امی نے میری پوری بات دلچسپی سے سنی اور ان خاتون کی

ہمت کو سراہا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھ پر واضح کیا کہ علی بھائی کی زندگی کے بارے میں فیصلہ وہ ان

کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتیں۔ دوسرے ابھی ماہ رخ کے گھر سے بھی انہیں امید وابستہ تھی۔ ماہ رخ

کے بارے میں خود علی بھائی نے والدہ سے کہا تھا۔

”مگر والدہ! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ تیمور اور ماہ رخ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے

ہیں۔“ میں نے والدہ کو زور دے کر کہا۔

”تمہارا کہنا بجا ہے لیکن ہم نے رشتہ ڈالا ہے تو ہاں اور ناں کا فیصلہ تو اگلے ہی کریں گے

اور جب تک ہمیں وہاں سے جواب نہیں مل جاتا تب تک ہم کہیں اور بات بھی نہیں کر سکتے۔“

والدہ عجیب شش و پنج میں تھیں۔

”اس بات کو آپ مجھ پر چھوڑیں، میں سب ٹھیک کر لوں گی.....“ میں نے اعتماد سے کہا۔

”تم اتنی عقلمند ابھی نہیں ہوئیں کہ اتنی مشکل صورت حال سنبھال سکو۔ ویسے بھی صدف اپنی

نند کی بیٹی کے لیے کہہ رہی ہے۔ وہ رشتہ بھی دیکھا بھالا ہے۔ نوریہ اچھی لڑکی ہے۔“ والدہ نے کہا۔

”امی! پلیز نوریہ بہت خخرے والی ہے اور ویسے بھی میں تو اس حق میں نہیں کہ آپ اتنے

اونچے گھر سے بھولائیں کہ اس کے قدم ہی زمین پر نہ پڑیں۔“ میں نے ناک سکڑی۔

”صدف کا بھی یہی خیال ہے کہ لڑکی کافی خخرے والی ہے۔“ والدہ نے کہا۔

”ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی، جب انہیں علم ہے کہ لڑکی خخرے والی ہے تو پھر انہوں نے کہا

کیوں؟“ میں حیران تھی۔

”ممکن ہے کہ اس کی نند نے خواہش ظاہر کی ہو.....؟“ والدہ اختصار سے بولیں۔

”بھلا لڑکی والے اپنے منہ سے ایسے کیوں کہیں گے اور پھر انہیں رشتوں کی کون سی کمی

ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”دیکھ بھالے لوگوں میں رشتہ ہر کوئی کرنا چاہتا ہے اور پھر میں نے اپنے سب بچوں کی

تر بیت میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ لوگ انہیں دیکھ کر ہی ان کی شخصیت کی خوبیوں کا اندازہ

کر لیتے ہیں.....“ والدہ نے پیار سے مجھے دیکھا کر کہا۔

”کیا غرور ہے والدہ!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”یہ غرور نہیں، یہ میرے سوہنے رب کا مجھ پر احسان ہے۔“ انہوں نے خیر انداز سے کہا۔

علی بھائی اور ابو بھی آگئے، والدہ نے کھانا لگوا دیا اور میں نے کھانے کے دوران مظہر علی اور

ثانیہ کا پھر تذکرہ کیا۔ علی بھائی نے کرسی پر پہلو بدل کر والدہ کو دیکھا اور والدہ نے نظر ہی نظر سے علی

بھائی کو اشارہ کیا، یہ دونوں حرکات میں نے دیکھ لیں۔

”بتائیں ناں ابو! آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے براہ راست ابو سے سوال کیا۔

”بھئی جو ہماری حکومت کا فیصلہ ہو..... اور سب سے اہم بات تو علی کی رضا مندی کی ہے۔“  
ابو نے کہا۔

”کیوں والدہ، کیا کہتی ہیں آپ؟“ میں نے امی سے سوال کیا، پہلے تو وہ گڑبڑائیں پھر سنبھل گئیں۔

”اصل میں، میں تمہیں بتانا بھول گئی کہ ہم نے کہیں رشتہ ڈال رکھا ہے.....“ والدہ یوں گویا ہوئیں جیسے کہ مجھے ابھی مطلع کر رہی ہوں۔ ”تمہاری مندرگت کی منداہ رخ کے لیے۔“

”کیا واقعی؟“ میں نے بھی حیرت کی اداکاری کی۔ ”کہیں آپ مذاق تو نہیں کر رہیں؟“  
”اس میں مذاق کی کیا بات ہے بیٹا؟“ ابو نے پوچھا۔

”وہ ویسے ہی..... میں سمجھی..... لیکن ماہ رخ تو.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کیا ماہ رخ تو؟“ علی بھائی بے تاب سے بولے۔

”کچھ نہیں.....“ میں نے کہا۔ ”یونہی ذہن میں خیال آ گیا تھا۔“

”کیا خیال آ گیا تھا؟“ علی بھائی نے پھر پوچھا۔

”صاف صاف بات کرو بیٹا!“ والدہ نے مجھ سے کہا۔

”رہنے دیں امی! کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے ٹالنے کی اداکاری کی۔

”اب تو تم نے ہمارے تجسس کے غبارے کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔“ ابو نے الجھ کر کہا۔

”اصل میں ابو! ہمارا ارادہ تھا تیسور کے لیے ماہ رخ کا رشتہ مانگنے کا.....!“ میں نے لمبی تھیلے

سے نکال ہی دی۔

”تو ابھی مانگا تو نہیں نا؟“ علی بھائی فوراً بولے۔

”مانگا تو نہیں مگر یہ بات تقریباً طے ہی سمجھیں!“ میں نے جواب دیا۔

”طے کیسے سمجھیں؟ تم اگر اپنے گھر پر یا تیسور کو بتا دو تو ظاہر ہے کہ پھر وہ لوگ رشتہ ہی نہیں

مانگیں گے۔“ علی بھائی نے آسان ساحل پیش کیا۔

”اس بات کی اتنی کوئی اہمیت نہیں ہے علی بھائی..... اور بات تقریباً طے اسی لیے ہے کہ تیسور

اور ماہ رخ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ میری بات سے علی بھائی کے چہرے پر مایوسی

کا ایک رنگ آکر گزر گیا۔

”کبھی ذکر نہیں کیا کسی نے پہلے.....؟“ والدہ بولی۔

”اصل میں ہم مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے، ابھی تو تیسور پاس آوٹ ہوا ہے..... لیکن

اگر وہ علی بھائی کے لیے رشتہ دے دیتے ہیں تو بخدا ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں نے علی

بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں ماہا! تم ان کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہیں کرنا..... اگر بات صرف تیسور کی ہوتی تو

شاید حالات مختلف ہوتے مگر تم کہہ رہی ہو کہ ماہ رخ بھی.....“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جی علی بھائی وہ تو ہے.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔ اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی چھائی

رہی کوئی کچھ نہیں بولا۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ مجھے اس خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔

”ابو مجھے چھوڑ آئیں گھر۔“ میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

”چلو میں چھوڑ آتا ہوں.....“ علی بھائی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں، امی اور ابو سے مل کر

باہر نکلی تو علی بھائی گاڑی میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں کوئی

بات کرنا چاہتے تھے۔ میں اپنے دماغ سے اندازے لگا رہی تھی کہ انہیں مجھ سے کیا بات کرنا ہوگی۔

”ماہا! تم سے کس نے کہا کہ تیسور اور ماہ رخ ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے ہیں؟“ انہوں نے

مجھ سے سوال کیا۔

”میں خود اس بات کو اچھی طرح سے جانتی ہوں کسی کو مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”مجھ سے ایک بے وقوفی سرزد ہو گئی ہے۔“ علی بھائی بولے۔

”وہ کیا؟“ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”میں نے آج ہی تیسور سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ میں ماہ رخ کو پسند کرتا ہوں اور میں

نے اس کے لیے رشتہ بھی بھجوایا ہے۔“ علی بھائی تاسف سے بولے۔

”تو اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہے؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”وہ بھلا میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا؟“ وہ اسی لہجے میں بولے۔

”آپ کو یہ بات کوئی پہلے سے معلوم نہ تھی اور یہ تو اسے بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر آپ کو اس کی

پسندیدگی کی بابت علم ہوتا تو آپ بھلا یہ بات اس کے سامنے کرتے؟“ میں نے دلیل دی۔

”ویسے آپ کی بات سن کر اس نے کچھ کہا؟ یا پھر اس کے تاثرات کیا تھے؟“

”اصل میں جذباتیت میں، میں نے اس کے تاثرات کا جائزہ ہی نہیں لیا، ہاں البتہ کہا اس نے کچھ بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ خاموش رہا تھا۔“ علی بھائی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ گیٹ پر علی بھائی نے اتارا، میں نے اندر چلنے کو کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔

”دیر کافی ہو گئی ہے، پھر کسی وقت آؤں گا۔“ انہوں نے چلتے وقت کہا۔ ”تم کسی طرح بات کو سنبھال لینا اور ہاں جس لڑکی کا تم بتا رہی تھیں وہ کسی وقت دکھا بھی دینا۔“ میں دیر تک کھڑی ان کی گاڑی کی بتیاں دور جاتی ہوئی دیکھتی رہی۔

لاؤنج میں داخل ہوئی تو تیمور نیم تاریکی میں بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ”کس کے ساتھ آئی ہیں؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”کس کے ساتھ آسکتی ہوں میں؟“ میں نے ذرا طعنے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے انکل کے ساتھ آئی ہیں یا علی بھائی کے ساتھ اور جو بھی آیا ہے اندر کیوں نہیں آیا؟“ اس نے پوچھا۔

”علی بھائی آئے تھے۔ دیر ہو گئی ہے اس لیے اندر نہیں آئے“ میں نے وضاحت کی۔ ”تم کیوں ابھی تک جاگ رہے ہو اور یہاں کیوں بیٹھے ہو اندھیرے میں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ سے کوئی بات کرنی ہے!“ اس نے مختصر آکھا۔

”تو کل بات کر لیتے!“ مجھے علم تھا کہ وہ بات مظہر کی بابت ہی ہوگی۔

”میرے پاس اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ صرف دس دن اور آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل پارہا۔“ تیمور نے بے چارگی سے کہا۔

”اس وقت تو نیند آرہی ہے، تاہم کہو کیا بات ہے؟“ اس نے میرے یوں کہنے پر مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔

”بیٹھیں!“ اس نے کہا۔ میں نے بیٹھ کر اپنے پاؤں سینڈل کی قید سے آزاد کیے۔

”کچھ کھاؤ گے؟ چائے لو گے؟“ میں نے مجبوراً پوچھا۔

”نہیں آپ بیٹھیں۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”مظہر کے بارے میں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! آپ کے بارے میں۔۔۔۔۔“ اس نے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا ”میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟“ میرے حواس گویا تھقل ہو گئے اور آنے والے لمحات کی تنگنی سے میرا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

”کیا مطلب ہے اس بات کا؟“ میں نے ہمت جمع کر کے پوچھا۔

”میں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ میں آپ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں!“ میرے سر پر کئی آسمان آگرے میں جو بڑے اعتماد سے اس کے پاس بیٹھی تھی، بھر بھری مٹی کی ڈھیر بن گئی۔ میری ٹھوڑی جھکتے جھکتے میرے سینے سے آگلی۔ ہونٹوں پر یوں تالا لگا کہ منہ سے ایک لفظ ادا نہیں ہو رہا تھا۔

”یہ کیا مذاق ہے تیمور؟“ بمشکل میں نے پوچھا۔

”یہ مذاق تو نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں نے سوچ سمجھ کر بات کی ہے، اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو بتادیں۔“ اس نے کہا۔

”میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ماہ رخ کو چاہتے ہو اور جو بات تم کر رہے ہو وہ نکبت یا امی کے کہنے پر کر رہے ہو۔“ مجھے اس تصور سے ہی جھجک آرہی تھی کہ اس نے مجھ سے رشتے کی بات کی تھی۔

”آپ سمجھتی ہیں کہ میرا دماغ نہیں ہے، میری سوچ نہیں ہے؟“ تیمور بھند تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ یہ خیال کس کے ذہن کی اختراع ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے، بہت عرصہ قبل امی نے مجھ سے بات کی تھی، لیکن میں مناسب وقت کے انتظار میں تھا اور اب میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس قابل ہو گیا ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”تم جو کچھ سوچ رہے ہو اور کس وجہ سے سوچ رہے ہو میں سب جانتی ہوں۔“ میں نے اسے جتلیا۔ ”میں کیا یہ نہیں جانتی کہ تم ماہ رخ کے معاملے میں کتنے سیر لیس ہو۔“

”وہ سب نوجوانی کی نادانیاں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اور ماہ رخ کو مجھ سے بڑھ کر بہتر رشتے مل جائیں گے، لیکن مجھے یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے حق میں اور ہمارے گھر کے لیے کیا بہتر ہے۔“ تیمور نے رمان سے کہا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے لیے کیا بہتر ہے، سے زیادہ اس بات نے تیمور کو مجھ سے یہ بات کرنے پر مجبور کیا، ہوگا کہ علی بھائی کا رشتہ وہاں ڈالا گیا تھا۔ ”آپ سوچ کر مجھے اپنے

فیصلے سے آگاہ کریں..... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟“ تیمور نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”مجھے اپنے فیصلے کے لیے سوچنے کی ضرورت نہیں، میں ابھی تمہیں اپنا فیصلہ سنا دیتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”زندگی کے فیصلے جذباتی انداز میں نہیں کیے جاتے اور نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد بازی میں انکار کر کے خود پر خوشیوں کے دروازے بند کر دیں۔“ تیمور نے مجھے سمجھانے کے لیے کہا۔

”میرے نصیب کی خوشیاں لازم نہیں کہ اسی فیصلے سے منسلک ہوں۔ نہ ہی میں چاہتی ہوں کہ کسی اور کی خوشیوں کے مزار پر اپنی خوشیوں کے مینار تعمیر کروں تم میرے لیے اپنی محبت کی قربانی مت دو۔“ میں نے جتنی انداز میں کہا۔

”کیا قربانی اور کس کی خوشیاں، کیا مزار اور کیا مینار؟ آپ یہ افسانوی باتیں بند کریں اور میری بات پر غور کریں، میں کل آپ سے دوبارہ بات کروں گا!“ وہ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ میں چاہتے ہوئے بھی اسے یہ نہ کہہ سکی کہ میرا یہی جواب کل ہوگا جو کہ آج ہے۔

اگلے روز دفتر میں ہی امی جان کی کال آئی کہ میں جلدی گھر آنے کی کوشش کروں کیونکہ انہیں میرے ساتھ ماہ رخ کی طرف نکلت، خوشی اور نکلت کے آنے والے بچے کے لیے کچھ چیزیں دینے کے لیے جانا تھا۔ ماہ رخ کچھ دنوں میں انگلینڈ جانے والی تھی۔ میں حسب وعدہ جلدی گھر پہنچی تو تیمور امی جان باہر برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مظہر بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس کی شیو کافی بڑھی ہوئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے مظہر سے سوال بھی کیا کہ اس نے کافی دنوں سے شیو کیوں نہیں کی۔

”میں داڑھی رکھ رہا ہوں بھابی!“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”داڑھی سے یار بندہ ذرا بڑا بڑا لگتا ہے۔“ تیمور نے ہنس کر کہا۔

”بڑا تو میں ہو گیا ہوں چاہے آپ لوگ یقین کریں یا نہ کریں اور داڑھی میں نے سید رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں رکھی ہے، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو؟“ مظہر نے سیدھا تیمور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جانے اس کے لہجے میں کیا تھا کہ مجھے عجیب سا احساس ہوا۔

”نہیں بھائی! مجھے کیا اعتراض ہوگا اور یہ کس نے کہا کہ کوئی تمہیں بڑا تسلیم نہیں کرتا، چاہو تو میں تمہیں خود سے بھی بڑا تسلیم کر لیتا ہوں؟“ تیمور نے بات ہلکے پھلکے انداز میں کی۔

”نہیں! مجھے آپ سے بڑا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے، بس میں اتنا ہی بڑا رہنا چاہتا ہوں، جتنا بڑا میں ہوں۔“ مظہر نے عام سے لہجے میں کہا مگر اس عام لہجے میں کوئی خاص بات تھی۔

”مظہر! یار تم بڑے ہو گئے ہو اور اب تمہیں ذرا اپنی ذمہ داری کا احساس بھی کرنا چاہیے۔ پڑھائی ختم کر کے گھر اور کاروبار کی ذمہ داریاں سنبھال لو۔“ تیمور نے اس سے کہا۔

”اچھا اگر تم دونوں چائے پی چکے ہو تو جا کر اچھی سی مٹھائی لے آؤ، اتنی دیر میں ماہا تیار ہو جائے تو پھر ہمیں جانا ہوگا نکلت کا سامان دینے کے لیے۔“ امی جان نے کہا۔

”امی! یہ بھی عجیب رسم ہے، بھلا کون سا آپ نے انگلینڈ مٹھائی بھیجی ہے۔“ تیمور جھنجھلایا۔

”پھر بھی بیٹا، رسوائی سہی پر بیٹی کے گھر خالی ہاتھ تو نہیں جاسکتے ناں؟“ امی جان نے کہا۔

”تو امی ضروری ہے کہ آپ مٹھائی لے کر جائیں، کچھ اور لے جائیں ڈرائی فروٹ یا بسکٹ یا پھر کوئی اور ایسی چیز۔“ مظہر ہمیشہ دور کی کوڑی لاتا تھا۔

”واہ بھئی واہ! کیسی عقلمندی کی بات کی ہے چھوٹو نے۔“ میں نے بے ساختہ داد دی۔

”بس بھابی! آپ کی نظر میں، میں چھوٹو ہی رہوں گا، جانے کب بڑا ہوں گا۔“ مظہر بے چارگی سے بولا۔

”سوری بھئی! بھول گئی لیکن میرے لیے تو تم چھوٹو ہی ہونا.....“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہنس کر کہا۔ اس نے مجھ کھڑا ہونے کو کہا۔

”دیکھیں امی! میں چھوٹو ہوں، یہ بھابی میرے سامنے بالکل گڑیا جیسی لگ رہی ہیں!“ میں اس کی بات سن کر جھینپ گئی۔ واقعی اس کی اٹھان ایسی تھی کہ غالب اور تیمور سے قد کاٹھ میں بھی بڑا تھا اور پھر اس کے چہرے پر نیا اضافہ یعنی داڑھی مزید اس کو بڑا دکھاتی تھی۔

”اچھا چلو اب جاؤ بھی یا باتیں ہی بگھارتے رہو گے، جا کر لے آؤ جو کچھ تم مناسب سمجھتے ہو!“ امی جان نے کہا۔ دونوں چلے گئے تو میں اور امی جان تنہا رہ گئیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ کٹھ کر نماز پڑھ لوں اور فریش اپ بھی ہو جاؤں کہ انہوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ کر ہر تن گوش ہو گئی۔

”ماہا بیٹا، تیمور نے تم سے کوئی بات کی ہے؟“ انہوں نے قدرے توقف سے کہا۔ میں

خاموش ہی رہی۔ ”بیٹا! میری بڑے عرصے سے یہ سوچ تھی۔ تم بتاؤ تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں.....؟“ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں بصد کوشش کچھ نہیں بول سکی۔

”بیٹا! میں ماں ہوں، غالب کی بھی، تیمور کی بھی اور اسی طرح تمہاری بھی اور میرے لیے اس بارے میں سوچنا بڑا ہی مشکل مرحلہ تھا، مجھے علم ہے کہ تمہارے لیے بھی اس پر سوچنا بہت مشکل ہے، لیکن بیٹا زندگی کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا ڈراما یا تین گھنٹے کی فلم نہیں کہ جو شروع ہو کر تین گھنٹے میں خوشگوار انجام پر منٹج ہو جائے۔ بیٹا زندگی آزمائش گاہ ہے اور اس میں بڑے بڑے مشکل مراحل آتے ہیں، میں نے بھی بیوگی کاٹی پر میرے پاس چار بچے تھے تمہارے لیے یہ سفر اس لیے مشکل ہے تم بالکل تنہا ہو۔“ انہوں نے بہت وضاحت سے بات کی۔

”میں کیوں تنہا ہوں امی، آپ ہیں، تیمور، مظہر ہیں، ان کی شادیاں ہوں گی تو ان کے بچے ہوں گے، میں اکیلی کیوں ہوں گی۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”بیٹا! شادیاں ہوتی ہیں تو سنگے بھائیوں کے رویے بھی مختلف ہو جاتے ہیں، یہ تو پھر تمہارے دیور ہیں، تمہاری عزت اور احترام کرتے ہیں، کل کو شادیاں ہوں اور کوئی اور عورتیں آکر گھر کا نظم و نسق سنبھالیں تو ہرگز حالات ایسے نہ رہیں گے، اس لیے بہتر ہے تم ابھی سے اپنے لیے بہتر راہ چن لو۔“ امی جان نے کہا۔

”امی جان ایسی باتیں عموماً فلموں اور ڈراموں میں ہوتی اور کامیاب بھی رہتی ہیں۔ میرے لیے تیمور چھوٹے بھائی کی طرح ہے اور خصوصاً جب میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔“ میں نے سوچا کہ اب وقت آگیا ہے امی جان پر اس کا انکشاف کر دیا جائے۔

”تیمور کسی اور کو کیسے پسند کر سکتا ہے..... اور کبھی اس نے مجھ سے ذکر بھی نہیں کیا؟“ امی بہت حیران تھیں۔

”اس سے پہلے کبھی ایسا ذکر بھی نہیں ہوا اور یوں بھی ہر چیز کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ اس مناسب وقت کی تلاش میں ہو اور ظاہر ہے کہ آپ سے قدرتی طور پر جھجک کی وجہ سے وہ آپ سے خود بات بھی نہ کر سکے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اگر میں اس بات کو تسلیم بھی کر لوں تو جب میں نے اس سے تمہاری بابت بات کی تھی تو کم از کم تب تو اس بارے میں ضرور بات کرتا ناں؟“ امی جان نے کہا۔ ”اور پھر کون سا اس سے

کہیں منگنی وغیرہ ہو گئی ہے۔“

”پلیز امی جان! آپ سمجھنے کی کوشش کریں..... اور پھر آپ میری یہ بات مان لیں، وعدہ کرتی ہوں کہ اس کے بعد میں آپ کی بات پر غور کروں گی۔“ میں نے ان سے وعدہ کر لیا۔

”پروہ لڑکی ہے کون اور اسے ملی کہاں؟“ امی جان نے سوال کیا۔

”ماہ رخ!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”دماغ تو ٹھیک ہے اس لڑکے کا؟ کیوں ایسی جگہ کے متعلق سوچا جہاں پر رشتہ وٹہ سٹہ بن جائے۔“ امی جان غصے میں آ گئیں۔

”وٹہ سٹہ تو تب ہو جب کسی نے رشتہ مانگتے وقت قدغن لگائی ہو کہ ہمیں رشتہ لینا بھی ہے اور دینا بھی۔“ میں نے اپنی طرف سے ٹھنڈی جھاڑی۔

”تم اپنی وضاحتیں اپنے پاس رکھو۔ ابھی تم اس طرح کے معاملات کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتی ہو بیٹا!“ امی جان بولیں۔

”لیکن امی تعلیم ہمیں یہی شعور تو دیتی ہے کہ ہم رسومات اور توہمات کی قیود بند سے آزاد ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہ یہ رسومات ہیں اور نہ توہمات بیٹا اور جو باتیں ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں ان میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔“ امی جان نے کہا۔

”پلیز امی جان! آپ ایسی کسی چیز سے خوف زدہ نہ ہوں اور اللہ کا نام لے کر رشتہ مانگیں۔“ میں نے ان کی منت کی۔

”تمہیں اگر تیمور سے شادی کرنے پر اعتراض ہے تو بھی میں اس کا رشتہ ماہ رخ سے کرنے کے حق میں ہرگز نہیں ہوں۔“ امی جان نے حتمی لہجے میں کہا۔

”پلیز امی جان! یقین کریں یہ میری نہیں تیمور کے دل کی خواہش ہے۔“ پھر میں نے منت کی۔

”تیمور کے دل کی خواہش.....! میں جانتی ہوں اور وہ تم سے اس کا اظہار بھی کر چکا ہے۔“

امی جان نے زور دے کر کہا۔

”وہ اس کے دل کی خواہش نہیں بلکہ سعادت مندی ہے، آپ کی خواہش کا احترام ہے۔“

چلیں مجھے ایک بات کا جواب دیں کہ کیا تیمور نے آپ سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا

ہے یا آپ نے اس سے کہا تھا؟“ میں نے ذرا سوچ کر سوال کیا۔

”میں نے اس سے کہا تھا لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟“ امی جان نے پوچھا۔

”اور آپ سے نگہت نے کہا ہوگا.....؟“ میں نے اندازہ لگایا۔

”نگہت نے بھی مجھ سے کہا ہے لیکن بہت عرصے سے میری اپنی بھی یہی خواہش تھی۔ میں اس گھر میں تمہیں بیٹی بنا کر لائی تھی اور بہت سوچا کہ کوئی مناسب رشتہ ملے تو تمہاری زندگی کا کوئی بہتر فیصلہ ہو جائے مگر اب اپنے گھر سے وداع کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔“ امی جان نے گلوگیر آواز سے کہا۔

”تو پھر مجھے یہیں رہنے دیں، اپنی بیٹی سمجھ کر۔“ میں نے اپنے بازوان کے کندھوں پر رکھے۔  
 ”اگر تم تیمور کے لیے ہاں کر دو تو پھر تم ہمیشہ کے لیے یہاں رہو میری بیٹی بن کر!“ انہوں نے پیار سے کہا۔

”پلیز امی جان! آپ کو میری قسم اس بات کو اس کے بعد مت دہرائیں، بلکہ آپ سے درخواست بلکہ اسے میری التجا سمجھ لیں کہ آج ہم جا ہی رہے ہیں تو کیوں نہ اپنی عرضی پیش کر دیں؟“ میں نے ان سے درخواست کی۔

”نہ تم نوید کے لیے مانتی ہو، نہ تیمور کے لیے، آخر تم چاہتی کیا ہو؟“ انہوں نے ناراضی سے پوچھا۔  
 ”اچھا پکا وعدہ، اس کے بعد آپ جو کچھ کہیں گی مانوں گی، پلیز!“ میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”میرے پاس تو اب چھوٹو ہی بچا ہے۔“ اور اس پر ہم دونوں کی ہنسی نکل گئی۔

”تیار ہو جائیں امی جان، وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ وضو کر کے کپڑے تبدیل کیے، نماز پڑھی اور بال بنا کر میں منٹوں میں تیار ہو کر بیگ لے کر باہر نکلی تو تیمور اور مظہر آچکے تھے۔

”بھابی! آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ مظہر نے کہا۔

”شکریہ! لیکن ایسا اچھا لگنے والی کیا بات ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”آپ پر گلابی رنگ بہت سوٹ کرتا ہے اور پھر آپ نے ہلکا ہلکا میک اپ بھی تو کیا ہے؟“ مظہر ہمیشہ ایسے ہی سادگی سے بات کر دیتا تھا۔ میں ذرا بلش کر گئی کیونکہ تیمور نے بہت گہری نظر

سے مجھے دیکھا تھا۔

”تم بہت نوٹ کرتے ہو ہر بات کو؟“ تیمور نے ہنس کر کہا۔

”گھر میں رہتا ہوں اور ہر بڑی چھوٹی تبدیلی کو محسوس کرتا ہوں۔ غالب بھائی کے بعد بھابی نے خود پر سنجیدگی اور بزرگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے، ذمے داریوں کے کوہِ گراں تلے دب کر انہیں اپنا بھی ہوش نہیں رہا۔ آج بہت عرصے کے بعد غالب بھابی نے میک اپ کیا ہے، لگتا ہے کوئی خاص بات ہے؟“ مظہر نے کتنا زیادہ تجزیہ کر رکھا تھا میرا، اور آج میک اپ یہ سوچ کر کیا تھا کہ کسی خاص مقصد سے ماہِ رخ کی طرف جارہے تھے، جانے تیمور اسے کیا معافی پہنائے۔

”چھوٹو! تم چھوٹو ہی رہو تو بہتر ہے، اتنی بڑی بڑی باتیں نہ کیا کرو۔“ میں نے بات ٹالنے کو کہا۔ تیمور بالکل خاموش تھا اور بغیر دیکھے بھی مجھے علم تھا کہ میں اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔  
 ”مظہر یار امی جان کو بھی بلاؤ۔“ تیمور کے کہنے پر مظہر امی کو بلانے چلا گیا۔

”کیا میں اس مثبت تبدیلی کو اپنے سوال کا مثبت جواب سمجھوں؟“ تیمور میرے بالکل سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”کون سے سوال کا؟“ میں یلکھت ٹپٹا گئی۔

”آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنا سوال دہراؤں؟“ اس کا سوال مکمل ہوتے ہی مظہر اور امی جان آگئے۔ روانگی کے وقت مظہر دودلی کا شکار تھا کہ جائے یا نہ جائے۔ کبھی سونے کا بہانہ کر رہا تھا، کبھی کام کا۔ میں نے ضد کی کہ اسے ہمارے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔ کافی عرصے سے میں اس کا تنہائی پسندی اور لیے دیے انداز کا رویہ نوٹ کر رہی تھی۔ سو میں نے اصرار کر کے اسے بھی ساتھ لے لیا۔

تیمور گاڑی چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ امی جان بیٹھی تھیں، میں اور مظہر پیچھے بیٹھے تھے۔ تمام راستہ نوک جھوک اور چٹکلے چلتے رہے۔ ماہِ رخ کے گھر پہنچے تو وہ سب لوگ لان میں ہی بیٹھے تھے۔ ماہِ رخ، اس کا بھائی امتیاز، بھابی، والدین سب لوگ چائے پی رہے تھے۔ سب لوگ اٹھ کر ہماری پذیرائی کو آگے بڑھے۔ ہمارے بیٹھے ہی ماہِ رخ اور اس کی بھابی کچن کی طرف سدھاریں۔

”ماہِ رخ پلیز ہم سب چائے پی کر آئے ہیں۔“ میں نے اسے آواز دے کر روکا۔

”چائے نہیں بنا رہے ہم آپ کو کھانا کھلا کر بھیجیں گے۔“ بھابی نے مڑ کر کہا۔

امی جان نے بھی کھانے سے منع کیا لیکن ان لوگوں کا اصرار قائم رہا کہ ہم کون سا روز روزان

کے ہاں جاتے تھے۔ امتیاز بھائی کے بچے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے انہماک سے ہوم ورک کر رہے تھے۔ تیسرا بچہ جو تقریباً دو سال کا تھا وہ دادی کی گود میں تھا۔ کتنا پیارا گل گوتھنا سا..... نیلی نیلی آنکھوں والا بچہ۔“ جانے کہاں سینے کی گہرائی میں ایک کسک اٹھی کہ میرا بچہ جو ہوتا تو ایسا ہی ہوتا، اتنا ہی بڑا۔ میرے اندر ماما کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میں نے اٹھ کر آنٹی کی گود سے اسے لینے کو ہاتھ بڑھائے تو وہ ہمک کر میری طرف آ گیا۔

”جانے کیا سمجھ کر میرے پاس آ گیا ہے؟“ میں نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”بیٹا یہ بہت بڑا بد معاش ہے، ہر خوبصورت لڑکی کے پاس چلا جاتا ہے۔“ ماہ رخ کے والد نے ہنس کر کہا تو قہقہہ ابل پڑا۔ میں بلش کر گئی۔

”آپ کو تو ہر وقت مذاق سو جھتا ہے۔ بیٹا یہ سب کے پاس اسی طرح چلا جاتا ہے۔“ ماہ رخ کی امی نے وضاحت کی۔

”میں مذاق نہیں کر رہا، میں تو تعریف کر رہا ہوں ماہابی کی اور میری بات کی تصدیق کر کے دیکھ لیں بے شک۔“ انکل نے دعویٰ کیا تو سب لوگ ہنس پڑے اور پھر ہر ایک نے باری باری کوشش کی مگر اس نے میری گود سے کہیں اور جا کر نہ دیا۔ مجھے بھی بہت حیرت ہوئی۔ یوں میرے سینے سے لگا جیسے میرا ہی بچہ ہو اور جانے کب سے میری گود کو ترسا ہوا ہو۔ اس کی ماں البتہ جس لے کر آئیں تو لپک کر ان کے پاس چلا گیا۔ مجھے دیر تک اپنے وجود کے پاس اس کی خوبصورت خوشبو محسوس ہوتی رہی۔ بچے قدرت کا کیسا خوبصورت عطیہ ہوتے ہیں۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا، اس کے بعد میٹھے اور پھر قہوے کا دور چلا، سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے امی جان کو دو ایک دفعہ اشارہ کیا مگر وہ بات شروع ہی نہیں کر پار ہی تھیں اور مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ موقع کھو دیا تو پھر نہ جانے کب موقع ملے یا معاملہ کب تک لٹک جائے۔

”آنٹی، انکل!“ میں نے ان کو مخاطب کیا۔ ”آج ہم آپ کی طرف ایک خاص مقصد سے آئے ہیں۔ اب امی جان آپ کے سامنے اس مقصد کی وضاحت کریں گی۔“ میں نے فقرہ مکمل کیا اور دانستہ امی جان یا تیمور کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

”کس خاص مقصد سے بیٹا؟“ آنٹی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

”جی امی جان آپ بات کریں۔“ میں نے گیند امی کے کورٹ میں پھینک دی۔

”تم بھی بڑی ہو اور دیا ہی حق رکھتی ہو، تم بات کرو۔“ امی جان نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا اور میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اس وقت وہ اندر کیا محسوس کر رہی تھیں، پھر بھی میں نے موقع ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”آنٹی! اصل میں امی کی خواہش ہے کہ آپ ماہ رخ کے لیے تیمور کا رشتہ قبول کر لیں۔“ یقیناً اس وقت تیمور اور مظہر پر بھی بہت بڑا انکشاف ہوا ہوگا کیونکہ راستے میں بھی ہماری اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شاید میرا بات کرنے کا انداز بہت بھونڈا تھا کہ ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ماہ رخ کپ اٹھا کر سین سے غائب ہو گئی۔

”ہمیں دو ایک دن سوچنے کے لیے دیں۔ ویسے تو تیمور بہت پیارا بچہ ہے، دیکھا بھالا ہے..... لیکن ہمیں اپنے بیٹے اعجاز سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔“ آنٹی نے کہا۔

”کیوں نہیں آنٹی! یہ تو آپ کا حق ہے اور پھر ماہ رخ کی مرضی معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔“ میں نے تیمور کی طرف غور سے دیکھا تو وہ جو مجھے ہی دیکھ رہا تھا گڑ بڑا گیا۔

”بہت شکریہ بہن جی! آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا۔“ ماہ رخ کی امی نے امی جان سے کہا۔

”آنٹی اگر تیمور کی چھٹی کے دوران ماہ رخ کے انگلیٹڈ جانے سے پہلے ہمیں جواب مل جائے تو.....؟“ میں نے فوراً آنٹی سے کہا۔

ماہابی! بچپن کی زندگی کے فیصلے والدین کو سوچ سمجھ کر کرنا ہوتے ہیں، تم اتاد لے پن سے کام نہ لو، انہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا وقت دو۔ تیمور پھر چھٹی پر آ سکتا ہے اور ماہ رخ کو بھی انگلیٹڈ سے تین ماہ میں واپس آ جاتا ہے۔“ امی جان بظاہر مجھے سرزنش کر رہی تھیں، لیکن مجھے ان کے لہجے سے ناراضی کی بو آ رہی تھی۔

”ارے نہیں بہن جی! ہماری اور آپ کی بیٹیاں کوئی الگ الگ ہیں۔ آپ کے گھر کے لیے فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں کسی لمبی چوڑی سوچ کی ضرورت نہیں، میرے لیے نگہت اور ماہابی ایسے ہی ہیں جیسے ماہ رخ۔ بس وہ دو ایک اور رشتے بھی ہیں، اس لیے میں مناسب سمجھوں گی کہ استخارہ کر لوں اور گھر کے سب افراد سے مشورہ بھی۔“ آنٹی نے کہا۔

”بالکل مناسب بات ہے آنٹی!“ میں نے کہا پھر ہم ان سے اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ ماہ رخ اس کے بعد سامنے نہیں آئی۔ میں کچن میں گئی تو وہ ایک کرسی پر بیٹھی فرش کو گھور رہی

تھی۔ میں نے اسے خدا حافظ کہا اور اس سے کہا کہ وہ جلد از جلد تیمور کے حق میں فیصلہ دیدے۔ اس پر وہ شرمائی۔

واپسی کے سفر میں گاڑی میں قدرے خاموشی تھی۔ جاتے ہوئے خوب گپ شپ اور نوک جھوک ہوئی تھی جو کہ اب مفقود تھی۔ مجھے اس خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔

”امی جان! آپ ناراض ہیں مجھ سے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بیٹا! ناراض کیا ہوں گی، جو تم لوگوں کی رضا ہو۔“ وہ بولیں۔

”تم لوگوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ تیمور چونک کر بولا۔

”تم لوگوں کا مطلب ہے تم لوگ..... ماہا اور ماہ رخ اور تم.....“ امی جان بولیں تو میں لب چبا کر رہ گئی۔

”یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں نے ایسا چاہا تھا.....؟“ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

”ماہانے سب کچھ بتا دیا تھا مجھے.....“ امی نے کہا تو پھر ایک طویل خاموشی کا وقفہ آیا۔

”آپ سب لوگ اس بات پر پریشان کیوں ہو گئے ہیں؟ تیمور بھائی ماہ رخ باجی کو پسند کرتے ہیں اور وہ ان کو یہ تو مجھے بھی علم ہے، پھر یہ رشتہ تو ہونا ہی تھا تو اب کیا پریشانی ہے؟ امی کہیں آپ اس بات پر تو بھائی سے ناراض نہیں ہیں کہ انہوں نے آپ کے بجائے بات کی؟“ مظہر کی اس قدر گہری بات پر ہم سب چونک گئے۔

”یہ بات تم نے سوچی بھی کیونکر؟ بے وقوف لڑکے! یہ بات تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے تو بسا اوقات ماہا عقلمندی اور معاملہ فہمی میں خود سے بھی دو ہاتھ آگے لگتی ہے۔ میں تو اس سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی۔“ امی نے خلوص سے کہا۔

”پتا نہیں، شاید آپ سچ ہی کہہ رہی ہوں لیکن مجھے ان کے گھر بھی محسوس ہوا جیسے آپ اس بات سے خوش نہیں ہیں اور تیمور بھائی تو ماتھے پر یوں بل ڈالے بیٹھے تھے جیسے کسی اور کے رشتے کی بات ہو رہی ہو۔ ایسے موقعوں پر جو خوشی کے تاثرات چہروں پر ہونے چاہئیں وہ سوائے بھابی کے سب کے چہروں سے مفقود تھے۔“ مظہر نے بہت عقلمندی کی بات کی۔

”اس لیے کہ اس رشتے پر سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی۔ ماہ رخ میری دوست بھی ہے۔ اب بھابی بن جائے گی اور کتنا مزہ آئے گا، تیمور کی شادی ہوگی.....“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

”ایک بات کا خیال رہے بھابی کہ دوستی جب رشتے داری میں تبدیل ہو جاتی ہے تو اس میں سے خلوص اور پیار ختم ہو جاتا ہے۔“ مظہر ایک بہت پتے کی بات کر گیا تھا۔

”اللہ نہ کرے کہ ایسا دن آئے، کم از کم میری طرف سے تو ایسا کبھی بھی نہ ہوگا۔“ میں نے پریقین لہجے میں کہا۔

”اللہ سب خیر کرے۔“ امی جان نے کہا۔

گھر پہنچے تو کافی رات ہو چکی تھی، ہم سب کی عشا کی نماز باقی تھی۔ میں نماز سے فارغ ہوئی تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ لاک تھا۔ میں نے اٹھ کر کھولا، میرا اندازہ یہی تھا کہ تیمور ہوگا۔ ”اگر آپ کو نیند نہیں آرہی تو ایک ضروری بات کرنا تھی۔“ میں نے ہٹ کر راستہ دیا۔ وہ اندر آ کر میرے کمرے میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری نشست سنبھال لی۔

”یہ آپ نے کیا کیا؟“ تیمور نے مجھ سے سوال کیا۔

”جو مجھے کرنا چاہیے تھا، شاید تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ کرنے کا حق نہیں تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”باتوں میں تو میں آپ کو ہر انہیں سکتا لیکن جو بات آپ سے میں نے کی تھی اس کا جواب یہ ایکشن تو نہیں ہو سکتا؟“ تیمور نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”تیمور یقین کرو، تم بہت اچھے انسان ہو لیکن میں نے تمہیں ہمیشہ بھائی سمجھا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”بھائی سمجھنے اور بھائی ہونے میں بہت فرق ہے.....“ تیمور نے کہا۔

”سچ کہو کیا تم مجھے بھابی یا بہن نہیں سمجھتے ہو؟ اور کیا تمہارے لیے اتنا آسان ہے مجھے اپنی زندگی میں کوئی اور مقام دینا؟“ میں نے براہ راست سوال کیا۔

”دنیا میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ بیس بچیس برس تک ایک دوسرے کو بھائی جان یا باجی کہنے والے کزنز کی بھی تو آپس میں شادیاں ہوتی ہیں اور پھر یہ کچھ ایسا بنا مل تو نہ ہوتا؟“ تیمور نے سوال کیا۔

”تیمور میں جانتی ہوں کہ تم نے ماہ رخ کے سپنے آنکھوں میں سجا رکھے ہیں اور مجھے تمہاری بات مان کر ہمیشہ پیچھا تارہتا۔ بس اب اس موضوع پر مزید بات نہیں!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”میں عجیب سی الجھن میں پڑ گیا ہوں بھابی!“ تیمور نے کہا۔



”الجھنے کی یا الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنی طور پر ریلیکس ہو گئے ہو کیونکہ آج کافی دن کے بعد تم نے مجھے بھائی کہا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بجدا ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی میں کسی ٹینشن میں تھا اور بھائی۔۔۔۔۔۔ ظاہر ہے میں آپ کو بھائی کہہ کر تو وہ بات نہیں کر سکتا تھا؟“ تیمور نے بھی کھسیانی ہنسی سے کہا۔

”بس تم مجھے کچھ اور کہنے کا سوچو بھی مت، بھائی ہی کہو۔۔۔۔۔۔“ میں نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

تیمور کی چھٹی کے دوران ہی مظہر کی سالگرہ تھی، اس تقریب کو چھوٹے سے پیمانے پر منانے کا سوچا، صرف امی کی طرف سے اور ماہ رخ کے گھر والوں کو بلایا۔ میرا رزلٹ بھی آگیا تھا اور میری محنت رنگ لائی تھی، میں نے پرائیوٹ طور پر ایم بی اے کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔

تقریب میں، میں نے مظہر علی کے گھر سے بھی سب کو بلانے کا سوچا تھا تا کہ کسی طرح علی بھائی ثانیہ کو بھی دیکھ لیں اور مظہر علی کی والدہ کی ملاقات میری والدہ سے ہو جائے مگر پھر ان کی مالی حالت کا سوچ کر خیال آیا کہ کہیں وہ ہمارے ہاں آکر کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہی سوچا کہ کسی اور موقع پر ان کی ملاقات کروادوں گی۔ چھوٹے سے پیمانے پر تقریب تھی۔ میں باری باری سب مہمانوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماہ رخ کی والدہ کے پاس پہنچی تو انہوں نے کہا کہ وہ ہاتھ روم جانا چاہ رہی تھیں۔ تقریب لان میں تھی، میں انہیں ساتھ لیے اندر اپنے کمرے کے ہاتھ روم کی طرف چلی۔ کمرے میں انہیں چھوڑ کر واپس جانے لگی تو انہوں نے مجھے پکارا، میں رک گئی اور پلٹ کر ان سے سبب پوچھا۔

”ماہا! بیٹا تم جانتی ہو کہ ماہ رخ کے لیے تیمور سے پہلے تمہاری والدہ علی کے لیے کہہ چکی ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی آئی! مگر آپ کو تو فیصلہ پتا برا بھلا سوچ کر یا پھر ماہ رخ سے پوچھ کر کرنا ہوگا!“ میں نے کہا۔

”یہ بات رشتہ مانگتے ہوئے بھی ہم نے آپ سے کی تھی۔“

”جانتی ہوں، لیکن میرے ذہن میں جو خدشہ ہے وہ یہ کہ میں کس کو ہاں کروں اور کس کو ناں!

ہر د صورتوں میں مجھے تمہاری پوزیشن سب سے زیادہ نازک نظر آتی ہے۔۔۔۔۔۔“ آنٹی نے خدشے کا اظہار کیا۔

”میری پوزیشن کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ اپنی بیٹی کی زندگی کا کیا فیصلہ کرتی ہیں، اس کی شادی وہیں ہوگی جہاں کا حق تقدیر نے لکھا ہوگا۔“ میں نے انہیں یقین دلایا۔

”تو کیا اگر ہم تیمور کے لیے ہاں کہیں تو تمہیں دکھ نہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے بھائی کو رشتہ نہیں دیا؟“ وہ حیرت سے بولیں۔

”آئی میرے لیے تیمور اسی طرح ہے جیسے علی بھائی، اور اگر سچ پوچھیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی اگر آپ تیمور کو اپنی فرزندگی میں لیں گی اور ہاں صرف میں ہی نہیں اس بات سے تیمور اور خود ماہ رخ بھی بہت خوش ہوں گے آئی!“ میں نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی ہنس دیں۔

”میں نے ماہ رخ سے عندیہ لیا تھا اور اسی لیے مجھے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ اس کی مرضی کا فیصلہ کہیں ہم دو تین خاندانوں میں پھوٹ نہ ڈلوادے، وہ بولیں۔ میں انہیں کمرے میں چھوڑ کر باہر آئی تاکہ کوئی میری غیر حاضری کا نوٹس نہ لے لے۔ سب لوگ کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کھانا کھانے کے بعد مظہر نے تحائف کھولے۔ سب نے بہت خوبصورت اور قیمتی تحائف دیئے تھے۔ مجھے بھی ایم بی اے کا امتحان پاس کرنے پر کچھ تحائف ملے۔ قبوے کا دور چلا اور یوں یہ ایک خوبصورت سی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ جاتے ہوئے ماہ رخ کی والدہ مجھے بہت تپاک سے ملیں۔ یقیناً انہیں میری طرف سے سکون اور اطمینان ملا تھا۔

تیمور نے اپنی نئی پونٹ میں رپورٹ کر دی تھی۔ ماہ رخ انگلینڈ چلی گئی تھی۔ ماہ رخ کے گھر سے تیمور کے لیے رشتے کی منظوری دے دی گئی تھی اور جب ان کی طرف سے ہمیں مثبت جواب دیا گیا تو میں نے والدہ کو بھی کال کر کے اطلاع دی۔ انہوں نے فون پر امی جان کو بہت مبارکباد دی اور ماہ رخ کی والدہ کو بھی۔ نہ امی جان اس بات کی توقع کر رہی تھیں نہ ماہ رخ کی والدہ کہ ان کے ساتھ کوئی اتنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرے گا لیکن تعلیم انسان کو اسی طرح شعور دیتی ہے۔ میری والدہ تقدیر کے لکھے پر بہت سچے دل سے یقین رکھتی تھیں اس لیے انہوں نے اس سارے سلسلے کو

خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ یوں بھی جب میں تیمور اور ماہ رخ کی آپس میں دلچسپی کا ذکر کر چکی تھی تو یہ رشتہ والدہ یا علی بھائی کے لیے کسی طرح بھی غیر متوقع نہیں تھا۔

والدہ اب کسی وقت ثانیہ کی طرف جانا چاہ رہی تھیں اور میں چاہ رہی تھی کہ نوید صاحب کی بہنیں ایک دفعہ رشتہ دیکھ آئیں اور اگر اپنی پسندیدگی کی مہر لگادیں تو پھر ہم ثانیہ کو دیکھنے جائیں۔ بصورت دیگر اگر ہم ثانیہ کو پہلے دیکھنے جاتے تو جانے زارا کو کیسا محسوس ہو جس کا اپنی طلاق کے معاملے میں کوئی تصور نہیں تھا۔ دفتر میں، میں نے نوید صاحب کو کسی ضروری کام سے بلایا تھا اور ان سے بات کرتے کرتے یکدم میرے ذہن میں اس بات کا خیال آ گیا۔ دفتر میں معاملے پر بات مکمل کر کے میں نے نوید صاحب سے اس سلسلے میں پیش رفت کی بابت پوچھا۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ کا کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے اور مجھے وہاں جانے اور جا کر لڑکی دیکھنے کی ضرورت نہیں۔“ تیمور صاحب نے کہا۔

”مگر آپ کی بہنیں تو..... میرا مطلب ہے انہیں تو دیکھنا ہی ہوگا بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ آپ بھی جائیں تاکہ کم از کم لڑکی والے تو آپ کو دیکھ سکیں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”جیسے آپ کہتی ہیں۔ آپ بتادیں کہ کب جانا چاہیے ہمیں؟“ انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ ”میں زارا کی والدہ سے بات کر لوں، میرا خیال ہے کہ اسی اتوار کو چلے جائیں آپ اور پھر اگلے اتوار کے لیے میں والدہ کو کہہ دوں گی کہ وہ ثانیہ کو دیکھ آئیں۔ خدا کرے کہ دونوں رشتے ہو جائیں تو دو بیٹیوں کے فرض سے وہ فارغ ہو جائیں۔“ میرے لہجے میں اطمینان تھا۔

”مناسب بات ہے، جتنا بھی جلد ہو جائے بہتر ہے..... پھر آپ نے ان کی تیسری بیٹی کی بابت بھی سوچنا ہوگا اور شاید چھوٹے بیٹے کے بارے میں بھی!“ نوید صاحب مسکرائے۔

”ظن کر رہے ہیں نوید صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”اتنی میری مجال کہاں میڈم؟ آپ کے جذبہ ہمدردی کی داد دے رہا ہوں۔“ نوید صاحب نے صفائی پیش کی۔ نوید صاحب دفتر سے چلے گئے تو میں نے میز تلے ٹانگیں پھیلا لیں، جوتے اتار کر ذرا ریلیکس ہو گئی، جسم کو کرسی پر ڈھینچا چھوڑ دیا اور ذہن کو سوچ کی وادیوں میں بھٹک جانے دیا۔

کیا چاہتا ہے دل! کیا مانگتا ہے دل! کیا کھوجتا ہے دل! کیوں یہ دروازے بند کیے بیٹھا ہے؟ کس کا انتظار کر رہا ہے کہ کسی دستک پر دروازی نہیں کرتا..... اور جس کے لیے اسے دروازے

کھولنا ہیں، وہ کہاں ہے، وہ دل پر دستک کیوں نہیں دیتا؟

گہمت کے ہاں بیٹے کی ولادت کی خوشخبری نے دونوں گھرانوں میں ایک انوکھی مسرت کی لہر دوڑادی۔ ماہ رخ نے ہی مجھے ٹیلی فون کر کے بتایا تھا۔ میں نے مٹھائی منگوا کر پڑوس میں اور قریبی عزیزوں کے گھروں میں بھجوائی تھی اور مزید بھی جہاں جہاں ضرورت تھی مٹھائی بھجوانے کی امی جان سے پوچھ کر لسٹ بنائی تھی۔ امی جان بہت خوش تھیں اور خود گہمت کی سسرال میں مٹھائی لیکر جانا چاہ رہی تھیں لیکن میں بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے ساتھ جانے سے معذرت کر لی، امی جان مظہر کے ساتھ چلی گئیں اور اور میں گھر پر ملازمہ کے ساتھ اکیلی رہ گئی تھی۔ ملازمہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں نے ذرا آرام کرنے کا سوچا، اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو مظہر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ جانے کیسے غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ کچھ عرصے سے اس کے کمرے کا دروازہ ہر وقت لاک رہتا تھا اور فقط وہ صفائی کروا تا تھا وہ بھی اپنی نگرانی میں۔

میں یونہی تجسس کے تحت اس کے کمرے کے اندر چلی گئی۔ کمرہ انواع و اقسام کی کئی کتابوں کے اضافے سے مختلف لگ رہا تھا، زیادہ تر کتب مذہبی موضوعات پر تھیں جو کہ ایک مثبت بات تھی۔ بستر ٹکٹوں سے بھرا تھا، میں بے اختیار میں اسے ٹھیک کرنے لگی لیکن پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ اسے میری اپنے کمرے میں آمد کا علم ہو جائے گا۔ ایک نیکی کے نیچے سے کالی سے کوئی چیز جھانکتی نظر آئی، میں تکیہ اٹھائے بغیر نہیں رہ سکی اور مظہر کے نیکی کے نیچے ریوالتور دیکھ کر میرا جسم سن ہو گیا۔ نزدیک ہو کر دیکھا تو بالکل اصلی ریوالتور تھا، میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا، خوف زدہ ہو کر باہر نکل آئی۔ بار بار دل یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ ریوالتور غائب کر دوں، جانے مظہر وہ ریوالتور کہاں سے لایا تھا۔ سب سے پہلا سوال تو ذہن میں یہی آیا کہ کیوں..... آخر مظہر کو ریوالتور کی ضرورت کیا پڑ گئی تھی؟ آخر وہ خود کو اتنا بڑا کیوں سمجھنا شروع ہو گیا تھا اور کہیں..... جو خیال میرے ذہن میں آیا تھا اس نے مجھے لرزادیا۔

کہیں وہ کسی جرائم پیشہ گروہ کا حصہ تو نہیں بن گیا تھا؟ سیکڑوں سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ مجھے شدید خوف نے اپنے ذہن میں جکڑ لیا۔ مجھے امی جان سے بات کرنی چاہیے یا پھر تیمور سے؟ خود ہی سے میں سوال کر رہی تھی لیکن ان دونوں سے مجھے بہت شدید رد عمل کی توقع تھی۔ تیمور تو شاید مظہر پر ہاتھ اٹھا بیٹھتا اور یہ بات مظہر کو مزید باغی کر دیتی۔ امی جان بڑی باحوصلہ سہی مگر

نیک طبیعت خاتون تھیں، وہ اگر یہ جان جاتیں کہ وہ کسی منفی کارروائی میں ملوث ہے تو اسی حوصلے سے اسے گھر سے بھی نکال سکتی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ حقیقت میں بہت معصوم تھا اور اگر کسی غلط کام میں ملوث ہو بھی گیا ہے تو ضرور کسی کے بہکاوے میں آ گیا ہے مگر کس کے بہکاوے میں؟ شاید کوئی استاد جو اپنے طالب علموں کو غلط راستوں پر چلا رہا ہو..... اس کا کوئی دوست یا پھر کسی دوست کا باپ؟ ایسے معصوم صفت انسانوں کو اپنے مقاصد کے لیے غلط راستوں پر چلانا کچھ اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ یکدم میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کے کمرے میں حد سے زیادہ مذہبی کتب..... کہیں وہ کسی مذہبی تنظیم کا آلہ کار نہ بن گیا ہو۔ جو کچھ بھی تھا ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے کمرے میں ریوالور کی موجودگی مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”یا اللہ! وہ کوئی جرم نہ کر بیٹھا ہو.....“ میں نے بہ آواز بلند سوچا۔ ”اور اگر ایسا کچھ ہوا تو ہم کسی کو کیا منہ دکھائیں گے؟“

جرم کی راہ پر خار مگر پرکشش ہوتی ہے، اس میں تمام راستے، پگڈنڈیاں اور شاہراہیں، آگے ہی آگے جاتے ہیں۔ واپسی کی راہیں مسدود..... مجرم خود تو قانون کی بلی سے چوہے کی طرح بھاگتا ہے، اور زیر زمین ٹھکانے کرتا ہے، مگر اپنے پیاروں کو دور، اکیلا تنہا چھوڑ دیتا ہے، زندہ درگور کر دیتا ہے۔ جرم کی سڑک آگے ہی آگے چلتی ہے، کوئی یوٹرن نہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تیمور اور امی جان مجھے قصور وار سمجھیں کہ میں نے غفلت کی ہے اور اس پر نظر نہیں رکھی۔ مجھے اس گھر میں بڑا کہا اور سمجھا جاتا ہے تو کیا میں نے اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نہیں نبھائی؟ اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو اپنے کمرے میں بیٹھی رہی، سامنے میز پر کچھ فائلیں دھری تھیں، میں نے فوراً اس میں سے ایک فائل اٹھائی اور بظاہر انہماک سے فائل دیکھنے لگی۔ لاؤنچ میں امی جان کی آواز آئی۔ وہ ملازمہ سے میری طبیعت کی بابت پوچھ رہی تھیں پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور امی جان نے اندر آ کر مجھے کام میں مصروف دیکھ کر پیار سے ڈانٹا۔ میں نے فائل بند کر کے رکھ دی۔

”مجھے کام کرنے سے گھر میں رو نہیں رہا، اس بلکہ فارغ رہنے سے ہوتا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”فارغ تم کون سے دن بیٹھی ہو؟“ انہوں نے مجھے پیار سے مسکرا کر دیکھا۔

”کیسا رہا آپ کا دورہ؟“ میں نے موضوع بدلا۔

”بہت اچھا.....“ امی جان نے بتایا۔ ”اور ہاں نگہت کے بیٹے کا نام انہوں نے عبداللہ رکھا ہے۔“ امی جان نے بتایا۔

”بہت پیارا نام ہے اللہ مبارک کرے۔“ میں نے دل سے دعا دی، میری بات بمشکل ختم ہی ہوئی تھی کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ دروازے کے وسط میں مظہر کھڑا تھا، چہرے پر طیش کے تاثرات تھے۔

”کیا ہوا چھوٹو؟ تم تو بالکل تیز بھول گئے ہو، دروازے پر دستک تک نہیں دی.....“ امی جان نے بھی غصے سے اس سے کہا۔

”بھابی! آپ میرے کمرے میں گئی تھیں؟“ اس نے امی جان کی بات کو نظر انداز کر کے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔ گھبراہٹ میں میرے ہاتھ سے فائل نیچے گر گئی۔ میرا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔

”کیا قیامت آگئی ہے اگر وہ تمہارے کمرے میں چلی بھی گئی ہوگی تو؟“ امی جان نے پھر مداخلت کی۔

”آپ چپ رہیں امی!“ اس نے عجیب بدتمیز لہجے میں کہا۔ میں بری طرح خوف زدہ ہو گئی اور یوں لگا جیسے اپنی سیٹ پر جڑ گئی ہوں۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ وہ میرے بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔ مجھے یکدم وہم آیا جیسے اس کے پاس ریوالور ہو۔ میں نے اپنے خشک ہوتے ہوئے گلے سے کوئی آواز نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

”میرے کمرے میں گئی تھیں آپ! کیوں گئی تھیں؟“ وہ بلند آواز سے دھاڑا اور میرے اٹھتے اٹھتے اور روکتے روکتے اچانک امی جان نے اٹھ کر اس کے منہ پر دائیں بائیں سے تھپڑوں کی برسات کر دی۔ وہ پھر بھی ڈھٹائی سے کھڑا مجھے غصے سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا کر رہی ہیں آپ امی جان؟“ میں نے یکدم درمیان میں آ کر امی جان کا تیزی سے چلتا ہوا ہاتھ روک دیا۔ نادانستگی میں، میں منظر کے بالکل قریب کھڑی تھی۔

”جواب نہیں دیا آپ نے میری بات کا؟“ اس نے نظریں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔  
”میں تمہارے کمرے میں بھلا کیوں جاتی؟ کس نے کہا تم سے کہ میں تمہارے کمرے میں گئی ہوں؟ پہلے گئی ہوں کبھی جواب جاؤں گی؟“ میں نے دل کڑا کر کے جھوٹ بولا۔

”میرے کمرے کے اندر آپ کی مخصوص خوشبو نے.....“ اس کے الفاظ نے مجھے اس بات کا یقین دلادیا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔

”تمہارے کمرے کا دروازہ کھلا تھا، صرف میں نے اسے بند کر دیا کہ کہیں ملازمہ میری لاعلمی میں اندر نہ چلی جائے اور تمہاری کوئی شے غائب نہ ہو جائے، کوئی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز۔“ میں نے صفائی دی۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا سیرا تھا۔

”میرے پاس جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ میں نے قدرے خشکی سے کہا۔

”آئی ایم سوری بھابی!“ اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے اور اس کی آنکھیں پانیوں میں ڈوب رہی تھیں۔ پہلی دفعہ امی جان نے میرے سامنے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ شاید کبھی بہت بچپن میں اسے مارا پیٹا ہو مگر جب سے میں آئی تھی میں نے اس کا بہت معصوم روپ دیکھا تھا۔ مجھے ابھی بھی اس پر بہت ترس آیا، میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”مجھ سے نہیں امی جان سے معافی مانگو۔“ میری بات سن کر وہ امی جان کی طرف مڑا۔ انہوں نے ناراضگی کے اظہار کے لیے رخ پھیر لیا۔

”مجھے معاف کر دیں امی! میری پہلی بدتمیزی سمجھ کر مجھے معاف کر دیں۔ میری ماں، میری جنت! مجھ سے منہ نہ پھیریں۔“ وہ ہلکے ہلکے کرجوں کی طرح رو رہا تھا۔ میرا دل بھی پگھلنے لگا مگر امی جان کی ناراضگی بدستور تھی۔ میں نے بھی ان سے سفارش کی کہ بچہ ہے اسے معاف کر دیں۔ اس پر انہوں نے اسے ساتھ لگایا اور رونے لگیں۔

”تمہارے باپ کے مرنے کے بعد غالب نے کبھی تمہیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور جب سے وہ ہمیں چھوڑ کر گیا ہے اس دن سے ماہانے نہ صرف حالات کا مقابلہ مردانہ دار کیا ہے

بلکہ ایک باپ ہی کی طرح اپنی ذمے داریاں بھی سنبھالی ہیں۔ ارے کم بختو! تم تو اس کے احسانوں کا بدلہ بھی نہیں چکا سکتے....“ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ میں نے منظر کو ان سے علیحدہ کیا اور انہیں سنبھالا دیا۔ مظہران کے لیے ایک گلاس میں جوس ڈال کر لے آیا۔ ”میں تو سوچتی تھی کہ میرے مرنے کے بعد بھی ماہا کا مرتبہ اس گھر میں سربراہ کا رہے گا مگر مجھے اپنی زندگی میں ہی یہ دن دیکھنا تھا کہ تم اتنی گستاخی کرو گے اس کے ساتھ۔“ امی جان نے روتے ہوئے کہا۔

”کہاناں معاف کر دیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا!“ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر امی جان کے ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

”چلو اٹھو مظہر! منہ ہاتھ دھو لو، کھانا تیار ہو گیا ہوگا۔ اپنا کمرہ اگر صاف کروانا ہے تو ملازمہ سے کہہ دو کر دے گی۔“ میں نے بات بدلی تاکہ ماحول بدلے۔

”ٹھیک ہی ہے کمرہ بھابی! ضرورت نہیں ہے صفائی کی۔“ مظہر نے مختصراً کہا۔

کھانا کھانے کے دوران بھی ماحول بوجھل سا ہی تھا۔ میں بھی اس میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ لاسکی۔ بظاہر تو میں نے مظہر کا دفاع کر لیا تھا لیکن اندر سے میرا دل بہت خوفزدہ تھا۔ کھانا کھا کر مظہر ٹی وی پر اسپورٹس کا کوئی چینل لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور اپنے کمرے میں لے آئی، چائے پی کر نماز پڑھی اور پھر تینچ لے کر لیٹ گئی۔ تینچ تو خیر کیا پڑھتی ذہن کی رو بھٹک کر اس طرف چلی گئی کہ اگر میں مظہر سے کہہ دیتی کہ میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی تو وہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتا؟ عجیب تصورات اور خوف سے مجھے پھریری آ گئی۔ میں نے یہی سوچا کہ اب کے تیمور آئے گا تو میں اسے صورت حال سے آگاہ کروں گی۔ رات نیند بھی ڈسڑب رہی اور عجیب و غریب خوابوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

”تو یہ تھی میری وقعت اور اوقات؟“ صبح ہاتھ روم میں آئینے کے سامنے اپنی سوچی ہوئی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میں نے خود سے سوال کیا۔ میں جواب بھی بائیس برس کی بھی نہ ہوئی تھی، کیوں میں نے خود پر بنجیدگی کا یہ خول چڑھا لیا تھا اور کیوں میں نے زندگی کی سب خوشیاں خود پر حرام کر لی تھیں۔ اس لیے کہ غالب نے اتنے کم عرصے میں مجھے وہ مان اور پیار دیا تھا کہ میں اس گھر کے ساتھ ایک خوبصورت رشتے کی زنجیر میں بندھ گئی۔ ایک دستک ہوتی رہی اور میں نے ان دستکوں کے جواب میں دل کے دروازوں پر انکار کے قفل لگا رکھے تھے اور کیا یہ صلہ تھا کہ اب مجھے

یہاں زندگی خوف کے سائے میں گزارنا ہوگی۔

”لیکن میں یہاں رہنے کی پابند تو نہ تھی۔“ ناشاز ہر مار کرتے ہوئے میں نے سوچا۔ ”کون“  
 سا مجھے کوئی مجبوری ہے کہ یہیں رہوں..... میں چاہوں تو والدہ کے گھر جاسکتی ہوں..... میرا خیال  
 ہے کہ یہی بہتر ہوگا۔ ”میں گویا دل ہی دل میں کیسے فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

”کیا بات ہے ماہا! تم کچھ پریشان ہو؟“ امی جان ناشتے کی میز پر میرے سامنے بیٹھی ہوئی  
 تھیں اور ان کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”نہیں تو!“ میں یکدم ہٹپٹا گئی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

”مجھے معلوم ہے بیٹا! تم منظر کے رویے سے پریشان ہوگی۔ تم نے خود ہی اس کو سر جڑھا رکھا  
 ہے۔ میں تو اس کے سر سے گستاخی کا بھوت اتار دیتی اگر تم درمیان میں نہ آ جاتیں تو۔“ انہوں نے  
 شرمندگی سے کہا۔

”ارے نہیں امی جان! میں اس کے رویے سے پریشان تو نہیں لیکن اس کے بارے میں  
 سوچتی ضرور رہی کیونکہ اس نے کبھی گستاخی کی نہیں پھر جوان اولاد پر ہاتھ اٹھانا بھی تو مسئلے کا حل  
 نہیں..... آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ بعد میں کیسے شرمندہ تھا اگر آپ اس کو مزید مارتیں تو ہو سکتا  
 ہے کہ وہ باغی ہو جاتا..... کہیں غصے میں آ کر گھر ہی چھوڑ جاتا تو۔“ میں نے ممکنہ صورتِ حال کا  
 نقشہ امی جان کے سامنے پیش کیا۔

”اگر وہ گھر چھوڑ جاتا ہے اس بات پر تو مجھے دکھ نہیں ہوگا۔ ماں ہوں، کمی تو ہوگی لیکن اگر وہ  
 تمہارے ساتھ گستاخی کرے اور تمہارے سارے احسانات بھول جائے تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔“  
 امی جان نے کہا تو میری آنکھیں جھلک آئیں۔

”اللہ نہ کرے امی جان کہ وہ کبھی بھی گھر چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچے۔“ میں نے  
 ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”اب ہم کسی کے جانے کا دکھ برداشت نہ کر پائیں گے۔“

”میں تو داد دیتی ہوں بیٹی تمہارے حوصلے کی اور آفرین ہے تمہاری ماں کی تربیت پر کہ جس  
 نے بیٹی کی ایسی تربیت کی ہے، ایسا تندہ، ٹھہراؤ، برداشت اور فہم تو بسا اوقات میری عمر کی عورتوں  
 میں بھی نہیں ہوتا۔ تمہارے لیے دعا مانگتے وقت بھی میرے ذہن میں تمہارا تصور، بہو کی حیثیت سے  
 نہیں آتا۔“ امی جان نے کہا۔

اس لیے امی جان کہ میں آپ کی بیٹی ہوں، بہنیں۔“ میں مسکرا کر کہا۔

”اللہ تمہاری آزمائشیں ختم کرے تمہارے لیے آسانیاں فرمائے، آمین!“ امی جان نے کہا۔

منظر کے کالج کی ہفتے میں دو تعطیلات ہوتی تھیں۔ تو اور کو تو ہمارا دفتر بھی بند ہوتا تھا اس لیے  
 میں نے اسے کہا تھا کہ وہ ہفتے کے روز میرے ساتھ دفتر جایا کرے اور پھر آہستہ آہستہ وہ ہفتے کے  
 روز اکیلا ہی دفتر جایا کرے گا۔ اس نے پس و پیش کی کہ ہفتے کے روز پڑھائی کی مصروفیات ہوتی  
 ہیں، دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھائی کرنا ہوتی ہے لیکن میں نے اصرار کیا تو وہ مان گیا میں نوٹ  
 کر رہی تھی کہ ہفتے کے دن وہ ناشتا کر کے غائب ہوتا تھا اور رات دیر دیر سے گھر آتا تھا۔ بسا  
 اوقات تو ہمیں علم ہی نہ ہو پاتا تھا کہ وہ رات کو لوٹا یا صبح کو۔ امی جان تو نیند کی دوا لے کر سوتی تھیں  
 اور میں بھی کبھی ایسے گہری نیند میں ہوتی تھی کہ اس کے آنے کا علم ہی نہ ہو پاتا تھا۔ اس مسئلے سے  
 نمٹنے کے لیے یہ حل میرے ناچیز ذہن نے خود ہی سوچا اور خود ہی میں نے امی جان کے سامنے  
 بات چھیڑی۔ ان کا وٹ بھی میرے حق میں تھا اس لیے اسے ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی۔

میرے ساتھ وہ پہلے دن جب دفتر گیا تو دوپہر کے بعد بوریت سے جمائیاں لینے لگا۔

”آپ ویسے کیا چیز ہیں بھابی! سچ آپ تو بور بھی نہیں ہوتیں۔ پتا نہیں کس مٹی سے بنی ہیں  
 آپ؟“ منظر نے برملا اپنی بوریت کا اظہار کیا۔

”تم ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہو کہ میں ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی ہوں۔“ میں نے  
 مصنوعی خشکی سے کہا۔

”اللہ نہ کرے کہ میں آپ سے ایسی گستاخی کروں!“ وہ یکدم بولا۔

”جیسے اس سے قبل تو تم نے کبھی مجھ سے گستاخی کی ہی نہ ہو۔“ میں نے نظریں پھیریں۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا؟“ اس نے شکوہ کنائے نظروں سے دیکھا۔

”نہیں، معاف تو کر دیا تھا، یونہی بات منہ سے پھسل گئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس کے سوال میں بے یقینی تھی۔

بالکل سچ کہہ رہی ہوں ”میں نے کہا“ کبھی جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے؟“

”شاید!!“ اس نے شاید سادگی سے یہ لفظ کہا مگر میرے من کا چور تو گویا مجھ سے ہی کچھ

پوچھنے لگا۔ میں نے بڑی ہمت کر کے ہنسنے کی کوشش کی اور وہ بھی ہنس پڑا۔ دروازے پر دستک

ہوئی، میں نے اجازت دی تو نوید صاحب داخل ہوئے۔

”مغل ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”ارے نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں۔“ مظہر نے کہا۔ ”بھابی کے لطیفے پر ہنس رہا تھا۔“

”آپ پلیز مجھے سرنہ کہیں، سر تو مجھے آپ کو کہنا چاہیے۔“ نوید صاحب نے مظہر سے کہا۔

”ویسے تو میں آپ کو بھائی جان کا دوست ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بھائی جان ہی کہتا رہا ہوں اور دفتر سے باہر اب بھی کہتا رہوں گا مگر دفتری آداب کے مطابق آپ سینئر ہیں اس لیے مجھے آپ کو سر کہنا ہوگا۔“ مظہر نے ریکارڈ درست کیا۔

”آپ اس کاروبار کے مالک ہیں اور میں تنخواہ دار ملازم۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”کاروبار کی مالک بھابی ہیں، انہیں آپ میڈم کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ البتہ مجھے آپ سر کہہ

کر شرمندہ مت کریں۔“ مظہر نے کہا۔

”میں کاروبار کی مالک نہیں ہوں مظہر!“ میں نے مداخلت کی۔ ”اس کاروبار کے مالک تم

اور تیمور ہو، میں اس کی عارضی نگران ہوں اور میرے پاس یہ ایک امانت ہے۔ نوید صاحب جانتے

ہیں کہ کس طرح میں نے حساب کتاب کو سیدھا اور شفاف رکھا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”چلیں جب آپ کہیں جائیں گی تو تب دیکھا جائے گا۔ جب تک آپ ہماری بھابی کی

حیثیت سے کاروبار سنبھال رہی ہیں، آپ اس کی اسی طرح مالک ہیں جیسے میں اور تیمور

بھائی۔“ مظہر نے زور دے کر کہا۔

”میں چلتا ہوں!“ نوید صاحب نے اجازت چاہی۔

”سوری، میں تو پوچھنا بھول گئی آپ کیوں آئے تھے؟“ میں نے شرمندگی سے کہا۔

”آپ سے کچھ کام تھا بعد میں بات کر لوں گا۔“ نوید صاحب کہا۔

”ارے نہیں کل پھر اتوار ہے۔“ اور یوں بھی ابھی تھوڑی دیر میں، میں اٹھ کر گھر جانے ہی

والی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بات کریں۔“

”اصل میں مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنا تھی۔“ نوید صاحب نے جھجک کر کہا اور اس

بات پر مظہر نے چونک کر مجھے دیکھا، میں نے اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں یکدم مجھے غصے کا

رنگ نظر آیا۔

”ایسی کیا بات ہے جو مظہر کے سامنے نہیں ہو سکتی ہے؟“ میں نے نوید صاحب سے پوچھا۔

”میرے کسی ذاتی معاملے پر بات ہے۔“ نوید صاحب نے مختصراً کہا۔

”میں باہر چلا جاتا ہوں!“ مظہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے چہرے پر لہراتے ہوئے

سائے کچھ خوش آئند نہ لگ رہے تھے۔ میں دل میں خوفزدہ ہو گئی کہ جانے اس بات کو کیا رنگ دے بیٹھے۔

”نوید صاحب آپ کے رشتے والے معاملے کی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ مظہر کے سامنے کرنے میں کوئی حرج نہیں!“ میں نے بات سمجھ کر کہا۔

”بات تو وہی ہے۔“ نوید صاحب نے کہا۔ ”میری بڑی بہن ہما آپ سے اس سلسلے میں

بات کرنا چاہ رہی تھیں اگر آپ اجازت دیں تو آپ کا نمبر دے دوں؟“

”ہاں ہاں! کیوں نہیں، لگتا ہے کہ وہ لڑکی دیکھ آئی ہیں جا کر؟“ میں نے جان بوجھ کر بات

اس طرح کی کہ مظہر کو سمجھ آ جائے۔

”جی ہاں! میری بہنیں گئی تھیں۔ وہ لوگ..... مجھے لگتا ہے کہ مطمئن نہیں ہوں۔“ نوید

صاحب نے کہا۔

”چلیں آپ انہیں بتا دیں کہ وہ مجھ سے بات کر لیں۔“ میں نے کہا تو نوید صاحب شکریہ ادا

کرتے ہوئے چلے گئے۔

”یہ آپ نے رشتے کروانے کا کام کب سے شروع کر دیا ہے بھابی؟ مظہر نے طنز سے

پوچھا۔ میں نے جواب میں خاموشی رکھی۔ واپسی پر گاڑی مظہر چلا رہا تھا اور دیر سے خاموشی تھی۔

”کہاں کروا رہی ہیں آپ نوید صاحب کا رشتہ؟“ مظہر نے پوچھا۔

”ہمارے ایک جاننے والے ہیں.....“ میں نے مختصراً کہا ”بلکہ میری دوست ہی سمجھ لو۔“

”کون لوگ ہیں یہی تو پوچھ رہا ہوں؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”تم تو یوں جرح کر رہے ہو جیسے تم میری سب دوستوں اور کلاس فیلوز کو جانتے ہو.....“ میں

نے چڑک کر کہا۔

”سوری! آپ کو برا لگا۔ اصل میں مجھے آپ کے انداز سے لگا کہ نوید بھائی کو آپ سے کچھ اور

بات کرنا تھی لیکن میری موجودگی کی وجہ سے آپ بات بدل گئیں“ اس نے کہا تو مجھے بہت عجیب لگا۔

”جی کیوں نہیں فرمائیے!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”ماہا! آپ جانتی ہیں ہمارے بھائی نے ساری زندگی مصائب کا سامنا کرتے اور اپنے فرائض سے عہدہ بردار ہونے میں گزاردی۔ اب ہمارے اصرار پر وہ بمشکل شادی کے لیے مانے اور آپ سے ساتھ کی خواہش کی۔“ وہ سانس لینے کو رکیں، میں ہمہ تن گوش تھی۔ ”جب آپ کی شادی غالب بھائی سے ہوئی تھی تب سے آپ نوید بھائی کو پسند آئی تھیں اور انہوں نے ہم سے ہمیشہ آپ کی بہت تعریف کی۔“

”لیکن مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں کبھی ان سے ملی بھی ہوں گی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”غالب بھائی کی زبانی آپ کی تعریفیں سن کر ان کے ذہن میں ایک اچھی بیوی کا تصور بن گیا تھا اور پھر جس طریقے سے غالب بھائی کی وفات کے بعد آپ نے ان کے گھر کو سنبھالا دیا، جس ذمے داری سے کاروبار سنبھالا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور نوید بھائی کو آپ کا یہی احساس ذمے داری اچھا لگتا ہے۔ اتنی کم عمری میں اتنی بالغ نظری آج کل ناپید ہے۔“ انہوں نے تفصیل بیان کی۔

”آپ نے مجھ سے زارا کے سلسلے میں بات کرنا تھی؟“ میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔

”میں اسی بات کی طرف آرہی ہوں، آپ بات کا رخ بدل رہی ہیں۔“ انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ”آپ کے تجویز کردہ رشتے کو ہم دیکھنے گئے تھے ماہا! مجھے وہ حیرت ہے کہ آپ نے ہمیں کیا سوچ کر وہاں بھیج دیا؟“ میں ان کی اس بات پر بہت حیران ہوئی مگر امی جان کی موجودگی کی وجہ سے کھل کر بات نہ کر سکتی تھی۔

”کیوں، کیا ہوا؟“ میں نے صرف اتنا کہا۔

”اس غریب بستی میں دو کمروں کے اس مکان میں آپ نے ہمیں بھیج کر ہمیں کیا جتلیا ہے، کیا ہمارے بھائی کی یہی اوقات رہ گئی ہے۔ ہم کوئی اتنے گرے پڑے تو نہیں ہیں ماہا اور آپ چلی ہیں ٹاٹ کا پیوند لگانے۔ ٹھیک ہے آپ کو ہمارا بھائی ناپسند سہی لیکن اس کو زارا سے شادی پر مجبور کر کے آپ کس چیز کا انتقام لینا چاہتی ہیں۔ آپ نے نوید بھائی کو دھکا کر دیا ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے.....؟“ وہ کافی چراغ پا لگ رہی تھیں میں کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”مظہر تمہیں مجھ پر کچھ زیادہ ہی شک نہیں ہو رہا؟ ہر بات کو تم جھوٹ سمجھتے ہو۔ جانے ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ تم مجھ سے بدگمان سے رہتے ہو۔ لگتا ہے اب تم بہت بڑے اور سمجھدار ہو گئے ہو اور تمہیں شک ہو گیا ہے کہ میں اب تک جو کرتی آئی ہوں وہ سب غلط تھا۔“ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

”بجدا ایسی کوئی بات نہیں.....“ اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”اصل میں یونہی مجھے لگا کہ نوید بھائی آپ سے اپنے اور آپ کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے، کیونکہ وہ بھی تو کوئی سلسلہ چل رہا تھا۔“ مظہر نے جملہ مکمل کیا تو میں اس کی معلومات پر حیران رہ گئی۔

”تمہیں غالباً اس سلسلے کا تو علم ہوا ہوگا مگر یہ علم نہیں ہوا ہوگا کہ وہ سلسلہ اپنے انجام تک پہنچ چکا ہے اور میں نے اس تجویز کو رد کر دیا تھا۔“ میں نے خفگی بھرے لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے لب بھینچ لیے۔

”پھر ایسی کیا وجہ ہے کہ جو چیز یا شخص آپ کو اپنے لیے پسند نہیں آیا وہ اپنی دوست کے لیے تجویز کر دیا آپ نے؟“ مظہر نے چبھتا ہوا سوال کیا۔ ”حدیث شریف میں بھی ہے کہ دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو تمہیں اپنے لیے پسند ہو۔“

”نوید صاحب میں ایسی کوئی خرابی نہیں جو کہ میرے انکار کا باعث بنی ہو۔ بس میرا دل ہی نہیں مانا ورنہ نوید صاحب بہت اچھے انسان ہیں اسی لیے میں نے اپنی دوست کے لیے ان کا سوچا۔“ میں نے کہا۔

”ویسے آپ نے اچھا کیا جو آپ نے نوید صاحب سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کو گھر چھوڑ کر جانا پڑتا۔“ مظہر نے کہا۔ ”لیکن بہتر ہوتا اگر آپ تیمور بھائی کے لیے ہاں کر دیتیں۔“

”تم خاموشی سے گاڑی چلاؤ مظہر۔“ میں نے بات ختم کی۔

شام کو نوید صاحب کی بہن ہما کی کال آئی، میں ٹی وی روم میں ہی بیٹھی تھی، امی جان بھی پاس ہی تھیں۔ میں نے ہی فون اٹھایا تھا، سلام دعا کے تبادلے کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ”آپ سے کچھ پوچھنا تھا اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو پوچھوں؟“

”دیکھیے ہاباجی! میں پھر کسی وقت آپ کو کال کر لوں گی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“ میں نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”ماہا! میں نے زندگی کو آپ سے زیادہ دیکھا اور برتا ہے اور جانتی ہوں کہ غریب گھرانوں کی لڑکیاں جب خوشحال گھرانوں میں بیاہی جاتی ہیں تو ان کے اندر کی بھوک جاگ اٹھتی ہے۔ ان میں قناعت ختم ہو جاتی ہے۔ جس ماحول سے وہ آتی ہیں وہ ماحول نادیہ جہیز کی طرح ان کے ساتھ آتا ہے۔ وہ شاید ہمارے بھائی کو وہ خوشیاں نہ دے سکے جو اس کا حق ہیں۔“ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ امی جان سمجھ گئی تھیں کہ میں ان کی موجودگی میں کھل کر بات نہیں کر پارہی ہوں، اس لیے انہوں نے آرام کا بہانہ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہاباجی! وہ بہت اچھی، سمجھدار اور سلجھی ہوئی لڑکیاں ہیں۔“ میں نے رمان سے کہا۔

”لیکن زارا طلاق شدہ ہے....“ انہوں نے ہچکچا کر کہا۔

”پھر تو میں بھی بیوہ ہوں!“ یکدم میرے منہ سے پھسل گیا۔

”بیوہ ہونے میں عورت کا اپنا قصور نہیں ہوتا، جب کہ طلاق کی صورت میں یہ خیال تو بہر حال ذہن میں رہتا ہے کہ اس میں عورت کا کوئی قصور ہوگا۔ اب بغیر رخصتی کے طلاق کوئی بلاوجہ تو نہیں ہو جاتی ناں، کوئی تو وجہ رہی ہوگی؟“ ہاباجی نے اپنے خدشے کو زبانی دے دی۔

”درست کہہ رہی ہیں آپ، وجہ تو ہے اور میں وجہ جانتی بھی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا کیا وجہ ہے؟“ انہوں نے تجسس سے پوچھا۔

”سوئے اتفاق اس کی طلاق کی وجہ اور آپ کے اس رشتے کو ناپسندیدگی کی وجہ ایک ہی ہے یعنی غربت۔“ میں نے دکھ سے کہا۔ ”ہمارے ہاں المیہ تو یہ ہے کہ عورت کے لیے گڑھے کھودتی ہے، وہی اس کو قابلِ تذلیل بناتی ہے اور وہی قابلِ توقیر....“

”جذبائی باتیں کرنے کے بجائے آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ اپنے بھائی کی بارات اس گھر میں لے کر جائیں گی، جہاں آپ ہمیں اپنے بھائی کی بارات لے جانے کا کہہ رہی ہیں؟“ ہاباجی نے پوچھا۔

”بے شک! کیوں نہیں، ہاباجی آپ کو غالباً نوید صاحب نے پوری بات بتائی نہیں۔ میں

نے اپنی والدہ سے کہا ہے کہ وہ دوسرے نمبر والی ٹائیپ کے لیے علی بھائی کا رشتہ بھیجیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”خود آپ نے زارا کا رشتہ کیوں نہیں مانگ لیا؟ کیونکہ آپ کی والدہ کو کیا آپ کے بھائی کو وہ طلاق شدہ لڑکی پسند نہ آتی؟“ انہوں نے طنز سے مجھ سے پوچھا۔

”سیدھی سی بات ہے ہاباجی! نوید صاحب بڑے ہیں عمر میں علی بھائی سے، صرف یہ سوچ کر میں نے یہ بات کہی تھی ورنہ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ میں مجبور تو کر ہی نہیں رہی نہ آپ کو نہ نوید صاحب کو۔“ میں نے ان کو وضاحت کی۔

”ہمارے بھائی کے لیے آپ کی بات کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو جانا چاہیے کہ نہ انہوں نے خود ساتھ جانے کی حامی بھری اور نہ ہی لڑکی کی تصویر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہتے ہیں جو آپ ان کے لیے مناسب سمجھ رہی ہیں، وہ ضرور مناسب ہوگا۔“ ہاباجی کے لہجے میں غالباً حسد تھا۔

”یہ نوید صاحب کا بڑا پرن ہے انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ یقین کریں میں نے بھی خلوص نیت سے ان کے لیے وہی بہتر سمجھا جو میں اپنے بھائی کے لیے سمجھ رہی ہوں اور اگر آپ زیادہ ملیں جلیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ زارا بالکل ویسی ہی لڑکی ہے جیسی لڑکی کی نوید صاحب کو ضرورت ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”خدا کرے کہ آپ کا اندازہ صحیح ہو مگر میرا تجربہ بھی بالکل غلط نہیں ہو سکتا۔ ایسی لڑکیاں جب پرہیزگار نکالتی ہیں تو پھر ہم جیسے پناہ مانگتے رہ جاتے ہیں۔ ویسے آپ کو ان لڑکیوں سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“ ہاباجی نے پوچھا۔

”مجھے اچھی لگیں وہ بچیاں، ان کا سلیقہ اور شرافت، اس گھرانے کی مشکلات کی وجہ سے سوچا کہ شاید مجھے اللہ نے ان کے لیے بہتری کا وسیلہ بنایا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”کون کون کیا تھا؟“

”میں تھی، فوزیہ میری بہن اور ہماری بڑی پھوپھو۔“ انہوں نے بتایا۔

”آپ نے زارا کی والدہ سے اس سلسلے میں کوئی بات کی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں ہم اچانک ہی گئے تھے۔ انہیں غالباً ہمارے یوں جانے سے شک تو پڑا ہوگا مگر پھوپھو کا کہنا تھا کہ کوئی بات نہ کی جائے۔ البتہ ہم چائے وغیرہ پی کر تھوڑی دیر بیٹھ کر آ گئے۔“



انہوں نے بتایا۔

”تو اس کا مطلب ہے آپ کو زارا پسند نہیں آئی؟“ میں نے پوچھا۔

بچیاں اچھی ہیں، والدہ بھی اچھی ہیں اور گھر بھی صاف سٹرا تھا، جس طرح ہم اچانک اٹھ کر چلے گئے تھے، بغیر بتائے۔ زارا اخبار پڑھ رہی تھی، ٹائیٹل پر کوئی کام کر رہی تھی، شامین دھوری تھی اور ان کی والدہ چائے بنا رہی تھیں۔“ انہوں نے سب کی حالت کا بتایا تو میری آنکھوں کے سامنے گھر کا نقشہ ساکھنچ گیا۔

”مظہر علی سے ملاقات نہیں ہوئی آپ کی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ گھر پر نہیں تھا، البتہ ہماری چائے کے دوران وہ بھی آ گیا تھا۔“ انہوں نے بتایا۔ ”پھوپھو کو البتہ ایک بات اچھی لگی کہ ہمیں چائے دی گئی تو ویسی ہی چائے باہر ڈرائیور کو بھی بھجوائی اور زارا کی والدہ نے یہ بھی معذرت کی کہ ان کے گھر میں ڈرائیور کو بٹھانے کی جگہ نہیں تھی۔“

”چلیں آپ کی پھوپھو کو کچھ تو پسند آیا ناں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آپ پلیر میری طرف سے خود کو مجبور نہ سمجھیں اور نہ ہی نوید صاحب، خود ہی دیکھ بھال کر اور آپس میں مشورہ کر کے جو مناسب سمجھیں وہ فیصلہ کریں۔ ہو سکے تو استخارہ کر لیں۔ میری والدہ صاحبہ تو ہمیشہ ایسے مواقع پر استخارہ کرتی ہیں۔“

”بہت شکریہ ہم ایسا ہی کریں گے۔“ ہاباجی نے کہا۔ ”ویسے ماہا کوئی گنجائش نہیں آپ کے دل میں ہمارے بھائی کے لیے؟ آپ ہماری عرضی پر غور تو کریں۔“

”پلیر ہاباجی! یہ باب بند ہو چکا، اسے بند ہی رہنے دیں۔“ میں نے التجائی انداز میں کہا۔

فون کا ختم ہوئی تو میں امی جان کے کمرے میں گئی، وہ صوفے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ اسی لیے اٹھ کر آئی تھیں کہ میں کھل کر فون پر بات کر لوں۔ جانے وہ کیا سوچیں یا کیا سمجھیں یہی سوچ کر میں ان کے پاس آئی اور انہیں ساری بات کھل کر بتادی۔ صفدر علی، مظہر علی سے لے کر جو میں نے نوید صاحب کو رشتہ تجویز کیا تھا اور اپنی والدہ صاحبہ کو بھی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ میں نے زارا، ٹائیٹل اور شا کے سلیقے کی بھی بہت تعریف کی۔ امی جان نے میری سوچ کو بہت سراہا اور دعا کی کہ اللہ ان بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔

”اور امی جان!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”شامین بھی بہت پیاری بچی ہے، اسے ہم اپنے چھوٹو

کے لیے لے لیں گے۔“ اور اس بات پر ہم دونوں خوب کھل کر ہنسے۔

میں دفتر کے کام میں مصروف تھی کہ چہرہ اس نے صدف آپنی کے آنے کی اطلاع دی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ کبھی اس سے قبل وہ اس طرح دفتر میں نہیں آئی تھیں۔ میں نے انہیں اندر بلوایا، ان کے ہمراہ کوئی اور آدمی بھی تھا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور جوس منگوایا۔

”خیریت سے آئیں آپ صدف آپنی؟“ میں نے بالآخر دیر سے دل میں مچلتے سوال کو زبان دی۔

”خیریت ہی ہے.... یہ ہمارے اسپتال میں نئے ڈاکٹر آئے ہیں ڈاکٹر معظم، یو کے میں ہوتے ہیں اور اب ہر سال تین ماہ کے لیے پاکستان آیا کریں گے.... دل کے ڈاکٹر ہیں۔“ صدف آپنی نے تعارف کروایا۔ میری سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھی رہیں۔ ڈاکٹر معظم سے تعارف میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔

”اصل میں، سوچ رہی تھی کہ والدہ کو ڈاکٹر معظم سے چیک اپ کرواؤں اور اگر سرجری کی ضرورت ہو تو وہ بھی انہی سے کروائی جائے، چاہے پاکستان میں کروانی پڑے یا باہر لے جا کر۔“ صدف آپنی نے وضاحت کی لیکن اس پر بھی میری نظر کا سوال برقرار تھا۔

”تو میرے دفتر میں آنے کی کیا وجہ ہے؟“ میری حیرت کو زبان مل گئی۔

”معظم میرا جونیئر بھی ہوتا تھا اور میرے ایک جیٹھ کا بیٹا بھی ہے.... اس کی بیوی کا شادی کے تین سال کے بعد انتقال ہو گیا تھا، ایک بیٹی ہے وہ بھی اپنی ایک بے اولاد خالہ کے زیر پرورش ہے.... خرم (صدف آپنی کے شوہر) کا خیال ہے کہ تمہارا اور معظم کا....“ بالآخر صدف آپنی نے بلی تھیلے سے نکال دی۔

میرا چہرہ بالکل بے تاثر تھا اور ڈاکٹر معظم بڑے اشتیاق سے مجھے گھور رہا تھا۔ شاید وہ دیکھنا چاہ رہا ہوگا کہ اس بات پر میرے کان شرم سے لال اور چہرہ گلابی ہو جائے گا غالباً میں دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کر شرما کر میز پر ٹکا دوں گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

زندگی! اسے زندگی.... تو نے مجھ کو کیوں انوکھے انداز دے دیے ہیں! مجھے مصائب دیے

ہیں اور پھر ان کا سامنا کرنے کی ہمت بھی، مشکلات کا کوہ گراں ہے، اور اس لبادے کو اوڑھ کر میری نساویت کہیں میرے وجود کی قبر میں سو گئی ہے۔ دل کچھ کہتا ہے تو دماغ نفی کر دیتا ہے، دماغ سوچتا ہے تو دل نہیں کہتا ہے، اس کشمکش تن و من میں میری روح کی حالت کیسی ہو گئی ہے!

”بڑا بھونڈا سا طریقہ ہے یہ مجھے پروپوز کرنے کا اور بغیر جواب کے اتنے یقین سے یہ سوچ لینے کا کہ غالباً میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ میرا لہجہ نجابانہ کیوں تلخ ہو گیا اور ڈاکٹر معظم کے چہرے کا رنگ یکدم تبدیل ہو گیا۔

”زبردست! صدف آپ جیسا آپ نے بتایا تھا ہم نے ویسا ہی پایا، اور یہ انداز تو ہمیں اور بھی پسند آیا۔“ ڈاکٹر معظم شکل سے جتنا خود پرست لگ رہا تھا، باتوں میں اس سے بڑھ کر لگا۔

”معظم نے تمہیں خاندان کی شادیوں وغیرہ فلموں میں بھی دیکھ رکھا ہے اور اس کی والدہ یعنی رانی باجی نے بھی تمہیں اچھی طرح دیکھ رکھا ہے، تم جانتی نہیں ہو کیا انہیں؟“ صدف آپ نے معظم کی بات کی خفت مٹانے کے لیے صفائی پیش کی۔

”جی رانی باجی کو تو میں جانتی ہوں۔“ میں نے مختصراً کہا۔ رانی باجی بھی معظم کی والدہ تھیں اور بیٹے سے چار ہاتھ بڑھ کر تھیں، انہیں بھی ہر بات میں سے شروع کر کے میں پر ختم کرنے کا ضبط ہوتا تھا۔ جو پہنا ہوتا تھا اس کی قیمت سب کو بتانا ضروری سمجھتی تھیں۔ مجھے تو حیرت تھی کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس طرح کے ”اچھی“ عادات والے رشتے کو میرے لیے لانے کی صدف آپ کی کیا تک تھی۔

”آپ چائے لیں گی صدف آپ؟“ میں نے ان سے پوچھا اور ڈاکٹر معظم کو نظر انداز کر دیا۔

”نہیں، چلتے ہیں....“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”اصل میں مجھے بھی یہ طریقہ زیادہ مناسب نہیں لگا تھا مگر رانی باجی کا اصرار تھا اس لیے اتنے بھونڈے طریقے سے ملاقات کروانا پڑی۔ ظاہر ہے تمہاری سسرال میں تو ملاقات کے لیے آیا نہیں جاسکتا تھا۔ بات تو والدہ کے ذریعے سے ہی ہو گئی لیکن اس سے قبل مجھے تمہاری اور ڈاکٹر معظم کی ملاقات کروانا تھی۔“ میں خاموش رہی۔

”اور اس ملاقات نے آئندہ ملاقات کی طلب میں اضافہ کر دیا ہے۔“ ڈاکٹر معظم یوں گفتگو کر رہا تھا جیسے جنموں سے میرا عاشق رہا ہو۔ میں نے بمشکل خود کو اسے ”شٹ اپ“ کہنے سے روکا۔ مجھے ایسے چکپو اور لپچر قسم کے مردوں سے سخت چڑھتی۔ وہ لوگ اٹھ کر چلے بھی گئے لیکن میری کوفت میں کمی

نہیں ہو رہی تھی۔ جانے کیسے کیسے لوگ میرے جی کو جلانے آ جاتے ہیں۔ بڑی شدت سے میں انتظار کر رہی تھی کہ کہیں صدف آپ کی اکیلے میں ملیں تو ان سے بات کروں لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری تھا کہ والدہ صاحبہ سے بات کروں اور ان سے کہوں کہ مجھے ”ایسی چیزوں“ سے بچائیں۔

ماہ رخ لندن سے واپس آ گئی تھی اور خوب سرخ و سفید ہو کر آئی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ اس نے دو بچوں اور نگہت کو سنبھالنے کی ڈیوٹی کی ہوگی۔ اپنی آمد کے تیسرے روز وہ اتوار کے دن ہمارے ہاں آ گئی، میں کسلمندی سے دیر تک بستر پر پڑی رہی تھی اور اسی طرح تلکجے اور شکن زدہ لباس میں ہی ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھی جہاں امی جان سبزی چھیل رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا اور کچن سے دو کپ چائے بنالائی۔ ملازمہ کپڑوں کی دھلائی میں مصروف تھی۔ مظہر ابھی تک کمر بند کیے سو رہا تھا۔

میں نے ٹی وی پر خبریں لگائیں اور صوفے پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھ گئی، تبھی باہر کی گھنٹی بجی اور ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ ہم ملازمہ کے منتظر تھے کہ وہ آ کر بتائے کہ گھنٹی کس نے بجائی ہے مگر اس کے بجائے ماہ رخ مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ ہمیں تپاک سے ملی اور خیریت وغیرہ پوچھی۔ اس کے مقابلے میں تو میں اپنے حلیے سے اس وقت کوئی ملازمہ ہی لگ رہی تھی۔ چائے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا کہ کھانا کھائے گی اور شام تک یہیں رہے گی۔ میں نے اسے امی جان کے پاس باتیں کرتا ہوا چھوڑا اور آ کر اپنا کمر اسنوآرا پھر ایک ہلکے سے رنگ کا سوٹ نکالا اور شاور لینے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی۔ بیس، پچیس منٹ میں، میں کمرے سے نکلی تو وہ اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ امی جان کچن میں تھیں۔ میں نے امی جان کو کچن سے باہر نکالا اور ماہ رخ کو اپنے پاس ہی بلالیا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے تھے تب مظہر کچن میں داخل ہوا اور ناشتے کی فرمائش کی۔ ماہ رخ کو سلام کیا۔

”اب تو دوپہر کا کھانا تیار ہے مظہر!“ ماہ رخ نے حیرت سے کہا۔

”مگر میں تو ابھی جاگا ہوں اس لیے پہلے ناشتہ ہی کروں گا۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”اچھی دھونس ہے بھئی!“ ماہ رخ نے کندھے اچکائے۔ میں نے جلدی سے انڈا فرائی کیا، چار تو س سینکے اور کھن جیم کے ساتھ چھریاں کاٹنے رکھ کر ٹرے تیار کی اور مظہر کو دی تو وہ ٹرے لے کر ٹی وی روم میں امی جان کے پاس جا بیٹھا۔ ”یہ کیا تم نے عادتیں بگاڑ رکھی ہیں اس کی؟ میں تو

کبھی اس وقت جاگنے والے کو ناشانہ دوں۔“ ماہ رخ نے خفگی سے کہا۔

”ایک ہی تو دن ہوتا ہے ہفتے میں اس کی چھٹی کا۔ خیر ہے اگر دیر سے جاگتا ہے تو۔“ میں نے صفائی دی۔ میرے لیے تو مظہر بچہ ہی تھا اور میری اس کے ساتھ دوستی بھی تھی اور یوں بھی یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی۔

”امید ہے کہ تم نے تیمور کی عادتیں اس طرح نہیں بگاڑیں؟“ ماہ رخ نے مسکرا کر پوچھا۔ اس کی عادتیں بگاڑنے اور سنوارنے کا تو مجھے موقع ہی نہیں ملا، میرے آنے کے بعد جلدی ہی وہ اکیڈمی چلا گیا تھا۔ اس کی عادتوں کے بگاڑ اور سنوار کے لیے تمہیں بھرپور موقع فراہم ہوں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس کی اچھی بری عادتیں تو اب تک پختہ ہو چکی ہوں گی!“ ماہ رخ نے بھی ہنس کر کہا۔ ”خبردار جو تم نے میرے بھائی کی عادتوں کو برا کہا تو.....“ میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔ کھانا بھی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا پھر ماہ رخ نے ہم سب کو تحائف دیے۔ مظہر کے لیے وہ ایک خوبصورت جیکٹ لائی تھی، میرے لیے ہینڈ بیک اور امی جان کے لیے پرفیوم۔ ہم سب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”تیمور بھائی کے لیے کیا گفٹ لائی ہیں آپ؟“ مظہر نے مصومیت سے پوچھا تو وہ شرمائی۔ ”تمہیں کیوں تجسس ہے تیمور کے گفٹ کا؟“ وہ خود آئے گا تو اسے مل جائے گا۔“ میں نے مظہر سے کہا۔

”تم دونوں مت لڑو، میں کچھ بھی نہیں لائی۔“ ماہ رخ نے کہا۔ ”کیوں بھابی! یقین آ گیا آپ کو کہ تیمور برائی کے لیے کوئی گفٹ نہیں آیا ہوگا؟“ مظہر نے سوال کیا۔

”نہیں چھوٹو مجھے یقین نہیں آیا!“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”بھابی آپ نے مجھے پھر چھوٹو کہا۔“ مظہر نے ناراضی کی ایکٹنگ کی۔

لچ بریک میں، میں بیٹھی اپنا کوئی کام کر رہی تھی کہ نوید صاحب نے ملنے کی اجازت مانگی اور

چلے آئے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میڈم! میں نے ہمارا فوزیہ کو سمجھایا ہے اور وہ لگتا ہے کہ کچھ قائل ہو گئی ہیں، صرف چند ایک اعتراضات تھے۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”چند ایک اعتراضات؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یقین کریں کہ ان میں سے کوئی بھی اعتراض میری طرف سے نہیں ہے، بس عورتوں کی باتیں ہوتی ہی کچھ ایسی ہیں۔“ وہ بات کرتے ہوئے ہنسی بکچا رہے تھے۔ ”آپ وضاحت کریں گے تو ہی میں سمجھ سکوں گی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”اصل میں میری بہنوں اور اس سے زیادہ میری بڑی پھوپھی کو ان کے علاقے پر اعتراض ہے، اگر وہ کہیں اور گھر وغیرہ کرائے پر لے لیں یا خرید لیں تو۔“ وہ ادھوری بات کر کے خاموش ہو گئے۔ ”میں سمجھتی تھی کہ آپ کی شادی کے معاملے میں زیادہ وقعت آپ کی بات کی ہوگی مگر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے گھر کے معاملات میں بڑی پھوپھی کے فیصلوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور جو بات وہ سوچتی ہیں اور جس طریقے سے سوچتی ہیں، ظاہر ہے کہ اسے ہم تبدیل نہیں کر سکتے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”پھوپھی کی اہمیت ہمارے گھر میں واقعی زیادہ ہے کیونکہ والدین کے بعد انہوں نے ہمارے سر پر دستِ شفقت رکھا، میری ایک بہن کو اپنی بہو بنایا اور میری بہنوں کی شادیوں کے تمام معاملات انہوں نے ہی طے کیے.....“ نوید صاحب نے وضاحت کی۔

”سوری! آپ کو برا لگا، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ میرا مطلب تھا کہ پرانی اور نئی نسل کی سوچ میں فرق ہونا چاہیے ناں۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔

”میں نے اسی نظریے کے تحت انہیں قائل کیا ہے، لیکن ان کا یہ اعتراض بے جا نہیں کہ وہ لوگ اگر کسی اور علاقے میں.....“ نوید صاحب کی بات میں نے کاٹ دی۔

نوید صاحب آپ بھی جانتے ہیں کہ ان کے گھر میں ذریعہ آمدنی کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ میں چار پانچ دفعہ ان کے ہاں گئی ہوں مگر مجھے کبھی وہاں جا کر شرمندگی نہیں ہوئی۔“ میں نے ذرا خفگی سے کہا۔

”دوستی اور رشتے داری کے معاملات مختلف ہوتے ہیں، آپ دیکھ لیجئے گا کہ اگر آپ اپنی

والدہ کو وہاں لے کر جائیں گی تو ممکن ہے کہ وہ بھی اسی بات پر اعتراض کریں۔“ انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

’میں اپنی والدہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم آپ جیسے کہہ رہے ہیں میں ان سے موقع مناسب دیکھ کر بات کروں گی لیکن اس بات کا مجھے علم ہے کہ ان کے وسائل اس بات کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

اس سلسلے میں، میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔“ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’میرا اندازہ ہے وہ سفید پوش اور خوددار لوگ ہیں، کسی تیسرے شخص سے اس طرح امداد کبھی قبول نہیں کریں گے۔“ میں نے وثوق سے کہا۔

’اگر ہم مستقبل میں اس مضبوط تعلق کی دُور میں بندھنے والے ہیں تو میں ان کے لیے دوسرا یا تیسرا شخص نہیں رہوں گا۔“ انہوں نے دلیل دی۔

’یہ بات آپ اپنے مستقبل کی حیثیت میں زیادہ بہتر طرح سے کر سکیں گے، ابھی اس وقت یہ بات نہ چھیڑیں۔“ میں نے کہا۔

’مجھے نہ آج ان کی رہائش پر اعتراض ہے نہ بعد میں ہوگا۔ سارا مسئلہ یہی ہے ہمارے ہاں کی عورتوں کا کہ منگنی یا شادی پر عزیز و اقارب باتیں کریں گے۔“ نوید صاحب نے کہا۔

’منگنی یا شادی تو شادی ہال یا کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی ہو سکتی ہے، تاہم میں پھر بھی دیکھتی ہوں کہ اس معاملے کو کس طرح ذیل کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے گویا بات ختم کی۔

’یقین کریں کہ مجھے آپ سے یہ بات کرتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ جانے آپ میری بابت کیا رائے قائم کریں گی حالانکہ مجھے نہ شادی سے قبل لڑکی دیکھنے سے دلچسپی ہے نہ اس کا گھر۔“ نوید صاحب نے کہا۔

’خود کو اس معاملے سے لائق ثابت کر کے آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں اور میرے ضمیر پر بوجھ بڑھا رہے ہیں۔“ میں واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔

’ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ عمر میں مجھ سے ممکن ہے کہ بہت چھوٹی ہوں لیکن میں نے ہمیشہ آپ کی عزت اور احترام کیا ہے اور آپ کا یہ خیال اور سوچ بھی میرے لیے محترم ہے۔ اسے آپ میری لائق نہ سمجھیں بلکہ یہ آپ پر میرے اعتماد کا اظہار ہے۔“ نوید صاحب یہ کہہ کر دفتر

سے چلے گئے اور میں دیر تک جانے کس سکتے کی کیفیت میں رہی۔ ایسا نہ ہو کہ زارا کے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہو اور نوید صاحب کی زندگی میرا کہنا مان کر اجیرن ہو جائے۔

بہاؤ پور کچھ ایسا دور نہ تھا کہ تیمور مہینے میں ایک بار بھی نہ آ سکتا مگر جب سے اس نے یونٹ میں رپورٹ کی تھی تب سے یونٹ آگے بارڈرز پر متعین تھی۔ حالات کافی خراب تھے اس لیے اسے چھٹی نہیں مل پائی تھی۔ کبھی جو اس کا فون آتا تو بھی اتنی ہلکی اور کمزور آواز ہوتی تھی کہ آدھے الفاظ کی سمجھ آتی تھی اور آدھے ہم اندازے سے ہی سمجھتے تھے اور یہی کیفیت غالباً تیمور کی تھی۔ دو تین دفعہ ماہ رخ نے مجھے کال کر کے پوچھا تھا کہ کیا تیمور کو اس کے آنے کی خبر نہ ہوئی تھی۔ میں نے خود تیمور کو ماہ رخ کی آمد کا بتایا تھا مگر یہ سوچ کر کہ اس کے کال نہ کرنے کو یہ کیا سمجھے، میں نے خود ہی تیمور کا دفاع کیا۔

’اصل میں جب سے تم آئی ہو ہمیں بھی اس کی کوئی کال نہیں آئی..... اور یوں بھی جہاں پر وہ ہے وہاں پر ہماری طرف سے بھی رابطہ نہایت مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے وضاحت کر کے فون بند کیا ہی تھا کہ امی جان نے فوراً کہا۔

’مجھے اس لڑکی کی آزاد خیالی کوئی زیادہ پسند نہیں ہے اور منگنی کا رشتہ کیا ہوتا ہے کہ یہ تیمور سے بات کرنے کو تڑپ رہی ہے۔ ایسی کون سی باتیں ہیں جو اسے تیمور سے کرنا ہیں۔“

’کوئی بات نہیں امی جان! آج کل کے زمانے میں یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

تمہاری بھی منگنی ہوئی تھی، میرا خیال ہے کہ شادی سے پہلے کبھی بات بھی نہیں ہوئی ہوگی۔“ انہوں نے خفگی سے کہا۔

’وہ زمانہ اور تھا امی اور یہ زمانہ اور ہے۔“

’کوئی ایسی پرانی بات بھی نہیں ہے، نہ ہی تم لوگ ایسے بوڑھے تھے۔“ وہ بدستور برہم تھیں۔

’امی جان ہمارے حالات اور تھے اور پھر آپ کو میں نے بتایا تھا کہ تیمور اور ماہ رخ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور منگنی سے پہلے بھی وہ ایک دوسرے سے رابطہ میں تھے۔“ میں نے

انہیں رساں سے سمجھایا۔

”مجھے تو ایسی لڑکیاں بہت خطرناک لگتی ہیں جو گھر والوں سے بالابائی بالا لڑکوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہیں اور یہ لڑکی تو مجھے ہمیشہ سے ہی تیز لگتی تھی۔ میں تو اس کے حق میں نہ تھی۔ مناسب وقت پر لڑکیوں کی شادی ہو جائے تو وہ سسرال کے ماحول میں رچ جاتی ہیں جب کہ ایسی لڑکیاں!“

امی جان نے ماہ رخ کی ٹیپ چڑھا رکھی تھی۔ میں انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہفتے کا دن تھا مظہر دفتر گیا ہوا تھا، اب ایک ہفتے کے روز میں اس کے ساتھ جاتی تھی اور اس سے اگلے ہفتے کو میں اسے اکیلے دفتر بھیجتی تھی۔ اگرچہ وہ دن میں ہر بات کے لیے مجھے پچاسوں بار فون کرتا تھا۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ مظہر کی کال آگئی اور میں اس سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز آئی، ملازمہ چھٹی پر تھی اس لیے امی جان اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئیں۔ میں فون پر بات کر رہی تھی کہ آنے والے تیمور کو دیکھ کر حیرت سے میری چیخ نکل گئی اور فون بند ہو گیا۔ جلی ہوئی رنگت، گالوں اور ٹھوڑی کی نمایاں ہڈیاں..... کتنا کمزور لگ رہا تھا وہ۔ امی جان بار بار اس کا منہ سرچوم رہی تھیں۔ اب کے تو وہ تقریباً ساڑھے تین ماہ کے بعد آیا تھا۔ میں نے اسے تازہ جوس بنا کر دیا۔ مظہر کا دوبارہ فون آیا، میں نے ہی اٹینڈ کیا، وہ بہت پریشان تھا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے تیمور کی آمد کا بتایا تو وہ بھی خوشی سے تقریباً چیخ اٹھا۔ فون بند ہوا تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ انشا اللہ اگلے آدھے گھنٹے میں گھر پر ہوگا۔

”تم فریش اپ ہو جاؤ، مظہر بھی آنے والا ہوگا، کھانا بنا لوں۔“ میں نے ہدایات جاری کیں۔ ”بھابی! میں گھر آیا ہوں، پلیز مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔ فریش اپ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مظہر کون سا کوئی لڑکی ہے۔“ اس نے سستی سے کہا۔

”اوہ ہاں یاد آیا تم نے ماہ رخ کو کال نہیں کی؟“ میں نے سوال کیا۔ اچانک نظر اٹھی تو مجھے امی جان کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آئے۔

”اچھا واپس آگئی ہے وہ؟“ تیمور نے لہجے کو سرسری رکھنے کی ایکٹنگ کی۔

”بتایا تو تھا تمہیں میں نے فون پر.....“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس فون پر تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا، نہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بول رہی ہیں نہ امی جان کی

اور مظہر کی آوازوں میں فرق لگتا ہے۔“

”اب ایسی بھی نہیں ہونے کی۔“ اس کی بات پر میری ہنسی نکل گئی۔

”کتنی چھٹی لے کر آئے ہو میرے بچے؟“ امی جان نے کہا۔

”سندھ اتوار کو واپس ہے۔“ مختصر اس نے کہا۔

”کیا حالت ہو گئی ہے تمہاری؟ کب تک یونٹ باہر رہے گی؟“ امی جان پریشان تھیں اور

اس کے چہرے پر ہاتھ بھیر رہی تھیں۔

ماں بھی کیا رشتہ ہے، عمر بھر اس کی اولاد اس کے وجود کا وہی ایک گم شدہ ٹکڑا ہی رہتی ہے۔

اپنے وجود کو تقسیم کر کے جن اولادوں کو جنم دیتی ہے، وہ دنیا میں بکھر جاتی ہے، اپنے مقاصد کی تلاش

میں اور ماں بن جاتی ہے ایک نامکمل وجود، JIGSAW پزل کی طرح۔ جس کے کچھ ٹکڑے

علیحدہ ہو گئے ہیں اس سے، انہی کی تلاش میں وہ عمر بھر سرگرداں رہتی ہے۔ یہ ٹکڑے اسے مل کر بھی

مل نہیں پاتے، کہ یہ ٹکڑے دوبارہ اس کے وجود سے کبھی منسلک نہیں ہو پاتے۔ ماں! کہ

اچھا عاؤں کا دامن اور آنچل کی چھایا اپنے وجود کے ٹکڑوں پر تان کر زندگی بھر پایہ سفر زہتی ہے۔

”تیمور کیا کھاؤ گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کرلیے گوشت اگر پک سکیں تو؟“ اس نے فرمائش کی۔

”ان کا تو موسم ہی ختم ہو گیا ہے۔“ امی جان نے کہا۔

”تو پھر کچھ بھی بنا لیں، آپ جو بھی بنائیں گی اچھا ہی ہوگا۔“ تیمور نے کہا۔

مظہر آیا تو دونوں بھائی بڑے جوش و خروش سے ملے، کتنے عرصے کے بعد دونوں ملے تھے۔

میں نے مظہر کو کچن میں بلایا اور کہا کہ کہیں سے بھی کرلیے ڈھونڈ کر لائے۔ خود میں نے اتنی دیر میں

فریزر سے شامی کباب نکال دیئے۔ مرغی بھی نکال دی کہ اگر کرلیے نہ ملے تو مرغی جلدی بن جائے

گی۔ جتنی دیر میں، میں نے سلاد بنایا، آٹا گوندھا اور چٹنی تیار کی مظہر کرلیے لے کر آ گیا۔

”بس بھابی! بمشکل اتنے ہی ملے ہیں، دس دکانوں کی خاک چھان کر۔“ اس کی کوشش کا

اندازہ ہو رہا تھا۔ کرلیے تھے بھی اتنے خاص نہیں تاہم میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔

”بہت اچھے ہیں، اور مجھے پتا تھا کہ تم جہاں سے بھی ہو سکا ڈھونڈ کر لائے گے۔“ میں نے اسے

چھکی دی۔ رات کھانے کی میز پر تیمور کی خوشی کرلیے گوشت دیکھ کر دیدی تھی۔ اس نے تعریفوں

کے پل باندھ دیئے۔

”آج کے کریلے گوشت کا سارا کریڈٹ تو مظہر کو جاتا ہے، کیونکہ اگر وہ کریلے نہ لاتا تو تمہاری فرمائش پوری ہونا ممکن نہ ہوتا۔“ میں نے مظہر کی تعریف کی۔

”امی تھوڑی دیر تک علی بھائی مجھے لینے آرہے ہیں۔“ میں نے میز پر بیٹھے ہی انکشاف کیا۔

”کیوں بیٹا، خیریت ہے؟ امی جان تشویش سے بولیں۔“

”بالکل خیریت ہے، اصل میں، میں آپ کو بتانے ہی والی تھی کہ تیمور آ گیا اور بات ذہن سے نکل گئی۔ اصل میں کل مجھے والدہ کے ساتھ علی بھائی کے لیے رشتہ دیکھنے جانا تھا جو آپ کو بتایا تھا۔“ میں نے وضاحت کی۔

”یا وہ بیٹا، ٹھیک ہے چلی جانا پر کب واپسی ہوگی؟“ امی جان نے پوچھا۔

”پہلے تو رکنے کا ارادہ تھا مگر اب تیمور آیا ہے تو کل شام کو ہی آ جاؤں گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور ہاں تیمور تم کل ماہ رخ کی طرف سے ہوا نا۔“

”تم واپس آؤ گی تو اکٹھے ہی جا کر ہوا نا..... ابھی تو بچہ تھکا ہوا آیا ہے، آرام کرے گا۔“ امی جان فوراً بولیں۔

”جی بھائی! آپ کل آئیں گی تو کل شام کو ہی چلے جائیں گے یا پرسوں۔“ تیمور نے سرسری انداز میں کہا۔ اسے معلوم تھا کہ رشتہ طے بھی ہو گیا تھا مگر امی جان کو ماہ رخ کے انداز پسند نہ تھے۔ اسی لیے تیمور بھی ان کے سامنے ماہ رخ سے لیے دیئے رہتا تھا۔

میں نے گاڑی نالے کے کنارے بنی ہوئی پکلیا سے گزرا کر گلی میں بائیں جانب نالے کے کنارے کھڑی کی اور والدہ کو باہر نکلنے اشارہ کیا تو وہ حیرت سے بولیں۔ ”کیا ہوا؟ گاڑی خراب ہو گئی ہے کیا؟“

”والدہ باہر نکلیں، ہماری منزل مقصود آ گئی ہے۔“ میں نے دروازہ کھولا۔

”وماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ مجھے تو یہاں دور دور تک کوئی گھر نظر نہیں آ رہا ایسا جو ہماری منزل مقصود ہو۔“ انہوں نے سرگھما کر چاروں طرف دیکھا۔

”آپ سب طرف نہ دیکھیں، ادھر باہر نکلیں اور میرے ساتھ آئیں۔“ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی سے باہر نکالا، باہر نکلتے ہی ان کا پاؤں نیچے کچڑ میں جا پڑا جو وہ اچانک دیکھ کر نہ سکیں اور ان کی سفید صاف ستھری شلوار کچڑ کے سیاہ دھبوں سے داغدار ہو گئی۔ والدہ کو تو کپڑوں اور جوتوں کی صفائی کا خط تھا۔ شلوار پر پڑے ہوئے نشانات ان کے لیے ناقابل برداشت تھے۔

”ماہا! ایک منٹ، سامنے والے کوارٹر سے ذرا تھوڑا پانی لے کر میں اپنے جوتے اور شلوار کو صاف نہ کر لوں، اس طرح سے تو مجھے جانا ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ انہوں نے اسی گھر کی طرف اشارہ کیا جس میں دراصل ہمیں جانا بھی تھا۔

میں نے زارا کو مظہر علی کے ہاتھ لکھ کر پیغام بھجوایا تھا کہ میں اتوار کے روز اپنی والدہ کے ہمراہ ان کے گھر آؤں گی۔ اس لیے انہیں ہمارے آنے کی خبر تھی۔ البتہ مجھے یہ صورت حال خاصی دلچسپ لگی کہ والدہ جس گھر میں یہ سمجھ کر جا رہی تھیں کہ جوتے اور شلوار کے پانچے صاف کر لیں وہی دراصل منزل تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا تو مظہر علی کی والدہ نے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم آئی!“ میں آگے بڑھ کر ان سے ملی اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ میں تو اس گھر میں پہلے بھی بہت دفعہ آ چکی تھی، البتہ جب والدہ کو میرے انداز سے علم ہوا تھا کہ میں ٹھیک اسی گھر میں آئی تھی جہاں میں نے انہیں بتا رکھا تھا، ان کے چہرے پر مجھے تعجب اور تفاخر کا رنگ نظر آیا تھا۔ زارا نے آ کر سلام کیا اور ایک ہوائی چپل لا کر والدہ کے سامنے رکھی کہ اسے پہن کر پاؤں اور شلوار کے پانچے دھولیں۔ والدہ نے اس چپل کو دیکھ کر پہننے سے انکار کر دیا، میں حیرت سے زیادہ شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گئی۔

”میں غسل خانے میں جا کر ہی پاؤں بھی دھو لیتی ہوں، چپل بھی اور پانچے بھی۔“ والدہ بولیں۔

”میں یہیں پانی لا دیتی ہوں۔“ ہم برآمدے میں بیٹھے تھے۔ زارا لوٹے میں گرم پانی لائی اور اس سے قبل کہ وہ والدہ کے پاؤں یا جوتے دھلاتی میں نے اس سے لوٹا لے لیا، حالانکہ وہ یہ سب کسی چالپوسی سے نہیں کر رہی تھی مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے والدہ کے پاؤں صحن کی طرف کر کے دھوائے، اپنے پرس سے نشو پیپر لے کر انہوں نے پاؤں صاف کیے۔ میں نے اپنے جوتے انہیں پہننے کو دیے اور خود زارا کی لائی ہوئی چپل پہن لی اور والدہ کے جوتے اٹھا کر صحن میں لگے گل پر جا کر تھوڑا پانی بہا کر دھوئے۔ اگرچہ جوتے ایسے نہ تھے کہ دھوئے جاتے مگر جتنی بری

طرح جوتے خراب ہوئے تھے انہیں دھونا لازمی تھا۔

گھر میں مظہر علی اور ثنا موجود نہیں تھے۔ زارا نے بتایا کہ کسی کام سے گئے ہیں۔ یقیناً ہماری تواضع کے لیے کچھ لینے گئے ہوں گے، مجھے بہت شرمندگی ہوتی تھی۔ میں جب اکیلی آتی تھی انہیں اس طرح کے تردد سے منع کر دیتی تھی۔ اصل میں جب سے مجھے ثانیہ کے سلائی کرنے کا علم ہوا تھا، میں اپنے اور امی جان کے کپڑے سلائی کے لیے اسے ہی دے کر جاتی تھی۔ ہم دونوں ہی کو اس کے سسلے ہوئے کپڑے پسند آ جاتے تھے۔ کیونکہ ہم سادہ سا لباس پہنتے تھے، یہ اور بات ہے کہ ثانیہ کے ہاتھ میں اب صفائی آتی جا رہی تھی۔ مظہر علی اور ثنا بھی جلد ہی آ گئے۔ گھر کی بنی ہوئی چنے کی چاٹ، بازار کا پیزا اور تازہ کیک۔ لیکن والدہ نے کچھ نہیں کھایا۔ بلڈ پریشر کا بہانہ کر کے تھوڑی سی چنے کی چاٹ ڈالی اور وہ بھی نہیں کھائی۔ مجھے تو ان کے رویتے کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ میری والدہ سادہ سی عورت ہیں اور ان کی نظر میں لڑکیوں کے سلیقے اور شرافت کی بہت اہمیت ہے۔ کبھی ایسی بات انہوں نے نہیں کی کہ انہیں علی بھائی کو کسی امیر گھرانے میں بیاہنا ہے لیکن اس وقت ان کا ناقابل فہم رویہ مجھ پر سوچوں کے بہت سے دروا کر گیا تھا۔

ہم سب بہنیں اچھے بڑے گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں پھر بھلا وہ بیٹے کو کسی غریب گھرانے میں کیوں کر بیاہ سکتی تھیں جب کہ اس میں کوئی ذہنی و جسمانی نقص تھا، نہ اس کے لیے رشتوں کی کمی۔ اور مجھے خود بھی علم تھا کہ بہت سے گھرانوں سے لڑکیوں والوں کی طرف سے اس طرح پیشرفت ہوئی تھی، لوگ اپنی خوبصورت پڑھی لکھی بیٹیاں ان سے بیاہنے کے خواہش مند تھے۔ ایسے میں بھلا اگر ایسی جگہ رشتہ طے کیا جاتا تو لوگ ہم سے پوچھتے کہ کیا یہ وہ گھرانہ تھا جس کی خاطر آپ نے ہماری بیٹی کو یا ہمارے گھرانے کو مسترد کیا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا وجود خالی لگنے لگا اور میں اس ماحول سے کٹ کر فضا میں معلق ہو گئی۔ کیسی بے وقوفی کی تھی میں نے۔ واقعی نوید صاحب کی پھوپھو بھی ٹھیک سوچ رہی تھیں اور والدہ بھی حق بجانب تھیں۔ نوید صاحب ٹھیک کہتے کہ دوستی اور رشتے داری کے لیے معیار کے پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے جانے کب خود کو اتنا غفلت سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ خود کو ان لڑکیوں کا نجات دہندہ سمجھ کر خود سے نوید صاحب اور علی بھائی کی قسمتوں کا فیصلہ کرنا شروع کر دیئے تھے۔ میں شرمندگی کی انتہا تک پہنچ گئی کیونکہ میں نے آنٹی سے ایک دفعہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ مجھے ثانیہ اور زارا بہت

اچھی لگتی ہیں۔ بیٹیوں کی ماں تھیں ضرور والدہ کی آمد کا مقصد بھی سمجھ گئی ہوں گی۔

یعنی دیر میں چائے پی گئی والدہ مارے باندھے بیٹھی رہیں اور اٹھتے ہوئے پرس کھول کر اس میں سے پانچ سوکانوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ میں ان کے اس طرز عمل پر بہت شرمندہ ہوئی اور نوٹ اٹھا کر ثنا کی طرف بڑھایا۔ ”ثنا! اصل میں ہم خالی ہاتھ آئے ہیں، والدہ تمہیں دے رہی ہیں رکھ لو۔“ آنٹی نے ثنا کے ہاتھ میں سے نوٹ اچک لیا جو پہلے ہی اس نے بمشکل تھا مٹا تھا اور نوٹ انہوں نے زبردستی واپس میرے بیک میں ٹھونس دیا۔ میں نے ناراضی کا اظہار کیا مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے سب سے ملنا حسب عادت ضروری سمجھا جب کہ والدہ خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکل کر کھڑی تھیں۔

”چلتی ہوں آنٹی پھر آؤں گی۔“ میں نے ان سے اجازت چاہی۔

”جب تمہارا جی چاہے بیٹا، تمہارا اپنا گھر ہے۔“ انہوں نے خلوص سے کہا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے منہ پھلایا، والدہ نے میرے رویے کو محسوس کیا لیکن خاموش رہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بات چھیڑیں تو میں ان سے ان کے اس ناروا رویے کی وجہ تو پوچھوں لیکن وہ بھی میری والدہ تھیں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ گھر پہنچ کر میں نے ان سے واپسی کی اجازت چاہی۔

”ارے! تم نے تو کہا تھا کہ چند دن رکو گی؟“ والدہ نے حیرت سے کہا۔

”چلتی ہوں والدہ! تیمور بھی آیا ہوا ہے اور ملازمہ بھی چھٹی پر ہے اور کل مجھے دفتر بھی جانا ہے۔“ میں نے اپنی مصروفیات کی وضاحت کی۔

”تو تم اس گھر کی ملازمہ تو نہیں ہو بیٹا۔“ والدہ غصے میں آ گئیں۔

”والدہ ناراض کیوں ہوتی ہیں؟ میں پھر آ جاؤں گی۔“ میں نے انہیں کندھوں سے تھاما۔

”مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا تھیں۔“ انہوں نے ہتھیا رڈالے۔

”مجھے بھی آپ سے بہت ساری ضروری باتیں کرنا تھیں لیکن پھر آ جاؤں گی۔“ میں نے ان کے ہاتھ تھام کر وعدہ کیا۔

”بس سب کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آؤ گی اور میرے پاس رہو گی۔“ والدہ طول ہو رہی تھیں۔

”والدہ! حقیقت بتا رہی ہوں کہ تیمور اچانک آیا ہے، پہلے سے اطلاع ہوتی تو میں فون

کر کے آپ کو مطلع کر دیتی۔ بس اب آپ بہو لے آئیں تاکہ آپ کی تنہائی بھی دور ہو۔“ میں نے لاڈ سے کہا۔

”ہاں جیسے ساری بہوئیں ساسوں کی تنہائی دور کرنے کے لیے ہی تو آتی ہیں۔“ طنز سے انہوں نے کہا۔

”گھر میں بہو آتی ہے تو رونق آ جاتی ہے، سب کی تنہائی اور اکیلا پن ختم ہو جاتا ہے۔ بہو اور بیٹے کے قہقہے، ساس بہو کے جھگڑے، سر بہو کے لاڈ، بچوں کی چہکاریں..... کتنا کچھ ہو گا ناں۔“ میں نے ایسا خوبصورت نقشہ کھینچا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

”آپ کو ثانیہ پسند نہیں آئی ناں؟“ میں نے اچانک سوال کیا۔

”یہ میں نے کب کہا؟“ حیرت سے وہ بولیں۔

”کچھ باتیں کہے بنا سمجھ لی جاتی ہیں والدہ!“ میں نے کہا۔

”بڑی عقلمند بنتی ہو تم۔“ وہ مسکرائیں۔

”آج آپ نے یقین دلادیا ہے کہ دنیا میں مجھ سے بڑھ کر بے وقوف کوئی نہیں ہے۔ میں تو آپ کو دنیا بھر کی عورتوں سے مختلف سمجھی تھی والدہ لیکن آپ نے جو رویہ وہاں روا رکھا، اس نے مجھے میری نظر میں بہت گرا دیا۔ کسی انسان کے پاس صرف عزت نفس کی دولت ہوتی ہے اور آپ نے ان کے اس مان کو بھی مٹی میں ملا دیا۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا، کیا ہے میں نے جو تم اتنی جذباتی ہو رہی ہو؟“ وہ بولیں۔ ”میں تو اپنا پاؤں کچھڑ میں جا پڑنے پر جھنجھلا ہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔“

”پاؤں تو آپ کا دھل بھی گیا تھا مگر آپ کے ماتھے کی تیوریاں پھر بھی قائم رہیں“ آپ نے انہیں مستر دکرنا تھا تو بعد میں گھر آ کر پیغام بھیج دیتیں، کم از کم وہاں اس طرح۔“ جانے کیا ہوا کہ میں چہکوں بہکوں رونے لگی۔

”تم خود ہی اندازے لگا رہی ہو میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے ان کی تحقیر ہوئی ہو، میں تو تمام وقت خاموش ہی بیٹھی رہی۔“ والدہ بولیں۔

”اس سے بڑھ کر ان کی اور تحقیر کیا ہوگی؟“ اور اس سے پہلے کہ ابو یا علی بھائی میں سے کوئی باہر آ کر ہماری گفت و شنید سنتا میں انہیں خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔

گھر کی طرف واپسی کا سفر مانو کٹنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ واپسی پر سارا راستہ عجیب و غریب خیالات نے ذہن پر قبضہ جمائے رکھا تھا۔ پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی خیال کو ذہن پر حاوی نہ ہونے دوں۔ کیونکہ گاڑی چلاتے ہوئے خیالات کی رو بھٹک جانے کا نتیجہ میں ایک بار پہلے بہت اچھے طریقے سے بھگت چکی تھی۔ ابھی تک میری ٹانگ میں چلتے ہوئے درد ہوتا تھا اور جڑوں پر ٹانگوں کے نشانات اگر کافی حد تک مندل ہو چکے تھے مگر جلد پر ہلکا سا کھنچاؤ مجھے ابھی تک محسوس ہوتا تھا اور میں ان داغوں کو مندل کرنے والے کریمیں اور لوشن استعمال کر رہی تھی۔

کبھی یہ خیال آ رہا تھا کہ مجھے والدہ سے اتنی گستاخی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ مجھے بھلا اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی یہ تو سب تقدیر کی باتیں ہیں اور بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لڑکیاں بالیاں پیری کے درخت کی طرح ہوتی ہیں، پیر پکنے پر پتھر آنا کوئی ایسا بعید از قیاس نہیں اور پھر ہمارے ہاں تو عام گھرانوں میں یہی سلسلہ ہوتا ہے، لڑکیوں کے رشتے دیکھنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک بڑھیا طریقہ رائج ہے، لڑکیوں کو یوں دیکھا جاتا ہے جیسے قربانی کے لیے بکرے کو۔ بڑی بہنوں کی نسبت کیسے طے ہوئیں مجھے ابتدائی مراحل کا علم نہیں تاہم مجھے ان مراحل سے بالکل بھی نہیں گزرنا پڑا کیونکہ بزرگوں ہی کے مابین بات طے پائی اور کسی تقریب میں غالب نے مجھے دیکھ بھی لیا جب کہ میں نے غالب کو منگنی کے وقت پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس سے قبل صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔

شاید معاشرے کے مختلف طبقوں میں لڑکیوں کے رشتوں کے مراحل مختلف طریقوں سے طے ہوتے ہیں۔ والدین کا صاحب حیثیت اور خوشحال ہونا شاید اسی لیے لڑکیوں کے حق میں بہتر ہوتا ہے کہ یہ خوبیاں بہت سی ایسی خامیوں پر پردہ تان لیتی ہیں جو ایک غریب گھر کی بیٹی کے لیے جرم قرار پاتی ہیں۔ اللہ سب بچیوں کی قسمتیں اچھی کرے۔ مجھے اپنی قسمت پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ بی اے کے امتحانات سے فارغ ہوتے ہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا پھر غالب کا ساتھ چھوٹا تو ایک کے بعد دوسرا رشتہ کچھ عرصے کے بعد آ رہا تھا اور اگر میں کسی غریب گھر میں پیدا ہوئی ہوتی تو..... ثانیہ جو تقریباً میری ہم عمر تھی اور زارا مجھ سے بڑی..... ان کی طرح رشتوں کی آس میں بیٹھی ہوتی۔ مجھے اپنے قسمت پر رشک آیا۔ واقعی میرے رب نے مجھے کتنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں اور میں ان نعمتوں کو جھٹلا رہی تھی؟



”کیا میں اپنے رب کی نعمتوں کو جھٹلا رہی ہوں؟“ خو سے میں نے سوال کیا۔ مجھے کوئی حق نہیں کفرانِ نعمت کرنے کا۔ جانے کہاں سے بھولا بھٹکا خیال میرے ذہن میں نوید صاحب کے لیے آیا اور میں نے سوچا کہ اگر نوید صاحب کا اور زارا کا رشتہ نہ ہو سکا تو دل مانے یا نہ مانے میں نوید صاحب کے لیے ہاں کر دوں گی۔ میں بھلا کیوں اتنی بے وقوفیاں کرتی رہی ہوں۔ نوید صاحب کو اس لیے مسترد کر دیا کہ لوگ کیا کہیں گے، تیمور کو اس لیے کہ وہ میرے بھائیوں جیسا ہے اور اب ایک نیا کردار ڈاکٹر معظم کا سامنے آ رہا تھا۔

گھر پہنچی تو سب لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ شپ ہوئی۔ تیمور نے بتایا کہ وہ دن بھر کابلی سے بستر پر اور پھر ٹی وی روم میں صوفے پر گزار رہا ہے۔ میری دن کی زوداد پوچھی گئی تو میں نے مختصراً بتایا کہ سب ٹھیک رہا۔ باقی فیصلہ بعد میں ہوگا۔ تیمور تفصیل جاننے کو بے چین تھا اور میں نے نماز پڑھ کر سونے کا عذر پیش کر کے معذرت کر لی۔ کمرے میں آ کر نماز پڑھی اور سونے کے لیے لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن کے پردوں پر ایک ایک کر کے ماضی کے منظر آنے لگے اور ان مناظر میں یاویں غالب کی۔

○ جو خود تو سکون میں ہے مجھے بے سکون کر کے

مجھے بس اذیت پہ، اک پٹا ہوا مہرہ بنا کے

جس کے دم سے قائم تھی بہارِ زندگی

وہ نہیں تو تھم گیا ہے، وجود پہ موسمِ خزاں

بہار آتی ہے اور دیتی ہے دستکیں

مگر میری صحنیں ہیں ویراں

اور مقفل ہیں دروازے شہرِ دل کے

منتظر ہے میرے بدن کی ریاست

کوئی تو دے دستکِ دردِ دل پہ!! ○

یہ نہیں کہ اب غالب کی یاد نہیں آتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے دل کے بند دروازے اب کسی دستک پروا کرنا ہی ہوں گے۔ زندگی یوں بھی بتانا

مشکل ہو رہی ہے اور پھر گزرتا ہوا وقت آنے والے وقت کی تبدیلیوں کے آثار کو ظاہر کر رہا تھا۔ نیند کسی محبوب کی طرح روٹی ہوئی تھی، اسے کافی دیر تک کروٹیں بدل بدل کر منانے کی کوشش کی۔ مجبوراً اٹھ کر نیند کی ایک گولی اور تھوڑی دیر میں ہی نیند کی مہربان آنکھ میں چلی گئی۔

جانے کیا وقت تھا اور کیا پہر تھا، گہری نیند سے اچانک بیدار ہوئی تو دل کی دھڑکنیں اٹھل پھل ہو رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میری نیند ڈسٹرب ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میں تو نیند کی گولی لے کر سوئی تھی۔ پھر دستک کی آواز آئی، میں نے وہیں لیٹے کان لگائے۔ دستک دروازے پر نہ تھی لیکن پھر بھی کافی واضح تھی۔ میرے کمرے کی کھڑکی کے شیشے پر دستک ہو رہی تھی، کھڑکی میرے بیڈ کے بہت قریب تھی، پھر مجھے تیمور کی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے پردہ ہٹایا تو تیمور کھڑکی کے باہر کھڑا تھا۔ رات ان دنوں ہلکی سی خشکی ہو جاتی تھی اور وہ عام سے شلوار قمیض میں باہر کھڑا ٹھہر رہا تھا۔ لیکن یہ باہر کیوں کھڑا ہے؟ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔ ”کھڑکی کھولیں۔“ اس نے باہر سے آواز دی جو کہ شیشوں کی وجہ سے مجھے بہت ہلکی آئی۔ میں نے تھوڑی سی کھڑکی کھولی اور اس سے کہا کہ وہ اندر آئے۔ مجھے مناسب نہ لگا کہ میں یہاں سے اس سے گفتگو کروں۔ اگر کوئی اڑوس پڑوس والا دیکھے تو جانے کیا سمجھے! وہ بار بار کھڑکی کھولنے پر اصرار کر رہا تھا میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ سیدھے راستے سے اندر آ کر بات کرے۔ اپنا بستر اٹھ کر ٹھیک کیا اور بال سمیٹ کر دوپٹا اوڑھ کر میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ باہر کھڑا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تیمور! اس وقت کیوں آدھی رات کو باہر کھڑے چیخ رہے تھے۔“ میں نے قدرے خشکی سے کہا۔

”سوری بھائی! میں کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا مگر آپ دروازہ نہیں کھول رہی تھیں، مجبوراً مجھے کھڑکی کے راستے دستک دینا پڑی۔“ اس نے معذرتی انداز میں کہا۔

”ایسی کیا ایمر جنسی پڑ گئی تھی؟“ میں نے خشکی بھرے لہجے میں کہا۔ جواب میں وہ خاموش رہا، اس کی خاموشی سے مجھے وحشت ہونے لگی اور ساتھ ہی دل میں عجیب سا خیال یہ آیا کہ اگر امی جان یا مظہر میں سے کوئی جاگ جائے اور تیمور کو رات کے اس پہر میرے کمرے میں دیکھ لے تو..... اس خیال نے اتنی شدت سے میرے ذہن کو جھنجھوڑا کہ میں نے اٹھ کر فوراً دروازہ کھول دیا اور جانے میرے ذہن سے ٹیلی پیتھی کی کیسی لہریں نکلیں کہ تیمور اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا اور

ٹی وی روم میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے اس کی تھلید کی۔ ”اب کہو کیا ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔  
 ”بھابی! علی کا فون آیا تھا، آنٹی کی طبیعت۔“ اس کا جملہ نامکمل ہی تھا کہ میں چیخ پڑی۔  
 ”کیا ہوا والدہ کو؟“

بھابی! انہیں ہلکا سا ہارٹ ایک ہوا ہے، اسپتال لے گئے ہیں اور میں پچھلے ایک گھنٹے سے آپ کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امی جان بھی نیند کی دوا لے کر سوئی ہوئی ہیں اور نہ آپ کے کمرے سے کوئی جواب آ رہا تھا، نہ ہی مظہر کے پھر مجبوراً مجھے آپ کی کھڑکی کی طرف سے کھٹکھٹانا پڑا۔ وہ وضاحت کر رہا تھا اور میرا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا، کچن سے پانی لا کر دیا اور مجھے کپڑے تبدیل کرنے کو کہا اور خود بھی کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ میں نے کمرے میں آ کر جلدی سے کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں برش پھیر کر بال سمیٹے۔

امی جان کے کمرے پر دستک دے کر انہیں چگایا اور ساری صورت حال سمجھائی۔ تیمور گاڑی کی چابی لیے کھڑا تھا، میں نے مظہر کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا تاکہ وہ جاگ کر کم از کم گیٹ اور بیرونی دروازہ بند کر لے مگر جواب نہ ارد۔ مجبوراً امی جان نے رات کے اس پہر آ کر گیٹ بند کیا۔ راستے میں تیمور نے مجھے بتایا کہ جب وہ باہر میری کھڑکی کی طرف آ رہا تھا تو مظہر کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے کھڑکی کھول کر جھانک کر اندر دیکھا تو وہ کمرے میں نہیں تھا..... کافی دیر میں اس انتظار میں رہا کہ وہ شاید غسل خانے میں ہو مگر میرا خیال ہے کہ وہ گھر میں ہی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم سب کے سو جانے کے بعد وہ گھر سے باہر گیا ہے کہیں؟“ تیمور کے لیے تو بلاشبہ یہ ایک انکشاف تھا۔ یہی ایک بات جو کافی عرصے سے میں اس کے ساتھ کرنا چاہ رہی تھی، اس کا انکشاف تیمور پر ہوا بھی تو ایسے وقت میں کہ میرے حواس والدہ کی خرابی صحت کا سن کر سلب ہو رہے تھے۔

”وہ اکثر پہلے بھی گھر دیر سے آتا ہے اور بسا اوقات تو اتنا دیر سے کہ ہمیں علم ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ رات گوا آیا ہے یا صبح.....“ میں نے اس پر ایک اور انکشاف کیا۔

”تو آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کیوں چھپائے رکھا مجھ سے یہ سب؟ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اس تمام صورت حال کو اکیلے ہینڈل کر لیں گی؟ مجھے تو اس کے اطوار پہلے ہی کچھ بدلے بدلے سے نظر آ رہے تھے۔“ تیمور جذباتی ہو رہا تھا۔

”میں نے بار بار کوشش کی کہ تم سے اس سلسلے میں بات کروں، اگر تمہیں یاد ہو تو گزشتہ چار ماہ قبل جب تم آئے تھے تو میں نے تم سے اس معاملے پر بات کرنے کے لیے تمہیں باہر چلنے کو کہا تھا، تب تم نے ماہ رخ کو بھی بلا لیا تھا۔“ میں نے اسے یاد دہانی کرائی۔

”اس کے بعد بھی مجھے آپ اس بارے میں بتا سکتی تھیں۔“ تیمور شکوہ کنناں تھا۔  
 ”کبھی موقع ہی نہیں ملا، میں تو خود اس معاملے میں بہت پریشان تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔ امی جان تو بات، بات پر اس کے ساتھ غصے میں آ جاتی ہیں۔“ میں نے بے بسی غاہر کی۔

”مجھے امی جان نے بتایا تھا کہ کس طرح اس نے آپ کے ساتھ شدید بدتمیزی کی تھی اور آپ نے اس کو برداشت بھی کر لیا تھا۔ آخر کیا وجہ ہے، کیوں آپ اس کی طرح کی غلطیوں پر پردے ڈال دیتی ہیں؟“ کتنا عجیب لہجہ تھا تیمور کا کہ میں دل ہی دل میں بل کھا رہ گئی۔

”میں اس لیے برداشت کرتی ہوں کہ میں اس کی بڑی ہوں، مجھے اس کی غلطیوں پر اس کی اصلاح کرنا ہے، اسے سمجھانا ہے، ہاتھ اس لیے نہیں اٹھا سکتی کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں اور اسے برا بھلا اس لیے نہیں کہتی کہ جو ان خون ہے، کسی بات پر برامان کر گھر سے ہی چلا جائے تو ہم کیا کریں گے.....“ میں بات کرتے کرتے سسک اٹھی۔ آخر میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

”لیکن آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کیا وجہ ہوئی، وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس کا کوئی استاد یا کوئی دوست ایسا ہے جو خود کسی مذہبی تنظیم سے وابستہ ہے اور اسی نے اس سے اثر لیا ہے۔“ میں نے مختصر آیتا کیا۔

”یہ اندازہ آپ نے کس وجہ سے لگایا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔  
 ”اس کے کمرے میں موجود مذہبی موضوعات پر بہت ساری کتابوں کی وجہ سے۔“

”لیکن اس کا کمر تو امی جان بتا رہی تھیں کہ بند رہتا ہے اور اس نے اسی بات پر آپ سے بدتمیزی کی تھی کہ اسے شک ہوا کہ آپ اس کے کمرے میں گئی تھیں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں اس نے مجھ سے اس بات پر بدتمیزی کی تھی، جس پر امی جان نے اس کی بہت پٹائی کی تھی۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن جب آپ اس کے کمرے میں گئی تھیں تو اس کو شک کیوں ہوا؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”اس لیے کہ میں اس کے کمرے میں گئی تھی.....“ میں نے انکشاف کیا۔ ”غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی، اس کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر میں مارے تجسس کے اندر چلی گئی اور پھر لوٹ کر آئی.....“ میں نے اعتراف کیا۔

”اور اگر آپ اس کے کمرے میں چلی ہی گئی تھیں تو اس کے سامنے یہ کہنے میں کیا حرج تھا.....؟“ تیمور نے گاڑی کو پارک کرتے ہوئے کہا۔ اسپتال آ گیا تھا، میں نے گاڑی رکتے ہی استنبالیہ کی طرف دوڑ لگا دی۔ تیمور میرے پیچھے لپک کر آیا۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے سوال کیا۔

”میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔“ میں نے عجلت میں جواب دیا۔

”خوفزدہ! وہ کس بات سے؟ چھوٹا ہے وہ آپ سے اس سے کیوں خوفزدہ ہیں آپ؟“ اس نے تیز چلتے ہوئے آگے آ کر سوال کر دیا۔

”تیمور اس کے پاس ریوالور ہے اصلی والا۔ میں نے وہ دیکھ لیا تھا.....“ لفٹ میں، میں نے اسے یہ بات ڈرتے ڈرتے بتائی۔ ”مگر ابھی تم اسے مت جتنا نا، میں بعد میں تمہیں ساری تفصیل بتاؤں گی پھر ہم دیکھیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ میری اس بات نے اس پر یوں اثر کیا جیسے میں نے اس پر ریوالور تان لیا ہو۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ ایک سکتے کی سی حالت میں وہ مجھے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے والدہ کے کمرے کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں صدف آپنی خرم بھائی، علی بھائی، ابو کے علاوہ ڈاکٹر معظم بھی موجود تھے۔ یہ سب لوگ کمرے کے باہر بچے بیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا والدہ کو؟“ میں نے ابو کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔ صبح تو بالکل ٹھیک تھیں بلکہ شام تک بالکل ٹھیک تھیں۔“ میں سسکتی گئی۔

”حوصلہ کرو بیٹا! وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ معظم بیٹا تو کافی دفعہ کہہ چکا ہے کہ ان کو انجیو پلاسٹی کروالیتی چاہیے۔“ ابو نے میری کمر سہلائی۔ میں باقی سب لوگوں سے ملی اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے والدہ سے ملنا ہے، جب کہ صدف آپنی کا کہنا تھا کہ وہ آرام کر رہی ہیں اس لیے انہیں دور سے ہی دیکھ لیا جائے مگر میں مصر رہی کہ مجھے ان کو چھو کر دیکھنا تھا۔

”بچی نہ بنو ما! والدہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ تم انہیں جا کر چھوؤ اور اگر وہ جاگ گئیں تو پھر

ڈسٹرب ہو جائیں گی۔“ صدف آپنی نے ڈانٹا۔

”پلیز میں انہیں چھوؤں گی نہیں، صرف دیکھوں گی..... پلیز آپنی!“ میں نے التجا کی۔ میں والدہ کی اس حالت کا ذمے دار خود کو سمجھ رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا کہ والدہ نے میری کی ہوئی کسی بات کی ٹینشن لی تھی، میں نے شاید انہیں زیادہ ہی گستاخی دکھائی تھی۔ میں دل سے شرمندہ تھی۔

”نہ ڈانٹیں صدف آپنی پجاری پریشان ہے۔ آنٹی کی چھوٹی اور لاڈلی بھی ہے..... آؤ ماہا میں خود تمہیں لے چلوں آنٹی کے پاس!“ معظم نے آگے بڑھ کر یوں استحقاق سے میرا ہاتھ تھام لیا جیسے ارد گرد کوئی نہ ہو۔ میں بھی اس وقت ذہنی طور پر اتنی منتشر تھی کہ اس بات کا احساس ہی نہ کر سکی اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے ایک معمول کی طرح اس کے ساتھ اندر کو چلی۔ خاموشی سے والدہ کے بیڈ کی پاس کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ہوش و حواس کی دنیا میں نہ تھیں غالباً بے ہوش تھیں یا پھر گہری نیند میں۔

”ڈاکٹر معظم! والدہ نے کوئی ٹینشن لی ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں کوئی ایسی خاص ٹینشن کیا ہو سکتی ہے، ویسے ان کے دل کی حالت ایسی تھی کہ انجیو پلاسٹی ہونے کی ضرورت تھی۔ یونہی کوئی چھوٹی سی بات بہانہ بن جاتی ہے بسا اوقات۔ ہو سکتا ہے کہ وہا کے استعمال میں بے قاعدگی ہوئی ہو۔“ اس نے وضاحت کی۔

”دوا تو وہ ہمیشہ بے قاعدگی سے اور بروقت کھاتی ہیں، ضرور کوئی اور بات ہوگی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ڈاکٹر معظم مشین کے پاس کھڑا ان کا ریکارڈ چیک کر رہا تھا میں نے دونوں ہاتھوں سے والدہ کے پاؤں چھوئے جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ میری رگوں میں ایک خوف سا سرایت کر گیا۔ میں نے زیر لب بڑبڑا کر ان سے اپنی گستاخیوں کی معافی مانگی۔ کہیں والدہ..... یکدم مجھے خیال آیا اور میں نے سسکیاں لے رونا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر معظم نے مجھے کندھوں سے تھاما اور تقریباً دھکیلتے ہوئے باہر لے آیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی جیب سے نشو پیر بھی نکال کر دیا۔ میں نے باہر آ کر ابو کے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔ دل میں یہی خدشہ تھا کہ والدہ کو کچھ ہونہ جائے۔ کتنی منتیں کر رہی تھیں شام کو کہ رک جاؤ مگر میں اس وقت غصے میں تھی شاید۔ ”یا اللہ والدہ کو صحت دے! میں ایک بار ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں۔ مجھے تو ان سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ میرے لیے تو وہ دنیا میں ایک مضبوط جذباتی سہارا ہیں۔“ میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔

تب معظم نے اصرار کیا کہ سب لوگ گھر چلے جائیں اور ون کو سبجے واپس آ جائیں جب تک ڈاکٹر ذہبی راؤنڈ کر کے چلے جائیں گے۔ میرا تو بالکل جی نہ چاہ رہا تھا کہ وہاں سے جاؤں مگر سب لوگوں نے یہی کہا کہ اسپتال کے بیٹوں پر بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، سو بے دلی سے میں نے بھی سب کا ساتھ دیا۔

”پریشان نہ ہو گڈ گرل! اس وقت گھر جاؤ، صبح دس بجے آ جانا، پھر میں تمہیں آنٹی سے ملوا دوں گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ تم ان سے بات بھی کر سکو۔“ ڈاکٹر معظم نے مجھے بچوں کی طرح پچکارا۔  
 ”یہ ڈاکٹر معظم کون ہے؟“ تیمور نے گاڑی اسپتال کے احاطے سے نکلتے ہی سوال کیا۔  
 ”صدف آپ کی جیٹھ کا بیٹا ہے اور کالج میں صدف آپ کا جو نیر تھا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”اسی لیے انہیں چچی کے بجائے صدف آپ کی کہتا ہے۔“

”پہلے کبھی نظر نہیں آیا؟“ تیمور کے لہجے میں کوئی عجیب سی چیز تھی۔  
 ”یہاں نہیں ہوتا، یو کے سے آیا ہے.....“ میں نے مختصر اُ کہا۔  
 ”آپ سے کچھ زیادہ فرینک نہیں ہے؟“ تیمور کی بات پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

میں جواب میں خاموش تھی۔ مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ تیمور کے اس سوال کا کیا مطلب ہے؟  
 ”آپ کو برا لگا تو معذرت چاہتا ہوں۔“

”نہیں برا کیا لگے گا، مجھے تمہارے سوال کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے ساتھ وہ فرینک ہے، تمہیں کیوں ایسا لگا؟“ میں نے کسی خیال میں گم ہو کر سوال کیا۔

”میرا مطلب ہے جس طریقے سے اس نے آپ کا ہاتھ تھام لیا تھا اور پھر کندھوں سے تھام کر واپس باہر لایا تھا، مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا تو میں حیرت زدہ رہ گئی، واقعی میں نے اس وقت پریشانی میں اس بات کا خیال نہیں کیا اور تیمور کیسے ایک بھائی کی طرح سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر معظم کو میرے ساتھ فری ہوتے دیکھ کر اس کی غیرت برداشت نہیں کر سکتی تھی اور وہ کیسے لہجہ زور ہوا تھا۔ واقعی ہم لوگ شاید پریشانی کے لمحات میں اس طرح کی باتوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر معظم ہمدردی کی آڑ میں اپنی حدود سے تجاوز کر رہا تھا۔

”شادی شدہ نہیں ہے کیا؟“ تیمور نے سوال کیا تو مجھے ہنسی آ گئی۔  
 ”تمہیں کس نے کہا نہیں ہے؟ اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔  
 ”شکل سے تو کوئی مجنوں نما چیز لگا مجھے، میں سمجھا اس کی شادی نہیں ہوئی۔“ تیمور نے اندازہ لگایا۔ میں نے سوچا کہ اسے ڈاکٹر معظم کے رنڈوے ہونے کے بارے میں بتاؤں مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔ پہلے ہی وہ میرے اور اس کے درمیان کے تعلق کے بارے میں ابہام کا شکار تھا۔ گھر پہنچے تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ مظہر گھر آچکا تھا، جانے وہ کس راستے سے گھر سے نکلتا تھا اور کیسے واپس آتا تھا؟ میرا اندازہ تھا کہ اس نے داخلی دروازے کی ڈیپلیکٹ چابی بھی بنوا رکھی تھی اور یا گیٹ پھلانگ کر باہر نکلتا ہو گا یا پھر غلی چھوٹے گیٹ سے جو ملازمین کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تیمور تو اس قدر غصے میں تھا کہ اسی وقت مظہر سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ نماز پڑھ کر لیٹی تو گہری نیند میں چلی گئی، الارم لگا کر سوئی تھی اس لیے آٹھ بجے جاگ گئی۔ کمرے سے تیار ہو کر نکلی تو امی جان ناشتا بنا چکی تھیں، میں شرمندہ سی ہو گئی۔ تیمور نے انہیں والدہ کی طبیعت کی خرابی کی بابت بتا دیا تھا۔ اس لیے انہوں نے تشویش کا اظہار کیا۔ مظہر کالج چلا گیا اور ہم تینوں تیار ہو کر اسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ز راؤنڈ لے کر جا چکے تھے۔ اس لیے ہمیں ایک ایک کر کے والدہ سے ملنے کی اجازت ملی، صرف امی جان، صدف باجی، ابو اور میں باری باری اندر گئے۔ ڈاکٹر معظم تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھنے کے بعد اپنے معمول کے راؤنڈز وغیرہ پر چلا گیا تو میں نے شکر کی سانس لی۔ ورنہ تیمور تو سارا وقت اسی پر نظر رکھتا۔  
 دوپہر کے قریب ڈاکٹر ز دوبارہ راؤنڈ پر آئے تو انہوں نے اجازت دے دی کہ مریضہ کے پاس ایک تیماروار خاتون رہ سکتی ہیں، میں اور صدف آپ اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے آپس میں اختلاف کر رہے تھے۔ میرا موقف یہ تھا کہ میرے سر پر کاروبار کے علاوہ کوئی اور ایسی ذمہ داری نہیں تھی جب کہ صدف آپ کی بچے تھے، گھر تھا اور ان کی اپنی جاب۔ امی جان نے بھی میری حمایت کی تو صدف آپ کو ہار تے ہی بنی۔ روانگی کے وقت تیمور نے میرے نزدیک آ کر کہا۔ ”ذرا خیال سے رہیے گا، ڈاکٹر صاحب سے بچ کر۔“ میں ہلکا سا مسکرائی۔  
 ”تمہیں مجھ پر شک ہو رہا ہے تو میں نہیں رہتی اسپتال میں۔“ مجھے واقعی اس کے الفاظ سے دکھ ہوا تھا۔

”ایسا تو میں نے کبھی نہیں کہا کہ مجھے آپ پر شک ہے، میں نے اس کی نظر میں کچھ عجیب سی چیز محسوس کی ہے۔“ تیمور نے صفائی دی۔

”کسی کی نظر اور رویے کی تو میں گارنٹی نہیں دے سکتی، تاہم تمہیں میرے کردار پر شک نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ تم مجھے اس طرح سمجھا رہے ہو جیسے مجھے اچھے برے کی پہچان نہیں۔“ میں نے کہا۔

”معافی چاہتا ہوں..... ایک بھائی ہونے کی حیثیت سے آپ کو خبردار کر رہا تھا اس کی طرف سے۔“ وہ شرمندہ تھا۔

”جانتی ہوں کہ تم میرے بھائی ہو اور یہ یقین رکھو کہ میری طرف سے تمہیں کچھ ایسی شرمناک بات سننے کو نہیں ملے گی۔“ میں نے اسے یقین دہانی کرائی۔ ”اور ہاں! آج جا کر ماہ رخ کو مل آنا، یا اسے کال تو کر لینا۔ تمہیں آئے ہوئے آج تیسرا دن ہے، ناراض ہو جائے گی۔“

”بہت فکر ہے آپ کو اپنی سبیلی کی ناراضی کی۔ میں نے کال کی تھی اور آج کا ہی پروگرام ہے اس سے باہر ملنے کا، اس کے گھر کسی اور وقت چلا جاؤں گا۔“ اس نے ہنس کر وضاحت کی۔

سب لوگ چلے گئے تو میں والدہ کے پاس واپس آ گئی۔ ان کی جلد کتنی خشک ہو رہی تھی، میں نے اپنے پرس سے نوٹن نکالا اور پہلے ان کے ہاتھوں اور پیروں پر ہلکا ہلکا مساج کیا۔ وہ ہوش میں تھیں مگر ذرا غنودگی میں تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا تو انہوں نے کوشش کر کے اپنے ہاتھ کا دباؤ میرے ہاتھ پر ڈالا، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ والدہ کسی بچے کی طرح بے بس لیٹی ہوئی تھیں۔

مغرب کی نماز پڑھ کر میں یونہی باقی کمروں میں گھومتی اور مختلف مریضوں کو دیکھتی رہی۔ وہاں زیادہ تر مریض ایسے تھے جو موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ واقعی جب تک ہم ایسے لوگوں کو نہ دیکھیں ہمیں شاید اپنی زندگی کی قدر بھی نہیں ہوتی۔ ہم اپنی ذرا ذرا سی تکلیف پر بلک اٹھتے ہیں لیکن وہ لوگ بڑے بڑے حادثات اور آپریشنز کے باوجود بھی زندگی کی طرف لوٹنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اپنے فرائض کی احسن ادائیگی میں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی نرسیں، مریض سے شفقت اور تحمل سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر..... کتنا اچھا لگ رہا تھا یہ سب دیکھنا، دل سے ان سب کی صحت یابی کی دعا نکلی۔ تبھی ایک نرس والدہ کے کمرے کی طرف ٹرے

اٹھائے جاتی نظر آئی تو میں بھی اسی طرف لپکی۔ غالباً وہ والدہ کو کوئی انجکشن لگانے جا رہی تھی۔ والدہ نے دروازہ کھلنے کی معمولی سی آواز پر بھی آنکھیں کھولیں اور مجھے مسکرا کر دیکھا۔ نرس نے ان کو انجکشن لگایا اور روانہ ہوئی۔ میں نے والدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”والدہ! مجھے اپنے پاس روکنے کا یہ بہانہ کچھ پسند نہیں آیا مجھے۔“ وہ مسکرا دیں اور میں نے پیار سے ان کے زرد اور کزور گال پر بوسہ دیا۔

اسپتال کی طرف سے والدہ کے لیے کھانے کی ٹرے آئی، میں نے نفاست سے بنی ہوئی ٹرے پر لمبل کا ٹرے کور ہٹایا، صاف ستھرے برتنوں میں بخنی، ابلی ہوئی تھوڑی سی سبزیاں، مونگ کی دال اور مرغی کا شوربہ ساتھ سا گودانے کی کھیر۔ کھانا دیکھنے میں تو اچھا لگ رہا تھا مگر نہ اس میں کبھی تھانہ چٹ پٹا ذائقہ۔ والدہ میری طرف سے پریشان تھیں کہ کچھ کھا لیتی۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ یہی سوچا کہ وہ سو جائیں گی تو اسپتال میں بنے ہوئے کیفے میری میں جا کر کچھ کھالوں گی۔ والدہ کے بیڈ کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی تھی، سر میں نے بیڈ پر ٹکا رکھا تھا اور والدہ کے ہاتھ میرے بالوں میں مساج کر رہے تھے، جانے کس وقت میں سکون سے نیند کی واوی میں جا اتری تھی۔ ہلکے سے کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، والدہ بھی جاگ گئیں۔ رات ساڑھے نو بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر معظم آیا تھا۔ ”ارے آپ ابھی تک یہیں ہیں، گھر نہیں گئیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں یہیں رہوں گی والدہ کے پاس!“ میں نے گویا اسے اطلاع فراہم کی۔

”لیکن یہاں تو کسی کورات رہنے کی اجازت نہیں ہے، شکر کریں کہ میں راولپنڈی پر آیا ہوں کوئی اور ڈاکٹر آتا اس وقت تک آپ کی اچھی خاصی کلاس ہو چکی ہوتی اس بات پر۔“

”تو اب تو میں رہ سکتی ہوں ناں؟“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”جی نہیں! آپ کو گھر جانا ہوگا، یہ بات اسپتال کے قواعد و ضوابط کے خلاف ہے۔ نہ زیادہ ملاقاتیوں کی، ہم اجازت دیتے ہیں نہ رات کو کسی امینڈنٹ کے رہنے کی، ورنہ پھر نرسیں اور اسٹاف اپنے آپ کو ان فرائض سے بری الذمہ سمجھتے ہیں اور مریض کی حالت اگر اچانک خراب ہو جائے تو بسا اوقات ہمیں علم ہی نہیں ہو پاتا۔“ ڈاکٹر معظم نے وضاحت کی۔

”لیکن والدہ تو ابھی بہتر ہیں اور میں پورا خیال رکھوں گی۔ جو نبی ضرورت ہوئی میں نرس کو

کال کرلوں گی۔“ میں گھکھائی۔

”آپ بے مقصد ضد کر رہی ہیں ماہا! پلیز آپ باہر چلیں اور کل دوبارہ آجائیں۔“ اس نے اٹل سچے میں حکم دیا اور والدہ نے بھی اس کی تائید کی۔

”اچھا تو پھر میں باہر بیٹھ کر رات گزار لیتی ہوں۔“ میں نے متبادل حل پیش کیا۔

”آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے ماہا! آپ گھر جا کر آرام کیوں نہیں کرتیں؟ اس طرح تو آپ خود بھی بیمار پڑ جائیں گی اور ایک بیمار شخص کسی کی خدمت کیا کرے گا۔ مجھے لگتا ہے آپ بہت زیادہ جذباتی ہیں اور جذبات میں آکر مسائل کو بالکل بھی نہیں سمجھتیں۔“ اس کے بے رحم لہجے سے مجھے بہت غصہ آیا، میں نے والدہ کو ”اللہ حافظ“ کہا اور کمرے سے نکل آئی۔ ڈاکٹر معظم بھی میرے پیچھے پیچھے نکل آیا اور چند قدم تک تیز چل کر وہ میرے ساتھ آن پہنچا۔ میں اسی بے نیازی سے چلتی رہی جیسے کہ میں اکیلی چل رہی ہوں۔ ”گاڑی ہے آپ کے پاس؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”رات کے اس وقت اکیلے؟ ہرگز نہیں! میں ڈراپ کرو دیتا ہوں۔“ اس نے آفر کی۔

”اکیلے ٹیکسی میں کیا ہو جائے گا مجھے؟ زندگی میں پہلی دفعہ تو نہیں ٹیکسی سے سفر کروں گی۔“

میں نے چڑ کر کہا۔

”ماہا! ایک خوبصورت، جوان اور تنہا لڑکی..... ٹیکسی ڈرائیور کی نیت خراب ہو جائے تو.....؟“

نہیں نہیں، میں ہرگز یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا.....“ اس نے مسخرے پن سے میری تعریف کی۔

”نیت کا کیا ہے ڈاکٹر معظم، وہ تو آپ کی بھی خراب ہو سکتی ہے۔ نہیں نہیں، میں ہرگز یہ خطرہ

نہیں مول لے سکتی.....“ میں نے اسی کے انداز میں کہا تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

”میری نیت خراب ہونے کا تو آپ کو علم ہے ہی..... البتہ اس طرح میں آپ کی تنہائی سے

فائدہ نہیں اٹھاؤں گا کم از کم۔“ اس نے مجھے یقین دلایا۔

”نہیں، میں گھر فون کر کے تیمور یا مظہر کو بلا لیتی ہوں۔“ میں نے اس کی آفر کو ٹھکرا دیا۔

”کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا آپ نے ابھی تک؟“ اس نے درست اندازہ لگایا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے، بس کہیں سے فون کروادیں، شکریہ۔“ میں نے کہا۔

فون بوتھ کیفے ٹیریا کے ساتھ ہی تھا۔ اس کے پاس لمبی لائن تھی۔ ڈاکٹر معظم کے پاس موبائل

فون بھی نہیں تھا۔ نہ ہی میں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ یوں بھی موبائل فون ان دنوں اتنے عام نہیں تھے۔ میں حیران تھی کہ کم از کم ڈاکٹر کے پاس تو موبائل فون ہونا چاہیے، اگر اس سے کوئی رابطہ کرنا چاہے تو؟ ڈاکٹر معظم نے بتایا کہ ان کے پاس Pager ہوتے ہیں اور یوں بھی وہ جہاں کہیں بھی ہوں اسپتال کے احاطہ میں تو اسپیکر سسٹم پورے اسپتال میں لگا ہوا تھا اور کسی بھی ضرورت کے وقت ڈاکٹر کو اس کی مدد سے کال کر لیا جاتا تھا۔ مجبوراً انتظار کے لیے کیفے ٹیریا میں بیٹھنا پڑا تو وہ دوجوس اور سینڈویچز کی پلیٹ لے آیا۔ بھوک تو ستار ہی تھی اور یوں بھی انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ٹیلی فون کیا تو امی جان نے بتایا کہ مظہر دوستوں کے ساتھ پڑھائی کے لیے گیا ہے اور تیمور کسی دوست کے ساتھ کھانے پر۔ میں جانتی تھی کہ وہ دوست کون ہے۔ ماہ رخ کے پاس موبائل فون تھا مگر اسے کال کروں تو وہ ڈسٹرب ہوں گے۔ بہت عرصہ کے بعد وہ مل رہے تھے مجھے اچھا نہیں لگا ان کو ڈسٹرب کرنا۔ تب میں نے علی بھائی کو کال کرنے کا سوچا تو ڈاکٹر معظم نے منع کر دیا کہ ان کو اس وقت ڈسٹرب نہ کروں، وہ مجھے ڈراپ کر دے گا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہوئی اور اس نے گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو میں نے پچھلا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ، تمام سفر خاموشی سے کٹا۔

ساڑھے دس ہونے والے تھے میں نے گھر کے قریب پہنچ کر اسے گھر کا راستہ سمجھانا شروع کر دیا۔ گھر کے پاس پہنچے اور گاڑی رکی تو مجھے پورچ میں تیمور کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ گھر آچکا تھا۔ میں نے نکلے نکلے سوچا کہ اندر جاؤں گی تو وہ پوچھے گا کہ کس کے ساتھ آئی ہوں۔ جھوٹ تو بول نہیں سکتی کہ پول کھل جائے گا اور سچ کہا تو وہ ڈاکٹر معظم کو پہلے ہی مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے جانے کیا سمجھے۔ میں واپس گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ذہن کشمکش میں تھا۔ ”ڈاکٹر معظم! اگر آپ برآمدہ نہیں تو مجھے ابو کی طرف چھوڑ دیں۔“ میں نے شرمندگی سے کہا۔

”خیریت ہے؟ اس طرح گھر پہنچ کر آپ نے اپنا ارادہ کیوں تبدیل کر دیا؟“ وہ حیران تھا۔

”وہ مجھے یاد آیا کہ میں نے ابو سے کہا تھا کہ میں ادھر آ جاؤں گی۔“ میں نے بہانہ ٹھرا۔

”مگر آپ تو رات اسپتال میں رہنے والی تھیں۔ ابو سے آپ نے کس وقت کہا ہوگا؟“ اس

نے گاڑی چلا دی مگر اس کا تجسس برقرار تھا۔

”آپ بحث کیوں کر رہے ہیں؟ اگر آپ کے لیے کوئی مسئلہ تو آپ مجھے یہیں ڈراپ کر دیں۔“ میں نے یہ جانتے ہوئے وہ کبھی مجھے یوں ڈراپ نہیں کرے گا دھمکی دی۔

”ارے ایسی بھی کیا بات ہے، اگر آپ میری ہمراہی میں سفر کرنا چاہتی ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن اس تشنہ سی ہمراہی کا کیا فائدہ؟ مزہ تو تب ہے کہ قریب بیٹھ کر ہم سفر بنو.....“ وہ بہک رہا تھا مگر میں خاموش رہی۔ خود ہی میں نے اس مصیبت کو دعوت دی تھی۔

عورت بے چاری! تنہا ہو جائے تو بن جاتی ہے، اندیشوں کے سائبان تلے زندگی گزارنے والی۔ دنیا کیا کہے گی؟ لوگ کیا سوچیں گے؟ ابانا راض نہ ہوں! اماں دیکھی نہ ہو! بھائی کی عزت پر حرف نہ آئے، شوہر کی انا مجروح نہ ہو! بیٹا شرمندہ نہ ہو! انہی اندیشوں کے زیر سایہ وہ اپنا ہلوہو وجود اور کرچی کرچی بدن لیے عمر بھر چلتی ہے..... پل صراط کی طرح، کبھی کانٹوں پر، کبھی اٹکیوں پر، کبھی نیزوں پر.....

”لگتا ہے تیمور صاحب گھر لوٹ آئے ہیں اور آپ ان کے خوف سے ابو کے ہاں جا رہی ہیں..... کیونکہ وہ پوچھے گا، اس وقت آئی ہو؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟ کیسے آئی ہو؟ کس سیٹ پر بیٹھی تھیں؟ کیا کیا باتیں ہوئیں راستے میں؟“ وہ غضب کا قیافہ شناس تھا اور میرے ذہن کی سلیٹ پر لکھا ایک ایک حرف اس نے جزئیات سمیت درست بولا تھا۔

”ایسا بد تمیز نہیں ہے تیمور، وہ میرا بھائی ہے اور کوئی اس کے بارے میں ایسے بات کرے یہ بھی مجھے پسند نہیں ہے۔“ میں نے خفگی سے کہا۔

”چلو شکر ہے کہ وہ بھائی ہے، کم از کم اپنا اسکوپ تو ہے مگر وہ بات آپ سے ایسے ہی کرے گا اگر آپ کو شک ہے تو میں گاڑی موڑ لیتا ہوں آپ گھر جا کر دیکھ لیجئے!“ اس نے مجھے چیلنج کیا۔

”وہ کیا کہے گا یا کیا سوچے گا اس کی ایسی اہمیت نہیں ہے ڈاکٹر معظم! بات یہ ہے کہ اگر آپ میں سننے کا حوصلہ ہے تو حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود ہی یہ سوچ کر عجیب لگا کہ میں آپ کے ساتھ آئی ہوں۔ مجھے ہرگز آپ کے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے بے وقوفی کی جو آپ کی باتوں میں آگئی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ تیمور کو یہ علم ہو کہ اس کی بھابی کتنی بڑی بے وقوف ہے۔“ مجھے جانے کس بات پر غصہ تھا جو میں نے اس پر نکال دیا۔

اس کے بعد والدہ کے گھر پہنچنے تک خاموش رہی، اس نے مجھے ڈراپ کر کے گاڑی لاک

کی، علی بھائی کو ملا اور پھر روانہ ہوا۔ مجھے اس کے اس طرز پر کوئی اعتراض نہ تھا اور نہ ہی علی بھائی کو برا لگا، اس لیے کہ وہ صدف باجی کی طرف سے ہمارا رشتے دار بھی تو تھا اور یہ بات تیمور کو سمجھانا اتنا ہی مشکل ہوتا۔ ابو سوچکے تھے، علی بھائی نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی ڈنر سے لوٹے ہیں۔ انہوں نے کافی اصرار کیا کہ میں رک جاؤں مگر میں نے انہیں مجبور کیا کہ مجھے گھر چھوڑ آئیں۔

سوا بارہ کا وقت تھا جب میں گھر پہنچی۔ گیٹ تیمور نے کھولا اور علی بھائی سے کافی اصرار کیا کہ وہ ہمارے ساتھ چائے پیئیں۔ دیر کا بہانہ کر کے علی بھائی روانہ ہوئے۔ مظہر ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ امی جان سوچکی تھیں۔ تیمور چائے پینا چاہ رہا تھا جب کہ مجھے نیند آرہی تھی، تاہم اس نے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ میں سمجھی کہ اسے مظہر کی بات کرنا تھی، غالباً وہ رات بھر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا چاہ رہا تھا اور دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کب واپس آتا ہے۔ مجبوراً میں نے چائے کے دوگ بنائے اور لاؤنج میں آکر تیمور کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھی۔

”کہاں تھیں آپ ابھی تک؟“ عجیب لہجے میں اس نے پوچھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کس چیز کا مطلب پوچھ رہی ہیں آپ؟“ اس نے سوال کا جواب سوال میں دیا۔

”میں اسپتال میں تھی پھر وہاں سے ابو کے گھر اور پھر اب علی بھائی کے ساتھ گھر آئی ہوں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اسپتال سے کتنے بجے نکلیں آپ؟“ اس نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ دس ساڑھے دس کا وقت ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر تم بحث کیوں کر رہے ہو؟“

”اسپتال سے گھر کیسے گئیں آپ؟“ اس نے تفتیشی انداز میں اگلا سوال داغا۔

”علی بھائی کے ساتھ.....“ میں نے فوراً جھوٹ گھڑا۔

”پھر.....!“ اس نے مبہم سا سوال کیا۔

”ہوا کیا ہے آخر تمہیں؟ کیوں اس طرح سوال کر رہے ہو؟“ میں نے چڑ کر کہا۔

”میں نے کوئی فالتو سوال تو نہیں کیا، یونہی وقت گزارنے کے لیے باتیں کر رہا ہوں، پوچھ رہا ہوں کہ آپ کا دن کیسا گزرا؟ آپ بھی مجھ سے پوچھ لیں کہ میرا دن، میری شام کیسی گزری؟“ اس نے خوش دلی سے کہا تو میرے دل پر سے گویا ایک بوجھ سرک گیا۔

”اچھا کیسا رہا تمہارا ڈرن؟ ماہ رخ ناراض تو نہیں ہوئی؟“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔  
 ”ڈرن اچھا رہا..... ماہ رخ کی ناراضی کا علم نہیں!“ اس نے کندھے اچکا۔

”ہیں، یہ کیا بات ہوئی، اگر وہ ناراضی کا اظہار کرے گی تو علم تو ہوگا ناں کہ وہ کتنی ناراض تھی؟ کتنی جلدی مان گئی اور ڈرن کہاں پر کیا؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس کی ناراضی کا علم اس لیے نہیں ہو سکا کہ اس سے ملاقات ہی نہ ہو سکی اور ڈرن صرف باجی کے گھر پر تھا۔ میں تھا، علی بھائی تھے، آپ کے ابو تھے، صدف باجی کے جیٹھ تھے اور ڈاکٹر معظم کی والدہ تھیں رانی باجی.....“ اس نے میرے سر پر ہم پھوڑا۔ ”نوبے صدف باجی نے حکم دیا کہ آپ کو اسپتال سے لے کر آتا ہے۔ ساڑھے نو بجے ہم اسپتال پہنچے تو آئی نے بتایا کہ آپ ڈاکٹر معظم کے ساتھ جا چکی ہیں، ہم واپس صدف باجی کی طرف گئے، آپ وہاں نہیں پہنچی تھیں، پھر میں گھر آیا اور علی کو کال کیا تو آپ وہاں بھی نہیں تھیں۔

گیارہ بجے کے قریب گھر کے سامنے ڈاکٹر معظم کی گاڑی آئی، اندر کون کون تھا نظر نہیں آیا، کم روشنی اور فاصلے کے باعث، لیکن ظاہر ہے کہ آپ دونوں تھے پھر دو منٹ گاڑی رکی رہی، میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا، ہاں میرے کمرے کی بتی بند تھی اس لیے آپ مجھے نہ دیکھ سکیں پھر آپ روانہ ہو گئیں اور اب آپ بارہ بجے کے بعد گھر آ رہی ہیں اور یہ جھوٹ بول رہی ہیں کہ آپ علی بھائی کے ساتھ گھر گئی تھیں.....؟ اور ہاں آپ کی باجی کے گھر مجھے اس لیے کھانے پر بلایا گیا تھا کہ ڈاکٹر معظم کی آپ سے شادی کی خواہش آپ کو بتاؤں اور آپ کو اس بات کے لیے مناؤں..... اور میرے ساتھ آپ سب لوگ مل کر یہ ڈراما کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں مجھے یہ توقف بنارہے ہیں؟ خود آپ آدھی رات تک اس کے ساتھ جانے کہاں کہاں گھوم رہی ہیں اور میں آپ کو مناؤں.....؟“ وہ چیخ رہا تھا اور میرے سارے بدن سے جان نکل رہی تھی، میری بے وقوفی تھی جو میں نے یہ تمام چکر چلایا تھا، صرف اس ڈر سے کہ تیمور جانے کیا سوچے گا اور میری چوری کا پول کھلا بھی تو کتنے بے ہودہ طریقے سے۔

یہاں ڈاکٹر معظم ہوتا تو زور زور سے تالیاں بجاتا اور قہقہے لگاتا اور کہتا۔ ”دیکھو میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تیمور تم سے کیا کیا سوال کرے گا۔“ میں نے بے بسی سے اپنے ہونٹ چبا ڈالے۔ میرا بھی جی چاہ رہا تھا کہ تیمور ہی کی طرح چیخوں، چلاؤں اور اسے اپنی صفائی پیش

کروں۔ اسے بتاؤں کہ میں اسی کے سوالوں کے خوف سے ابو کے ہاں واپس چلی گئی تھی۔ اسے کیسے بتاؤں کہ مجھے معظم کا ساتھ کتنا گوار لگتا ہے، کیسے اسے اپنی پاکی داماں کا یقین دلاؤں۔

”یا اللہ! تو تو انسانوں کے راز رکھ لیتا ہے، ان کی غلطیوں پر پردے ڈال لیتا ہے، تو ہی میری اس بے وقوفی پر پردہ پڑا رہنے دیتا! تو ہی میرے جھوٹ کا پول نہ کھلتا۔“ میں دل ہی دل میں فریادیں کر رہی تھی۔ تیمور کے الفاظ تھے یا بر چھیاں..... دل چاہ رہا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اسے پیٹ ڈالوں لیکن وہ میری بات پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔ ایک ذرا سا جھوٹ بول کر میں نے اپنی سچائی کو مشکوک کر لیا تھا۔ جس لمحے کا سامنا کرنے سے میں بچ رہی تھی وہ لمحہ عین میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاش میں بے ہوش ہو جاتی..... کاش زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ کتنی بڑی تہمت لگا رہا تھا وہ مجھ پر۔ میری آنکھیں دھندلانے لگیں اور شدید قسم کا چکر آیا۔ غالباً زلزلہ آیا تھا، ہر چیز گردش کر رہی تھی۔ میں صوفے پر ڈھسے سی گئی اور ذہن غنودگی میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آنکھ کھلی تو تیمور گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھا مجھ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ مجھے ایک ہاتھ سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ تبھی بیرونی دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے مظہر گھر کے اندر تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بری طرح چونکا۔ ”آپ دونوں رات کے ایک بجے یہاں کر رہے ہیں؟“ اور میں جو پہلے ہی الزامات کی بوچھاڑ سے بیہوش ہو گئی تھی، میرا بدن سن ہو گیا۔

”تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے شہزادے!“ تیمور نے طنز سے کہا۔

”بڑے قابل اعتراض انداز میں انتظار کر رہے تھے آپ؟“ مظہر کا طنز اس سے بھی سوا تھا۔

”بکواس بند کرو تم! بھابی بے ہوش ہو گئی تھیں۔“ تیمور نے لہجے کو ذرا سا تبدیل کیا۔

”بھابی تو بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہیں، ایسا کیا کہہ دیا آپ نے جو وہ بے ہوش ہو گئیں۔“ وہ طنز سے ہنسا۔

”تم کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟“ تیمور گرجا۔

”آرام سے بات کریں، میں اسٹڈی کر کے آرہا ہوں!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”کون سی اسٹڈی اور کہاں کی اسٹڈی کر رہے تھے تم اس وقت؟“ تیمور اسی انداز میں بولا۔

”آپ کو مجھ پر کیا شک ہے کہ میں اس وقت کسی سینما سے آرہا ہوں یا پھر کسی لڑکی کے پاس



”سے؟“ مظہر نے انتہائی تحمل سے کہا۔

”نہ مجھے تمہارے سینما جانے پر اعتراض ہے نہ کسی لڑکی کے پاس جانے پر..... لیکن مجھے اس سب پر اعتراض ہے جو تم کرتے پھر رہے ہو۔“ تیمور نے غصے سے کہا۔

”مظہر..... تیمور! تم دونوں آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“ میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ٹیٹس کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں ہاتھ پائی کی نوبت نہ آجائے۔ میں نے مظہر کو پکڑ کر لاکر اپنے پاس صوفے پر بٹھایا، تیمور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ کو کیا ہوا؟ کیوں بے ہوش ہوئیں؟ تیمور بھائی نے کچھ کہا؟“ مظہر نے انتہائی نرمی سے مجھ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس والدہ کی طرف سے پریشان تھی۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔  
”سوری! میں آپ سے پوچھنا بھول گیا، دوپہر کو امی جان نے بتایا بھی تھا۔ کیسی ہے اب آنٹی کی طبیعت؟“ اس نے شرمندگی اور تشویش کا اظہار کیا۔  
”کافی بہتر ہیں، بس ذرا کمزوری ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“ میں نے اسے بتایا۔

”ہاں تو کیا مصروفیات ہیں بھی تمہاری برخوردار؟“ جب سے تیمور آرمی میں گیا تھا اس طرح کے طرزِ مخاطب اس کی گفتگو کا حصہ بن گئے تھے، برخوردار، شہزادے، بچے، بیٹے، الو کے پٹھے..... ہر موقع محل کے حساب سے اس کا طرزِ مخاطب جدا ہوتا تھا۔

”میری مصروفیت پڑھائی ہے اور بروز ہفتہ دفتر جاتا ہوں، بھابی سے کاروبار کی سوجھ بوجھ حاصل کر رہا ہوں۔“ مظہر نے تابعداری سے جواب دیا۔ ”لیکن آپ کا طرزِ گفتگو فوج سے زیادہ پولیس کے انداز کا ہے۔“

”ریوالور کہاں سے لیا ہے تم نے اور کیوں لیا ہے؟“ تیمور نے اچانک گویا بم کا دھماکا کیا، میں گڑبگڑا گئی اور مظہر بری طرح سے چونکا، میری طرف چہرہ پھیرا اور آہستگی سے بولا۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ میرے کمرے کے اندر گئی تھیں!“ لیکن اس کی آواز تیمور تک بھی پہنچ گئی۔

”بڑبڑمت کرو، میری طرف دیکھ کر مجھ سے بات کرو۔“ تیمور پھر بلند آواز میں بولا۔ ”ایسی کون سی غلطی شے تم نے اپنے کمرے میں پال رکھی ہے جو ہر وقت اسے لاک رکھتے ہو؟ کون سے جرائم میں ملوث ہو تم؟“ زور زور سے پیر پختا ہوا وہ اٹھا اور کمرے کے دروازے کا لاک کھول کر دھاڑے سے اُسے کھولا، دروازہ زور سے جا کر دیوار سے لگا اور ایک دھماکے جیسی آواز آئی، امی جان بھی جاگ کر کمرے سے نکل آئیں اور پوچھنے لگیں کہ کیا ہوا ہے، تیمور بہت غصے میں تھا اور اس سے بڑھ کر غضب ناک مظہر ہورہا تھا۔

”آئیے میرے کمرے میں اور دیکھ لیں میرے وہ جرائم جن پر میں پردہ ڈالتا ہوں۔“ کہتا ہوا وہ دروازے کے پتھوں بچ کھڑا تھا اور امی جان ”ہوا کیا ہے؟ کیا مسئلہ ہے؟“ جیسے سوالات پوچھ رہی تھیں۔ ”انہی سے پوچھیں کہ کیا ہوا ہے؟ جیسے خود ہیں ویسا ہی سب کو سمجھتے پھرتے ہیں۔“ قریب تھا کہ تیمور کا بھاری ہاتھ مظہر پر اٹھتا، میں نے اسے پکڑ لیا۔  
”مظہر تم تیز سے بات کرو، بڑا بھائی ہے تمہارا!“ میں نے مظہر کو سرزنش کی۔

”آخر ہوا کیا ہے جو دونوں اس طرح پھرے ہوئے ساڈبے ہوئے ہو؟“ امی جان ابھی تک صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”یہ دیکھیے امی جان! یہ کیا کرتا پھر رہا ہے!“ تیمور نے کمرے میں داخل ہو کر تین چار کتابیں اٹھا کر امی جان کو دکھائیں۔

”یہ تو سب اسلامی کتابیں ہیں، اس میں برا کیا ہے؟“ امی جان کچھ نہیں سمجھی تھیں۔  
”جی ہاں امی جان! تیمور بھائی کو یہی اعتراض ہے کہ میں اسلامی کتابیں کیوں پڑھ رہا ہوں۔“ مظہر نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

”بکو اس بند کرو۔“ تیمور نے پھرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”جس طرف تم جا رہے ہو وہ راستہ اسلام کا نہیں بلکہ انتہا پسندی کا ہے۔ اسلام اعتدال کا مذہب ہے اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو، نہ کہ دفتر میں کام کرنے والے ورکرز اور لیڈی ورکرز کے۔“ تیمور کی بات نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ دو دن سے میں دفتر نہیں گئی تھی اس لیے جانے دفتر میں کیا ہوا تھا۔

”یہ تم کیا بات کر رہے ہو تیمور؟“ میں نے تیمور سے پوچھا۔  
”بھابی! میں کل دفتر گیا تو مجھے یہ علم ہوا کہ شہزادے نے یہ حکم جاری کیا ہے کہ دفتر میں کام

کرنے والی تمام خواتین کو پورے بازوؤں والے لباس پہننا ہوں گے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے، سر پر حجاب یا چادر لازمی ہے اور تمام اشاف، مرد حضرات وغیرہ بھی شلواری قمیص پہنیں یا ڈھیلے لباس اور ممکن ہو تو داڑھی بھی رکھیں اور نئی بھرتی کرتے وقت امیدواروں کا بارلش ہونا ضروری ہے۔“ تیمور نے انکشاف کیا۔

”تو کیا ہوا ماہ بھابی سر پر دوپٹا نہیں لیتی ہیں، پورے بازوؤں کے اور ڈھیلے ڈھالے لباس نہیں پہنتی ہیں۔ اس سے کیا ان کی شان میں کوئی فرق آ جاتا ہے؟“ مظہر نے غصے سے کہا۔

”لیکن میں تو یہ اپنی مرضی سے پہنتی ہوں کسی کے کہنے پر تو نہیں کرتی۔ تم نے داڑھی رکھی ہے تو سید رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے، کسی کے کہنے پر تو نہیں رکھی ناں۔ ہمارا مذہب تو جبر کا مذہب ہے ہی نہیں۔ اللہ نے ہمیں حقوق و فرائض بتا دیئے، نیکی اور بدی کے راستے بتا دیئے، جزا اور سزا کی بابت بتا دیا اور پھر ہمیں عقل دی کہ ہم اچھے برے کی تمیز کر سکیں، ہر کوئی اپنے ذاتی فعل کے معاملے میں آزاد ہے۔“ میں جو کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ اسے بیٹھ کر سمجھاؤں گی، وہ موقع مجھے آج ہی مل گیا تھا۔

”اگر ہر کوئی اپنے اچھے برے کے انتخاب میں آزاد ہے تو یہ صاحب مجھے کیوں لعن طعن کرتے ہیں؟“ اس نے غصے سے سوال کیا۔

”یونہی غصے میں اس کے منہ سے نکل گیا، چلو اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔“ میں نے ہاتھ جوڑے۔ تیمور پھر اکھڑا تھا اور امی جان ششدر۔

”کیوں یہ باتیں کیا گالی ہیں جو غصے میں ان کے منہ سے نکل گئی۔ یہ ہر وقت میری داڑھی کی تضحیک کرتے ہیں، صرف ایک یہی نہیں، اور بھی بہت سے لوگ.....“ وہ آنسوؤں سے رونے لگا۔

”چلو غصہ تھوک دو.....“ میں نے اس کے کندھے تھپکے۔

”آپ اس کو زیادہ سر پر مت چڑھائیں، یہ کسی انتہا پسند تنظیم کا حصہ بن گیا ہے۔ آپ کو نہیں اندازہ کہ اس وقت باہر کیا حالات ہیں، یہ جانے کیا کرتا پھر رہا ہے۔ بڑا بھائی دنیا سے چلا گیا، میں بھی اس گھر سے نکلا ہوں تو اس نے سمجھ لیا کہ آج نہیں تو کل مر ہی جاؤں گا اور یہ آزاد ہے جو مرضی کرتا پھرے۔“ تیمور کی بات پر امی جانے رونے لگیں اور مظہر سر بہوڑائے کھڑا رہا۔

”آفرین ہے تیمور! کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ مادر وطن کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے اور باتیں

کر رہے ہو ایسی فضول قسم کی۔“ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

”آپ پوچھیں امی! اس سے پوچھیں کہ یہ کیا کرتا پھر رہا ہے..... اگر اس نے مذہب کا مطالعہ کرتا ہے تو ضرور کرے، بہت اچھی بات ہے مگر یہ کہاں آدھی آدھی رات تک غائب رہتا ہے؟ کہاں گھومتا ہے؟ کیا کرتا پھر رہا ہے؟ کمر کیوں ہر وقت لاک رکھتا ہے اور اس نے ریو الور کیوں رکھا ہے؟“ تیمور روانی میں ریو الور کا ذکر بھی کر گیا جو غالباً اسے امی جان کے سامنے نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ بہت خوف زدہ ہو گئی تھیں۔

”کیوں چھوٹو؟“ وہ آگے بڑھ کر اس کے سامنے آنکھڑی ہوئیں۔ اس کا سر مزید جھک گیا تھا۔ ”کیوں رکھا ہوا ہے تم نے ریو الور؟“

”امی! وہ“ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ ”وہ ریو الور میرا نہیں بلکہ میرے ایک دوست کا تھا۔ تھوڑے دنوں کے لیے میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں اس سے چلا نا سیکھ رہا تھا۔“

”تم نے کیا کرتا ہے ریو الور چلا نا سیکھ کر؟“ میں نے سوال کیا۔

”کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے بھابی!.....!“ اس کے لہجے میں وہی ازلی معصومیت تھی جو اس بات کا تادیبی تھی کہ اسے ابھی ان چیزوں کی سمجھ ہی نہیں تھی۔

”تمہیں جو کچھ چاہیے ہو مجھے بتاؤ، میں بڑی ہوں ناں تم سے؟ امی جان کو بتاؤ یا پھر بڑے بھائی کو۔ اگر تمہیں ریو الور سیکھنے کا شوق ہے تو تیمور خود تمہیں سکھادے گا اور ریو الور رکھنے کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی رکھ لینا لیکن لائسنس کے ساتھ اور اب اچھے بچوں کی طرح بڑے بھائی سے معافی مانگو۔“ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”پہلے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے، میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے، پھر اس نے امی جان سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا پھر وہ تیمور کے سامنے جا کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بغیر کچھ بولے، بغیر کچھ کہے۔

”ٹھیک ہے بس.....“ تیمور نے رکھائی سے کہا۔

”ٹھیک نہیں ہے بڑے بھائی۔“ وہ رونے لگا۔ ”بھٹک گیا تھا..... آپ سے گستاخی کی ہے۔“

معاف کر دیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”کہہ دیا نا بس ٹھیک ہے، آئندہ خیال کرنا۔“ تیمور نے بڑے افسرانہ انداز میں معافی دی۔

”یوں نہیں! گلے لگا کر کہیں.....“ وہ بچیوں سے رونے لگا۔ ”مجھے معاف کر دیں..... آپ یاد کریں کہ کب آپ نے مجھے گلے لگایا ہوگا؟ جب بھی بات کرتے ہیں طنز سے، جب ملتے ہیں ڈانٹ دیتے ہیں۔ میں دیکھتا رہ جاتا ہوں کہ بڑا بھائی ہے کبھی میرے سر پر ہاتھ رکھے گا..... نہ مجھے ابو کا دستِ شفقت ملا، غالب بھائی بھی چھوڑ کر چلے گئے، میں تو یونہی ہو گیا ہوں جیسے میرے میلے میں کوئی بچہ کھو گیا ہو، پھنڑ گیا ہو اپنے پیاروں سے۔ میں کیا کروں، مجھ جیسے محروم بچے جب کسی کا بھی دستِ شفقت پاتے ہیں تو اسی کی ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں غلط یا درست، کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے میرے مسائل سننے کا۔“ وہ رورہا تھا اور ہم سب سن بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کرسی پر تھی، تیمور صوفے پر اور امی جان مظہر کے بیڈ پر۔ تیمور نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور خود بھی رونے لگا۔

”مجھے معاف کر دے یار، میں بڑا بے وقوف ہوں۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک جو نیز کی طرح ٹریٹ کیا ہے، بھول ہی گیا کہ تو میرا بھائی بھی ہے، میرا چھوٹا بھی، تو ہی تو اس دنیا میں میرا دایاں بازو ہے.....“ میں اور والدہ بھی رورہے تھے۔ ”آئندہ کبھی مذاق نہیں اڑاؤں گا تیری داڑھی کا یار، ایک بار معاف کر دے۔“

”بات میری نہیں ہے، داڑھی کا مذاق اڑانا یوں بھی گناہ ہے۔ میرا اور آپ جو چاہے مذاق اڑالیں۔“ مظہر روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دونوں بھائی بھی دیر تک روتے رہے، گلے شکوے کرتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کثیف دھوئیں کے بادل چھٹ رہے ہوں اور فضا صاف ہو رہی ہو۔ طبیعت بھی ہلکی ہو گئی تھی۔

اگلی صبح مظہر کالج جا چکا تھا، میں دفتر جانے کے لیے تیار تھی کہ تیمور بھی تیار ہو کر نکل آیا۔ والدہ نے استفسار کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ دفتر جا رہا ہے۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ مجھ سے اس نے براہِ راست پوچھا۔ میرے اندر ابھی تک اس کے لیے ناراضی تھی۔

”امی جان! ذرا اپنے ہاتھوں سے پر اٹھا تو بنادیں.....“ میں سمجھ گئی کہ وہ انہیں دانستہ وہاں سے اٹھا رہا ہے۔

”میں دفتر جا رہی ہوں۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔

”دفتر تو میں جا رہا ہوں، آپ اسپتال نہیں جائیں گی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں!“ میں نے لب بھینچ کر کہا۔ ”والدہ گھر آئیں گی تو میں ان کی خیریت معلوم کرنے

چلی جاؤں گی۔“

”کیوں؟“ اس نے مجھ سے سوال کیا، میں نے رخ موڑ لیا۔

”اسپتال جاؤں گی تو تم نہ جانے اس کو اور کون سا رنگ دو گے؟“ میں نے مختصر کہا۔

”آپ بڑی ہیں مجھ سے! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، اپنی بدتمیزی کی۔“ وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔

”میں چھوٹی ہوں تم سے، بڑی نہیں۔“ میں نے ہلکے سے کہا۔

”میں عمر کی نہیں مرتبے کی بات کر رہا ہوں، رشتے کی بات کر رہا ہوں۔“

”کوئی مرتبہ بڑا نہیں ہے میرا۔ میں اپنی حیثیت جانتی ہوں اور کون سا رشتہ؟ ہونہہ..... اس

کی وساطت سے جو ہے ہی نہیں؟ اور وہ جو زندہ ہوتے تو شاید تم مجھ پر یوں ہتھیں بھی نہ لگاتے۔“ میں سسک پڑی۔

”کہانا معاف کر دیں، آپ غلط سمجھیں، بخدا میں نے آپ پر تہمت نہیں لگائی۔ آپ نے جھوٹ بولا تو مجھے غصہ آ گیا۔ آپ کی تو آنکھیں بھی آپ کے اس چھوٹے سے جھوٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔“ ابھی تک وہ ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا اور میں لا تعلقی سے بیٹھی تھی۔ آنکھیں پانیوں لبریز تھیں۔ امی جان تیمور کا پر اٹھانا کر لے آئی تھیں۔ وہ میرے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

”اب کیا ہوا؟ تم روئی ہو ابھی؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں تو.....“ میں نے نشو و پیر سے آنکھیں پونچھیں۔

”پریشان نہ ہو بیٹا! بہن جی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی اور ہاں تم تیار ہو تو تیمور تمہیں اسپتال چھوڑتا ہوا ہی دفتر جائے گا۔“ میں نے کافی حیل و حجت کی کوشش کی مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ مجبوراً میں نے کمرے میں جا کر بیک اٹھایا اور امی جان کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلے۔ تیمور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے کھڑا تھا، میں نے خاموشی سے کچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ اس نے گاڑی اشارت کی اور گھر سے باہر نکالی۔ گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر گاڑی کھڑی کی اور سر موڑ کر پیچھے دیکھا۔

”آگے آ جائیں، نہ میں آپ کا ڈرائیور ہوں نہ ڈاکٹر معظم!“ میں چونک اٹھی۔

”تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں گاڑی کے اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، ہو سکتا ہے کہ میں ڈاکٹر معظم

کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوں۔“ میں نے جان بوجھ کر کہا۔

”میں آپ کو اتنی اچھی طرح تو جانتا ہوں.....“ اس نے مختصر اُ کہا۔

”غلط دعویٰ ہے تیور! تم مجھے بالکل نہیں جانتے۔“ میں نے ناراضی سے کہا۔

”کوئی گنجائش نہیں معافی کی بھائی؟“ اس نے اتنی معصومیت سے کہا کہ مجھے ترس آ گیا۔ اپنی مسکراہٹ چھپانے کو میں نے سر نیچے کر لیا۔ بیک اٹھایا اور دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر جا بیٹھی۔

”شکریہ بھائی! آپ نے بھی سمجھا عزت کے قابل مجھے!“ وہ بھونڈے انداز میں گنگنا رہا

تھا۔ میں ہنس پڑی۔ ”اگر آپ میرا کہنا نہ مانتیں تو میں..... تو میں واپس چلا جاتا۔“

”یہ کیا دھمکی ہے؟ واپس تو تمہیں جانا ہے اور تین دن میں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن پھر میں آتا بھی نہیں!“ اس نے کہا۔

”اللہ نہ کرے!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں دل سے؟“ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

”ہوں!“ میں آہستگی سے بولی۔

”دفتر کا چکر لگا کر پلیز آج ماہ رخ سے مل لو، اس کا پارا بہت گرم ہو رہا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”تو ہونے دیں، آپ کیا ڈرتی ہیں اس سے؟“ وہ ہنسا۔

”وہ تم پر دل و جان سے مرتی ہے اور یہ آگ دونوں طرف سے برابر ہے یہ بھی جانتی ہوں،

حیرت ہے تم کیسے صبر کیے بیٹھے ہو؟“ میں حیران تھی۔

”اصل میں، میں نے اسے کل کال کیا تھا اور کل ہمیں ڈنر پر ملنا تھا پھر صدف باجی نے بات

کی تو میں نے اسے معذرت کے لیے کال کیا اور آج کا پروگرام بتایا۔“ تیور نے بتایا۔

”چلو جو بھی ہے آج ضرور مل لینا۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”بات تو پوری سنیں!“ وہ جھنجھلایا۔ ”جب میں نے اسے پروگرام بتایا تو اس نے انکار کر دیا،

کہنے لگی چار دن سے آئے ہو، اب خیال آیا ہے..... ابھی بھی نہ ملو، جاؤ بھاڑ میں اور فون بند کر دیا۔

بڑی بدتمیزی لگی مجھے یہ اس کی۔ مجھے جہنم میں جانے کا کہتے ہوئے اس نے کچھ سوچا بھی نہیں۔“

”ارے نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا، وہ تو اس نے یونہی محاورہ کہہ دیا ہوگا۔ میں بات

کروں گی اس سے۔“ میں نے اس کی بات کو کور کیا۔

”ویسے اس دنیا میں جینے کے لیے یا بندے کو موٹے دماغ اور عقل کا ہونا چاہیے یا پھر آپ جتنے بڑے ظرف کا مالک۔ داد دیتا ہوں، جانے اب تک کیا، کیا برداشت کرتی آئی ہیں اور آئندہ کیا، کیا برداشت کریں گی؟“ وہ ہنسا۔

”چلو پہلے مجھے کسی پی سی او سے اس سے بات کروادو۔“ میں نے کہا تو اس نے گاڑی روک

دی۔ مجھے تو کہیں کوئی پی سی او نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر نکلا اور ڈکی کھول کر اس میں سے ایک

پیکٹ نکال لایا۔ میری طرف پیکٹ بڑھایا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”آپ کو سالگرہ مبارک ہو.....“ اس نے مختصر اُ کہا اور میں شدید حیرت سے دوچار ہو گئی۔

”تمہیں کیسے یاد رہا یہ دن؟“ میں نے پوچھا۔ شادی کے بعد پہلی دفعہ کسی نے مجھ سے یہ جملہ

کہا تھا۔ غالب کی وفات نے زندگی کے سارے خوبصورت رنگ، فقرے اور جملے مجھ سے چھین

لیے تھے۔ میں نے پیکٹ کھولا تو اندر ایک خوبصورت سیاہ موبائل فون تھا۔

”یہ آپ کے لیے ہے، اب آپ کو اس کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ چلیں آپ اس سے

کال کریں جس کسی کو بھی کرنی ہے۔ میں نے تمام ضروری نمبر اس میں بھر دیئے ہیں۔“ پھر اس نے

مجھے کال کرنے کا طریقہ بتایا۔ میں نے ماہ رخ کا نمبر ڈائل کیا، تیور نے ہاتھ بڑھا کر اسپیکر آن کر دیا۔

”السلام علیکم ماہ رخ، میں ماہ پاول رہی ہوں!“

”وعلیکم السلام! کیا حال ہے تمہارا اور کیا حال ہے آنٹی کا؟ سوری یار میں نکل ہی نہیں سکی،

طبیعت ذرا خراب تھی۔“

”کیوں نصیب دشمنان کیا ہو گیا؟“

”بس یونہی ذرا سر میں درد تھا.....“

”سر میں یاد دل میں؟“ میں ہنسی۔

”تم بتاؤ کس کا نمبر ہے یہ جہاں سے کال کر رہی ہو.....؟“

”میرا اپنا ہے، نیا نمبر ہے اور سب سے پہلی کال تمہیں ہی کر رہی ہوں۔“

”تھینک یو، میں نمبر اسٹور کر لیتی ہوں۔ اچھا کیا اب رابطہ رہے گا۔“

”تیور سے ناراض ہو تم کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کیا ناراض ہوں گی، وہ خود ہی مصروف ہے۔“

”اس کی مصروفیت تو بلا جواز نہیں اور پھر تم جانتی ہو کہ امی کو تو نہیں معلوم کہ تم لوگ اکیلے بھی ملتے ہو۔ اتنے دنوں سے وہ مجھے کہہ رہی تھیں کہ تیمور کے ساتھ جا کر ادھر سے ہو آؤ اور میری مجبوری میں تو تمہیں شک نہیں ہونا چاہیے۔“

”ارے نہیں تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو۔“

”تیمور بے چارہ تو تڑپ رہا تھا تمہیں ملنے کو۔۔۔۔۔“

”مجھے بھی تو اسے دیکھے ہوئے کتنے مہینے ہو گئے ہیں ماہا! وہ تو اتنا سنگدل ہے کہ کسی کی کمک کا اسے احساس ہی نہیں ہے۔“ تیمور کو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا، میں نے فوراً فون بند کر دیا۔

”تسلی ہو گئی ہو تو آج ضرور اسے مل لینا۔“ میں نے تیمور کو تاکید کی۔ اسپتال کے گیٹ سے گاڑی اندر داخل ہوئی تو اس وقت ڈاکٹر معظم کی گاڑی روانہ ہو رہی تھی۔ تیمور نے اسے اور اس نے تیمور کو ہاتھ ہلایا۔ ویسے اچھا اسمارٹ لڑکا ہے یہ ڈاکٹر معظم بھی۔ تیمور نے آہستگی سے کہا۔

”تو۔۔۔۔۔؟“ میں نے چتون چڑھائے۔

”ہو سکے تو اس کے سوال پر غور کریں۔ آپ کے گھر کے سارے ووٹ اس کے حق میں ہیں۔“

”میرا گھر۔۔۔۔۔ اچھا تمہاری مراد والدہ کے گھر سے ہے؟“ میں نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

”سوری!“ وہ بولا۔

”میرا خیال ہے کہ میری زندگی کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے اہمیت دوسروں کے ووٹوں کے بجائے کچھ میری مرضی کی بھی ہونی چاہیے ناں؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں جی! وہ تو اولین حق ہے آپ کا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

میرے ساتھ اوپر آ کر اس نے والدہ کو دیکھا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا، صدف باجی وہیں تھیں، عائشہ باجی بھی آرہی تھیں، تانیہ باجی بھی چکر لگاتی رہتی تھیں مگر میری ان سے ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ ”سچ، تم دونوں ساتھ چلتے ہوئے کتنے پیارے لگ رہے تھے، پرفیکٹ کپل کی طرح۔“ صدف باجی بولیں۔

”پلیز صدف باجی!“ میں نے درخواست کی۔

والدہ کافی بہتر لگ رہی تھیں، صدف باجی کے ساتھ وہ ہاتھ روم تک بھی گئی تھیں اور کپڑے تبدیل کیے تھے اس لیے فریش لگ رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے پیار اور دعائیں

وصول کیں۔ ”کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے؟“ انہوں نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ ان کی آنکھیں ہیں یا ایکسرے مشین، جانے کیسے اندر در تک جھانک لیتی ہیں۔

”آپ کی پریشانی سے بڑھ کر میرے لیے کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟“ میں نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ وہ اس جواب پر خاموش تو ہو گئیں لیکن مجھے علم تھا کہ مطمئن نہیں ہوئی ہوں گی۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ صدف باجی نہ ہوتیں وہاں تو اس شفیق ہستی کے کاندھے پر سر رکھ کر اپنے دل کا سارا غبار نکال لیتی۔ انہیں بتاتی کہ دیکھیں دنیا میرے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ مگر ان کی طبیعت بھی تو اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی۔

”صدف بیٹا! اب ماہا آگئی ہے تو تم جاؤ! اور ہاں جو کام بتایا ہے وہ یاد سے کر لینا۔“ انہوں نے ایک چابی صدف باجی کو دی، یہ ان کی الماری خاص کی چابی تھی جس تک ابو کی پہنچ بھی نہیں تھی۔

”خیر تو ہے والدہ؟ کیا کوئی وصیت وغیرہ لکھ رہی ہیں؟“ میں نے انہیں چھیڑا۔ ”اور یہ اپنی الماری کی چابی آپ کیا بھائی ہوش و حواس ہی صدف باجی کو دے رہی ہیں ناں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کسی قسم کا دباؤ وغیرہ؟“ وہ بھی مسکرا دیں اور صدف آپ کی تھکھکھلا کر ہنس دیں۔ اس لیے کہ جب سے ہم سب دیکھ رہے تھے، یہ الماری والدہ کے جانے کن کن رازوں کی راز دار تھی کہ ہم میں سے کسی پر آشکا نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھار تو وہ خم ٹھونک کے میدان میں اتری ہوئی ابوتے اس بات پر بھڑ رہی ہوتی تھیں کہ کہیں ابو نے ان کی الماری تو نہیں کھول لی تھی۔ آج جانے کیوں انہوں نے یہ چابی صدف باجی کو دے دی تھی۔

”صدف سب سمجھ لیا ہے ناں بیٹا؟ بس سامنے ہی ہوگا، دیکھو بیٹا کسی اور چیز کو نہ چھیڑنا!“

”دیکھ لو ماہا۔“ صدف باجی ہنسیں۔ ”مجبوری میں چابی تو دے دی ہے پر اعتماد پھر بھی نہیں ہے۔ والدہ کیا آپ نے کوئی چاکلیٹ وغیرہ رکھے ہوئے ہیں الماری میں؟ اگر ایسا ہوا تو میں آپ کی نصیحت بھول کر چاکلیٹ تو ضرور اڑاؤں گی، بعد میں چاہے آپ ماریں۔“

”آخر ایسی کیا مجبوری ہے والدہ؟ اس پریشانی سے تو بہتر ہے کہ آپ چابی ہی نہ دیں۔ کیوں صدف باجی، کیا ہو گیا ہے، والدہ کو اتنی کیا مجبوری آن پڑی ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”لازم نہیں کہ ہر ایک سے کہی جائے ہر ایک بات!“ صدف باجی نے چڑایا اور ان کا یہ جملہ مجھے اپنے بچپن میں لے گیا جب تینوں بڑی بہنیں آپس میں باتیں کرتیں یا پھر والدہ سے کوئی بات

اکیلے میں کرتیں تو میں بے وقوفوں کی طرح پوچھتی پھرتی..... اور وہ تینوں جواب میں مجھے اسی طرح چڑاتیں۔ ”لازم نہیں کہ ہر ایک سے کہی جائے ہر ایک بات۔“ اور میں روہانسی ہو جایا کرتی تھی۔ مگر آج ان کے منہ سے یہ فقرہ غالباً میں نے دس سال کے بعد سنا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ اب مزاج میں تحمل اور عادات میں سنجیدگی کا عنصر آ گیا تھا۔ صدف باجی چلی گئیں، میں والدہ کے پاس بیٹھ گئی اور عام چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی۔

”تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”نہیں تو.....“ میں نے چہرے پر بے بسی لائی۔

”کچھ تو ہے جو مجھ سے چھپا رہی ہو؟“ انہوں نے میرے چہرے پر نظریں گاڑیں۔

”ہاں ہے تو..... میں نے اٹھ کر اپنے پرس سے موبائل فون نکالا۔“ یہ مجھے تیور نے دیا ہے..... تھکے۔“ سالگرہ کا کہتے کہتے رک گئی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان سے اپنی سالگرہ کا جان بوجھ کر ذکر کر رہی ہوں۔ وہ ہمیشہ میری سالگرہ پر مجھے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر دیتی تھیں، اور اب جب وہ اسپتال میں تھیں، مجبور، بے بس اور لاچار تو کیا میں ان کے اس احساس کو دود بالا کر دیتی۔  
”کیسا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت اچھا ہے، بہت خوبصورت، اللہ نصیب کرے۔“ وہ ہمیشہ یونہی دعا دیتی تھیں کہ جو ملا ہے اسے نصیب کرنا۔ شاید میری شادی کے وقت وہ یہ فقرہ کہنا بھول گئی تھیں..... جو مجھے ملا، وہ میرا اتنے کم عرصے کا نصیب تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں آنے والے اس خیال کو جھٹکا، کہیں غالب کی یاد آنکھوں میں آنسو نہ بھر دے اور والدہ اسے جانے کیا سمجھیں۔

”اور سنائیے کیا محسوس کر رہی ہیں ابھی؟ اور کیا ٹینشن ہو گئی جو اس تکلیف کا باعث بنی؟“ میں نے شکستگی بھرے انداز میں ان سے پوچھا تو ان کی آنکھیں لبریز ہو گئیں۔

”کوئی ٹینشن نہیں ہے..... جو ٹینشن ہے وہ تمہارے سامنے ہی ہے۔“ مختصر ابولیں۔

”والدہ پلیز! میری طرف سے پریشان نہ ہوا کریں..... مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے آپ کو اپنی وجہ سے تکلیف میں دیکھ کر۔“ میں نے ان کے ہاتھ تھام کر اپنے رخساروں سے لگائے۔

”تم بھی تو بغیر سوچے سمجھے مجھ سے اس روز ناراض ہو گئی تھیں!“ وہ شکوہ کنال ہوئیں۔

”بخدا! ایسی کوئی بات نہیں، آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں کر؟“

”تم اولاد ہو میری ماہا! مجھے تمہاری خوشی اور دکھ جاننے کے لیے تمہاری نبض پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ ہی تمہاری آنکھوں میں جھانکنے کی۔“

”پھر تو آپ کو شاباش دینی چاہیے کہ آپ نبض دیکھے بغیر ہی مرض جان لیتی ہیں۔“ میں ہنسی۔  
”مجھے تم جانتی ہو، میں نے تو کبھی ایسی اونچ نیچ کا سوچا بھی نہیں، مگر بیٹا ہو سکتا ہے کہ علی کو ہی ان کا گھر اور گلی محلہ پسند نہ آئے۔“ میں خاموش رہی، دل تو چاہ رہا تھا ان سے کہوں کہ شادی لڑکی سے ہونی ہے یا گھر سے اور گلی محلے سے مگر میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور یوں بھی میں خود کو بہت عقلمند سمجھتی تھی، واقعی میں نے اس نقطہ نظر سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ یہی اعتراض نوید صاحب کے گھر والوں نے بھی کیا تھا۔

”یا تو بیٹا وہ گھر کہیں تبدیل کر لیں..... یا پھر لڑکی علی کو اپنے گھر سے باہر ملوادو، اگر اسے لڑکی پسند آجائے تو پھر باقی معاملات بعد میں طے ہو سکتے ہیں۔“ انہوں نے مجھے رمان سے سمجھایا۔  
”ٹھیک ہے جیسے آپ کہیں، میں دیکھتی ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کا خیال درست ہے جس طرح آپ کو وہاں جا کر شاک لگا ہے اس سے بڑا شاک علی بھائی کو اور میری تینوں بڑی بہنوں کو لگے گا۔ میں بات کروں گی آئنی سے کہ وہ کیا مناسب سمجھتی ہیں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ شام کو ابھی میں وہیں بیٹھی تھی کہ صدف باجی اور ڈاکٹر معظم اکٹھے آئے، ڈاکٹر معظم کے ہاتھوں میں پھولوں کا گلہ دستہ تھا۔ ”یقیناً والدہ کے لیے لائے ہوں گے۔“ میں نے سوچا۔

”سہی برتھ ڈے ماہا!“ انہوں نے گلہ دستہ مجھے دیا تو میں چونک اٹھی، صدف باجی اتنی دیر میں والدہ سے مل کر ان کی الماری کی چابی اور ایک لفافہ ان کے حوالے کر چکی تھیں۔ آکر مجھے ملیں اور سالگرہ کی مبارک باد دی۔

”آپ سب کو کیسے پتا چلا؟“ میں حیران تھی۔

”پتا کیا چلا؟ ہمیں تمہاری پیدائش کا دن بھول سکتا ہے؟“ صدف باجی بولیں تو میں مسکرا دی۔

والدہ نے بلا کر لفافہ میرے حوالے کیا، میرا پسندیدہ پرفیوم، میں ان سے لپٹ کر سسک پڑی۔ انہیں اس حالت میں بھی یاد تھا کہ آج میری سالگرہ تھی اور انہوں نے اپنی الماری کی چابی بھی صدف باجی کو دے دی تھی۔

”صدف باجی! اور کیا، کیا تھا والدہ کی الماری میں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

گیپ لگتا ہے۔“ تیمور بولا۔

”اب ایسی بھی نہیں ہونے کی تیمور!“

”یقین کریں بھابی! میں نے موبائل فون خریدا ہے تو ابھی تک مجھے اس کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی اور ادھر ماہ رخ اس بات پر میرا تسخراڑا رہی تھی کہ اس کا وہ گولوسا بھیتجا جو ہے وہ بھی موبائل فون کا سبز بٹن دبا کر کال اینڈ کر لیتا ہے۔“

”ان کے گھر کی تو بات ہی دوسری ہے تیمور! وہاں سب لوگ اسپیشل ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ اس پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا، جیسے اسے اپنی ہونے والی سسرال کی برائی پسند نہ آئی ہو۔

گھر پہنچے تو میری حیرت کے لیے ڈاننگ ٹیبل پر رکھا کیک اور اس کے ساتھ چائے کے لوازمات منتظر تھے، اس کے ساتھ ہی چمکتے دسکتے چہروں کے ساتھ گنگناتے ہوئے ماہ رخ اور منظر۔ امی جان نے آگے بڑھ کر گلے لگا کر مبارک بادوی اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پیکٹ، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ماہ رخ نے مجھے خوبصورت سی بالیاں دیں اور منظر نے پین سیٹ۔ میں نے مسکراتے ہوئے کیک کاٹا۔ منظر نے کھانے کے لیے پیزا آرڈر کر دیا۔

میں سب کی چاہتوں کی پھوار میں بھیگ رہی تھی۔ امی جان والا پیکٹ کھولا تو اس میں زمرود جڑا وہ خوبصورت کنگن تھا جو غالب کی وفات کے بعد مجھے ان کے ہاتھ میں نظر نہیں آیا تھا۔ میری آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ اس کنگن سے ان کی ایک مخصوص یاد تھی۔ مجھے بتایا تھا کہ یہ کنگن ان کو ان کی ساس نے غالب کی پیدائش پر دیا تھا اور تب سے انہوں نے سوچا تھا کہ غالب کے پہلے بچے کی پیدائش پر وہ اپنی بڑی بہو کو وہ کنگن دیں گی لیکن آج جانے کیا سوچ کر انہوں نے مجھے یہ کنگن دے دیا تھا۔ تاہم میں نے ماہ رخ کے سامنے اس ذکر کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ جانے وہ اس بات سے کیا مطلب اخذ کرے۔

کھانا کھانے کے دوران تیمور نے اچانک کہا۔ ”ماہ رخ میں اور بھابی آرہے تھے تو بھابی تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں، کہہ رہی تھیں، کچھ اسپیشل..... کیا کہہ رہی تھیں آپ بھابی؟“

”لازم نہیں ہے کہ میں اگر ماہ رخ کی غیر موجودگی میں اس کی تعریف کروں تو اسے ضرور بتایا

”آنکھیں بند کر کے الماری کھولی، سامنے ہی یہ لفافہ رکھا تھا، اسی طرح اٹھایا اور الماری بند، قسم لے لو جو دائیں بائیں دیکھا بھی ہو۔ حالانکہ دل بہت بے ایمان ہو رہا تھا۔“ صدف باجی نے صفائی دی۔

”آپ کہتی ہیں تو مان لیتے ہیں آپنی! ویسے دل ایک دفعہ بے ایمان ہو جائے تو دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔“ ڈاکٹر معظم نے عاشقانہ فقرہ اچھالا۔ میں پہلو بدل کر رہ گئی۔ تبھی علی بھائی اور ابو کیک لے کر آگئے۔ عائشہ باجی اور عثمان بھائی بھی تھے۔ ڈاکٹر سے خصوصی اجازت لے کر کیک کاٹا اور ہلکی ہلکی آواز میں پی پی برتھ ڈے گایا۔ ڈسپوزیبل پلیٹوں میں کیک کھایا گیا اور تیمور مجھے لینے آیا تو میں سب سے اجازت لے کر رخصت ہوئی۔

راستے میں تیمور نے بتایا کہ اس نے بڑی مشکل سے ماہ رخ کو منایا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے ایک موبائل فون اپنے لیے لیا ہے اور ایک منظر کے لیے۔ ”آپ ہی اسے دے دیں بھابی! اور بہتر ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گا کم از کم آپ سے رابطہ تو رہے گا، اگر گھر آنے میں دیر سویر ہو جائے تو بجائے اس کے کہ آپ پریشان ہوتی رہیں اسے کال کر لیا کریں۔“ تیمور مجھے سمجھا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے یہ سب احتیاطی تدابیر اچھی ہیں لیکن اس نے معافی مانگی ہے تو دوبارہ ہمیں شکایت کا موقع نہیں دے گا۔“ میں نے دثوق سے کہا۔

”جتنے دثوق سے آپ اس کے بارے میں بات کر رہی ہیں اتنے دثوق سے تو کوئی اپنے بارے میں بھی بات نہیں کرتا۔“ تیمور نے حیرت سے کہا۔

”میں اسے بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں!“ میں نے دعویٰ کیا۔

”اوہو! جانتی بھی نہیں کہا آپ نے، سمجھنے کا لفظ استعمال کیا ہے، کیا ذہانت ہے، ویسے بھابی اتنے یقین سے کم از کم آج کل کے نوجوانوں اور بچوں کے بارے میں کوئی قیافہ لگانا ذرا مشکل ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”ہم کیا کوئی بہت پرانے زمانے کے نوجوان ہیں؟“

”پہلے پہل تو بھابی عمر میں بیس سال کے تفاوت کو جزیشن گیپ کہا جاتا تھا مگر اب تو زندگی اتنی تیز رفتار ہو گئی ہے اور آج کل تو بچے بھی اتنے تیز ہیں کہ لگتا ہے پانچ سال کا تفاوت بھی جزیشن

جائے۔“ میں نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں ماہا! تم تو خود اتنی ایکٹیل ہو!“ ماہ رخ نے مجھے گلے لگا کر گال پر بوسہ دیا اور تعریف کی تو تیسور کو اچھو لگ گیا، مجھے بھی ہنسی آگئی۔

”اچھا چھوڑو بتاؤ، تمہیں میری سالگرہ کا کیسے علم ہوا؟“ میں نے موضوع بدلا تو وہ ٹپٹا گئی۔ یقیناً اسے دن کو تیسور نے بتایا تھا کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کہ میرا تحفہ بھی انہوں نے مل کر خرید ا ہوگا۔

”وہ مجھے یاد تھا۔۔۔۔۔“ ماہ رخ گھبرا گئی۔

”بلکہ ہمیں بھی ماہ رخ نے ہی آکر بتایا۔“ امی جان بولیں۔

”جی امی! مجھے تو خود بھی یاد تھا۔ سالگرہ منانے کا آئیڈیا ماہ رخ باجی کا تھا مگر میں نے تحفہ تو پہلے سے لے کر رکھا ہوا تھا۔ یہی سوچا کہ کارڈ اور گفٹ دے دوں گا۔“ منظر نے فوراً تر وید کی۔

”اور ہاں چھوٹو! اس دفعہ تو میں نے بھی تمہیں سر پر انزو دینے کا سوچا تھا۔“ میں نے کہا۔

”کہہ لیں چھوٹو! آج آپ کو اجازت ہے بلکہ چلیں کیا یاد کریں گی آپ جب بھی چاہیں مجھے چھوٹو کہہ سکتی ہیں۔“ منظر نے سخاوت کی انتہا کر دی۔ ”ویسے آپ نے مجھے کیا سر پر انزو دینا تھا؟“

”میں نے سوچا کہ اس دفعہ میں اپنی سالگرہ پر تمہیں تحفہ دوں گی، ضروری ہے کہ ہم تحائف لیں، سالگرہ پر تحائف دینے بھی تو جاسکتے ہیں۔“ کہتے ہوئے میں نے اپنے پرس میں سے پیکٹ نکال کر اسے تھمایا۔

”آپ کے سارے کام، سارے انداز ہی انوکھے ہیں۔۔۔۔۔“ موبائل فون دیکھتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے غور کیا تو مجھے لگا کہ اس نے اپنی داڑھی کو بھی ذرا سا ہلکا کیا تھا۔

”بڑے اسمارٹ لگ رہے ہو چھوٹو آج تو؟“ میں نے اس کی تعریف کی۔

”آج میں نے تازہ تازہ بال بھی کٹوائے ہیں اور داڑھی کی شپ بھی بنوائی ہے۔“ وہ معصومیت سے بولا تو میں ہی نہیں باقی سب بھی ہنس دیے۔

تیسور چھٹی گز کر چلا گیا، جتنے دن تک وہ رہا اتنے دن وہ دفتر جاتا رہا، سو مجھے فراغت رہی۔ والدہ کی طرف بھی ہر روز چکر لگ جاتا تھا۔ وہ صحت یاب ہو کر گھر آگئی تھیں۔ عانشہ باجی کے ساتھ

ان کے کیوٹ سے ننھے فرشتے جنہیں گوو میں لے کر مجھے بہت مزہ آتا تھا۔ دونوں اب چیزوں کو پکڑ کر اور سہارے سے چل لیتے تھے۔ صحت کے لحاظ سے بھی دونوں بہت اچھے تھے، البتہ عانشہ باجی ان کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کافی اسمارٹ ہوگئی تھیں۔ اتنے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تھی کہ ہم جب بھی اکٹھے بیٹھتے تو خوب گپ شپ ہوتی مگر ہماری گپ شپ کا سلسلہ بچوں کے اُنچلے پن کی وجہ سے بار بار ڈسٹرب ہوتا۔ عانشہ باجی نے مجھے ڈاکٹر معظم کی بابت قائل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے انہیں یہی بتایا کہ میں اس ملک سے باہر جا کر کہیں اور رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان کا اصرار یہی تھا کہ جو میرے دل میں تھا میں انہیں بتا دو، لیکن میرے پاس اس سوال کا کوئی مثبت جواب نہ تھا۔ جانے کیوں کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔

○ یہ کون سی منزل ہے گماں کی

کہ ہر چاہ پر تیرا گماں ہوتا ہے!

کسی اور کا ذکر آئے تو بھی

تیرا ہی وہ بیان ہوتا ہے

میں دیکھوں تو کسی اور کو آنکھوں سے

مگر بس پر وہ تیرا نشان ہوتا ہے!

دل ہے کہ اب وحشت سے گھبراتا ہے،

جو گھر تھا وہ اب مکاں ہوتا ہے!

کیوں ہر اک دستک پہ،

تیرے ہی ہاتھ کے لُس کا نشان ہوتا ہے؟

تو یہیں ہے، یہیں کہیں ہے، لوٹ آئے گا،

(شیریں حیدر)

○ اب تک یہی گماں ہوتا ہے

تقریباً ہفتے بھر کی غیر حاضری کے بعد دفتر آئی تو سبھی لوگوں نے باری باری آکر والدہ کی بیماری کی بابت پوچھا۔ نوید صاحب کے ساتھ بیٹھ کر دفتری امور پر بات چیت کی۔ دل تو چاہا کہ



زارا کے رشتے کی بابت پوچھوں مگر واماغ نے منع کر دیا۔ وہ بیٹھے مجھے میری غیر حاضری کے دوران کی رپورٹ دے رہے تھے اور میں بیٹھی یہ تک رہی تھی کہ ان میں کون سی ایسی بات تھی، جسے میرے دل نے مسترد کر دیا تھا۔ دیر تک میں دیکھتی رہی اور مجھے ایسا کچھ نہ ملا کہ جسے میں قابل اعتراض سمجھتی۔ خوش شکل، خوش اطوار، جامہ زیب، پڑھے لکھے اور مختاری! سبھی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں تو پھر ایک لڑکی کے اور کیا خواب ہوتے ہیں؟ کیوں میں یہ بیوقوفی کر رہی تھی اور اپنے ہاتھوں سے اپنا نقصان کر رہی تھی۔ تب میں نے دل میں تہیہ کیا کہ میں استخارہ کروں گی۔ اس سے بہتر بھلا میرے لیے اور کیا مشورہ ہو سکتا ہے جو میں بلا واسطہ اپنے رب سے کروں گی۔

”میڈم! میڈم!“ وہ مجھے پکار رہے تھے، یکدم میں خیالات سے چونک گئی۔

”جی! مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟“

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں، یونہی ذرا کچھ سوچ رہی تھی، آپ بات کریں۔“ میں نے ان سے کہا۔

”وہ میڈم! مظہر صاحب نے ایک عجیب سا آرڈر دیا ہے.....“ انہوں نے بات شروع ہی کی تھی کہ میں نے کاٹ دی۔

”نوید صاحب! وہ بچہ ہے..... اور اگرچہ کاروبار کی سوجھ بوجھ حاصل کر رہا ہے، تاہم ایسی باتوں میں اس کا تجربہ نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے آپ اس معاملے پر پریشان نہ ہوں۔“

”لیکن انہوں نے تو مجھے تحریری نوٹس لکھوایا تھا کہ وہ سب کو دیدوں؟“ انہوں نے ہچکچا کر کہا۔

”آپ وہ نوٹس مجھے دیدیں، میں اس سے بات کر لوں گی۔“ میں نے انہیں حتمی انداز میں کہا۔

نوید صاحب کے جانے کے بعد میں نے چیرا سی کو کہہ کر مظہر علی کو بلایا۔ وہ پہلے سے ہی باہر آیا کھڑا تھا۔ میں نے اندر بلایا۔ اس نے آکر سلام کیا، میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گیا۔ اس نے والدہ کی طبیعت کا پوچھا اور عندیہ ظاہر کیا کہ اس کی امی اور بہنیں والدہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آنا چاہتی تھیں۔ میں نے اس پر کوئی اعتراض ظاہر نہ کیا۔ اچھا تھا جو میں سوچ رہی تھی کہ کسی طرح ثانیہ اور علی بھائی کی سرسری سی ملاقات ہو جائے شاید اللہ نے یہی راہ خود نکال دی تھی۔

”مظہر علی آپ اپنی جاب سے مطمئن ہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی میڈم! الحمد للہ! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کو ہمارے گھر کی سرتوں کے لیے

وسیلہ بنا کر بھیجا اور میں جو ہر وقت موٹر سائیکل پر سوار ایک سے دوسری نوکری پر بروقت پہنچنے کے لیے بھاگتا رہتا تھا اب یہ بے فکری ہے کہ ایک ہی جگہ پر نوکری ہے، مگر سے دور تو ہے مگر کسی نہ کسی طرح معمول بنائی لیا ہے اور ذرا جلدی اٹھ جاتا ہوں، آپ میرا ریکاؤرڈ چیک کروائیں، میں ہمیشہ وقت پر دفتر آتا ہوں۔ شام کی کلاسز بھی اٹینڈ کرتا ہوں۔ اتوار کے دن ایک ٹیوشن سینٹر میں چار گھنٹے میٹھس پڑھاتا ہوں۔“ اس کا لہجہ پر عزم اور اس کا چہرہ اس کے اندرونی جوش کا عکاس تھا۔

”مظہر علی! اتنا ہی کام کریں، جتنا بدن اور ذہن بوجھاٹھا سکیں۔“ میں نے نصیحت کی۔

”ابھی میرے بہت سے فرائض ہیں میڈم اور اللہ کے فضل سے اب میری بہنوں کے لیے دو

ایک جگہوں سے معقول رشتے بھی آئے ہیں۔“ اس نے مزید بتایا۔

”اچھا کہاں سے رشتے آئے ہیں؟ کون لوگ ہیں؟“ میں نے تفصیل پوچھی۔

”مجھے ایسے معاملات کا کچھ ایسا تفصیلی علم نہیں، میری امی البتہ چاہ رہی تھیں کہ کبھی آپ کے

پاس وقت ہو تو آپ آئیں، کیونکہ وہ آپ سے ان کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے

لیے آپ کے مشوروں کی بہت اہمیت ہے اور وہ آپ کو اسی طرح سمجھتی ہیں جیسے زارا آپنی اور ثانیہ

کو۔“ اس نے مجھے بتایا۔

”ہاں میں آؤں گی کسی وقت، بس وہ والدہ کی خرابی طبع کے باعث مصروف رہی۔“ میں نے

بتایا۔ ”ہاں مظہر علی آپ کو صبح دفتر پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟“

”سوا سے ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا ہے میڈم! صبح بہت سویرے نکلتا ہوں، پھر بھی ٹریفک کا رش

بہت ہوتا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آپ کہیں نزدیک ہی کوئی گھر کیوں نہیں دیکھ لیتے، کرائے پر یا خریدنے کے لیے؟“ میں

نے پوچھا تو اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لیے جل کر نکلیں۔

”میڈم ہم تو گھر خریدنے کے لیے کرائے پر لینے کا بھی فقط خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے

پاس ایسے وسائل کہاں؟“ اس نے بے چارگی سے کہا تو مجھے دل میں ایسی بات پر افسوس ہوا۔

”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے، بسا اوقات غیر متوقع طور پر کچھ نہ کچھ وسیلہ بن جاتا ہے۔“

”ابھی تو بہنوں کی شادیوں کے فرائض ہیں۔“ وہ بولا۔

”اس تبدیلی سے ممکن ہے کہ ان کے لیے بہتر رشتے آنے کے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔“

میں نے دلیل دی۔

”وہ تو جہاں ان کے مقدر لکھے ہیں وہیں پر ہوں گے، جگہیں بدلنے سے مقدر تو نہیں بدلیں گے۔“ میں اس کے توکل پر حیران تھی۔

”مگر تیرے تقدیر بدلنے کا محاورہ بھی تو آپ نے سن رکھا ہوگا؟“ میں مسکرائی۔

”میڈم دلائل میں تو آپ سے کوئی جیت نہیں سکتا۔“ وہ بھی ہنسا۔ اجازت لے کر وہ دفتر سے رخصت ہونے لگا تو مجھے یکدم کچھ یاد آیا۔

”مظہر علی!“ میں نے پکارا۔

”جی میڈم!“ وہ پلٹا۔

”یہ میرا موبائل فون نمبر ہے۔“ میں نے ایک چٹ پر نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”جب آنٹی لوگوں کا والدہ کی طرف آنے کا پروگرام ہو تو مجھے اطلاع کر دیں۔ میں کوشش کروں گی کہ میں بھی ادھر چلی جاؤں۔ والدہ گھر پر اکیلی ہوتی ہیں، ذرا لڑکیوں کی کمپنی کا مسئلہ ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک ہے میڈم! امی کو بتا دوں گا۔“ اس نے مجھ سے چٹ لے کر جیب میں رکھی اور اجازت لے کر رخصت ہوا۔

مظہر کے امتحانات ختم ہو گئے تھے اور وہ اب باقاعدگی سے دفتر جا رہا تھا۔ میں کبھی کبھار ہی جاتی تھی۔ تبھی نگہت کے آنے کا پروگرام بنا تو دونوں گھروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اس کے بیٹے کے لیے ڈھیر و ڈھیر شاپنگ کر لی۔ کاٹ تو ہم نے خوشی کے لیے لی تھی، اس پر میں نے ہلکے نیلے رنگ کے نئے بستر بنائے۔ امی جان بھی میرے ساتھ ان تیاریوں میں مصروف تھیں بلکہ انہوں نے تو عبد اللہ کے لیے بھی اپنے ہاتھوں سے خوبصورت سویٹر بھی بنائے تھے۔ اتنے خوبصورت نرم نرم سویٹر۔ میں تو ان کو چھو کر دیکھتی تو دل میں گدگدی ہونے لگتی۔

میں اس روز گھر پر آرام کر رہی تھی کہ مظہر علی کی والدہ کی کال آئی، وہ لوگ گھر سے روانہ ہونے والے تھے اور مجھے اطلاع کر رہے تھے کیونکہ میں نے ہی مظہر علی سے کہا تھا۔ پھر میں نے والدہ کو کال کر کے بتایا کہ آنٹی اور ان کی بیٹیاں آنا چاہ رہی ہیں۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو صدف باجی کو بھی بلا لیں اور علی بھائی کو ساتھ لانے کی ذمہ داری میں نے سنبھالی۔ امی جان سے میں نے چند دن کے لیے والدہ کی طرف جانے کی اجازت لے لی۔ کمرے میں آ کر میں نے اپنا بیک تیار

کیا اور ساتھ ہی ترکیب سوچ رہی تھی کہ علی بھائی کو کس طرح بلایا جائے۔ اپنے موبائل فون سے ہی میں نے کال کی۔ علی بھائی نے بتایا کہ وہ بہت مصروف تھے۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ ”کیا ہو گیا ماہا؟ موڈ آف ہو گیا ہے تمہارا؟“ وہ لاڈ سے بولے۔

”کچھ نہیں علی بھائی! والدہ کی طرف جانا تھا، ہماری گاڑی گھر پر نہیں تھی، میں نے سوچا کہ آپ کو زحمت دیتی ہوں۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔

”اس وقت تو نہیں بیٹا! مگر شام کو واپسی پر میں تمہیں ساتھ لے لوں گا۔“ جب بھی میں ناراض ہوتی تھی تو وہ اسی طرح مجھ سے لاڈ کرتے تھے۔

”لیکن مجھے تو ابھی جانا تھا، میری ایک دوست اور اس کی والدہ آرہی تھیں چلیں آپ رہنے دیں، میں ٹیکسی لے کر چلی جاتی ہوں۔“ میں نے ذرا خفگی سے کہا۔

”ٹیکسی پر..... پھر اکیلی نہ جانا آنٹی کو ساتھ لے لو۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”آپ مفت میں مشورے نہ دیں، مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔“

”تو پھر میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔ ڈرائیور تمہیں ڈراپ کر دے گا۔“ انہوں نے آفر کی۔

”بہت شکریہ علی بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کوئی بندوبست خود ہی کر لیتی ہوں۔“ کہہ

کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں دل ہی دل میں بہت خوشی ہوئی۔ کال کر کے والدہ کو بھی ساری روداد سنائی اور انہیں بتایا کہ انہیں اپنے مہمانوں کو روکنا ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے ان کو چند چیزیں سمجھائیں اور آخر میں یہ کہنا نہ بھولی کہ وہ مہمانوں کے سامنے ان کے گھر کے بارے میں کوئی بات فی الحال نہ کریں۔

”تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو کیا؟“ وہ ہنس دیں۔

علی بھائی آئے تو میں بالکل تیار تھی، مروتا میں نے ان کو اندر بلایا اور جوس پلایا۔ امی جان نے توجہ پر اصرار کیا مگر انہوں نے معذرت کر لی کہ انہیں دو گھنٹے بعد دفتر پہنچنا تھا۔ میں نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور امی جان کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوئی۔ علی بھائی کو میری دوست کے بارے میں جاننے کا بالکل بھی تجسس نہ تھا۔ اس لیے کہ شادی سے قبل ہماری دوستیاں اسکول اور کالج کی حدود

تک ہی رہی تھیں۔ اسی طرح ہمارا گھر بھی لڑکیوں والا گھر تھا سوغی بھائی کے دوست یا رہی باہر باہر رہی رہے۔ گھر پہنچے تو صدف آپ کی گاڑی بھی نظر آئی۔ ”ارے واہ صدف آپ بھی آئی ہیں؟“ میں نے خوشی کا اظہار کیا، سامان بھی نہ نکالا اور اندر کو لپکی۔

”مجھے تو تم لوگوں کی کوئی ملی بھگت لگتی ہے۔“ میں نے عقب سے علی بھائی کی آواز سنی۔ کتنے تیز تھے، وہ بھی آخر ہمارے بھائی تھے۔ تاہم میں نے مڑ کر کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی ہوئی اندر کو لپکی۔ آنٹی اور والدہ ٹی وی لاؤنج میں تھیں، ان کو ملی۔ ثانیہ اور ثناء، صدف آپ کے ساتھ کچن میں تھیں، سو میں بھی ادھر کو روانہ ہوئی۔ آنٹی نے بتایا کہ زارا کو جاب سے چھٹی نہیں ملی تھی اس لیے وہ نہ آسکی تھیں۔ مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا مگر خیر میرا مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔

علی بھائی بھی والدہ اور آنٹی کو سلام دعا کر کے دروازہ کھٹکھٹا کر کچن میں ہی آگئے تھے۔ ہم چاروں کچن کی میز کے گرد بیٹھی گپ شپ کر رہی تھیں، انہوں نے سلام کیا اور آگے بڑھ کر صدف آپ سے پیار لیا۔ میں نے انہیں ثانیہ اور ثناء سے متعارف کرایا اور پھر علی بھائی سے کہا۔

”علی بھائی، یہ ثانیہ ہے میری دوست اور یہ ثناء اس کی چھوٹی بہن!“ میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ علی بھائی نے چونک کر مجھے دیکھا اور سرسری نظر دونوں بہنوں پر ڈال کر کچن سے چلے گئے۔ وہ یقیناً والدہ اور آنٹی کے پاس چلے گئے تھے۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ جلد ہی ہم نے کھانا لگایا اور خاموشی سے کھانا کھایا گیا۔ ثانیہ تو خیر تھی ہی اس تمام قصے سے لاعلم، البتہ مجھے علی بھائی کی نظروں کی چوری پکڑنے کا بھی موقع نہ ملا۔ کھانا ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ علی بھائی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں دفتر واپس پہنچنا تھا۔ کھانے کے بعد پھل سرد ہوا اور قہوہ پی کر ثانیہ، ثناء اور ان کی امی روانہ ہوئیں۔ صدف آپ نے انہیں گھر چھوڑ دیئے۔ بچہ کی آفر کی جسے انہوں نے شکریہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تینوں نے اپنی چادریں سلیقے سے اوڑھیں اور روانہ ہوئیں۔ ”کیوں صدف آپ! کیسی لگیں آپ کو ثانیہ؟“ میں نے بے تابی سے صدف آپ سے پوچھا۔

”اچھی ہے..... لیکن.....“ وہ ٹھٹھکیں۔ ”آپ کا کیا خیال ہے والدہ؟“

”میرا خیال تو تم چھوڑو، فی الحال اپنا خیال بتاؤ۔“ والدہ نے گیند واپس صدف باجی کے کورٹ میں پھینکی۔

”اگر آپ کو مناسب لگا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔“ صدف آپ نے ڈپلومیسی سے کام لیا۔

”میں نے تو ابھی کوئی رائے قائم کی ہے نہ تمہیں بتائی ہے۔“ والدہ مسکرائیں۔

”والدہ، میں نے ان کا گھر وغیرہ نہیں دیکھا اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”صدف آپ! ہم نے علی بھائی کی شادی لڑکی سے کرنی ہے یا اس کے گھر سے؟“ میں نے

جھنجھلا کر کہا۔

”شادی بے شک لڑکی سے ہی کرنی ہوتی ہے، مگر مجھے لگتا ہے کہ طبقاتی فرق بہت زیادہ

ہے۔ کم از کم میرا بے اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ جو کپڑے انہوں نے پہن رکھے تھے وہ صاف سھرے تو

تھے مگر معیار کے لحاظ سے ویسے ہی تھے جیسے ہمارے ہاں کی ملازما مکین پہنتی ہیں۔“ صدف آپ

کے بے لاگ تبصرے سے میں گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ واقعی ایسا تو تھا، کیونکہ وہ اپنی ساری شاپنگ

اتوار بازار سے کرتی تھیں جہاں عموماً غیر معیاری اشیاء ملتی ہیں۔ یقیناً وہ کپڑا وغیرہ بھی وہیں سے

لیتی ہوں گی۔

”میں سمجھتی تھی کہ ہمیں اچھی سیرت کی لڑکی چاہیے، سلیقہ شعار اور والدین کی خدمت گزار ہو مگر

میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ پیسے اور اسٹیٹس کی بھی کوئی وقعت ہوتی ہے۔“

”تم ہر بات جذباتی ہو کر نہ سوچا کرو..... جھجھل میں لگا ٹاٹ کا پیوند صاف نظر آ جاتا ہے۔“

صدف آپ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اب ایسا بھی برا معاملہ نہیں صدف آپ!“ میں نے ہلکے سے کہا۔ ”بہر حال آپ بڑی ہیں

ظاہر ہے کہ آپ کی بات کی اہمیت زیادہ ہے۔“

”ماہا بیٹا، میری طبیعت تھوڑا سنبھل لے تو میں استخارہ کرتی ہوں اور اگر مجھے ان کے گھر کے

لیے مثبت اشارہ ملا تو یقین کرو میں کسی اور چیز کو اہمیت نہیں دوں گی۔“ والدہ نے مجھے تشفی دی۔

”اہمیت تو والدہ ہر چیز کی ہوتی ہے۔ چھوٹے گھروں سے آنے والی لڑکیاں ہمیشہ گھٹن اور بند

ذہن والی ہوتی ہیں، محدود سوچ کی حامل۔“ صدف آپ بولیں۔

”یہ تو بڑا بے رحم تجربہ کیا ہے آپ نے صدف آپ! ان کے گھر ایسی غربت ہمیشہ سے تو نہ تھی

اور پھر دن پھرے کا کیا ہے، آج ہمارے دن اچھے ہیں تو کل کو ہمارے دن بھی بگڑ سکتے ہیں۔“

میں نے دو بدو کہا۔

”اللہ نہ کرے کہ ہمارے دن اگر برے آ بھی جائیں تو ہماری نیت میں ہوس کبھی نہیں آئے

گی کیونکہ ہم نے ہمیشہ خوشحالی دیکھی ہے، اس لیے ہمارے ذہنوں میں وسعت ہوگی۔ ہم کم و سائل میں بھی تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔“ صدف آپنی نے کہا۔

”یہ تو ان بے چاریوں کی قسمت ہے کہ جو وہ اس گھر میں پیدا ہو گئی ہیں، یہ تو کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ فراخ دلی اور تنگ دلی کا تعلق چھوڑے بڑے گھروں سے نہیں ہوتا۔ دل بڑا ہونا چاہیے۔“ میں نے اپنی طرف سے مضبوط دلیل دی۔

”چلو ہم دونوں کو لڑنے کی کیا ضرورت ہے، والدہ استخارہ کر لیں تو پھر دیکھتے ہیں۔“ صدف آپنی نے صلح کے انداز میں کہا۔

”کوئی مسئلہ نہیں، جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ میری طرف سے آپ اپنی تک چڑھی وہ نند کی بیٹی لے آئیں بہو بنا کر۔“ میں نے ٹھنک کر کہا۔

”چھوٹی ہونا! اس لیے بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔ یوں منہ نہ بسورو، یہ کوئی گڈے گڑیا کی شادی کا معاملہ تو ہے نہیں، اس لیے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر لیں گے اور علی کی رائے معلوم کرنا سب سے اہم ہے۔“ والدہ نے کافی دیر ہماری بحث سن لی تھی، اس لیے انہوں نے مصالحت کرانا ضروری سمجھا تھا۔

میں نے سوچا والدہ تو بعد میں استخارہ کریں گی، میں بھی استخارہ کر کے دیکھوں۔ عشا کے بعد دو نفل پڑھے اور استخارے کی دعا پڑھ کر نیند کی تلاش میں لیٹ گئی۔ جب تک جاگتی رہی، تسبیح پڑھتی رہی اور پھر نیند غالب آنے لگی تو میں نے اپنے رب کو پکارا۔

”یا اللہ! یا رب! یا پالن ہار..... یا خالق..... یا مالک! میں تیری ادنیٰ سی بندی، تجھ سے مدد کی طالب ہوں۔ میری عقل ناقص ہے اور تو ایسے میں میرا راہنما، مجھے بہتر راستہ دکھا، میرے ذہن اور قلب کو وسعت دے، مجھے فہم دے، مجھے اس قابل بنا، میری پکار سن! میری شہ رگ سے بھی قریب تر، میرے اللہ، یا رب ذوالجلال والا کرام! تو ہر چیز پر قادر ہے، تو قادرِ مطلق ہے۔ تیرے ہی مشورے کی طلب ہے، تجھ سے خیر کی طالب ہوں، تو مجھے بہتر راستہ دکھا اور اس راہ پر ہمارے لیے بہتری فرما، ہمیں وہ راستہ دکھا جو تیری چاہت ہے، ہمارے قدموں کو اس راہ پر گامزن کر جو ہمارے مقدر کی راہ ہے۔“

رات بھر ٹوٹے پھوٹے خواب دیکھتی رہی، فجر کی نماز کے لیے ابھی تو خواب ذہن میں گڈٹ تھے۔ نماز پڑھ کر تسبیح لے کر پھر لیٹی تو آہستہ آہستہ خواب واضح ہونے لگے۔ بچپن سے ہی والدہ کو ہر مشکل مرحلے پر استخارہ کرتے اور پھر اس کے نتیجے پر ہمیشہ مطمئن دیکھا تھا۔

مجھے یاد آنے لگا۔ میں نے خود کو اسپتال میں دیکھا تھا، سفید چادر لے کر لیٹے ہوئے، پھر میں نے کافی دفعہ خود کو مظہر علی کے گھر پر دیکھا تھا۔ میں نے یہ سب مثبت آثار سمجھے اور دل میں مطمئن ہو گئی۔ چلو اب والدہ جاگیں گی تو ان کو سارے خواب سناؤں گی۔ ایک دفعہ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ میں کسی برف پوش وادی میں ہوں اور مظہر مظہر پکار رہی ہوں لیکن یہ مظہر جانے مظہر علی ہے یا اپنا مظہر، میں پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ناشتے سے فارغ ہوئی تو ابو بھی گھر پر تھے، اس روز ان کی چھٹی تھی۔ میں والدہ کے ساتھ تنہا ہونے کا موقع ڈھونڈنے لگی۔ بمشکل ابو کمرے میں آرام کرنے چلے گئے تو میں حسبِ عادت لاڈ سے والدہ کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔ ”مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا تھی والدہ!“

”مجھے بھی تم سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

”اچھا بتائیں.....“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”پہلے تم بتاؤ.....“

”نہیں پہلے آپ! آپ بڑی ہیں.....“ میں ٹھکی۔

”پہلے تم بتاؤ کیونکہ پہلے تم نے بات بتانے کا کہا تھا۔“ انہوں نے اصرار کیا۔ تب میں نے انہیں یہ بتایا کہ رات میں نے استخارہ کیا تھا، تفصیل سے میں نے انہیں سارے خواب سنائے اور ان سے تعبیر پوچھی۔

”یہ سارے خواب تو مجھے بہت منتشر ذہن کے لگتے ہیں اور زیادہ تر ثانیہ کا گھر دیکھنا اس بات کی نشانی ہے کہ تم ذہنی طور پر مکمل اسی خیال کے زیرِ تسلط ہو، سو وہی تمہیں خواب میں نظر آیا جو تم چاہ رہی تھیں۔“ والدہ نے وضاحت کی۔

”چلیں! مان لیا اگر میں چاہتی بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ یہی میرے رب کی بھی چاہت ہو۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”اب آپ بتائیں، کیا بات کرنا تھی؟“

”یہ بات بھی تمہارے خوابوں ہی کے حوالے سے ہے۔“ والدہ نے تمہید باندھی۔

”میں سمجھی نہیں؟“ میں نے سادگی سے کہا۔

”تم نے بتایا ناں کہ تم نے خود کو خواب میں اسپتال میں دیکھا؟“ والدہ مسکرائیں۔

”تو.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم ذرا ٹھیک سے تیار ہو جاؤ، آج معظم کے گھر والے آرہے ہیں تمہیں دیکھنے کے لیے؟“

”وہ کیوں.....؟“ میرے منہ سے اچانک نکلا۔ حالانکہ اس وقت اس سے احقنا سوال اور

کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

”معمظم کے گھر والے تمہیں دیکھنے اور غالباً دست سوال دراز کرنے کے لیے آرہے ہیں.....

باقی مراحل تو بعد کی بات ہے۔ تم پریشان مت ہو، سب کچھ تمہاری مرضی اور رائے سے ہوگا۔ بیٹا،

بہت مناسب اور حسب حال رشتہ ہے۔“ والدہ وضاحت کر رہی تھیں۔

”مگر والدہ اس طرح..... تیمور کیا سوچے گا؟“ میرا اندیشہ زبان پر آ گیا۔

”تیمور کیوں کچھ سوچنے لگا ایسا ویسا؟ تم نے کیا اس سے کچھ عہد و پیمان کر لیے ہیں جو توڑ و گی تو

وہ سوچے گا؟ اس کے رشتے کو تم انکار کر چکی ہو، اس کی بات طے ہو چکی ہے، اسے اعتراض کرنے کا

کیا حق ہے۔“ والدہ چونکہ میری بات نہیں سمجھی تھیں اس لئے خود ہی قیافوں پر بات کر رہی تھیں۔

”ایسی بات نہیں ہے والدہ۔“ میں جھجھکائی۔ ”کیا آپ ان کو آج آنے سے منع نہیں کر سکتی ہیں؟“

”عجیب سر پھروں والی باتیں کر رہی ہو تم؟ کیا اعتراض ہے تمہیں اس رشتے پر؟ اگر اس کی

بچی پر اعتراض ہے تو وہ غریب پہلے ہی اپنی خالہ کے پاس ہے۔“ والدہ غصے میں آ رہی تھیں۔

”مجھے کسی بچی وغیرہ پر اعتراض نہیں..... والدہ اپنا بلند پریشربائی نہ کریں۔ آپ پلیز مجھے غلط

مت سمجھیں، میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ میں نے التجائی۔

”میں نا سمجھ ہوں ناں، اس قابل ہی نہیں کہ تمہارا برا یا بھلا سوچ سکوں۔“ وہ نیر بہانے

لگیں۔ ”کون سے والدین ہوں گے جو اپنی اولاد کا برا چاہتے ہوں گے، ہم نے تمہاری شادی کی تو

یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سال کے اندر اندر تم پر بیوگی کا لیل لگ جائے گا۔“

”والدہ پلیز!“ میں نے ان کے آگے ہاتھ باندھے۔ ”روئیں مت ورنہ آپ بیمار ہو جائیں

گی۔“ تبھی علی بھائی سامان سے لدے گھر میں داخل ہوئے تو میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”آپ آفس نہیں گئے آج؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، آج والدہ کے حکم پر دفتر سے چھٹی لینا پڑی۔ کل تمہارا حکم تھا تو آدمی چھٹی لی اور آج

والدہ نے کہا کہ بہت اہم مہمان آنے والے ہیں، اس لیے مابدولت آج ڈرائیور، وینٹر اور جانے کیا

کیا فرائض سرانجام دیں گے۔“ علی بھائی خوش دلی سے سامان ڈھونڈ رہے تھے۔

”ذرا ایک دفعہ آکر سودا سلف تو چیک کر لو ماہا۔“ علی بھائی نے ہانک لگائی۔

”تم اٹھو نہا دھو کر کپڑے بدل لو، میں سودا چیک کر لیتی ہوں۔“ والدہ نے مجھے تاکید کی۔

”میں سودا دیکھ کر بھی نہا کر تیار ہو جاتی ہوں والدہ! آپ کا حکم سرانکھوں پر، مجھ میں حکم عدولی

کی تاب کہاں۔“ میں نے فرمانبرداری کی اداکاری کی..... اور انہوں نے فوراً متاثر ہو کر مجھے ساتھ

لگا لیا۔ ”والدہ! جو آپ مناسب سمجھیں کریں، لیکن مجھے خود سے اتنا دور تو نہ بھیجیں!“ میری آنکھوں

میں آنسو آگئے تو وہ لہلہ ہو گئیں۔

”کوئی تم پر زبردستی تو نہیں کرے گا، یوں پریشان نہ ہو۔ تمہاری زندگی کے فیصلے میں سب

سے زیادہ اہمیت تمہاری رائے کی ہے۔ ہم نے اپنے بچوں کی تربیت اس طرح کی ہے کہ انہیں

اچھے برے کا شعور دیا ہے اور پھر زندگی میں اپنی طرف سے بہترین آپشن ان کے سامنے رکھ کر ان

سے تصدیق کی سند لی اور حتمی قدم اٹھایا۔“ انہوں نے مجھے تسلی دی۔ لیکن میں آکر میں نے سودا

وغیرہ چیک کیا اور تسلی ہو جانے پر کلک کو کام سمجھایا۔

”ماہا!“ علی بھائی نے پکارا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کے لہجے میں کیا تھا سمجھ نہ پائی۔

”ماہا! میری دعائیں اور خلوص تمہارے ساتھ ہے، اللہ تمہارے لیے بہتر کرے۔“ میں

جذبات سے مغلوب ہو کر ان سے لپٹ ہی تو پڑی۔

”ارے ہاں!“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”وہ تمہاری دوست کب آرہی ہے دوبارہ والدہ کی

خیریت پوچھنے؟“

”کون سی دوست؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی جس کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں جیسی ہیں اور ان میں گلابی گلابی ڈورے ہیں..... کیا

نام ہے اس کا؟“ علی بھائی نے بھولنے کی ایکٹنگ کی۔

”ثانیہ.....!“ میں نے چیخ نما آواز میں مسرت سے کہا اور دوبارہ علی بھائی سے لپٹ گئی۔

○ ”پھول جب شاخ سے کٹتا ہے..... بکھر جاتا ہے  
 پتیاں سوکتی ہیں..... ٹوٹ کے اڑ جاتی ہیں  
 بیٹیاں پھول ہیں، ماں باپ کی شاخوں پہ جنم لیتی ہیں  
 ماں کی آنکھوں کی چمک بنتی ہیں  
 باپ کے دل کا سکون ہوتی ہیں  
 گھر کو جنت سا بنا دیتی ہیں، ہر قدم پیار بچھا دیتی ہیں  
 جب چھڑنے کی گھڑی آتی ہے  
 غم کے رنگوں میں خوشی آتی ہے  
 ایک گھر میں تو اترتی ہے اداسی، لیکن!!  
 دوسرے گھر کے سنورنے کا یقین ہوتا ہے  
 بیٹیاں پھول ہیں  
 اک شاخ سے کٹتی ہیں..... مگر

اک شاخ پہ کچھ اور نئے پھول کھلا دیتی ہیں۔“ ○ (محمود شام)

اور میں ایک ایسی ہی بیٹی تھی جو اپنے ماں باپ سے چھڑ کر نئی شاخ سے منسلک ہوئی تو وہ شاخ  
 ہی مرجھا گئی۔ میری شاخوں پر پھول تو کیا لگتے میری تازگی بھی برقرار نہ رہی اور اب میرے  
 والدین اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ وہ میرا ناطہ کسی اور شاخ سے جوڑیں تو نئے پھول کھلیں۔  
 والدہ کے کہنے پر ہی میں نے بمشکل کپڑے تبدیل کر کے اپنا حلیہ بدلا اور باولی خواستہ تیار  
 ہو گئی۔ صدف آپنی کے ہمراہ خرم بھائی، صدف آپنی کی ساس اور جیٹھ جھٹانی کے علاوہ ڈاکٹر معظم کا  
 بڑا بھائی اور دو بہنیں بھی تھیں۔ روایتی انداز سے مجھے چائے کی ٹرائی لے کر تو ان کے سامنے جانا نہ  
 تھا البتہ دو پہر کا کھانا ہم سب نے مل کر کھایا۔ ڈاکٹر معظم کے علاوہ سبھی لوگوں نے مجھے پہلے سے بھی  
 دیکھ رکھا تھا، بے شک سب سے سرسری ملاقات تھی، لیکن میرا چہرہ تو ان کے لئے نیا نہ تھا۔ اس روز  
 کی ملاقات کا مقصد مختلف تھا، میرا اپنا دل عجیب سی کیفیات کا شکار تھا، یہ بھی غیبت ہے کہ ڈاکٹر  
 معظم اس موقع پر موجود نہ تھا۔

کھانا کھانے کے بعد جب میں کچن میں قبوہ بنانے کے لئے گئی تو اس وقت غالباً رانی باجی  
 نے والدہ اور والد کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہوگا۔ کیونکہ جب میں قبوہ لے کر گئی تو مجھے  
 ماحول بو جھل سا لگا۔ پراسرار سی خاموشی طاری تھی، کوئی گفتگو نہ ہو رہی تھی۔ قبوہ بھی تقریباً خاموشی  
 سے ہی پیا گیا اور چلتے وقت رانی باجی نے والدہ سے میرے سامنے درخواست کی کہ ان کے سوال  
 پر غور ضرور کیا جائے۔ والدہ نے ان سے یہی کہا کہ وہ اپنی بیٹی سے بات کر کے ہی کچھ جواب دے  
 سکتی ہیں جسے زندگی گزارنا تھی۔ میرے وماغ سے ایک بڑا بوجھ سرک گیا تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ علی بھائی کی طرف سے مجھے مثبت اشارہ ملے اور میں پھر بھی انتظار کرتی رہ  
 جاتی۔ علی بھائی سے ہی کہا کہ دفتر سے گاڑی اور ڈرائیور بھجوا دیں تو میں ثانیہ کی طرف چکر لگا  
 آؤں۔ نہا کر اپنے بال پشت پر گیلے ہی کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ راستے میں گاڑی روک کر تھوڑا سا  
 پھل لیا اور ثانیہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ شہر کے پوش علاقے سے گزر کر متوسط طبقے کے  
 علاقے اور پھر اس سے بھی آگے جا کر غریب آبادیوں کے علاقے کی طرف گاڑی موڑ لی۔

گھر کے نزدیک پہنچ کر میں نے ڈرائیور سے پھل کے تھیلے نکلوائے اور اسے کہا کہ تین گھنٹے  
 کے بعد مجھے لینے آجائے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ڈرائیور ثانیہ کا موجودہ گھر دیکھے، مجھے امید تھی کہ  
 مظہر علی کوشش کر کے کسی علاقے میں فلیٹ لے لے گا تو بہتر ہے کہ بہت سے لوگوں کو ثانیہ کی سابقہ  
 رہائش گاہ کا علم نہ ہو۔ میں نے تھیلے اٹھا کر دروازے کے سامنے پہنچائے اور جب گاڑی نظروں  
 سے اوجھل ہو گئی تو باہر کا پردہ ہٹایا تاکہ دروازہ کھٹکھٹاؤں، مگر دروازے پر لگا تالا دیکھ کر دھک سے  
 رہ گئی۔ کتنی بڑی غلطی ہو گئی تھی مجھ سے کہ میں نے گاڑی بھی واپس بھجوا دی تھی، گاڑی تو خیر واپس  
 پہنچتی تو پھر منگوائی جاسکتی تھی لیکن اس میں بھی گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت لگ جاتا۔

تالا میں نے ہاتھ میں لے کر دیکھا، بند تھا۔ جانے سب لوگ کہاں چلے گئے ہوں گے۔ تالا  
 میں نے ہاتھ سے چھوڑا تو وہ لوہے کے دروازے سے زور سے ٹکرایا اور اس کے ٹکرانے سے کافی  
 اونچی آواز پیدا ہوئی۔ گلی میں گندے سندے بچے کھیل رہے تھے، جن میں سے کچھ اوپری دھڑ سے  
 برہنہ تھے تو کچھ مکمل ننگ دھڑنگ۔ تبھی مجھے گھر کے اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔

دروازے میں کوئی معمولی سی درز بھی نہ تھی کہ میں اندر جھانک پاتی۔ تاہم دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے محسوس کیا کہ کہیں اندر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ باہر سے تالا لگا کر گھر والوں کو اندر بند کر کے..... کچھ لوگ اندر ہوں، کچھ باہر اور کوئی واردات ہو رہی ہو؟ اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور میں نے گھبرا کر دائیں بائیں جھانکا کہ شاید ڈاکوؤں کے ساتھی باہر کھڑے نظر آجائیں۔ میرا وجود ہولے ہولے لرزنے لگا۔ تبھی دروازے کے اندر دنی طرف ثانیہ کی آواز آئی، ”کون ہے؟“

”میں ہوں ثانیہ!!! تم ٹھیک ہو؟ گھر کے باہر تالا کیوں ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”سب خیریت ہے، اصل میں میں گھر پر اکیلی ہوں، امی کو کسی کے ہاں پڑھ دینے جانا تھا اس لیے باہر سے تالا لگا کر گئی ہیں۔ آپ کو میں دروازے کے نیچے سے چابی پکڑاتی ہوں، اس سے تالا کھول لیں تو میں اندر سے کنڈی کھول دیتی ہوں۔“ ثانیہ نے کہا اور دروازے کی دہلیز سے مجھے چابی کا سر نظر آیا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر چابی پکڑی اور تالا کھولا۔ اندر سے ثانیہ نے کنڈی کھولی اور میں نے اس کو تالا اور چابی پکڑائی۔ پھر ہم دونوں نے مل کر پچھل کے لفافے اٹھائے اور پھر ثانیہ نے گھر کو اندر سے کنڈی لگائی۔

میں ثانیہ کی والدہ کے ”حفاظتی اقدامات“ سے جہاں متاثر ہوئی، وہیں یہ اندیشہ بھی میری زبان پر آئے۔ پتا نہ رہ سکا کہ اگر اچانک مصیبت آن پڑے یا خدا نخواستہ ثانیہ کی طبیعت خراب ہو جائے تو؟ جس پر ثانیہ نے بتایا کہ ان کے گھر کے اندر ایک کمرے کی دیوار میں چھوٹی سی کھڑکی ہے جو کہ پڑوسیوں کے ہاں برآمدے میں ہے، کسی ناگہانی صورت میں اس درز سے پڑوس میں آواز دی جاسکتی ہے۔ پھر چھت ان کی چھت سے ملی ہوئی ہے وہاں سے کوئی بھی فوری مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ ”لیکن اگر کوئی ایسی مصیبت آن پڑے کہ اس درز تک بھی تم نہ پہنچ سکو تو؟“ میں نے تشویش سے کہا۔

”انسان اپنے مقدور بھر ہی حفاظتی اقدامات کر سکتا ہے اس کے بعد اسے کچھ چیزیں اللہ کے آسرے پر بھی چھوڑنا پڑتی ہیں اور یوں بھی ایسا ہوتا ہی کم ہے۔ بہت کم ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس طرح کسی ایک بہن کو گھر پر اکیلی ”لاک“ ہونا پڑتا ہے۔“ ثانیہ نے وضاحت کی۔

”ویسے تم اندر کیا کر رہی تھیں؟“ میں نے اس کی مصروفیت کی بابت دریافت کیا۔

”سالن بنا رہی تھی۔“ مختصر سا جواب تھا۔

”کیا پکا یا جا رہا تھا؟“ میں اس کے ساتھ ہی باورچی خانے کی طرف چل پڑی۔ وہ غالباً چولہا بند کرنے جا رہی تھی۔ میں نے ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ سادے آلو کا شوربے والا سالن، وہ مجھے شرمندہ سی نظر آئی۔ ”واؤ! کتنی پیاری خوشبو ہے اور تمہیں کیسے پتہ چلا کہ آلو مجھے بہت پسند ہیں؟“ میں نے اس کی شرمندگی دیکھ کر کہا۔

”یونہی آلو اور انڈے کا سالن بنا رہی ہوں۔ کوئی سبزی آج لایا نہ سکے، میں گھر پر اکیلی تھی اس لیے جو گھر میں موجود تھا۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور پاس ہی پڑنے ہوئے ابلے ہوئے انڈے اٹھا کر چھیلنے لگی۔ ”یہ لاؤ مجھے دے دو“ میں نے اس کے ہاتھ سے انڈے لے لیے۔ ”تم کوئی اور کام کر لو.....“

”اور تو کوئی کام نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”چلو پھر دو گ چائے بنا لو.....“ میں نے کہا تو وہ از حد شرمندہ ہوئی۔

”سوری مجھے خیال ہی نہ رہا.....“ اس نے چائے کا پانی چڑھایا اور بسکٹ جا رہی تھی

کر پلیٹ میں رکھے۔ چائے لے کر ہم برآمدے میں آ بیٹھے۔

”ثانیہ تمہیں میرے علی بھائی کیسے لگے؟“ میں نے اچانک ہی سوال پوچھ لیا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں، اور یوں بھی آپ اتنی اچھی ہیں تو آپ کے بھائی بھی اچھے ہی

ہوں گے۔“

”یہ تو بڑا ٹیڑھا میٹر جا جواب ہے.....“ میں نے منہ بسورا۔

”میں آپ کے بھائی کو اتنا جانتی ہی کب ہوں ماہا آپنی..... اور مجھے یوں بھی اس سوال کی

نوعیت ہی سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ اس نے واقعی میری بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ یوں بھی جس تھکے نظر

سے میں پوچھ رہی تھی وہ تو اس کے گمان کی حدوں سے بھی دور تھا۔ علی بھائی اس کے لیے آسمان پر

چمکتے ہوئے چاند کی طرح ہی ناقابل رسائی تھے۔

”یہ بھی خوب کہی، ثانیہ جی! علی بھائی تو تم سے اتنے متاثر ہوئے ہیں اور تم تو لگتا ہے ان سے

بالکل بھی متاثر نہیں ہوئیں، بلکہ لگتا ہے تم نے تو نظر بھر کر انہیں دیکھا بھی نہ ہوگا.....“ میں نے

شرارت سے کہا۔

”آپ ٹھیک سمجھیں ماہا آپ! میں نے انہیں واقعی نہیں دیکھا اور وہ مجھ سے اس لیے متاثر ہو گئے ہوں گے کہ مجھے انہوں نے آپ کی کوئی امیر کبیر اور آپ ہی جیسی سیلی سمجھ لیا ہوگا۔ ہم جیسی لڑکیوں کو ہماری اصلیت کے فریم میں دیکھ لیں تو کسی کو پسند نہ آئیں۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی اور آنکھوں میں آنسو۔

”پاگل ہو تم تو بالکل! اگر مجھے جانتی ہو تو یقین کرو کہ میرے بھائی بھی میرے ہی جیسے ہیں۔ کیا میں تم لوگوں کے ہاں نہیں آتی سب کچھ جان کر بھی، اور علی بھائی کا تمہیں دیکھنا اتفاقی ہرگز نہ تھا۔ میں اور والدہ اس سے قبل تمہارے گھر آچکے ہیں۔“ میں نے صفائی دی۔

”ماہا آپ! آپ بہت عظیم ہیں مگر آئی کارویہ بھی مجھے یاد ہے.....“ اس نے جواب دیا۔

”پھر وہی بات، ارے والدہ کی عادت اور مزاج ذرا نازک ہیں، اس دن کسی وجہ سے ممکن ہے یوں ہی موڈ ٹھیک نہ ہو۔ اور یوں بھی بات علی بھائی کی ہو رہی ہے، ان کے تم سے متاثر ہونے کی ہو رہی ہے۔“ میں نے والدہ کے رویے کی صفائی دینے کے ساتھ ساتھ علی بھائی کی بابت دوبارہ بات کی۔

”ماہا آپ! آپ سے کہاناں، ہم نے حالات کے ایسے ایسے رخ دیکھ لیے ہیں کہ اب عام نوجوان لڑکیوں کی طرح آنکھوں میں پسینے اور سپنوں میں شہزادے بسانے کی گنجائش نہیں.....“ وہ یاسیت سے بولی۔

”لگتا ہے آج کل اردو ادب کے پرچے کی تیاری ہو رہی ہے.....“ میں نے شرارت سے کہا تو وہ ہنس دی۔ ہم نے بمشکل چائے ہی ختم کی تھی کہ ثانیہ کی امی لوٹ آئیں اور پہلے تو ہر تالانہ دیکھ کر دھک سے رہ گئیں مگر جلد ہی انہیں میرے آنے کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ ثانیہ نے ماں کو بھی چائے بنا کر دی اور میں نے باتوں ہی باتوں میں جبکہ ثانیہ وہاں موجود نہ تھی اشارہ دے دیا کہ ثانیہ علی بھائی کو پسند آئی تھی، ان کی آنکھوں میں بے یقینی ثبت تھی۔

میرا ڈرائیور مجھے لینے آیا تو میں اس سے قبل ہی آئی کے ساتھ باہر کھڑی تھی ان کے گھر سے قدرے فاصلے پر۔ گاڑی آتے ہی میں انہیں خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوئی۔ ثانیہ اور اس کی امی دونوں کی طرف سے مجھے جس گرجوٹی اور خوشی کے اظہار کی توقع تھی وہ نظر نہ آیا تھا۔ میرے دل میں ایک خلش سی پڑ گئی تھی۔ ”شاید انہیں میری بات پر یقین نہ آیا تھا..... شاید ثانیہ کی کوئی اور پسند

ہو.....؟“ ارے یہ تو اتنی سانسے کی بات تھی میرے ذہن میں اس سے قبل کیوں نہیں آئی۔ میں نے خود ہی اپنی سوچ کو رد کرتے ہوئے کہا۔

”کیسا رہا بھی تمہارا اپنی سیلی کے ہاں کا دورہ؟“ علی بھائی نے شام کو مجھ سے پوچھا تو میں جواباً خاموش رہی۔ ان کے اس پُشوق سوال کے جواب میں میرے پاس کچھ زیادہ بہتر تاثرات نہ تھے۔ خود مجھ پر بھی صورتحال مبہم ہی تھی، اس لیے میں نے انہیں کوئی بھی حوصلہ افزاء جواب نہ دیا۔

”ٹھیک تھا!!“ میں نے سرسری سا کہا۔

”ٹھیک تھا کا کیا مطلب بھی؟ تم تو اتنے شوق سے وہاں گئی تھیں، کوئی گپ شپ سناؤ۔ ذرا تبادلہ خیالات کی بابت بتاؤ.....“ انہوں نے میری جان اتنی آسانی سے کب چھوڑنا تھی۔

”اصل میں میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہ تھی، پھر ان کے محلے میں کوئی فوجیدگی ہو گئی تھی، اس لیے ایسی کوئی بھی گپ شپ کی روداد نہیں جو کہ میں آپ کو سناؤں.....“ میں نے بالآخر بہانہ گھڑا۔

”مجھے کب لے کر جا رہی ہو اپنی سیلی کے گھر؟“ انہوں نے اگلا سوال کیا ”اب کرو ذرا بہانہ.....“ میں نے خود سے کہا۔

”جلد ہی چلیں گے علی بھائی..... ابھی ذرا چند دن انتظار کریں۔“

”نیک کام میں دیر اچھی نہیں ہوتی ماہا بی بی.....! انہوں نے میری ننھی سی ناک دبائی۔

والدہ، ابو اور علی بھائی..... سبھی کو ڈاکٹر معظم کا رشتہ پسند آیا تھا۔ بظاہر اعتراض کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ البتہ مجھے اعتراض یہ تھا کہ میں ملک سے باہر کسی صورت نہ جانا چاہتی تھی اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹر معظم اپنی اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر برطانیہ سے کیوں کر آ سکتا تھا۔ والدہ کو تو میرا یہ اعتراض بالکل بے وزن لگا، آخر دنیا بھر میں آج کل ہمارے ہاں سے بیاہ کر لڑکیاں جاتی ہیں۔

لیکن میرے لیے یہ سوچنا بھی بہت کٹھن تھا کہ میں کیسے ایک دیار غیر میں اپنوں کے بغیر رہ پاؤں گی۔ یہاں اگرچہ میں ہر روز اور بسا اوقات ہفتوں بھی والدہ سے نہ مل پاتی تھی لیکن ایک شہر میں رہنے کی تسلی تو تھی۔ اور پھر میں اتنا دور جا کر کیسے رہتی جہاں سے مجھے آنے کا بھی مسئلہ ہو۔ ہوائیں اور فضا نہیں بھی اجنبی ہوں۔ والدہ کا کہنا تھا کہ میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں



باقی سب چیزیں ثانوی ہوتی ہیں۔ آپس میں پیار ہو تو باقی رشتہ داروں کی کمی محسوس بھی نہیں ہوتی۔ مجھ سے بڑھ کر بھلا کون اس بات کو جان سکتا تھا کہ جانے والا تو چلا گیا تھا لیکن اس کی محبت اور اس کے رشتوں کی محبت میرے وجود میں اتنی گہری اتر چکی تھی کہ جیسے کوئی گھٹی چھاؤں اور بے شمار جڑوں والا درخت، جسے زمین سے اکھاڑ پھینکنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔

○ میں مقید ہوں اک زنداں میں

جہاں محبت کی دیواریں ہیں، پیار کا فرش

جکڑا گیا ہے مجھے وفا کی زنجیروں میں

اور حکم آزادی بھی جاری ہو چکا.....

دروازے کھلے ہیں، صیاد بھی جا چکا.....

مگر میں ابھی تک پابند ہوں

خود ہی سے کیے گئے اک وعدے کی زنجیر میں ○ (شیریں حیدر)

صدف آپنی کے ذریعے ہی غالباً ڈاکٹر معظم تک یہ بات پہنچی ہوگی کہ میں اپنی کشمکش میں ہوں اور کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پار ہی۔ اس نے گھر کے نمبر پر ٹیلی فون کیا، گھر پر میں اور والدہ ہی تھے۔ فون والدہ نے اٹینڈ کیا اور مجھے بلا کر فون کا چونکا تھما دیا۔ سلام دعا کا تبادلہ ہوا۔ وہ سیدھے سبھاؤ مطلب کی بات پر آ گیا۔ ”اتنا برا ہوں میں ماہاجی کہ انکار کر دیا آپ نے؟“

”میں نے ویسے انکار نہیں کیا جیسے کہ آپ سمجھ رہے ہیں!“

”چلیں خود ہی بتا دیں کہ کیسے انکار کیا ہے؟“

”اصل میں میں!“ مجھے الفاظ نہ سوجھ رہے تھے، ”میں سمجھتی ہوں کہ میں پاکستان سے باہر خوش

نہ نہ سکوں گی۔ یہاں میرے والدین ہیں، غالب کے گھر والے ہیں، وہ بھی میری ذمہ داری ہیں۔

”خوش رہنے یا نہ رہنے کا تعلق جگہوں سے نہیں بلکہ لوگوں سے ہوتا ہے۔ اور یہی بات آپ

کی سسرال کی ذمہ داری کی کہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ ان کی رازق ہیں۔ اگر آج آپ نہ

رہیں خدا نخواستہ تو کیا وہ سب زندہ نہ رہیں گے؟“ اس کے لہجے میں تلخی تھی اور انداز میں سفاکی۔

”بہت پتھر دل ہیں آپ..... ذرا بھی نہیں سوچا کہ میرے دل کو کیسے تکلیف ہوگی آپ کے

الفاظ سن کر.....“ میں جیسے سسکی۔

”پتھر دل میں نہیں آپ ہیں..... پتھر پر بھی پانی پڑتا رہے تو اس پر اثر ہوتا ہے، اور آپ پتھر

سے بھی سخت دل ہیں غالباً میرے وغیرہ سے بنا ہوا دل ہے آپ کا۔“ اس کی حلقی پر مجھے ہنسی آ گئی۔

”ہنس لیں آپ، لیکن آپ اتنی بے رحم نہیں ہو سکتیں کہ مجھے یوں ٹھکرا دیں۔ میں پہلے ہی

بہت دکھی ہوں اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے۔“

”کوئی اور شخص اگر وجہ ہو اس احتراز کی تو بتا دیں۔ پہلے تو میں تیمور کو اس کی وجہ سمجھتا تھا لیکن

حالات نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔ اب اور ”کون“ وجہ ہو سکتا ہے، میں تو لاعلم ہوں۔“

”آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں ڈاکٹر معظم!!“ میں جھنجھلائی۔

”ڈاکٹر میرا پیشہ ہے، میرا نام صرف معظم ہے..... اگر وہی جواز جو آپ نے اپنی والدہ اور

صدف آپنی کو پیش کیا ہے، حقیقت ہے، تو چلیں آپ کا یہ مطالبہ ماننے کو میں تیار ہوں.....“

”کون سا مطالبہ؟“ میں واقعی نہ سمجھ سکی تھی۔

”کہ آپ کو ملک چھوڑ کر نہ جانا پڑے، میں دیا ر غیر چھوڑ کر یہاں آجاتا ہوں، آخر میری

جڑیں بھی تو اسی ملک میں ہیں۔ اگر مجھے اتنی محبت وطن بیوی مل رہی ہے تو مجھے بھی وطن سے محبت کا

حق تو ادا کرنا چاہئے نا؟“ اس کی اس بات پر میرے دل کی دھڑکنیں اٹھ اٹھنے لگیں۔ کیا

واقعی وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے لئے سب کچھ تہ تیغ دینے کو بھی تیار ہے۔

”آپ کیوں میری خاطر اتنا شاندار مستقبل اور اپنی بیرون ملک کی اتنی اچھی ملازمت کو چھوڑ

دیں گے؟“ میرے من سے اچانک پھسل گیا۔

”سچ سننا چاہتی ہیں؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”ظاہر ہے کہ سچ سننے کے لئے ہی سوال کیا ہے.....“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔

”اس لئے ماہا کہ اگرچہ تم میری پہلی محبت ہو نہ میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت، مگر تم پر

پڑنے والی پہلی نظر سے تم سے محبت کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔“ اس کے الفاظ میں جذباتیت

تھی اور اظہار..... شکر ہے کہ وہ میرے سامنے نہ تھا ورنہ شرم سے گلابی ہوتے میرے چہرے کو دیکھ

کر شاید وہ اپنے بہت سے سوالوں کے جواب پالیتا۔

”کیا میں اس خاموشی کو اقرار سمجھوں؟“ اس کی آواز ابھری۔ میں بھلا اسے کیا جواب

دیتی.....” بولو ناں ماہا! کیا ناراض ہو گئی ہو مجھ سے؟.....“

”نہیں!!“ بمشکل میرے منہ سے نکلا۔

”نہیں کیا؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہو؟“ اس نے ڈرنے کی ایک ٹینگ کی۔

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو تم نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“ وہ مُصر تھا۔

”ڈاکٹر معظم ہمارے ہاں کی لڑکیاں ایسی بات اپنے منہ سے نہیں کہتیں.....“ جانے کیسے

میرے منہ سے پھسل گیا۔ زیادہ شرم تو مجھے اس بات پر آئی کہ میں نے نادانستگی میں خود کو لڑکیوں کی

صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

”تو پھر کس کے منہ سے کہتی ہیں، آپ کے ہاں کی لڑکیاں!!“ اس کے انداز میں طنز نہ تھا بلکہ

شرارت تھی۔

”کیا آپ نے یہ سوچ کر کال کی تھی کہ مجھ زچ کر کے رہیں گے؟“ میں نے بات بدلی۔

”میں نے تو یہ سوچ کر کال کی تھی کہ آپ کو رام کر کے رہوں گا.....“

”اب اگر آپ کے خیال میں آپ مجھے رام کر چکے ہوں تو فون بند کر دیں.....؟“ مجھے اس

طویل کال سے الجھن ہونے لگی تھی۔

”آپ کے جواب سے ہی مجھے اندازہ ہو سکے گا کہ میں آپ کو رام کرنے میں کامیاب ہوا

ہوں کہ نہیں۔“

”اوکے، آپ کو جلد ہی جواب مل جائے گا..... میرا مطلب ہے کہ ”پراپر پینٹل“ سے۔“ میں

نے خدا حافظ کہہ کر جان چھڑوائی۔ فون بند کیا اور ارد گرد دیکھا، کوئی نہ تھا اور میرے دل کی دھڑکنیں

انوکھا ہی راگ الاپ رہی تھیں۔ کہتا ہے کہ پہلی نظر سے ہی مجھ سے محبت ہو گئی تھی اس کو..... لیکن

مجھے ایسا محسوس کیوں نہیں ہوا؟ کیوں میں نے اس کے بارے میں کبھی اس انداز سے نہ سوچا۔

”اصل میں اس نے جب مجھے پہلی بار دیکھا تو میں اس وقت مصیبت اور پریشانی میں تھی،

اس لیے مجھے یہ دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی کہ کون کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔“ میرے دل نے

میرے سوال کا جواب دیا، جو اس کے اظہار محبت سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

”اس نے یہ بھی تو کہا ہے کہ میں اس کی پہلی محبت ہوں نہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی

عورت!!“ دل نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تو تمہاری زندگی میں آنے والا بھی نہ وہ پہلا مرد ہو گا نہ تمہاری پہلی محبت.....“ دماغ نے

تادیل دی۔ لیکن ایک بات کا اقرار کرنے میں مجھے عار نہ ہوئی کہ غالب کے بعد یہ پہلی بار ہوا تھا

کہ کسی کے اظہار نے میرے دل پر دستک دی تھی۔ ”تو کیا میں اس دستک دینے والے کا استقبال

کروں؟“ خود سے ہی میں نے سوال کیا۔ اور دل اور دماغ دونوں اس کی حمایت میں مجھ سے باغی

ہوئے جا رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ والدہ کے سامنے جانے سے بھی جھجک

محسوس ہو رہی تھی۔ خود ہی وہ میرے کمرے میں چلی آئیں۔ انہیں شاید بات شروع کرنے کو الفاظ

نہ مل رہے تھے۔

”کیسا رہا تمہارا ثانیہ کے گھر کا دورہ، تم نے کچھ بتایا ہی نہیں؟“ انہوں نے یونہی بات شروع

کی۔ جواب میں میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح ثانیہ گھر میں مقید تھی۔

”واقعی جوان بیٹیاں تو ہیرے جواہرات سے بڑھ کر انمول اور آگینوں سے بڑھ کر نازک

ان کی عزت ہوتی ہے۔ ماں باپ کے لیے آزمائش ہی ایسی ہوتی ہیں۔ اللہ سب کی بیٹیوں کی

عزت اور خوشیاں سلامت رکھے۔“

”والدہ میں نے اپنا عندیہ ان سے ظاہر کیا تھا، مگر وہ تھوڑے سے گریزاں ہیں اس ذکر سے۔“

”کیوں؟ کوئی کمی ہے کیا میرے بیٹے میں.....؟“ وہ چراغ پا ہو گئیں۔

”ارے نہیں والدہ! کوئی کمی خدا نخواستہ علی بھائی میں نہیں ہے، لیکن آپ اپنے جوان اور

اسمارٹ بیٹے کی ماں ہونے کے زعم میں شاید ان کے ہاں کچھ زیادتی کر گئیں.....“ میں نے مختاط

انداز سے کہا۔

”کیا زیادتی کی میں نے؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگیں۔

”زیادتی تو آپ نے کوئی نہیں کی لیکن آپ کا انداز ذرا.....“ میں گڑبڑا گئی، مغرور جیسا لفظ

میں کہہ کر والدہ کی شان میں گستاخی نہ کرنا چاہ رہی تھی، ”عالمبائے انہیں یہ اندازہ ہوا ہے کہ آپ کو وہ

لوگ پسند نہیں آئے۔“

”حقیقت تو یہ ہے بیٹا کہ مجھے وہ لوگ پسند آئے ہیں، لیکن ہر چیز کو دیکھنا ہوتا ہے۔ مجھے معلوم

ہے کہ علی کو بھی وہ لڑکی پسند آئی ہے، لیکن اگر وہ اس کو اس کے پس منظر میں دیکھے گا تو اس کا سارا

جب دواغ کرتی ہیں اس کو گھر سے۔ اور ماں کے وجود سے منسلک یہ خوف بیٹی کی پیدائش پر نہیں ہوتا، بڑے ہو کر اس کے نصیب سے ہوتا ہے۔

میرے آنسو میرا اقرار بن گئے تھے اور میرے ماں باپ کے لیے یہ اقرار نئے دن کے طلوع کی طرح تھا۔ ”ابھی یہ بات ہم دونوں کے بیچ رہے والدہ!!“ میں نے درخواست کی۔

”کیوں بیٹا انہیں جواب بھی تو دینا ہے، معظم کو واپس بھی جانا ہے، وہ لوگ چاہتے ہیں کہ کم از کم نکاح کرو یا جائے، معنی کی طرح مختصر پیمانے پر.....“ والدہ نے کہا۔

”ہمارے اقرار سے قبل ہی وہ اتنی منصوبہ بندی کیے بیٹھے ہیں؟“ میں نے فحشگی سے کہا۔

”تمہیں رانی کی جلد بازی طبیعت کا اندازہ تو ہے.....“

”یہ تو پھر بہت بڑا تضاد ہے ان میں اور مجھ میں۔ اس پر پھر غور کر لیں والدہ..... میں نے نہ خود کبھی جلد بازی کی ہے نہ مجھے جلد باز لوگ اچھے لگتے ہیں۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”بیٹا! کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ اور سرال میں تو ماحول میکے سے مختلف ہوتا ہی ہے..... اس کا تمہیں تجربہ ہے.....“ والدہ نے ولیل وی۔

”اپنی موجودہ سرال میں خود کو کبھی Misfit محسوس نہیں کرتی والدہ! وہ لوگ ہمارے ہی مزاج کے ہیں، امی جان بہت سمجھدار خاتون ہیں.....“

”اب اگر تمہیں اس رشتے پر اعتراض نہیں ہے تو پھر انہیں ہاں کہلانے پر کیوں اعتراض ہے؟“ والدہ نے چڑ کر سوال کیا۔

”میں چاہتی ہوں کہ پہلے آپ امی جان سے بات کریں اور انہیں اس رشتے کے بارے میں بتائیں۔ پھر اسی گھر میں آپ ان کو لے کر آئیں اور وہ رشتہ بھی انہی سے مانگیں کیونکہ وہ مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہیں، اور یہ نہ سمجھیں کہ اس اہم وقت اور فیصلے میں ہم نے ان کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا۔“ میں نے شرط پیش کی۔

”یا تو تم پہلے بتائیں تو میں بہن جی کو اس روز گھر پر بلا لیتی، جس روز رانی وغیرہ آئے تھے۔ اب تمہاری اس عجیب و غریب شرط نے عجیب ڈرامائی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔“ والدہ نے کہا۔

”مجھے علم نہ تھا کہ وہ یوں ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں، اور نہ ہی یہاں آتے ہوئے مجھے یہ علم تھا کہ یہ سلسلہ ہوگا ورنہ میں آپ سے کہتی کہ امی جان سے بات کر لیں۔ بہر حال آپ صدف

جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ وہ ہر روز مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں اسے لے کر کب جاؤں گی، اور میں یہ بہانہ دیتی ہوں کہ پہلے ماہا کا معاملہ طے ہونے دو۔ اور مجھے بھی اس بات پر پہلے شک لگا تھا، پھر سوچا کہ لڑکی اچھی ہے، ماں باپ کی تربیت اچھی ہے، ہمیں اسی سے غرض ہونا چاہئے۔ البتہ میں علی کو ان کے ہاں تب تک نہیں لے کر جاسکتی، جب تک کہ وہ اپنا گھر تبدیل نہ کر لیں۔ تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ واقعی ان کے بولے ہوئے ہر لفظ میں حقیقت تھی۔

میرا تجربہ ان کے تجربے کے پائے کو بھلا کب پہنچ سکتا تھا۔ اور میں بھی مظہر علی کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اور اسے ضرورت مند جان کر اس کے ہاں گئی تھی۔ اور پھر مجھے اس کے گھر والوں کی سادگی اور سلیقے نے متاثر کیا تھا۔ ورنہ اگر مجھے کوئی رشتہ کروانے والی مائی سیدھے سجاؤ ثانیہ کے ہاں لے کر جاتی تو ممکن ہے میں وہ ماحول باہر سے ہی دیکھ کر پلٹ آتی۔ ”میں آپ کی بات سمجھتی ہوں والدہ، اسی لیے کوشش کر رہی ہوں کہ مظہر علی کہیں پر فی الوقت بے شک کرایہ پر ہی فلیٹ وغیرہ لے لے تو..... میں گھر واپس جاؤں گی تو پھر دیکھتی ہوں کہ اس سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے؟ آپ اسی بہانے سے علی بھائی کو کچھ دن ٹال دیں۔“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”میں علی کو کسی بہانے سے نہیں بلکہ کسی ٹھوس وجہ سے ہی ٹالنا چاہ رہی ہوں.....“ اب میرے لیے بہت مشکل مرحلہ آرہا تھا، ”کیا فیصلہ کیا ہے تم نے بیٹا؟؟“

”میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے والدہ!!! آپ لوگ جو ہیں میرے فیصلے کرنے والے.....“ میرے ان الفاظ سے والدہ کے چہرے کا جس چمک نے احاطہ کر لیا اس کا الفاظ میں تذکرہ ممکن نہیں۔

”تو گویا تمہیں معظم کے ساتھ رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟“ وہ جوش سے بولیں۔ اور میری آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں..... ان کی خوشی محسوس کر کے، اپنی بیٹی کی زندگی کے ساتھ دوسری بار جوا کھیلے ہوئے بھی وہ یوں پر جوش ہو رہی تھیں گویا یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا حاصل ہو۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر آئیں اور میرا سر پکڑ کر ماتھے پر بوسہ دیا اور اپنے ساتھ لپٹا کر رونے لگیں۔

یہ مائیں، یہ بھولی مائیں.....! بیٹیوں کو جنم دیتی ہیں تو خود کو جنس بے مایہ سمجھ لیتی ہیں۔ اپنے ہی وجود کے ٹکڑوں کو اندیشوں کے سائبان تلے پالتی ہیں، اسے گھٹی دیتی ہیں خوف کی، اس کی پرورش کرتی ہیں ڈر ڈر کر، اور پھر یہی خوف چھوٹی سی پوٹلی میں باندھ کر، بیٹی کے ہمراہ کرویتی ہیں،

آپنی سے بات کر لیں کہ میرے لیے وہ لوگ اتنے ہی عزیز ہیں جیسے آپ لوگ..... اور اگر صدف باجی یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سب ممکن نہ ہوگا تو پھر آپ میری طرف سے انہیں انکار کہلا دیں۔“

”یہ تو تمہاری انتہائی بے وقوفی ہے..... مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں اس رشتے میں اور کوئی اعتراض نظر نہیں آ رہا تو تم نے یہ شرط رکھ دی.....“ والدہ چڑھ گئیں۔

”مجھے انکار کرنا ہوتا تو میں سیدھے سبھاؤ انکار کر سکتی تھی والدہ..... آپ کی بات مان رہی ہوں لیکن اسی بات کو ذرا بہتر طریقے سے کرنے کو کہہ رہی ہوں۔ میں اتنے سال سے اس گھر میں ہوں، کیا میں ان کو اس معمولی سے حق سے بھی محروم کر دوں۔ آپ یقین کریں ان کا جواب بھی منفی نہ ہوگا کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں کہ میرا گھر بس جائے.....“

”میں سب جانتی ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ وہ کیوں چاہیں گی کہ تمہارا گھر بس جائے۔ مفت کی نوکرائی، امور کاروبار سنبھالنے والی، ایک بیوقوف لڑکی ان کو ملی ہوئی ہے۔“ والدہ خفا ہو گئیں۔

”والدہ آپ یونہی بدگمان ہیں ان سے اور اسی بدگمانی میں آپ یہ بھی بھول گئیں کہ میں اب ایک لڑکی نہیں بلکہ عورت ہوں۔ میرا گھر وہ بسانا چاہتی ہیں کیونکہ وہ مجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہیں۔“

”تم ان کی ان چالپلوسیوں سے بیوقوف بن سکتی ہو، میں نہیں۔ ایسا ہی تمہیں بیٹی سمجھتی تھیں تو کیوں نہ گھر میں رکھ لیا تیور کے حوالے سے؟“

”وہ یہی چاہتی تھیں اور یہ ہو بھی جاتا اگر میں خود جا کر تیور کے لیے ماہ رخ کا رشتہ نہ مانگتی۔ میں جانتی تھی کہ تیور ماہ رخ کو چاہتا ہے اور یہ غالب کی زندگی سے ہی تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کی خوشی کے مزار پر اپنی تنہا کا مینا تعمیر کروں۔“ میں نے صفائی دی۔

”سب جانتی ہوں میں..... ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں جلد باز لوگ پسند نہیں اور جو جلد بازی تم نے ماہ رخ کے ہاں رشتہ مانگنے میں دکھائی.....“ والدہ نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”بعض جلد بازیاں مصلحت جاذب ہوتی ہیں.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں اس جلد بازی میں جو مصلحت پوشیدہ تھی وہ میں بھی جانتی ہوں میں، کہیں تمہارے دیور

کی پسند کو تمہاری ماں نہ ایک لے!“ اور والدہ کے اس استہزائیہ انداز پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

”کیوں آپ چاہتی تھیں کہ چار لوگ بے چینی اور اضطراب کی زندگی گزارتے۔ ماہ رخ کی شادی علی بھائی سے ہو بھی جاتی تو شاید وہ تیور کو یعنی اپنی پہلی محبت کو کبھی بھلا نہ پاتی۔ اور تیور ماں

کی بات مان کر مجھ سے شادی کر بھی لیتا تو کیا وہ مجھے دل سے بھی قبول کر لیتا؟“ میں نے ان کے سامنے مکمل تصویر رکھی۔

”فلموں اور ڈراموں میں ایسی صورتحال میں لوگ بے چین اور مضطرب ہوتے ہیں کیونکہ انہیں محبت کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہوتا..... حقیقی زندگی میں محبت کے سوا بھی بڑے غم ہوتے ہیں، اس لیے تھوڑا عرصہ گزرتے ہی ساری محبتیں بھول بھال جاتی ہیں.....“ والدہ نے غالباً اپنا تجربہ بیان کیا تھا۔

”آج بڑا شاعرانہ مزاج ہو رہا ہے والدہ!“ میں نے چھیڑا، ”کیا بات ہے آج تو فلسفہ محبت پر بڑی مدلل گفتگو ہو رہی ہے.....“ میں نے لاڈ سے ان کے گلے میں بانٹیں ڈالیں۔ وہ مجھے مصنوعی خفگی دکھا رہی تھیں۔ والدہ سے میرا قلبی تعلق ایسا ہی تھا کہ میں ان کے مزاج کے سبھی موسم سمجھتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ بھلے وہ مجھ سے کتنی بھی خفا ہوں گی لیکن جب اکیلے میں میری باتوں پر غور کریں گی تو ضرور میری دلیل پر قائم ہو کر کوئی نہ کوئی راہ نکالیں گی۔ انہوں نے کبھی مجھے اندھیروں میں تنہا نہ چھوڑا تھا۔ مجھے اللہ کے بعد زمین پر اپنی والدہ کا آسرا سب سے مضبوط آسرا محسوس ہوتا تھا۔

والدہ کی مصنوعی خفگی طول کھینچ گئی تھی اور مجھے شدید الجھن ہو رہی تھی۔ رات کو ابو اور علی بھائی نے بھی ان کے اس رویے کو محسوس کیا اور استفسار کیا کہ اس رویے کی وجہ کیا تھی۔ والدہ نے خرابی طبع کا بہانہ کیا اور میں زیر لب مسکرا دی، ورنہ میں تو توقع کر رہی تھی کہ وہ ابو کے سامنے میری شکایتوں کا دفتر کھول دیں گی اور بقول ان کے جو میرا بے وقوفی کا انداز تھا اس پر ابو سے اپنے حق میں تائید چاہتیں۔ علی بھائی تو ان کی ناسازی طبع کے بہانے سے مطمئن ہو گئے تھے لیکن ابو کا مطمئن ہونا آسان نہ تھا۔

اگلے ہی دن میں نے واپسی کا قصد کیا مگر آتے ہوئے والدہ سے معذرت بھی کی اور انہیں درخواست کی کہ وہ میری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کریں، صدف آپنی کے ذریعہ وہ رانی باجی کو میری پوزیشن واضح کر دیں اور اگر انہیں کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتائیں میں ڈاکٹر معظم سے فون پر بات کر کے اسے خود سمجھا لوں گی۔ اور میری اس بات پر والدہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکیں۔ ”خود کو بہت عقلمند سمجھتی ہو اور تمہیں حالات کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کا طریقہ بھی آتا ہے تو جو جی چاہے

کرد۔ مجھ سے نہ کچھ پوچھنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی میری دخل اندازی کی۔“ وہ منہ پھلا کر بولیں۔  
 ”آپ ہی کے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ آپ معاملہ اپنے طور پر سلجھالیں گی تو آپ کی بیٹی کی کچھ عزت بنی رہے گی، اور اگر آپ کی بیٹی اپنے منہ سے یہ بات کرے گی تو شاید اس کی وقعت کم ہو۔“ میں نے بات کو اس انداز سے پیش کیا کہ وہ بے ساختہ مسکرائیں۔  
 ”کتنا احساس ہے تمہیں میرے بھلے اور برے کا۔“ ناراضگی بھول کر انہوں نے مجھے گلے لگالیا، ”اللہ سب کو تمہارے جیسی بیٹیاں بہوؤں کے روپ میں دے!“ دل سے انہوں نے دُعا دی۔

گھر پہنچی تو امی جان کی طبیعت کچھ ایسی اچھی نہ تھی، حالانکہ ہر روز فون پر بات ہوتی تھی مگر انہوں نے مجھے ہلکا سا شائبہ تک نہ ہونے دیا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔  
 ”یہ کیا امی جان؟ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ طبیعت نا ساز ہے، بیٹی کہتی ہیں اور ایسی غیریت۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”نہیں ماما! بیٹی تم بڑے عرصے کے بعد ادھر گئی تھیں، ذہنی طور پر بھی تمہیں سکون ملا ہوگا اور جسمانی بھی، ایسے میں میں تمہیں ڈسٹرب کرتی تو اچھا نہ ہوتا۔“ انہوں نے وضاحت کی۔  
 ”دوا وغیرہ لی آپ نے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں مظہر لے گیا تھا ڈاکٹر کے پاس، کالج سے تو وہ فارغ ہی تھا۔ آج کل تو باقاعدگی سے دفتر بھی جا رہا ہے اور دیر تک کام کرتا ہے، رات کے کھانے کے وقت ہی گھر آتا ہے۔“ والدہ نے محبت سے مظہر کی کارکردگی کی رپورٹ مجھے پیش کی۔

”رات دیر تک کام کرنے کی کیا ضرورت ہے امی جان! میری تو ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مغرب کے وقت تک سب لوگ اپنے گھروں میں پہنچ جائیں۔ یہی غالب کے زمانے میں روایت رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”چلو اچھا ہے ذرا مصروف تو رہتا ہے، دماغ فارغ رہے گا تو پھر کسی نہ کسی چکر میں پھنس جائے گا۔“ امی جان نے وضاحت دی۔ میں نے اپنا سامان وغیرہ کمرے میں رکھا، کمرہ صاف ہی تھا تاہم پھر بھی بستر وغیرہ جھاڑا اور پھرائی جان نے چونکہ دوا لینا تھی اس لیے کھانا لگوا یا۔ مظہر ابھی

تک نہ لوٹا تھا اور جب ہم کھانا کھا چکے تو وہ گھر لوٹا۔ مجھے لگا کہ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا۔ تاہم بظاہر اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

”کیا حال ہے بھابی؟ کیسے آئیں؟ مجھے بتائیں میں لینے آ جاتا!“  
 ”علی بھائی کا ڈرائیور چھوڑ گیا تھا۔ اور اپنے گھر آنے کے لیے مجھے بھلا ایسے تکلفات کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر تم اتنا کام کر رہے ہو امی جان بتا رہی ہیں کہ بہت محنت کر رہے ہو۔ رات گئے گھر لوٹتے ہو.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”آج تو دفتر سے جلدی اٹھ گیا تھا، اس کے بعد دوستوں کے ساتھ باہر ڈنر پر چلا گیا تھا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”پہلے سے کمزور بھی لگ رہے ہو..... کالج کب شروع ہو رہا ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”اگلے پیر سے کالج کھل رہے ہیں اور اتوار کو نگہت باجی بھی آرہی ہیں۔“ اس کی اس اطلاع پر مجھے بہت خوش ہوئی۔

”کھانا کھاؤ گے؟“ میں نے سوال کیا۔  
 ”نہیں پیٹ بھر کے کھا کر آیا ہوں، البتہ آپ کے ہاتھ کی چائے پیسے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں.....“ میں اس کی فرمائش پر چائے بنا کر لے آئی، امی جان بھی وہیں بیٹھی تھیں۔  
 ”کیسا رہا آپ کا وقت اپنی والدہ کی طرف؟“ مظہر نے سوال کیا۔  
 ”بہت اچھا۔“

”کیسے ہیں انکل، آنٹی اور علی بھائی؟“ اس نے سب کی بابت پوچھا۔  
 ”سب ٹھیک ہے الحمد للہ!“ میں نے جواب دیا۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی، مظہر نے ہی فون اٹھایا، سلام دعا کا تبادلہ ہوا تو اندازہ ہوا کہ صدف آپی کا فون ہے۔ میں نے اٹھ کر نشست تبدیل کی اور مظہر کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر فون لے لیا۔ ”السلام علیکم!“ میں نے کہا۔

”وعلیکم السلام! اور یہ سب کیا بیوقوفی ہے.....؟ تم کیا شرطیں عائد کرتی پھر رہی ہو..... کیا ضرورت ہے سیدھے سادے معاملات کو خواہ مخواہ الجھانے کی؟“ صدف آپی شروع ہو گئیں۔  
 ”جی آپی! بالکل ٹھیک ہوں۔ جی امی جان کی طبیعت کچھ نا ساز ہے اور مظہر ٹھیک ہے، اسارٹ اور فٹ۔“ میں نے گندم کے جواب میں چنوں کی سنائی۔

”سیدھی طرح بات کرو میرے ساتھ، معظم کو بھی تمہاری اس بیوقوفی پر حیرت ہے، وہ تمہارے ساتھ ابھی خود بات کرنا چاہتا ہے.....“ صدف آپ مزید جھنجلا گئیں۔

”جی آپ بس سونے ہی والی تھی..... ہاں بس یاد ہی نہ رہا آپ کو اپنا موبائل نمبر دینا، آپ ابھی لکھ لیں۔ اور میری فکر نہ کیا کریں۔ آئندہ میں بہت احتیاط سے گاڑی چلاؤں گی۔“

”تمہارا دماغ بالکل خراب ہے کیا تمہارے پاس کوئی بندوق لیے کھڑا ہے.....؟“

”جی آپ بس نمبر نوٹ کریں!!“ میں نے اپنا موبائل نمبر بولا، جسے صدف آپ نے انتہائی غصے سے نوٹ کیا ہوگا اور اسی غصے سے انہوں نے فون بند کر دیا۔ فون میں ٹون کی آواز مجھے بہت مکروہ لگی، تاہم چہرے پر ہنست لاکر میں نے غیر موجود صدف آپ کو اللہ حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ امی جان کو ان کے کمرے تک پہنچایا اور میں اپنے کمرے میں آگئی، مظہر بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے بھی اٹھ کر آرام کرنے کو کہا۔

”آپ صبح دفتر جائیں گی یا مجھے ہی جانا ہوگا؟“ مظہر نے پوچھا۔

”تم ہی چلے جانا، ابھی تو تمہاری چھٹیاں ہیں اور میں کل تھوڑی شاپنگ کر لوں گی نگہت اور اس کے بچوں کے لئے۔“ میں نے اس سے کہا۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ میرا مظہر علی سے ملنا ضروری ہے، ”شاید میں تھوڑی دیر کے لیے دفتر کا چکر لگاؤں گی، ذرا ایک چھوٹا سا کام تھا۔“

”مجھے بتادیں، میں ہی وہ کام کر لوں گا۔“ اس نے آفر کی۔

”نہیں وہ کام میرے ہی کرنے کا ہے..... میں آؤں گی تھوڑی سی دیر کے لیے۔“ میری بات کے جواب میں وہ خاموش رہا۔ میں نے کمرے میں آکر نگہت کے آنے کی پلاننگ مکمل کی اور پھر مظہر علی سے بات کرنے کا سوچتی ہوئی نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ رات دیر سے نیند سے چونک گئی، موبائل کی ہلکی سی گھنٹی کی آواز آ رہی تھی کیونکہ موبائل فون میرے پرس میں رکھا تھا۔ نیند سے چوڑھٹی، اس لیے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ کلاک پر رات کے دو بجے کا وقت دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً ڈاکٹر معظم ہوگا، لیکن اس وقت بھلا میں اس سے کیسے بات کر سکتی تھی اور بالخصوص جس موضوع پر اسے بات کرنا تھی، مجھے خود پہلے اس کی بابت سوچنا تھا۔

صبح حسب عادت آنکھ کھل گئی، دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسلندی سے پڑی رہوں، مگر امی جان کی طبیعت کی خرابی کا علم تھا اس لیے بادل خواستہ بستر چھوڑا، ہاتھ روم سے نکلی اور پرس میں سے موبائل فون نکال کر چیک کیا۔ دس دفعہ معظم نے کال کیا تھا، یقیناً موصوف ناراض ہوں گے اور میں اب اس فکر میں مبتلا تھی کہ ایک بالکل نئی قسم کا تعلق اس شخص سے پیدا ہو رہا تھا، اس حوالے سے اسے منانا بھی شاید تھا۔

ناشتے سے قبل امی جان کی شوگر چیک کی اور پھر انہیں ہلکا سا ناشتہ دے کر بعد میں دوبارہ شوگر چیک کی تو دونوں دفعہ شوگر زیادہ تھی۔ بیٹھے کی اور تلی ہوئی اشیاء کی تو وہ بہت احتیاط کرتی تھیں اور انسان کے بس میں تو ہوتی بھی غذائی احتیاط ہی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ شوگر ٹینشن سے بھی بڑھتی ہے تو اب یہ کسی کے بس کی بات تو نہیں ہوتی کہ وہ ٹینشن لے یا نہ لے۔ یہ تو غیر اختیاری فعل ہے۔ ہم لوگ مریض کی صرف اسی طرح مدد کر سکتے ہیں کہ ہر وہ خبر جو مریض کو پریشانی میں مبتلا کر سکتی ہے اس سے چھپائی جائے اور اسے حتی المقدور خوش رکھنے کی کوشش کی جائے۔ تاہم میں نے امی جان سے کہا کہ تھوڑی دیر میں وہ تیار ہو جائیں تو انہیں ڈاکٹر کو دکھا کر پھر میں انہیں ساتھ لے کر ہی نگہت کے لیے شاپنگ پر چلی جاؤں گی اور یوں بھی گھر کا ایک کمرہ بھی نگہت اور بچوں کے لیے تیار کرنا چاہ رہی تھی۔

مظہر ناشتہ کر کے روانہ ہوا تو میں امی جان کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے ان کی شوگر چیک کر کے تشویش کا اظہار کیا کہ ابھی تک تو وہ دواؤں سے کنٹرول ہو رہی تھی، اگر یہی رفتار رہی اس کے بڑھنے کی تو ممکن ہے انہیں انسولین کے انجکشن لگانا پڑیں۔ اور امی جان حتی الامکان اس مرحلے سے بچنا چاہ رہی تھیں کیونکہ خود کو انجکشن لگانا انہیں بہت مشکل مرحلہ لگتا تھا۔ ڈاکٹر سے فارغ ہو کر میں لبرٹی کے علاقے میں اسی اسٹور پر والدہ کو لے کر آئی جہاں پر زارا ملازمت کرتی تھی۔ پہلے فلور پر ہی وہ مجھے گاہکوں کے ساتھ مصروف نظر آئی۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ ان گاہکوں سے فارغ ہو کر ہی ہمارے پاس آئے گی، اس لیے میں نے امی جان کو یونہی چھوٹی چھوٹی سی فراکس اور شرنیں اٹھا کر دکھانا شروع کر دیں۔ ایک دوا اور سیلز مین اور سیلز گرل مدد کو آئے مگر میں نے انہیں شکریہ کہہ کر لوٹا دیا۔ تبھی زارا فارغ ہو کر سیدھی ہماری طرف آئی۔ انتہائی تمیز سے اس نے اپنا پیشہ وارانہ انداز بھی برقرار رکھا اور مجھے اور امی جان کو سلام کیا۔

”یہ غالب بھائی کی امی ہوں گی یقیناً؟“ اس کے سوال میں ہی جواب تھا۔ میں نے اس کی تصدیق کی۔ امی جان نے مجھ سے اس کی بابت پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ میری دوست ہے اور یہ کہ اس کا بھائی ہمارے پاس جا کر رہتا ہے۔

زارا نے شاپنگ میں ہماری رہنمائی کی، امی جان بھی اس کے انداز، گفتگو اور تیز سے بہت متاثر ہوئیں۔ جب کاؤنٹر پر ادائیگی کے لیے کھڑے تھے تو انہوں نے کھل کر اس کی تعریف کی اور دکان کے مالک سے بھی اس کی تعریف کی۔ تب دکان کے مالک نے بتایا کہ زارا کی کارکردگی کے باعث اس کی ترقی کر کے اسے مینیجر بنانے کی آفر کی گئی تھی مگر اس نے انکار کر دیا کہ دفتر میں بیٹھ کر دفتری امور سنبھالنے کی نسبت وہ گاہکوں سے براہ راست رابطہ رکھنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ تاہم اس نے ایسی در کر کے لیے بہتر مراعات کی سفارش پیش کر رکھی ہے۔

واپسی پر ہم گھٹ کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے آئے اور درزی کو اس کے کپڑے ارجنٹ سلائی کے لیے دے دیئے۔ گھر پہنچ کر میں نے امی جان کے لیے کھانا بنایا اور اپنے لیے تھوڑا سا سوپ لے کر ان کے پاس ہی آ بیٹھی۔ ”کیسی لگی آپ کو زارا؟“ میں نے سوال کیا۔

”بڑی پیاری بچی ہے۔ کہاں رہتی ہے؟ بچے کتنے ہیں اور شوہر کیا کرتا ہے اس کا؟“ امی جان نے تین چار سوالوں کو ایک ہی بار میں پوچھ لیا۔

”بچے بھی نہیں ہیں اس کے اور شوہر بھی کچھ نہیں کرتا۔“ میں نے شرارت سے کہا۔ ”اے بچے! بچاری کیسی بد نصیب ہے.....“ امی جان کو تاسف ہوا تو میری ہنسی نکل گئی، ”ہنس کیوں رہی ہو بیٹا؟“ میرا تو اندازہ ہے کہ میں نے پینے میں ہوگی، وہ تو شکل و صورت بھلی ہے اور دھان پان ہی ہے اس لیے ذرا کم عمر دیکھتی ہے اور یہ تمہاری دوست کہاں سے ہو گئی؟ ہو سکتا ہے عائشہ کی کلاس فیلو؟“

”آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے امی جان اس کی عمر کا، البتہ وہ عائشہ باجی کی بھی کلاس فیلو نہیں ہے اور ہاں اس کی شادی نہیں ہوئی، بلکہ نکاح ہوا تھا اور پھر طلاق ہو گئی۔“ اس پر ان کے تاسف میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ تب میں نے انہیں زارا کے بھائی صفدر کی داستان سنائی اور پھر مظہر علی سے میرا کس طرح ٹکراؤ ہوا، سے لے کر ان کی حالیہ تنگدستی اور حالات کا مختصر سا نقشہ کھینچا۔ ”اور امی جان میں نے نوید صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ زارا سے شادی کر لیں، جبکہ اس

سے چھوٹی ثانویہ کارشتہ میں نے والدہ سے درخواست کی ہے کہ علی بھائی کے لیے لے لیں.....“ ”بہت اچھی سوچ ہے بیٹا! اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے اور تم جو دوسروں کی بیٹیوں کے لیے ایسا سوچتی ہو تو اللہ تمہارا بھی نیک سبب لگائے۔ میری تو سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں اپنی زندگی میں تمہاری یہ خوشی بھی دیکھ لوں۔“ امی جان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ”ابھی تو آپ کو بہت سی خوشیاں دیکھنا ہیں تیور کی اور مظہر کی..... بلکہ میں تو سوچ رہی تھی کہ اب گھٹ آئے تو ہم تیور کی منگنی کا فنکشن رکھ لیں گے۔ وہ کون سا بار بار پردیس سے آسکتی ہے۔“ ”جیسا تم مناسب سمجھو بیٹا! ابھی میں بھی تو اس حق میں نہیں ہوں، میری تو خواہش تھی.....“ ”پلیز امی جان! اب اس بات کو بھول جائیں۔“ میں نے ان کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی کاٹ دی، ”لیکن ایک عدد مسئلہ ہے زارا اور ثانویہ کے رشتوں کے راستے میں.....“

”غریب اور بن باپ کی بچیوں کی شادیوں میں ایک مسئلہ ہے تو یہ ان کی بڑی خوش قسمتی ہے ورنہ ایسی بچیوں کے لیے تو ہزاروں مسائل منہ پھاڑے کھڑے ہوتے ہیں۔“ امی جان کا تجزیہ کتنا حقیقت پر مبنی تھا۔ ”تاہم کیا مسئلہ ہے اور مجھے بتاؤ کہ اس سلسلہ میں میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”امی جان اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہیں جس علاقہ میں رہنا پڑ رہا ہے وہ ایسا علاقہ ہے کہ وہاں پر کسی کے لیے بھی رشتہ لے کر جانا آسان نہ ہوگا۔ غریب سی بستی ہے۔ میں نے مظہر علی سے کہا تھا کہ وہ فیسٹری کے نزدیک ہی کوئی چھوٹا فلیٹ یا گھر کرائے پر لے لے یا اگر کوئی برائے فروخت مل جائے تو کچھ رقم ہم اس کو دفتر سے قرض خنہ کے طور پر دے دیں، کچھ انہیں پرانا گھر بیچ کر مل جائے گی، باقی ادائیگی وہ قسطوں میں کر لے گا اور اس کے مسائل ایک ایک کر کے حل ہو جائیں گے۔ یوں تو اسے قرض حسنہ نوید صاحب بھی دے سکتے ہیں اور والدہ بھی، لیکن یہ بات مظہر علی، اس کی والدہ اور اس کی بہنوں کی عزت نفس پر تازہ پانہ ہوگی۔ شاید وہ اس طرح اس رقم کو قبول نہ کرے۔“ میں نے بات یہاں تک کر کے وقفہ دیا۔

”مجھ سے کیا چاہتی ہو بیٹا؟ کیا میں یہ رقم اسے قرض دے دوں؟“ امی جان نے پوچھا۔ ”نہیں امی جان! میرے اور آپ کے پاس ملا کر رقم ہو تو جائے گی لیکن میں چاہتی ہوں کہ اسے دفتر سے رقم قرض کے طور پر دی جائے اور ماہانہ قسطیں بھی مقرر کی جائیں تاکہ مظہر علی کو ہتک محسوس نہ ہو۔ آپ سے صرف یہ اجازت چاہتی تھی کہ اسے دفتر سے قرض دینے کی اجازت دے

دیں۔ میں کوشش کروں گی کہ یہ بات مظہر کے نوٹس میں نہ آئے۔ ابھی تک ایسی طرفداری ہم نے کسی ملازم کی نہیں کی ہے۔“

”ماہا! بیٹا جیسا تم سوچ رہی ہو، وہی کرو۔ نوید کو اور تمہیں علم ہوگا۔ مکمل حساب کتاب ہوگا اور سب دفتر کے ریکارڈ پر ہوگا، رہی بات مظہر کو علم ہونے کی تو اگر اسے معلوم ہو بھی جائے تو میرا خیال ہے کہ اسے بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ امی جان نے کہا۔

میں ان کی اجازت پر دل سے ان کی مشکور تھی، میرے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ میں مظہر کو جانے کیوں یہ سب معلوم نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید میں مظہر علی کے گھر والوں کی عزت نفس کے بارے میں بہت محتاط تھی۔ یوں بھی مجھے علم تھا کہ اگر کسی اسٹیج پر بھی اسے یہ محسوس ہو کہ میں اس پر خواہ مخواہ ترس کھا رہی تھی تو وہ بدک ہی نہ جائے۔ حالانکہ میں پورے خلوص سے اس کے حالات بہتر دیکھنا چاہتی تھی۔

”مگر کیوں؟“ میں نے خود سے سوال کیا، ”میں کیوں اتنا پریشان ہو رہی تھی ان کے گھر کے مسائل کی بابت۔“ شاید یہ انسانی ہمدردی تھی؟ مگر دنیا بھری پڑی ہے ایسے لاکھوں افراد ہر روز ہماری نظر کرم کے متمنی ہوتے ہیں۔ مگر ہم کس کس کے لیے اس حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ سوچ کر خود کو بہلایا کہ جس حد تک اور جس طرح بھی انسان کسی کی مدد کر سکے، کسی کے زخموں پر پھپھار کھ سکیں۔ خود کو مطمئن کر لیا تو مجھے لگا کہ میں مظہر علی سے سہولت سے بات کر سکوں گی۔ اس روز تو میں اتنا تھک گئی تھی کہ دفتر نہ جاسکی۔ یوں بھی فائدہ کچھ نہ تھا، مظہر علی کو دفتر بلا کر میں مظہر کے سامنے بات نہ کر سکتی، اس لیے میں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا کہ جب مظہر کالج جانا شروع کر دے اور میں دفتر جو آؤں کر لوں تو۔

رات کا کھانا کھا کر کمرے میں آ کر نماز پڑھی اور یونی ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ مظہر جلد ہی واپس آ گیا تھا۔ اگلے روز سے اس کا کالج شروع ہونے والا تھا۔ امی جان کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ مجھے بھی اگلے روز سے دفتر جانا تھا، ذہن میں ترتیب وار الفاظ کو بٹھانے لگی کہ کس طرح مظہر علی سے بات کرنا ہوگی۔

تیمور سے تقریباً ہر روز فون پر بات ہو جاتی تھی یا پھر وہ موبائل پر پیغام وغیرہ بھیجو دیتا تھا۔ ماہ رخ بھی گاہ بگاہے چکر لگاتی رہتی تھی۔ ان کی طرف بھی نگہت اور بچوں کے استقبال کی تیاریاں ہوتی تھیں۔ ساتھ ہی جالبابا مکہ منگنی کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ میں سوچوں کے بھنور میں گم تھی کہ موبائل فون کی کھنٹی بجی، فون سائیڈ ٹیبل پر دھرا تھا، ممکن ہے کہ تیمور کا فون ہو، میں نے بے خیالی میں فون اٹھایا اور اسکرین پر صدف آپنی کا نمبر جگمگاتا ہوا دیکھ کر دل کی دھڑکنیں اٹھل پھل ہونے لگیں، لب آپ ہی آپ مسکرا اٹھے۔

شکر ہے کہ مان رہ گیا!! دل کیسا شکستہ سا تھا یہ سوچ کر کہ وہ دشمن جاں!! کیسے دنوں میں ہی خیالات پر قابض ہو گیا تھا۔ کیسے اس کی ناراضگی سے فضاؤں میں بھی اداسی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے کیسے مناؤں..... دل کتنا مسخور ہو گیا ہے، تو خود ہی لوٹ آیا ہے، اور میرا مان رہ گیا ہے۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہی ہوں گے، اگر وہ دل کے ڈاکٹر تھے تو میرے دل کی پکار بھی غلط نہ ہو سکتی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا اپنے جذبوں پر۔ میں نے فون آن کر کے السلام علیکم کہا تو جواب میں صدف آپنی تھیں، سلام دعا کے تبادلے کے بعد انہوں نے یہ تسلی کرنے کے بعد کہ میں اکیلی تھی اور جاگ رہی تھی فون معظم کو وے دیا۔ ”ہیلو!“ معظم کی شوخ سی آواز آئی۔

”السلام علیکم!“ میں نے جتلانے والے انداز میں کہا۔

”والسلام!“ جواب میں عجیب طریقے سے انگریزی اسٹائل میں ولیم السلام کو ادا کیا گیا۔

”جی فرمائیے کیا حال ہے؟“ میں نے ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ماہا! آپ بالکل معہ ہو، جکسا پزل جیسا!“ اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ میں سمجھ کر بھی انجان رہی۔

”یہ کیا انداز ہے کسی کے پروپوزل کو قبول کرنے اور پھر اسے مشروط کر دینے کا؟ مجھے آپ کی اس انوکھی شرط کا مقصد بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ زندگی آپ کی ہے، آپ نے گزارنی ہے اور فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کے پاس ہے۔ پھر آپ نے اپنی سسرال میں رشتہ بھیجنے والی مخ نہ جانے کیوں رکھ دی ہے؟ مجھے اس پر شدید اعتراض ہے۔“

”دیکھیے ڈاکٹر معظم! میں اب اسی گھر میں رہتی ہوں اور اس گھر سے میرا رشتہ اگر چہ یکے جتنا پرانا جیسا مگر ان کی اہمیت میرے لیے بہت زیادہ ہے کہ اس گھر کے کلین مجھے اہم گردانتے ہیں۔



میری ہر رائے اور ہر فیصلے کو مانتے ہیں۔ بس میں نے یہ خواہش کی تھی کہ اس رشتے کی قبولیت کا شرف امی جان کے ہاتھوں انجام پائے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ کو یہ سب سمجھنا سب سے آسان ہوگا اور آپ ہی میرے نکتہ نظر کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔“ میں نے معظم سے وضاحت کی اور اپنی بات کے آخر تک پہنچتے پہنچتے میرا لہجہ غالباً ڈولنے لگا تھا۔

”میں بہت قدر کرتا ہوں آپ کے جذبات کی اور آپ کے اس جذبے کی لیکن میرے لیے اپنے گھروالوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہوگا۔ اوپر سے وقت تنگ ہے، میں چاہتا تھا کہ جانے سے قبل کم از کم نکاح ہو جاتا۔“

”آپ تو تھیلی پر پرسوں جمانے والی بات کر رہے ہیں۔“ میں مسکرائی، ”ہر چیز کی جلدی ہے آپ کو۔ ابھی تو جلد ہی تیور اپنے کورسز کے لئے کوئٹہ جانے والا ہے اور اس کی بہن کی آمد کے موقع پر اس کی منگنی کی رسم کرنے کا بھی ارادہ ہے۔“

”چلیں یہ تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ایک ہی وقت میں تیور کی منگنی اور ڈاکٹر معظم کا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔

”نکاح کی کیا ضرورت ہے قبل از وقت؟“ میں نے اپنے اندیشے کو زبان دے دی۔

”نکاح کی صورت میں آپ کی امیگریشن وغیرہ کے کام میں سہولت رہے گی۔“

”مگر میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں ملک چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی!!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”کبھی کبھار..... اگر آپ ناچیز کو اس قابل سمجھیں تو ملنے آسکتی ہیں، پھر ہمیں اپنا ہی مون وغیرہ بھی پلان کرنا ہوگا۔“ اس کی اس بات پر مجھے عجیب سی مسرت کے احساس نے چھوا۔

”اگر آپ میری اس چھوٹی سی خواہش کا خیال رکھیں تو ہی آپ بندی سے مستقبل میں اپنی خواہشات کی تکمیل کی توقع کر سکتے ہیں۔“ میں نے شرارت سے کہا۔

”تو گویا آپ کے التفات کو حاصل کرنے کے لیے یہ شرط لازم ہے؟“ اس نے بے یقینی سے کہا، میرے دل میں عجیب سا احساس جاگا۔ سمجھ نہ پائی کہ جواب کیا دوں۔

”نہیں ایسی کوئی شرط لازم تو نہیں ہے، لیکن میں یہ سمجھ بیٹھی کہ اگر میں آج اس سسرال کی عزت بنانے کے لیے آپ سے یہ ادنیٰ سا تقاضا کروں گی تو آپ میری کیفیت کو سمجھیں گے اور آپ کو کیا آپ کے گھر میں سے کوئی بھی ہوا سے یہ یقین ہونا چاہئے کہ اگر آج میں ان کی اتنی عزت

کرتی ہوں تو ظاہر ہے کل کو آپ سب کی بھی اتنی ہی عزت کروں گی اور اتنا ہی اہم سمجھوں گی۔“ جانے کیسے یکدم میرے منہ سے یہ سب ادا ہو گیا۔

”میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں، آپ کی تو اس سے قبل بھی کرتا تھا۔ دیکھیں بھلا گھر میں کس طرح رائے آپ کے اس مطالبے کے حق میں ہوا کرتا ہوں۔“ اس نے مجھے تسلی دی۔

”اگر آپ کو یہ محسوس ہو کہ یہ کام آسان نہیں بلکہ دشوار ہے تو بے شک کوشش ترک کر دیں، لیکن صرف میری ایک خواہش ہے.....“ میں رُک گئی۔

”ایک نہیں دو خواہشات بتائیں۔“ سخاوت کا مظاہرہ ہوا۔

”میرے اور آپ کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو، ہمارے درمیان ہی رہے.....“ میں نے ہچکچا کر کہا۔

”اوشیور! میں صدف آپ کو بھی نہیں بتاؤں گا، اور کوشش کروں گا کہ نئی زندگی کی ابتدا میں ہی آپ کو اپنا اعتماد دے سکوں اور آپ کو احساس دلا سکوں کہ آپ میرے لیے کتنی اہم ہیں.....“

میرے کانوں میں وہ امرت رس ٹپکا رہا تھا، مجھے یقین تھا کہ وہ خود ارادہ کرے گا تو ضرور اس میں کامیاب ہو جائے گا۔

”آپ کا بہت شکریہ!“ میں نے دل سے کہا۔

”دیکھ ماہا! میرے اور آپ کے درمیان ایسے پر تکلف قسم کے الفاظ کا تبادلہ اتنا ضروری بھی نہیں۔“ خدا حافظ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور جانے کیا ہوا کہ اس کے بعد میں نے اسی کو سوچنا شروع کر دیا۔ خوابوں میں بھی اسی کا ساتھ تھا اور خیالوں میں بھی۔

اگلے ہی روز دفتر پہنچ کر میں نے دو تین گھنٹے تک کام اور فائلیں وغیرہ چیک کیں، پھر لنچ بریک سے پہلے چڑا کر مظہر علی کو بلوا لیا۔ لنچ بریک میں میں زیادہ سے زیادہ سینڈوچ یا سوپ لے لیتی تھی۔ لیکن اس روز میں نے دو پلیٹ سینڈوچ کے علاوہ سوپ کا آرڈر بھی دے دیا۔ مظہر علی کے آنے پر میں نے اس سے اس کی جاب اور مصروفیت کی بابت پوچھا، پھر گھر والوں کی خیریت۔

”مظہر علی آپ کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ سے کھل کر بات کروں۔ اس سے قبل میں نے

آپ کی والدہ سے اشارت بات کی تھی اور آپ ان کے بیٹے ہو تو یقیناً انہوں نے آپ سے بات کی ہوگی؟ میری بات سمجھ رہے ہیں آپ؟“ میں رُکی۔

”جی میڈم!! آپ غالباً میری بہنوں کے رشتوں کی بات کر رہی ہیں؟“ اس نے اختصار سے کہا۔

”ٹھیک سمجھ! میں جتنا آپ لوگوں کو جان پائی ہوں، مجھے اندازہ ہوا ہے کہ آپ لوگ بہت اچھے، شریف اور سلجھے ہوئے ہیں۔ حالات نے آپ لوگوں کو اس طرح رہنے پر مجبور کر دیا ہے اور یہ مشکل وقت ایسا ہے کہ اپنی بہنوں کے رشتوں کی وجہ سے آپ کو اپنا طرزِ رہائش تھوڑا سا بدلنا ہوگا۔ ورنہ شاید ان کی عمریں نکل جائیں۔“ میں نے تلخ حقائق کی وضاحت کی۔

”میں یہ سب جانتا ہوں اور سمجھتا بھی ہوں، لیکن آپ میری مجبوریاں بھی جانتی ہیں۔ اب کچھ حالات بہتر ہوئے ہیں ورنہ میری موجودہ نوکری سے قبل کے مشکل حالات کو آپ بھی جانتی ہیں۔“ اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

”میں سب سمجھتی ہوں مظہر علی! اور میں صدقِ دل اور خلوص نیت سے کوشاں ہوں کہ زارا اور ثانیہ کے رشتے ہو جائیں۔ آپ گھر سے باہر نکلتے ہو، دنیا دیکھی ہے اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ لوگوں کے کیا کیا مطالبات ہوتے ہیں۔ اگرچہ نوید صاحب اور میری والدہ دونوں لالچی لوگ نہیں ہیں لیکن جس حلقہٴ احباب میں وہ رہتے ہیں، اس میں ایسی مادی اور سطحی چیزوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ بے شک کوئی چھوٹا سا گھر سہی لیکن کسی بہتر علاقے میں لے لیں۔“ میں نے جھجکتے ہوئے بات مکمل کی۔

”میں نے اس سلسلے میں کافی چیک کیا ہے، تب سے جب آپ نے بات کی ہے، لیکن کسی بھی علاقے میں میرے لیے فلیٹ یا گھر لینا مشکل بلکہ ناممکن سی بات ثابت ہوئی ہے۔ بلکہ ایک نامکمل گھر بھی دیکھنے میں آیا تھا جو کہ نسبتاً بہتر علاقے میں ہے، لیکن بنکوں سے قرض پر آج کل مارک اپ کی شرح بھی بہت زیادہ ہے اور پھر میرے پاس ضمانت کے لئے کوئی جائیداد ہے نہ سرمایہ۔“ مظہر علی نے بیچارگی سے کہا۔ ”فلیٹوں کے کرائے بھی بہت زیادہ ہیں، لیکن اگر آپ سمجھتی ہیں کہ یہ بہت ضروری ہے تو میں تھوڑے عرصہ کے لیے فلیٹ لے لیتا ہوں اور اپنا موجودہ گھر بیچ کر اس میں سے کرایہ ادا کرتا رہوں گا، مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ گھر ہی ہماری کل جائیداد ہے، مجھے اسی کوچ

کر بہنوں کو بیاہنا بھی ہوگا۔“

”جو نامکمل گھر آپ تیار ہے ہیں وہ کس علاقہ میں ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”چھاؤنی سے نکل کر جب آپ دھرم پورہ کی طرف جاتے ہیں، وہاں پردس مرلہ پر یہ گھر تیار ہو رہا تھا، ڈھانچہ تیار ہے، پلستر بھی ہوا ہے اور پھر صاحب خانہ کی وفات ہو گئی۔ اولاد ان کی ہے نہیں اور خاتونِ خانہ یہاں رہنے میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ گھر کو بیچ باج کر اپنے بھائیوں کے پاس امریکہ جانا چاہتی ہیں۔“ مظہر علی نے وضاحت کی۔

”آپ نے اس کی لاگت کا تخمینہ لگوا یا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یوں تو جو رقم وہ مطالبہ کر رہی ہیں وہ بمشکل زمین ہی کی رقم ہے، اور میرا ایک بہت قریبی دوست ان کا بھانجا ہے، اس نے ہی بتایا تھا مجھے، میں نے دلچسپی ظاہر کی اور اپنی بے بسی بھی تو اس نے ان سے دوبارہ بات کر کے بتانے کا وعدہ کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ لاکھ دو لاکھ مزید کم کر دیں گی، لیکن میری استطاعت سے وہ بھی زیادہ ہے.....“

”آپ جس گھر میں رہ رہے ہیں اس کا تخمینہ بھی لگوائیں اور گھر میں کھڑکیاں، دروازے لگوانے اور رنگ و روغن کا بھی۔ اللہ مدد کرے گا، کچھ آپ دفتر سے قرضہ لے لیں، کچھ بینک سے اور خاتون سے بات کر دیکھیں کہ اگر وہ قسطوں میں رقم لینے پر تیار ہو جائیں تو؟“ میں نے ایسے اطمینان سے کہا جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔

”لیکن میڈم اتنی بڑی رقم مستعار لینا، بہنوں کی شادیاں.....“ وہ تذبذب میں تھا، ”میں اتنا کچھ کیونکر کر سکوں گا؟“

”مظہر علی! میں نے انہی چیزوں کو مد نظر رکھ کر یہ تجویز دی تھی، اگرچہ آپ لوگوں کو کچھ عرصہ بہت مشکل لگے گا لیکن اگر آپ یہ مشکل نہ ختم کریں گے تو پھر زندگی بھر جن مشکلات کا سامنا رہے گا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوں گی۔“ میں نے اسے مستقبل کی تصویر دکھائی۔

”ممکن ہے کہ ہماری اپنی ہی حیثیت کے لوگوں میں ان کے رشتے طے پا جائیں.....“ اس نے جھجک کر کہا۔

”آپ اس بات پر کم از کم میری گارنٹی پر یقین کر لو کہ جہاں آپ کی بہنوں کے رشتوں کی بات چل رہی ہے وہاں پر کسی کو کوئی غرض نہیں نہ ان کے جہیز سے اور نہ ہی شادی پر دیگر اخراجات

سے۔ اور اگر آپ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کم حیثیت لوگوں میں رشتہ داری کرنے سے آپ کے اخراجات ممکن ہے کہ کم ہوں تو یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ خرابی تو موجود ہے کہ اس طبقے میں لوگوں کے اپنے حالات جیسے بھی ہوں مگر انہیں اپنے سپوتوں کو کیش کروانے کا شوق ہوتا ہے۔ وہاں بھی مستثنیات موجود ہیں مگر میں عمومی رویوں کی بات کر رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی بہنوں کی شادیوں پر ہی اور پھر مستقلاً آپ اخراجات کے ایسے گرداب میں پھنس جائیں کہ آپ کو احساس ہو تو بہت دیر ہو چکی ہو۔“ میں نے اسے حقیقت حال بتائی۔ وہ خاموش رہا، ”مظہر علی! آپ اس بات پر سوچ لیں، اپنی والدہ سے مشورہ بھی کر لیں۔ آپ اکیلے میں غور کرو گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں آپ کے بھلے کے لئے ہی یہ مشورہ دے رہی ہوں۔“

”آپ کے خلوص نیت پر مجھے کبھی پہلے شبہ تھا نہ اب ہے۔ میری والدہ اور میری بہنیں بھی آپ کو اپنے گھر کے ایک فرد کی طرح سمجھتی ہیں اور آپ کے توسط سے آنے والے دونوں رشتے میری بہنوں کے لئے میری سوچ اور میری اوقات سے بہت بڑھ کر ہیں۔ میں تو اتنے بہترین رشتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آپ کی کاوشیں میرے اوپر ہمیشہ احسان بن کر رہیں گی۔“ شکر گزاری کے جذبات سے معمور مظہر علی نے کہا۔

”ارے آپ اتنے بالکل نہ ہوں۔ بس غور کریں اور بلکہ آئی سے کہیں کہ اس سلسلہ میں استعارہ کر لیں۔“ میں نے مشورہ دیا اور پھر اس نے اجازت چاہی۔

مظہر علی کے جانے کے بعد میں نے نوید صاحب کو بلایا اور انہیں مظہر علی سے ہونے والی تمام گفتگو کا لب لباب بتا دیا۔ انہوں نے مطلوبہ رقم اپنی طرف سے بطور قرض حسنہ دینے کی پیش کی، ان کا خیال تھا کہ مظہر اگر کبھی آکر دفتر میں حساب کتاب چیک کرے گا تو ممکن ہے دفتر سے اتنی بڑی رقم دیئے جانے پر اعتراض کرے۔ لیکن میں نے ان کی تجویز یہ سوچ کر مسترد کر دی کہ مظہر علی کبھی بھی اتنی بڑی رقم نوید صاحب سے نہ لے گا۔ اس کی انا، اس کی عزت نفس اس سے متاثر ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ میں نے ان سے ضرور درخواست کی کہ گھر کی ذیل ہو جائے تو جتنا بھی جلد اس کے کھڑکیاں، دروازے اور رنگ و روغن وغیرہ مکمل کروائیں۔

نوید صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں مظہر علی کے ساتھ جا کر گھر کو دیکھ لیں گے اور کاریگروں کو بلوا کر آرڈر دے دیں گے تاکہ مزید تاخیر نہ ہو۔ سودا فائل ہوتے ہی کچھ بیعانہ دے

کر ہم کام شروع کروائیں گے۔ نوید صاحب کی اس دلچسپی سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوئی کہ وہ اس رشتہ پر رضامند تھے۔ ”آپ زارا سے ملنا نہیں چاہیں گے؟“ میں نے نوید صاحب سے پوچھا۔

”مجھے آپ کے انتخاب پر اعتماد ہے لیکن یقیناً وہ اور اس کے گھر والے مجھے ملنا چاہیں گے اور اس کے لئے مناسب وقت غالباً وہی ہوگا جب وہ لوگ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں تو پھر میری ”رومانی“ اور باقاعدہ رشتہ ڈالنے کی رسم اکٹھے ہی ہو جائیں گے۔“ ان کی اس بات پر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ نے اپنی زندگی کے اتنے اہم معاملہ میں مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے وہ میرے لیے واقعی اعزاز ہے اور میری دعا ہے کہ آپ کو اس رشتے سے اتنی خوشیاں ملیں کہ کبھی مجھے آپ کی طرف سے ایسی خبر نہ سننے کو ملے کہ مجھے اپنی سوچ اور انتخاب پر پچھتاوا ہو۔“ میں نے صدق دل سے انہیں دعا دی۔

”کوئی اور حکم میڈم؟“ انہوں نے اجازت چاہی۔

”ہاں یہ مظہر پچھلے دنوں رات دیر دیر تک دفتر میں کیا کرتا رہا ہے؟“ مجھے یکدم کچھ یاد آ گیا۔ ”مظہر؟“ نہیں تو!! وہ تو ہر روز پانچ بجے دفتر سے اٹھ جاتا رہا ہے۔ رات دیر تک تو یہاں کسی بھی دن نہیں رکا۔“ انہوں نے جواب دیا تو میں ششدر رہ گئی۔

”لیکن مجھے تو اس نے کہا کہ وہ دفتر سے ہی لیٹ ہو گیا تھا۔“ میں بڑبڑائی۔

”جوان بچہ ہے اور اسماٹ بھی..... ممکن ہے کسی اور چکر میں ہو اور گھر والوں کے سوالوں سے بچنے کے لئے بہانہ کر گیا ہو۔ گھر پر بڑا بھائی سر پر نہ ہونے کی وجہ سے اکثر نو جوان لڑکے ایسے چکروں میں پھنس جاتے ہیں۔“ وہ مسکرائے۔

”میں تو اسے چھوٹا سا سمجھتی ہوں، جانے اس طرف دھیان کیوں نہیں جاتا؟ لیکن ظاہر ہے کہ بات کچھ ایسی ہی ہوگی، جو اس نے جھوٹ بولا..... چلیں میں خود پوچھوں گی اس سے۔“ میں نے بات گول مول کر دی۔

”ماہا! ذرا خیال سے اور محتاط رہ کر بات کیجئے گا، اگر وہ کچھ بتانے پر تیار نہ ہو تو مُصر نہ ہوں۔ تیمور کے آنے پر اس معاملے کو ٹال دیں۔ یونہی آپ کے ساتھ کوئی بد مزگی نہ ہو جائے۔“ نوید

صاحب بے اختیاری میں مجھے مایا کہہ گئے۔

”میں سمجھتی ہوں..... بہر حال آپ کا مشورہ ٹھیک ہے، میرا خیال ہے تھوڑے ہی دن میں تیمور آنے والا ہے۔ اس کے سامنے بات کرنا سب سے مناسب ہوگا۔“ میں نے رسان سے کہا۔

نگہت کے آنے سے لگا گھر کا ہر گوشہ مسکرا رہا ہو۔ اس کے بچوں کی رونقیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے گھر بھر گیا۔ خوشی تو پیاری پیاری باتیں کرتی تھی۔ زیادہ تر وہ انگریزی ہی بولتی تھی، نگہت نے بتایا کہ زیادہ وقت وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہتی ہے اور کارٹون دیکھتی رہتی ہے۔ اسی لیے ہم سب نے اس بات کو نوٹ کیا تھا کہ اس کی انگریزی بھی آواز اور لہجہ بگاڑ کر بولنے والی تھی، جیسا کہ کارٹون بولتے تھے۔

بچوں کی تربیت کا یہ دور یقیناً سب سے زیادہ والدین کی توجہ اور سرپرستی کا مستحق ہوتا ہے۔ سب سے بہتر تو یہی ہوتا ہوگا کہ والدین خود بچوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کریں، انہیں اچھی باتیں سکھائیں اور دیار غیر میں رہنے والے والدین کی تو یہ ذمہ داری بھی ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو اپنے مذہب، اپنی زبان اور اپنی اقدار سے روشناس کرائیں۔ خوشی میں میں نے اتنی کم عمری میں بھی ضد اور ہٹلار پن دیکھا تھا۔ جس بات پر اڑ جاتی تھی اسے منا کر ہی دم لیتی تھی۔ نگہت نے اس کی وضاحت یہ کی کہ عبداللہ کی پیدائش سے وہ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ اور مجھ سے اس نے اکیلے میں یہ بھی کہا کہ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی عادت اس کی پھوپھی ماہِ رُخ پر گئی ہے۔ ”یقین کرنا اس کی شکل بھی اسی کی طرح ہے اور عادتیں بھی۔“

”لگتا ہے تم نے ماہِ رُخ کو بہت سوچا ہوگا خوشی کی پیدائش سے پہلے؟“ میں نے شرارت سے کہا۔ یہ اس کی خاص چڑچڑی۔

”یقین کریں بھابی! میں تو دعا کرتی تھی کہ میری بیٹی بالکل آپ جیسی ہو، شکل میں بھی، عقل میں بھی اور سلیقے میں بھی۔“ نگہت کی آواز بھرا گئی۔

”فکر نہ کرو! بیٹیاں عام طور پر ماؤں کا پرتو ہوتی ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”اللہ نہ کرے بھابی! اس کی ماں سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔“ اس کے لہجہ پر میں سن ہو گئی۔

”اس طرح نہ کہا کرو، اور اس نادانی اور اس وقت کو بھول جاؤ.....“

”میں تو بھول جاؤں، مگر میری لوح قسمت پر وہ سب انہٹ روشنائی سے نقش ہے۔ میں اس بابِ زندگی کو دوسروں کے دماغوں سے کھرچنے کی طاقت تو نہیں رکھتی۔“ وہ یاسیت سے کہہ رہی تھی۔

”کسی نے کہا کچھ؟“ میں نے پوچھا۔

”ماہِ رُخ تو اکثر ہی جلتا ہے..... مگر یونہی ایک دفعہ میرے منہ سے بات پھسل گئی کہ اگر ماہِ رُخ اور تیمور کا آپس میں سلسلہ نہ ہوتا تو شاید مایا بھابی اور تیمور کی شادی ہو جاتی۔ ہمارے گھر کے لیے بھی بہتر ہوتا..... اعجاز نے پہلے تو اس بات کا یقین ہی نہ کیا۔ پھر میرے سامنے ہی ماہِ رُخ سے پوچھ ڈالا کہ کیا واقعی اس کا اور تیمور کا آپس میں پسندیدگی کا کوئی سلسلہ تھا؟ وہ تو بھر ہی گئی اور بڑے بھائی سے بھی اتنی بدتمیزی سے بولی کہ خود تو آپ بے تکلفی کی ساری حدیں شادی سے پہلے ہی پار کر گئے تھے اور ہمیں دوستی کی بھی اجازت نہیں..... میں تو شرم سے زمین میں گر گئی۔ میں نے ہی معافی تملانی کر کے معاملہ رفع کروایا، لیکن بھابی میرے لیے تو یہ طے زندگی بھر کے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں پانی سا چمک رہا تھا۔

”چلو تم دل پر مت لو اور آئندہ کوشش کرو کہ ایسا موقع ہی نہ آئے کہ اس موضوع پر بات ہو۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ اس نے آنکھوں کے گوشے صاف کیے۔

”ابھی تک تو یہ بات دو چار لوگوں کے بیچ ہے لیکن تیمور بھائی سے شادی کے بعد اس نے یہ بات اگر تیمور بھائی کو بتادی تو میرے لیے اس سے بڑھ کر شرم کا اور کیا مقام ہوگا؟“ وہ بہت پریشان تھی۔ میں نے اسے سمجھایا اور کہا کہ میں کبھی موقع دیکھ کر ماہِ رُخ سے بھی یہ بات کروں گی۔

”سچ بھابی! آپ کبھی مان جاتیں تو نہ صرف اس گھر کی بلکہ آپ کی زندگی کی کھوئی ہوئی خوشیاں بھی واپس آ جاتیں۔“

جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اپنی خوشی کی خاطر ہم دوسروں کی خوشیوں کو ڈس لیتے ہیں۔ تباہ کر دیتے ہیں، گھروں کے گھر، دوسروں کے مزاروں پر اپنی خواہشات کے مینار تعمیر کرتے ہیں۔ مصلوب کر دیتے ہیں دوسروں کو، اپنی تمنائوں کی صلیب پر۔

مگر مجھے تو یہ سب کچھ گوارا ہی نہ تھا۔ میرے لیے تو یہ سب ممکن ہی نہ تھا۔ نہ خواب میں نہ خیال میں..... میں نے نگہت سے یہ وعدہ بھی لیا کہ اس کے بعد وہ کبھی بھی، کسی کے بھی سامنے یہ

باتیں نہ دہرائے گی، پرانے قصوں کو نہ چھیڑے گی۔ کبھی یہ نہ کہے گی کہ میری اور تیمور کی شادی کا خیال کبھی کسی کے ذہن میں آیا تھا۔

ذرا سا جو ماہِ رُخ اڑتی اڑتی یہ خبر سن لیتی تو جانے میرے بارے میں کیا کیا سوچتی۔ جو فتور اس کے دل میں برسوں پلٹے رہے ہوں گے، ان کو زبان مل جائے گی۔ تیمور کے لیے جب تک میں نے اس کی والدہ کے سامنے سب سوال دراز نہ کیا تھا، تب تک تو وہ مجھے اور تیمور کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی ذرا سی بھٹک اسے ایسی طے جو اس کے کسی منفی شے کو تقویت دے۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہی باتیں اگر کسی طرح اُڑ کر ڈاکٹر معظم تک پہنچیں تو..... وہ کچھ بھی سوچ سکیں گے۔ میرے اس گھر میں رہنے کو بھی شک کی نظر سے دیکھیں گے اور پھر میری آئندہ زندگی کا نقشہ کیا ہوگا۔

○ عمر بھر لرزتی رہی ہے عمارت گھر کی،

جیسے کسی زلزلے کے اثر میں ہو۔

نظر آتی ہیں، ان دیکھے لوگوں کی پرچھائیاں،  
جو سرگوشیاں کرتے ہیں،

اور کہتے ہیں

جو ہوا ہی نہیں کبھی!

کبھی چھت گرنے کا خوف رہتا ہے،

کبھی کسی دیوار کے،

کوئی ستون کھسک نہ جائے،

اسی خوف میں مبتلا رہتی ہے۔

عورت اسی حال میں جی کر چلی جاتی ہے

اک گھر میں رہتے ہوئے بھی،

اس گھر کی شکستگی سے لرزاں۔

اسی کوشش میں انگلیاں نگار کر لیتی ہے

کہ اس اینٹ کو نوچ کر نکال دے

بنیادوں میں جو پڑ جاتی ہے ٹیڑھی

شک کی پہلی اینٹ!! ○ (شیریں حیدر)

میرے ذہن میں تو کبھی تیمور کے لیے ایسی سوچ نہ آئی تھی، میرا ضمیر اور ذہن بالکل صاف تھا لیکن میں کس کس کو اپنی صاف نیتی کا یقین دلاتی، کس کس کو صفائیاں دیتی۔ مجھے ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ اگر میں نے اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ کر ہی لیا تھا تو اس میں ایسے الزامات میرے ہمراہ ہوتے۔ نہ ڈاکٹر معظم میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا، نہ ہی میں ان کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت۔ اور پہلے مرد اور پہلی عورت کا تصور ان سے تعلق کی کک تو عمر بھر کی رفیق ہوتی ہے ایسے جوڑوں کی۔ مزید اس کک میں اضافہ نہ ہو بس یہ چاہتی تھی میں۔

نگہت کی آمد کے دور و ز بعد تیمور بھی آن پہنچا۔ کافی کمزور لگ رہا تھا وہ۔ ظاہر ہے کہ بہاد پور کا موسم اور یونٹ کی سخت روٹین نے اسے ایسا کروا دیا تھا۔ اس کے آنے سے گھر بھر کی رونقیں دوبالا ہو گئیں۔ امی جان کی بیماری تو لگتا تھا کہ کبھی تھی ہی نہیں۔ نگہت، تیمور اور مظہر جب آپس میں گپ شپ کے لیے بیٹھے تو لگتا ہی نہ تھا کہ ان میں ایک دو بچوں کی ماں، ایک فوجی افسر اور ایک ایم بی اے کا اسٹوڈنٹ بیٹھا ہوا ہے۔ بہت عرصے کے بعد یوں ان تینوں کو اکٹھے ہونے کا موقع ملا تھا۔

خوشی میرے ساتھ بہت مانوس ہو گئی تھی۔ ضد کر کے میرے پاس ہی سوتی تھی۔ شروع میں تو نگہت جھجکی کہ وہ رات کو مجھے تنگ کرے گی لیکن جب پہلی رات خیریت سے گزر گئی تو اس کے بعد وہ میرے پاس ہی سونے لگی۔ میں اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی، اسے اردو کی نظمیں اور کہانیاں سناتی۔ اردو وہ بولتی بے شک نہ تھی مگر ماں اور باپ کو بولتے سنتی تھی اور اسی لیے سمجھ بھی لیتی تھی۔ مجھ سے چونکہ اسے قدرتی طور پر لگاؤ ہو گیا تو میں نے اس کیساتھ یوں اداکاری کی جیسے مجھے انگریزی کی سمجھ ہی نہ آتی ہو۔ مجبوراً وہ خاموش ہو جاتی یا پھر میرے الفاظ کو نقل کرنے کی کوشش کرتی۔ تھوڑے سے دنوں میں ہی اس نے اردو کے بیسیوں فقرے بولنا شروع کر دیئے تھے۔

گھر میں سب نے میری دیکھا دیکھی اس کے ساتھ اردو بولنا شروع کر دی اور یوں اس چھوٹی سی بچی کو جلد ہی اپنا میڈیم تبدیل کرنا پڑتا۔ رات وہ مجھ سے لپٹ کر سوتی تو مجھے عجیب سکون کا

احساس ہوتا اور میں سوچتی کہ میرا بچہ ہوتا تو وہ شاید اس سے تھوڑا سا بڑا ہی ہوتا۔ اور میں بے ساختہ ہو کر اس سوئی ہوئی بچی کو چومے جاتی۔ اس کے وجود کا لمس مجھے بہت پر کیف لگتا۔

تیور کے چھٹی پر آنے سے قبل ہی ہم نے ماہِ رُخ کے گھر والوں پر اپنے ارادے کا اظہار کر دیا تھا، اس لیے دونوں طرف اندرونِ خانہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ منگنی کے موقع پر زیادہ تیاری تو عموماً لڑکی والوں کو ہی کرنا پڑتی ہے، لڑکے والوں کو تو صرف لڑکی کے کپڑے اور انگلی وغیرہ ہی بنانا ہوتا ہے۔ عمومی رسم تو یہ ہوتی ہے کہ ایک دن لڑکے والے لڑکی کی طرف جاتے ہیں اور دوسرے دن لڑکی والے لڑکے کی طرف۔ لیکن ہم سب اس حق میں تھے کہ غیر ضروری رسومات سے گریز کیا جائے اور ایک ہی تقریب کی جائے، وقت اور پیسہ دونوں کی بچت ہو سکتی ہے۔

میں نے امی جان کے ہمراہ جا کر زمر کا ہلکا سا سیٹ ماہِ رُخ کے لیے خرید لیا تھا اور اس کو رقم دے دی تھی کہ وہ ہم رنگ لباس اپنی مرضی سے تیار کروالے۔ سیٹ کے علاوہ ہیرے کی ایک انگلی عیحدہ سے بھی بنوائی تھی جو کہ رسم کے وقت پہنائی جانا تھی۔ اس طرف سے بے فکری تھی، لیکن باقی افرادِ خانہ کی تیاری کا ذمہ بھی میرا ہی تھا۔ سب کے لیے ملبوسات، جوتے اور ضرورت کی باقی اشیاء میں نے امی جان کے مشورے اور نگہت کی ہمراہی میں جا کر بنالیں۔

موقع دیکھ کر میں نے ایک روز تیور کو بازار جانے کا بہانہ کر کے ساتھ لیا اور راستے میں نے اس سے بات کی کہ مظہر وعدہ کرنے کے باوصف بھی جانے کس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف ہے کہ اس طرح اس نے مجھے اپنے لیٹ گھر آنے پر جھوٹ بول کر کہا کہ وہ دفتر میں تھا جبکہ بعد ازاں چیک کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ تیور گاڑی چلا رہا تھا، اس کا دھیان سامنے تھا لیکن اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ اضطرابی انداز سے حرکت کر رہے تھے۔

”کیا خیال ہے بھابی؟ پھر انہی جھیلوں میں پھنس گیا ہوگا؟“ اس نے تشویش سے پوچھا۔  
”کچھ کہہ نہیں سکتی، بظاہر تو ایسا نہیں لگتا۔ داڑھی بھی تم نے دیکھا ہوگا کہ چھوٹی چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ دروازہ جو ہر وقت لاک رہتا تھا اب لاک نہیں ہوتا۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ غالباً کوئی لڑکی وغیرہ کا چکر؟“

”تمہیں لگتا ہے کہ چھوٹو ایسا ہو سکتا ہے؟“

”اب وہ چھوٹا نہیں رہا بھابی! کافی بڑا ہو گیا ہے..... کم از کم قد کا ٹھہ میں تو ہم سب سے نکل

گیا ہے۔“ تیور بولا۔

”چلو تم پریشان نہ ہو، میرا مقصد تمہیں بتانا تھا تا کہ تم کو سب جانے سے قبل اس سے بات کر سکو۔“  
”الٹھ سا گیا ہوں میں۔ کورس پر جا رہا ہوں اور کورس کے دوران سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اب جانے یہ کس چیز میں ملوث ہو گیا ہے..... کہیں اس دوران کوئی مسئلہ ہی نہ کر دے؟“  
تیور کے لہجے میں تشویش تھی۔

”تم ذرا اس سے نرمی سے ہی بات کرنا، بلکہ اگر ممکن ہو تو کسی وقت اس کا کمرہ چیک کرنا۔“  
میں نے آہستگی سے اسے کہا۔

”کاروبار کیسا جا رہا ہے؟“ اس نے یکدم موضوع تبدیل کر دیا۔

”بہت اچھا۔ دفتر کا چکر نہیں لگاؤ گے کسی دن؟“

”آؤں گا ضرور.....“ علی بھائی کا بھی کوئی رشتہ وغیرہ فائل ہوا کہ نہیں؟“

”دیکھ رہی ہیں والدہ آج کل، اسی سلسلہ میں کافی مصروف ہیں، جلد ہی کچھ خبر مل سکتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ کہیں سلسلہ چل رہا ہے؟“ تیور نے پوچھا۔

”وہ تو والدہ خود اور ساری بہنیں بھی اپنے اپنے طور پر سرگرم عمل ہیں۔ دیکھیں کب کوئی کوشش بار آور ثابت ہو سکتی ہے.....“ میں نے جواب دیا۔

”مظہر کتنی دفعہ اور کب کب گھریٹ آیا تھا؟“ گھما پھرا کر وہ وہیں آن پہنچا جہاں سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اندر سے اسے تشویش تھی اور یوں ہی دھیان بیٹانے کو ادھر ادھر کے سوالات کرنے لگا تھا۔

”بس تم زیادہ پریشان نہ ہو تیور، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا.....“ میں نے اسے تسلی دی۔

اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔ میں نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“  
”بھابی! آپ کب تک یوں ہمارے لیے پریشان ہوتی رہیں گی، کب تک اپنے آپ کو پس پشت ڈال کر اپنے خون پسینے سے اس گھر کو ستیختی رہیں گی..... کب تک ہماری پریشانیوں سینے کی تگ و دو میں خود پر جبر کرتی رہیں گی؟“ انتہائی جذباتی ہو رہا تھا۔

”میں، آپ لوگ اور ہمارا گھر..... کوئی عیحدہ عیحدہ چیزیں تو نہیں ہیں۔“

”پھر بھی آپ اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سوچیں..... کبھی کبھار انسان کو کسی حد تک

خود غرض بھی ہونا چاہئے۔“

”انسان کے دنیا میں آنے کا یہ مقصد تو نہیں کہ وہ خود غرضی سے اپنی زندگی جیے اور اپنی ہی ذات سے غرض رکھے۔“

”لیکن آخر کب تک آپ اپنی خوشیوں کے بارے میں نہیں سوچیں گی؟“

”تمہاری شادی ہو جائے، گھر میں ذمہ داریاں سنبھالنے والی آجائے تو پھر میں اس تجویز پر غور کروں گی۔“

”میری شادی ہوگی تو گھر سنبھالنے والی تو پھر بھی اس گھر کو نہ سنبھالے گی، کیونکہ وہ تو وہیں رہے گی جہاں میری پوسٹنگ ہوگی.....“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اب مجھے تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سوچوں، تو امی جان کا کیا ہوگا؟ مظہر کا تو تمہیں علم ہے کہ ذرا لاپرواہ سا ہے.....“ میں نے تاویل پیش کی۔

”بھابی میں آپ سے بارہا یہی درخواست کروں گا کہ آپ اپنی زندگی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت ان مسائل سے ہٹ کر سوچیں۔ امی جان میرے ساتھ چلی جائیں گی اور مظہر تب تک تعلیم مکمل کر کے کاروبار سنبھال لے گا تو اس کی بھی شادی ہو جائے گی.....“

”تم تو بڑی دور تک پلاننگ کیے بیٹھے ہو، میں تو سمجھتی تھی کہ غم روزگار نے تمہیں گھر کی فکروں سے لاپرواہ کر دیا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”مذاق کر رہی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں تو سیریس بات کر رہی ہوں، اس میں مذاق کا کیا پہلو ہے؟“

واپسی پر ہم آئس کریم اور چاکلیٹ لے کر گھر آئے، خوشی تو چاکلیٹ پا کر بہت خوش ہوئی اور اپنی توتلی زبان میں ”مامی شکریہ!“ کہہ کر چاکلیٹ کی پیکنگ کھولنے لگی، اور اس کے اس معصوم شکریہ پر میں نے اس کے پھولے پھولے گالوں کا بوسہ لے لیا۔ نگہت باورچی خانے میں تھی۔ میں سمجھی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی ہوگی۔ میں نے کمرے میں جا کر غسل کر کے کپڑے بدلے اور نماز عصر پڑھ کر لاؤنج میں آئی تو امی جان اور تیمور وہیں بیٹھے تھے۔ عبداللہ امی جان کی گود میں سو رہا تھا اور وہ ہاتھ میں شیج لیے رو کر رہی تھیں۔ جبکہ تیمور کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ٹیلی ویژن آن تو تھا مگر اسے دیکھ کوئی نہ رہا تھا۔ میں نے بیٹھ کر اسے آف کر دیا۔

”نگہت کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچن سے ابھی فارغ ہوئی تھی، خود بھی شاور لے کر کپڑے بدلے گی اور خوشی نے چاکلیٹ سے اپنا سارا فراک، ہاتھ اور چہرہ گندے سندے کر لیے تھے، اسے بھی نہلا کر تیار کرے گی۔“ امی جان نے جواب دیا۔

”کیوں کہیں جانا ہے کیا انہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں بہن جی کی کال آئی تھی..... وہ لوگ آرہے ہیں.....“ امی جان نے والدہ کے بارے میں بتایا۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید تیمور کی منگنی کی مبارکباد دینے آرہے ہیں۔

”کون کون آرہا ہے؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”تفصیل تو نہیں پوچھی بیٹا، لیکن صدف کا انہوں نے خود ہی بتا دیا۔ میں نے کہا کہ کھانا نہیں کھائیں لیکن انہوں نے اپنی کوئی اور مصروفیت بتا دی ہے اس لیے نگہت سے میں نے کہا تھا کہ چائے کے لیے تازہ سمو سے، شامی کباب اور گلاب جاشیں بنالے۔“ امی جان خود ہی تفصیل بتانے لگیں۔

”نگہت کو آپ نے خواجہ زحمت دی..... فریزر میں کچھ نہ کچھ پڑا ہو گا یا پھر بازار سے کچھ منگوا لیتے۔“ مجھے شرمندگی کا احساس ہوا، ”والدہ کون سا کوئی مہمان ہیں؟“

”وہ مہمان نہ سہی لیکن خود وہ اتنا تکلف کرتی ہیں تو ہمارا کیا اتنا ساق بھی نہیں ہے؟“ امی جان نے کہا، ”اور پھر وہ بتا رہی تھیں کہ شاید صدف کی جھٹانی بھی ساتھ ہوں اور وہ خاص طور پر مجھے ملنے کو آ رہی ہیں۔ صدف کی سسرال سے کوئی مہمان آئے تو اتنا تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی خاطر مدارات بھی اس کے شایان شان ہو۔“ امی جان کے انکشاف پر میرے ہاتھ پیر جیسے سن ہو گئے۔ یونہی دل میں خیال آیا کہ اگر انہیں آتا تھا تو کم از کم صدف آپنی مجھے کال کر لیتیں۔ سوچ ہی رہی تھی کہ کمرے میں جا کر صدف آپنی کو کال کر کے تفصیل پوچھوں اور یہ کہ انہوں نے ایسے دن کا انتخاب کیوں کیا جب فقط دو روز کے بعد تیمور کی منگنی تھی..... تبھی تیمور ہاتھوں میں چائے کے دو مگ لیے ہوئے آیا اور ایک مجھے تھما دیا۔ میں نے لینے سے انکار کیا یہ کہہ کر میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر تیمور نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے کپ پکڑتے ہی بنی۔ گرم گرم چائے کا پہلا گھونٹ ہی لاوے کی طرح محسوس ہوا، پھر بھی میں چائے کو تیزی سے حلق سے اتار رہی تھی۔ چائے ختم کرتے ہی میں

باتھ روم جانے کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں گئی اور پرس سے فون نکالا تو اس پر صدف آپنی کی پندرہ دفعہ کال آئی تھی، لیکن مجھے علم نہ ہوا تھا۔

اب میں اپنی بیوقوفی پر پچھتانے لگی کہ مجھے نہانے کے بعد یا پھر نماز کے بعد فون چیک تو کرنا چاہئے تھا یا کم از کم اسے پرس سے ہی نکال دیا کروں تو کھنٹی کی آواز آئے۔ میں نے صدف آپنی کا نمبر ڈائل کیا تو وہ بھی فون نہ اٹھا رہی تھیں۔ کافی دفعہ کوشش کر چکنے کے بعد مجبوراً میں نے ڈاکٹر معظم کا نمبر ملایا، ”ہیلو!“ کے جواب میں میں نے ”السلام علیکم“ کہا اور اس نے حسب معمول اپنے مخصوص لہجے میں ”والسلام“.....

”کہاں ہیں آپ؟ صدف آپنی کہاں ہیں؟ فون نہیں اٹھا رہی ہیں؟“ میں نے بے تابی سے دو تین اکٹھے سوالات کی بارش کر دی۔

”صدف آپنی ڈرائیونگ کر رہی تھیں اس لیے فون نہیں اٹھا رہی تھیں، اور کیا عالم ہے بے تابی کا..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ ”کوئی“ اتنی بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہا ہے۔“ اس نے کوئی پرزور دے کر کہا۔

”پلیز مذاق چھوڑیں اور بتائیں کہ ہیں کہاں آپ؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔  
”ہم آپ کے بہت قریب..... میرا مطلب ہے کہ چند لمحوں میں آپ کے سامنے ہوں گے، آپ درکھولے تو ہمارا دیدار ہو جائے گا۔“ اس نے ذومعنی سا فقرہ بولا اور ساتھ ہی اطلاعی کھنٹی کی آواز آئی۔ میں نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔ کمرے سے باہر نکل آئی اور نارمل نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

”بھابی میں نے دی بڑے بھی بتالیے ہیں.....“ نگہت نے مجھ دیکھ کر اطلاع کی۔  
”کیوں تم کچن میں گرمی میں خود کو ہلکان کر رہی ہو؟“ میں نے کچن کی طرف قدم بڑھائے۔  
لاؤنج میں مہمانوں کی آمد اور استقبالیہ کلمات، سلام دعا اور خیریت دریافت کی جا رہی تھی۔  
”آپ چلیں، میں آتی ہوں۔“ نگہت نے مجھے اصرار کر کے باہر نکال دیا تو لاؤنج میں آکر میں والدہ، کرن، صدف آپنی، رانی باجی سے ملی اور ڈاکٹر معظم کو سلام کر کے امی جان کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ کر عبد اللہ سے کھیلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں نگہت بھی آکر صدف آپنی کے ساتھ بیٹھ گئی۔  
والدہ اور رانی باجی اکٹھی بیٹھی تھیں جبکہ تیمور اور ڈاکٹر معظم ایک ساتھ۔ نگہت نے اٹھ کر مشروبات سرو

کیے اور پھر چائے بنانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی ساتھ ہی اٹھنے لگی تو نگہت نے منع کر دیا، ”آپ بیٹھیں بھابی! سب تیاری مکمل ہے، تھوڑی ہی دیر کے لیے تو آئی ہیں آنٹی۔“ میں ناچار بیٹھ گئیں۔

”آپا میرا خیال ہے کہ جس مقصد کے لیے ہم آئے ہیں، وہ بات شروع کی جائے!“ رانی باجی نے والدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ والدہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور گویا ہوئیں امی جان کو مخاطب کر کے.....

”آپا جی ماہا آپ کی بیٹی ہے..... اور آج رانی اپنے بیٹے ڈاکٹر معظم کے لیے اسی بیٹی کے رشتے کی سوالی بن کر آئی ہیں، اگر آپ کا دل چاہے تو ان کا دامن خوشیوں سے بھر دیں.....“ والدہ کا یہ فقرہ سن کر میرا پورا جسم جیسے پتھر کا بن گیا تھا، مڑ کر امی جان کو نہ دیکھ سکی لیکن سامنے بیٹھے تیمور کے چہرے پر تو مجھے حیرت یوں نظر آرہی تھی گویا علیحدہ سے چہرے پر اس کا لپ کر دیا گیا ہو.....

باورچی خانے سے ٹرے میں لوازمات سجا کر لاتی ہوئی نگہت وہیں مقیم مئی تھی، یوں جیسے فریم میں کوئی تصویر جڑی ہو۔ میں اس ”غیر متوقع حملے“ پر بوکھلا کر رونے لگی، بغیر کسی آواز کے، سر جھکا کر میں نے صوفے کی سائیڈ والی ٹیک پر رکھ دیا۔ امی جان نے عبد اللہ کو میری گود سے اٹھالیا۔ خاموشی کا وقفہ لگا صدیوں پر محیط ہو گیا ہو۔ ”آجاؤ نگہت! رک کیوں گئی ہو بیٹا!!“ امی جان کی آواز نے سکوت توڑا۔ ایک ہاتھ انہوں نے میرے سر پر رکھا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”ماہا! سیدھی ہو جاؤ بیٹا!! یوں پریشان نہیں ہوتے.....“

میں نے آہستگی سے سر اٹھایا اور ٹیبل سے ٹشو پیپر لے کر آنکھیں صاف کیں۔ پھر بھی میں نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے خود پر تیز نظروں کا احساس ہوا اور یہ نظریں شاید تیمور کی تھیں یا ڈاکٹر معظم کی، یہ اندازہ نہ ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے اس کی تصدیق کرنے کو بھی نظر نہ اٹھائی۔ تبھی والدہ اٹھ کر آئیں اور میرے نزدیک ہی بیٹھ گئیں، جہاں امی جان بیٹھی تھیں۔ امی جان اٹھ کر رانی باجی کے پاس جا بیٹھی تھیں۔

”بہادر بننے میں بیٹا! لڑکیوں کی زندگی میں ایسے مقامات تو آتے ہی ہیں، یہ کوئی ایسی انوکھی بات تو نہیں۔“ وہ مجھے تشفی دے رہی تھیں۔ میں جواب میں خاموش ہی تھی۔ نگہت نے عبد اللہ کا



فیڈر تیار کر کے اسے دیا اور وہ سو گیا تو اسے لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر لٹا دیا۔ نگہت نے ڈاکٹر معظم سے اس کے بیٹے اور لندن میں اس کی جاب کی بابت سوالات پوچھے۔ سب لوگ آپس میں ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کر رہے تھے لیکن میں بالکل خاموش تھی۔ صدف آپنی بھی ایک دفعہ میرے پاس آ کر بیٹھیں..... مجھے ساتھ لگا لیا اور چپکے سے میرے کان میں بولیں، ”اپنا مطالبہ تم نے منوالیا ہے اب یہ ڈرامہ کرنے کا کیا مقصد.....“ مجھے ان کے الفاظ سے شدید دھچکا لگا تاہم میں نے موقع کی مناسبت سے خاموشی روا رکھی۔

چائے کا دور ختم ہوا اور جب انہوں نے اٹھنے کی اجازت چاہی تو امی جان نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ گھر میں سب سے مشورہ کریں گی۔ ”ضروری جانچ پڑتال کروانا بھی مناسب ہوگا اور پھر ماہیٹی کی رائے سب سے اہم ہے.....“ انہوں نے کہا۔

”کیوں نہیں! آپ جیسے اور جو مناسب سمجھیں..... بس معظم بیٹے کی یہ خواہش ہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کی لندن واپسی سے قبل نکاح کا فریضہ سرانجام پا جائے.....“ رانی باجی نے درخواست کی۔

”اس سے پہلے میں آپ سے درخواست کروں گی کہ ڈاکٹر معظم اور ماہا کو آپس میں ایک ملاقات کم از کم لازمی کر لیتا چاہئے تاکہ آپس میں اگر انہیں کچھ پوچھنا ہو یا..... یوں بھی انہیں ایک دوسرے کی بابت تفصیل کا علم ہونا چاہئے.....“ امی جان نے کہا۔

”کیوں نہیں! بالکل مناسب خیال ہے.....“ ڈاکٹر معظم نے کہا اور جو میری نظر اٹھی تو مجھے تیور کے چہرے پر سچی طنزیہ مسکراہٹ فوراً نظر آ گئی۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو پرپوس تیور کی مفتگی میں آپ لوگ شرکت فرمائیں تو ہماری ایک ملاقات اور ہو جائے گی۔“ امی جان نے خلوص سے انہیں دعوت دی۔

”ارے! کیوں نہیں..... بھد شوق آئیں گے.....“ رانی باجی نے مسکرا کر امی جان کے گلے ملتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر معظم نے تیور کو مفتگی کی مبارکباد دی اور اس سے پوچھا کہ اس سلسلہ میں اگر وہ کوئی کام کر سکے تو.....؟ تیور نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ والدہ نے مظہر کی بابت پوچھا جو خوشی کو ساتھ لے کر ”میکڈونلڈ“ گیا ہوا تھا۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی ہم گھر کے چار افراد دوبارہ اپنی اپنی نشستوں پر آن بیٹھے۔

”سچ بھابی! کتنا اچھا ہو جائے اگر ایسا ہو تو، آپ بھی لندن آ جائیں گی۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی مزہ آیا کہ ڈاکٹر معظم بھی ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں، اعجاز کی طرح۔ ہو سکتا ہے کہ اعجاز انہیں جانتے ہوں؟ کل جب وہ آئیں گے تو میں ان سے پوچھوں گی۔“ نگہت اپنی گرمجوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

”لیکن میں تو کبھی بھی لندن نہیں جانا چاہوں گی!“ میں نے اچانک یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا۔

”مگر کیوں بھابی؟“ نگہت نے حیرت سے کہا، ”میں بھی تو وہاں رہ رہی ہوں۔“

”اپنی اپنی پسند ہے.....“ میں نے مختصر آ کہا۔

”تو گویا آپ یہ اتنا اچھا رشتہ ٹھکرا دیں گی؟“ نگہت کو شاید میرے الفاظ پر یقین نہ تھا۔ میں خاموش ہی رہی، میں اس سلسلہ میں ابھی کچھ نہ کہنا چاہ رہی تھی۔

”ماہا بیٹا! مجھے تو دیکھنے میں لڑکا اچھا لگا ہے..... پھر گھر والے بھی بہن جی کے دیکھے بھالے ہوں گے۔ بیٹا تم خود سمجھدار ہو اور میچور ہو، میں بہت مناسب سمجھتی ہوں کہ تم ایک دفعہ اس سے تفصیل سے مل لو.....“ امی جان نے کہا۔

”بھابی ملی ہوئی ہیں ”لڑکے“ سے پہلے بھی، اپنی والدہ کی سرجری کے دنوں میں!“ تیور نے لڑکے پر زور دے کر کہا۔

”وہ ملنا کیا ہوا بیٹا، سرسری ملاقات ہوئی ہوگی، یوں تو آج بھی وہ آیا تھا مگر اسے ہم ملاقات تو نہیں کہہ سکتے۔“ امی جان نے سادگی سے کہا۔

”لیکن“ تیور اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے التجا بھری نظر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ خاموش ہو گیا، اور پھر وقفہ دے کر مکمل کیا، ”لیکن بھابی جانے اس طرح ڈاکٹر صاحب سے ملنا پسند کریں یا نہیں؟“

”کیوں حرج ہی کیا ہے اس میں؟ اگر مجھے اس میں کوئی بات نامناسب نہ لگتی ہو..... وہ کوئی بھیڑ بکری تو ہے نہیں کہ ہم اسے کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیں۔ اس کی زندگی کا فیصلہ ہوا اور اسے ہم آنکھیں بند کر کے طے کر دیں؟ نہیں بیٹا..... میں تو اصرار کر کے ماہا کو مجبور کرنا پڑا تو بھی اسے مجبور کروں گی کہ ایک دفعہ اسے ضرور ملے۔ اور خود ہی ہر سوال اس سے پوچھے، جو اس کے ذہن میں ہو.....“ امی جان نے ضد کے انداز میں کہا۔

”ویسے امی جان! آپ بھابی کے معاملے میں کوئی زیادہ ہی ”لبرل“ نہیں ہو گئی ہیں، ساری پابندیاں ہمارے لیے اور یہاں آپ لڑکے اور لڑکی کی تنہائی میں ملاقات کے لیے اصرار کر رہی

ہیں.....“ تیمور نے شرارت سے کہا۔ میرے لیوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”سب جانتی ہوں جن پابندیوں کے ماتحت تم ہو۔ اور یوں بھی نہ میری ماہاکم عقل اور جذباتی قسم کی لڑکی ہے اور نہ ہی ڈاکٹر معظم کوئی کھلنڈرانو جوان ہے۔“ امی جان نے غصے سے کہا۔

”لڑکیاں تو امی جان ساری ہی کم عقل اور جذباتی ہوتی ہیں۔“ تیمور نے پھر شرارت سے کہا۔

”ایسے ہی! میں تو یہ بات کبھی نہیں مان سکتی، کم از کم ماہاکے بارے میں تو میں یہ بات تسلیم کرنے کو قطعی تیار نہیں ہوں کہ جس کم عمری میں جس فراست اور عقلمندی کے ساتھ اس نے اس گھر کی باگ ڈور کو سنبھالا، میں خود اس موقع پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ اسی بچی کا حوصلہ تھا کہ اس نے خود کو سنبھالا، مجھے بھی اور تم لوگوں کو بھی۔“ امی جان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

”تیمور بھائی! آپ بھلے ساری دنیا کی لڑکیوں کو بے وقوف کہہ لیں..... لیکن ماہا بھابی کا نام اس لسٹ سے خارج کر دیں۔ آپ نے خوشی کے موقع پر امی جان کو زلادیا ہے۔“ نگہت نے امی جان کے کندھوں کے گرد اپنے بازو جھانک کر دیئے۔

”میں ڈاکٹر معظم سے ملنے کے لیے تیار ہوں“ میں نے یکدم کہا، ”مگر ایک شرط پر۔“ تینوں کی استنبہامیہ نظریں میری طرف انھیں..... ”میرے ساتھ اس ملاقات میں تیمور بھی ہو۔“ میں نے بلی تھیلے سے باہر نکالی۔ تیمور کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

”یہ کیا بیوقوفی ہے بیٹا؟“ یکدم امی جان کے منہ سے پھسلا۔

”دیکھ لیجئے، اب آپ کو خود ان کی بیوقوفی پر یقین آ گیا ناں؟“ تیمور ہنس کر بولا، ”مجھے خواہواہ کباب میں ہڈی بنانا چاہتی ہیں۔“

”کوئی کباب بنانا ہے نہ کسی ہڈی کا وجود..... تم ساتھ نہیں ہو گے تو میں ملاقات نہیں کروں گی۔“ میں نے حتمی انداز میں کہا، ”اور یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے کل کو یہ توقع کروں گی کہ اپنی اور ماہا رُخ کی ملاقاتوں میں تم مجھے بھی ساتھ رکھنا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”آپ کو کیا اعتراض ہے تیمور بھائی؟ بھابی اگر اکیلے میں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں تو!!“ نگہت نے کہا۔

”نہیں نگہت! میں خود کو اس طرح غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔ حالات نے مجھے مردانہ وار باہر کی دنیا میں نکلنے کے سبھی اسباق پڑھادیئے ہیں۔ تیمور کو اس لیے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں کہ اپنے بھائی کی

موجودگی میں مجھے زیادہ اعتماد سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔“ میں نے رسان سے کہا۔

”جو آپ کی رضا!! لیکن مذاق برطرف، مجھے بہت عجیب محسوس ہو گا یوں بی جملوں کی طرح بیچ میں بیٹھنا.....“ تیمور نے کہا تو میری ہنسی نکل گئی۔

”تم کرسی پر ہی بیٹھنا اور میرے ساتھ بیٹھنا..... بیچ میں میز پر چڑھ کر نہ بیٹھنا.....“ میں نے اسے کان سے پکڑ کر اسی شرارت کے انداز میں کہا۔

اس رات مجھے اس بات کا اطمینان تو ہوا کہ ڈاکٹر معظم نے پہلے ہی قدم پر میرا مان رکھ لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ صلح جو آدمی ہے، مجھے اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔“ جانے میرے یوں رو پڑنے سے اس نے کیا مطلب اخذ کیا ہوگا؟ عورتیں بیچاری ساری زندگی اندیشوں کے سایوں میں ہی گزار دیتی ہیں۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلتی ہیں، ہر میدان میں کام کرتی ہیں، اپنی سکت اور استطاعت سے بڑھ کر بھی، مگر ان کا وجود کانچ کے اس نازک گلدان کی طرح ہوتا ہے جسے ذرا سی تیز ہوا گر کر تو زدنکتی ہے۔

اندیشے!!! گمان اور توہمات، ہر روپ میں عورت کے رفیق ہیں۔ ماں ہو یا بہن!!!! بیٹی ہو یا بیوی!!!! ہر نہ پنا چلتی ہے، اور راہ میں بکھری ہوتی ہیں کرچیاں، اندیشوں کی..... فکروں کی..... اور وہ بچوں کے بل سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی، لرزتی ہوئی، دغا رنجوں پر ہی عمر کا سفر تمام کر دیتی ہے۔

”آنے والی زندگی میں کیا ہوگا؟“ سوچتی تو کوئی اچھا گمان ذہن میں ہی نہ آتا تھا۔ لگتا تھا کہ میرے مقدر میں پھر کوئی ٹھوکر لکھی ہوئی ہے..... خدشہ اللہ کرے کہ غلط ہو۔ لیکن یہ دل بدگماں..... پھر بھی میں نے اپنے ذہن کو اس جوئے کے لیے تیار کر لیا۔

”ہوسکتا ہے کہ معظم اتنا اچھا رفیق ثابت ہو کہ اس کی محبت مجھے وطن چھوڑتے وقت کوئی کسک نہ دے، میں بخوشی اس کے ساتھ چلی جاؤں۔ اگر وہ مجھ سے اچھا سلوک کرے تو ہوسکتا ہے کہ میں اس کی مرحومہ بیوی کی نشانی اس کو بھی اپنانے کو تیار ہو جاؤں جسے مجبوراً اپنی خالہ کے پاس رہنا پڑ رہا تھا۔ میرا دامن اور میرا قلب بہت وسیع ہے، اگر میرا رب ہزار آزمائش میں ساتھ دے گا تو زندگی کی ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔“ میں یہی سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

”بھابی! اگر فارغ ہیں تو چل کر مجھے نکلائی اور کف لکس ہی لے دیں۔“ تیمور کچن میں ہی آگیا جہاں میں اور نگہت مصروف عمل تھیں، ”بلکہ آپ اپنی طرف سے تحقیقات ہی لے دیں۔“

”تیمور میں بہت مصروف ہوں، آج اعجاز بھائی آرہے ہیں اور مجھے کھانا بنانا ہے۔“ میں نے عذر پیش کیا۔

”پلیز بھابی! میں کیسا لگوں گا ٹائی کے بغیر!“ اس نے التجا کی۔

”تیمور بھائی! شام تک صبر کر لیں..... اعجاز نے آپ کے لیے اور مظہر کے لیے شرٹس اور نکلائیاں ہی لی ہیں تحفہ دینے کے لیے، بلکہ آپ کے لیے تو منگنی میں دیئے جانے والے تمام تحائف جن میں کف لکس بھی شامل ہیں سبھی لندن سے آئے ہیں۔“ نگہت نے معلومات میں اضافہ کیا۔

”نگہت تمہاری گود میں دو بچے تو آگئے ہیں پر عقل تمہیں پھر بھی نہیں آئی..... بھلا میں گھر سے کف اور کالر کھلے لے کر جاؤں گا تاکہ وہاں پر ماہ رخ سے درخواست کروں کہ مجھے نکلائی بھی باندھ دے اور کف لکس بھی لگا دے؟“ اور مجھے اور نگہت کو بے اختیار ہنسی آگئی، تصور ہی میں یہ دیکھ کر کہ کیا ساین ہوگا۔ ”یوں بھی اعجاز بھائی کی پسند کافی ”بابائے“ ہے، لے آئیں گے میرے لیے کوئی چیک والی نیلی نکلائی اور مظہر کیلئے دھاریوں والی نیلی نکلائی، ساتھ میں پلین آسمانی شرٹس۔“

”شرم کرو تیمور! اتنی اچھی ان کی چوائس ہے سو برسی اور تم مذاق اڑا رہے ہو۔ بہنوئی ہیں تمہارے..... ذرا عزت سے بات کرو۔“ میں نے اسے سرزنش کی، کیونکہ نگہت کے منہ سے اپنے بھائی کے احترام کے باعث ایک لفظ بھی نہ نکل سکا مگر مجھے علم تھا کہ اسے برا لگا ہوگا۔

”جتنا احترام مجھ پر اعجاز بھائی کا واجب ہے اب اتنا ہی انہیں بھی میرا احترام کرنا ہوگا کیونکہ میں بھی ان کا قابل احترام بہنوئی بننے والا ہوں۔“ تیمور نے فرضی دھول کالر پر سے جھاڑی۔

”اچھا بھی قابل صدا احترام تیمور صاحب اب ذرا آپ تشریف لے جائیں تاکہ ہم اپنا کام کریں۔“ میں نے اسے وہاں سے بھگانے کو کہا، مبادا کہ وہ مذاق میں کوئی اور غلط بات نہ کر دے۔

”آپ جائیں بھابی! میں کام دیکھ لوں گی.....“ نگہت نے مجھے کہا۔

”تم نکلو کچن سے اور اپنی اور بچوں کی تیاری دیکھ لو۔ میں کھانا بنا کر بعد میں اسے اور منج یا شاکنگ پنک نکلائی دلوادوں گی.....“ میں نے اسے کچن سے باہر دھکیلا۔ میں جانتی تھی کہ تیمور کو

مجھ سے کوئی خاص بات کرنا تھی، صرف اسی لیے وہ باہر لے جانا چاہ رہا تھا۔

”اور منج یا گلانی نہیں بلکہ سبز رنگ کی نکلائی چاہئے، زمرہ کے رنگ کی اور انگریزی رنگ کی شرٹ پہنوں گا، میچنگ کر کے.....“ اس نے ہنس کر کہا۔

”بڑے ٹوٹس ملائے ہوئے ہیں آپ دونوں نے.....“ نگہت نے طنز سے کہا۔

”کرنا پڑتا ہے..... بہن کی نند کا خیال کرنا پڑتا ہے، میں نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟ مجبوری ہے اس لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔“ کچن میں ہی کرسی پر بیٹھ کر اس نے بڑے فلمی اسٹائل میں کہا۔

”چائے پیو گے؟“ میں نے اس کا پسندیدہ سوال کیا جس کا جواب کبھی ناں نہیں ہو سکتا تھا۔

”زندہ باد بھابی! جانے کیسے آپ میرے دل کی بات جان لیتی ہیں؟“

”جیسے میں یہ جان گئی ہوں کہ تمہیں نہ نکلائی لینی ہے نہ کف لکس، صرف تم مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہو اور وہ بات گھر پر نہیں ہو سکتی۔“ میں نے گویا اس کی چوری پکڑی حیرت سے وہ مجھے دیکھنے لگا۔

”اگر یہ جان گئی ہیں تو یہ بھی جانتی ہوں گی کہ وہ کون سی بات ہے۔“

”تھوڑا اندازہ تو ہے لیکن ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو.....“ ملازمہ کی موجودگی کے باعث ہماری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

”بتائیے آپ کیا سمجھیں؟“

”بہتر ہے تم پہیلیاں بھوانے کی بجائے سیدھی بات کرو.....“ میرے ذہن میں تھا کہ وہ بات ڈاکٹر معظم کے حوالے سے ہوگی یا پھر مظہر کے حوالے سے۔

”پھر بھی ذرا آپ کے اندازے تو دیکھیں؟“ اس نے اصرار کیا۔

”غالباً مظہر کے کمرے کی تلاشی لی ہوگی تم نے اور وہاں سے کوئی ایسا سراغ ملا ہوگا.....“

”نہیں! میں ابھی تک اس کے کمرے کی تلاشی نہیں لے سکا..... کوئی اور اندازہ؟“

”اور تو کوئی بات ذہن میں نہیں آرہی.....“ میں نے جان کر بھی نظریں چرا لیں۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ تیمور کے سامنے چائے کا مگ رکھ کر میں دھنیہ اور مٹر میز پر رکھ کر وہیں بیٹھ گئی، اس کے سامنے والی کرسی پر۔

”مجھے کل والے ڈرامے کی بابت کرنا تھی۔“ اس نے ایسا فقرہ کہا کہ میں سن ہو گئی۔

”ڈرامہ؟ میں سمجھی نہیں؟“ میرے لہجے میں شک کی تھی۔

”کیوں آپ کل ایسے ایکٹنگ کر رہی تھیں کہ ڈاکٹر معظم اور اس کے گھر والوں کا آنا بالکل اتفاقی اور اچانک واقعہ تھا اور قبل ازیں آپ کو اس کا علم نہ تھا؟“ الفاظ تھے یا نشتر!!

”میں کوئی ایکٹنگ نہیں کر رہی تھی، حقیقت وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو.....“ میں نے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کیا ڈاکٹر معظم سے آپ کا ملتے رہنا، رات گئے اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر آنا؟؟ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں یہ سب؟“ اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

”کیا چاہتے ہو تم کہ میں تمہاری سب فضول سوچوں کو بچ کہہ دوں اور یہ اعتراف کر لوں کہ میں دھوکہ دے رہی ہوں تمہیں اور امی جان کو؟ کیوں شک کر رہے ہو مجھ پر؟“ میں سسک پڑی۔

”غلط سمجھ رہی ہیں آپ! میں شک کیوں کروں گا؟ آپ سمجھ رہیں اور آپ کو پورا اختیار ہے کہ اپنی زندگی کے بارے میں جو بھی مناسب سمجھیں، فیصلہ کریں۔ اور مجھے تمام وقت یہ محسوس ہوتا رہا کہ کوئی ڈرامہ چل رہا ہو..... سب لوگ ایکٹنگ کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے..... کیوں؟ اگر آپ نے اپنے لیے فیصلہ کر لیا ہے تو یہ بہت اچھا فیصلہ ہے۔ آپ ہمیں صرف اس کی اطلاع کر دیں۔ یہ جتانے کی کیا ضرورت ہے کہ آپ کا رشتہ امی جان کی مرضی سے طے ہو.....“ وہ جذباتی ہو رہا تھا اور میرے دل پر چنگاریاں گر رہی تھیں۔

”میں تمہاری طرف فقط ایک ہی دفعہ دیکھ پائی تھی تیمور اور اس کے بعد تمام وقت مجھے تمہاری نظریں خود پر محسوس ہوتی رہیں۔ وہاں آٹھ لوگوں میں بیٹھے بھی میں نے ایک لمحے میں تمہاری نظروں کے اندر بدگمانی دیکھ لی تھی۔ مجھے دکھ تو یہ ہے کہ میں نے امی جان کو ماں اور تمہیں بھائی سمجھ کر یہ غلطی کی کہ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا ماں امی جان کو دوں مگر تم نے اس پر مجھے شک کی نظر سے دیکھا۔ میں ہر روز گھر سے باہر جاتی ہوں جانے تم میرے بارے میں کیا کیا سوچتے ہو گے؟ تمہارے خیال میں، میں ہر وقت لوگوں کے التفات کی طلبگار رہتی ہوں گی۔“ میں ہچکیاں لینے لگی۔ ملازمہ کچن سے باہر جا چکی تھی۔

”میں نے ایسا کچھ کہا کبھی اور نہ سوچا..... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے.....“ وہ ہکلا نے لگا۔

”بس تیمور، یہ تو تم ہو جسے میں اپنا بھائی سمجھتی ہوں اور جانے کون کون اور کیسی کیسی باتیں کرے گا۔ اس لیے میں ابھی والدہ سے کہہ کر اس رشتے سے انکار کر دیتی ہوں۔ اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اندرون خانہ تمام معاملات طے ہو چکے ہیں تو میں تمہیں اپنی صفائی ابھی دے دیتی ہوں.....“ کہہ کر میں کچن سے اٹھی اور اسے اپنے پیچھے اپنے کمرے میں آنے کو کہا۔

”سوری بھابی! مجھے آپ پر پورا یقین ہے.....“ لیکن میں چلتی رہی اور وہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے اسے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اپنے موبائل فون سے ڈاکٹر معظم کا نمبر ڈائل کیا اور بیل جانے لگی تو اسپیکر آن کر دیا..... ”میں کچھ نہیں سننا چاہتا، پلیز بھابی!!“

”خاموش رہو ابھی تم!!“ میں نے غصے سے کہا..... پانچویں بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

”ہیلو!!“

”السلام علیکم ڈاکٹر معظم!“

”والسلام!! زہے نصیب، کیسے یاد فرمالیا آپ نے؟ مجھے تو اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں آ رہا۔“

”پلیز آپ یہ فالتو باتیں چھوڑیں اور مجھے بتائیں..... آپ لوگ کل کیوں آئے ہمارے ہاں

یوں اچانک؟“

”اچانک اس لیے آئے کہ بتا کر آتے تو آپ سو بہانے کرتیں، صدف آپنی نے آپ کو

Missed کالیں دیں آپ بے شک اپنا فون چیک کر لیں۔ اور آئے کیوں؟ آپ جانتی

ہیں کہ آپ نے اپنی والدہ کو خود ہی کہا تھا کہ آپ کا پرنسپل آپ کے میکے میں نہیں بلکہ آپ کی

سسرال میں بھیجا جائے کیونکہ وہی آپ کا گھر ہے.....“

”اچھا ٹھیک ہے.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”کیا بات ہے ماہ! کچھ غلط کہہ دیا ہم میں سے کسی نے..... آپ کو ہماری جسارت بری لگی یا

بغیر اجازت کے آنا.....“

”کچھ بھی نہیں!!“

”کچھ تو ہے!!“ ورنہ یہ باتیں آپ مجھ سے ملاقات پر بھی کر سکتی ہیں۔“ وہ الجھن میں تھا۔

”یونہی خیال آیا تو پوچھ لیا۔“ اور خدا حافظ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو

تھے، میں تیسویں طرف پلٹی.....“ ہوگئی تمہاری تسلی؟ یا اب بھی تم مجھے ڈرامے باز ہی سمجھ رہے ہو؟“  
 ”پلیز بھابی!!“ اور اچانک اس نے جھک میرے پاؤں پکڑ لیے، ”میں بہت گھٹیا انسان ہوں۔“  
 میں یوں سہم کر پیچھے ہٹی جیسے میرے پاؤں پر وزن آن گرا ہو، ”وماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا،  
 اوپر اٹھو، یہ کیا کر رہے ہو.....؟“

”آپ مجھے معاف کرویں پلیز!!“ وہ یونہی بیٹھا رہا..... مجھے اس پر ترس آیا۔

”ٹھیک ہے، اٹھو اور جاؤ میرے کمرے سے، مجھے نماز پڑھنی ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔  
 ”ابھی بھی آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں گی ناں، جب ڈاکٹر معظم سے ملنے جائیں  
 گی؟“ اور اس بات پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”آپ ہنستی رہا کریں، اسی طرح اچھی لگتی ہیں..... اور ہاں کل کس رنگ کے کپڑے پہن  
 رہی ہیں.....؟“ اس نے مسخرے پن سے سوال کیا۔

”جس رنگ کے تم پہنو گے!!“ میں نے اسے باہر دکھادیا۔

نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو پھر آنسو جاری ہو گئے..... جانے کتنی آزمائشیں ابھی  
 میری زندگی میں باقی تھیں۔

”یارب!!! مجھے بتا! مجھے سمجھا کہ میری عقل بھی محدود اور فہم بھی، تھک کیوں جاتی ہوں چند گام  
 چل کر؟؟؟ یہ مسافت تو میرا مقدر ہے پھر بھی کیوں الجھتی ہوں، مقدر سے؟؟؟ چند میلوں دور نظر تو  
 آتی ہے منزل مجھے، مگر مسافت اتنی کٹھن ہے بیٹھ جاتی ہوں، چند گام چل کر!!! مایوسی گھیرا سا کیوں  
 کر لیتی ہے؟“

بھی اعجاز بھائی کے ساتھ چلی گئی تھی جبکہ عبداللہ کی طبیعت نا ساز تھی جس کے باعث نگہت صبح سے دو  
 دفعہ ڈاکٹر کے ہاں جا چکی تھی۔ میں تیار ہو کر نکلی تو میرے آف وائٹ سوٹ پر تیسویں سمیت سب کو  
 شدید اعتراض ہوا۔ ”میرا بالکل نیا سوٹ ہے اور اتنا بھاری ہے!!“ میں نے احتجاج کیا، ”کیوں  
 ابو؟“ میں نے ابو سے پوچھا کیونکہ ابو ہمیشہ میری سائیڈ لیتے تھے۔

”چلیں بیٹا! اگر سب لوگ مُصر ہیں تو آپ کوئی ہلکا سوٹ پہن لیں، بس ذرا سارنگ اس کا  
 تیز ہو۔ یہ سوٹ آپ تیسویں کی شادی پر پہن لیں.....“ ابو نے بھی پبلک کا ساتھ دیا۔  
 ”جی نہیں! یہ میری شادی پر بھی نہیں چلے گا، میری شادی پر تو بھابی لال رنگ کا سوٹ پہنیں  
 گی۔“ میرے چہرے پر تیسویں کی بات سے ایک رنگ سالہرایا۔

”چلو اٹھو بیٹا! کپڑے تبدیل کر لو، ابھی وقت ہے۔ نگہت بھی ابھی گھر کے کپڑوں میں پھر  
 رہی ہے۔ مجھے تو تم نے گلابی رنگ پہنا دیا لے کر اور خود.....“ امی جان نے مجھے چکارا۔ میں بادل  
 خواستہ اٹھی اور کمرے میں جا کر وارڈروب کھول کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن وہاں تو سب ہی ایسے  
 کپڑے تھے ہلکے رنگوں والے۔ البتہ میرے ڈریسنگ روم میں ڈبوں میں بند سوٹ رکھے تھے،  
 لیکن وہ کبھی پہننے کا سوچا بھی نہ تھا۔ میں الجھن میں تھی کہ صدف آپنی اور تیسویں دے کر میرے  
 کمرے میں آ گئے۔

”کدھر ہیں تمہارے رنگدار سوٹ سارے؟“ صدف آپنی تلاش کرنے لگیں۔ اور بالآخر  
 ڈریسنگ روم میں سے تین چار ڈبے لے کر باہر آئیں اور ان کے ڈھکن کھول دیئے، گلابی، ہرا،  
 نیلا، گولڈن..... ”کون سا سوٹ پہنو گی؟“

”یہ سب تو.....“ میں گھکھکیائی۔

”فضول باتیں بند کرو..... تم بتاؤ تیسویں؟“ صدف آپنی نے مجھے گھر کا۔

”میں تو کہوں گا میرے ساتھ میچ کر کے سبز پہنیں..... لیکن صدف آپنی! آپ بتائیں ڈاکٹر  
 صاحب کو کون سا رنگ پسند ہے، خون کے رنگ کے علاوہ؟“ تیسویں مخروں کی طرح بولا۔

”تیسویں تم مار کھاؤ گے مجھ سے.....“ میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”چلو اٹھاؤ یہ نیلا سوٹ اور تیار کرو۔“ صدف باجی نے حکم جاری کیا۔

”بہت گہرا رنگ ہے صدف آپنی پلیز!“ میں نے ان کی منت کر کے گلابی سوٹ اٹھا لیا۔

تیسویں کی منگنی کا فنکشن شام کو تھا، دن کو مٹھائی وغیرہ منگوائی گئی، تحائف تیار کر لیے گئے۔ روانگی  
 سے تھوڑی دیر قبل ہی والدہ، ابو، علی بھائی، صدف آپنی اور تانیہ باجی اپنے شوہروں کے ہمراہ اور رانی  
 باجی، ان کے شوہر اور ڈاکٹر معظم کا قافلہ آن پہنچا، ساتھ ہی سب کے لیے تحائف کے ڈھیر اور  
 مٹھائیوں کے ٹوکڑے۔ گھر میں رنگین آنچل لہرانے لگے تو یوں لگا کہ بہار اتر آئی ہو۔

اعجاز بھائی صبح سے اپنے گھر جا چکے تھے جبکہ نگہت نے ہماری طرف سے شرکت کرنا تھی۔ خوشی

”کبھی یہ تمہارا پسندیدہ رنگ ہوا کرتا تھا۔“ صدف آپنی نے کہا۔

”سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔“ وہ لوگ باہر نکلے تو میں نے تیار ہو کر ہلکی سی جیولری بھی پہنی اور سینڈل پہن کر باہر نکلی تو سب تیار تھے۔ سب کی نظروں میں میرے لیے ستائش تھی۔

”بہت اچھا فیصلہ کیا بھابی آپ نے ویسے۔“ تیمور بولا۔

”کیوں؟ تم تو سبز سوٹ پہننے کا کہہ رہے تھے؟“ میں نے ابرو اچکائے۔

”کیونکہ وہ میرا پسندیدہ رنگ تھا اور اب جو رنگ آپ نے پہن رکھا ہے یہ ڈاکٹر معظم کا پسندیدہ رنگ ہے۔ کیوں ڈاکٹر صاحب؟ یہی کہہ رہے تھے ناں ابھی آپ کہہ گلابی آپ کا پسندیدہ رنگ ہے؟“ اس نے تصدیق چاہی اور میں اس کی اس فراہمی معلومات پر بلش کر گئی۔

”جی ہاں! یہی کہہ رہا تھا میں خواتین کے لیے میرا پسندیدہ رنگ یہی ہے۔“ ڈاکٹر معظم سادگی سے کہہ رہے تھے۔ شکر ہے کہ بزرگان آگے نکل چکے تھے۔

صدف آپنی اور تانیہ باجی ایک گاڑی میں تھے، دوسری گاڑی میں ابو، والدہ اور علی بھائی، ایک گاڑی میں ڈاکٹر معظم اپنے والدین کے ساتھ، چوتھی گاڑی میں ہم پانچ لوگ بچتے تھے اس لیے میں والدہ کے ساتھ بیٹھ گئی جبکہ باقی افراد خانہ ایک ہی گاڑی میں فٹ آ گئے۔ اس سے قبل مظہر نے اپنی نگرانی میں سامان وغیرہ احتیاط سے گاڑیوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا تھا۔ ماہِ رُخ کا گھر دور سے ہی جگمگا تا نظر آ رہا تھا۔

وسیع لان میں ہی ایک طرف اسٹیج بنا کر سامنے فشتیں لگی تھیں۔ کارپورچ والا حصہ کھانے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ خوبصورت ”مارکی“ لگا کر ٹیبل پر پھولوں اور موم بتیوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ اسپاٹ لائٹوں کے ساتھ وہ حصہ سب سے زیادہ منور کیا گیا تھا جہاں ایک طرف چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر دو سیٹوں والا ایک وکٹورین صوفہ رکھا ہوا تھا، اسٹیج پر بہت خوبصورت گلابی پھولوں کی سجاوٹ تھی۔ تیمور کو اسٹیج پر اس کی سیٹ پر بیٹھایا گیا اور ہم باقی لوگوں نے بھی سیٹیں سنبھال لیں۔

گھٹ تھوڑی دیر بیٹھی اور پھر بچے میرے حوالے کر کے خود گھر کے اندر چلی گئی۔ مشروبات سے تواضع کی گئی۔ ہلکی ہلکی موسیقی کہیں بج رہی تھی جس کی وجہ سے آپس کی بات چیت کے لیے فضا اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔ میں بچوں کے ساتھ مصروف تھی۔ یکدم نوید صاحب پر نظر پڑی تو وہ میری طرف ہی دیکھ رہے تھے، تاہم میری نظر اٹھتے ہی انہوں نے اپنی نظر کا زویہ بدل لیا۔ مجھے ایک دم

یاد آیا کہ میں نے مظہر علی کو بھی منگنی پر اس کے گھر والوں سمیت مدعو کیا تھا۔ پھر ان میں سے کوئی بھی کیوں نہ آیا تھا؟ لیکن اس سوال کا جواب ملنے میں دیر نہ لگی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اگر ان میں سے کوئی آ بھی جاتا تو وہ خود کو Misfit محسوس کرتا۔ اور کئی سوال ماہِ رُخ اور اس کے گھر والوں کے ذہن میں اٹھتے۔ لیکن انشاء اللہ جلد ہی وہ وقت آئے گا کہ کم از کم زارا اور تانیہ فخر کے ساتھ اس طرح کی تقریبات میں شمولیت کر سکیں گی۔ گھٹ ماہِ رُخ کے ہمراہ باہر آتی دکھائی دی تو میری محویت ٹوٹی۔

ماہِ رُخ یوں بھی خوبصورت تو تھی اور اس وقت بنی سنوری تو اور بھی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ پورے اعتماد سے وہ تیمور کے ساتھ بیٹھی تھی اور ارد گرد گردن گھا کر اس نے سب کو دیکھا، مسکراہٹیں بکھیرتی وہ تیمور سے مسلسل باتیں کر رہی تھی۔ گھٹ میرے ساتھ آ بیٹھی۔ میں نے اپنے پرس سے انگوٹھی والا ڈبہ نکال کر اسے امی جان کو دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گھٹ نے مجھے روک دیا۔ میں نے حیران ہو کر اسے مستغرقانہ نظروں سے دیکھا۔

”ماہِ رُخ کہتی ہے کہ اسے انگوٹھی تیمور بھائی پہنائیں نہ کہ امی جان!“ گھٹ نے آہستگی سے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے شدید حیرت کے باوجود اپنی آواز کو آہستہ رکھا۔

”وہ کہتی ہے کہ مودی میں بہت عجیب لگے گا کہ لڑکے کی اماں لڑکی کو انگوٹھی پہنا رہی ہوں!“ گھٹ کے لہجے میں دبا ہوا غصہ صاف واضح تھا۔

”اس میں ایسا عجیب لگنے کی کیا بات ہے، آخر اس کی امی بھی تو تیمور کو انگوٹھی پہنائیں گی ناں؟“

”نہیں! وہ کہتی ہے کہ جن کی آپس میں منگنی ہے وہی ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائیں گے۔“

”اس کے گھر والے!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ سب بہت ماڈرن ہیں بھابی!“ گھٹ نے میری بات بھی مکمل نہ ہونے دی، ”وہ سب جانتے ہیں اور انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس لیے اب امی جان کو آپ ہی سمجھائیں۔“ مجھے اندازہ تھا کہ امی جان کو بھی یہ بات پسند نہ آئے گی اور میری والدہ اور بہنوں کو بھی اس بات پر اچھٹا ہوگا، کیونکہ ہمارے گھرانوں میں ایسی چیزوں کو بے حیائی کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کی ماڈرن حرکت کو اتنی آسانی سے ہضم کرنا مشکل تھا۔ تاہم اب مجھے اپنے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ایک بوجھ کی طرح نظر آنے لگی کہ مجھے اس کے لیے سب سے پہلے تو امی

غصہ دکھالیا تھا، بعد میں ماہِ رُخ اس کی خبر لینے والی تھی۔ تقریب شروع کرنے کے لیے میں نے امی جان کو انگٹھی پکڑائی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج کی طرف چلی۔ مظہر بھی اپنا کیمرا لیے ہمارے ساتھ تھا۔ گھر کے کسی فرد کو کہہ کر نگہت نے اسٹیج پر صوفے کے اطراف میں دو کرسیاں رکھوا دیں۔

امی جان کو اسٹیج پر ماہِ رُخ کی طرف کرسی پر بیٹھایا اور پھر ماہِ رُخ کی امی اعجاز بھائی کے ہمراہ اسٹیج پر آئیں اور ان کے ساتھ ماہِ رُخ کی بہن ستارہ بھی تھی، جو اپنی امی کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ ہم اسٹیج سے اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ امی جان نے انگٹھی ڈبیا سے نکال کر ہاتھ میں تھامی اور اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر ماہِ رُخ کا بایاں ہاتھ تھاما، جسے اس نے یوں ذرا سا آگے بڑھایا جیسے ان پر کوئی احسانِ عظیم کر رہی ہو۔

”آپنی ذرا مسکرائیں!“ ستارہ نے ہدایات پاس کیں، جس پر عمل کرتے ہوئے ماہِ رُخ نے ایک جعلی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجالی، جو اور بھی عجیب لگ رہی تھی۔ ماہِ رُخ کی امی نے تیمور کو انگٹھی پہنائی اور یوں رسم مکمل ہوئی۔ کھانے کے لیے بلایا گیا۔ ہم سب کھانے کے لیے چلے تو ماہِ رُخ نے ستارہ کو آواز دے کر روک لیا کہ اسے اسٹیج پر فوٹو سیشن کروانا تھا۔

”مگر مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“ تیمور نے بے چارگی سے کہا۔

”نہیں مرتے تم بھوک سے دس پندرہ منٹ میں!!“ اپنی دانست میں تو ماہِ رُخ آہستہ ہی بولی ہوگی لیکن اسے بہت سے ارد گرد کھڑے لوگوں نے سنا۔ میرے دل میں احساسِ شرمندگی تو پیدا ہوا ہی تھا مگر جس طرح اس نے تیمور کی بے صبری پر اسے ”ڈانٹ“ دیا تھا وہ مجھے بھی بہت برا لگا تھا اور اس سے قبل کہ نگہت اس پر کچھ بولتی میں نے اسے پکڑ کر کھانے کی طرف کھینچا، ”چلو نگہت کھانا کھائیں۔“

کھانا کھانے کے دوران اسٹیج پر فوٹو سیشن ہو رہا تھا، ماہِ رُخ جس طرح کے پوز بنا رہی تھی وہ آج کل کے دور میں بھی شادیوں کے موقع پر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ماہِ رُخ کو کسی کی ناگواری کی کب پرواہ تھی۔ اسے کچھ کہنا اور سمجھانا بیکار تھا۔ جب اس کے اپنے گھروالے ہی یہ سب کچھ دیکھ کر اسے کچھ نہ کہہ رہے تھے تو ہمارے لیے خاموشی بہتر تھی۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ تیمور کے ساتھ ہمقدم جب کھانے کی میزوں کی طرف آئی تو زیادہ تر لوگ کھانا ختم کر چکے تھے۔ کئی مہمان رخصت

جان کو ڈنسی طور پر تیار کرنا ہوگا اور پھر باقی لوگوں کو بھی صفائیاں دینا ہوں گی۔ امی جان یقیناً اسٹے کے لیے پر تول رہی ہوں گی، میں نے نظر ہی نظر میں انہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور اٹھ کر اسٹیج پر جا کر انگٹھی کی ڈبیہ تیمور کے ہاتھ میں پکڑا کر پلٹنے ہی والی تھی کہ تیمور کی آواز نے قدم روک لیے۔

”یہ کیا ہے بھابی؟ اور مجھے کیوں دے رہی ہیں؟“ وہ بہت آہستگی سے بولا۔ میں گھبرا گئی، کیونکہ مووی کیمرا کا رُخ اسٹیج کی طرف تھا اور اسٹیج پر ہونے والی کارروائی روشنی کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔

”انگٹھی ہے جو تم نے ماہِ رُخ کو پہنائی ہے!!“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

”میں نے کیوں پہنائی ہے؟ امی جان کہاں ہیں.....؟ وہ کیوں نہیں انگٹھی پہنائیں گی؟“ تیمور کے لہجے میں خفگی تھی۔

”تیمور آج کل منگتیاں اسی طرح ہوتی ہیں.....“ میں نے جلدی سے کہا۔ ماہِ رُخ کے چہرے پر بیزاری نظر آرہی تھی۔ اس نے آہستگی سے تیمور سے کچھ کہا، جس کے جواب میں تیمور نے غصے سے کچھ کہا اور انگٹھی کی ڈبیا مجھے واپس پکڑا دی۔ میں نے مزید تماشہ بننے سے بہتر سمجھا کہ خاموشی سے آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟“ نگہت نے فوراً تجسس سے پوچھا۔ ارد گرد بھی لوگوں کے کان کھڑے تھے اس لیے میں خاموش ہی رہی۔ ”انگٹھی کیوں نہیں لی تیمور بھائی نے؟“ میں نے اپنے پاؤں سے اس کا پاؤں دبایا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”میں انگٹھی دینے تو نہیں گئی تھی۔“ میں نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا تاکہ اگر کوئی ارد گرد کان کھڑے کر کے بیٹھا ہو تو وہ بھی سن لے، ”میں تو کچھ اور پوچھنے گئی تھی۔ انگٹھی تو امی جان جب پہنانے جائیں گی تو خود ہی ساتھ لے جائیں گی۔“ وہ غالباً کچھ سمجھ گئی تھی، اس لیے اس نے مزید کچھ نہ پوچھا۔

”ٹھیک کیا ہے تیمور بھائی نے!!“ آہستگی سے وہ بڑبڑائی اور میرے کانوں میں اس کی آواز پہنچ گئی، بے ساختہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے پھر اس کا پاؤں دبایا۔ کیمروں کا رُخ اسٹیج پر تھا اور تیز روشنیوں میں ماہِ رُخ کے چہرے کی بیزاری، میک اپ کی تہوں کے نیچے سے بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ مجھے اس کی سوچ پر حیرت ہو رہی تھی۔ اور پھر اب تیمور نے اس وقت تو

ہو چکے تھے۔ والدہ وغیرہ نے بھی رخصت چاہی تو ہم ان کی گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ رانی باجی نے بہت پیار سے مجھے ساتھ لگا کر کہا ”آج اپنی نظر ضرور اتارنا.....“ ہر کوئی اس روز اسی طرح کے فقرے میرے کانوں میں انڈیل رہا تھا اور میں بار بار بلش کر رہی تھی۔

”آج بہت پیاری لگ رہی ہیں!!!..... لگتا ہے گلابی رنگ بنا ہی آپ کے لیے ہے؟“ ڈاکٹر معظم کے الفاظ نے میرے پورے وجود میں سرشاری کی لہر دوڑا دی تھی۔

”تھینک یو!!“ میں نے مختصر ا کہا۔

”کبھی ہمیں بھی ”تھینک یو“ کہنے کا موقع دیں آپ!!“

”کیسے؟ میں سمجھتی نہیں!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم پر کوئی احسان کر کے..... ہمارے سوال کا جواب دے کر۔“ اور اس کا جواب سن کر اور سمجھ کر میں پھر بلش کر گئی۔

گھر لوٹے تو کافی دیر ہو چکی تھی، مگر پھر بھی ہم سب لاؤنج میں آ بیٹھے اور ماہ رخ کے گھر سے آئے ہوئے تحائف نگہت نے کھولنا شروع کر دیئے اور اس وقت قہقہے بکھر گئے جب تیمور اور مظہر کی لندن سے آئی ہوئی شرمیں اور ٹائیاں بالکل ویسی ہی نکلیں، جیسی تیمور نے نقشہ کشی کی تھی۔ اس کے بعد چائے کا دور بھی چلا اور تقریب کے مختلف واقعات پر کھلے تبصرے بھی۔

”ویسے یہ میرے ہاتھوں انگوٹھی پہنانے کی تجویز کس کی تھی؟“ تیمور نے اچانک پوچھا۔

”میری!“ میں نے فوراً کہا، اس سے قبل کہ نگہت کچھ کہتی اور اس پر امی جان کو بھی برا لگتا۔

اور میرے ایک اس لفظ کے کہہ دینے سے بحث و مین سمٹ گئی اور نگہت بیٹھے بیٹھے فقط پہلو بدل کر رہ گئی۔ محفل برخاست ہوئی اور میں اپنے کمرے میں آ گئی، ڈیرینک ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے خود کو غور سے دیکھا تو تصور میں ڈاکٹر معظم کا چہرہ اور اس کی ستائشی نظریں بھی آ گئیں۔ میرے چہرے پر اس قدر گلابیاں تھیں کہ مجھے خود بھی یقین نہ آ رہا تھا۔

○ گہن کو اپنے تن کا نوشتہ جان کے، میں نے

روشنیوں سے سارے ناتے توڑ لیے تھے

رات کو اپنی سکھی مان کے

اپنے سارے دکھ بس اس سے کہہ کے

جی ہلکا کر لیتی تھی

شام ڈھلے تنہائی کے بازو پر سر رکھے سو جاتی

اور نیند کے بے آباد جزیروں میں تنہا

اک تھکی ہوئی خوشبو کی طرح بھٹکا کرتی!

آج بھی تنہا ہوں سفر میں

لیکن خود سے پوچھ رہی ہوں

میرے وجود کے گرد یہ کیسا ہالہ ہے!

یوں لگتا ہے

چادر شب شانوں سے سرکتی جاتی ہے

چاند میرے آنچل میں ستارے ٹانگ رہا ہے! (پروین شاکر)

رات دیر تک میں خود سے ہی سوال و جواب کرتی رہی۔ اور غالب کے بعد پہلی دفعہ کسی کی نظر ستائش نے میرے دل کے بند دریوں وا کیے تھے کہ مجھے خود ہی اپنے اندر خوشگوار تبدیلیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ عرصے بعد میں نے اس رات رنگین سپنے دیکھے تھے، پھولوں کے، تیتریوں کے، قوس قزح کے۔

تیمور کی چھٹی کے صرف دو ہی دن رہ گئے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے ایک ملاقات اس کی موجودگی میں ہی ڈاکٹر معظم سے ہو جاتی تو..... مگر جھک یہ آ رہی تھی کہ اسے خود سے کیسے کہوں۔ دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلنے ہی والی تھی کہ والدہ نے بلا لیا۔ ”کیا سوچا ہے پھر ماہا تم نے؟“

”کس سلسلے میں امی جان؟“ میں نے لاعلمی سے سوال کیا۔

”ڈاکٹر معظم سے اکیلے ملنے اور تفصیل سے بات کرنے کے بارے میں؟“



”مجھے اس سے اکیلے نہیں ملنا امی جان“ میں نے آہستگی سے کہا، ”تیور سے پوچھ لیں کہ وہ کب فارغ ہے کہ مل سکے اور اگر ابھی نہیں تو جب وہ کورس ختم کر کے واپس آئے تو..... اور سب سے پہلی بات امی جان!“ میں رُک تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔

”کیا پہلی بات بیٹا؟ کیا کوئی اور مسئلہ ہے؟“

”پہلی بات تو یہ کہ کیا میری ماں ہونے کی حیثیت سے آپ کو وہ لوگ اچھے لگے؟ کیا آپ کا ذہن اس بات کو تسلیم کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے بظاہر تو سب اچھا ہی لگا بیٹا اور اگر کوئی ایسی بات ہے یا تمہیں اعتراض ہے تو کھل کر کہو۔“ وہ تشویش سے بولیں۔

”میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ آپ کی رائے کی اہمیت میرے لیے اولین ہے۔“ اگرچہ میرا دل فیصلہ دے چکا تھا لیکن میں نے ان کو یہ مان دینے کے لیے کہا۔

”بیٹا! اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اگر ایک دفعہ اس سے مل لو..... اور پھر اگر وہ نکاح کرنا چاہتا ہو تو تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں اس کے لندن جانے میں.....“

”امی جان! تیور کورس پر جا رہا ہے، اسے بھلا چھٹی کب ملے گی؟“ میں نے نکتہ اٹھایا۔

”تو ہم کون سا تیور کے نکاح کی بات کر رہے ہیں۔“ امی جان بولیں۔

”پھر بھی، اس کا نہ بھی ہو، تب بھی اس کا ہونا ضروری ہے۔ اور ہم نکاح کی باتیں تو یوں

کر رہے ہیں امی جان جیسے ہر بات طے ہو چکی ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اللہ کرے گا تو ہر بات ٹھیک ہو جائے گی..... تم اس سے ملو تو سہی۔“ وہ یقین سے بولیں۔

”تیور جاگے امی جان! تو اس سے کہیے گا کسی بھی دن کا پروگرام طے کر لے جو اسے مناسب

لگے اور پھر ادھر بھی اطلاع کر دے۔ میں شام کو آ جاؤں گی تو مجھے بھی بتا دے.....“ میں نے انہیں

کہا اور چل دی۔

”اگر آج شام کا ہی پروگرام طے ہو جائے تو.....؟“ امی جان نے یکدم پوچھا، لگتا تھا وہ

سب سے جلدی میں تھیں۔

”تو بھی ٹھیک ہے، میں دفتر سے ہی ادھر چلی جاؤں گی۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”یہ کوئی حلیہ ہے بیٹا کسی سے اس مقصد کے لیے ملنے کا.....؟“ امی جان ناراض ہوئیں۔

”بس امی جان! اپنا تو یہی حلیہ ہے..... اگر کسی کو نا پسند ہو تو نہ کرے ہمیں پسند، اور نہ کرے خواہش ہمارے ساتھ کی۔“ میں چپک کر بولی۔

”کوئی میری نظر سے تمہیں دیکھے تو ایک لمحہ انتظار نہ کرے تمہارا ساتھ حاصل کرنے کو.....“

”پر آپ جیسی نظر اور پیارا دل بھی تو ہوتاں کسی کے پاس۔“ میں نے شرارت سے کہا۔

”بس میں تیور سے کہوں گی کہ کل رات کے کھانے کا وقت طے کر لے اور ہاں پھر کل تم دفتر

نہیں جاؤ گی۔ کل تیور خود دفتر چلا جائے گا، تم دن کو آرام کرنا۔“ امی جان بالکل ایک ماں کی طرح

میری فکر کر رہی تھیں کہ میرے حلیے سے اور میرے چہرے سے کم از کم شگفتگی کا اظہار ہو۔ میں ان کی

بات کی تائید کرتی ہوئی انہیں خدا حافظ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ راستے میں میں نے ٹیک بھی

آن کر لیا، اور خود بھی ہلکے سروں گنگنا نے لگی۔

○ ”خوشی..... جب آنے کی خبر دیتی ہے

تو گنگنا اٹھتی ہیں فضا میں

خوشبو سے بھر جاتی ہیں ہوائیں

وجود میں جلنے لگتی ہے

اک جوت..... کرنیں بکھیرتی

لب مسکراتے ہیں بات بے بات.....

دل چاہتا ہے، ہنستے رہیں.....

کوئی ساتھ ہو تو اس سے کہیں.....

آؤ لب مرا استقبال کریں

کہ خوشی آ رہی ہے ○ (شیریں حیدر)

نوید صاحب نے انٹرکام پر کال کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے میرے دفتر آنا چاہتے ہیں۔ اور

جب وہ آئے تو خالی ہاتھ تھے۔ میں سمجھی کوئی دفتری معاملہ ہوگا، میری استفہامیہ نظریں دیکھ کر

انہوں نے بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ ”میں نے زارا کو دیکھا ہے۔“

”کیا آپ اس کے گھر گئے تھے۔۔۔۔۔؟“ یکدم میرے منہ سے نکلا، مجھے اس سوچ سے ہی یکدم احساس ہوا کہ اس کا گھر اور ماحول دیکھ کر تو وہ ”بدک“ جائیں گے۔ کتنی تیزی سے میں کوشش کر رہی تھی کہ ان کا گھر کا کچھ ہو جائے تو۔۔۔۔۔

”اچھی لڑکی ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”آپ نے دیکھی کہاں؟“ میری حیرت بڑھ گئی اور وہ یقیناً اس سے محفوظ ہو رہے تھے۔

”کیا اس کی دکان پر گئے تھے آپ جہاں وہ کام کرتی ہے؟“

”نہیں وہ صبح دفتر آئی تھی، اپنے بھائی کے ساتھ، آپ کو ملنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ اور یہ پیکٹ دے گئی تھی، آپ ابھی آئی نہ تھیں۔۔۔۔۔“ انہوں نے بالآخر وضاحت کر دی۔

”تو مظہر علی دے دیتا یہ پیکٹ مجھے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”مظہر علی گھر کے سلسلہ میں کسی کام سے گیا ہے اور ویسے بھی مجھے آپ کے انتخاب کی داد دینا تھی۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”بہت شکریہ!“ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ مجھے واقعی خوشی ہوئی کہ نوید صاحب کو زارا پسند آئی تھی۔ ”مظہر علی کس سلسلہ میں گیا ہے؟“

”میں نے اسے کہا تھا کہ وہ مختلف پراپرٹی ڈیلروں سے گھر کی مالیت کا اندازہ لگوائے اور اس کے علاوہ کھڑکیاں دروازے لگوانے اور ڈمپروں وغیرہ کا بھی تخمینہ لگوائے۔“ نوید صاحب نے بتایا۔

”اچھا، جب وہ واپس آئے تو اسے میرے پاس بھیجیں۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

زارا کا پیکٹ میں نے دیکھا، اس کے اوپر ”تیور صاحب کے لیے“ لکھا ہوا تھا۔ اس لیے

اسے میں نے بندر پہنچا دیا اور ساتھ میرے نام کا ایک خط تھا، اسے میں نے چاک کیا۔

”ماہاجی! سلام۔ سب سے پہلے تو آپ کو، آنٹی کو، تیور صاحب کو اور مظہر

صاحب کو تیور صاحب کی مشکلی کی بہت بہت مبارکباد، اس کے بعد نہ

آسنے کی معذرت۔ اور کوئی عذر بہانہ تراشنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی

کیونکہ میں جانتی ہوں آپ کو ہماری مجبوریوں کا علم ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں

کہ آپ ناراض نہیں ہوں گی۔

حقیر سا تحفہ اپنی حیثیت کے مطابق دے رہے ہیں، اُمید ہے کہ تیور صاحب کو پسند آئے گا اور وہ ہماری اس ”جسارت“ کو قبول فرمائیں گے۔

آپ کی ”زارا“

کیسی قیافہ شناس تھی وہ بھی! حالات نے اسے بھی کافی اسباق پڑھا اور سکھادیئے تھے۔ کتنی عقلمندی سے اس نے جامع الفاظ میں اپنی مجبوری بتادی تھی، نہ لمبے چوڑے جھوٹ گھڑے تھے، نہ کوئی غلط بیانی کی تھی، نہ ہی اپنی غربت کا رونا رویا تھا، نہ بے بسی کی داستان بیان کی تھی۔ میں دل سے اس کی سادگی اور سچائی کی قائل ہو گئی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کا تحفہ کھول کر دیکھوں۔۔۔۔۔ لیکن پھر رک گئی کیونکہ اس پر تیور کا نام لکھا تھا۔ اور بچپن سے ہی یہ بات ذہن نشین کرادی گئی تھی کہ کسی کا خط کھولنا امانت میں خیانت کے مصداق ہوتا ہے اور یہ پیکٹ بھی چونکہ تیور کی امانت تھا اس لیے اس کو کھولنا میرے لیے ممنوع تھا۔

یہ بھی سوچا چند لمحوں کے لیے کہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جو مجھے شرمندہ کر دے، کوئی بہت گھٹیا یا بہت حقیر نہ ہو؟ کہیں واقعی وہ تیور کے شایانِ شان نہ ہوا تو؟؟ لیکن مجھے زارا اور ثانیہ کی تفصیل بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یوں بھی کوشش کر کے تیور کو کسی ایسے وقت پر دوں گی جب اور کوئی نہ ہو۔ لیکن خود مجھے بھی تجسس کے مارے کھد بد ہو رہی تھی۔ پھر دفتر کے معمولات میں یہ بات ذہن سے ہی نکل گئی۔ شام ہونے والی تھی اور مصروفیت سے دقت گزرنے کا علم بھی نہ ہوا تھا۔ تیور کی کال کا مجھے غیر ارادی طور پر انتظار رہا مگر وہ بھی نہ آئی۔ اور دفتر سے اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ انٹر کام پر مظہر علی کی کال آئی۔ سلام دعا کے تبادلے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ بہت جلدی میں تھا۔

”میڈم! زارا آپنی دیر سے میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ آپ کا پیغام ملا، لیکن اگر آپ برا نہ منائیں تو کل آپ کو تفصیل بتا دوں گا۔۔۔۔۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”کیا بنا کوئی ذیل ہوئی فائنل؟“ میں نے بے قراری سے کہا۔

”چلیں میڈم میں آجاتا ہوں اور آپ کو تفصیل بتا کر جاتا ہوں۔۔۔۔۔“ غالباً میری بے قراری

جان کر اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا تھا۔ ”زارا آپنی کوفون کر کے بتا دیتا ہوں وہ ٹیکسی پر چلی

جائیں گی۔“

”نہیں آپ جاؤ، میں کل پوچھ لوں گی۔ اس وقت اندھیرا ہو رہا ہے اور زارا کا تنہا ٹیکسی میں

جانا ٹھیک نہیں۔“ میں نے رمان سے کہا۔

”کوئی بات نہیں میڈم! وہ عادی ہیں..... اکثر میں اور ٹائم وغیرہ کے لیے رُک جاؤں تو وہ ٹیکسی یا وٹیکن سے چلی جاتی ہیں۔“ اس نے کہا۔

”لیکن مجھے ایسی کوئی ایمر جنسی لاحق نہیں ہے جس کی وجہ سے میں انہیں خواہ مخواہ میں ٹیکسی یا وٹیکن پر جانے پر مجبور کروں، اس لیے آپ بے فکر ہو کر جائیں.....“ میں نے اسے اصرار سے کہا۔

”ٹھیک ہے میڈم! بہت شکریہ۔ میں کل آتے ہی آپ سے ملوں گا انشاء اللہ۔“ کہہ کر اس نے انٹرکام بند کر دیا۔ واپسی پر میں خود ڈرائیو کر رہی تھی، ساتھ والی سیٹ پر میرا بیگ رکھا تھا اور اس میں رکھا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ میں دورانِ ڈرائیو تک تو قطعی فون اٹینڈ نہ کر سکتی تھی، اس لیے اس کے ”میوزک“ سے لطف اندوز ہوتی گھر پہنچی تو تیسور گاڑی دیکھتے ہی باہر نکل آیا۔

”کہاں رہ گئی تھیں آپ؟ اتنی دیر سے کال بھی کر رہا ہوں، آپ فون بھی نہیں اٹھا رہیں، مجھے تو پریشانی سے اختلاج ہونے لگا ہے۔“ تیسور نے خفگی سے کہا۔

”دھیرج بھی دھیرج، میں گاڑی چلاتے ہوئے فون اٹینڈ نہیں کر سکتی اور کوئی اختلاج ہونے والی بات نہیں ہے، میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کہیں بھاگنے والی نہیں ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”تیاریاں تو ہو رہی ہیں ہمیں اکیلا چھوڑ کر بھاگنے کی۔“ وہ بھی شرارت سے بولا۔

”تمہیں ماہِ رُخ کے مضبوط سہارے چھوڑ کر جاؤں گی، تم فکر نہ کرو۔“

”ماہِ رُخ، ماہِ رُخ ہے اور آپ آپ، جو آپ ہیں وہ ماہِ رُخ کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے کہا۔

”اور جو ماہِ رُخ ہے وہ میں کبھی نہیں ہو سکتی۔“ میرے منہ سے یہ الفاظ انتہائی نادانستگی میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح گئے اور جواثر انہوں نے تیسور پر کیا ہوگا اسے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

”آئی ایم سوری تیسور! میرے منہ سے کیسا اسٹوپڈ قسم کا جملہ ادا ہوا ہے.....“

”جانتا ہوں..... اس لیے کہ آپ کو یہ جملہ کہنے کا حق بھی نہیں ہے۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”اچھا اتنی بے چینی سے مجھے کال کیوں کر رہے تھے؟“ میں نے موضوع بدلا۔

”بس تھا کوئی ضروری کام، اب بھول گیا ہوں۔“ اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”ایسے بھلکدو تو تم ہونی نہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا، ”چلو نہ بتاؤ وہی تھوڑی دیر میں پیٹ میں درد ہوگا تو بتانے کو آؤ گے۔“ میں نے اسے کہہ تو دیا مگر دراصل مجھے خود پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ مگر

اب میری انا آڑے آ رہی تھی کہ میں اسے کس طرح پوچھوں۔ یقیناً اس نے امی جان کے کہنے پر ڈاکٹر معظم سے فون کر کے ہی وقت لیا ہوگا اور وہ اب بچوں کی طرح مجھے ستا کر بتائے گا۔ اور خود پوچھنے میں بھی مجھے اپنی ہنگ محسوس ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے اگر پیٹ میں درد ہوا بھی تو آپ سے دوا لینے نہیں آؤں گا، کسی ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا..... چاہے وہ دل کا ڈاکٹر ہو۔“ اس نے ذومعنی بات کی تو میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی جسے چھپانے کو میں نے اپنے کمرے کی راہ لی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس راز کو خود تک محدود نہ رکھ سکے گا۔ لیکن اس وقت تو مسئلہ میری اپنی کیفیت کو راز رکھنے کا ہو رہا تھا۔

○ سوتے میں بھی چہرے کو آنچل سے چھپائے رہتی ہوں،

ڈر لگتا ہے

پلکوں کی ہلکی سی لرزش، ہونٹوں کی موہوم سی جنبش

گالوں پر رہ رہ کر اترنے والی دھنک

لبو میں چاند رچاتی اس ننھی سی خوشی کا نام نہ لے لے

نیند میں آئی ہوئی مسکان

کسی سے دل کی بات نہ کہہ دے ○ (پروین شاکر)

”سوچ لیں شاید آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنا ہو؟“ باہر سے تیسور کی آواز آئی۔

”میں نماز پڑھ کر آتی ہوں، تم دو کپ اچھی سی چائے تو بناؤ۔“ میں نے وہیں سے آواز دی۔

”اگر تین کپ بن جائے تو مجھ غریب کو بھی چائے مل جائے گی۔“ مظہر اسی وقت نگہت کو اس کے گھر چھوڑ کر واپس آیا تھا۔ میں ہاتھ روم میں گھس گئی، نہا کر نماز پڑھی اور لاؤنج میں آئی تو دونوں

بھائی چائے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ امی جان بھی وہیں تھیں لیکن وہ ہماری طرح وقت بے وقت چائے نہیں پیتی تھیں، بلکہ مغرب کے بعد جلد ہی کھانا کھا لیتی تھیں۔ مظہر اور تیسور گاڑیوں کے ماڈلز

کی باتیں کر رہے تھے۔ میں امی جان کے پاس بیٹھ گئی اور یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

”کچھ طے ہوا کہ کب مل رہے ہو تم لوگ ڈاکٹر معظم سے؟“ امی جان نے اچانک پوچھا۔

”معلوم نہیں امی جان، میں تو ابھی آئی ہوں اور آپ نے ہی تیسور کے ذمہ یہ کام لگانا تھا۔“

میں نے لا پرواہی سے کہا۔

”میں نے کہا تو تھا اسے..... اور میرا خیال ہے کہ اس نے بات کی بھی ہوگی..... کیوں تیور؟“ وہ ایک دم سے تیور سے مخاطب ہوئیں، ”بات ہوئی تمہاری ڈاکٹر معظم سے؟“

”جی امی جان! ہوگئی تھی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کس ڈاکٹر سے اور کیوں؟“ مظہر ایک دم پریشان ہو گیا.....

”کوئی نہیں یار! میرا ایک دوست ہے ڈاکٹر معظم، اس سے بات کرنا تھی کسی کام کے سلسلہ میں!“ تیور نے مظہر کو ٹالا۔ میں نے شکر کیا، ورنہ زیادہ جرح ہوتی تو مظہر کے سوالات کے جوابات دینا مشکل ہو جاتے اور ابھی تک مظہر چونکہ اس سارے سلسلے سے لاعلم تھا اسی لیے میں چاہتی تھی کہ اسے معلوم نہ ہو جب تک کہ کوئی بات فائل نہ ہو جائے۔ امی جان نے بھی غالباً اسی وجہ سے تیور سے مزید سوال جواب نہ کیے اور کھانا کھانے کو اٹھ گئیں۔ مظہر تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا تو تیور نے پھر شرارت سے پوچھا، ”بھابی آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنا تو نہیں ہے؟“

”نہیں تو!“ میں نے بھی اسے چڑانے کو کہا۔

”اچھا چلیں بتائیں کل لچ پر کیا پہن رہی ہیں؟“ تیور نے پوچھا۔

”کیوں کل کوئی خاص لچ ہے کیا؟“

”ہاں آپ اور ڈاکٹر معظم لچ پرل رہے ہیں.....“

”تمہارا کوئی ذکر نہیں اس میں؟“

”میں دفتر میں ہوں گا۔“

”تو پھر یہ لچ کینسل کر دو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے ان سے اکیلے نہیں ملنا۔“

”پلیز بھابی! یہ کیا دھونس ہوئی؟ میرے سامنے آپ کیا بات کریں گے؟“

”مجھے کوئی ایسی بات نہیں کرنی جو میں تمہارے سامنے نہ کر سکوں۔“ میں نے ضد سے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کوئی ایسی بات کرنا ہو۔“ وہ مسکرایا۔

”تیور میں نے تمہیں بتا دیا ہے اور بہتر ہے کہ کل کا ڈنر مقرر کر لو کیونکہ مجھے کل دفتر جانا ہے

چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔“ میں چاہتی تھی کہ کل دفتر جا کر مظہر علی کے گھر کے سلسلہ میں اس سے پوچھوں تا کہ جلد از جلد اس میں پیش رفت ہو۔

”میں دوبارہ ان سے بات کر لوں گا اور مجھے بہت عجیب لگتا ہے اپنے منہ سے یہ کہنا کہ میں

بھی وہیں موجود ہوں گا۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”پھر کس کے منہ سے کہا جاسکتا ہے؟“

”آپ کے منہ سے، میرا مطلب ہے کہ اگر آپ ڈاکٹر معظم سے بات کر کے تبدیلی پروگرام

سے بھی آگاہ کر دیں اور ساتھ ہی میرے بارے میں بتادیں.....“

”بڑے شرمیلے ہو تم جیسے.....“ میں نے طنز سے کہا، ”چلو ٹھیک ہے میں کہلوادوں گی صدف

آپ کے ذریعہ۔“

اگلے روز میں نے دفتر پہنچتے ہی نوید صاحب کو کہلوایا کہ جو انتہائی ضروری کام ہیں وہ مجھے

چیک کرادیں کیونکہ مجھے جلد اٹھنا تھا اور پھر چڑا اسی سے کہہ کر مظہر علی کو بلوا بھیجا۔ وہ آیا اور اجازت

لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے سلسلہ میں پیش رفت حوصلہ افزا

تھی۔ میں نے جوس منگوایا اور اس سے تفصیل پوچھی۔

اس نے بتایا کہ گھر کی مالکن فسطوں میں رقم لینے پر تیار ہوگئی ہیں۔ کیونکہ وہ اتنی ضرورت مند تو

ہے نہیں، فقط اپنی تنہائی کے خیال سے اور پھر اپنے شوہر کے انتقال کے بعد وہ اس گھر کی ضرورت

نہیں سمجھتی ہیں، نہ ہی ان کی کوئی اولاد ہے۔ دفتر سے ملنے والی قرض کی رقم کو وہ ایڈوانس کے طور پر

دے گا اور بتایا رقم وہ ہر چھ ماہ بعد مساوی اقساط میں جمع کرواتا رہے گا۔ موجودہ گھرنج کردہ آئندہ

چار قسطیں تک ادا کر سکے گا اور اسی میں سے کھڑکیوں، دروازوں اور ڈمپپر وغیرہ کا خرچہ بھی نکل

آئے گا۔ یہ سب بتاتے ہوئے اس کا چہرہ جوش سے تمتار رہا تھا۔

”میڈم میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس طرح کا گھر کسی بھی طریقہ سے حاصل کر سکتا

تھا، جب تک کہ آپ کی رائے، مدد اور حوصلہ افزائی نہ ملتی۔ آپ نے واقعی مجھے زندگی میں بہت

مثبت تبدیلی کی راہ دکھائی ہے۔ جس گھر میں میں رہ رہا ہوں وہاں رہتے ہوئے زندگی احساس

کمتری کے گرداب سے ہی نہیں نکل سکتی تھی۔ آپ نے مجھے وہ راستہ دکھایا ہے کہ اب میں اس سے

آگے زندگی میں مزید بہتری کی جدوجہد کر سکوں گا۔“ اس نے مشکور لہجے میں کہا۔

”ہر کامیابی کے لیے اللہ کا شکر ادا کریں تو مزید کامیابیاں خود ہی قدم چومنے کو بے تاب رہتی ہیں۔ بہتری کے لئے جدوجہد ضرور کرو لیکن قناعت کے ساتھ..... خود کو کبھی بھی مشین مت بنالینا۔ گھر کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو اس میں سے ضروری اخراجات کے لیے رقم نکال کر باقی رقم کتنی بچ جائے گی؟“ میں نے سوال کیا۔

”میڈم نیا گھر مجھے دس لاکھ میں مل رہا ہے اور یہ بالکل اونے پونے دام ہیں۔ اگر میری قسمت اچھی نہ ہوتی تو یہ گھر میرے دوست کی آنٹی مجبوری میں بھی چندہ لاکھ سے کم کا نہ بچتیں اور میں اتنا بوجھ اٹھانے کا متحمل نہ ہوتا۔ کچھ سیکنڈ ہینڈ دروازے اور کھڑکیاں اچھی حالت میں مل گئے ہیں، میرا خیال ہے کہ تقریباً ایک لاکھ تک خرچہ کر کے ہم گزارا کر سکیں گے۔ ہمارا پرانا گھر چار لاکھ کا بک رہا ہے..... ہمارے پڑوسی ہی خرید رہے ہیں، اس لیے ہم نے بھی مروتا بحث نہیں کی ورنہ شاید پانچ لاکھ تک مل جائے..... اور چونکہ یہ ہماری بلا واسطہ بات چیت ہو رہی ہے اس لیے پراپرٹی ڈیلر کا کمیشن بھی خرچ نہ ہوگا۔“ مظہر علی نے وضاحت کی۔

”پھر کیا سوچا ہے؟“

”سوچ رہا ہوں کہ گھر کی فروخت سے ملنے والی رقم سے ضروری اخراجات نکالوں، پھر دونوں بہنوں کی شادیوں کے اخراجات نکال کر بقایا رقم میں سے دفتر کا قرض ادا کر دوں..... اور اگر پھر بھی کوئی تھوڑی بہت رقم بچ جائے تو.....“

”فی الحال نہ آپ دفتر کا قرض چکانے کی بات کرو نہ بہنوں کی شادیوں کی فکر کرو۔ ضروری اخراجات کے لیے رقم منہا کر کے باقی رقم کو کسی جگہ انویسٹ کر دو تو اس سے حاصل ہونے والا منافع بھی دوسالوں میں بڑھ جائے گا۔ ہر چند کہ چھ ماہ بعد رقم ادائیگی کے لیے نکالنا ہوگی پھر بھی کچھ نہ کچھ فرق تو پڑے گا.....“ میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”بہت شکریہ! آپ کے احسانات بڑھتے ہی جا رہے ہیں!“ اس نے احسان مندی سے کہا۔

”پلیز مظہر علی اس طرح کے الفاظ نہ کہیں۔ اللہ مجھے توفیق دے کہ میں آپ لوگوں کی بہتری کے لیے کچھ کر سکوں تو اس سے مجھے خوشی ہوگی۔“ میں نے ندامت سے کہا۔ مجھے یہ سوچ کر شرمندگی ہو رہی تھی کہ کہیں زارا اور ثانیہ بھی خود کو زندگی بھر میرے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس نہ کریں۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اپنی زندگی فخر سے اور کسی احساسِ کمتری کی موجودگی

کے بغیر جنیں۔

میں نے مظہر علی کو اسی وقت قرضے کے لیے درخواست لکھ کر دینے کو کہا اور پھر نوید صاحب کو کال کر کے ہدایات دیں کہ وہ مظہر علی کی درخواست پر عملدرآمد کرنے کے اور رقم جلد فراہم کرنے کی ہدایات جاری کریں اور پھر تھوڑی بہت فائلیں چیک کر کے دفتر سے اٹھ گئی۔ واپسی پر جانے کیسے گاڑی میں نے لبرٹی کی طرف موڑ لی اور وہاں ایک مشہور بیوٹی پارلر کے سامنے جا کر گاڑی کھڑی کر دی۔ غالب کی وفات کے بعد میں نے پہلی دفعہ یہاں کا رخ کیا تھا۔ بال جو کبھی بڑی خوبصورتی سے تراشے ہوتے تھے اتنے سالوں میں کافی بڑھ گئے تھے اور اب میں ان کو جوڑے کی شکل میں باندھے رکھتی تھی۔ پارلر کے اندر گئی تو کوئی ایسا چہرہ نہ تھا جو مجھے پہچانتا ہو، تاہم ایک لڑکی غالباً میرے طبع سے مرعوب ہو کر میری طرف بڑھی اور پھر مجھ سے کچھ سوالات کر کے اس نے مجھے ایک چھوٹے سے کیوبیکل کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہاں گزار کر نکلی تو میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ بالوں کی ہلکی سی ٹرمنگ اور کلینزنگ فیشل سے میری جلد چمکنے لگی تھی۔ گھر پہنچ کر بھی میں نظریں چراتی رہی کہ کوئی میرے چہرے اور بالوں میں تبدیلی کو محسوس نہ کر لے۔ شکر ہے کہ نگہت گھر پر نہ تھی، ورنہ ایسی تبدیلی اس سے ہرگز نہ چھپی رہتی۔ ڈاکٹر معظم کو میں نے وقت کی تبدیلی اور تیور کی موجودگی کا بھی بتا دیا تھا۔

شام کی چائے پیتے ہوئے یکدم مجھے پچھلے روز کا پیکٹ یاد آ گیا جو ابھی تک میری گاڑی کی ڈگی میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے مظہر سے کہا کہ وہ پیکٹ نکال لائے۔ مظہر پیکٹ نکال کر لایا اور تیور کا نام پڑھ کر اس کے حوالے کیا۔ ”یہ کیا ہے بھابی؟“ تیور نے حیرت سے کہا۔

”کھولو اور دیکھو کیا ہے!“ میں نے کہا کیونکہ میں خود بھی نہ جانتی تھی کہ اس کے اندر کیا تھا۔

ٹیپ اتار کر اس نے احتیاط سے ٹیٹ اتاری اور اندر سے گتے کے ڈبے سے بھی ٹیپ اتار کر کھولا تو اندر سے براؤن رنگ کی خوبصورت جرسی، ہاتھ کی بنی ہوئی نکلی..... ”واؤ! ویری ٹائس! بہت خوبصورت ہے، کتنی نرم اور گرم.....“ تیور نے جرسی ہاتھوں میں لے کر کہا۔

پھر مظہر نے اس کے ہاتھ سے لے کر کھول کر اپنے ساتھ لگائی۔ ”یہ تو غالباً مجھے بھی پوری ہوگی!“ اسی جان نے مظہر سے کہا کہ انہیں دکھائے۔ پھر میں نے بھی اسے ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھا۔

نے گاڑی کی چابیاں سنبھالیں اور امی جان نے نکلنے وقت مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔  
 ”گھبرانا نہیں اور جو پوچھتا ہے اسے کھل کر بغیر ہچکچاتے ہوئے پوچھنا۔ راستے میں بے شک  
 تیمور سے ملے کر لینا کہ کس طرح اور کیا بات کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بہتر کرے۔“  
 خدا حافظ کہہ کر ہم روانہ ہوئے۔ تیمور خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا۔  
 ”بڑی اچھی خوشبو لگا رکھی ہے آپ نے؟“ مجھے اندازہ تھا کہ اس نے بات یونہی شروع  
 کرنے کو کہا تھا۔

”کسی اچھے بندے نے دی تھی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔  
 ”اوہو! کون ہے وہ اچھا بندہ بھابی؟“  
 ”تیمور!“ میں نے انکشاف کیا، ”تمہی نے تو مجھے دی تھی یہ سا لگرہ پر گزشتہ برس۔“  
 ”تب سے اب تک ختم نہیں ہوئی؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”میری تو پرفیوم کی ایک بوتل چند  
 دنوں میں پار ہو جاتی ہے۔“

”میں پرفیوم کم استعمال کرتی ہوں، کوشش کرتی ہوں کہ باقاعدگی سے نہالوں تاکہ.....“  
 ”یہ فاول ہے بھابی!“ وہ چیخا ”آپ کا مطلب ہے کہ میں نہانے کی بجائے پرفیوم لگاتا  
 ہوں۔ میں ہر روز دو دفعہ نہاتا ہوں۔“  
 ”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی.....“ میں زیر لب مسکرائی۔  
 ”آپ کا تو وہ حال ہے کہ کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے.....“ وہ چڑ گیا۔  
 ”تم جارہے ہو پرسوں صبح؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی انشاء اللہ.....“ وہ بولا، ”ویسے مجھے تھوڑا سا سمجھا دیں کہ میں نے ڈاکٹر معظم صاحب  
 سے کیا بات کرنی ہے..... کیا کیا پوچھنا ہے اور کیا کیا شرائط منوانی ہیں؟“  
 ”زیادہ منحہ بننے کی ضرورت نہیں ہے، شرائط میری کچھ بھی نہیں ہیں۔ بس ایک تو میں ملک  
 چھوڑ کر پردیس نہیں جاسکتی اور دوسرے تمہاری موجودگی کے بغیر کوئی فٹکشن نہیں ہوگا..... کم از کم  
 نکاح تو ہرگز نہیں..... باقی تم جو مناسب سمجھو پوچھ لینا، بھائی ہو اور بہن کی زندگی کا فیصلہ کرتے  
 وقت بھائیوں کی جو بھی سوچیں ہوتی ہیں، ان کا تو تمہیں ہی اندازہ ہوگا.....“ میری آواز بھرا گئی اور  
 کا جل پھیلنے لگا۔ دیر تک گاڑی میں خاموشی رہی، ہم دونوں کے پاس بولنے کو کچھ نہ تھا۔

واقعی وہ جری بنانے والے کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔  
 ”کہاں سے آئی ہے بھابی!“ تیمور نے پوچھا۔  
 ”کسی نے تمہاری منگنی کا تحفہ بھیجا ہے.....“ میں نے مختصر ا کہا۔  
 ”کس نے بتائی ہے یہ جری اتنے پیار سے؟“  
 ”میری ایک دوست کے گھر سے تحفہ آیا ہے، اب یہ معلوم نہیں جی کس نے ہے؟“ میں نے کہا۔  
 ”یہ کون سی دوست ہے بیٹا؟“ امی جان نے پوچھا۔  
 ”امی جان! زارا یاد ہے ناں آپ کو؟“ میں نے مختصر ا کہا۔  
 ”اچھا وہ والی، بہت پیاری بچی ہے..... اور تم نے بتایا تھا کہ ماں بیٹیاں بہت سلیقہ شعار ہیں۔“  
 ”تو پھر بھابی! اپنی سلیقہ شعار سہیلیاں کہاں چھپا رکھی ہیں آپ نے؟“ تیمور شرارت سے بولا۔  
 ”شرم کو، ورنہ میں ماہ رخ کو بتاؤں گی!“ میں نے اسے دھمکی دی۔  
 ”میں اپنے لیے نہیں بلکہ مظہر کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ تیمور کھسکا کر بولا۔  
 ”ابھی سے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو لینے دو۔“ میں نے کہا۔  
 ”بھابی! میں اپنے ہی پیروں پر کھڑا ہوتا ہوں اب بھی۔“ مظہر بولے بنانہ رہ سکا۔  
 ”اسے کہتے ہیں بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔“ امی جان نے کہا،  
 ”چلو اٹھو باتیں چھوڑ دو اور تیار ہو جاؤ، تم لوگوں کو کھانے پر بھی جانا ہے۔“  
 ”کون دونوں؟“ مظہر نے سادگی سے پوچھا۔  
 ”میں اور بھابی!“ تیمور نے کار سے خیالی گرد جھاڑی، ”تم ابھی چھوٹے ہو۔“ اس پر مظہر  
 ٹھنک گیا.....

”دال میں کچھ کالا ہے..... میں بھی ساتھ جاؤں گا.....“  
 ”ضد نہ کرو، چھوٹے بچے نہیں، وتم، انہیں ملنا ہے کسی سے۔“ امی جان نے حتی انداز میں کہا۔

حسب معمول میں نے سادہ سا سوٹ پہنا، ہلکا سا کاجل آنکھوں میں بسایا اور نیچرل شید کی  
 لپ اسٹک لگا کر بالوں کو کلپ میں جکڑ کر تیار ہو گئی۔ باہر نکلی تو شرمندہ سا محسوس کر رہی تھی۔ تیمور

”تیور تم نے مظہر کے سلسلہ میں کیا کیا ہے؟“ یکدم مجھے یاد آیا۔

”میں نے پوچھنا چاہا تھا بھی کی ہے، اس کے کالج سے بھی چیک کیا ہے۔ کوئی ایسی چیز پیل گرفت بات نہیں۔ راتوں کو دیر سے آنے کا پوچھا تو اس کے دو ایک اور کلاس فیلو نے بھی بتایا کہ ان کے ایک پروفیسر ہیں جن کے ہاں یہ لوگ اپنی اسائنمنٹس وغیرہ کے لیے مدد لینے کو جاتے ہیں۔“

”اس کا کمرہ چیک کیا؟“

”وہاں بھی کچھ نہیں ملا اور اس کی کالج میں پرفارمنس بھی انتہائی اطمینان بخش ہے۔ پڑھائی کے علاوہ اس کی کھیلوں اور غیر نصابی سرگرمیوں کی رپورٹ بھی اچھی ہے۔“

”کوئی لڑکی؟ کوئی کلاس فیلو وغیرہ؟“ میں نے مکمل سا سوال کیا۔

”نہ کیوں تو اس کی کلاس میں ہیں اور اچھی بھی ہیں، لیکن یہی علم ہوا ہے کہ وہ ان سے غیر ضروری رابطہ نہیں رکھتا۔ وہی اگر بات کریں تو جواب دیتا ہے، خود سے تو سلام میں بھی پہل نہیں کرتا۔“

”بڑی تفصیل سے چیک کیا ہے تم نے سب کچھ؟“ میں نے واوڈی، ”ماہِ زرخ سے ملے تم؟“

”بہت سخت ناراض تھی مگنی والے دن کے بعد سے، بمشکل اسے منایا ہے۔۔۔۔۔ اصل میں اسے بڑی مشکل سے یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ ہمارے اور ان کے گھر کے ماحول میں فرق ہے۔“

”اس بات کا تو ماہِ زرخ کو سمجھائے بغیر بھی علم ہونا چاہئے کہ ایسا فرق موجود ہے۔“

”جب ہمارے ہاں آئے گی تو ہمارے طور طریقے سیکھ لے گی۔۔۔۔۔ وہ اعتماد سے بولا۔“

”کچھ وہ ہمارے طریقے سیکھے گی اور کچھ ہمیں اپنے طریقے سکھائے گی۔۔۔۔۔“ میں نے ہنس کر کہا، ”تھوڑے سا بتم بھی ماڈرن ہو جاؤ تا کہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکو۔“

”قدم اس کو میرے ساتھ ملانے ہیں نہ کہ مجھے اس کے ساتھ بھابی؟“

”چلو دیکھیں گے کہ کس کی خاطر کون خود کو بدلتا ہے؟“ میں نے اسے چیلنج کیا۔ میں جانتی تھی کہ ماہِ زرخ خندی سی لڑکی ہے اور وہ کبھی بھی کسی کی خواہشات کے سامنے جھکنے والی نہیں۔ مگر اب اس کا کیا علاج کہ تیور کا دل اس پر آگیا تھا؟

تھی اتنی تھی نہیں، اندر سے جھجک سے عجیب حالت ہو رہی تھی۔

”کیفِ زور ہو رہی ہیں بھابی۔“ تیور غالباً مجھے اچھے خاصے موسم میں پسینے صاف کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

”ہاں بہت زیادہ!“ میں جھوٹ نہ بول سکی۔

”بس نارمل رہنے کی کوشش کریں۔۔۔۔۔ میں ہوں ناں آپ کے ساتھ۔“ مگر اس کی اس یقین دہانی کے باوجود حالات ویسے ہی رہے۔

ہم اندر جا کر ڈائننگ ہال سے ملحقہ کمرے میں ایک کونے میں جا بیٹھے۔ صرف پانچ منٹ کے وقفہ سے ڈاکٹر معظم آگئے، گہرے رنگ کے سوٹ، گلابی شرٹ اور لائٹوں والی گلابی اور نیلی نکھائی میں لمبوس۔ میں نے ان کے لباس کو غور سے دیکھا، دل میں سراہا اور پھر مجھے خود ہی احساس ہوا کہ میں نے تو کبھی یوں کسی کا تاندانہ نظر سے جائزہ بھی نہ لیا تھا۔ جانے کیوں میں انہیں اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ آئے سلام کیا، تیور نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا اور پھر دونوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک دیگر تازہ جوس لے کر آگیا۔ اور میں جوس کے ہلکے ہلکے سپ لینے لگی۔ مجھے لگا کہ وہ بھی مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اچانک نظر اٹھا کر ان کی چوری پکڑ لی تو وہ گڑبڑا گئے۔ لیکن سنبھل کر یکدم مسکرا دیئے اور بولے، ”آپ اپنی سادگی کے باوجود بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ اور یہ پہلا فقرہ تھا جو وہاں ہم تینوں میں سے کسی کے منہ سے ادا ہوا تھا۔

”شکریہ! صدف آپ کی کیسی ہیں؟“

”میں اس وقت اپنے گھر سے آرہا ہوں اور آج صدف آپ سے ملاقات نہیں ہوئی ویسے وہ ٹھیک ہی ہوں گی انشاء اللہ تعالیٰ۔“ ان کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی، ”مجھے نہیں علم تھا کہ کسی کی تعریف کی جائے تو جواب اس طرح سے ملتا ہے۔“

”میں نے شکریہ کہا تو ہے!“

”کیا تھا کہ اگر آپ اخلاقاً ہی کہہ دیتیں کہ میں بھی اچھا لگ رہا ہوں میں نے تو اس ڈنر کے لیے بہت خاص اہتمام کیا اور اچھا نظر آنے کی کوشش بھی کی ہے۔ کیوں تیور کیے الگ رہا ہوں؟“

”بہت اچھے ڈاکٹر صاحب! خصوصاً آپ کا ہیئر اسٹائل۔۔۔۔۔“ تیور نے تعریف کی تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، واقعی اس کا ہیئر اسٹائل مختلف تھا۔ ”تو اس کا مطلب ہے کہ تیاری دونوں طرف

جتنا نہ کلب پہنچے تو میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ جتنی پر اعتماد میں نظر آ رہی

سے بھر پور کی گئی تھی ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی۔“ میں دل ہی دل میں ہنسی، اور ایسا تبھی ہوتا ہے جب آپ کو کوئی اچھا لگتا ہے اور آپ اس کو اچھا لگنا چاہتے ہیں۔ میں نے فقط مسکرا کر سر جھکا لیا۔

جوں ختم کر کے ہم کھانے والے کمرے کی طرف گئے اور کھانے کے دوران تیمور اپنی باتیں سناتا رہا۔ دو ایک دفعہ ڈاکٹر معظم نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی تو بھی تیمور کا سلسلہ گفتگو قائم رہا۔ ڈاکٹر معظم نے کھانے کی تعریف کی تو تیمور نے میس کے کھانے سے موازنہ شروع کر دیا۔ بیٹھا لینے کے لیے تیمور اٹھا تو ہم دونوں بیٹھے رہے کہ ہمیں بیٹھا نہ لینا تھا۔ تیمور نے ہمارے لیے کافی آرڈر کر دی تھی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہماری یہ ملاقات کسی خاص مقصد کے تحت طے ہوئی تھی؟“ ڈاکٹر معظم کے انداز میں شکوہ تھا۔ میں خاموش رہی۔

”آپ کو میری شرافت پر شبہ تھا جو اپنی حفاظت کے لیے اس ”باتونی“ کو لے کر آئی ہیں؟“

”پلیز ڈاکٹر معظم! وہ میرا بھائی ہے..... میں نے آپ کی شرافت پر کیوں شبہ کرنا تھا۔ مجھے خود پر اعتماد ہے۔“

”آپ کو خود پر اعتماد ہے تو کیا تیمور کو آپ پر اعتماد نہیں.....؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں چاہتی تھی کہ اگر وہ آپ کے بارے میں کچھ جانتا چاہتا ہو تو میرے بھائی کی حیثیت سے وہ خود آپ سے پوچھ لے.....“

”اور وہ غالباً یہ بات بھول گیا ہے..... اور اپنے بارے میں تفصیل یوں بتا رہا ہے جیسے میں اس کی محبوبہ کا بھائی ہوں اور اس کے بارے میں ”بہت کچھ“ جانتا چاہتا ہوں۔“ خفگی سے ڈاکٹر معظم نے کہا تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔

”کس بات پر ہنس رہی ہیں؟“

”میں آپ کی محبوبہ کب سے ہو گئی؟“ میں نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

”جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے اور آپ کو میری محبوبہ ہونے پر شک کیوں ہے؟ محبوبہ وہی ہوتی ہے ناں جس سے محبت ہوتی ہے، اور مجھے آپ سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔“ ڈاکٹر معظم کا لہجہ خمار آلود تھا۔

”ڈاکٹر معظم! ہم کوئی کم عمر نوجوان نہیں ہیں جو یوں پہلی نظر کی محبت میں گرفتار ہو جائیں۔“ میں نے ہنسی روک کر کہا۔

”یہی میں آپ کو سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ ہم میچور لوگ ہیں اور کسی تیسرے کی موجودگی کے بغیر اپنے معاملات بہتر طریقے سے طے کر سکتے ہیں۔“

”تیمور تیسرا نہیں ہے.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔ تیمور واپس آ گیا تھا۔

”میرا اٹھ کر جانا اچھا شگون ثابت ہوا کہ آپ دونوں آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔ ورنہ جب تک میں یہاں بیٹھا تھا آپ لوگ گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے تھے اور فقط میں ہی بول رہا تھا۔ میری تو قسم سے زبان بھی تھک گئی بول بول کر اور اوپر سے ڈاکٹر معظم بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں کتنا باتونی ہوں، حالانکہ آپ کو تو علم ہے بھابی کہ میں غیر ضروری گفتگو نہیں کرتا.....“

”مجھے تو علم ہے مگر ڈاکٹر صاحب کو تو نہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”بس اب میں چپ بیٹھوں گا اور آپ دونوں باتیں کریں۔ اور اگر میری موجودگی آپ کی خاموشی کی وجہ ہے تو میں ڈنر ختم کر کے گھر چلا جاتا ہوں، آپ دونوں ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ کریں یا لانگ ڈرائیور پر چلے جائیں۔“ تیمور نے تجویز پیش کی۔

”دونوں ہی آئیڈیاز اچھے ہیں، خصوصاً لانگ ڈرائیو والا.....“ ڈاکٹر معظم نے مسکرا کر کہا۔

”ویسے وہ کافی رسک والا آئیڈیا ہے، کہیں کسی پولیس والے نے روک کر نکاح نامہ مانگ لیا تو؟“ تیمور نے خبردار کیا۔

”پھر تو مجبوری ہے کہ یہیں بیٹھ کر گفتگو کرنا ہوگی۔“ ڈاکٹر معظم نے بے چارگی سے کہا۔

”میں چلتا ہوں، بھابی کو پھر آپ گھر چھوڑ دیں گے؟“ تیمور اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھو تیمور، میں تمہارے ساتھ ہی چلی جاؤں گی.....“

”میں ایک شریف آدمی ہوں ماہا! اس طرح تو میں اپنی توہین محسوس کروں گا۔“ ڈاکٹر معظم نے کہا تو میں ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ تیمور چلا گیا اور ہم دوسرے کمرے میں ایک صوفہ پر جا کر بیٹھ گئے۔

”اپنا خیال رکھا کریں ماہا! آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں، خود پر تھوڑی سی توجہ دی ہے تو آپ کا چہرہ فریش لگ رہا ہے.....“

”بڑا جانتے ہیں آپ عورتوں کی باتوں کو.....“

”آپ جانتی ہیں کہ آپ میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت نہیں ہیں، خدا کرے کہ



اتنا انتظار کیا ہے چند ماہ میری خاطر اور سہی.....“

”جو آپ کی رضا!“ اس نے ہتھیر ڈال دیئے، ”لیکن امی تو اندر ہی اندر فنکشن کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور ہمارے آدھے خاندان کو علم ہے کہ معظم کا نکاح ہونے والا ہے۔ اگر آپ رضامند ہو جائیں تو خالی خولی ایجاب قبول کی بجائے اگر ممکن کے نام پر رسم ادا ہو جائے اور پھر خاندان بھر میں اعلان بھی ہو جائے گا۔“ معظم نے درخواست دی۔

”جس طرح آپ مناسب سمجھیں، لیکن سادہ اور مختصر تقریب ہو۔“ میں نے ہتھیر ڈال لے ہوئے کہا۔

”بہت بہت شکریہ ماہا!“

”کس بات کا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”آپ نے میرا مان رکھا..... اور آپ کے ان الفاظ کا مطلب ہے کہ آپ نے میرا رشتہ قبول کر لیا ہے۔“ وہ خوشی سے کہہ رہے تھے۔

”آپ کی عزت میری عزت ہے اور آپ کی خوشی میری خوشی!“ میں نے انہی کا فقرہ ان کو

لوٹا دیا۔

”تم بہت اچھی ہو ماہا، بہت پیاری!“ شدت جذبات سے وہ ”آپ“ سے ”تم“ پر آگئے۔ ”اٹھو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں، ورنہ کہیں میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھوں۔“ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ان کی تقلید میں باہر کو روانہ ہوئی۔ معظم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے مجھے احساس تحفظ بھی تھا اور احساس سکون بھی۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر انہوں نے آٹو بیگ مٹن دبا کر گاڑی کا لاک کھولا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں خاموش نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ دوسری طرف سے آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

”بہت شکریہ ماہا! میرے ساتھ بیٹھ کر تم نے مجھ پر اعتماد کا عملی اظہار کر دیا ہے۔“ اس نے

مشکورہ لہجے میں کہا۔

”آپ کو بار بار یقین دہانی کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہئے!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”ایک بات پوچھوں؟ ناراض نہ ہونا.....“

آخری ثابت ہوں۔“ ان کی آواز میں جذبات سے لہجہ بہت خوبصورت تھا۔ ”اور اگر میں آپ کو اچھا لگتا ہوں تو کہہ دینے میں کیا حرج ہے؟“

”آپ سے میں نے کب کہا یہ؟“

”یہی تو کہہ رہا ہوں کہ جو بات آپ کی آنکھیں کہتی ہیں اسے زبان کو بھی کہنے دیا کریں۔“

”پلیز ڈاکٹر معظم!“

”ڈاکٹر میرا نام نہیں ہے..... پیشہ ہے میرا اور نام معظم ہے، مجھے میرے نام سے بلایا کریں۔“

”جب وقت آئے گا تو سیکھ لوں گی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”یہی تو وقت ہے، بعد میں تو پھر آپ کہیں گی سنے کے ابایا نغمی کے پاپا!“ اور میرے بدن کا سارا خون سمٹ کر میرے گالوں میں آگیا ہر جھکا لیا تاکہ وہ شرمیلیں مسکرا ہٹ ڈاکٹر معظم نہ دیکھ سکیں۔

”بس ایک درخواست کرنا تھی اور ایک بات کا شکریہ کہنا تھا۔“ میں نے ہمت کر کے کہا۔

”فرمائیے؟“

”شکریہ اس بات کا کہ آپ نے میرا مان رکھا.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”آپ کی عزت کو میں ابھی سے اپنی عزت اور آپ کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہوں۔“

”درخواست یہ ہے کہ اگر کورس کے دوران تیور نہ آ سکے تو نکاح پر اصرار نہ کریں۔ فی الحال زبانی ایجاب و حلیم ہو جائے تو ممکن یا نکاح بعد میں، جب آپ اگلی دفعہ آئیں گے۔“ میں نے

رک رک کر فقرہ مکمل کیا۔

”بوی لمبی زنجیر کا آخری سرا پکڑا دیا ہے آپ نے انتظار کرنے کے لیے.....“

”وقت گزرتے چٹا بھی نہیں چلا۔“ میں نے دلا سدا دیا۔

”درست کہہ رہی ہیں، لیکن صرف تب جب وقت گزارنے کو ساتھ کوئی ہو۔ تنہائی کی تو ایک شب نہیں کتنی، یہ مجھ سے اور آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ ہم دونوں ایک جیسی راہوں کے مسافر ہیں۔“ ان کے کہنے پر میری آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ اپنی تنہائی تو میں کاٹ ہی رہی تھی۔ اب اس میں معظم کی تنہائی کا احساس بھی شامل ہو گیا تھا۔ مگر میں تھوڑا وقت چاہتی تھی۔

”کاش آپ کی زندگی میں کبھی میری اہمیت بھی اتنی ہو جائے جتنی تیور کی ہے۔“

”معظم!“ میں نے بمشکل ادا کیا، ”خود کا موازنہ تیور کے ساتھ کیوں کرتے ہیں؟ پلیز جہاں

”اگر ناراض ہونے والی بات ہے تو نہ پوچھیں۔“

”یوں ہی تجسس ہو رہا تھا۔“ انہوں نے اصرار کیا۔

”پوچھیں۔“ میں نے اجازت تو دے دی لیکن دھڑکا سا لگ گیا جانے کیا پوچھ بیٹھیں۔

”غالب آپ کو کیا کہہ کر بلاتے تھے؟ یہی نام تھا ناں آپ کے پہلے شوہر کا؟“ میرے دل کی کئی دھڑکنیں Miss ہو گئیں جیسے۔

”غالب مجھے ماہا ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ اور پلیز آپ کو جو کچھ اس سلسلہ میں پوچھنا ہے، آج ہی پوچھ لیں اور پھر اس کے بعد یہ ذکر ہمارے درمیان نہیں آنا چاہئے۔ جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور پھر ہمارے نئے رشتے کی شروعات سے ہماری زندگیوں میں وہ باب بند ہو جانے چاہئیں۔ اگر کبھی یاد آئے بھی تو وہ ہمارا ذاتی معاملہ ہوگا۔“ میں نے آنسوؤں کی نمی کو حلق میں اتار لیا۔

”تمہیں برا لگا ماہا! مجھے معاف کر دو۔“ انہوں نے معذرت کی۔

”ٹھیک ہے، آج پوچھ لیں، لیکن آئندہ کے لیے بھول جائیں۔“

”تم نہیں پوچھنا چاہو گی کچھ بھی میری پہلی بیوی یا بیٹی کے بارے میں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جواب اس دنیا میں اور ہماری زندگی میں ہوگی ہی نہیں اس کے بارے میں تو کچھ نہیں البتہ آپ کی بیٹی کے بارے میں ضرور کچھ پوچھوں گی۔“ میں نے کہا۔

”وکیلیم، کیوں نہیں، پوچھو..... کیا پوچھنا ہے؟“

”نام کیا ہے؟ کتنی بڑی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ آپ سے ملتی ہے کہ نہیں؟“ میں نے اکٹھے ہی

ڈھیر سارے سوالات داغ دیئے۔

”نام ہے اس کا انامیکا..... پانچ سال کی ہے..... اپنی خالہ کے پاس رہتی ہے اس کی خالہ کا نام رابعہ ہے..... اس کی ماں کا نام زرتاشیہ تھا اور میں جب کبھی فرصت ملتی ہے تو اس کی خالہ کے ہاں اس کو ملنے چلا جاتا ہوں، کبھی کبھار اسے شاپنگ بھی کروا دیتا ہوں..... اور ویک اینڈ پر ملتا ہوں کیونکہ وہ اسکول جانے لگی ہے اب.....“ معظم نے میرے سوالوں کا بالترتیب جواب دیا۔

”انامیکا؟ عجیب سا نام ہے، اس کا کیا مطلب ہوا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے جس کا کوئی نام نہ ہو، یہ نام زرتاشیہ نے ہی رکھا تھا۔ پہلے ہمیں اس کا مطلب نہیں آتا تھا۔ اس نے کہیں سنا تو اسے اچھا لگا.....“ مجھے بہت عجیب سا لگا اور سوچا کہ اگر کبھی

وہ بچی میرے پاس رہنے لگی تو میں اس کا نام تبدیل کر دوں گی۔“ اگر میرا بیٹا بھی ہوتا تو میں ان دونوں بچوں کو کتنے پیار سے رکھتی.....“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب تو جانے یہ یادیں بھی ذہن سے کھرچ کر پھینک دینا ہوں گی۔

”آپ کا جی نہیں چاہا کہ آپ کی بیٹی آپ کے پاس رہے؟“ میرے منہ سے سوال پھسل گیا۔

”جی چاہتا بھی تو لازم نہیں کہ دل کی ہر بات مانی جاسکے۔ میری مصروفیت ایسی ہے کہ میں

اسے سنبھال بھی نہ پاتا۔ گھر میں کسی عورت کی موجودگی کے بغیر بچی کیسے سنبھالی جاسکتی تھی.....“

”تو آپ دوسری شادی کر لیتے؟“ میں نے تجویزی، ”فوری طور پر بچی کی خاطر۔“

”فوری طور پر تم ملیں نہیں اور میں کسی اور سے شادی کیسے کر لیتا؟ میرے مقدر میں تم جو

تھیں۔“ میں اس خوبصورت جواب پر مسکرا اٹھی۔

”کتنی عمر تھی انامیکا کی، آپ کی بیوی کی وفات کے وقت؟“ میں نے سوال پوچھ ہی لیا۔

”انامیکا اس وقت ایک سال کی تھی صرف.....“ آہستگی سے معظم نے کہا۔

”چار سال ہو گئے ہیں اس بات کو..... تو گویا آپ کا ساتھ صرف دو سال رہا..... ہمارا تو فقط

چند ہی ماہ کا ساتھ تھا۔“ میرے لہجے میں انامیکا کی کم عمری کی محرومی سے دکھ ہی دکھ بھر گیا تھا۔

”نہیں انامیکا ہماری شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی.....“ معظم نے انکشاف کیا۔

”اوہ، اچھا!“ میں نے اپنا اندازہ غلط ہونے پر کھسیا کر کہا۔

”زرتاشیہ نہیں چاہتی تھی کہ ہمارے بچے ہوں..... وہ انامیکا کی آمد سے بھی خوش نہ تھی۔“

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی، چاہتے ہوئے بھی سوال نہ کیا کہ کیوں؟

”وہ بہت آگے تک جانا چاہتی تھی اپنے پروفیشن میں!“ خود ہی انہوں نے وضاحت کر دی۔

”کیا کرتی تھی وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”دماغی امراض کی ماہرہ.....“ مختصر جواب ملا اور میں سوچ کر رہ گئی کہ اس کے عزائم کیا تھے

مگر زندگی نے دفنانہ کی۔ اور وہ بچی جسے وہ چاہتی بھی نہ تھی تنہائیاں کاٹنے کو دنیا میں آگئی تھی، ”میں

اسے ماں کا پیارا دوں گی۔“ میں نے دل ہی دل میں خود سے عہد کیا۔

گھر آگیا تھا..... گاڑی رُکی تو معظم نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان سے معذرت کی کہ میرے سوالوں نے شاید ان کے دل کو دکھی کر دیا ہوگا، پرانی یادوں کے نیچے ادھیڑ نے سے انہیں تکلیف ہوئی ہوگی۔

”کوئی بات نہیں ماما! اب ہمیں ایک دوسرے کے دکھ اور شکھ کا ساتھی بننا ہے، اور تمہاری بات بالکل ٹھیک لگی مجھے، آج ہم نے اس موضوع پر بات کر لی ہے۔ آئندہ ہم یہ دیکھی موضوعات زیر بحث نہیں لائیں گے۔“ معظم نے رساں سے کہا۔ میں خدا حافظ کہہ کر گاڑی سے نکلی تو گیٹ خود بخود کھل گیا..... سامنے ہی مظہر کھڑا تھا، شعلہ برساتی نظریں لیے ہوئے۔

”کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟“ وہ مجھ سے گویا ہوا۔

”اندراجل کربات کرو مجھ سے چھوٹا!“ میں نے لہجہ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

”میں بڑا ہو گیا ہوں، بہت چھوٹا نہیں رہا..... گھر سے آپ تیمور بھائی کے ساتھ نکلی تھیں اور انہیں گھر آئے ہوئے ایک گھنٹے سے زائد وقت ہو چکا ہے۔“ وہ دھاڑا۔

گھر کے اندر سے تیمور بھی باہر نکل آیا، اس نے مظہر کو آواز دی، جو اس نے سنی ان سنی کر دی۔ ”کون ہے یہ باسنرڈ، جس کے ساتھ آپ اس وقت گھر لوٹ رہی ہیں، کہاں سے آ رہی ہیں اور کیا کر کے آ رہی ہیں؟“ اس کے گھٹیا الفاظ کا مجھ پر اتنا شدید اثر ہوا کہ میں نے دائیں ہاتھ کی بھرپور طاقت سے اس کے بائیں گال پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔ ”یکو اس بند کو اسٹوپڈ!!“ میں چلائی۔

تیمور بھی بھاگ کر لپکا اور ادھر سے معظم بھی گاڑی سے باہر نکلا..... تیمور نے مظہر کو اپنے بازوؤں کے شکبے میں جکڑ لیا..... ”چھوڑیں مجھے..... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا، جس کی خاطر بھابی نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔“ وہ اپنے پیچھے پھردوں کی پوری طاقت سے چیخ رہا تھا.....

خود کو وہ تیمور کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں احساسِ شرمندگی سے رو رہی تھی۔ ”خود کو قابو میں رکھو، پاگل ہو گئے ہو کیا۔ اندر چلو۔ چل کر بیٹھ کربات کرتے ہیں۔“ تیمور نے اسے اندر کی طرف دھکیلا۔

معظم نے میرے نزدیک آکر مجھے کندھے سے پکڑا، پورے استحقاق کے ساتھ، میں چاہتے

ہوئے بھی خود کو اس کی گرفت سے نہ چھڑا سکی۔ تیمور اور مظہر کی تھلید میں ہم بھی اندر کی طرف چلے۔ لاؤنچ میں جا کر ہم سب بیٹھ گئے۔ ایک صوفے پر تیمور اور مظہر بیٹھے تھے، دوسرے صوفے پر معظم میرے ہمراہ بیٹھ گئے۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا.....

”یہ ڈاکٹر معظم ہیں!“ تیمور نے مظہر کو بتایا، ”اور ان کے گھر سے بھابی کے لیے رشتہ آیا ہے، امی جان کا خیال تھا کہ اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرنے سے قبل ان دونوں کو ایک دفعہ مل لینا چاہئے، بھابی اکیلی ہچکچا رہی تھیں اس لیے مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا اور پھر میں ان کو چھوڑ کر آگیا تاکہ وہ لوگ آپس میں بات کر لیں۔“ تیمور کی بات ختم ہوئی تو مظہر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”مجھے بہت افسوس ہے ڈاکٹر معظم! مظہر نے بیوقوفی میں جانے کیا کہہ دیا.....“ تیمور نے معذرت کی۔

”ارے نہیں کوئی بات نہیں، بچہ ہے..... چاہے خود کو لاکھ بڑا سمجھے مگر ہے تو بچہ ہی۔“ معظم نے مسکرا کر کہا، جانے اس ایک مسکراہٹ کو کیوں تک لانے میں انہیں کتنی مشقت کرنا پڑی ہوگی۔

”میں بہت برا ہوں بھابی! میں آپ کو بہت تنگ کرتا ہوں!!“ وہ رو رہا تھا۔ میں نے اپنے آنسو خشک کیے اور اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ بھی مجھے معاف کر دیں.....“ اس نے ہمارے ہوئے لہجہ میں کہا، ”میں غصے میں آکر جانے کیا کیا بول گیا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا۔ اگر مجھے بھی بتا دیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ شام کو میں نے پوچھا بھی تھا کہ کہاں جا رہے ہیں، مگر مجھے کچھ نہیں بتایا، میں سمجھا ماہِ رُخ باجی کے ساتھ ڈنر تھا۔“

”بس یار! کافی ہے اب بس کرو۔ ٹھیک ہے میں بھی سمجھتا ہوں کہ ساری غلطی تیمور اور ماما کی ہے.....“ معظم نے اٹھ کر اسے تسلی دی اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔

”چائے پیئیں گے آپ“ میں نے مروتا پوچھا۔

”کون بتائے گا؟“ اشتیاق سے معظم نے پوچھا۔

”ہم تینوں بہت اچھی چائے بناتے ہیں، جس کے ہاتھوں کی آپ پینا چاہیں!“ تیمور نے کہا۔ ”میں بناتی ہوں۔“ میں اٹھنے لگی۔

”نہیں بھابی! آپ بیٹھیں میں بناتا ہوں۔“ مظہر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو میں اور تم مل کر بناتے ہیں۔“ میں بھی اس کے ساتھ چل دی۔ میں نے چائے چولہے

پر رکھی تو مظہر ٹرے میں برتن نکالنے لگا.....

”آئی ایم سوری بھابی!“ اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے..... ”بس بہت ہو گئی ہیں معذرتیں!“

”بھابی! میں سوری کہتا ہوں لیکن پھر غلطیاں کرتا ہوں۔“

”ہر انسان خطا کا پتلا ہے۔ بس تم اب چونکہ بڑے ہو رہے ہو اس لیے جلد جذباتی ہو جاتے ہو۔ ذرا بولتے وقت احتیاط کیا کرو۔ جانے کہاں سے غلط سلسلہ لفظ سیکھ لیے ہیں تم نے..... اور پھر جب بولتے ہو تو خیال بھی نہیں رہتا کہ کس کے سامنے بول رہے ہو۔ اسی لیے مجھ سے اتنا زور کا تھپڑ کھایا تم نے.....“ میں بھی دل میں شرمندہ تھی۔

”وہ تو واڑھی کی وجہ سے بھی تھوڑی بچت ہو گئی ہے، ورنہ آپ نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔“ وہ ہنسا۔

”آئندہ بچ کر رہنا!“ میں بھی مسکرائی۔

”امی جان کو نہ بتائیے گا پلیز، ورنہ دوسرا تھپڑ ان سے کھاؤں گا.....“

”اوکے، چلو وودھ وان پکڑاؤ، وودھ گرم کیا ہے۔ چینی وان اور تچے بھی ٹرے میں رکھو۔“

میں نے ہدایات دیں۔

”کیسے لگے ہیں آپ کو ڈاکٹر صاحب ویسے؟“ اس نے اچانک سوال کیا۔

”ٹھیک ہیں۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا، ”تمہیں کیسے لگے؟“

”میں نے تو نہ نہیں اچھی طرح دیکھا ہے، نہ ان سے تفصیل سے ملا ہوں۔“

”پھر بھی سرسری دیکھنے میں تمہیں کیسے لگے؟“ مجھے بھی تجسس ہو رہا تھا۔

”میں تو انسانوں کو جاننے اور پرکھنے میں بالکل اناڑی ہوں.....“

”کچھ تو محسوس ہوا ہوگا تمہیں؟“ میں نے اصرار کیا۔

”ٹھیک ہی ہوں گے“ وہ انک کر بولا، ”کچھ مصنوعی سے لگے مجھے!“

”مصنوعی؟“ میں کچھ نہ سمجھی تھی۔

”جیسے کوئی بنا ہوا ہو..... وہ نہ ہو جو وہ نظر آتا ہو۔“ وہ الفاظ کے انتخاب کے معاملہ میں

تذبذب میں تھا۔

”بے سنورے تو وہ ہیں ہی آج خصوصی طور پر اور آج ہی انہوں نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی تبدیل کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کون سا ان کا پہلا ہیئر اسٹائل دیکھ رکھا ہے۔“ وہ بولا۔

”تیور کی منگنی پر بھی تو آئے تھے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”میں نے نہیں دیکھا غور سے اس دن بھی ان کو، نہ ہی علم تھا کہ کون ہیں۔ یوں بھی میں مصروف

ہی رہتا ہوں کام کاج میں۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا، ”آپ کو پسند ہیں تو سب ٹھیک ہے۔“

”بات میری انفرادی پسند کی نہیں ہے۔ میری زندگی میں جو اہمیت آپ لوگوں کی ہے اس

سے کسی کو انکار نہیں۔ مجھے آپ سب کی رائے اور آپ سب کی خوشی عزیز ہے۔ میری زندگی اور

مستقبل کے بارے میں جو بھی فیصلہ ہوگا اس میں امی جان کی رائے کی اہمیت سب سے زیادہ

ہے۔“ میں نے یقین سے کہا۔

”جانتا ہوں! اور آپ بہت اچھی ہیں جو اس بات کا خیال کرتی ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش

رکھے اور اگر امی جان کو یہ اطمینان ہوا کہ ڈاکٹر معظم آپ کو خوش رکھ سکیں گے تو اس سے اچھی کیا

بات ہو سکتی ہے۔ لگ بھگ چار سال ہونے کو آئے ہیں کہ میں نے آپ کو ویسا خوش اور مطمئن نہیں

دیکھا جیسے آپ غالب بھائی کی زندگی میں ہوتی تھیں۔“

”میں خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔ تم سب لوگ ہونا میرے!!“ میں نے ٹرے اٹھائی۔

”بہت سی خوشیاں ہم سب لوگ مل کر بھی آپ کو نہیں دے سکتے۔“ وہ بولا ہی تھا کہ تیور چلا آیا

اور کچن کے دروازے پر ہی کھڑا ہو کر بولا، ”آپ لوگوں کی چائے نہیں گل رہی ہے کیا؟“ میں

چائے کی ٹرے لے کر تیزی سے لاؤنج کی طرف چلی۔

”اسی لیے کہہ رہا تھا کہ میں چائے بنا لیتا ہوں۔“ تیور بولا۔

”کوئی بات نہیں، اچھا ہے ہماری گپ شپ رہی.....“ معظم نے اطمینان سے کہا۔

چائے ختم ہوئی تو معظم نے اجازت چاہی، ”آئی کو میرا سلام کہیے گا اور کہیے گا مجھے ان کے

جواب کا انتظار رہے گا۔“

”جی ضرور، میں کہہ دوں گا۔“ تیور نے کہا اور میں اپنے کمرے میں آئی تو تھکاوٹ اور نیند کی

وجہ سے نہ میک اپ صاف کیا، نہ ہی کپڑے تبدیل کیے۔ تبھی موبائل فون کی تھنٹی بجنے لگی.....

”معظم ہوں گے۔“ دل میں سوچتے ہوئے فون اٹھایا تو اسکرین پر تیور کا نام جگمگا رہا تھا۔

”کیا بات ہے تیور؟“ میں نے فکر مندی سے فون آن کر کے پوچھا۔

”آپ سے بات کرنا تھی.....“

”اس وقت تو میں لیٹ گئی ہوں، نیند آرہی ہے.....“ میں نے آواز میں نیند کا خمار شامل کیا، ”کل بات کر لیں گے، کل چھٹی کا دن ہے۔“

”کل میری فلائٹ ہے کوئٹہ کے لیے، دس بج مجھے گھر سے نکلنا ہے.....“

”فجر کے بعد بات کر لیں گے، پلیز۔“ میں نے درخواست کی۔

”آپ کو واقعی نیند آرہی ہے بھابی؟“ وہ حیرت سے بولا، ”انسان بے چین ہو تو کیونکر سو سکتا ہے؟“

”مجھے کوئی بے چینی نہیں ہے!“ میں نے کہا۔

”تو گویا آپ سکون میں ہیں؟“

”ہاں! مگر کیوں؟ میں سمجھی نہیں!!“ میں نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”بس یہی پوچھنا تھا کہ آپ مطمئن ہیں ڈاکٹر معظم سے مل کر؟“

”تیور صبح باتیں کریں گے.....“ میں نے کہہ کر فون بند کر دیا..... بلکہ اسے آف کر دیا تاکہ

اب کسی کی کال نہ آئے، اب میں سونا چاہتی تھی، سکون کی نیند.....

○ نیند اب میری بھولی ہے

جو روٹھ گئی تھی مجھ سے.....

آنکھ سپنے دیکھنے کو ترستی تھی

بدن مضحل ساتھ ساتھ کاٹھ کا سا

اور کان سرگوشیوں کے منتظر

اب وقت آ گیا ہے

ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں

مجھے آکے کانوں میں کہتی ہیں

اب تیار ہو جانے سپنے بٹنے کو!

تیری روٹھی ہوئی، بھولی تیری نیند

لوٹ آئی ہے تیرے پاس ○

فجر کی نماز پڑھ کر میری عادت لان میں صبح کی سیر کرنے کی تھی، اور میری توقع کے عین مطابق تیور پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اسے تو شاید رات بھر نیند بھی سکون سے نہ آئی ہوگی۔

”لگتا ہے تم سوئے بھی نہیں.....“ اس کی آنکھوں میں لالی اور تھکاوٹ تھی۔

”آپ کی کیا لگتی ہے وہ؟ دیورانی.....“ ہاں، وہ سونے دے تو!!“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”کیا مطلب وہ خواب میں آئی تھی تمہارے.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”جی نہیں..... فون پر ہی وہ اپنی اداسیوں کی داستانیں سنارہی تھی۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”تو تم بھی سنالیتے اپنی مجبوریوں کی داستانیں!“ میں نے اس کی خفگی پر ہنس کر کہا۔

”وہی تو کرتا رہا، اور صبح کے تین بجے محترمہ نے جان چھوڑی.....“

”اندر سے کتنے خوش ہو گے، سب سمجھتی ہوں تمہارے سلسلے.....“

”میرے تو سبھی سلسلے سمجھتی ہیں، کبھی اپنے سلسلوں کی بھی ہمیں خبر تو ہونے دیں.....“ اس

نے بات بدلی۔

”میرا کوئی ایسا سلسلہ ہے ہی نہیں.....“ میں مسکرائی۔

”ہے نہیں تو ہو جائے گا، بس ایک آپ کی ہاں کی دیر ہے.....“ اس نے میری طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”میرا خیال..... ہوں“ وہ شرارت سے بولا، ”میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر معظم صاحب آپ کو

سرتاپا بہت پسند آئے ہیں.....“

”اچھا..... بہت بڑے قیافہ شناس ہو تم؟“

”جی نہیں! قیافہ شناسی نہیں ہے، حقیقی اندازے ہیں۔“

”کس بنا پر اندازے قائم کر رہے ہو؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”فی الحال اپنے اندازوں کی درستی کی حقیقت ثابت کرنے کے لیے دو مثالیں دینا چاہوں گا۔“ وہ مسخرے پن سے بولا۔

”فرمائیے؟“ میں نے اسے گھورا۔

”ہمیں تو چائے پینے کے لیے آپ کی منت کرنا پڑتی ہے اور ڈاکٹر صاحب کو آپ نے خود ہی پوچھ کر، اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔“ اس نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے بائیں ہاتھ کی انگلی کو چھو کر ایک نمبر گنا۔

”شرم کرو! کب تم نے نتیں کی ہیں چائے کے لیے؟“ میں نے اسے مصنوعی غصے سے دیکھا۔  
”اتنے پیار سے پوچھ کر بھی کبھی آپ نے نہیں پلائی۔“ اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی کو اس نے انگشت شہادت سے چھوا..... ”نمبر دو یہ کہ جس منظر سے آپ کو اتنا پیار ہے، اس کے منہ پر تھپڑ آپ نے مارا کیونکہ اس نے ڈاکٹر صاحب سے بد تمیزی کی تھی۔“

”بات بد تمیزی کی نہیں ہے، نامناسب لفظ بولا تھا جو اس نے بولا، اس نے انہیں ”باسٹرڈ“ کہا اور وہ مجھ پر بھی یوں چیخ چیخ کر بول رہا تھا جیسے وہ مجھ پر شک کر رہا تھا.....“

”اوہ! آئی ایم سوری! میں نے سنا نہیں تھا.....“ اس نے معذرت خواہانہ انداز سے کہا۔

”وہ اتنا چیخ رہا تھا کہ تم نے بھی سنا ہوگا اور معظم نے بھی.....“ میں روانی میں کہہ گئی۔

”معظم نے بھی سن لیا ہوگا؟“ تیمور ”معظم نے بھی“ پر زور دے کر بولا۔

”ڈاکٹر معظم نے، میرا مطلب ہے!“ میں کھسیا گئی۔

”میں چاہ رہا تھا کہ آپ کا جو بھی جواب ہو وہ میں آج خود ڈاکٹر معظم کو بتا کر جاؤں۔“ تیمور

نے کہا، ”اگر آپ نے بھائی کو اتنی اہمیت دی تو مجھے اپنا جواب اپنے منہ سے بتادیں۔“

”میں نے تمہاری رائے اور تمہارا فیصلہ پوچھا ہے۔“ میں نے بات پلٹی۔

”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں انہیں ہاں کہہ دوں؟“ تیمور نے میری طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”جو تم مناسب سمجھو اور جو امی جان مناسب سمجھیں۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”پلیز بھائی! میری طرف دیکھ کر بات کا جواب دیں۔ آپ رشتے میں مجھ سے بڑی سہی،

لیکن ہم آپس میں بہن بھائی کی طرح بھی ہیں اور دوستوں کی طرح بھی۔“ تیمور نے اصرار کیا۔

”تو پھر کیا سنا چاہتے ہو تم مجھ سے؟“ میں نے زچ ہو کر کہا۔

”آپ کی رائے۔“ مختصر جواب تھا۔

”اگر دوستی کا دعویٰ ہے تو یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہو!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”آپ اس فیصلے کے لیے کسی قسم کا یا کسی بھی طرف سے کوئی دباؤ تو نہیں محسوس کر رہیں؟“

”نہیں!!!“

”اور یہ فیصلہ آپ قطعی اپنی مرضی سے اور سوچ سمجھ کر کر رہی ہیں؟“

”تیمور! پلیز مجھے زچ نہ کرو.....“ میں نے منت کے انداز میں کہا۔

”کیوں زچ ہو رہی ہیں آپ؟“

”کیونکہ تم مجھے زچ کر رہے ہو۔“

”چلیں تو پھر ہاں کہہ دیں، اچھی لڑکیوں کی طرح.....“

”نہیں کروں گی!“ میں ٹھنکی۔

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ میں لڑکی نہیں ہوں اور دوسرے مجھے شرم بھی آرہی ہے.....“ کہتے کہتے میں ہنس دی۔

”کتنے عرصے کے بعد ہنسی ہیں آپ بھائی؟“ تیمور کے سنجیدگی سے پوچھنے کے سوال سے

میں چونک گئی۔

تیمور کا سامان لاؤنج میں تیار پڑا تھا اور وہ بھی تیار ہو کر نکل آیا تھا۔ نگہت اور اعجاز بھائی بھی آئے تھے، کیونکہ ان کی تو اب تیمور سے ملاقات جانے کب ہوتی۔ میں نے ملازمہ کے ساتھ مل کر اسٹیشل ناشتہ بنایا تھا اور تیمور کے جانے کے خیال سے اداس بھی ہو رہی تھی۔

”پھر کب آؤ گی نگہت؟“ تیمور نے پوچھا۔

”پتا نہیں کب آؤں گی تیمور! خوشی کا اسکول بھی آئندہ برس شروع ہو جائے گا۔ آپ کی شادی

پر ہی لگتا ہے کہ آپاؤں گی۔“ نگہت نے جواب دیا۔

”تو بھائی کی شادی پر نہیں آؤ گی کیا؟“ تیمور کے سوال پر سب کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔

معظم کے والدین، میرے والدین کے ہمراہ آرہے تھے، جمعرات کا دن مقرر ہوا تھا، نگہت اور اعجاز بھی آگئے تھے اور مظہر بھی تھا۔ امی جان نے جب باقاعدہ ہاں کی تو رانی باجی نے اٹھ کر مجھے پیار کیا اور بہت سارے پیسے میری گود میں رکھ دیئے اس سے اگلے جمعہ کی تاریخ منگنی کے لیے مقرر ہوئی۔ میں نے پہلے ہی امی جان اور والدہ سے کہہ دیا تھا کہ کم سے کم رسومات کے چکر میں پڑا جائے اور تقریب انتہائی سادہ ہو۔ امی جان نے رانی باجی سے اپنی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

انہوں نے بلکہ یہ کہا کہ اگر نکاح کا فیصلہ ہو جاتا تو تقریب کا جواز بھی بنتا تھا۔ منگنی کی تقریب پر وہ بھی سادگی کی قائل تھیں۔ پھر مجھ سے انہوں نے ناپ وغیرہ مانگا اور میری پسند وغیرہ پوچھی کہ میں کس رنگ کا جوڑا منگنی پر پہننا چاہوں گی۔ میں نے اس طرح کے سب معاملات انہی پر چھوڑ دیئے کہ جو وہ بہتر اور مناسب سمجھیں کریں۔ اور مجھے پورا یقین تھا کہ منگنی کا جوڑا اگلا ہی ہوگا کیونکہ وہ معظم کا پسندیدہ رنگ تھا۔ شام کی چائے پی کر وہ لوگ رخصت ہوئے۔

امی جان نے ان کے جانے کے بعد مجھ سے کہا عشاء کی نماز کے بعد جب بچے سو جائیں تو نگہت اور اعجاز کے ساتھ مل کر دعائیں کی فہرست بھی بتالوں اور ایک فہرست بتالوں ان لوگوں کی جو ڈاکٹر معظم کی طرف سے منگنی پر آئیں گے۔ میں نے اس پر جرح کرنا چاہی تو انہوں نے مجھے صاف کہہ دیا کہ مجھے وہی کرنا چاہئے جو انہوں نے کہا ہے۔

عبداللہ سو گیا تھا، خوشی جاگ رہی تھی اور اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ میں نماز پڑھ کر آئی تو نگہت چائے بنا رہی تھی اور اعجاز بھائی کا غدقلم سنبھالے بیٹھے تھے، چائے کے دوران ہی نگہت نے فہرست بخوانا شروع کر دی۔ ”پلیز نگہت زیادہ اہتمام اور لمبی چوڑی رسومات کی ضرورت نہیں!!“ میں گھٹکیائی۔

”خود کو اس گھر کا فرد نہیں سمجھتیں آپ؟“ نگہت نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

”بات وہ نہیں ہے، تمہیں بھی علم ہے کہ میرے حالات کیا ہیں؟“

”کیا ہے آپ کے حالات کو؟“ اس نے تنک کر پوچھا۔

”نگہت پلیز، میں کوئی نوجوان لڑکی نہیں ہوں اور نہ ہی یہ میری پہلی شادی ہے“ میں نے

جھجکتے ہوئے کہا۔

”کب ہو رہی ہے بھابی کی شادی؟ کیا فائل ہو گیا سب کچھ؟“ نگہت نے اگلا سوال کیا۔

”بس بیٹا، سب کچھ فائل تو نہیں ہوا، رشتہ فائل ہی سمجھو۔“ امی جان نے کہا، انہیں عادی تیور بتا چکا تھا۔ ”لڑکا دیکھا بھالا ہے اور رشتہ تسلی بخش ہے۔“ میرا سر جھکا ہوا تھا اور میں پوری کوشش کر رہی تھی کہ چہرے کے تاثرات پر قابو رکھوں مگر مجھے شاید اس میں کامیابی نہ ہو پارہی تھی۔

”کیا ہم دھیان سے ناشتہ کر سکتے ہیں؟“ مظہر کے الفاظ میرے لیے کسی مددگار کی طرح ثابت ہوئے اور گفتگو کا موضوع تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد تیور کے بارے میں ہی گفتگو ہوتی رہی اور ہم بچوں کی شرارتوں سے محفوظ ہوتے رہے۔ چائے پیتے ہی تیور جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ اعجاز بھائی اور مظہر کو اس کے ساتھ جانا تھا۔ امی جان ابھی سے اداس ہو رہی تھیں۔ اسے گلے ملنے ہوئے، اس کا ہاتھ چومتے ہوئے ان کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ نگہت بھی اس سے گلے ملنے ہوئے رو پڑی یہ سوچ کر کہ جانے اس کے بعد کب ملاقات ہو۔ میں نے بھی اسے دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا اور پھر ان کے جانے کے بعد امی جان اور نگہت کو تسلی دی۔ ”بھابی! آپ کا آسرا ہے تو کتنی بے فکری رہتی ہے، آپ بھی چلی جائیں گی تو امی جان کا کیا ہوگا؟ اب تو مجھے پردیس میں یہ فکر بھی ستایا کرے گی۔“ نگہت گلوگیر لہجے میں بولی۔

”اب میں اپنی فکر کی خاطر بچی کے مستقبل کا بھی نہ سوچوں نگہت یہ تو بڑی خود غرضی کی بات ہے۔“ میرا اللہ مالک ہے، تم میری فکر ہرگز نہ کیا کرو۔“ امی جان نے کہا۔

”تیور کی شادی ہو جائے گی تو ماہ رخ آجائے گی گھر میں۔“ میں نے کہا۔

”اس میں تو ابھی دو تین سال باقی ہیں!“ نگہت نے کہا۔

”اس سے پہلے مظہر پڑھائی سے فارغ ہو جائے گا تو ہم اس کی شادی پہلے کر دیں گے۔“ میں نے تجویز دی۔

”ہاں یہ خیال اچھا ہے۔“ نگہت اس خیال سے خوش ہو گئی۔

تیور کے جانے سے گھر پر گویا اداسی کی چادر تن گئی تھی۔ نگہت بھی واپسی کی تیاریوں میں تھی اور کئی دفعہ مجھے اس کے ساتھ شام میں شاپنگ کے لئے جانا پڑتا۔ مصروفیت میں دن گزرنے کا ہمتا بھی نہ چلتا۔ اور پھر ایک دن کال کر کے رانی باجی نے بتایا کہ وہ ہمارے ہاں آکر منگنی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتے تھے اور میرا کپڑوں اور جوتوں کا ناپ وغیرہ بھی لینا تھا۔

”تھوڑی بہت رسمیں تو دنیا داری کے لئے بھی کرنا ہوتی ہیں اور بالکل سادہ سی تقریب ہوگی۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ باہر سے کوئی مدعو نہ ہوگا اور باقی بات لین دین کی رہی، وہ تو زندگی بھر ہوتا ہی رہتا ہے۔“ نگہت نے وضاحت کی۔ پھر وہ اور اعجاز مل کر فہرستیں بناتے رہے، میں خاموشی سے خوشی کے ساتھ مصروف رہی۔

”بھابی! آپ نے کسی کو بلانا ہو؟ اپنی کوئی سہیلی وغیرہ۔“ اس کے پوچھنے پر میرے ذہن میں زار اور اس کے گھر والوں کا خیال آیا، لیکن پھر اس خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔ اس طرح تو ان سے بہت قریبی بہت سے عزیز اور رشتہ دار تھے جن کو ہم نہ بلا رہے تھے۔

”ماہا بھابی! معظم کون سے ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں لندن میں؟“ اعجاز بھائی نے پوچھا۔

”مجھے تو نہیں معلوم!“ میں نے سادگی سے کہا۔

”کیا مطلب؟ اتنی اہم بات آپ لوگوں نے پوچھی ہی نہیں..... لگتا ہے تفصیلی جانچ پڑتال نہیں کی گئی۔“

”اس طرح کی جانچ پڑتال میں تو نہیں کر سکتی۔ صدف آپ کی جیٹھ کا بیٹا ہے اور غالباً یہ بات ہی خاصی تلی کی ہے۔“ میں نے آہستگی سے وضاحت کی۔

”باہر رہنے والے چمڑوں کے بارے میں خاص طور پر جانچ پڑتال کی ضرورت ہوتی ہے، بسا اوقات وہ اپنے والدین سے بھی غلط بیانیاں کر دیتے ہیں.....“ اعجاز بھائی نے کہا۔

”ایسے معاملات میں تو اعتبار زبان پر ہی کیا جاتا ہے، آپ کے معاملے میں بھی تو ایسا ہی تھا.....“ میں نے کہا۔

”میری بات اور تھی، میری فیملی کو آپ لوگ دیکھ اور پرکھ سکتے تھے۔ اور میں یہاں تعلیم مکمل کر کے اسپیشلائزیشن کے لئے گیا تھا اور ڈاکٹر معظم تو غالباً دوران تعلیم ہی باہر چلے گئے تھے.....“

”مجھے واقعی اتنی تفصیل کا علم نہیں ہے.....“

”اور پھر اگر میرے معاملہ میں بالفرض آپ نے جانچ پڑتال نہیں کی تو اس کی وجہ یہ کہ اس وقت کوئی ذریعہ نہ تھا کیا لازم ہے کہ اس پرانی غلطی کو پھر دہرایا جائے۔ اب میں وہاں موجود ہوں تو چیک کر سکتا ہوں کہ کیا حالات ہیں۔“

”مگنی کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور اب یہ سب باتیں لایعنی ہیں اس لیے اس بحث میں نہ

پڑیں اعجاز!“ نگہت نے کہا۔

”مگنی کوئی ایسا بندھن نہیں ہے جو ٹوٹ نہ سکے.....“ میں نے چونک کر اعجاز بھائی کو دیکھا۔ کسی باتیں کر رہے تھے وہ۔ اس خوبصورت رشتے کو جو میرے اور معظم کے بیچ قائم ہونے جا رہا تھا وہ ختم کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اعجاز، اور کسی بے رحمی سے.....“ نگہت نے کہا۔

”آئی ایم سوری ماہا بھابی اور نگہت، لیکن زندگی کے اتنے اہم فیصلوں کی بابت اگر حقیقت پسندی سے بات کی جائے تو اسے بے رحمی نہیں کہتے..... میں صرف اس بات کی ضمانت چاہتا ہوں کہ بھابی نے اتنے سال آزمائشوں کی زندگی گزاری ہے، وہ ابھی بھی کم عمر اور اسماٹ ہیں اور ٹیلنٹ بھی ہے۔ انہیں رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہئے.....“

”تو آپ چاہ رہے ہیں کہ مگنی نہ ہو؟“ نگہت نے ابرو اچکائے۔

”یہ میں نے نہیں کہا۔ مگنی ہو جائے، لیکن میں اس کے بعد بھی اپنی تسلی کرنا چاہوں گا۔“ اعجاز بھائی نے حتی انداز میں کہا اور باقی ماندہ فہرستیں مکمل کرنے لگے۔ کام ختم ہوا تو ہم اٹھے اور اپنے کمرے میں آکر میرے رُکے ہوئے آنسو بہہ نکلے..... یونہی پراگندہ سوچیں ذہن میں آنے لگیں۔ اعجاز بھائی نے ایسی باتیں کیوں کہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہہ اوپری دل سے میری مگنی کی تیاریاں تو کر رہے ہوں لیکن اندر سے یہ لوگ خوش ہی نہ ہوں۔

مجھے لگا نگہت اگرچہ بظاہر اعجاز بھائی کی باتوں کی مخالفت کر رہی تھی اور ان کی باتوں کو برا محسوس کر رہی تھی، مگر ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ بات پہلے سے اس طرح طے کر رکھی ہو کہ اس طرح باتیں کریں گے۔ شاید وہ چاہتے ہوں کہ میں معظم سے بدگمان ہو کر انکار کر دوں اور ان کی ماں کے گھر کی گاڑی بنا کسی غلطی کے چلتی رہے۔ بسا اوقات مگنی خود غرضی سے انسان فقط اپنے ہی مفادات کی بابت سوچتا ہے“ میں نے نگہت کی خود غرضی پر دل سے برا سوچا۔

اور نیند جو بمشکل ہی میری ہجولی بنی تھی، پھر مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ میں دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ قسمت کے اس نئے رخ پر سوچتی رہی..... اور بالآخر یہی نتیجہ نکالا کہ اگر میری خوشیوں کے راستے میں نگہت اپنی خود غرضی کی دیواریں تعمیر کر رہی ہے تو مجھے بھی خود غرض ہونا پڑے گا۔



دفتر سے ہی میں نے امی جان کو کال کر کے کہہ دیا تھا کہ میں والدہ کی طرف جاؤں گی۔ اصل میں مجھے مظہر علی کے ہاں بھی جانا تھا۔ ذرا جلدی اٹھ کر میں نے راستے سے والدہ کے لئے سرخ مٹائوں کا گلہ سہ لیا اور مظہر علی کے گھر کے لئے تھوڑا پھل اور مٹھائی لی۔

والدہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ ابو بھی بہت خوش ہوئے۔ شام کی چائے ان کے ساتھ پی۔ تنہائی پا کر میں نے والدہ سے کہا کہ ابو یا علی بھائی میں سے کوئی ڈاکٹر معظم کے بارے میں تسلی کر لے۔ ”مٹکنی کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور اب تم یہ نیا شوشہ چھوڑ رہی ہو!“ والدہ جھنجلائیں۔

”والدہ! میں نے کوئی مٹکنی کو مشروط تو نہیں کر دیا، مجھے علم ہے کہ مٹکنی ہو رہی ہے۔ مگر اتنا تو ہمارا حق ہے ناں کہ ہم دوسرے فریق کی بابت اپنی تسلی کر لیں۔“

”بیس سال سے زیادہ عرصہ صدف کی شادی کو ہو گیا ہے۔ ابھی تک مجھے اس کی سسرال کی طرف سے کوئی کسی قسم کی شکایت نہیں ہوئی اور اس کی جھٹائی اگرچہ زیادہ گھٹنے ملنے والی نہیں مگر صدف سے اس کا رویہ ہمیشہ اچھا ہی رہا ہے۔“

”کیونکہ اس سے پہلے اس طرح کے حالات سامنے ہی نہیں آئے۔ اور ڈاکٹر معظم کے بارے میں اس لیے نہیں چیک کیا جانا کہ وہ صدف آپنی کے جیٹھ کا بیٹا ہے، بلکہ اس لیے کہ اس خاندان میں ہمارے ایک نئے رشتے کی بنیاد پڑنے والی ہے۔“ جانے کیسے اتنی بہادری سے میں نے وہ سب باتیں کر لیں۔

”چلو اگر تمہیں کسی نے کوئی نیا دہم ڈال دیا ہے تو میں علی سے کہوں گی کہ اس کے بارے میں تسلی کر لے۔“ والدہ نے مجھے اطمینان دلانے کو کہا۔ میں نے ان سے اجازت چاہی اور روانہ ہوئی۔ مظہر علی کے گھر پہنچنے سے قبل میرے پہنچنے کی اطلاع وہاں پہنچ چکی تھی، کیونکہ میں نے مظہر علی سے ذکر کیا تھا۔ مجھے اس روز سب کے چہروں پر ایک انوکھی خوشی کا احساس نظر آیا۔ اور میری خاطر تواضع بھی تو وہ لوگ اس دن خصوصی طور پر کر رہے تھے۔ میں نے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ کیوں وہ لوگ تکلف کر رہے ہیں؟

”بیٹا ہم پر تو تمہارے احسانوں کا اتنا بوجھ آن پڑا ہے کہ جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔“ آنٹی نے کہا۔

”بلیز آنٹی! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ یہ سب اللہ کا کرم اور احسان ہے آپ پر!“

”پھر بھی بیٹا تمہیں یوں اتنی کم عمری میں اتنی فہم و فراست اس نے عطا کی ہے کہ اپنے سے بڑے بڑوں سے بڑھ کر عقلمند ہو، اور تمہاری سمجھداری تو بڑے بڑوں کو مات دیتی ہے۔“

”آنٹی! پکیز! میں بہت شرمندہ ہو رہی ہوں۔ میں عقلمند کب ہوں؟ آپ کبھی میری والدہ سے بات کریں تو وہ مجھے اب بھی بیوقوف سمجھتی ہیں۔“ میں ہنس کر بولی۔

”ماؤں کی نظر میں تو بچے ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں، ان سے عقلمندی ”سرزد“ ہو بھی جائے تو وہ انہیں بہت چھوٹی لگتی ہے۔ کیونکہ بیٹیوں کی فہم و فراست ماؤں کی تربیت کا نتیجہ ہی تو ہوتی ہے۔“ آنٹی نے وضاحت کی۔

”درست کہتی ہیں آنٹی! اور سنائیں اداس ہیں اس گھر کو چھوڑنے پر؟“ میں نے موضوع بدلا۔

”کوئی خاص نہیں بیٹا! اس گھر سے ہماری انیسیت بہت پرانی نہیں ہے۔ پہلے ہمارے پاس اس سے بہت بہتر گھر تھا، پھر زارا کے ابو کی وفات نے حالات کا رخ بدل دیا تو تنگی ہونے لگی، اس گھر کا ایک پورشن کرایے پر دے دیا، صدف علی کی بیماری، آپریشنز اور پھر جواں مرگی کے باعث ہم نے بڑا گھر بیچ کر یہ وقتی ٹھکانہ کر لیا، اس گھر کی ساری رقم بھی ختم ہو جاتی اور یہ عارضی سا گھر بھی پک جاتا اگر صدف علی زندہ رہتا اور ہمیں حریف کچھ عرصہ اس کا علاج کروانا پڑتا۔ بس یہ گھر اور بیٹیوں کی شادی کے لیے بس انداز کی ہوئی کچھ رقم میرے پاس رہ گئی تھی۔“ وہ اس ذکر پر ہمیشہ کی طرح آبدیدہ ہو گئیں۔

”اوہو! مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسے حالات ہوئے۔“ اور میں تصور کر سکتی تھی کہ کس طرح وہ ایک خوشحال زندگی گزار رہی ہوں گی اور پھر پے در پے حادثات نے انہیں اس نوبت کو پہنچا دیا تھا۔ اسی لیے ان کے انداز میں مجھے کبھی غربت کی ایسی جھلک نظر نہ آئی تھی جسے کمینگی یا لالچ کا نام دیا جاسکے۔ ”تو آنٹی وہ رقم آپ نے مظہر علی کو کیوں نہ دی کہ وہ کوئی کاروبار شروع کر لیتا؟“ میرے لبوں پر سوال آیا۔

”کئی بار خیال آیا تھا بیٹی، لیکن بچہ ہی تھا ناں اور پھر وہی رقم میرے پاس بچی تھی کہ بچیوں کو عزت سے ٹھکانے لگا سکتی۔ لیکن ان حالات میں تو میری خوبصورت اور سلیقہ شعار بچیوں کے لیے بھی رنڈوے، دوہاجے اور عمر رسیدہ رشتے آنے لگے۔ یہ تو ہمارے مقدر اچھے تھے جو تمہاری ملاقات مظہر علی سے ہو گئی اور اس دن سے ہمارے دن پھرنے لگے ہیں۔ میں تو شاکر تھی کہ اللہ

سو ہنا جس حال میں بھی رکھے، گھر کا ہر فرد کام کرنے لگا کہ زندگی کی گاڑی کھینچتی رہے۔ کم آمدنی میں بھی میں نے توکل کیا۔ کمیائیں ڈال ڈال کر بیچوں کی شادیوں کے لیے جمع شدہ رقم میں اضافہ ہی کرتی رہی۔“

”بس آئی آپ نے ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا، اسی لیے آج آپ کو آگے بہتر مستقبل نظر آ رہا ہے۔“

”اللہ تمہیں بھی حیاتی دے اور ہمیشہ خوش رکھے۔ مجھے تو تم اپنی بیٹیوں جیسی ہی لگتی ہو۔ اللہ تمہارے لیے بھی کوئی بہت بہتر راہ نکالے بیٹا! اتنی لمبی زندگی یوں کب تک اکیلے گزار دیگی؟“

”آئی تیور کے لیے سوئٹرز نے بنا تھا؟“ میں نے موضوع بدلا کیونکہ چائے لے کر تینوں بہنیں اور مظہر علی بھی آگئے تھے، گھر کے بنے ہوئے پکڑے، سموے، شامی کباب اور بازار کی گلاب جامنیں..... بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی بہت سارا کھا گئی اور اجازت چاہی۔

”میڈم کل مجھے دفتر سے ہی جانا ہے گھر کے سلسلہ میں میٹنگ کے لیے..... لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ اس گھر کو دیکھ لیتیں تو؟“ مظہر علی نے جھجک کر کہا۔

”ٹھیک ہے دفتر پہنچ کر مجھے یاد کروادینا اور اکٹھے ہی چلے چلیں گے.....“ میں نے جوابا کہا۔

”نہیں میڈم! مجھے پکھری وغیرہ سے کچھ کاغذات اور اسٹام پیپر وغیرہ لے کر آنا ہوگا۔ میرے دوست کے والدین بھی وہیں پر ہوں گے اور اس کی آئی بھی..... آپ کو میں ایڈریس سمجھا دوں گا آپ سیدھی وہیں پہنچ جائیں!“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں خود آ جاؤں گی۔“ واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ باتوں میں وقت گزرنے کا علم ہی نہ ہوا تھا۔ میں بھی دل سے مطمئن تھی کہ میری ذرا سی کوششوں سے کسی گھر میں خوشیوں اور امیدوں کے کئی چراغ جل اٹھے تھے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس حیثیت میں ہوتے ہیں کہ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں لیکن نہیں کرتے۔ ساری بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق کی ہوتی ہے۔ وہ جسے نیکی کی توفیق دے اور جس کے دل میں دوسروں کے لیے ہمدردی اور پیار کے جذبات ڈال دے۔ وہی لوگ دوسروں کے کام آ کر خوشی محسوس کر سکتے ہیں۔

ڈرائیونگ کے دوران ہی مجھے پھر اعجاز بھائی کا رویہ یاد آیا اور چنی رد پھر بھٹکنے لگی۔ کبھی کوئی سیدھا خیال آتا تو ساتھ ہی ایک الٹا خیال بھی آ جاتا اور میرے ذہن میں یہ خیال راسخ ہونے لگا کہ میری بھینسی اور شادی کے لیے تشویش ظاہر کرنا غالب کے گھر والوں کا ڈرامہ تھا اور اب جب واقعی حالات نے ایسا ثابت رخ اختیار کیا تھا تو انہوں نے الجھن کھڑی کر دی تھی۔

دفتر سے میں مظہر علی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچی تو ایک گھر کا پلستر شدہ ڈھانچہ نظر آیا۔ وہیں پر نوید صاحب تھوڑی دیر کے بعد آگئے، مظہر علی کی والدہ ایک ٹیکسی پر آئیں اور اس کے بعد مکان کی مالکہ، جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ کوئی بوڑھی یا کم از کم اڈیڑ عمر کی عورت ہوگی، بمشکل پچیس سے تیس سال کے بیچ ان کی عمر ہوگی۔ دھان پان اور خوبصورت نقش و نگار والی۔ چہرے پر مسکراہٹ اور سوگوار کی کا احتجاج۔ اس نے آکر ہمیں سلام کیا اور اپنا تعارف کر دیا۔

فریحہ نام کی وہ پیاری سی، نرم لہجہ والی اور قسمت کی خرابی کا شکار۔ شادی کے دو سال کے بعد ہی شوہر کی اچانک وفات کی وجہ سے اس نے زیر تعمیر گھر کو بیچ دینے کا عزم کر لیا تھا جو اس کے مرحوم شوہر کے خوابوں کی تعبیر تھا، اب وہ کس دل سے اس تعبیر کو اکیلے دیکھتی۔

”میں واپس اپنے والدین کے ہاں جا رہی ہوں۔ میری عدت پوری ہو گئی ہے۔ سرال والوں نے مجھے اتنے عرصہ میں اپنی اصلیت دکھا دی ہے اور یہ گھر جس کی زمین میرے والدین نے مجھے خرید کر دی تھی اور میرے شوہر اس پر مکان تعمیر کر رہے تھے اور اس مکان کے حصول کے لیے میرے سرال والوں نے مجھ پر کتنا دباؤ ڈالا، تب میں نے بدل ہو کر اسے بیچنے اور واپس جانے کا سوچا ہے۔“ فریحہ نے وضاحت کی۔

”تو آپ اسے بھوکا کرایے پر دے دیتیں، ایک مستقل ذریعہ آمدنی بن جاتا۔“ میں نے تجویز دی۔

”مجھے پیسے کی اتنی ضرورت نہیں ہے ماہا! میری سرال والے میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتے تو میں یہ گھر انہیں یونہی دے دیتی۔ مگر ان کے ردیے نے مجھے اس عمل پر مجبور کیا۔ تب مجھے اپنے ایک بھائی کی سرال والوں کے توسط سے یہ گھر فروخت پر لگانا پڑا اور اسے ادنے پونے بیچ

رعی ہوں۔“

”جب کبھی آپ پاکستان آئیں گی تو؟“ میں نے ادھر اور اس سوال کیا۔

”سعودیہ میں میرے بھائی کے ایک دوست ہیں جن کی اپنی بیوی کے ساتھ اختلافات کے باعث علیحدگی ہو گئی تھی۔ میرے والدین ان کے ساتھ میری رضامندی سے میرا رشتہ طے کر چکے ہیں۔ میں وہاں جاؤں گی تو جلد ہی ہمار نکاح ہو جائے گا، انشاء اللہ۔“ فریجہ نے مجھے بتایا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کے شوہر کی وفات کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“ میرے منہ سے سوال پھسل گیا۔

”تین ماہ۔“ اس نے مختصر کہا۔

”ابھی تو آپ کی عدت بھی پوری نہیں ہوئی؟“ میں نے حیرت سے کہا، ”اور اس دوران میں

آپ کے گھر والے آپ کا رشتہ کیسے طے کر سکتے ہیں؟“

”میرے شوہر کی وفات کے وقت میں پریکٹس تھی اور ان کے قتل سے اگلے دن ہی میرا ابارش ہو گیا تھا۔ اس طرح شرعاً وضع حمل تک میری عدت تھی۔“ اس نے مجھے مختصر آیتایا۔ میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ میری ہی طرح کے حالات تھے، مگر یہ شاید میری لاعلمی تھی کہ میں نے انہی حالات کے باوجود اپنی چار ماہ اور دس دن کی عدت پوری کی تھی۔ تاہم میں شرمندگی کے باعث خاموش ہی رہی۔

”ماہ! میں نے وقت کے ہاتھوں بہت جلدی بہت کچھ سیکھ لیا ہے، ان تین ماہ میں ہی میں نے انسانوں کے ایسے ایسے انداز دیکھے ہیں، شخصیتوں کے اترتے ہوئے پرت دیکھے ہیں کہ مجھے اس عمر میں بھی کئی سالوں کا تجربہ مل گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میرے انداز اور سوچ پر تعجب ہو رہا ہے، لیکن میں نے زندگی کا جو بھی فیصلہ کیا ہے وہ بالکل شرعی ہے اور اس میں تاخیر کا کوئی جواز نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرے شوہر سے مجھے بہت پیار تھا، لیکن اس کے گھر والوں نے میرا گلا گھونٹ کر مار ڈالنے سے لے کر میری عزت پر حملے تک ہر کام میرے شوہر کی وفات کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر کر ڈالا، صرف اس گھر کے حصول کی خاطر۔۔۔۔۔ اور میں پچھلے دو ماہ سے اپنے بھائی کی سرسرا میں بیٹھی ہوں تاکہ تمام قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنی موجودگی میں گھر کا سودا کروں۔ ایسا نہ ہو کہ خریدنے والے کو میری سرسرا والے پریشان کریں۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”نہیں فریجہ جی! میرے ذہن میں کوئی ایسی غلط سوچ نہیں آئی۔ جو فیصلہ آپ نے جلد کر لیا ہے اسے میں نے بدیر کیا ہے۔ آپ کو تین ماہ میں حالات کی مجبوری کے باعث یہ فیصلہ کرنا پڑا اور مجھے یہ فیصلہ کرنے میں لگ بھگ چار سال لگ گئے ہیں۔ تاہم اس اتوار کو میری منگنی ہے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے زندگی میں دوسری بار منگنی۔۔۔۔۔“ میں نے مسکرا کر آہستگی سے کہا۔

”اوہ! سوسیڈ! تم تو بہت چھوٹی سی ہو اور بہت ہی چھوٹی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں؟“ اس نے تاسف سے کہا۔ ”اللہ تمہیں زندگی کی کھوئی ہوئی خوشیاں نصیب کرے۔“

”بہت شکریہ، مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔“ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تبھی مظہر علی اور نوید صاحب دکیوں اور گواہوں کے ہمراہ وہیں آ گئے جہاں ہم پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مظہر کی والدہ ہماری تمام گفتگو خاموشی سے سنتی رہی تھیں۔ جب وہ لوگ آ گئے تو میں، فریجہ اور آئی اٹھ گئے تاکہ گھر دیکھ لیں۔ تین بیڈروم، ڈرائنگ، ڈائننگ اور مرکزی ٹی وی لاونج پر مشتمل یہ گھر ہم سب کو اچھا لگا تھا۔ بیڈروم بھی اوپر تھے۔ میں نے آئی کو گھر کی مبارکباد دی اور پھر مظہر علی کو بھی۔ فریجہ کو خدا حافظ کہا اور واپسی کی اجازت چاہی۔

تھوڑی دیر کے لیے دفتر میں کام وغیرہ دیکھا اور پھر کچھ ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے لبرٹی کی طرف چلی۔ شاپنگ مکمل ہوئی تو میں بیوٹی پارلر چلی گئی۔ فیشل کرایا، ڈرائیوٹیکس ہونے کے لیے مساج بھی اور پھر بالوں کو براؤن رنگ میں رنگوایا۔ اتنے تردد کے بعد مجھے خود میں کافی واضح تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ واقعی ہمارے اندر اور باہر کے موسم آپس میں کتنے مربوط ہوتے ہیں۔ ”معظم مجھے منگنی والے دن دیکھ کر کتنا حیران ہوگا؟“ صرف اسی کے حوالے سے مجھے یہ سوچ آئی تھی۔ اور آتی بھی کیوں نہ کہ اب وہی میری زندگی کا مالک بننے والا تھا۔

○ دل یہ محسوس کرتا ہے،

تو پہننے لگا ہے بدن میں ہر قطرہ لبو کے سنگ

جسم کہتا ہے یہ،

مجھ پر آنے لگے ہیں تیری ہی محبت کے رنگ

دماغ یہ سوچتا ہے،

جینے کی جاگی ہے مجھ میں اک نئی امنگ، اک نئی ترنگ O (شیریں حیدر)

رات کا کھانا کھا رہی تھی کہ آنٹی کا فون آیا۔ میں نے انہیں گھر کا سودا ہو جانے پر مبارکباد دی۔ شکریہ کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا واقعی میری منگنی ہو رہی تھی۔ میں نے تصدیق کی تو انہوں نے تفصیل پوچھی۔ تب میں نے انہیں مختصراً معظم کے بارے میں بتایا کہ ڈاکٹر ہے اور انگلینڈ میں رہتا ہے۔ گھر والوں کے رشتے کا صدف آپنی کے حوالے سے بتایا۔

”یہ جہاں سن کر خوشی ہوئی ہے وہیں یہ دکھ بھی ہو رہا ہے کہ تم ہمیں چھوڑ کر دور دس چلی جاؤ گی۔“ مجھے ان کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں نہیں رہوں گی آنٹی، اسی ملک میں، آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”منگنی میں دو دن رہ گئے ہیں اور ہمیں ابھی تک دعوت نامہ نہیں ملا؟“ آنٹی نے کہا تو میں شرمندہ ہو گئی۔

”اصل میں آنٹی میں نے خود ہی سوچا کہ آپ کو نہ بلاؤں.....“

”ہم غریب ہیں اس لیے تم سوچتی ہو گی کہ ہمارا خرچہ ہوگا؟“ آنٹی نے پوچھا۔

”پلیز آنٹی! آپ سوچ سکتی ہیں کہ میں آپ کو غربت کی وجہ سے نہ بلاؤں گی۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ سچ وہی تھا جو انہوں نے سمجھا تھا۔ تبھی امی جان نے میرے ہاتھ سے فون لے لیا اور خود آنٹی سے بات کر کے ان سب کو آنے کی دعوت دی۔ فون بند ہوا تو امی جان نے مجھے کہا کہ مجھے شروع سے ہی ان کو بلانا چاہئے تھا، بلکہ کوشش کر کے اگر ان کی بیٹیوں کو کسی بہانے سے اچھے کپڑے، دلوادیتیں تو وہ پورے اعتماد سے آتیں۔

”میں خود ہی چاہ رہی تھی امی جان کہ ان کا خرچہ نہ ہو۔“ میں نے تاویل پیش کی۔

”کل تم دفتر نہ جاؤ، مظہر چلا جائے اور بازار سے ان سب کے لیے اچھے سے ملبوسات تحفہً خرید کر پہنچا دو۔ گھر نیا لیا ہے انہوں نے، بہانہ موجود ہے۔ بچیوں اور مظہر علی کے لیے ریڈی میڈ لے لینا اور ان کی امی کے لیے ان سلا لے لینا، ارجنٹ سلائی کروا کر کے وہ بھی پہن لیں گی.....“ امی جان نے حل پیش کیا۔

”وہ برا محسوس کریں گی امی جان!“ میں ہچکچائی۔

”تم اپنے تک رکھنا اور اپنی خوشی کی خاطر دینا تو وہ برا نہیں منائیں گی.....“ امی جان نے کہا۔

”آپ ساتھ چلیں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں اس طرح ان کی خودداری مجروح ہوگی۔ میں ان کے نئے گھر میں ہی جاؤں گی.....

بلکہ یوں کرو کہ میرے پاس ان سارے کپڑے پڑے ہیں، ان میں سے کوئی اچھا سا سوٹ نکال کر لے جاؤ، باقی ریڈی میڈ لے لینا۔“

”کتنا اچھا دل ہے آپ کا امی جان! میرے ذہن میں تو یہ تجویز نہیں آ سکتی تھی۔“ میں نے اعتراف کیا۔

اگلے روز میں نے بازار کھلتے ہی جا کر بوتیک سے تینوں بہنوں کے لیے خوبصورت ملبوسات

خریدے، مظہر علی کے لیے شلوار قمیض، کیونکہ پینٹ شرٹ کے لیے تو ناپ کا علم ہونا ضروری ہے۔

تھوڑا سا پھل اور مٹھائی لی۔ ان کے گھر پہنچی تو وہ کبھی حیران ہوئے۔ چند دن ہی تو ہوئے تھے مجھے

گئے ہوئے اور پہلے کبھی میرا چکر اتنی جلدی جلدی نہ لگتا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوشی کی ایک لہر سب کے

چروں پر دوڑ گئی تھی۔ تحائف کھول کر دیئے تو بچیاں بہت خوش ہوئیں مگر آنٹی کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

”یہ سب کیا ہے ماہا بیٹی؟“

”آنٹی! آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے آپ کے گھر کی خریداری کی۔“

”جانتی ہوں لیکن میں کپڑوں کے اس ڈھیر کا پوچھ رہی ہوں۔“ وہ خفا سی تھیں۔

”آپ کو پسند نہیں آئے کیا آنٹی؟“ میں نے جان بوجھ کر ایک ٹینگ کی۔

”کس خوشی میں لائی ہو یہ کپڑے بیٹا؟“ انہوں نے سوال دہرایا۔

”بیتا تو رہی ہوں کہ گھر کی خوشی میں تحفے کے طور پر۔“

”گھر میں شفٹ ہوں گے تو گھر کی خوشی کے تحفے لیں گے اور پھر تحفہ تو خلوص کی ایک نشانی

ہوتا ہے، اتنے قیمتی تحفے دے کر تم میرے ذہن پر بوجھ کو اور بھی بڑھا رہی ہو بیٹا! ہم تو پہلے ہی

تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں.....“ ان کی آواز بھر گئی۔

”آپ نے ایسا سوچا بھی کیونکر آنٹی..... مجھے یہ تحفہ دینا تو آپ کے نئے گھر میں تھا، لیکن میں

نے سوچا کہ سودا تو ہو ہی گیا ہے، تحفہ بروقت دے دوں تو کل میری منگنی پر زارا، ٹائیہ اور شان

تھے، میچنگ جوتی، مہندی، کانچ کی چوڑیاں اور چھوٹی سی میک اپ کٹ صدف اپنی اور رانی باجی شام کو دینے آئیں۔ بلاشبہ بہت ہی خوبصورت تھیں سب کچھ۔ میں آنے والے دن کے سنے سجاتے ہوئے بستر پر دراز تھی کہ معظم کی کال آگئی۔ سلام دعا کا تبادلہ ہوا۔

”سو گئی تھیں کیا؟“ معظم کا لہجہ خمار آلود تھا۔

”بس سونے ہی والی تھی.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”مجھے تو نیند نہیں آرہی آج.....“ لہجہ بہک رہا تھا۔

”تو بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھ لیں..... یا نیند کی دوا لے لیں.....“ میں نے ہنس کر کہا، ”اور مجھے

سونے دیں، مجھے تو نیند آرہی ہے۔“

”جھوٹ مت بولو ماہا! آج تمہیں بھی نیند نہ آرہی ہوگی.....“ اس نے ناراضگی سے کہا، ”اچھا

بتاؤ چیزیں پسند آئیں؟“

”ہاں، بہت خوبصورت ہے سب کچھ۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”سب کچھ میری پسند سے لیا گیا ہے..... اور میں اس گھڑی کے انتظار میں سو نہیں پارہا، جب

میں یہ سب کچھ تمہیں پہنچے ہوئے دیکھوں گا.....“ اس کے اندر کی بے چینی لہجے سے عیاں تھی۔

”معظم! یہ مت بھولیں کہ کل منگنی ہے.....“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس وقت بات

بے بات ہنسی آرہی تھی۔

”یا وہ..... اور اب میں زیادہ انتظار نہ کر سکوں گا شادی کے لیے۔“

”اچھا خدا حافظ، اب سونے دیں.....“ اور میں نے اس کے اصرار کے باوجود فون بند کر دیا۔

بجائے اس کے کہ میں صبح اٹھتی تو طبیعت تازہ دم ہوتی اور چہرے پر ہلاکت ہوتی، میرے

چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ رات بھر میرے خوابوں میں غالب تھے اور وہ مجھ سے کچھ ناراض

بھی تھے۔ تھے تو یہ خواب ہی لیکن ان خوابوں نے مجھے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ بہت طویل عرصہ کے بعد

غالب میرے خواب میں آئے تھے اور ان کا یہ ناراض سا انداز مجھے ڈسٹرب کر گیا تھا۔

○ رات پہنوں میں آکر جگاتے رہے

کپڑوں کو استعمال کر لیں گی۔ بعد میں دوں گی تو وہ بھلا کب پہنیں گی۔ پلیز آئی میرے خلوص کو کوئی اور رنگ نہ دیں۔“ میں نے انہیں کندھوں سے تھام لیا۔ ”صرف وقت کم تھا اور مجھے علم تھا کہ اتنی جلدی میں یہ لوگ تیار نہ کر سکیں گی اور پھر نہ آنے کے بہانے کریں گی۔“

”میں سب سمجھتی ہوں۔“ وہ بولیں۔

”پلیز آئی! یونہی غلط سلط نہ سمجھیں اور ثانیہ سے کہیں کہ آپ کا سوٹ سی لے، آپ ثناء کے

ساتھ جا کر ان کپڑوں کے میچنگ جوتے وغیرہ لے لیں.....“ میں نے بات بدلی، ”مجھے جانا ہے،

صدف اپنی وغیرہ میرے کپڑے لے کر آرہی ہیں شام کو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”یہ بہت زیادتی ہے بیٹی ماہا!.....“

”ٹھیک ہے پھر مجھے بیٹی نہ کہیں.....“ میں نے خفا ہو کر کہا تو وہ خاموش ہو گئیں، جب لڑکیوں

نے اپنے کپڑے کھول کر دیکھے، بہت تعریف کی اور میرا شکریہ ادا کیا۔

واپسی پر میں سوچ رہی تھی کہ کیوں میرا دل ہر دفعہ ان کی مدد کے لیے کچھ نہ کچھ کر کے خوش

ہوتا تھا۔ ”کیا وجہ تھی؟“ اور کیا وجہ ہوگی؟ یقیناً میں مظہر علی کے خلوص سے ہی پہلی بار متاثر ہوئی

تھی۔ اور پھر زارا سے ملاقات ہوئی تو میں اس کی گرویدہ ہو گئی..... ”یہی بات ہے“ تب میں نے

خود کو تسلی دی۔ ”یقیناً میں نے اس کے بعد ان کی مدد کرنے کا سوچا..... اور ہر دفعہ مدد کرنے میں

میں اپنے اختیار کی آخری حدوں تک چلی گئی، واسے، ورے، سنے اور قدمے۔ کیوں؟ کیوں

آخر؟ میں اپنے ذہن کے سوال پر الجھ گئی۔ ”مظہر علی کی وجہ سے.....“ میرے دل کی دھڑکنوں

نے اتھل پتھل ہو کر کہا۔ ”یہ کیا اسٹوڈنٹ بات ہے؟“ وماغ نے پوچھا، ”مظہر علی میں ایسی کیا خاص

بات ہے کہ..... خود سے پوچھو!! کیا کمی ہے اس میں..... شکل، وجاہت، تعلیم؟؟؟“ دل نے

کہا۔ ”زندگی گزارنے کے لیے اور بھی بہت کچھ چاہئے ہوتا ہے.....“ وماغ نے تردید کی۔

”زندگی گزارنے کی بات کب ہو رہی ہے، بات تو متاثر ہونے کی ہو رہی ہے۔ پسندیدگی کی

ہو رہی ہے.....“ دل نے سمجھایا تو میں لال بتی کے اشارے پر کھڑی ہوئی چونک گئی کہ میں کیا سوچ

رہی تھی اور کیوں!!! اور وہ بھی ایسے وقت میں کہ جب اگلے ہی دن میں کسی اور سے منسوب ہونے

جاری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جذبہ ہمدردی ہی تھا۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق گلابی رنگ کا جوڑا اور ہلکا سا سیٹ جس میں یا قوت لگے ہوئے

دوہ روٹھے رہے، ہم مناتے رہے

آنے والے دقتوں کے

جانے کون اندیشے ستاتے رہے

تڑپ کوئی دیکھتا دل کی

ہم جانے والے کو پکارتے، بلاتے رہے

فکروں کے ناگ،

واہموں کے سنبولیے.....

میرے چھید چھید دامن میں مقید

آنے والی خوشیوں کو، ڈستے رہے، کھاتے رہے.....

رات کے اندھیروں میں چھپ کر

دن کو آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کے خزانے

لٹاتے رہے، نیر آتے رہے، ہم بہاتے رہے O (شیریں حیدر)

دل بھر بھر کر آ رہا تھا، غالب کو یاد کر کے، تیمور کو یاد کر کے..... اور امی جان کی مستقبل میں پیش

آنے والی تنہائی کا خیال..... مجھے اداس کر رہے تھے۔

دن کو علی بھائی انتظامات کے سلسلہ میں آئے تو میں انہیں سامنے دیکھ کر رو پڑی۔ انہوں نے

میرا سراپے کندھے سے لگالیا اور میرا سر سہلانے لگے۔ میرے زکے ہوئے آنسو بھی تھم تھم برس

پڑے۔ امی جان نے بھی مجھے بیوقوفی پر ڈانٹا اور مظہر نے بھی میرے سر پر یوں شفقت سے ہاتھ

رکھا جیسے مجھ سے بڑا ہو۔ گھر میں لان میں ہی سارے انتظامات ہو رہے تھے۔ اعجاز بھائی، علی بھائی

اور مظہر سب کاموں میں پیش پیش تھے۔ لان کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ نگہت نے مجھے بیوٹی

پارلر لے جانے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن میں نے مان کر نہ دیا۔ ”خود ہی گھر پر تیار ہو جاؤں گی“

کی رٹ لگائے رکھی۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہ لگ رہا تھا کہ میں پارلر سے تیار ہو کر آؤں۔

چند سال قبل ہی جب غالب سے میری مٹکئی ہوئی تھی تو کتنی سادگی سے میں گھر پر جن کپڑوں

میں تیار ہوئی تھی انہی کے اوپر لایا ہوا شگون کا دوپٹہ دے کر مجھے انگوٹھی پہنادی مگر اب چند

سالوں میں رسوم و رواج کتنے بدل گئے تھے۔ پہلی مٹکئی ہوتی تو میں احتجاج نہ کرتی مگر اب مجھے یہ

سب نامناسب سا لگ رہا تھا۔ تاہم جب ماہِ رُخ آئی تو اس نے میری ایک نہ چلنے دی اور میرا

”خود ہی تیار ہونے“ کا عزم ادھورارہ گیا۔ اس نے اچھا خاصا میک اپ کر کے مجھے آئینے کے

سامنے کھڑا کیا تو چند لمحوں کے لیے میں خود بھی ششدر رہ گئی۔

مظہر علی کے گھر والے آئے تو اس کی بہنیں اندر میرے کمرے میں آگئیں۔ ماہِ رُخ سے سلام

دعا کا تبادلہ ہوا تو اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے فوری طور پر کوئی بہانہ نہ سوچھ

رہا تھا، کالج سے دوستی کا بہانہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ میں اور ماہِ رُخ ایک ہی کالج میں تھیں۔ اسکول کا

بھی کہتی تو ماہِ رُخ کرید کرید کر کہیں سے سراغ لگالیتی کہ میں نے جھوٹ کہا تھا۔ تب میں نے مظہر

علی کی بہنیں ہونے کی حیثیت سے ہی تعارف کروایا اور یہ کہ مظہر علی ہمارے ہاں اہم ذمہ داری

سراجام دے رہے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اپنا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح

سے میری ان کی بہنوں سے دوستی ہوئی اور یہ کہ صفدر علی مرحوم، غالب کے دستِ راست تھے۔

عالمباہ ماہِ رُخ کو اطمینان ہو گیا ہوگا۔ وہ تینوں بہنیں میرے ہی گفٹ کیے ہوئے ملبوسات پہنے ہوئے

تھیں، ان کی میچنگ جوتیاں اور کانوں میں سونے کی ہلکی ہلکی سی بالیاں اور ٹاپس بھی انہیں اعتماد

بخش رہے تھے۔

یقیناً آئی نے انہیں یہ ہلکے سے زیورات اسی لیے پہنادیے ہوں گے کہ وہ ہمارے ہاں خود کو

احساس کمتری میں مبتلا نہ سمجھیں۔ انسان کا ظاہری حلیہ ہی اس کی اصلیت پر پردہ بھی ڈال دیتا

ہے۔ اور اس وقت جو خوبصورت اور دیدہ زیب ملبوسات انہوں نے زیب تن کر رکھے تھے وہ ایسے

تھے کہ دیکھنے والا اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ کس گھر کے مکین تھے۔ بعد ازاں مجھے ان کے انداز

میں جھجکی نظر آئی کہ فطری تھی کہ وہ ہمارے ہاں پہلی دفعہ آئی تھیں۔

والدہ بھی پہنچیں تو وہ تپاک سے ان تینوں بہنوں اور آئی کو ملیں۔ تب معظم کے گھر والوں

کے آنے کا شور اٹھا تو سب لوگ باہر نکل گئے، ثانیہ میرے پاس بیٹھی رہ گئی۔ وہ میرے لباس،

زیورات اور میک اپ کی تحریف کرنے لگی۔ ”آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں ماہِ ماہ آئی!!“

”بہت شکریہ! آج بھی آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔ مجھے تو تم سادگی میں بھی بہت اچھی

گتی ہو مگر آج تو غضب ڈھا رہی ہو۔ دیکھنا کوئی مجروح نہ ہو جائے۔“ میں نے شرارت سے کہا۔  
 ”ارے آپنی! اپنی ایسی قسمت کہاں اور پھر ہماری ایسی حیثیت کہاں!!“ اس کے لہجے میں  
 حسرت تھی۔

”یوں تو نہ ہوتا نی!“ میں نے اسے گھر کا، ”سچ اگر میں لڑکا ہوتا تو میں اس وقت پورے دل  
 و جان سے تم پر عاشق ہو چکی ہوتی۔۔۔۔۔“

”یہ آپ کا حسن نظر ہے آپنی۔۔۔۔۔ ورنہ میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔۔۔۔۔“ یاس بھرا لہجہ تھا۔  
 ”ہر لڑکی عام ہوتی ہے ثانی! یہ تو کسی خاص بندے کی خاص نظر ہوتی ہے جو اسے مستحکم کر دیتی  
 ہے اور خالص الخالص بنا دیتی ہے۔۔۔۔۔“  
 ”جیسے ڈاکٹر معظم صاحب۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائی۔

”مجھے تو دو بندوں کی نظر خاص نے خالص الخالص بنایا ہے ثانی! مگر میری دعا ہے کہ تمہارے  
 نصیب میں ایک ہی بندے کی نظر خاص ہو اور پھر تمہارا اور اس کا ساتھ دائمی رہے۔۔۔۔۔“ میری  
 آنکھیں لبریز ہو گئیں۔

”ایسے موقع پر ادا تو نہ ہوں آپنی!“ وہ میرے ساتھ لپٹ گئی، ”اللہ اس کے بعد آپ کو کوئی  
 پریشانی اور آزمائش نہ دے۔ بہت سی خوشیاں آپ کا مقدر ہوں۔“

نکھت اندر آئی، مجھے باہر لے کر جانے کا وقت آیا تھا۔ نکھت اور ثانیہ کی معیت میں باہر کی  
 طرف جاتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو رہی تھیں۔ دو تین دفعہ  
 نکھت نے رُک کر میرے ہاتھوں سے پسینہ خشک کیا۔ باہر لے جا کر معظم کے ساتھ مجھے بٹھایا گیا  
 اور مووی کیمرے اور دوسرے کیمروں کا رخ ہماری طرف ہو گیا۔ میری آنکھیں بارہا جیسے جھک  
 گئیں۔ مجھ پر یہ مرحلہ زندگی میں دوسری بار آیا تھا اور مجھ سے زیادہ یہ بات کون جان سکتا تھا کہ  
 ایسے مرحلے میں کسی لڑکی کا ایک سے زائد بار گزرتا کس قدر کریناک ہو سکتا ہے۔ میرے دل سے  
 اس وقت دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ کسی لڑکی کو ایسی آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔

مجھے بھی اندازہ تھا کہ یہ قدرت کا نظام ہے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میری دعا سے دنیا بھر کی  
 لڑکیوں کی تقدیر بدل جائے۔ اللہ نے زندگی اور موت کے اوقات مقرر کر دیئے ہیں۔ لیکن اصل  
 مسائل تب ہوتے ہیں جب ہم مذہب سے دوری اور کم علمی کے باعث دوسری شادی کو اور

بالخصوص عورتوں کے لیے شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ مرد و نڈا ہوا جائے تو لوگ اس کی تنہائی اور مجبور یوں  
 کی دکالت کرتے ہیں اور اس کی دوسری شادی کو جائز اور ضروری سمجھتے ہیں جبکہ یہ وہ یا مطلقہ کو دوسری  
 شادی کے راستے میں بچے، خاندان، بہن بھائی اور کئی طرح کے مسائل دیواروں کی طرح کھڑے  
 ہو جاتے ہیں۔

تب مجھے سوچ آئی کہ مجھے یہ دعا کرنی چاہئے کہ ہمارے ہاں لوگوں کی سوچ تبدیل ہو اور  
 مذہب پر ان کے ابہام بھی۔ میری سوچوں کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب معظم میرے پاس سے  
 اٹھے اور ان کی جگہ پر رانی باجی آکر بیٹھ گئیں۔ میرا بایاں ہاتھ انہوں نے ہاتھ میں لیا اور تیسری انگلی  
 میں ہیرے کی خوبصورت سی انگوٹھی پہنا دی اور میرے سر کو اپنے کندھے کے ساتھ لگا کر بوسہ دیا۔  
 وہ انھیں تو دوبارہ معظم بیٹھ گئے۔

”بہت مبارک ہو!“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ میں نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ اس کے بعد  
 معظم کو انگوٹھی پہنانے کا مرحلہ آیا تو بحث و تجویس شروع ہو گئی اور بالآخر قرعہ امی جان کے نام نکلا،  
 انہوں نے معظم کے ساتھ والے صوفہ پر بیٹھ کر انگوٹھی پہنائی تو مبارک سلامت کا شورا اٹھا۔ سب  
 لوگ آپس میں گلے مل کر مبارکباد دے رہے تھے، اسٹیج پر سب معظم کو بھی مل رہے تھے اور مجھے  
 بھی۔ تب ہم دونوں بار بار اٹھنے کی بجائے کھڑے ہو گئے۔

گروپ فوٹو بننے لگا اور پھر کھانے کا مرحلہ آیا تو مجھے اور معظم کو وہیں کھانا دے دیا گیا۔ باقی  
 سب لوگ کھانے کی میزوں کی طرف چلے۔ ”اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ جی چاہ رہا ہے تمہیں چرا کر  
 لے جاؤں!“ معظم نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

”شکریہ!“ میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔ معظم نے کھانا پہلے میری پلیٹ میں ڈالا اور پھر اپنی  
 پلیٹ میں۔ مجھ سے تو شرم کے مارے کھایا بھی نہ جا رہا تھا۔ پلیٹ میں چاولوں اور کانٹے سے کھلتی  
 رہی۔ ”اگر تم نے سارے چاول گن لیے ہوں تو اب کھا لو ان کو۔“ معظم ہانے شرارت سے کہا۔ میں  
 خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ ”تیور کا کورس ختم ہو رہا ہے؟“ معظم نے پوچھا۔

”تین ماہ اور رہ گئے ہیں غالباً۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”اتنے دن مجھے انتظار کرنا پڑے گا ابھی؟“ معظم نے کہا۔

”عمر دراز مانگ کر لایا ہوں چار دن  
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں“

”آپ نے تو شعر کا حلیہ بگاڑ دیا ہے.....“

”بگاڑا تو نہیں، صرف اپنی کیفیت اس پر لاگو کی ہے..... بس تیمور آجائے تو میں ایک دن بھی  
انتظار نہیں کروں گا۔“ معظم نے حتی انداز میں کہا۔ میں اپنے بانیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی  
انگوٹھی پر نظریں جمائے ہوئے تھی جسے پہن کر اب مجھے اپنے پاس بیٹھا ہوا شخص، اپنی بے تابیوں کی  
دستاویں سناتا ہوا..... کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے محبت جاگ رہی تھی۔ میرا  
اپنا دل اس کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

○ من چاہے تیرا ہاتھ تمام لوں

نیلے گلن کا سایہ ہواؤں پر

اور دور نیچے دھرتی نظر آتی ہو.....

ہواؤں میں بسی خوشبو ہو تیرے پیار کی

مجھ میں دھڑکن کی طرح تیرا نام بسا ہو.....

اور اڑ رہے ہوں ہم فضا میں

آزاد پنچھیوں کی طرح بادلوں کی طرح.....

ہواؤں کی طرح..... ○

(شیریں حیدر)

میں کرونگی ماہا؟“

”ہوں!!“ کہہ کر میں نے سر جھکا لیا۔ معظم کے قرب اور اس سے وابستہ استحقاق کے  
احساس نے مجھے سب کی نظروں میں معتبر کر دیا تھا، میں اس وقت سب کی توجہ کا مرکز بھی تھی اور  
تقریفوں کا بھی۔ ہر چیز کا ایک انجام ہے اور ایک انتہا، اسی طرح میری یادوں میں بسی وہ  
خوبصورت تقریب بھی بالآخر انجام کو پہنچی۔ سب سے پہلے معظم کے گھر والے رخصت ہوئے اور  
پھر ایک ایک کر کے باقی سبھی مہمان رخصت ہونے لگے۔ آخری وغیرہ کو میں نے بہت کہا کہ انہیں  
ڈرائیور چھوڑ آئے گا مگر انہوں نے مان کر نہ دی اور ٹیکسی سے ہی گھر روانہ ہوئے۔ امی جان نے  
ان کی آمد کا بہت شکریہ ادا کیا، نئے گھر کی مبارکباد دی اور ان سے کہا کہ جب وہ نئے گھر میں شفٹ  
ہوں گے تو وہ مبارکباد کے لیے جائیں گی۔

جب ہم گھر کے لوگ ہی رہ گئے تو سب لاؤنج میں آن بیٹھے اور چائے کی فرمائش کی، نگہت  
انٹھے ہی والی تھی کہ میں اٹھ کھڑی ہوئی..... یوں بھی میں اب اس قدر بھاری لباس سے جان  
چھڑانا چاہ رہی تھی۔ ”میں بناتی ہوں چائے.....“ میں نے کہا۔  
”آرام سے بیٹھی رہو بیٹا، نگہت بنا لیتی ہے، یوں بھی اب تم اس گھر میں مہمان ہو.....“ امی  
جان نے کہا۔

”پھر ملازمہ سے کہہ دیں وہی بنا لیتی ہے، نگہت بھی تو مہمان ہی ہے نا!“ میں نے کہا تو  
منظہر نے اٹھ کر ملازمہ سے چائے بنانے کو کہا۔ علی بھائی میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مظہر نے  
تخائف کھولنا شروع کر دیے، سبھی تخائف بہت قیمتی اور خوبصورت تھے لیکن مجھے مظہر کا دیا ہوا تحفہ  
سب سے زیادہ پسند آیا تھا جس میں اس نے سونے کی بہت خوبصورت چین میں انگریزی کے  
حرف ”M“ دو ڈال رکھے تھے جو کہ میرے نام کے اور معظم کے نام کے بھی ابتدائی حروف تھے  
اور چین میں ساتھ ساتھ پڑے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے، ایک پر نیلم اور ایک پر  
یا قوت لگا ہوا تھا۔ مجھے مظہر کی چوائس بہت اچھی لگی تھی۔ سب کا شکریہ ادا کیا۔

چائے پیتے ہوئے علی بھائی میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ ”آج تو سب لوگ غضب ڈھا رہے  
تھے.....“ وہ بولے۔

”کون سب لوگ؟.....“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وقت تھم جائے، یہ لمحے امر ہو جائیں، جب معظم نے اپنا بھاری ہاتھ  
میرے ہاتھ پر رکھ دیا..... پورے استحقاق کے ساتھ..... میرا ہاتھ نئے سے خوفزدہ پرندے کی  
طرح لرزنے لگا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر معظم کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور  
آنکھوں میں پیار کی جوت تھی۔ میں نے نظر ہی نظر میں التجا کی تو اس نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔  
”تمہاری یاد خوشبو بن کر لندن میں ہر پل میرے ساتھ رہے گی..... میں اس خوشبو کو اپنے ساتھ  
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لے جانے تک مضطرب رہوں گا.....“ میں خاموشی سے سن رہی تھی۔ ”تم مجھے



”کبھی لوگ..... اور سب سے بڑھ کر میری بہنا ماہ!“

”مسک نہ لگائیں، سب سمجھتی ہوں میں.....“

”اگر سمجھتی ہو تو پھر کچھ کر داب، ہماری قسمت میں جانے کب تک انتظار ہے.....“ انہوں نے بے چارگی کی ایکٹنگ کی۔

”بس اب آپ کے انتظار کا وقت کم ہی رہ گیا ہے..... آپ کی مراد بھی بر آنے والی ہے، ثانیہ وغیرہ نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں تو.....“

”گھر میں شفٹ ہونے سے میرا رشتہ بھجوانے کا کیا تعلق؟ آخر وہ کسی گھر میں ہی رہتے ہیں ناں!“ انہوں نے اصرار کیا۔

”رہ تو رہے ہیں، مگر آج کل وہ شفٹنگ میں مصروف ہیں اس لیے تھوڑے دن انتظار کریں۔“

”ماہا تمہیں معلوم ہے کہ اس انتظار کے باعث میرے سر میں کتنے ہی بال سفید ہو گئے ہیں۔“

”سر کے بال تو آپ کے بہت عرصے سے سفید ہیں۔“ میں ہنسی۔

”اب میری عمر بھی تو دیکھو ستائیس سال کا ہو گیا ہوں۔ ستائیس سال کی عمر میں صدف آپنی

کے دو بچے تھے۔“ علی بھائی نے مصومیت سے کہا۔

”اگر آپ لڑکی ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ ابھی تک آپ کے چار بچے ہوتے۔ صدف آپنی تو

ڈاکٹر بن رہی تھیں اس لیے ان کی شادی دیر سے ہوئی، جبکہ والدہ نے عائشہ باجی کی اور میری

شادیاں انیس سال کی عمر میں کر دی تھیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مذاق تو نہ اڑاؤ ماہا! سیریس ہو کر بھی کسی وقت بات کیا کرو..... اب مزید انتظار نہ کرو۔“

وہ خفا ہو گئے۔

”اوکے! اوکے! اب آپ کی درخواست پر جلد غور ہوگا.....“ میں نے انہیں تسلی دی۔

مظہر علی نے دفتر سے ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دی تھی، میں نے اسے بلا کر مشورہ دیا کہ

وہ صبح فیکٹری آ کر کام وغیرہ دیکھ کر گھر کی طرف چلا جایا کرے اور پھر شام میں فیکٹری کا چکر لگالیا

کرے۔ تب اس نے اسی طرح کیا اور رات دیر تک بھی وہ گھر پر کام کر دیا تھا۔ ڈسٹر کے ساتھ

ساتھ ہی کھڑکیوں اور دروازوں کا کام ہو رہا تھا۔ تین اطراف کی باؤنڈری وال بن چکی تھی، چوتھی

طرف سے بھی اس کی تعمیر کردہائی جا رہی تھی۔ ان دنوں مظہر علی کا جوش و خروش دیدنی تھا، اس کے

چہرے پر مسرت جھلکتی تھی، حالانکہ وہ اطراف مسلسل کام کرنے کی وجہ سے وہ یقیناً ذہنی اور جسمانی

طور پر تھک جاتا تھا۔ لیکن بہتر مستقبل کی امید اسے دن رات کام پر مائل رکھے ہوئے تھی۔ کبھی

کبھار اسے دیکھ کر مجھے ترس بھی آتا تھا، لیکن میں نے سوچ رکھا تھا کہ گھر کا کام مکمل ہو گا تو پھر اسے

دس پندرہ دن کی چھٹی دیں گی تاکہ وہ گھر پر آرام بھی کر سکے اور انہی دنوں میں اس کی بہنوں کے

رشتے طے ہو جائیں اور ممکن ہو تو ممکن بھی۔

نگہت اور اعجاز بھائی واپس چلے گئے تو کتنے ہی دن گھر پر اداسی چھائی رہی تھی۔ اب ان

دونوں سے زیادہ تو دل خوشی اور عبداللہ سے اداس ہو رہا تھا۔ بچوں کی معصوم باتیں، چھوٹی چھوٹی

شرارتیں اور زندگی سے بھرپور نفعی گفتاریاں ہی گھر آنگن کی اصل رونق ہوتی ہیں۔ عبداللہ جب

کبھی ہمک کر میرے پاس آتا تھا تو مجھے اس کے وجود سے اپنے اندر مٹا کا احساس ہونے لگتا تھا۔

قدرت کی ایسی دین ہے کہ عورت کو اولاد دے یا نہ دے، مگر مٹا کا جذبہ ہر عورت کو ودیعت

ہوتا ہے۔ زندگی میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں کہ وہ صرف ایک ماں کی طرح سوچتی ہے، اپنی

اولاد کے لیے تو ماں کی طرح سوچنا قدرتی رد عمل ہے لیکن وہ ہر ایک کے لیے مٹا کی تڑپ اپنے

اندر رکھتی ہے۔ اسی لیے جب رب العالمین نے اپنی محبت کی مثال دی تو کہا کہ وہ اپنی مخلوق سے

ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے، حالانکہ یہی مثال محبت کے اور رشتوں کی بابت بھی ہو سکتی تھی،

لیکن جو محبت مٹا کی ہوتی ہے وہ افضل ترین ہے۔

اسی طرح کبھی کبھار میں والدہ کی طرف سے سوچتی یا امی جان کی طرف سے تو دل میں یہی

خیال آتا تھا کہ وہ بھی تو ہیں جو میری تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہیں۔ لیکن اب دونوں ہی مطمئن تھیں کہ

وقت تبدیل ہو رہا تھا۔ میری آزمائش کا دور ختم ہو رہا تھا۔ میں نے ذہن میں خود ہی اپنی تیاری کے

پلان مرتب کرنا شروع کر دیئے تھے۔ سوچتی تھی کہ ایک بار لندن جاؤں گی تو سہی۔ انامیکا سے ملنے

کا سب سے زیادہ تجسس تھا مجھے۔

معمظم کی کال بھی اکثر رات دیر سے آتی تھی کہ جب وہ ہاسپٹل سے فارغ ہو کر گھر آتے اور

پھر اپنا کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہوتے تو تب تک میں سونے کے لیے لیٹ چکی ہوتی تھی۔ ایسے میں

معظم کی خوبصورت باتیں، مدھر سرگوشیاں اور بے تابیوں کی داستانیں مجھے اپنی دنیا سے دور لے جاتیں اور میں چشم تصور میں معظم کے پاس ہوتی تھی۔

○ یاد ہے وہ دن مجھے

جب وہ میرے پاس بیٹھ کر بھی خاموش تھا  
میں ڈھونڈ رہی تھی اس کے چہرے پر خوشی کی رمت  
جواسے ہوتی میرے پاس ہوتے ہوئے  
مگر وہ اداس تھا، جو یاس تھا  
میری پلکوں پر موتی چمک اٹھے تو  
پوچھا اس نے..... ”معاملہ.....؟“  
”تم خوش نہیں ہوئے مجھ سے مل کر؟“

پوچھا تھا میں نے.....

”تجھ سے ملنے کی خوشی عارضی ہے  
جیسے کوئی بچہ ذرا دیر کو تیری پکڑے  
اور گھبرا کر چھوڑ دے

تو تیزی کے حسین رنگوں کو ہی سکتا ہے اپنی انگلیوں کی پوروں پر  
میں بھی سوچ رہا ہوں یہ کہ

گنتار ہوں گا وصل کے لیے لمحے اپنی انگلیوں کی پوروں پر  
جو تیزی کے رنگوں کی طرح ذرا دیر کو ملے ہیں مجھ کو.....

تجھ سے ہنچڑ کر دور چلے جانا ہے

یہی نصیب ہے میرا جان جانا !!!

اور اس کا تصور مجھے اداس کرتا ہے

میں مسکرا ہی نہیں سکتا تجھے مل کر بھی.....

○ میں اداس رہتا ہوں، جو یاس رہتا ہوں“

اور معظم سے باتیں کرتے ہوئے بھی، ہوا کی لہروں کے سنگ آتی اس کی آوازوں کو سن کر  
میرے دل کی ککب بڑھ جاتی تھی۔ میں نے اناکھ اپنے وجود پر، دل پر اور دماغ پر سختی سے پیرے  
بٹھار کھے تھے۔ زندگی میں کسی اور خوشی کو دستک دینا ہی منع کر رکھا تھا۔ مگر در دل دوا ہوا تو محسوس ہوا  
کہ زندگی کسی ہدم کسی رفیق کے ساتھ کتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عورتوں کو  
مردوں کے لیے اور مردوں کو عورتوں کے لیے بنایا گیا ہے۔

وہی ایک دوسرے کے دمساز اور دوست ہو سکتے ہیں۔ جن خوشیوں کو خود پر حرام کر لیا تھا، اب  
ان خوشیوں کی آمد پورے وجود کے لیے ہوا کے خوشگوار جھونکے کی مانند تھی۔ جاگتے بھی اور سوتے  
بھی میں معظم کے خیالوں اور خوابوں میں رہتی تھی۔ اس کی کال آنے سے پہلے میرا پورا وجود  
سامع بن جاتا تھا اور پھر یہی دل چاہتا تھا کہ وہ بولتا رہے اور میں سنتی رہوں۔ غالب کی یاد بالکل  
پس منظر میں چلی گئی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ سلیٹ پر ایک عبارت مٹا کر دوسری نئی عبارت لکھ دی جائے تو پہلی عبارت کے  
نقوش بھی غیر واضح ہو جاتے ہیں۔ یہی میرے ذہن کی سلیٹ کیساتھ ہوا تھا۔ دفتر میں تو وہی ہلکے  
رنگ پہنتی تھی مگر گھر کے کپڑوں میں اور کہیں آنے جانے کے لیے پہننے والے کپڑوں میں تبدیلی  
ہونا شروع ہو گئی تھی۔ صرف میں نے خود ہی نہیں بلکہ اس تبدیلی کو سب نے پسند کیا تھا۔

تیسرا کافون کبھی کبھار آتا تھا۔ مجھے اس نے منگنی کی مبارکباد کا فون کیا تھا اور پھر منگنی کی تصاویر  
بجوائیں تو اس نے پھر فون کیا اور بہت تعریف کی، نئے سرے سے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

منظر امتحان سے فارغ ہوا تھا اس لیے زیادہ تر اب وہی دفتر جاتا تھا۔ جس روز میں دفتر نہ  
جاتی تھی کبھی والدہ کی طرف چکر لگاتی تھی، کبھی مظہر علی کے گھر۔ کسی روز خود ہی دفتر بھی چلی جاتی  
تھی۔ وہ بھی ایسا ہی دن تھا کہ اچانک دفتر چلی گئی تو مظہر علی سے ملاقات ہو گئی۔ اس کا رنگ دھوپ  
سے سنولا گیا تھا اور وہ مجھے نسبتاً کمزور بھی لگا۔ یقیناً یہ سب اس تمام محنت کی وجہ سے تھا۔

”کیا حال ہے مظہر علی؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں میڈم، بہت شکریہ۔ سوری آپ دو دفعہ گھر آئیں اور دونوں دفعہ ملاقات نہ ہو سکی،  
اصل میں بہت کوشش کر رہا ہوں کہ گھر کا کام جلدی ختم ہو جائے کیونکہ آگے دن چھوٹے ہونا شروع  
ہو جائیں گے اور پھر اب تو اکتوبر کے مہینے ہیں روزے آرہے ہیں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”اما بیٹا! میں سوچ رہی ہوں کہ زارا وغیرہ اپنے گھر میں شفٹ ہوں تو انہیں کوئی اچھا ساتھ دیا جائے، کپڑے لے لے تو عام ساتھ ہوتے ہیں.....“ امی جان نے کہا۔

”اور کیا تھنہ ہو سکتا ہے امی جان؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے ذہن میں آ رہا تھا کہ فرج، ٹی وی یا پھر صوفہ سیٹ.....“

”یہ تو بہت زیادہ ہوگا۔ اتنا بڑا تھنہ قبول کرنے کی تو ان کی حیثیت نہ ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”تھنہ قبول کرنے والے کی نہیں بلکہ دینے والے کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہئے۔ کیا خیال ہے ہماری ایسی حیثیت نہیں ہے کہ ہم انہیں ان میں سے کوئی تھنہ دے سکیں۔“ انہوں نے پوچھا۔

”وہ تو ہے مگر وہ شاید قبول نہ کریں۔“

”قبول تو انہیں کرنا ہی ہوگا، ہم خود تھنہ لے کر جائیں گے تو کیا وہ واپس کر دیں گے؟“ وہ مسکرائیں۔

”ممکن ہے وہ مجبور ہو جائیں.....“

”تو پھر بتاؤ کیا لیں؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ صوفہ ٹھیک رہے گا، کیونکہ ٹی وی اور فرج تو ان کے پاس ہیں۔ انہی سے گزرا چلا لیں گے، البتہ نئے گھر میں شفٹ ہو کر انہیں فرنیچر تو لینا ہی ہوگا۔“ میں نے تجویز دی۔

”تو پھر یوں کرنا کہ انہیں کسی وقت بتا دیتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود بھی صوفہ بنوالیں اور پھر

ہمارا دیا ہوا تھنہ بیکار ہو جائے.....“ انہوں نے تاکید کی۔

”جی میں کہہ دوں گی.....“ میں نے کہا۔ تبھی فون کی بیل ہوئی اور امی جان نے فون اٹھا لیا۔

تکھت تھی اس نے بات کی، پھر خوشی نے فون چھین لیا اور نانو سے بات کی۔ پھر امی جان نے

ریسیور میری طرف بڑھایا۔

”ہیلو! اما ہامی.....“ خوشی کی پیاری سی آواز آئی۔

”کیا حال ہے میری جان؟“ میں نے پیار سے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بھائی میری گڑیا توڑ دیتا ہے۔“ اس نے عبداللہ کی شکایت کی۔

”اب جب تم لوگ پاکستان آؤ گے تو میں اس کی پٹائی کروں گی.....“ میں نے اس سے وعدہ

کیا۔ اس کے بعد تکھت نے فون لے لیا۔ گپ شپ ہوتی رہی، تب تکھت نے بتایا کہ اس کی کوئی

دوست پاکستان آئی ہوئی ہے اور وہ مجھ سے رابطہ کرے گی۔ اس کو تکھت نے میرے موبائل کا نمبر

”اللہ کرے آپ کا خواب سچا ہو اور آپ لوگ عید اپنے نئے گھر میں کرو.....“ میں نے دل

سے دعا دی۔

”میری کوشش ہوگی کہ عید الفطر اور عید الفصحی کے درمیانی عرصہ میں کم از کم دو بہنوں کی

شادیاں کر دوں.....“ میں محسوس کر سکتی تھی کہ کس طرح اس کے کندھے پر دو بہنوں کا بوجھ تھا۔

”اللہ آپ کی خواہشات پوری کرے.....“ میں نے کہا۔

”میڈم کچھ پوچھنا تھا آپ سے اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو؟“ وہ جھجکا۔

”پوچھو!!“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کی اپنی شادی کب ہو رہی ہے؟ ذرا اعزازہ ہو تو ہم بھی اپنی تیاری اسی طرح رکھیں۔“

”آپ لوگوں نے کس چیز کی تیاری کرنی ہے.....؟“ میں حیران ہوئی۔

”آپ ہمارے لیے اتنا کرتی ہیں، ہمیں بھی تو بھرپور طریقے سے آپ کی شادی میں شرکت

کرنا ہوگی اور دوسری بات یہ کہ آپ کے چلے جانے کے بعد ممکن ہے مجھے ایسی مراعات حاصل نہ

ہوں نوکری میں، جیسی کہ اب ہیں۔ مظہر صاحب ذرا اور حراج کے ہیں، جانے ان کے ساتھ کام

کر پاؤں کہ نہیں؟“ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”مظہر علی! یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ یہاں نوکری اپنی قابلیت کی بنا پر

کر رہے ہو اور پرائیویٹ طور پر ایم بی اے بھی کر رہے ہو۔ یقیناً اس قابلیت کے بعد تنخواہ اور

مراعات میں اضافہ ہی ہوگا۔ رازق تو اللہ کی ذات ہے۔ اس طرح کے وہم اپنے ذہن میں نہ

پالو۔ اور رہی بات میری شادی کی، تو اس کی ابھی کوئی تاریخ قائل نہیں ہوئی، البتہ یہ ہے کہ آپ

سب لوگوں کی بھرپور شرکت ہی میرے لیے سب سے بڑا تھنہ ہوگا۔“

”میڈم! آپ اتنی عقیم ہیں کہ مجھ میں تو آپ کے احسانوں کے آگے سر اٹھانے کی تاب نہیں ہے۔“

”پلیز مظہر علی! مجھے شرمندہ نہ کریں اور کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔“

خواہ وہ مدد دفتر سے ہو یا پھر میری ذاتی حیثیت سے.....“ میں نے اس سے پوچھا۔

”بہت بہت شکریہ میڈم.....“ اس نے احسان مندی سے کہا۔

دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی میرے موبائل فون پر پیغام آیا۔ ”میں نگہت کے حوالے سے آپ سے ملنا چاہتی ہوں، ہم کب مل سکتے ہیں؟“

”آپ جب چاہیں گھر پر آجائیں.....“ میں نے جواب دیا۔

”میں آپ کے گھر پر نہیں بلکہ کہیں باہر آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر ممکن ہو تو مجھے وقت اور جگہ بتادیں۔“ ایک اور پیغام آیا۔

”ٹھیک ہے آپ کل گیارہ بجے میرے دفتر میں آجائیں، میں آپ کو ایڈریس سمجھاتی ہوں کال کر کے۔“ میں نے پھر پیغام بھیجا۔ اور اس سے پہلے کہ میں کال کرتی، پیغام آیا۔

”مجھے دفتر کا ایڈریس معلوم ہے، کال نہ کریں میں کہیں میٹنگ میں ہوں۔ کل گیارہ بجے ملاقات ہوگی۔“ جواب آیا، پھر بھی میں یہ سوچ کر کال کرنے لگی کہ اس سے اس کا نام ہی نہ پوچھا تھا، نہ ہی نگہت نے بتایا تھا۔ پھر اس کی کال نہ ملی تو سوچا کہ نگہت سے کال کر کے اس کا نام پوچھ لوں۔ پھر اس خیال کو جھٹک دیا کہ کل ملاقات ہوگی تو پھر ہی پوچھ لوں گی۔ اس کا نام فون میں نگہت کی دوست کی حیثیت سے لکھ لیا تھا۔

”کون تھا بیٹی.....؟“ امی جان نے پوچھا۔

”نگہت کی دوست ہے کوئی، لندن سے آئی ہے اسی کا پیغام تھا، مگر نام نہیں بتایا۔“ میں نے کہا، ”خیر کل ملے گی تو پوچھ لوں گی۔“

دفتر پہنچ کر میں نے چڑا سی کو بتایا کہ گیارہ بجے میرے مہمان آئیں گے ان کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ اس کے بعد میں نے ضروری فائلیں منگوا کر چیک کیں، ہدایات وغیرہ جاری کیں تاکہ گیارہ بجے سے قبل فارغ ہو جاؤں..... ذہن میں یہ بھی سوچا کہ اگر نگہت کی دوست کے پاس وقت ہوا تو اسے لُچ کے لیے باہر لے جاؤں گی۔ اس سے قبل میں نے منظر علی کو بلا کر امی جان کی طرف سے تجھے کا پیغام دیا اور اس سے کہا کہ فی الحال اس سر پرانز کو وہ خود تک ہی محدود رکھے۔ ”لیکن یہ تو بہت زیادتی ہوگی میڈم!“ وہ بولا تھا۔

”وہ اپنی خوشی سے مدد ہی ہیں، کسی کے کہنے سے نہیں دے رہی ہیں، اس لیے آپ بے فکر رہو۔“

”جیسا تجھ دینے کی ہماری حیثیت نہیں ہے، ویسا تجھ ہم لے بھی کیونکر سکتے ہیں.....؟“

”تجھ دینے والے کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے، لینے والے کی نہیں.....“ میں نے امی جان کے الفاظ ہی اسے بتائے اور پھر اسے بتایا کہ میں کسی مہمان کا انتظار کر رہی تھی۔ تب وہ شکریہ کہہ کر اجازت لے کر چلا گیا۔

گیارہ بجنے میں ابھی دو تین منٹ باقی تھے جب میں نے اسے شیشے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا اور چڑا سی نے مجھے اطلاع کی۔ جس وقت وہ میرے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اس وقت گھڑی پر پورے گیارہ کا وقت تھا۔ پابندی وقت کی ایسی ”خوبصورت مثال“ میں نے اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔ میں عورت ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ ترشا ہوا بدن اور خوبصورت نقش و نگار، اس پر پہننے کا سلیقہ، وہ اتنی جاذب نظر تھی کہ میں اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا بھی بھول گئی کہ وہ بیٹھ جائے۔ اس کی انگلی پکڑے اسی کی مکمل اور ہو بہو تصویر چار پانچ سالہ بچی جو کسی گڑیا کی طرح لگ رہی تھی۔ ”بیٹھے پلیز!“ میں نے خود بھی بیٹھے ہوئے کہا۔ اس نے خود بھی ایک سیٹ سنبھالی اور بچی کو بٹھایا۔

”بہت بہت شکریہ ماہا.....“ وہ بولی تھی۔

”کتنی پیاری بچی ہے..... کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟“ میں نے انگریزی میں بچی سے پوچھا۔

”انامیکا!!!!!!“ اس کا کہنا تھا کہ میرا پورا جسم سُن ہو گیا، میری چھٹی جس کچھ اشارہ کر رہی تھی۔

”آپ یقیناً رابعہ ہوں گی؟ انامیکا کی خالہ“ میں نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کی۔

”کافی کچھ جانتی ہیں آپ معظم کی فیملی کے بارے میں؟“ اس نے طنز سے پوچھا۔

”معظم نے خود ہی بتایا تھا مجھے آپ کے اور انامیکا کے بارے میں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”جو کچھ اس نے بتایا، آپ نے اس پر یقین کر لیا؟“

”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ میرے پاس نہیں ہے..... اور وہ میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولیں گے۔ ہمارے سچ جو رشتہ قائم ہونے جا رہا ہے اس کی بنیاد ہی اعتماد اور سچائی پر ہوتی ہے۔“ میں نے یقین سے کہا۔

”میں بھی یہی سمجھتی تھی..... میں نے بھی اس سے رشتہ قائم کرتے وقت اعتماد کو ہی بنیاد سمجھا

تھا..... مگر اس نے اس اعتماد کی دھجیاں بکھیر دیں.....“ وہ سسکی۔

”کیا کیا اس نے آپ کے ساتھ؟“ میں نے کمزوری آواز میں کہا۔

”مجھ سے کوئی بھی سوال نہ کرو صرف میرا نام پوچھو تو آپ کے آدھے سوالات کا جواب آپ کو خود ہی مل جائے گا۔“ اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا..... ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں وہ خیال آیا اور میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا آپ زرتاشیہ ہیں؟“ میں چلتی ہوئی اس کی نشست کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ معصوم بچی ہم دونوں کی گفتگو اور اس کے مطالب سے بے نیاز نہیں دیکھ رہی تھی۔

”ہاں! آپ ٹھیک سمجھی ہو!!! میں تاشی ہوں.....“ اس نے کھڑے ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا..... اس کی اس تصدیق نے میری ٹانگوں سے رہی سہی جان بھی نکال دی۔

”آپ تو.....“ میں ہکلائی، ”میرا مطلب ہے کہ مجھے معظم نے بتایا تھا کہ آپ کا خدا نخواستہ انتقال ہو گیا تھا.....؟“

”ہاں! اپنی طرف سے تو اس نے مجھے مارنے میں کبھی کسر نہیں چھوڑی لیکن میری زندگی تھی، جو میں اس کے چنگل سے نہ صرف نکل گئی بلکہ آزادی اور سکون کی زندگی بھی بسر کر رہی ہوں.....“ اس کا لہجہ زہر میں بھیگا ہوا تھا۔

”مگر اس نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا؟ اگر آپ زندہ تھیں تو مجھے بتا دیتا کہ آپ زندہ ہیں.....“ میں اب تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

”پھر آپ کئی سوال کرتیں ماہا! وہ ایسا ہی فراڈیا ہے۔ بیوی کی موت کی داستان سنا کر جو ہمدردی اور پیار اس نے آپ سے حاصل کر لیا ہے وہ علیحدگی کی خبر سن کر یا طلاق کی خبر پر آپ کو محسوس نہ ہوتا۔ کبھی آپ اس کو مظلوم سمجھتیں، کبھی ظالم۔ آپ کے ذہن میں کئی ابہام ہوتے..... میرے وجود کو دودھ سے کبھی کی طرح نکال کر وہ آپ سے منگنی کروا کے آپ کو اپنے الفاظ اور وعدوں کی سنہری زنجیروں میں باندھ کر چلا گیا ہے۔ وہ ہے ہی ایسا لفظوں کا کھلاڑی، جادوگر ہے پورا۔ اور اس کی ظاہری شکل و صورت آپ کی اور میرے جیسی لڑکیوں کو با آسانی اسیر کر لیتی ہے۔“

وہ بول رہی تھی اور میرے وجود سے گویا میری جان نکل رہی تھی۔

میں نے ٹیبل کی سطح پر اپنی انگلیاں جمائیں اور خود کو کرسی پر گرا دیا، میرے سامنے گزرا ہوا وقت فلم کی طرح آ رہا تھا۔ اور میرا دل چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ معظم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے..... میں نے امید کا سراہا تھا میں پکڑا۔

”آپ کو میرے بارے میں کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈاکٹر اعجاز کو جانتی ہوں آپ ماہا؟ آپ کی سابقہ زندگی کے شوہر؟.....“

”ہوں!!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”وہ غالباً“ ڈاکٹر معظم صاحب“ کے بارے میں جانچ پڑتال کر رہے تھے اور کسی نے انہیں میرے پاس بھجوادیا۔ تب میں نے انہیں وہی بتایا جو حقیقت ہے..... اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو کال کر کے اس فراڈیے کی اصلیت بتاؤں۔ سوئے اتفاق میں پاکستان آ رہی تھی، تب میں نے سوچا کہ خود ہی آپ سے مل کر آپ کو ساری حقیقت بتاؤں۔“ اور اس کی اس وضاحت سے میرا یہ شک اور بھی جڑ پکڑ گیا کہ نگہت نہ چاہتی تھی کہ میں شادی کروں اور اس کی امی جان بے آسرا ہو جائیں۔ یقیناً اس نے یہ سارا ڈرامہ تیار کیا ہوگا مجھے معظم سے بدلہ کرنے کے لیے۔ میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمائیں۔

”کون ہیں آپ اور یہ سب ڈرامہ کس کے کہنے پر کر رہی ہیں آپ؟“

”میں وہی ہوں ماہا، جو آپ کو بتا رہی ہوں!! آپ چاہو تو معظم سے کہو آپ کو میری کوئی تصویر دکھا دے..... اس بچی سے اس کا نام پوچھیں تو تب آپ کو یقین آئے گا، دنیا میں اس نام کی بہت زیادہ لڑکیاں نہیں ہوں گی۔ جن کے نام کا مطلب ہی یہ ہو کہ اس کا کوئی نام ہی نہیں..... کیونکہ اس بچی کی کوئی پہچان ہی نہیں، اس کا تعلق دنیا میں ایسے بچوں کی کینگری سے ہے جو عمر بھر اپنی شناخت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دو ایسی کشتیوں کے مسافر جو ایک دوسرے سے فاصلے پر سفر کر رہی ہوتی ہیں۔ دیکھو اس بچی کی آنکھوں میں، اور ابھی آپ کے پاس وقت ہے، مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرو، بچ جاؤ اس شخص سے جس نے آپ سے قدم قدم پر غلط بیانیوں کی ہوں گی اور آئندہ زندگی میں آپ بھی کوئی دھوکہ کھاؤ گی.....“ اس کے لہجے میں انتباہ تھا۔

میرا وجود گھٹلنے لگا..... پھر بھی میں خوش فہمی میں مبتلا تھی۔

”اگر آپ زندہ تھیں..... میرا مطلب ہے کہ ہیں تو اس کے گھر والوں کو کیوں علم نہیں ہے؟“

”اس کے گھر والوں کو تو یہ بھی علم نہ ہوگا کہ میں اس کی پہلی بیوی تھی۔ اور انا میکا اس کی بیٹی کے علاوہ اس کی پہلی بیوی کے بطن سے اس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کی عمر اس وقت دس سال ہے اور مجھ سے اس کے اختلافات اسی بات پر شروع ہوئے تھے.....“ میری آنکھیں حیرت کی زیادتی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں..... اور ایک لفظ نہ بول سکی۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ کو میری باتوں پر اب بھی زیادہ یقین نہیں آرہا ہے.....“ وہ بولی۔

”لیکن وہ ایسا دھوکہ کیوں کرے گا؟ اس کے گھر والے یوں اس کے ساتھ اس دھوکے میں شامل کیوں ہوں گے اور سب سے بڑھ کر میری سگی بہن..... صدف آپنی!! وہ ایسا کیوں کریں گی؟“ میرے لیے سب ناقابل یقین تھا۔

”گھر والے کچھ جانتے ہوں تو..... اس نے جس طرح اپنی پہلی شادی کو گھر والوں سے چھپالیا، جو اس نے زمانہ طالب علمی میں کی تھی اور پھر اس شادی کو اس نے اس وقت طلاق سے ختم کر دیا جب اسے میں ملی..... اور میں بھی اس کی چکنی چڑی باتوں سے دھوکہ کھا گئی، اس کی اصلیت ہی نہ جان پائی..... اس سے شادی ہو گئی اور اس کے چار سال کے بعد مجھے علم ہوا جب اس کی برٹش بیوی بیٹا نے اس کے بچے کے لیے خرچ اور اس کی جائیداد میں سے حصہ طلب کیا.....“ وہ سانس لینے لگی۔

”آپ کے والدین تو وہیں رہتے تھے انہوں نے رشتہ کرنے سے قبل تسلی کیوں نہ کی؟“ میں نے سوال کیا۔

”ماہا! ماں باپ تو اپنی بیٹیوں کے لیے بہتر ہی سوچتے ہیں اور جانچ پڑتال کر کے رشتے کرتے ہیں۔ لیکن جب میرے جیسی نا تجربہ کار لڑکیاں اپنے دماغ کی بجائے دل کی مان کر اپنی زندگی کے اہم فیصلے خود کرنا شروع کر دیں تو ماں باپ کا کردار ثانوی سا رہ جاتا ہے۔“

”مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو بھی اس نے اپنی وجاہت اور اپنی گفتگو سے شیشے میں اتارا ہوگا اور والدین یا آپ کی سرال والوں کا کردار بعد میں آیا ہوگا.....“ اس نے کتنا صحیح اندازہ لگایا تھا۔

”آپ کبھی اپنی سرال آئیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”صرف ایک دفعہ، شادی کے فوراً بعد تقریباً دس دن کے لیے اور اس کے بعد میں بھی

معروف رہی پھر معظم خود بھی کم ہی پاکستان آتا ہے.....“ اس نے بتایا۔

”آپ کو کہیں جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟“ میں نے اچانک سوال کیا۔

”ایسی کچھ خاص نہیں، مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہو؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”میں آپ کے بیان کی تصدیق کروانا چاہتی ہوں!!“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”صدف آپنی نے آپ کو دیکھا ہوا ہے نا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں ظاہر ہے، وہ معظم کی چچی ہیں.....“ اس نے کہا۔

میں نے صدف آپنی کو کال کی، وہ معروف تھیں تاہم میں نے ان سے انتہائی ضروری کام کا کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے بعد ان کی کال میرے موبائل پر بھی آتی رہی مگر میں نے اٹینڈ نہ کیا، وہ وجہ پوچھتیں، میں سو سو وضاحتیں دیتی اور یوں میں جس طرح سے چاہتی تھی ویسے میری تسلی نہ ہو پائی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ چالیس سے پچاس منٹ میں آجائیں گی۔

تاشی سے میں نے چائے کا پوچھا تو اس نے انکار کیا، تب میں نے کال کر کے سیکرٹری کو بتایا کہ پہلے جس مجھ کو سنا اور پھر چائے اور لوازمات، اس کے علاوہ میں نے انا میکا کے لیے چاکلیٹ منگوائے اور چپس۔ بچی اس قدر پیاری تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا اسے اپنے بازوؤں میں بھر لوں۔ لمبے، گھٹنگریالے اور سنہری بال اور پھولے پھولے گال..... کیا کیا سوچا تھا میں نے اس بچی کے حوالے سے..... اور اپنے سامنے دیکھ کر میں وہ سب بھول گئی تھی۔ ”معظم نے آپ کو طلاق دے دی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے تو مجھے چیلنج کیا تھا کہ وہ مجھے طلاق نہیں دے گا، تب میں نے شرعی عدالت سے خلع لی اور اس کے بدلے تمام جائیداد سے دستبردار ہو گئی، مجھے اپنی زندگی کو اپنے رنگ سے اور اپنی آزادی سے جینا تھا اور وہ مجھے گھر میں قید کر دینا چاہتا تھا۔“

”بیٹا کو وہ چھوڑا چکا تھا اور آپ نے اپنی پسند سے شادی کی تو پھر آپ کے درمیان کیا اختلافات ہو گئے کہ آپ کو خود خلع لینے کی نوبت آگئی؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

”شادی ایک بندھن ہے ماہا! اعتماد کا، آپ اپنے وجود کو گویا ایک شخص کے حوالے کر دیتے ہیں پورے خلوص ایمان داری اور نیک نیتی کے ساتھ۔ اور جب کبھی آپ کو یہ احساس ہو کہ اعتماد کا یہ رشتہ

یک طرفہ ہے، دوسرا فریق آپ سے کبھی تخلص تھا ہی نہیں تو اعتماد کا شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑا کیا دھچکہ ہو سکتا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا..... اگر کسی عورت کے بارے میں یہ انکشاف ہو تو اس کا شوہر اسے ایک پل بھی گھر پر نہ رکھے، اسے تو آن چھوٹی کلی چاہئے ہوتی ہے، خود بے شک وہ اپنے وجود کو شراب کے پیمانے کی طرح استعمال کر چکا ہو جو بار بار بھرا جاتا ہے اور بار بار خالی ہوتا ہے..... میں پھر بھی برداشت کر لیتی، پھر بھی گزارا کر لیتی یعنی اگر مجھ پر اس کی دیگر برائیوں کا انکشاف نہ ہوتا۔“ وہ بڑے کرب سے کہہ رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اما اسے ڈرنک کرنے کی عادت ہے اور گھر سے باہر منہ مارنے کی بھی، اسی وجہ سے ہمارے درمیان آئے دن اختلافات رہتے..... میں نے اس بندھن کو بہت نبھانے کی کوشش کی کیونکہ میرے وجود کا خیر مشرق کی مٹی سے بنا تھا، ویسے بھی وفاداری صرف مشرقی عورتوں کا شیوہ نہیں، مغرب میں بھی وفادار عورتیں ہیں۔ مگر اس نے انتہا کر دی، اس نے میرے وجود کو نہیں بلکہ میری روح کو گھائل کرنا شروع کر دیا تھا۔“

”میں سمجھی نہیں؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”وہ مجھ پر نفس کی حالت میں تشدد کرتا، مجھے جسمانی اور ذہنی تکلیفیں دیتا تھا، تب مجھے مجبوراً پولیس کو رپورٹ کرنا پڑی اور پولیس نے اسے اپنی حراست میں لے لیا۔“ وہ سانس لینے کو رکھی۔

”پھر؟“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں پریگنٹ تھی..... اپنے ہوش و حواس میں مجھے شادی کے بعد پانچ برس تک مجھے جس حق سے اس نے محروم رکھا تھا، وہ اس سے نفس میں سرزد ہو گیا تھا۔ تب میں نے اسے اس آنے والے وجود کی خاطر معاف کر دیا، حالانکہ اس نے کبھی معافی مانگی نہ کبھی اپنے کرتوتوں پر شرمندگی محسوس کی۔ عدالت میں میں نے خود اس کے خلاف شکایت واپس لے لی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس لیے اسے معاف کر دیا تھا کہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی..... میں توقع کر رہی تھی کہ وہ اس خوشخبری پر اچھل پڑے گا اور مجھے بانہوں میں بھر لے گا.....“ وہ سسک پڑی، ”ذرا تصور کرو اس نے کیا کیا ماہا!!“

”آپ بتائیں..... مجھے کچھ اندازہ نہیں!!“

”اس نے مجھے گھونسلوں، تھپڑوں اور ٹھنڈوں پر رکھ لیا۔ اس نے مجھ پر گھنیا الزام لگایا کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اپنے کسی یار سے مراسم کا شراں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی تھی، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، ”اس سے بڑی ایک عورت کی کیا توہین ہو سکتی ہے؟“

”مجھے تو معظم نے بتایا تھا کہ آپ بچہ نہیں چاہتی تھیں؟“ میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

”اما! آپ بھی ایک عورت ہو..... آپ ہی بتاؤ کون سی عورت ہے جو اپنے وجود کی تکمیل نہیں چاہتی، آپ کے دل میں شادی کے بعد بچے کی خواہش ہو سکتی تھی کہ نہیں؟“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... مجھے تو بن دیکھے اور بناٹے انامیکا سے بھی پیار ہو گیا تھا، یہ سوچ کر کہ معظم کی بیٹی ہے اور میں اسے ماں کا پیار دوں گی، اس کا کوئی اچھا سا نام رکھوں گی.....“ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”کبھی بھولے سے بھی اس خواہش کا اظہار معظم کے سامنے نہ کرنا، اس نے بیٹا پر بھی یہی الزام لگا کر اسے طلاق دی اور پھر مجھ پر بھی یہی گھنیا الزام لگایا اور میں آپ کو بتا رہی ہوں، جس دن آپ نے نے اپنی مٹا کی تکمیل کا خواب دیکھا وہ دن آپ کی زندگی کی خوشیوں کا آخری دن ہوگا.....“ ناشی نے کہا تو میں اس عجیب سے خیال سے ہی کانپ اٹھی۔

”آئی میں آپ کو پیار کر لوں؟“ معصومیت سے انامیکا پوچھ رہی تھی۔ میں مسکرا دی اور اسے سمیٹنے کو اپنے بازو پھیلا دیئے..... وہ میری بانہوں میں سمٹ آئی..... ”تھینک یو آئی! آپ بہت اچھی ہیں، مجھے چاکلیٹ اور چپس بنوا کر دیئے.....“

”تمہیں پسند ہیں چاکلیٹ اور چپس؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت زیادہ!!“ اس نے کہا۔

”اور کیا پسند ہے؟“

”مجھے اپنی مہم پسند ہیں، مانو پسند ہیں، رابی آئی پسند ہیں اور“ اس نے سہم کر ماں کو دیکھا۔

”اور اسے اپنے پچا بھی بہت پسند ہیں..... اس شخص نے مجھے اذیت دینے کے لیے اس بچی

کو رابطہ رکھ کر اپنا گرویدہ کر رکھا ہے..... حالانکہ یہ وہی بچی ہے جس کے وجود کو وہ اپنا نام دینا بھی نہ چاہتا تھا۔“ ناشی نے بچی کا جملہ مکمل کیا۔

”آپ اس کے سامنے یہ بات نہ دہرایا کریں۔ ابھی تو یہ بچی ہے، کل کو بڑی ہوگی، باشعور ہوگی تو اس کو یہ باتیں بہت تکلیف دیں گی۔“ میں نے کہا۔

”بہت شکریہ، آپ نے ایک عورت بن کر سوچا۔“

”ایک اور درخواست کروں آپ سے؟“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کہو؟“ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

”انامیکا کا نام تبدیل کر کے کوئی اچھا سا نام رکھیں، جتنی پیاری یہ خود ہے!!“

”کوشش کروں گی، کیونکہ نام کی تبدیلی کے لیے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کئی طرح کی دستاویزات پر اس کا نام موجود ہے۔ تاہم وعدہ کرتی ہوں کہ کوشش کروں گی۔ آپ بتاؤ کوئی نام؟“ اس نے کہا۔

”میں؟“ میں ایک دم بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی، ”اس وقت فوری طور پر تو کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آ رہا ہے، تاہم سوچ کر بتاؤں گی۔“

”آپ کی اپنی بیٹی ہوتی تو آپ اس کا کیا نام رکھتیں؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا تو میرے وجود میں محرومی اور درد کا احساس جاگا۔ میری یادوں کے درپچوں میں شدت سے غالب کی یاد اتر آئی۔ غالب مجھے چھوڑ کر کیا گئے تھے۔ اس کے بعد خوشیوں نے بھی ایک ایک کر کے مجھ سے منہ موڑنا شروع کر دیا تھا۔

”خوشبو!!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”بہت پیارا نام ہے، میں یہی نام انامیکا کو دوں گی!“ اس نے کہا، ”آپ کو برا تو نہ لگے گا؟“

”ارے نہیں!!“ میں نے مسرت سے کہا۔

”یوں بھی ایک نام ایک شخص کا تو ہوتا نہیں، آپ کی بیٹی ہوئی کبھی انشاء اللہ تو بے شک آپ بھی یہ نام رکھ لیتا۔ جب بھی آپ کبھی اپنی بیٹی کو پکارو گی تو آپ کو یاد آیا کرے گا کہ دنیا میں کسی خطے میں ایک بد قسمت بچی بھی اسی نام کی رہتی ہے۔“ وہ سسکتے لگی تو میری آنکھیں بھی بھر آئیں، میں نے انامیکا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا جو ماں کو دیکھ کر منہ بسور رہی تھی۔

تبھی فون پر اطلاع آئی کہ صدف آپلی باہر پہنچ گئی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کے لیے دروازہ کھولا دروازے کے نیچے ہی میں ان سے گلے ملی اور پھر انہیں لے کر وہاں بڑھی جہاں تاشی مگر

کے بیٹھی تھی، انامیکا تو سامنے ہی کھڑی تھی، مگر وہ کون سا اسے پہچانتی تھیں۔

”کیا بات ہے، خیر تو ہے، یوں اس طرح اچانک بلانے کی؟“ صدف آپلی نے غصے سے کہا۔

”آپ کو ملنا تھا کسی سے!!“ میرے کہتے ہی تاشی اٹھ کھڑی ہوئی اور جونہی اس نے اپنا چہرہ

ہماری طرف کیا، صدف آپلی کی حالت دیدنی تھی، مجھے لگا کہیں وہ پورے قد سے نیچے ہی نہ

جاگریں۔۔۔۔۔ ”کو۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ کون ہے یہ؟“ وہ ہکلائیں۔

”یہی پوچھنے کے لیے تو میں نے آپ کو یہاں بلایا ہے۔“

”السلام علیکم صدف آپلی!“ آگے بڑھ کر تاشی نے انہیں سلام اور معافتہ کیا۔۔۔۔۔ صدف آپلی

کی آنکھیں یوں حیرت سے پھٹ رہی تھیں جیسے کوئی بھوت ان کو گلے مل رہا ہو۔۔۔۔۔

”تم زندہ ہو؟“ بمشکل ان کے منہ سے نکلا۔

”آپ نے یہ کیوں سمجھا کہ میں زندہ نہیں ہوں؟“ وہ مسکرائی۔

”کیونکہ معظم نے بتایا تھا، تم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“ وہ اپنا فقرہ بھی مکمل نہ کر سکیں۔

”کیا آپ کو خود معظم نے بتایا کہ میں مر گئی ہوں؟“ اس نے بے رحمی سے سوال کیا۔

”نہیں، مجھے رانی باجی نے بتایا تھا۔۔۔۔۔“ صدف آپلی نے کہا۔

”صدف آپلی!! میں معظم کی بیوی تھی اور اس کی بیٹی کی ماں!! اگر میں مرجاتی تو آپ نہ سہی کم

از کم میری ساس اور سرسرو کو تو میری تکفین و تدفین پر لندن آنا چاہئے تھا ناں؟ کبھی اپنی پوتی سے رابطہ

کرنا چاہئے تھا ناں؟“ تاشی نے سوال کیا۔

”ہاں!!“ صدف آپلی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا، ”لیکن میں نے کبھی اس بات پر غور ہی

نہیں کیا، جتنا انہوں نے بتایا، اسی کوچ سمجھا اور اس سے زیادہ سوال و جواب بھی نہیں کیے۔ اصل

میں میری ایسی عادت ہی نہیں ہے غیر ضروری سوالات کرنے کی۔“

”ویسے تو آپ چاہے سوالات نہ کریں صدف آپلی، لیکن اپنی بہن کا رشتہ طے کرتے وقت یہ

آپ کا فرض اور ماہا کا حق تھا۔ خصوصاً اس بچی کے بارے میں چیک کرتیں، اس کی پہلی بیوی بیٹا

اور اس کے بیٹے کے بارے میں چیک کرتیں۔۔۔۔۔“ تاشی نے ایک اور انکشاف کیا تو صدف آپلی

صوفے پر ڈھسے گئیں۔

”تم کیا کہہ رہی ہو تاشی؟ یہ سب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔۔۔۔۔“ صدف آپلی کی آواز غڑھال



سائنس مفقود، جسم بے نشان

زمین ہے پیروں تلے

نہ سر پہ آسمان

نہ کوئی پہچان، نہ کوئی روشنی

نہ آواز کوئی نہ کوئی ساتھی

آخر میں ہوں کہاں؟ ○

صدف آپنی اور تاشی کیا بول رہی تھیں، کیا حکمت عملی وضع کر رہی تھیں؟ مجھے کچھ علم نہ تھا۔ کب وہ دونوں اٹھیں، کیسے مجھے ملیں، جاتے ہوئے انہوں نے کیا کہا..... مجھے سمجھ میں ہی نہ آیا۔ کمرہ خالی ہوا تو لگا کہ میں کسی لبق و دق صحرا میں کھڑی تھی..... دھوپ غالباً بہت تیز تھی کہ سر جل رہا تھا، سالوں سے پانی نہ پیا تھا کہ حلق میں کانٹے سے اُگ آئے تھے اور ریت بھی بہت گرم تھی کہ پاؤں کے تلوے جل رہے تھے..... اور میں پھر اس بات سے بھی غافل ہو گئی کہ مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔

آنکھ کھلی تو میں والدہ کے گھر میں اپنے بستر پر تھی، اٹھنے کی کوشش کی تو بدن کی طاقت ہی سنبھانہ ہو پائی، غالباً میں کسی سکون آور انجکشن یا دوا کے زیر اثر تھی، لیکن میں وہاں آئی کیسے تھی؟ یاد ہی نہ آ پ رہا تھا، سیدھی لیٹ کر چھت کو گھورنے لگی تو ہلکا ہلکا سایا دانے لگا کہ آفس میں کیا ہوا تھا۔ ”اوہ غالباً میں بیہوش ہو گئی ہوں گی؟“ خود ہی خیال آیا۔ مجھے لگا کہ میں نے سب خواب دیکھا تھا۔ مگر نہیں، تاشی کا لہجہ، انا میکا کالس، سب میرے حواسوں میں زندہ تھا، میں اپنی بد قسمتی پر آنسو بہانے لگی۔

ہلکا سا کھٹکا ہوا تو میں نے کروٹ بدل لی۔ یقیناً والدہ آئی ہوں گی اور مجھے اپنے آنسوؤں سے چھپانا تھے۔ میں نے تو مشکل ترین حالات میں بھی کبھی ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھیں کیسے میں ان کو پریشان کر سکتی تھی۔ اور والدہ کے دل کا مرض یاد آتے ہی مجھے وہ دھوکہ باز دل کا ڈاکٹر جانے کیوں یاد آ گیا؟

”ماہا!! میری جان جاگ رہی ہو کیا؟“ والدہ کی آواز آئی۔ میں خاموش رہی۔ ”ہوں“ کی آواز بھی نکالتی تو وہ میرا بھیگا ہوا لہجہ جان جاتیں..... ماں ہیں ناں، اولاد کے مزاج کے ہر موسم

سی تھی۔ ”مجھ سے رانی باجی نے یہ سب کیوں چھپایا؟ جانے انہیں خود بھی یہ سب علم ہے کہ نہیں؟“ ”انہیں سب علم ہے صدف آپنی..... اور وہی ہیں جو یہاں بیٹھے معظم کو بتاتی رہتی تھیں کہ اسے طلاق مت دینا، ورنہ آدمی جانیدا سے محروم ہو جاؤ گے۔ تب میں نے اس کی ”آدمی جانیدا“ پر تھوک کر اس کی قیمت میں اپنی پوری آزادی خود ہی حاصل کر لی۔ جو راستے ہمارے مذہب نے بنا رکھے ہیں دنیا کے ہر قانون سے افضل ہیں اور میں سکون میں ہوں، سوائے اس کے کہ اس کا اب بھی میری بیٹی سے رابطہ ہے اور میں قانونی طور پر مجبور ہوں ورنہ میں اس شرابی، زانی اور تشدد پسند انسان کا سایہ بھی اپنی بیٹی پر نہ پڑنے دوں..... آپ یقین کریں، وہ اتنا گھٹیا انسان ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کی عزت کی طرف سے بھی خطرہ رہتا ہے.....“ تاشی کے کہنے پر مجھے پھریری سی آگئی۔

”تاشی!! تم نے آکر میری بہن کو تو برباد ہونے سے بچالیا ہے، لیکن یقین کرو میرا اپنا دل نہیں چاہ رہا ہے کہ میں اس گھر میں لوٹ کر جاؤں۔ آخر کیا سوچ کر مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولا گیا..... کیا میں اس گھر کی فردائیں جو مجھے حقیقت بتائی جاتی؟“ صدف آپنی رونے لگیں، ”اور میری بہن کیسی بد قسمت ہے۔ کیا سوچ رہی ہو گی میرے بارے میں کہ میں اسے کنوئیں میں دھکا دینے والی تھی اپنے ہی ہاتھوں سے؟“

”پلیز صدف آپنی! ایسا نہ کہیں“ میں نے انہیں ساتھ لگا لیا اور وہ چٹکیوں سے رونے لگیں، ”آپ کا اس میں کیا تصور تھا؟ آپ تو بے خبر تھیں اور وہی سچ سمجھتی تھیں جو آپ کو بتایا گیا تھا۔“ ”آپ اپنے دل پر بوجھ نہ لیں..... ہر کام میں اللہ کی کوئی بہتری ہوتی ہے۔ اس نے میری اور بیٹا کی زندگیاں برباد کیں اور مزید ایک زندگی برباد کرنے والا تھا، یہ سن کر میں رہ نہ سکی اور وقت نکال کر خود لندن سے آئی تاکہ آپ کو یقین ہو جائے۔ فون پر میں کچھ کہتی تو آپ کو کبھی یقین نہ آتا.....“ اس نے شروع سے اپنی کہانی صدف آپنی کو سنانا شروع کر دی۔ صدف آپنی کے آنسو ہی نہ تھم رہے تھے۔ بیچ میں کبھی وہ تاشی کو ساتھ لگا لیتی تھیں اور کبھی اس کی بیٹی کو لپٹا لیتی تھیں۔ اور میں..... میں کہاں تھی؟ میں تو بیچ خلاؤں کے تھم گویا..... نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی۔ آگے کیا ہوگا؟ لوگ کیا کہیں گے؟ مگنی، چاؤ چونچلے، مگر تنگ وعدے، باتوں کی خوشبو..... کبھی کبھی میرے ساتھ کیوں ہوتا تھا؟

○ میں بے وجود، میں بے اماں.....

سے آشنا، اس کے اندر تک کی کیفیات سے آگاہ۔ میں سمجھی جواب نہ پا کر وہ خاموشی سے باہر نکل جائیں گی اور میں جی بھر کر رولوں گی، اپنی بد قسمتی پر..... مگر وہ میرے بیڈ پر بیٹھ گئیں..... میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگیں.....

”روؤ نہیں بیٹا! اپنے دل پر بوجھ مت ڈالو۔ شکر کرو ہم بروقت بچ گئے.....“ کیسی غضب کی قیافہ شناس ہیں میری والدہ۔ شاید دنیا کی ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہوں گی؟ یہ سوچ کر تو میرے آنسو سمندر کی طرح موجزن ہو گئے کہ میری والدہ اس وقت کس کرب میں مبتلا ہوں گی۔ میری طرف سے تو سکون انہیں میسر ہو ہی نہ رہا تھا۔ ایک مسئلہ ختم ہو نہیں پاتا تھا کہ دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ میرا نکتہ بھی بھیگ رہا تھا۔ ”نروؤ بیٹا، تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں!!“ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اتنا سننا تھا کہ میں نے جھٹکے سے کروٹ بدلی اور خود کو ان کے سپرد کر دیا، میرا سر عین وہاں تھا جہاں ان کا دل سینے میں بے قراری سے دھڑک رہا تھا اور کہہ رہا تھا، ”نرو ماہا.....“

”میرے ساتھ کیوں ہوتا ہے والدہ؟ میرے ساتھ ہی ہر بار ایسے کیوں ہوتا ہے؟ کیوں میرا رب مجھ سے راضی نہیں؟ کیوں مجھے سب کچھ ملنے سے پہلے چھن جاتا ہے؟“

”یوں نہ کہو میری جان! آزمائش میں صبر کرتے ہیں، احتیاط سے بولتے ہیں، کوئی کفر کا کلمہ منہ سے نہ نکل جائے۔“ والدہ خود بھی سسک رہی تھیں۔

”میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں سوچا، میں نے تو کبھی کسی کو تکلیف پہنچانے کا سوچا ہے نہ کبھی دھوکہ دیا ہے۔ پھر کیوں زندگی میں خوشیاں مجھ سے روٹتی ہوئی ہیں..... نہ میری زندگی میں یہ تکلیفیں محرومیاں ہوتیں، نہ آپ میرے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو دل کا روگ لگا لیتیں..... والدہ آپ کہتی ہیں، ”بیٹیاں پھول ہوتی ہیں..... مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ساری بیٹیاں پھول نہیں ہوتیں، کچھ ٹھول ہوتی ہیں..... کوئی دھول ہوتی ہیں اور کوئی میری طرح امرئیل ہوتی ہیں جن پر نہ کوئی پھول ہوتا ہے نہ پتا..... خود تو محروم ہوتی ہیں مگر کسی دوسرے پیڑ یا تیل پر بھی ڈال دیں تو اسے بھی ختم کر دیتی ہیں..... سب اس سے اپنے چمن کو، اپنے باغ کو اور اپنے لان کو بچاتے ہیں والدہ..... کبھی یہ تیل ”غالب“ کے نام کے درخت سے وابستہ ہوتی ہے تو وہ تناور درخت سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے اور کبھی ”مومن“ نام کے ننھے سے پودے کو ختم کر دیتی ہے..... میں کیوں آئی دنیا میں، میں کس لیے ہوں..... اور کیا کیا کرنا ہے مجھے، کس چمن کی بربادی باقی

ہے.....“ میں با آواز بلند چیخ چیخ کر جانے کیا کیا فضول بول رہی تھی۔

ایک بات کا مجھے احساس تھا کہ میں کوشش کر رہی تھی کہ یہ سب نہ بولوں، لیکن جانے کیسے میرے منہ سے یہ سب الفاظ اور جملے نکل رہے تھے۔ میرے ذہن میں یہ سوچ بھی زندہ تھی کہ یہ سب والدہ کے لیے بہت پریشان کن ہوگا، لیکن کوشش کے باوصف بھی میں سب ہڈیاں بولے جا رہی تھی۔ شاید اسے ڈپریشن کا شدید دورہ کہتے ہوں گے، والدہ مجھے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تب میں نے صدف آپنی کو کو بھی دیکھا اور شاید انہیں غصے سے وہاں سے چلے جانے کو بھی کہا تھا۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ انہوں نے مجھے انجکشن لگایا اور جلد ہی میں نیند کی آغوش میں چلی گئی، غنودگی میں جاتے ہوئے بھی میرے تصور میں تاشی اور انا میکا کے چہرے تھے۔

دل بہت دکھتا ہے جب بندھن ٹوٹتے ہیں، رشتے ٹوٹتے ہیں، وعدے ٹوٹتے ہیں۔ کیسا لفظوں کا کھلاڑی تھا معظم۔ اس نے کیسے میرے دل کے بندر کھول کر اندر کرسی رکھ کر بیٹھ کر دکھایا تھا کہ عورت دھوکے سے بھی غلط لوگوں کو دل کا مہمان کر لیتی ہے۔

آٹھ دس دن تک میں مسکن دواؤں کے زیر اثر رہی تھی اور پھر آہستہ آہستہ صدف آپنی سے میری طویل نشستیں ہوئیں اور وہ نفسیات دان تو نہ تھیں مگر میری بہن تھیں۔ انہوں نے مجھے اس صدمے کے اثر سے نکال لیا۔ میں نے باقاعدگی سے نماز شروع کر دی اور دس دن کی قضا نمازیں بھی مکمل کیں۔ اللہ سے رورو کر اپنے کہے کی معافی مانگی۔ بے اختیاری میں جانے کیا کیا بک گئی تھی۔ اسی سے کہا کہ وہ میرے دل سے معظم کی محبت اگر قطرہ بھر بھی بچی ہے تو اسے نکال دے۔

صدف آپنی نے ہی بتایا کہ وہ میرے دفتر سے نکل کر گئی تھیں تو اس کے چندرہ منٹ کے بعد میری سیکرٹری نے انہیں اطلاع کی تھی، میں بے ہوش ہو گئی تھی، وہ میرے دفتر میں کال کر رہی تھی اور میں نے دس منٹ تک کال اٹینڈ نہ کی تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی اور آپنی کو کال کر دیا، کیونکہ وہ ڈاکٹر بھی تھیں۔ سو آپنی واپس آئیں اور پھر ہسپتال لے کر گئیں، وہاں سے فارغ کروا کے گھر لے آئیں۔

”والدہ کی طرف اس لیے لائی تھی کہ تم ڈپریشن کی وجہ سے بیہوشی میں بہت غلط سلط بول رہی تھیں۔“ صدف آپنی نے بتایا کہ میں نے بیہوشی میں بہت سی باتیں کیں غالب سے بھی اور

معظم سے بھی مگر جس شخص کو میں نے بہت یاد کیا اور معظم کی شکایتیں بھی لگائیں وہ تیمور تھا۔ ”تم تیمور سے بہت زیادہ اٹنچ ہو ماہا! اتنی کہ شاید تمہیں خود بھی اندازہ نہیں ہے.....“ صدف آپنی نے کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں سب سے زیادہ وہ سمجھتا ہے اور تم اسے.....“

”وہ میرے لیے ایک بھائی اور ایک دوست سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے.....“ میں صدف آپنی کی بات کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ ”واقعی ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں۔ آپ صحیح سمجھی ہیں، تیمور مجھے ہر مشکل میں اس لیے یاد آتا ہے کہ وہ میرے مسائل کو سمجھتا ہے، میرا خیال رکھتا ہے، میری عزت کرتا ہے۔“

بہت سارے دن لگ گئے اس بات کو سمجھنے میں کہ معظم میرا مقدر نہ تھا۔ صدف آپنی نے مجھے بھرپور توجہ اور وقت دیا، مجھے اس مشکل وقت میں سنبھالا اور سمجھایا۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ جب انہوں نے رانی باجی سے یہ پوچھا کہ انہوں نے ناشی کے سلسلہ میں جھوٹ کیوں بولا تو پہلے تو وہ یہی کہتی رہیں کہ وہ لاعلم تھیں لیکن جب صدف آپنی نے اصرار کیا کہ وہ سب کچھ جانتی تھیں تو پھر وہ ڈھٹائی سے کہنے لگیں، ”جب وہ ہماری، بہو ہی نہ رہی تو ہماری طرف سے جیسے یا مرے ایک برابر ہے اور ایسا اس لیے کہہ دیا تھا کہ اگر علیحدگی کا بتاؤ تو خاندان میں لوگ باتوں کے چسکے لگاتے ہیں۔ مرنے کا کہا تو چاروں سب نے افسوس کیا اور بھول بھال گئے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔“ صدف آپنی نے ہاتھ بچانچا کر جب رانی باجی کے لب و لہجہ کی نقل کی تو مجھے ہنسی آگئی۔

”کیسی بے حس عورت ہیں صدف آپنی، آپ کی جھٹانی!!“

”میرے لیے تو خود ان کا یہ روپ ایک نیا انکشاف ہے.....“ صدف آپنی نے کہا، ”واقعی ماہا! والدہ ایک محاورہ بولا کرتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ راستے کی مشکلات کا اندازہ تب ہوتا ہے جب اس راستے پر سفر شروع کر دو اور آدمیوں کی خوبیوں اور خامیوں کا تب علم ہوتا ہے جب ان سے کوئی قریبی تعلق قائم ہوتا ہے.....“

”سچ آپنی! بزرگوں کی کہی ہوئی ہر بات میں سالہا سال کی ریاضتوں اور عمر بھر کے تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔“ میں نے تائید کی۔

امی جان اور مظہر بھی میری خیریت معلوم کرنے آئے تھے، ماہ رخ اور اس کی والدہ بھی..... رانی باجی بھی..... تیمور کی کال ہر روز باقاعدگی سے آتی رہی، وہ بار بار اصرار کرتا اور پوچھتا کہ مجھے

کیوں ڈیپریشن کا ٹیک ہوا تھا، ”اب تو آپ کو خوش خوش رہنا چاہئے۔“

”تم آؤ گے تو بتاؤں گی۔“ میں نے کہا تھا۔ بگت کی کال بھی آتی رہتی تھی۔ اس سے میں نے وعدہ لیا کہ وہ اس راز کو کہیں طشت از بام نہ کرے گی۔ جو میرے مقدر کی تکالیف تھیں، آزمائشیں تھیں وہ مجھے خود پر ہی جھیلنا تھیں۔ اور کالیں تو اس کی بھی آتی رہیں جو اس تمام قصے کا کرتا دھرتا تھا۔ مگر میں نے اپنے دل کے کواڑ مقفل کر کے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے تاکہ اس کی صدائیں بھی مجھ تک نہ پہنچیں۔ میں نے موبائل فون کا نمبر ہی تبدیل کر لیا تھا اور نیا نمبر صرف محدود لوگوں کو معلوم تھا۔

والدہ کے علاوہ صدف آپنی کے گھرانے کے رانی باجی اور ان کے گھر والوں سے تعلقات میں سرد مہری آگئی تھی، جو کہ ایک قدرتی بات تھی۔ گھر واپس آنے سے قبل میں نے والدہ سے کہا کہ میں معظم کے گھر والوں کی طرف سے بھجوا یا گیا سامان تیار کر دوں گی، وہ کسی روز منگو کر ان کے ہاں واپس بھجوا دیں۔ زارا اور اس کی امی بھی میری خیریت دریافت کرنے کو آئیں، انہوں نے بتایا کہ گھر کا کام تیزی سے مکمل ہو رہا تھا اور جلد ہی وہ اس میں شفٹ ہونے والی تھیں۔ اپنا گھر..... کیسا خواب ہوتا ہے جو آنکھوں میں ہے تو چہرے پر خوشی میک اپ کی طرح ج جاتی ہے۔ مجھے آخری کے چہرے پر بھی اطمینان نظر آیا۔ اور خوشیوں کی جوت آنکھوں میں جیسے چمک رہی تھی۔

گھر لوٹی تو اپنے ہی گھر کے درود یو اراجنی سے لگ رہے تھے۔ کبھی بات کرتے کرتے بھول جاتی کہ کیا بات کر رہی تھی، کبھی کھانا کھاتے ہوئے اچانک جی اچاٹ ہو جاتا، کوئی کام کر رہی ہوتی تو دلچسپی ختم ہو جاتی اور ٹی وی دیکھ رہی ہوتی تھی تو معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ ٹی وی پر کیا پروگرام چل رہا ہے۔ میری یہ ذہنی کیفیت میرے لیے تو پریشان کن تھی ہی مگر مجھ سے بڑھ کر مظہر اور امی جان پریشان تھے۔ دفتر جانا میں نے چھوڑ دیا تھا۔ مظہر ہی مکمل ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا البتہ ہر روز رات کو واپس آ کر وہ رپورٹ مجھے پیش کرتا تھا، جسے میں قدرے غائب دماغی سے سنتی تھی۔

”بھابی! ماہ رخ بھابی آج دفتر آئی تھیں۔“ ایک روز مظہر نے مجھے اطلاع کی۔

”اچھا۔“ میں نے غیر دلچسپی سے کہا، ہو گا کوئی کام، مجھے اس سے کیا۔

”آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟“

”کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”تو کیا وہ پہلے بھی دفتر میں آتی رہتی ہیں؟“

”نہیں تو.....“ میں نے کہا۔

”پھر تو آپ کو حیرت ہونی چاہئے..... پوچھنا چاہئے آپ کو کہ وہ کیوں آئی تھیں۔“

”مجھے اب کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی.....“ میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے بھابی؟ مجھے تو بتائیں کہ آپ کو کیا بیماری ہے؟ اب آپ کی زندگی کا رُخ بدلنے جا رہا ہے۔ آپ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والی ہیں، ایسے حالات میں آپ کا ڈیپریشن جیسی بیماری میں مبتلا ہونا.....؟“ وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مظہر اور امی جان کو ابھی تک نئے حالات کا علم نہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ تیمور کو بھی نہ ہوگا..... حالانکہ میں سوچ رہی تھی بگمت اپنی ماں کو تو ضرور بتائے گی لیکن اس نے غالباً میرے کہے کا مان رکھا تھا۔ اور یوں بھی کوئی ایسی خوش کن خبر تو تھی۔

مجھے بگمت پر بے پناہ اعتماد کا احساس ہوا، اور میں اس کے بارے میں خواہ مخواہ میں بدگمان ہوتی رہی تھی۔ مجھے وہ بہنوں جیسی ہی تھی اور اس نے مجھے وہی مان دیا تھا۔ اس گھر میں ہر رشتے نے مجھے عزت اور مان دیا تھا، میں نے ان سے پیار کیا تھا، ان کی عزت کی تھی تو انہوں نے اس سے کہیں بڑھ کر مجھے جواب میں عزت اور پیار دیا تھا۔

”بس چھوٹو!“ میں نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کی، ”تم سے پچھڑنے کا سوچتی ہوں تو دل کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ اس گھر سے، اس گھر کے کینوں سے مجھے بہت انس ہے۔ میرے لیے آپ سب لوگ اہم ہیں۔ میری زندگی کا ملزم ہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہیں بھابی؟“ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی اور میری تو آنکھیں لبریز تھیں۔

اندر دکھوں کے سمندر جو رواں تھے۔

”تم سے کبھی جھوٹ بولا ہے میں نے؟“

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے کوئی کھٹ پٹ نہ ہوگئی ہو؟“ مظہر نے سادگی سے کہا تو میرے دل کی دھڑکن ڈوبنے لگی، کیسا ٹھیک قیافہ لگایا تھا اس نے..... ”کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی

کالیں بہت دفعہ آئیں کہ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے کہنے لگے ماہا سے کہنا صرف ایک دفعہ مجھ سے بات تو کرے.....“ شاید مجھے صبر آ گیا تھا کہ میرے وجود میں معظم کے ذکر سے کوئی ہنجل نہ ہوئی۔ ورنہ کتنے ہی دنوں میں نے دعائیں کی تھیں کہ میرے دل سے اس کی یاد تک ختم ہو جائے۔ مختصر سے عرصے کے تعلق میں اس نے مجھے لفظوں کی جن ریشی زنجیروں سے باندھا تھا وہ توڑتے توڑتے میرے اعصاب بھی شل ہو گئے تھے۔

”اچھا بتاؤ کیوں آئی تھی ماہ رُخ؟“ میں نے بات کا رُخ بدلا۔

”وہ اپنی بہن ستارہ کے ساتھ آئی تھیں۔ بظاہر تو گپ شپ ہی لگا رہی تھیں..... ستارہ کہنے لگی کہ میں دائرہ کے بغیر بہت اچھا لگوں گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”مجھے تو تم اچھے لگتے ہو، ہر لحاظ سے اور ہر طرح سے..... اور کیا وہ دونوں بہنیں تمہیں یہی بتانے کے لیے آئی تھیں؟“

”ارے نہیں وہ تو پونہی بات سے بات نکل آئی تھی۔ ماہ رُخ بھابی، کاروبار سے دلچسپی لینا شروع ہوگئی ہیں اور کہہ رہی تھیں کہ فارغ ہوتی ہوں اس لیے جب تک شادی نہیں ہو جاتی کاروبار ہی سنبھال لوں تاکہ وقت بھی کٹے اور ”اپنا کاروبار“ وہ خود ہی سنبھالے نہ کہ دوسرے لوگ.....“ مظہر نے اس کے بیان کے ہر ہر لفظ کو زور دے کر کہا تو میری آنکھیں حیرت کی زیادتی سے کھلی رہ گئیں۔ میں کچھ بھی نہ بول سکی۔

”ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی؟“ مظہر نے مسکرا کر کہا۔

”تو میں نے کب حیرت کا اظہار کیا ہے؟ کیا کہا ہے میں نے؟“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”بھابی! آپ کا چہرہ!! وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے، جو ہے ہی ایک کھلی کتاب کی طرح یا کم از کم مجھے تو ایسا لگتا ہے.....“

”اچھا! اتنے سمجھدار ہو گئے ہو کہ چہرے بھی پڑھنا شروع کر دیئے ہیں؟“ میں مسکرائی تھی غالباً۔

”سمجھدار تو میں بہت ہو گیا ہوں..... مگر میں جتنا بھی بڑا ہو جاؤں، جتنا بھی سمجھدار ہو جاؤں،

آپ کی نظر میں چھوٹو ہی رہوں گا..... بے وقوفی کی باتیں کرنے والا سولہ سال کا چھوٹو..... خود آپ نے چند سالوں میں ہی بزرگی کی چادر اوڑھ لی ہے اور اپنی فہم و فراست اور سمجھ بوجھ کے جھنڈے

گاڑ لیے ہیں.....“

”اتنی مشکل اردو نہ بولا کرو چھوٹو!“ میں ہنس پڑی اور فوراً ہی سنبھل گئی۔ مجھے اپنی ہنسی بھی ہنسی نہ لگ رہی تھی۔ جانے میں کتنے دنوں کے بعد ہنس رہی تھی۔

”ہنسا کریں بھابی! ہنستی ہوئی آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ کی بیماری اور تکلیف ہمیں پریشان کر دیتی ہے، اور آپ ہنستی ہیں تو سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے..... صرف آپ کی ایک بات مجھے اچھی نہیں لگتی.....“

وہ رُکا تو میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ صحت مند ہوتی ہیں تو یہاں رہتی ہیں، مگر جب بھی آپ پر کوئی تکلیف یا بیماری ہوتی ہے تو آپ اپنی والدہ کو زحمت دیتی ہیں..... کیا ہمیں کسی خدمت کے قابل نہیں سمجھتیں آپ؟“ اس کا شکوہ لبوں پر آیا تو میں اس کی سوچ پر حیران رہ گئی۔ مجھ سے کوئی جواب بھی نہ بن پڑا۔

”میں تو دفتر میں بے ہوش ہو گئی تھی..... اور کس طرح وہاں پہنچی، مجھے تو خود علم نہیں.....“

”مجھے بھی دفتر سے کال آئی تھی اور میں صدف آپ کی ساتھ ہی دفتر پہنچا تھا، ان کے ساتھ ہسپتال میں بھی تھا مگر جب ہسپتال سے فارغ ہوئے تو میرے اصرار کے باوجود صدف آپ کی آپ کو میرے ساتھ گھر نہیں بھیجا.....“ منظر نے بتایا۔

”مجھے واقعی کچھ علم نہیں منظر۔“ مجھے یہ سب اس کے منہ سے سن کر واقعی حیرت ہوئی تھی کیونکہ مجھے صدف آپ کی نے کچھ بھی نہ بتایا تھا۔

”اور تو سب ٹھیک ہے بھابی! مگر صدف آپ کی ایک فقرے نے تو مجھے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”کیا کہا انہوں نے؟“ میں نے آہستگی سے سوال کیا، دل میں یہ دھڑکا تھا کہ شاید انہوں

نے کچھ کہہ دیا ہو معظم کے بارے میں.....

”کہنے لگیں کہ ماہ کو آرام کی ضرورت ہے اور سکون کی، جو اسے والدہ کے گھر اور ان کی موجودگی سے ہی مل سکتا ہے۔ اس وقت اس کی دماغی حالت ایسی نہیں کہ وہ کوئی ذمہ داری اٹھاسکے.....“ منظر نے فقرہ مکمل کیا تو میرے اندر عجیب سی بے چینی بھر گئی۔ یہ کیا کہہ دیا تھا صدف آپ کی نے؟ منظر کی حساس طبیعت کو جانتے ہوئے میں اندازہ کر سکتی تھی کہ اسے ان الفاظ سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔

”مجھے بہت دکھ ہوا منظر! میں صدف آپ کی ان الفاظ پر تم سے معافی مانگتی ہوں۔ پلیز! تم اس بات کو دل پر نہ لو..... پریشانی میں جانے ان کے منہ سے کیا نکل گیا، ورنہ والدہ کے گھر میں اور اس گھر میں مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا.....“ میں نے دل سے کہا۔

”پلیز بھابی! شرمندہ نہ کریں مجھے۔ میں جانتا ہوں آپ کے مزاج کو اور آپ کی سوچ کو۔“

”اچھا؟ آج تو بڑے انکشافات کا دن ہے میرے لیے..... ذرا ہم بھی تو جانیں کہ آپ کیا کیا جانتے ہیں اور کیا کیا سمجھتے ہیں، بالخصوص ہمارے بارے میں؟“ میں نے جان بوجھ کر اپنے لہجے اور انداز کو ایسے کیا کہ منظر ہنس پڑا.....

”یہ کبھی وقت آیا تو میں آپ کو بتاؤں گا.....“ وہ ہنسا، ”اور ہاں ایک اور بات جو بیچ میں رہی گئی.....“ وہ رکا۔

”وہ کیا بات ہے جواب رہ گئی ہے؟“

”ستارہ اکاؤنٹس میں اے لیول کر رہی ہے.....“ اس نے گویا مجھے معلومات فراہم کیں۔

”یہ آج ستارہ کا ذکر بہت زیادہ نہیں ہو رہا کیا؟ خیر تو ہے؟“

”سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت بھی نیک مطلوب ہے.....“ وہ ہنسا اور میں بھی،

”ماہ رخ بھابی نے مجھے کہا ہے کہ میں انہیں وہ تمام اکاؤنٹس کا ریکارڈ فراہم کروں جو غالب بھائی کی وفات کے بعد کا ہے اور یہ کہ مس ستارہ اس کو چیک کریں گی.....“ میں جانتی تھی کہ جس فقرے کو بظاہر منظر نے بٹاشٹ سے مکمل کیا تھا اس کی تہہ میں تشویش کے کیسے مدوجزرموجزن تھے اور میرے تو اپنے حواس سُن ہونے لگے تھے۔

ایسا نہ تھا کہ مجھے کوئی پریشانی اس لحاظ سے تھی کہ حسابات میں کوئی گھپلا ہوگا۔ میں نے ہمیشہ اکاؤنٹس کا ریکارڈ باقاعدگی سے چیک کیا تھا اور اس میں ”شفافیت“ کا بہت خیال رکھا تھا۔ مگر اس اقدام سے مجھ پر ماہ رخ کی ذہنیت کھلنے لگی تھی اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کاروبار پر اپنی اجارہ داری چاہتی تھی، اپنا تسلط..... اور میری حیثیت اسے کھٹکنے لگی تھی، بالخصوص ایسے وقت میں کہ جب معظم سے میری منگنی ہوئی تھی، غالباً وہ سمجھ رہی تھی کہ اسی روز سے میرا اس گھر پر حق ختم ہو گیا تھا۔ خاموشی کا طویل وقفہ آگیا تھا.....

”میں جانتا ہوں کہ اس وقت آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ منظر نے میری سوچوں کا سرا توڑا۔

”چلو بتاؤ میں کیا سوچ رہی ہوں؟ ذرا امتحان ہو جائے تمہارا.....“

”مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں.....“

”اس لیے کہ تم نہیں جانتے میں کیا سوچ رہی ہوں.....“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”میں آپ کو صرف چند باتیں سمجھانا چاہتا ہوں.....“ وہ گھمبیر لہجے میں بولا..... ”میرے

لیے، امی جان کے لیے نگہت آپ کی لیے اور تیمور بھائی کے لیے آپ..... غالب بھائی ہیں.....

آپ نے ہم سب کو غالب بھائی کی طرح سنبھالا ہے۔ اب آپ اس گھر میں ایک بیٹی کی حیثیت

سے رہ رہی ہیں اور آپ دوبارہ شادی کر بھی لیں گی تو آپ کی یہ حیثیت قائم رہے گی، سسرال کوئی

اور بن جائے گی تو یہ گھر آپ کا میکہ ہوگا۔ نئے آنے والوں پر آپ کی یہ حیثیت اول روز سے ہمیں

واضح کر دینا ہوگی۔ اگر کسی کو آپ کے کسی اقدام یا فیصلے پر شک ہے تو ہوتا رہے۔ ہمارے دل

صاف ہیں، ہمیں آج تک آپ کے کسی کام پر نہ اعتراض ہوا ہے نہ شک..... اس لیے میرے

ہوتے ہوئے کم از کم آپ فکر مند نہ ہوں۔“

کتنا گہرا تھا وہ اور کتنی تفصیل سے اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ واقعی اسے یہ صلاحیت حاصل تھی

کہ وہ میری سوچوں کو بھی پڑھ لے۔ میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ ”مجھے تم پر..... تیمور پر، نگہت پر اور امی

جان پر اعتماد ہے، فخر ہے اور مان ہے.....“ میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ ”مجھے معلوم

ہے کہ میری نیت صاف ہے اس لیے کوئی آپ لوگوں کو مجھ سے کبھی بدظن نہ کر سکے گا.....“

”انشاء اللہ“ مظہر نے کہا، ”اور بھابی یہ باتیں صرف میرے اور آپ کے درمیان ہیں، امی

جان کو نہ بتائیں کہ وہ یوں ہی ماہِ رُخ بھابی کو زیادہ پسند نہیں کرتیں اور تیمور بھائی کو بتائیں تو وہ اپنی

نئی زندگی کے آغاز میں ہی دل میں بدگمانیاں پیدا کر لیں گے.....“

”تم تو واقعی بہت سمجھدار ہو بھئی.....“ میں نے بے ساختہ اس کی تعریف کی۔

”مجھے تو کب سے علم تھا۔“ وہ ہنسا۔

”اور ہاں!“ کسی“ کے آنے میں کہہ کر داڑھی نہ منڈوا دینا.....“

”ابھی تو آپ نے اعتراف کیا ہے کہ میں ”واقعی“ بہت سمجھدار ہوں؟“ مظہر نے منہ بسوا۔

”وہ تو تم ہو..... پر یہ محبت بڑی بری شے ہے، اگر کسی سے ہو جائے تو بسا اوقات اچھے خاصے

انسان کو جو کر بنا دیتی ہے.....“ میں نے شرارت سے کہا۔

”محبت؟ کس کو کس سے ہو رہی ہے.....؟“ اس نے ایکٹنگ کی۔

”عالمًا مظہر کو کسی سے یا پھر مظہر سے کسی کو.....“ میں نے گول مول سا جواب دیا۔

”بھابی! آپ امی جان سے پٹوانے کی باتیں نہ کیا کریں.....“ اس نے خجالت سے کہا،

”ایک درخواست کر سکتا ہوں بھابی؟“

”کہو؟“ میرے کان کھڑے ہو گئے اور میں نے اندازہ کیا کہ اب وہ میرے سامنے یہ

اعتراف کرنے والا ہے کہ اسے ستارہ سے محبت ہو گئی ہے۔

”آپ کے ہاتھوں کی ایک کپ چائے ابھی مل سکتی ہے؟“ بے چارگی اس کے چہرے پر

میک اپ کی طرح جمی ہوئی تھی۔

”تم بہت چکر باز ہو دیے، فوراً بات کو گھما دیا ہے.....“ میں نے شکوہ کیا۔

”ارے نہیں بھابی! ایسی کوئی بات نہیں، آپ کے اس اسارٹ سے دیور کو دیکھ کر کسی پر کیا

بیٹے، اس کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا، البتہ مجھے ظاہری چکا چوند اور گیسر بالکل بھی پسند

نہیں، اور پھر پوری دنیا میں کیا ایک ہی گھر رہ گیا ہے جو ہم سب بہن بھائیوں کی سسرال بنے؟“

”او کے میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ابھی تک دوائیں لے رہی تھی اس لیے دیر سے آنکھ کھلتی تھی۔ اٹھ کر وضو کیا اور فجر قضا کر کے

پڑھی۔ لاؤنج میں امی جان بیٹھی تھیں۔ موسم ابھی ہلکا سا خنک ہونے لگا تھا۔

”بیٹا شال رکھا کرو کندھوں پر، ابھی بیماری سے اٹھی ہو.....“ امی جان نے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں بالکل۔ آپ چائے لیں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”چائے کو چھوڑو، بلقیس کو بتاؤ تمہیں ناشتہ بنا کر دے۔“ انہوں نے گھر کا۔

”امی اب گیارہ بجے میں ناشتہ کیا کروں؟“

”بلقیس!!“ انہوں نے بلقیس کو آواز دی، ”باقی کے لیے ناشتہ بناؤ اور پہلے اسے جس کا

ایک گلاس دو۔“ بلقیس نے دروازے تک آکر بات سنی اور حکم کی تعمیل کے لیے لوٹ گئی۔

میں نے ریوٹ کنٹرول لے کر ٹی وی آن کر لیا۔

میں رشتے ختم کر دیتے ہیں جنہیں بننے میں سالوں لگتے ہیں.....“ امی جان نے چائے کا کپ تپائی پر دھرا اور ناراض ہونے لگیں۔

”میں لڑکی نہیں ہوں امی جان!!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”تو کیا لڑکا ہوتا ہے؟“ غصے سے انہوں نے پوچھا تو میری ہنسی نکل گئی۔

”میں ایک عورت ہوں امی! اور جو فیصلہ میں نے کیا ہے وہ حالات کے عین مطابق ہے۔

آپ سنیں گی تو آپ بھی میرے اس فیصلے کی تائید کریں گی۔“ میں نے رمان سے کہا۔

”یہ تم نے کیوں سمجھ لیا کہ میں تمہارے کسی احمقانہ فیصلے کی تائید کروں گی؟“

”امی جان!!“ میرے حلق میں گولے سے بننے لگے..... ”اس لیے کہ اس شخص نے مجھ

سے..... ہم سب سے جھوٹ بولا..... اس کی بیوی زندہ ہے..... پہلی بیوی بھی اور دوسری بھی اور

دونوں سے اس کی اولادیں بھی ہیں.....“

امی جان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، ”تمہیں کس نے یہ سب بتایا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب جھوٹ

ہو۔ بعض لوگ کسی کا بھلا ہوتا ہوا دیکھ نہیں سکتے اور رشتوں میں دراڑیں ڈالنے کو ایسی افواہیں

اڑا دیتے ہیں۔ ہمیں کم از کم با تصدیق کیے ایسی کسی معلومات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔“

”امی جان!! یہ ساری تصدیق شدہ باتیں ہیں۔ یہ معلومات نگہت اور انجاز بھائی کی فراہم

کردہ ہیں اور پھر جس روز میں دفتر میں بیہوش ہو گئی تھی، اس روز اس کی دوسری بیوی اور اس کی بیٹی

مجھے ملنے کے لیے دفتر میں آئی تھیں اور صدف آپنی کو بلوا کر میں نے تصدیق بھی کر لی تھی کہ تاشی

واقعی ڈاکٹر معظم کی بیوی رہ چکی ہے اور یہ کہ اس کی پہلی بیوی بیٹا اور اس سے ایک بیٹا بھی ہے.....“

میں نے انہیں بتایا۔

”مگر ممکن ہے اس نے پہلی دو بیویوں کو طلاق دے دی ہو.....؟“

”طلاق تو ہو چکی ہے امی جان..... مگر اس نے ہمیں دھوکہ دیا، اس کے گھر والوں نے جھوٹ

بول کر اس کی ایک ہی بیوی تھی اور وہ بھی مر چکی ہے.....“ میں نے بتایا۔

”تو اس گھر میں صدف بھی تو رہتی ہے، اس نے کیوں تمہیں اصلیت نہ بتائی؟“

”اس لیے کہ انہیں خود بھی اصلیت کا علم نہ تھا.....“ میں نے کہا۔

”ویسے یہ بات یقین کرنے والی تو نہیں ہے، مگر اگر صدف کہتی ہے تو ماننے لیتے ہیں۔ بچے

”بیٹا فون آیا تھا سیکڑ بہن (مظہر علی کی امی) کا اور معظم کا.....“ انہوں نے مجھے اطلاع دی۔

”آپ نے اپنی دو اور غیرہ لی ہے؟“ میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

”ہاں لے لی ہے“ انہوں نے کہا، ”سیکڑ بہن تو بتا رہی تھیں کہ وہ نئے گھر میں شفٹنگ سے

پہلے چھوٹا سا میلا دکر دانا چاہ رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ تو.....“

”میں ٹھیک ہوں امی جان! جب چاہیں وہ میلا دکر وائیں۔ اگر کام مکمل ہو گیا ہے تو انہیں

شفٹ ہو جانا چاہئے کیونکہ بہت وقت لگتا ہے نئی جگہ سیٹ ہونے میں اور پھر بہت سے معاملات

ہیں جو اٹکے ہوئے ہیں ان کی نئے گھر میں شفٹنگ سے مربوط ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے بھی یہی کہا تھا ان سے۔ اور بیٹا جو میں نے کہا تھا کہ ان کے لیے نئے گھر کا کوئی

تحفہ منتخب کرنا تھا۔“

”جی امی جان! مظہر جس دن جلدی فارغ ہو گیا ہم جا کر دیکھ لیں گے۔“ میں نے کہا۔

بلیقے ناشتہ لے آئی تھی۔ میں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔

”معظم سے کسی بات پر ناراض ہو بیٹا.....؟“ انہوں نے سوال کیا تو اس پر جیم لگاتے

ہوئے میرا ہاتھ دین کا وہیں رہ گیا.....

”آپ سے کس نے کہا؟“

”کسی نے بھی نہیں.....“ انہوں نے کہا، ”اصل میں اتنی دفعہ اس نے کال کی ہے اور اب تو وہ

منتوں اور ترلوں پر اتر آیا ہے..... کہتا ہے صرف ایک بار ماہ سے کہیں مجھ سے بات تو کر لے.....“

بات آج نہیں تو کل کھل ہی جاتی تھی۔ امی جان کو بھی علم ہوتا ہی تھا تو کسی اور سے کیوں علم ہو؟

بہتر ہے کہ میں خود ہی بتا دوں..... میں نے جیم لگا کر پورے اطمینان سے ناشتہ کرنا شروع کر دیا،

تا کہ انہیں بھی تسلی رہے۔ دل ہی دل میں میں بات کرنے کے لیے الفاظ مرتب کر رہی تھی۔

”میں معظم سے بات نہیں کرنا چاہتی امی جان! کیونکہ میں اس سے شادی نہیں کرنا

چاہتی.....“ میں نے گویا ان کے سر پر ہم پھوڑا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے جو اتنا بڑا فیصلہ تم نے اکیلے ہی اکیلے کر لیا۔ رشتہ میں نے دیا تھا ان کو تو اس کو

توڑنے کا حق بھی صرف مجھے ہی ہونا چاہئے..... اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ لمبی گفتگیاں کرنی ہی

نہیں چاہئیں، یہ موئے موبائل ٹیلی فون جن پر جانے یہ لڑکے لڑکیاں کیا باتیں کرتے ہیں کہ دنوں

کس کے پاس ہیں؟“

”بچے اپنی ماؤں کے پاس ہیں.....“ میں نے بتایا۔

”تو پھر کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر رشتہ اچھا ہے تو بیوی مرگئی ہے یا طلاق ہوگئی ہے، دونوں صورتوں میں ہمیں کیا لینا دینا.....“ امی جان نے کہا۔

”امی جان! اس نے ایک شادی ہم سے چھپائی ہے، مجھے وہ ایک بیوی کا بتاتا رہا، جبکہ وہ دو کو بھگتا چکا ہے.....“ میں نے دلیل دی۔

”سچ پوچھو تو ماہایٹا! مرد گھوڑے کی طرح ہے، ہمیشہ تازہ دم اور جوان۔ اسے کیا فرق پڑتا ہے کہ ایک بیوی بھگتا دے یا دو۔ مرد تو ہمیشہ چند اردھات کی طرح ہے، ذرا سا رگڑ کر صاف کر لو تو پھر نئی کی نئی لگنا شروع ہو جاتی ہے۔“ امی جان جانے کیوں معظم کی وکالت کر رہی تھیں۔

”امی جان، آپ کیوں اس کی اتنی حمایت کر رہی ہیں جبکہ آپ اس کو اتنا جانتی بھی نہیں؟“

”اصل میں بیٹا! اس نے میری بہت منت سماجت کی، مجھے میرے بچوں کے اور اللہ کے واسطے دیئے کہ میں تمہیں سمجھاؤں.....“ انہوں نے اعتراف کیا، ”مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے لیکن میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ تم سے ضرور کہوں گی اور تمہیں سمجھاؤں گی بھی۔“

”امی جان! وہ جھوٹا بھی ہے اور اس میں سبھی شرعی عیب موجود ہیں۔ اپنے کریہہ چہرے پر وہ جو نقاب پہن کر گھوم رہا ہے وہ اس کا اصلی روپ نہیں ہے۔“ میں نے امی جان سے آہستگی سے کہا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم سمجھدار ہو اور سب بھلا برا سمجھتی ہو۔ صرف یہ دکھ تھا کہ تم پر ایک داغ لگ جائے گا۔ لوگ کہیں گے کہ منگنی ہوئی اور ٹوٹ گئی۔“ وہ پریشان تھیں۔

”آپ کی پریشانی بجا ہے لیکن اب لوگوں کی باتوں کی وجہ سے میں آنکھوں دیکھی مکھی کیسے نکل لوں امی جان! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے قبل از وقت بچا لیا۔ منگنی کوئی ایسا مضبوط بندھن تو نہیں ہوتا، کوئی کاغذی کارروائی نہیں ہوتی۔ ایک زبان سے کہی ہوئی بات ہے..... زبان سے ہی کہہ کر توڑی جاسکتی ہے۔“ میں نے اپنے حق میں دلیل دی۔ حالانکہ یہی سوچ مجھے آئی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے؟

○ نصیب ہی ایسے ہیں ہم لڑکیوں کے

ڈرتی رہتی ہیں، اپنے لڑکی ہونے سے

زمانہ کیا کہے گا، دنیا کیا سوچے گی

لوگ باتیں کریں گے.....

خواہشوں کے موتی، سدا بند رکھتی ہیں

اپنے ہی وجود کی سیپیوں میں

کہ سطح پر آکر ہمیں آشکار نہ کر دیں

تمنا میں دفن رکھتی ہیں اپنے وجود کی قبر میں

کہ ان سے کوئی خوشبو پھوٹ کر ہمیں بدنام نہ کر دے

ستی ہو جاتی ہیں، انہی وجود کی قبروں میں

اگرچہ ہمیں اجازت نہیں ستی ہونے کی

ہم کا سچ جیسی لڑکیاں..... نازک اور نرم

تیر یوں جیسی، پھولوں جیسی،

خوبصورت ناموں والی لڑکیاں

پکاری جاتی ہیں

ابھاگن، منحوس اور کوکھ جلی جیسے

تاریک اور مکروہ ناموں سے

ہمارے مقدر..... ہماری پہچان کیوں بن جاتے ہیں؟

بیوہ..... مطلقہ..... یتیم..... بانجھ.....!!! ○ (شیریں حیدر)

لیکنہ آنٹی نے میلا دی تاریخ رکھ لی تھی، اس لیے میں نے مظہر سے کہا کہ وہ کسی روز وقت نکالے تاکہ ان کے گھر کی خوشی میں ان کا تحفہ خرید لیا جائے۔ مظہر علی کو فون کیا تاکہ اس سے اس کے نئے گھر کی اسکیم چیک کروں اور اسی حساب سے صوفہ خرید ا جائے۔ مظہر علی نے میری خیریت دریافت کی اور میں نے فون پر ہی محسوس کیا کہ اس کی آواز مسرت سے لبریز تھی۔ ظاہر ہے کہ اسے



دیکھے تھے۔ اگر آپ اس قابل سمجھیں تو آپ ہی کوئی رنگ تجویز کر دیں.....“

”ڈرائنگ روم کے لیے یوں تو آف وائٹ، سبز یا فان رنگ اچھے لگتے ہیں۔ لیکن آف وائٹ رنگ کے صوفے اور قالین بچوں والے گھر میں خراب ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہمارے گھر میں تو کوئی بچہ نہیں ہے اور آف وائٹ رنگ مجھے پسند بھی بہت ہے.....“

”ابھی تو نہیں ہیں بچے لیکن زارا اور ثانیہ کی شادیاں ہوں گی تو بچے ہوں گے انشاء اللہ!! اور پھر اتنی قیمتی چیزیں ہر روز تو نہیں خریدی جاسکتیں.....“ میں نے اسے سمجھایا۔

”پھر کیا کیا جائے آپ بتائیں میڈم پلیز؟؟“

”میرا خیال ہے کہ فان رنگ بہتر ہے اس کے ساتھ ہر طرح کا کنٹراسٹ اور امتزاج چل جاتا ہے اور یوں بھی اس رنگ پر لگا چھوٹا موٹا نشان یا داغ عموماً نظر نہیں آتا۔“ میں نے تفصیل سے تجویز دی۔

”بہت شکریہ میڈم!! میں اسی رنگ کا قالین پچھوالوں گا اور پردوں کے لیے زارا آپنی اور ثانیہ باجی سے کہہ دوں گا کہ وہ خود پسند کر لیں۔“ اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

”بھابی!! اگر آپ کی طبیعت بہتر ہو تو کسی دن دفتر آئیں آپ سے کچھ اہم امور پر بات کرنی ہے؟“ مظہر نے کہا تو امی جان اس سے ناراض ہونے لگیں۔

”رہنے دو تم اسے آرام کرنے دو، خود سنبھالو کام اور جو اہم باتیں ہیں وہ گھر پر ہی کر لو.....“

”امی جان!! کچھ دفتری معاملات ہیں جن کی تفصیل کا مجھے علم نہیں ہے اور کچھ اہم فیصلے کرنے ہیں جن کے لیے بھابی کا مشورہ ضروری ہے۔ کچھ کارکنوں کی تنخواہوں میں اضافوں اور بونس کی بابت فیصلے کرنا ہیں اور مجھے ابھی سب کی تفصیلی کارکردگی کا علم نہیں ہے۔ اسی لیے بھابی کا ہونا ضروری ہے.....“ مظہر گھگھکیا۔

”کوئی بات نہیں امی جان! میں چلی جاؤں گی، تھوڑی دیر کا کام ہوگا اور اچھا ہے دفتر سے واپسی پر ہم دونوں صوفے کا آرڈر بھی دے آئیں گے۔ گھر پر بیٹھی تو اب میں بور ہونے لگی

خوش ہونے کا حق حاصل تھا۔“ کیسا جا رہا ہے گھر کا کام کاج؟“ میں نے پوچھا۔

”مکمل ہے تقریباً میڈم! میں آپ کا بہت احسان مند ہوں..... میں اس گھر میں جاتا ہوں، اسے دیکھتا ہوں تو جو حسرت اور سکون مجھے محسوس ہوتا ہے وہ اللہ کی عطا ہے مگر آپ کا دیا ہوا ہے.....“

”یوں نہ کہو! آپ کی اپنی نیت اور قسمت ہے۔ اللہ آپ لوگوں کو وہاں صحت اور خیریت و سلامتی کے ساتھ رہنا نصیب کرے.....“ میں نے دل سے دعا دی۔

”بہت بہت شکریہ میڈم“ اس نے کہا، ”آپ میلا پر آئیں گی ناں؟“

”انشاء اللہ! آئیں گے اور بلکہ فون کر کے بھی میں نے یہی چیک کرنا تھا کہ آپ لوگوں نے ڈرائنگ روم کے لیے کس رنگ کے فرنیچر، قالین اور پردوں کا فیصلہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس بارے میں تو ابھی کچھ بھی نہیں سوچا ہے، جو سامان موجود ہے پہلے تو اسی کو ذرا صاف کر کے پالش وغیرہ کر کے یا جس کا کپڑا وغیرہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، استعمال کریں گے اور آہستہ آہستہ نیا سامان بنا لیں گے۔“ مظہر علی نے وضاحت کی۔

”اصل میں امی جان یعنی میری ساس، آپ لوگوں کو سننے گھر کے سلسلہ میں تھک دینا چاہ رہی تھیں۔ وہ تو فرج کا سوچ رہی تھیں، مگر میں نے صوفے کا کہا، کیونکہ فرج تو آپ لوگوں کے پاس ہے۔“

”پلیز! میڈم! ہم پہلے ہی آپ کے احسانوں تلے دبے ہوئے ہیں.....“ اس نے کہا۔

”اس طرح کی باتیں نہ کیا کریں مظہر علی! میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ آپ کو دفتر کی طرف سے قرض دیا گیا ہے اور وہ آپ نے لوٹا نا ہے۔ رہی بات تحفے کی تو وہ کسی پر احسان نہیں ہوتا۔“ میں نے اسے تقریباً ڈانٹا۔

”لیکن ہماری ایسے تحائف کی حیثیت نہیں ہے میڈم!!“ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

”تحفہ لینے والے نہیں بلکہ دینے والے کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے مظہر علی اور جسے جیسا تحفہ دینے کی توفیق ہو اسے دیا ہی تحفہ دینا چاہئے۔“

”میں ایک بار پھر آپ کا ممنون ہوں میڈم.....“ اس نے کہا۔

”تو اب اپنے ڈرائنگ روم کی کلر اسکیم بتا دیں.....“

”اصل میں میڈم! ہم نے اس بابت سوچا بھی نہیں اور یقین کریں کہ مجھے تو اندازہ بھی نہ تھا کہ کبھی اس طرح گھر خریدوں گا اور اسے سجاؤں گا۔ اسی لیے میں نے کبھی کسی گھر کے خواب بھی نہ

ہوں۔“ میں نے کہا تو امی جان خاموش ہو گئیں۔

اگلے ہی روز مظہر کے ساتھ دفتر گئی اور ضروری حسابات وغیرہ منٹائے۔ کچھ کارکنوں کے لیے خصوصی بونس تھے جن میں مظہر علی کا نام بھی تجویز کیا گیا تھا۔ میں نے اس کی مخالفت کی کہ ہم نے اس کو قرض حسنہ کے طور پر بھی رقم دے رکھی تھی جو کہ اس کے ساتھ خصوصی رعایت تھی۔ اس کو بونس ہی سمجھا جائے۔ نوید صاحب اور شیردانی صاحب نے تفصیلی بتایا کہ کس طرح اس نے فیکٹری میں وقت بے وقت محنت بھی کی تھی، کارکردگی بھی بہتر ہو گئی تھی، اس نے کسی فالتو کام کا اور ٹائم نہ لیا تھا اور وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ تب مظہر نے بھی اس کی سفارش کی اور یوں میں ایک زنانہ ووٹ کے مقابلے میں تین مردانہ ووٹوں سے ہار گئی۔ اگرچہ مجھے دل سے اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ اس کے لیے یہ رقم بہت بروقت خدائی مدد تھی جو اللہ نے اس کے نصیب میں ایسے وقت میں لکھ دی تھی جب اسے اس کی ضرورت بھی تھی۔

دفتر سے نکل کر ہم فرنیچر مارکیٹ کی طرف گئے۔ مظہر کو میں نے تجھے کی تمام تفصیل اور غرض و غایت سے آگاہ کر دیا تھا۔ ایک خوبصورت سا ہلکے اور گہرے براؤن رنگوں کے احتراز کے چھوٹے پرنٹ کا کپڑا پسند کیا اور ایک صوفے کا ڈیزائن پسند کیا، مظہر نے اس میں سینئر ٹیبل، دو تپائیاں اور ایک دیوار میں نصب کرنے کا بڑا سا نقشیں فریم والا آئینہ بھی پسند کیا۔

”یہ سب ملا کر تو قیمت بہت بڑھ جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”کچھ زیادہ فرق نہ پڑے گا بھابی، ٹیبل اور تپائیاں تو لازم و ملزوم ہیں اور آئینہ اس لیے کہ دیوار پر لگا ہو تو کمرے میں وسعت کا احساس ہوتا ہے اور ابھی آپ نے بتایا ہے کہ گھر چھوٹا سا ہے تو مجھے اندازہ ہے کہ ڈرائنگ روم بھی چھوٹا سا ہی ہوگا۔“ مظہر نے دلیل دی۔

”چلو ٹھیک ہے.....“ میں نے اس کی تائید کی اور آرڈر لکھوا کر ایڈوانس رقم کی ادائیگی کی۔

”میڈم سامان کس ایڈریس پر پہنچانا ہے؟“ دکاندار نے پوچھا تھا۔

”پہلے سامان تیار ہوگا تو آپ ہمیں کال کریں اور پھر ہم آکر سامان چیک کریں گے..... اس کے بعد آپ کو ایڈریس بتائیں گے جہاں سامان پہنچانا ہے.....“ میں نے کہا۔

”اپنا فون نمبر لکھوادیں میڈم!“ اس کے کہنے پر میں اپنا نمبر لکھوانے ہی والی تھی کہ مظہر نے فوراً اپنا نمبر اسے لکھوایا اور ہم روانہ ہوئے۔

”اپنا فون نمبر یوں ہر ایرے غیرے کو مت دیا کریں۔“ اس کا انداز تحکمانہ تھا۔

”اچھا جناب! ویسے اس سے فرق کیا پڑتا ہے، کام ہی کے سلسلے میں تو اسے رابطہ کرنا تھا.....“

”بھابی!! پلیز..... جس بات کی میں وضاحت نہیں کر سکتا آپ اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں

کرتیں؟“ اس نے زور دے کر کہا اور میں جواب میں خاموش رہی۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا، خواہ مخواہ ہی چڑ جاتا۔

”اور کوئی کام تو نہیں آپ کو لبرٹی وغیرہ میں؟“ مظہر نے پوچھا۔

”مجھے؟ نہیں تو..... کوئی بھی نہیں!!“

”مجھے ایک دوشرٹیں لینا تھیں اگر آپ کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ارے نہیں میں تو بالکل فارغ ہوں۔“ گاڑی کا رخ مظہر نے لبرٹی کی طرف موڑ دیا۔

گلیبرگ سے لبرٹی کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک سنگل بند تھا اس پر گاڑی رکی تو فقیروں، اخبار بیچنے والوں، گاڑی صاف کرنے والوں، غبارے بیچنے والوں کے علاوہ ایک پھول بیچنے والا بھی آگیا۔ کسی سنگل پر گاڑی رکنے کی دیر ہوتی ہے کہ کھیوں کی طرح یہ سب لوگ ”حملہ آور“ ہو جاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے تو اچھا ہے کہ گداگر بننے کی بجائے کچھ کام کر کے روزی کماتے ہیں مگر دوسری طرف مسلسل اصرار اور تکرار رزق کر دیتی ہے۔

”پھول بیچنے والا مظہر کی طرف کھڑکی پر آیا تو مظہر نے شیشہ نیچے کر کے اس سے مویجے کے دو گجرے خرید لیے۔ رقم کی ادائیگی کی تو بقیہ رقم دیتے ہوئے پھول والا بولا۔ ”بہت شکریہ صاحب! میم صاحب! اللہ آپ دونوں کی جوڑی سلامت رکھے..... اللہ آپ کے بچوں کو بھی خوش رکھے.....“ شیشہ چڑھاتے ہوئے مظہر نے بائیں ہاتھ سے گجرے میری طرف بڑھا رکھے تھے..... اس سے قبل کہ میں انہیں تھامتی، اس نے سامنے ڈیش بورڈ پر وہ دونوں گجرے رکھ دیئے..... مظہر خود شرمندہ سا محسوس کر رہا تھا۔

میں نے گجرے اٹھا کر سونگھے، اس قدر مسحور کن خوشبو آ رہی تھی ان میں سے..... ”میرے لیے لئے ہیں یہ گجرے تم نے مظہر؟“ میں نے اسے شرمندگی سے بچانے کو کہا۔

”آپ بہن لیں!!! میں نے تو یوں ہی لے لیے تھے، مویجے کی خوشبو کے لیے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”چلو اچھا ہے، پھول بھی ملے اور ہم بہن بھائی کی جوڑی کو سلامت رہنے کی دعا مفت میں ہی مل گئی اور ساتھ ہی تمہارے بچوں کو بھی!“ میں نے لہجے میں شوخی لانے کی کوشش کی۔ تب وہ ذرا سارے یلیکس ہوا، لبرٹی سے اس نے جلد ہی دو شرٹس پسند کر لیں، میں نے بھی ایک شرٹ تیمور کے لیے پسند کر کے خرید لی۔ مظہر نے اس شرٹ کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھا۔

”بھائی! کھانا باہر نہ کھایا جائے؟“ مظہر کو ہمیشہ سے کھانا باہر کھانے کا بہت شوق تھا۔

”امی جان کوفون کر کے بتا دو، ورنہ وہ ہمارا انتظار کرتی رہیں گی۔“ میرے کہنے پر اس نے امی جان کوفون کر کے اطلاع کر دی۔ ایم ایم عالم روڈ پر ایک اچھے سے فیملی ریسٹوران میں ہم چار ممبران کی ایک میز پر بیٹھے تھے کیونکہ دو کرسیوں والی کوئی میز دستیاب نہ تھی۔ سوپ کا آرڈر دیا اور دفتری امور ڈسکس کرتے ہوئے ہم نے سوپ پیا۔ کھانے کا آرڈر دیا جا چکا تھا، کھانا پہنچا تو ہم نے کھانا شروع کیا۔

”بھائی! ہم بزنس ڈنر پر تو نہیں آئے ہیں، اس لیے کھانے کے دوران کاروبار پر کوئی بات نہ ہوگی.....“ مظہر نے وارننگ دی۔

”یعنی ہم خاموشی سے کھانا کھائیں گے؟“ میں مسکرائی۔

”نہیں ہم اپنی باتیں کرتے ہیں، اپنے گھر کی، اپنی فیملی کی.....“ اس نے بھی مسکرا کر کہا۔

”مثلاً؟“ میں نے سوال کیا۔

”اب ہم یہ پلان کرتے ہیں کہ تیمور بھائی کی شادی کب ہوگی؟ اور کیسے ہوگی؟“ اس نے پر شوق انداز میں کہا۔

”ابھی سے تمہیں شادی کی فکر پڑ گئی ہے کہ شادی کب ہوگی اور کیسے ہوگی؟ ابھی تو اس پر بات کرنا بہت ہی قبل از وقت ہے.....“ میں بول رہی تھی کہ مظہر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”دلیں آگے وہ!! آج ہی بلکہ ابھی آپ نے ان کے لیے شرٹ خریدی ہے اور وہ پہنچ بھی گئے.....“ مظہر کہتا ہوا میری پشت کی طرف بڑھا اور کسی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”کیا تیمور ایسے اچانک پہنچ گیا تھا؟“ میں نے دل ہی دل میں سوچا، مگر یہ خوشبو؟ یہ تو تیمور کے پرفیوم کی نہ تھی۔ میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا، ڈاکٹر معظم!!! میرے ہاتھ سے کاٹنا جھوٹ کر گرا اور ہوٹل کی ہلکی آوازوں والی فضا میں کانٹے کے ٹانگوں والے فرش پر گر گئے۔ بہت

بھانک لور بلند آواز پیدا ہوئی تھی۔ لوگ گردنیں گھما کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میں بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم!!“ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

”علیکم السلام!“ میں منہ ہی منہ میں بے اختیار ہی میں بد بدائی تھی۔

”کیسی ہو ماہا؟“ وہ یوں بٹاشت بھرے انداز میں بات کر رہا تھا، گویا کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں جواب میں لب سمیٹنے خاموش رہی۔ میرے اندر غصے کی لہریں موجزن تھیں اور میں ان پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آئیے بیٹھے! ڈاکٹر صاحب۔ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔“ مظہر نے سادگی سے اس سے کہا، ”اور کب آئے آپ پاکستان؟“ ہم تینوں ہی کھڑے تھے۔

”اب سمجھا کہ کیا وجہ تھی۔ شادی کی پلاننگ ہو رہی تھی.....“ مکروہ سے انداز میں اس نے کہا،

عالم! اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں..... ”اگر یہی کچھ کرنا تھا تو مجھ سے منگنی کا ڈرامہ کس لیے کیا تھا؟ اگر خود سے تین چار برس چھوٹا شوہر ہی تمہیں چاہئے تھا تو مجھے کیوں تم نے چکر دیئے رکھا.....

میں کافی دیر سے تم لوگوں کا پیچھا کر رہا تھا..... اسی لیے یہ بر خوردار میرا اگر بیان پکڑ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ میں اس کا حق مار کر تم سے شادی کر رہا تھا؟.....“ اس کی مغالطات سے میری کنپٹیوں میں لہو ایلنے لگا، میں ایسی جگہ پر تماشاً بننا نہ چاہتی تھی، لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سب بکواس مظہر کی برداشت سے بہت باہر تھی۔

”بولو!! بتاؤ مجھے کیوں منگنی توڑی ہے تم نے مجھ سے؟“ اس نے مجھے دونوں کندھوں سے تھام لیا اور جھٹکا دیا.....

”مت چھوؤ انہیں!!“ مظہر پوری آواز سے دھاڑا، ”ہاتھ ہٹاؤ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا.....“ میں نے مظہر کے ہاتھ میں ریوالتور دیکھا تو چیخ پڑی۔

”مظہر پلیز!! فائز مت کرنا..... میرے بھائی! پلیز اپنے غصے پر قابو رکھو.....!!“

ہوٹل کا اسٹاف سراسیمہ کھڑا تھا اور سبھی لوگ حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر معظم کی آنکھوں میں موت کا خوف مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میرے کندھوں سے ہٹا لیے۔

”دفع ہو جاؤ ابھی تم یہاں سے اور دوبارہ کبھی ایسی حرکت کی تو اپنے قدموں پر چل کر دفع بھی نہ ہو سکو گے۔“ مظہر نے اسے وارننگ دی تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگا۔ ہوٹل کے میئر نے آکر ہم سے

درخواست کی کہ ہم بھی چلے جائیں ورنہ لوگ خوفزدہ رہیں گے کیونکہ مظہر کے پاس ریوالور تھا۔ مظہر نے ریوالور نکال کر منیجر کو اس کا چیمبر کھول کر چیک کروایا جو کہ خالی تھا اور اسے وضاحت کی کہ اسے اسی قسم کا خطرہ تھا اس لیے وہ خالی ریوالور لیے گھوم رہا تھا۔ اور یہ کہ اس کے پاس ریوالور کا لائسنس بھی تھا۔ لیکن منیجر اس وضاحت سے مطمئن نہ ہوا، غالباً وہ مظہر کے جارحانہ انداز سے خوفزدہ تھا۔ تب میں نے مظہر سے آہستگی سے درخواست کی کہ ہمیں چلے جانا چاہئے کیونکہ سب لوگ مسلسل ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

والپسی پر سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہ پا رہی تھی۔ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا اس لیے میں اسے ڈسٹرب نہ کرنا چاہ رہی تھی نہ اسے غصہ دلانا چاہ رہی تھی۔ گاڑی روکتے ہی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور سیدھا گھر کے اندر چلا گیا۔ عمومی حالات میں وہ میری طرف آ کر میری طرف کا دروازہ کھول کر مجھے تکریم دیتا اور پھر گاڑی لاک کر کے گھر کا دروازہ کھول کر مجھے پہلے داخل ہونے کو کہتا، مگر اس وقت اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت غصے میں تھا۔ میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل کر اسے لاک کیا، گیٹ کو بند کیا اور اندر داخل ہوئی۔ ”امی جان!! بھابی نے اپنی منگنی ڈاکٹر معظم کے ساتھ توڑ دی ہے.....“ اس نے بلند آواز اور غصے سے بھرپور لہجے میں امی جان کو اطلاع دی۔

”جانتی ہوں میں!!“ امی جان نے آہستگی سے کہا تو میرا دل دھڑک اٹھا، مجھے انجانا سا احساس ہوا کہ اب مظہر پھٹ پڑے گا.....

”جانتی ہیں آپ؟“ اس نے حیرت سے پوچھا..... امی جان خاموش رہیں۔

”اور کون کون جانتا ہے؟ میرا مطلب ہے بھابی کے گھر والے؟ تیمور بھابی، نگہت آپ؟ اعجاز بھابی؟“ اس نے اپنا اگلا سوال کیا۔

”تمہارے اور تیمور کے علاوہ سب جانتے ہیں!“ امی جان نے اس کی ”معلومات“ میں ”اضافہ“ کیا اور گویا اس کے اندر بھڑکتی آگ پر مزید تیل ڈال دیا۔

”وہ اس لیے کہ تیمور بھابی تو یہاں ہیں ہی نہیں، ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا۔ کیونکہ ان سے نہ آپ کوئی بات چھپاتی ہیں نہ بھابی!! صرف مجھ سے چھپایا جاتا ہے سب کچھ۔ کیونکہ میں قاتلو ہوں اس گھر میں، میں کسی کا کچھ نہیں لگتا، باپ کا رشتہ میں نے دیکھا ہی نہیں..... جسے باپ سمجھا وہ بھی

اللہ نے اپنے پاس بلا لیا..... ماں بھی مجھے پیار نہیں کرتی کہ میں ضدی ہوں، بے وقوف ہوں، سرکش ہوں۔ اس لیے ہر وقت ماں سے بھی بے عزتی کرواتا ہوں اور یہ.....“ اس نے میری طرف اشارہ کیا، میری ٹانگیں کا پنے لگیں۔

”فضول باتیں بند کرو مظہر!!“ امی جان نے گھر کا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔

”یہ وہ ہیں جنہیں جانے میں اپنا کیا کچھ سمجھ بیٹھا تھا، اپنا بڑا بھائی، اپنی بڑی بہن، اپنی ماں! انہوں نے تو قدم قدم پر مجھے بتایا ہے کہ میں ان کا کچھ بھی نہیں۔ مجھ سے ان کا کوئی تعلق نہیں، میں اس گھر کی سب سے فالتو چیز ہوں، جسے کسی اسٹور میں رکھا ہوا ہوتا چاہئے۔ کیا مقصد ہے میری زندگی کا؟ مجھے کوئی شوق نہیں ایسے جینے کا۔“ کہتے ہوئے اس نے جب سے ریوالور نکال لیا اور اپنی کینٹی پر رکھ لیا۔ مجھے تو معلوم تھا کہ وہ ریوالور خالی تھا مگر امی جان خوفزدہ ہو کر چیخنے لگیں۔

”مظہر!!“ میں نے نرمی سے کہا، ”دیکھو پہلے تم میری بات سنو!!“ میں اس کی طرف بڑھی۔ ”میرے قریب مت آئیں، میں خود کو شوٹ کرنے لگا ہوں۔ آپ سب لوگ رہیں ہنسی خوشی!!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیکھو! تم میرے بھائی ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تمہیں اور تیمور کو ایک جیسا سمجھتی ہوں۔“ میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مجھے یہ بے فکری تھی کہ ریوالور خالی تھا۔

”جھوٹ!! سراسر جھوٹ، سفید جھوٹ..... بس مت دیں آپ مجھے یہ دھوکہ۔ میں سمجھ گیا ہوں آپ کو بھی اور اپنی حیثیت کو بھی.....“

”جذباتی مت بنو مظہر!! یہ کون سا ایسی خوشگوار بات تھی جو میں تمہیں بتا کر پریشان کرتی؟“ میں نے ناراضی سے کہا۔ ”ضروری ہے کہ تمہیں ایسی معمولی باتیں بتا کر پریشان کیا جائے؟“

”یہ معمولی بات ہے؟ معمولی بات کہہ رہی ہیں اسے آپ!! کوئی چیز خریدنی ہو تو آپ کو میرا مشورہ چاہئے ہوتا ہے اس لیے آپ مجھے ساتھ لے جاتی ہیں اور آپ کی زندگی کا فیصلہ ہوتا تو نہ منگنی کرتے وقت آپ رائے لیتی ہیں نہ توڑتے وقت..... اس لیے کہ آپ مجھے بے وقوف سمجھتی ہیں، کم عقل اور نادان سمجھتی ہیں۔ حالانکہ میں نے اول دن ہی اس شخص کی آنکھوں میں خباثت دیکھ لی تھی۔ مجھے وہ پہلے دن ہی مکار انسان لگا تھا..... مگر میں اس لیے خاموش رہا کہ آپ کو اس پر اعتماد تھا۔ آپ کو مجھ پر کبھی اعتماد نہیں ہوا.....“ وہ ہلک رہا تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ حقیقت تھا، میں

بھی سسک پڑی..... ”مجھے معاف کر دیں امی جان..... آپ بھی مجھے معاف کر دیجئے گا میری گستاخیوں کے لیے اور میرے اللہ تو مجھے میرے اس اقدام پر معاف کر دینا کیونکہ کوئی چارہ نہیں رہا اب، زندہ رہنے کو دل نہیں چاہتا اب.....“ اور وہ با آواز بلند کلمہ پڑھنے لگا..... اس کی آنکھیں بند تھیں، ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور اس کا پورا جسم تناؤ میں تھا۔ تب جانے امی جان نے کیسے ہمت کی اور چیختی ہوئی اس پر جھپٹ پڑیں، ایک دم اس کا ریو الور والا ہاتھ کپٹی پر سے ہٹ گیا، مگر ساتھ ہی فائر کی آواز آئی..... اب چیخنے کی باری میری تھی۔

”ریو الور تو خالی تھا..... کب ڈالیں تم نے اس میں گولیاں.....“ میں نے قریب جا کر اسے جھنجھوڑا..... گولی خطا ہو کر سامنے دیوار پر لگے ہوئے بڑے سے آئینے پر لگی تھی جو چکنا چور ہو کر زمین پر بکھر گیا تھا۔

”چھوڑیں مجھے“ وہ خود کو ہم دونوں کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مارنا ہے تو مجھے مارو، سب قصور تو میرا ہے۔ میں نے تمہیں اس مقام تک پہنچایا ہے کہ تم خود کشی پر تیار ہو۔ مجھے ختم کر دو تو تمہارے سارے مسائل ختم ہو جائیں گے، میں ہی منحوس ہوں جو اس گھر میں آئی تو اس گھر کی خوشیوں کو چاٹ گئی، ایک ٹھہر سایہ وار تھا جسے میری غصہ چاٹ گئی، میں امرئیل ہوں، نہ رہوں گی تو تمہاری زندگی میں سکون آجائے گا.....“ میں نے اس کے ریو الور والے ہاتھ کو پکڑ رکھا تھا۔

”آفرین ہے بیٹا!! آفرین ہے تم پر۔ پڑھی لکھی ہو کر تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ کم از کم خوفِ خدا ہی کرو تم دونوں.....“ امی جان نے غصے سے کہا۔ تبھی گیٹ کے باہر لگی تھنی کی آواز آئی۔ غالباً پڑوس سے کوئی خبر لینے آیا تھا۔ میں نے امی جان کو بھی نارمل رہنے کو کہا اور مظہر سے ریو الور لے لیا۔ مظہر کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں نے اسے منہ دھونے کو کہا اور باہر نکلی۔

”کون ہے؟“ میں نے گیٹ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

”پولیس ہے بی بی! دروازہ کھولیں.....“ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

”ٹھہریئے میں اپنے بھائی کو بھیجتی ہوں۔“ میں واپس لوٹی اور مظہر کو بتایا کہ باہر پولیس آئی تھی..... وہ بھی ایک دم شہما گیا، تاہم خود پر قابو پالیا اور کہنے لگا ”آپ ریلیکس رہیں، یہ خالی ریو الور آپ لے لیں اور وہ بھرا ہوا مجھے دے دیں.....“ میں اسے وہ ریو الور دینے پر متذنب تھی۔

”جلدی دیں ورنہ پولیس والے ٹنک میں جتلا ہو سکتے ہیں.....“ اس نے سختی سے کہا۔

”مگر تم کہو گے کیا ان سے؟“ میں گھبرائی مگر ریو الور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”جو بھی کہوں گا اندر آ کر کہوں گا، آپ کے سامنے..... بس امی جان کو پولیس کہ بیٹھ کر سامنے ہی تسبیح پڑھیں اور ذرا پولیس کے سامنے ریلیکس رہیں۔“ کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔ لاؤنچ اور باہر کے دروازے اس نے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ میں نے امی جان کو سمجھایا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئیں اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ ”آئیے سر! اندر آئیں آپ!!“ مظہر کی آواز آئی تھی۔

”اصل میں آپ کے پڑوسیوں نے فائر کی آواز سنیں تو انہوں نے ہمیں کال کر دی کہ غالباً کوئی گڑبڑ ہے۔“ پولیس والے کی آواز سنائی دی۔

”سب خیریت ہے..... سوری سر! بس میری بڑی بہن ہیں انہیں بہت شوق ہے ریو الور چلانے کا، انہی کو سکھارہا تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ کس طرح ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھانا ہے اور غلطی سے مجھ سے خود ہی ٹریگر بوب گیا۔ ان کا ریو الور تو خالی تھا مگر میرا ریو الور بھرا ہوا تھا.....“ مظہر کی چالاکی پر میں حیران ہی تو رہ گئی، کیسے اس نے فوراً ہی ترکیب سوچ لی تھی۔

”الائنسنس ہے آپ کے پاس اس ریو الور کا اور آپ کی بہن کے ریو الور کا؟“ پولیس والے نے سوال کیا۔

”سر وہ والا تو کھلونا ہے اور میرا الائنسنس ہے.....“ مظہر نے وضاحت کی۔ پولیس والے نے

اپنی جیب سے رومال نکالا اور باری باری دونوں ریو الور کھول کر چیک کیئے۔ کرچیوں کے ڈھیر میں سے انہیں چلائی ہوئی گولی بھی مل گئی، اسے بھی چیک کیا۔ دونوں ریو الور سوکھ کر بھی دیکھے۔

میں اتنی دیر میں چائے بنا کر ساتھ بسکٹ لے آئی تھی۔

”کیوں ماں جی!! یہی بات ہے یا کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے؟“ اس نے امی جان سے پوچھا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جانے اب امی جان کیا کہہ دیں۔

”میں تو بیٹا ہوں یہی بیٹی تسبیح پڑھتے پڑھتے ذرا اوجھ گھٹ گئی تھی۔ پھر میری آنکھ تو فائر کی آواز سے ہی کھلی، میں تو خود بھی یہی سمجھی کہ کوئی ڈاکو وغیرہ گھس آئے ہیں گھر میں.....“ امی جان کی آواز ہلکار ہی تھی جو کہ یقیناً جھوٹ بولنے کی وجہ سے تھی مگر اس وقت تو پولیس والے ان کی آواز کی ہکلاہٹ کو بھی خوف کا نتیجہ ہی سمجھ رہے ہوں گے۔

”امید ہے آپ لوگ یہ سب بیان کسی خوف کے زیر اثر نہیں دے رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کسی کے مجبور کرنے پر..... شاید گھر میں کوئی چھپا ہوا ہو؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے.....“ مظہر نے انہیں یقین دلایا۔ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، ”مظہر جاوید صاحب آئندہ خیال رکھیں، فی الحال تو میں اس پر کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔ لیکن آپ کو علم ہونا چاہئے کہ اگر ایسی غفلت کسی جانی نقصان کا باعث بن جاتی تو آپ پر قتل کا الزام بھی لگ سکتا تھا۔“ مجھے بھی یہ سن کر پھریری سی آگئی۔ ”اور اس طرح کی لاپرواہی کے سبب میں آپ کا لائسنس ضبط کرنے کا مجاز بھی ہوں، صرف آپ کو انتباہ کر رہا ہوں اور چھوڑ رہا ہوں کہ شاید آپ نے اپنی حفاظت کے خیال سے اسلحہ رکھا ہوا ہے، کیونکہ آپ کے گھر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لوگ متمول ہیں.....“

”آئی ایم سوری سر! اور بہت شکریہ سر.....“ مظہر نے بشارت سے کہا۔

”لیکن ایک مشورہ آپ کو مفت میں دینا چاہوں گا میڈم!“ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔  
”جی؟“ میں نے سوال کیا۔

”آپ اپنا ریوالور چلانے کا شوق ترک کر دیں۔ صنفِ نازک کے ہاتھ ہتھیار چلانے کے لیے مناسب نہیں ہوتے.....“ اس نے مسکرا کر کہا، ”اس لیے آپ اس مشغلے کو نہ اختیار کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے ہاتھوں کسی کا کوئی ناقابلِ تلافی نقصان ہو جائے۔“  
”جی اچھا!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

مظہر انہیں گیٹ تک چھوڑنے گیا تو میں اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرہ بند کر کے میں نے عشاء کی نماز اور شکرانے کے دونوں اہل پڑھے کہ ہم کتنے بڑے حادثے سے بچ گئے تھے۔ ریوالور میں دونوں ہی اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ اور میں اس کی اس تمام کارروائی پر حیران ہو رہی تھی کہ کیسے اس نے اصلی ریوالور جیب میں رکھ کر کھلونا ریوالور پہلے ہوٹل کے میئر کو دکھایا تھا اور بعد میں گھر پر اپنا بیان کیسے تیار کر لیا تھا۔ ایسی تیزی سے اس نے ترکیب سوچی تھی کہ میں بھی دنگ رہ گئی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر معظم پر بھی اس نے اصلی ریوالور تانا تھا؟“ میں نے سوچا.....  
”اور وہ کسی بھی لمحہ اس پر فائر کر سکتا تھا.....“ یہ سوچ کر تو گویا میرے جسم سے جان ہی نکل گئی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں بھری دنیا میں تنہا ہوں.....

○ آسمان ہے بے پیکر اس

پراس پر چاند ہے چمکتا نہ کوئی ستارہ!!

زمین کی وسعتیں لامحدود

مگر دیا ہے کوئی، نہ چراغ نہ جگنو

پھر بھی مجھے نظر آتا ہے

اپنے ساتھ چلتا ہوا سایہ

سایہ جو ساتھ چھوڑ دیتا ہے

اندھیاروں میں..... مگر کون ہے یہ

جو میرے ساتھ رہتا ہے سایہ بن کر

کس کی سرگوشیاں ہیں

جو ریختی ہیں میری کان کی نو پر

کس کا لمس ہے

جو انگلیاں بن کر ریختا ہے میرے کاندھے پر

کس کے نادیدہ

مضبوط کاندھوں کا سہارا ہے مجھے

کس کے بازو ہیں

○ جن کے گھیرے میں رہتی ہوں میں؟ (شیریں حیدر)

کوئی تو تھا جو مجھے اپنی تنہائیوں کا رفیق محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اسی سے باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس وقت جی تو چاہ رہا تھا کہ تیمور سے کال کر کے کہوں کہ فوراً آؤ..... مگر اتنی رات گئے اے کال کرتی تو وہ پریشان ہو جاتا۔ صبح تک تو مجھے انتظار کرنا ہی تھا اور صبح جانے کب ہوگی؟ اتنی طویل رات! شاید میری زندگی کی طویل ترین راتوں میں سے ایک رات۔

”امی جان اس وقت جانے کس پریشانی میں ہوں گی اور مظہر؟ وہ کیا سوچ رہا ہوگا؟“ میں نے سوچا اور عجیب سا احساس ہوا..... میں امی جان کو تسلی دلا سہ دیتی، انہیں مطمئن کرتی..... اس کی

بجائے مظہر سے ناراضگی کے اظہار کے طور پر خود کو کمرے میں مقید کر لیا تھا۔ مجھے شرمندگی کا احساس ہوا..... میں نے لیمپ آن کیا، رات کے دو بجے تھے، آہستگی سے دروازہ کھول کر میں کمرے سے باہر نکل تو چونک گئی..... لاؤنج میں ہی صوفے پر امی جان اسی جگہ بیٹھی تھیں..... اور مظہر نیچے قالین پر ان کے پیروں میں۔ دونوں جاگ رہے تھے۔ مظہر غالباً کچھ بول رہا تھا۔ میں تو گویا زمین میں ہی گر گئی۔

بھاگ کر آگے بڑھی اور امی جان کے گلے لگ کر بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اتنا زیادہ compose رکھا تھا، مگر اب برداشت نہ ہو رہا تھا۔ کبھی میں یوں وحال میں مار مار کر نہ روئی تھی، مگر اس وقت خود پر اختیار ہی کہاں تھا۔ جانے کب کب کے آنسو جمع تھے اور کس کس وقت کے دکھ..... کیا اصل صدمہ تھا جو رلا رہا تھا مجھے..... لیکن میں نے خود کو آزاد چھوڑ دیا، رونے دیا..... آنسوؤں پر بند باندھنا نہ سکیوں اور نالوں پر۔ شاید مجھے اس کتھار سس کی بہت ضرورت تھی تاکہ میرے وجود کی کٹھن ختم ہو جائے، میرے اندر کب سے جمع دکھ جولاوے کی طرح پک رہا تھا اس روز بہہ نکلا۔

امی جان اپنی انگلیوں سے میرا سر سہلا رہی تھیں اور میں زار و قطار رو رہی تھی۔ مظہر ابھی تک قالین پر ہی بیٹھا تھا۔ خاموش، شرمندہ اور غالباً حیران بھی۔ غالب کی وفات پر بھی میں یوں روئی تھی نہ ہی کبھی اس کے بعد۔ مظہر خاموشی سے ہی اٹھا اور پانی کا گلاس میرے لیے لے کر آیا۔

”پانی پی لیں بھابی! اور رونا بند کریں۔ اتنا بھی اچھا انسان نہیں وہ کہ اسے کھو کر آپ اتنے آنسو بہائیں۔“ میں خاموش رہی..... اس سوال کا کوئی جواب بھی میرے پاس نہ تھا۔ اور تھا بھی تو میں مظہر سے اس کی کیا وضاحت کر پاتی؟ یہ آنسو معظم کے لیے تو تھے بھی نہیں..... یہ تو اپنی محرومیوں، اپنی بے بسی اور اپنی شرمندگی کے آنسو تھے۔

”امی جان! آپ انھیں اور سو جائیں!“ میں نے امی جان سے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھیں، ”تم بھی سو جاؤ مظہر!“ میں نے مظہر سے کہا۔

”مجھے آپ سے کوئی اہم اور ضروری بات کرنی ہے، تھوڑی دیر کے لیے آپ میرے پاس بیٹھیں۔“ مظہر نے آہستگی سے کہا۔

”اس وقت سو جاؤ تم، بعد میں بات کر لیں گے۔“ میں نے جواباً کہا۔

”میں پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“ اس نے کہا تو میں اٹھتے اٹھتے رک گئی۔

”کیوں آپ خود کو تنہا اور ہم سے الگ سمجھتی ہیں؟ کیوں اپنی پریشانیاں ہم سے شیئر نہیں کرتیں؟ کیا اتنے سانوں میں بھی آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے مظہر! اور تم لوگوں کے سوا میرا ہے ہی کون؟“ مختصر سا جواب دیا۔

”میں اب ویسا چھوٹا نہیں رہا بھابی! میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ آپ کے اور اس گھر کے سارے مسائل کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ”مجھ سے آپ اسی طرح بات کر سکتی ہیں جس طرح آپ علی بھائی سے کر سکتی ہیں۔“

”تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے یہ بات علی بھائی کو بھی خون نہیں بتائی۔“ میں نے پر یقین لہجے میں کہا، ”اب اٹھو اور آرام کرو۔“

سکینہ آنٹی کے ہاں میلا و پر میں نے ہلکے سے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، شاید اسی لیے سب کو میں کمزور سی لگی تھی۔ سب نے باری باری مجھ سے میری طبیعت کا پوچھا۔ انتہائی قریبی اور تھوڑے سے لوگ تھے جن میں عورتیں ہی زیادہ تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ہی قالین پر چاندنیاں بچھا کر بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ کچھ کشن اور گاؤتیکے بھی تھے اور جو خواتین زمین پر نہ بیٹھ سکتی تھیں ان کے لیے چند ایک کرسیاں بھی رکھی گئی تھیں۔

میں والدہ کے بالکل ساتھ ہی بیٹھی تھی اور میری دوسری طرف نوید صاحب کی بہن شازیہ بیٹھی تھی۔ نوید صاحب کی بہنوں کو بلانے کی تجویز میری ہی تھی۔ اور اس وقت جبکہ ایک انتہائی خوش الحان خاتون نعت پڑھ رہی تھیں، میں والدہ سے کھسر پھسر کر رہی تھی کہ میلا و کے بعد اگر وہ مناسب سمجھیں تو سکینہ آنٹی سے ثانیہ کے رشتے کے لیے بات کر لیں۔ یہی تجویز میں نے دائیں طرف بیٹھی ہوئی شازیہ کو بھی دی۔ خصوصی طور پر دوبارہ پروگرام مرتب کر کے آنے کی نسبت مجھے وہ موقع بہت مناسب لگا تھا۔ اسی لیے جب محلے کی خواتین اور باقی مہمان خواتین روانہ ہوئیں تو ہم کتنی کے کچھ لوگ رہ گئے۔ تب والدہ کے کہنے پر شازیہ نے امی جان سے کہا کہ وہ نوید صاحب کی بزرگ کی حیثیت سے زارا کے لیے نوید صاحب کا رشتہ پیش کریں۔ بعد ازاں والدہ نے اپنا عندیہ

پیش کیا یعنی علی بھائی کا رشتہ ثانیہ کے لیے۔

ان دونوں سوالوں کے جواب میں آنٹی بالکل خاموش ہو گئیں۔ شاید یہ سب ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ ان کی تینوں بیٹیوں میں سے اس وقت کوئی بھی وہاں موجود نہ تھی، البتہ مظہر علی وہاں ہی تھا۔ وہ بھی خاموش بیٹھا تھا۔ ”آنٹی آپ تسلی سے زارا اور ثانیہ کی مرضی پوچھ کر جواب دیں۔ آخر انہیں بھی پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اس اہم فیصلے پر اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کریں!!“ میں نے خاموشی کا وقفہ کافی طویل ہوتے ہوئے دیکھا تو اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”ارے نہیں ماما بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ میری بیٹیاں میرے کیے گئے فیصلے سے کبھی انحراف نہ کریں گی۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ اللہ نے میرے صبر کا پھل کیا میرے لیے اتنا بہترین رکھا ہوا ہے؟ مجھ میں اتنی استطاعت کہاں کہ میں ان کے لیے ایسے بڑھوٹہ پاتی؟ مجھے اپنی خوش قسمتی اور ان کے نصیب پر رشک آ رہا ہے۔“ آنٹی کی آواز بلاشبہ بھرائی ہوئی تھی۔

”ایسی بات نہ کریں سیکینہ بہن!“ والدہ نے کہا، ”آپ کی سبھی بیٹیاں ہیرے ہیں ہیرے۔“  
 ”لیکن ہیروں کو صرف جوہری کی نظر ہی پہنچاتی ہے بہن جی.....“ سیکینہ آنٹی بولیں، ”عام آدمی کی نظر میں تو ہیرا بھی ایک پتھر ہی ہوتا ہے۔“

”یہ تو بڑی مشکل قسم کی گفتگو شروع ہو گئی ہے۔“ میں نے ہنس کر مداخلت کی، ”آنٹی آپ سوچ بھی لیں اور استخارہ بھی کر لیں اور پھر بیٹیوں کی رائے بھی لیں۔“

”نہ مجھے کچھ سوچنا ہے، نہ بیٹیوں کی رائے لینا ہے، اور استخارہ بھی کرنے کی ضرورت میں تب محسوس کرتی اگر میرے ذہن میں کوئی الجھن ہوتی۔ میں مطمئن ہوں اور مجھے اپنی بیٹیوں پر بھی اعتماد ہے۔ میری بیٹیاں اب میرے پاس آپ لوگوں کی امانتیں ہیں۔ آپ جیسے چاہیں اور جب حکم الہی ہو، آپ آکر اپنی امانتیں لے جائیں۔“ فقرہ مکمل کرنے تک آنٹی باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ میں نے ایسا سیدھا سادہ معاملہ رشتے کے بارے میں طے پاتے ہوئے اس سے قبل نہ دیکھا تھا۔ دل سے دعا کی کہ اللہ زارا اور ثانیہ کو اپنے گھروں میں خوش رکھے۔

سب سے پہلے میں نے ہی اٹھ کر شاز یہ کو، پھر والدہ کو اور پھر امی جان کو مبارکباد دی، اس کے بعد آنٹی سیکینہ اور مظہر علی کو مبارکباد دی۔ تبھی مبارک سلامت کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں۔ میں نے باہر کی راہ لی، جہاں تینوں بہنیں باورچی خانے میں کام سمیٹ رہی تھیں اور

ساتھ ہی چائے بنا رہی تھیں۔ زارا ڈھیر دن دھونے میں مصروف تھی۔ میں نے جا کر پیچھے سے ہی اس سے لپٹ کر اسے مبارکباد دی..... اس نے شکر یہ کہا۔ غالباً وہ یہ سمجھی ہوگی کہ میں نے اسے نئے گھر کی مبارکباد دی ہے۔

”بھلا کس چیز کی مبارکباد دے رہی ہوں؟“ میں نے شرارت سے آنکھیں مٹکا میں۔

”نئے گھر کی!! اور بھلا کس چیز کی؟“ زارا نے کہا۔

”تمہیں بھی مبارک ہو ثانیہ!!“ میں نے ثانیہ سے کہا۔ وہ بھی ہنس کر میرا شکر یہ ادا کرنے

لگی۔ دونوں کے چہروں پر حیرت ایک سوالیہ نشان کی طرح تجلی ہوئی تھی۔

”ثناء تمہیں بھی بہت مبارک ہو!“ میں نے چائے بناتی ہوئی ثناء کو لپٹا لیا۔

”اب ہمیں اس مبارکباد کی وضاحت تو کرویں۔“ ثناء نے مسکرا کر پوچھا۔

”تمہاری دونوں آپیاں اپنے اپنے پیادوں کو پیاری ہونے والی ہیں!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”سچ؟ کب؟ کس سے؟“ ثناء نے ایک سانس میں کئی سوالات دہرا دیے اور زارا اور ثانیہ

کے چہروں پر حیرت کی جگہ حیا اور مسرت نے لے لی۔

”سمجھو دونوں میری بھابھیاں بننے والی ہیں۔“

”لیکن آپ کے بھائی تو ایک ہی ہیں؟“ ثناء حیرت سے بولی۔ زارا اور ثانیہ کچھ نہ بول رہی

تھیں لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ان کا جسم کا ہر رواں اس وقت سامع بنا ہوا ہوگا، اس لیے میں نے مزید

آزما نا مناسب نہ سمجھا۔

”زارا کے لیے نوید صاحب کا اور ثانیہ کے لیے علی بھائی کا رشتہ آنٹی سیکینہ نے قبول کر کے

دونوں کے مستقبل پر مہر لگا دی۔“ میں نے بتایا تو ثناء چیخ کر مجھے لپٹ گئی۔ میں نے دوبارہ زارا اور

ثانیہ کو گلے لگا کر مبارکباد دی۔ وہ دونوں ہی شرمناک تھیں۔ ثناء نے چائے کی ٹرے تیار کی اور ثانیہ

سے کہا کہ چائے دے آئے، ثانیہ نے جانے سے انکار کر دیا۔ تو ثناء چائے کی ٹرے لے کر چلی گئی۔

”ماما جی! ہم تو پہلے ہی آپ کے احسانوں تلے دبے ہوئے ہیں۔ ایک احسان مزید آپ نے

ہم پر کر دیا ہے۔“ زارا نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ زارا غالباً ایسی توقع بھی نہ کر رہی تھی۔

”یوں کیوں کہہ رہی ہیں زارا۔ ان رشتوں کو قبولیت بخش کر تو آنٹی نے ہم سب پر احسان کیا

ہے۔ رشتہ مانگنا نہیں بلکہ اپنی پلی پلائی بیٹیاں کسی کو دینا احسان ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔



”پھر بھی ماہا باجی! یہ آپ کا بڑا پن ہے اور اپنائیت ہے کہ آپ نے ہمیں مشکل وقت میں سہارا دیا، ہمارا اتنا خیال کیا.....“ ثانیہ نے کہا۔

”چلو میں نے آپ کا خیال کیا تو اب آپ اس کے بدلے میں میرے علی بھائی کا خیال رکھنا۔“ میں نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا تو وہ بری طرح لجا گئی اور اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے مجھے لپٹ گئی۔

رشتوں کی قبولیت سب سے اہم مرحلہ تھا کہ اس کے سر ہوتے ہی ہر طرف شادی کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ والدہ کی مدد کے لیے کبھی مجھے اور کبھی صدف آپنی کو آنا پڑتا تھا۔ دفتر کا کام مکمل طور پر اب مظہر ہی سنبھالتا تھا۔ نوید صاحب اس کی مکمل راہنمائی کرتے تھے۔ ہر روز شام کو مظہر اپنی دن بھر کی تمام روئیداد سنا تا تھا اور اہم امور اور فیصلوں میں میری رائے کو اہمیت دیتا تھا۔

یقیناً شادی کی تیاریاں نوید صاحب کے ہاں بھی زوروں پر ہوں گی اور زارا اور ثانیہ کے گھروں پر بھی۔ ہر گھر میں میری رائے کو اہم اور مقدم سمجھا جاتا تھا۔ میری پوری کوشش تھی کہ شادیاں سادگی سے ہوں تاکہ کم از کم سیکھنے آنٹی پر مالی بوجھ کم سے کم پڑے۔ نوید صاحب اور علی بھائی دونوں ہی اپنی اپنی بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے اور بھائیوں کے حوالے سے بہنوں کے بہت ارمان ہوتے ہیں۔ بہت سی رکیں مثلاً اجٹن، مایوں، تیل اور مہندی وغیرہ خواہ مخواہ ہی ترتیب دی جا رہی تھیں تاکہ شادی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوا جاسکے۔ لیکن میں نے سب کو یہی مشورہ دیا اور بصدا اصرار اس بات پر منایا کہ دونوں بہنوں کی مہندیوں کا فنکشن اکٹھا رکھا جائے اور اس میں اخراجات بھی ان کے ساتھ مل کر بانٹے جائیں۔ اس بات پر مظہر علی متفق نہ ہو رہا تھا، مگر میں نے اسے سمجھایا کہ اس کے لیے دوبار اتوں کی تواضع ہی کافی اخراجات کا باعث ہوگی۔

بارا تیں بھی ایک ہی دن کے لیے طے ہوئی تھیں، البتہ ولیمہ ایک دن نوید صاحب اور زارا کا اور اس سے اگلے دن علی بھائی اور ثانیہ کا طے پایا تھا۔ عروسی ملبوسات کے انتخاب کے لیے بھی نوید صاحب کی بہنوں اور والدہ کے ساتھ میری معاونت اور مشورہ شامل رہا تھا۔ بارات کے دن کے ملبوسات اور زیورات سیکھنے آنٹی کی طرف سے ہوتا تھے، انہوں نے بھی مجھ سے درخواست کی کہ اس

اہم فیصلے کے لیے میں ان کے ساتھ ہی چلوں۔ یوں زارا، ثانیہ، ثناء، آنٹی اور میں ہم سب خصوصی طور پر ایک دن ان کے عروسی ملبوسات کے انتخاب اور خریداری کے لیے گئے۔

مجھے اندازہ تھا کہ ان کی قوت خرید اس معیار کے ملبوسات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی جس طرح کے ملبوسات نوید صاحب کے گھر والوں اور والدہ نے بنائے تھے۔ لیکن میرا دل خواہ خواہ چاہ رہا تھا کہ میں اس موقع پر ان کی کسی ایسے طریقے سے مدد کروں کہ انہیں احساس بھی نہ ہو۔ لیکن چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکی کہ میرا تعلق اب ان کی ایک بیٹی کی ہونے والی نند ہونے کی مناسبت سے مختلف تھا۔ میں نے خود کو کسی بھی طرح ایسی پیشکش سے روکا تاکہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

ثانیہ نے اپنے لیے لال جبکہ زارا نے گلابی رنگ کا جوڑا پسند کیا تھا۔ چونکہ دونوں بہنوں کے ویسے کے جوڑے بھی گلابی رنگ میں ہی تھے۔ تب میں نے زارا سے اصرار کیا کہ وہ بھی لال یا میرون جوڑے کا ہی انتخاب کرے کیونکہ ہمارے ہاں تو لال جوڑا دلہن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

”مگر میری عمر کی دلہنوں کو لال رنگ کب بھلا لگتا ہے؟“ زارا منہ ہی منہ میں بولی۔

”دلہن لال رنگ میں ہی اچھی لگتی ہے..... اور بس لال سوٹ ہی منتخب کرنا ہوگا۔“ میں نے ضد کی۔ آنٹی نے بھی میری تائید کی اور یوں زارا کے ناں ناں کرتے ہوئے بھی ہم نے اس کے لیے ایک لال سوٹ کا ہی انتخاب کیا، جس کے ساتھ کنٹر اسٹ میں فیروز کی رنگ بھی شامل تھا۔

ہلکے پیلے رنگ کے جوڑے میں آنٹی سیکھنے اس روز کتنی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ فنکشن اگر چنان کے گھر کے نزدیکی ایک ہال میں تھا اور تمام تر انتظامات کی ذمہ داری ہال کی انتظامیہ کے سپرد تھی، لیکن آنٹی تو یوں مصروف تھیں جیسے کہ وہ فنکشن ان کے گھر میں تھا۔ جن خواتین کو ہمہ وقت مصروف کار رہنے کی عادت ہوتی ہے ان کے لیے تمام دنیا ہی میدانِ عمل ہے۔ شاید وہ اپنے اندر موجزن خوشی کے جذبات کی شدت سے مجبور ہو کر جو گردش تھیں۔ جونہی میں امی جان کی ہمراہی میں ہال میں داخل ہوئی وہ میری طرف لپکیں۔ ”مظہر بیٹا کہاں ہے؟“ وہ بے چینی سے بولیں۔

”گھاڑی پارک کر کے آ رہا ہے۔“ میں نے انہیں بتایا۔ امی جان کو مل کر وہ مجھے ملیں اور اسی طرح میرا ہاتھ پکڑے پکڑے اسٹیج کی طرف آئیں جہاں پھولوں کی سجاوٹ تھی اور بہت

”ہیرے مضبوط ہوتے ہیں بیٹا! اور تمہاری طرح خوبصورت اور قیمتی بھی.....“ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میرا دل چاہا کہ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں.....

پتھر ہوں میں کہ ہیرا ہوں؟ ہیرا جو قدر نہ پاسکا اور زل گیا یا پتھر جو زمانے کی ٹھوکروں پہ ہے، نہ اس کی رضا ہے کوئی نہ رغبت، نہ اسے کوئی اختیار ہے۔ ہیرا بھی تو پتھر ہی ہے، چاہے کسی تاج پر جج جائے، یا سر بازار مول لگے، پتھروں کے کب دل ہوتے ہیں کہ ان میں جذبات ہوں!

”آئی آپ چلیں اور مہمانوں کو دیکھیں۔“ میں نے خود کو سنبھالا۔ آئی چلی گئیں تو میرا دل لہو لہو ہونے لگا، مجھے لگا میرا وجود بھی پگھل رہا ہو۔ ایک عجیب سی بے چارگی کے احساس نے میرا احاطہ کر لیا اور میں خود کو ایک جنس بے مایہ محسوس کرنے لگی۔ تھوڑی دیر قبل ہی جس مسرت کے احساس کے زیر اثر میں ہنسی خوشی مہندی کی تیاریوں میں مصروف تھی وہ احساس کہیں کھو گیا تھا۔ اسی کھوئے کھوئے انداز میں میں نے باقی رسومات میں شرکت کی۔

زارا اور نوید صاحب کو مہندی لگائی جا رہی تھی۔ جانے کس نے میرا نام پکارا اور میں اسی طرح بے دھیانی میں اٹھ کر مہندی لگانے لگی۔ ابھی میری انگلی شہادت نے مہندی کوئس کیا ہی تھا کہ میری سماعتوں سے ایک آواز نکلائی۔ ”ابھی سات سہاگنیں پوری نہیں ہوئیں اور تم لوگوں نے بیچ میں بدشگونی کر دی.....“ آواز خاصی واضح تھی، لیکن تھی کس کی، یہ دیکھنے کے لیے مجھ میں اپنا جھکا ہوا سراٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ سر جو خود ہی جھک گیا تھا، کسی ناکردہ جرم کی پاداش میں۔ میں نے ٹشو پیپر لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا کہ انگلی سے مہندی صاف کروں اور اٹھ جاؤں کہ زارا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھے مہندی نہیں لگائیں گی ماہاجی؟“ میں نے سراٹھا کر زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

”بعد میں لگا دوں گی زارا!!“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی ایسی بیہودہ اور بے سرو پا باتوں پر یقین رکھتی ہیں۔“ نوید

صاحب نے کہا۔ ”جانے کب ہم ان ہندوانہ رسموں کے سحر سے آزاد ہوں گے؟“

”میرے یقین رکھنے یا نہ رکھنے کی بات نہیں ہے.....“

”جو بھی ہے، آپ مہندی لگائیں مجھے!“ زارا نے اصرار کیا اور ناچار مجھے مہندی لگانا پڑی۔

قلب و زبان سے سدا سہاگن رہنے کی دعائیں دیتے ہوئے اسے مہندی لگائی اور پھر علی بھائی اور

خوبصورت لگ رہا تھا۔ مجھ سے انہوں نے اسٹیج کی سجاوٹ پر رائے لی اور پھر پوچھنے لگیں کہ مہندی کی رسم کس انداز سے ہو؟ وہ پہلے دونوں لڑکوں اور پھر دونوں لڑکیوں کو بٹھانا چاہ رہی تھیں، جبکہ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ پہلے زارا اور نوید صاحب کو بٹھایا جائے اور ان کی رسوم ہوں، پھر علی بھائی اور ثانیہ کو۔ آئی اس پر متفق ہو گئیں۔ ہال مہمانوں سے بھرنا شروع ہو گیا تھا۔

ہماری فیملی کے ارکان اور خصوصاً لڑکیاں ایک طرف ایک کمرے میں مہندی کے تھال سجا رہی تھیں۔ اسی طرح کسی دوسرے کمرے میں نوید صاحب کی بہنیں اور ان کی کزنز اپنی مہندی تیار کر رہی تھیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا گیا، کسی نے کھولا تو علم ہوا کہ سیکینہ آئی تھیں اور میرا پوچھ رہی تھیں۔ غالباً کوئی کام یا یاد آیا ہو گا ان کو..... میں اٹھی تاکہ ان کی بات سنوں۔

”بیٹا! صدف یہیں پر ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی آئی یہیں پر ہیں.....“

”بیٹا اس سے پوچھنا تھا کہ کبھی لوگ آگئے ہیں، تمہاری سسرال والے نہیں آئے؟“ ان کے

لہجے میں تشویش تھی، میرے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرایا۔

”وہ نہیں آئیں گے.....“ بمشکل میں نے کہا۔

”کیا کوئی ناراضگی ہے؟ مظہر علی خود جا کر انہیں کارڈ دے کر آیا تھا؟“ آئی حیران تھیں۔

”آئی! اب وہ میری سسرال والے نہیں رہے!!“ بمشکل میں نے یہ الفاظ ادا کیے، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں تو سارے درد و کرب سے گزر کر سنبھل چکی تھی، مگر آئی کانپ رہی تھیں۔

”تم نے بتایا نہیں؟ کیا معاملہ ہو گیا؟“ ان کی آنکھوں میں نمی اور لہجے میں غم کا تاثر تھا۔

”ایسی باتیں وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی معلوم ہو جاتی ہیں آئی!“ میں نے اپنے تڑپاؤں

داغ کو سمیٹا، ”آپ ایسے دل پر نہ لیں۔ میرے لیے اس میں میرے رب نے کوئی بہتری رکھی

ہوگی۔ چلیں اس وقت اور آج کے دن آپ خود کو پریشان نہ کریں۔“ میں نے انہیں مین ہال کی

طرف لے جانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

”کس قدر مضبوط ہو تم ماہا!“ وہ رونے لگیں۔

”پتھر مضبوط ہی تو ہوتے ہیں آئی.....“ میرے لہجے میں بھی جانے کیسے آنسوؤں کی نمکینی

اتر آئی تھی۔

ٹائیڈ کو مہندی لگانے کے وقت میں دانستہ غائب ہو گئی، یہاں تک کہ میری اتنی ڈھنڈیا پڑی کہ سب پریشان ہو گئے۔ لیکن تب تک یوں بھی سات سہائیں مہندی لگا چکی تھیں۔

مہندی کی تقریب کا خاتمہ ہوا تو والدہ کے ہاں سے سب نے بہت پر زور اصرار کیا کہ میں بھی ادھر ہی چلوں، مگر طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی اور مجھے اپنے اندر جمع کیے ہوئے آنسو بھی بہانا تھے۔ امی جان بھی کہتی رہیں کہ بھلے چلی جاؤ مگر مجھے خود ہی اس روز نہیں جانا تھا۔ واپسی پر مظہر نے بھی میری خاموشی کو محسوس کیا اور دریافت بھی کیا کہ کیا مسئلہ تھا۔ امی جان تو جانتی تھیں مگر وہ خاموش رہیں۔ میں نے بھی بہتری اسی میں سمجھی کہ خاموش رہوں۔ ”بات کوئی ہے ہی نہیں یا پھر حسب معمول مجھے بتانے والی نہیں ہے۔“ گھر پر گاڑی سے اتر کر اندر جاتے ہوئے مظہر نے پوچھا۔

”بعض زخم ایسے ہوتے ہیں کہ جوجن کے وجود پر ہوتے ہیں، انہیں تو تکلیف دیتے ہی ہیں، مگر دکھانے پر دیکھنے والے کو بھی اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں!!“ میں نے نم آلود آواز میں کہا۔

”زخموں پر پھاہے رکھنے سے تکلیف کی شدت کم بھی تو ہوتی ہے!“

”اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ پر پھاہے نہیں رکھے جاتے مظہر!!“ میں سکی۔ امی جان نے مجھے ساتھ لگا لیا۔ مظہر دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔

”تم تو اتنی بہادر ہو بیٹا! یونہی کسی جاہل عورت کی بیوقوفانہ بات پر خود کو پریشان کر رہی ہو۔“ امی جان نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”جاتے ہوئے تالا کس نے لگایا تھا؟“ مظہر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”میں نے!“ میں نے فوراً کہا، ”کیوں کھل نہیں رہا کیا؟“

”تالا تو کھل گیا ہے، مگر دروازہ نہیں کھل رہا۔ لگتا ہے اندر سے بولٹ کیا گیا ہے!“ مظہر کی آواز میں خوف کی سرسراہٹ تھی۔

”واپس چلو گاڑی میں اور باہر نکلو، باہر نکل کر کہیں سے پولیس سے رابطہ کرو۔“ امی جان نے حکم جاری کیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، آپ اور بھابی گاڑی میں بیٹھیں! بھابی آپ گاڑی چلا کر باہر لے جائیں، گھر سے فاصلے پر اور پولیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔ میں کسی طرح گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”نہیں تم اندر نہیں جاؤ گے!“ میرے اور امی جان کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

”میرے پاس ریوالور ہے امی جان!“ وہ بولا۔

”نہیں! ہرگز نہیں!! تم کوئی بہادری دکھانے کی کوشش مت کرو.....“ میں نے سختی سے کہا۔

”بھابی پلیز!! آپ لوگ نکلیں.....“ اس نے مجھے اور امی جان کو گاڑی کی طرف دھکیلا اور

گیٹ وا کر دیا۔ گیٹ کھولنے اور گاڑی اشارت کر کے واپس نکالتے ہوئے خاصی آواز پیدا ہوئی۔ مظہر کھڑکیوں سے نیچے نیچے ہوتا ہوا ایک طرف سے اندر جانے لگا۔ میں نے گاڑی اشارت کی اور گھر سے تھوڑا دور لے آئی۔

پولیس سے کس طرح رابطہ کروں؟ رات دو بجے کا عمل تھا۔ شش و پنج میں تھی کہ کیا کروں، کیا کسی ہمسائے کو جگاؤں؟ تب میں نے تیمور کو فون کرنے کا سوچا، وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے پولیس کو جلد آنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ حسب توقع اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی، میں نے مختصر اسے روداد سنائی اور اسے کہا کہ کچھ کرے۔ ”آپ گھر چلیں، میں کچھ کرتا ہوں!“ تیمور کے لہجہ کا اطمینان مجھے بے چین کر گیا۔ میں نے امی جان کو بتایا تو وہ بھی کنکشن میں تھیں۔ میں نے گاڑی اشارت کی۔

”کہیں تیمور ہی نہ آیا ہو؟“ امی جان نے میرے خیال کو زبان دے دی تھی۔

”ہونہ ہو یہی بات ہے!“ میں نے کہا اور پھر گھر تک کا چند سوگڑ کا فاصلہ طے ہو کر ہی نہ دے رہا تھا، گیٹ کھلا تھا، گاڑی پورچ میں داخل ہوتے ہی اندرونی دروازہ کھلا اور تیمور ہنستا ہوا باہر نکل کر امی جان سے لپٹ گیا۔ آواز میں سن کر مظہر بھی بھاگتا ہوا آیا اور تیمور کو دیکھ کر نہال ہو گیا۔ قہقہوں اور مسکراہٹوں سے تیمور کا استقبال ہوا۔ ماحول ایک کی خوشگوار لگنے لگا۔ تیمور کے پاس گھر کی اضافی چابی تھی جس سے اس نے تالا کھولا تھا۔

مجھے بھی تھوڑی دیر پہلے کی کدورت اور پریشانی گویا بھول گئی۔ تیمور نے بتایا کہ اسے بروقت پہنچ کر فنکشن کے مقام پر سر پرانزدینا تھا مگر ٹرین آٹھ گھنٹے کی تاخیر سے پہنچی اس لیے وہ تھوڑی دیر قبل ہی گھر پہنچا تھا اور کال کر کے علی بھائی سے معلوم کر چکا تھا کہ فنکشن ختم ہو چکا تھا۔

”چلو خیر شادی اور ویسے کا فنکشن ابھی باقی ہے۔“ اس کے بعد بھی ہم کافی دیر تک بیٹھے گپ شپ کرتے رہے اور نیند سے نڈھال ہو گئے تو سونے کو اٹھے۔

”آپ کچھ کمزوری لگ رہی ہیں! سب ٹھیک تو ہے؟“ تیمور نے اچانک پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں، شاید تمہاری نظر کمزور ہو گئی ہے۔“ میں نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔ اچانک میری نظر اٹھی اور میں نے دیکھا کہ مظہر تیمور کو کوئی اشارہ کر رہا تھا۔ تیمور کی توجہ مظہر کی طرف ہوئی اور وہ غالباً اس اشارے کا مطلب نہ سمجھا تھا۔

”اب ایسی بھی کمزور نظر نہیں ہے میری!“ تیمور الجھن میں تھا۔

”اس وقت سویا جائے، باقی باتیں کل ہوں گی۔“ مظہر نے حتیٰ انداز میں کہا۔ اس کے اس جملے نے مجھے بہت بڑی ذہنی کوفت سے بچالیا تھا جو اس وقت مجھے تیمور کو وضاحتیں دینے سے ہوتی۔ پہلے ہی میں پریشان تھی۔ امی جان سونے کے لیے جا چکی تھیں، میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور کمرے میں داخل ہونے سے قبل میں نے سنا، تیمور کہہ رہا تھا، ”تم ہی بتا دو سبب بھابی کی پریشانی کا، میں انہیں جانتا ہوں اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ بہت زیادہ اپ سیٹ ہیں ذہنی طور پر.....“ میں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند نہ کیا بلکہ پورا کھلا رہنے دیا اور اس کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ اخلاقی طور پر یہ بہت بڑا جرم تھی لیکن میرے تجسس نے میری اخلاقیات کو سلا دیا تھا۔ میں سننا چاہ رہی تھی کہ اگر تیمور مظہر کی زبانی مجھ پر نیتنے والے حالات کی بابت سنے گا تو کیا رد عمل ہوگا؟ مظہر کس طرح بتائے گا.....

”بہت بچپان ہے آپ کو بھابی کے چہرے سے ان کی اندرونی کیفیات کی ویسے بڑے

استاد ہیں آپ!“ مظہر نے کہا۔

”کیا ہوا ہے؟ بتاؤ مجھے جلدی!!“ تیمور نے بے تابی سے پوچھا۔

”یہ تو آپ بھابی سے ہی پوچھو گے، اگر انہوں نے مناسب سمجھا تو آپ کو بتا دیں گی۔ اپنی پریشانیوں کو وہ اس گھر میں رہتے ہوئے کبھی مجھ سے بھی شیئر نہیں کرتیں۔“

”اس لیے کہ تم چھوٹے ہو.....“ تیمور نے کہا۔

”اب میں بہت بڑا ہو چکا ہوں تیمور بھائی! اتنا بڑا کہ یہ بھی جانتا ہوں، بھابی کی زندگی میں پیش آنے والے آدھے سے زیادہ مسائل کا حل آپ کے پاس تھا، لیکن آپ نے اپنا دامن

بچایا.....“ اس کا لہجہ تیز تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

”میرا مطلب بہت واضح ہے۔ میں تو چھوٹا تھا مگر آپ گھر اور کاروبار کا بوجھ ان کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر خود ایک طرف ہٹ گئے اور پھر انہیں سہارا دینے کی بجائے کسی اور سے منگنی کروا کر انہیں پھر زندگی کی دوڑ میں تباہ چھوڑ دیا.....“ میرا دل کاٹنے لگا اور مجھ میں مزید سننے کی سکت نہ رہی، کہیں تیمور یا مظہر میں سے کوئی اٹھ کر اچانک لابی میں آ جاتا تو اسے میرے کمرے کا کھلا دروازہ نظر آ جاتا۔ میں نے بے آواز طریقے سے دروازہ بند کیا اور اپنے بستر پر آگئی۔

یہ مظہر جسے میں چھوٹو سمجھتی تھی اور لا پرواہ سا بھی، کس قدر حساس تھا۔ کیسے وہ بڑے بھائی سے جواب طلبی کر رہا تھا..... ”کہیں غصے میں بات بڑھ ہی نہ جائے.....؟“ سوچ کر مجھے ایک دم پریشانی نے آن گھیرا۔ جلدی سے اٹھی، دوپٹہ لیا اور خاصی آواز پیدا کر کے دروازہ کھولا۔ ”ابھی تک بیٹھے ہوئے ہو تم لوگ؟“ میں نے کچن کی طرف جاتے ہوئے سادگی سے پوچھا، ”پانی پینا ہے کسی کو یا پھر چائے؟“

”آپ کو تو نیند آ رہی تھی.....“ تیمور کا لہجہ شکستہ تھا۔

”ہاں نیند تو آ رہی ہے اور تقریباً سو بھی گئی تھی، لیکن کمرے میں پانی رکھنا بھول گئی تھی۔“ میں نے وضاحت دی۔

”سوچا نہیں پھر آپ، ہم بھی سو رہے ہیں اب۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اگلے ہی روز مجھے تیمور کو جانے کیا کیا وضاحتیں دینا ہوں گی۔ ”چلو جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔“ میں نے سر جھٹکا اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

اور تیمور کی جواب طلبی کے ”خوف“ سے میں نے اگلے ہی روز ناشتے سے قبل علی بھائی کو فون کر دیا کہ وہ مجھے گاڑی بھیج کر منگوالیں۔ تیمور اور مظہر سو رہے تھے، میں نے امی جان کو بتا دیا کہ میں ناشتے کے بعد والدہ کی طرف چلی جاؤں گی۔ انہیں کوئی اعتراض نہ تھا، وہ تو رات کو ہی کہہ رہی تھیں کہ میں ادھر چلی جاتی۔

والدہ کے ہاں بچپنی تو جوانوں اور نوجوانوں کی ابھی بیداری بھی عمل میں نہ آئی تھی۔ میں حسب عادت والدہ کے بستر میں گھس گئی، جانے کیسے نیند کا غلبہ ہوا اور میں دیر تک سوتی رہی۔

جاگی تو گھر میں دوپہر کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ساری بہنیں مجھے دیکھ کر خوش ہوئیں اور خوب رونق تھی۔ عائشہ باجی، تانیہ باجی اور صدف آپنی بھی دہیں پر تھیں۔ رات کو بارات تھی اس لیے شام تک سب ریلیکس تھے۔ البتہ چھوٹی بچیاں اور بچے سر شام ہی تیار ہونے لگے، ان سب کو جلدی تھی کہ کہیں دیر نہ ہو جائے اور تو اور وہ بڑوں کو بھی کہہ رہے تھے کہ جلدی جلدی اٹھ کر تیار ہوں تاکہ دیر نہ ہو جائے۔

عائشہ باجی کی بیٹی فاطمہ تو اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ سب اسے دیکھ دیکھ کر غار ہو رہے تھے۔ اپنی تو قلی زبان میں باتیں کرتے ہوئے فاطمہ اور احمد سب کی توجہ کا مرکز تھے۔ صدف آپنی کی بڑی بیٹی کرن بچوں کی انچارج تھی اور وہ سب بچوں کو تیاری میں مدد دے رہی تھی۔ شام کی چائے کا دور چلا اور پھر بڑوں نے بھی تیاری شروع کر دی۔ صدف آپنی نے خود تیار ہو کر زبردستی میرا بھی ٹھیک ٹھاک میک اپ کر کے مجھے تیار کیا۔ آئینہ دیکھ کر مجھے خود سے بھی جھک آنے لگی۔ لیکن صدف آپنی کی ڈانٹ نے مجھے اس حلیے کو برقرار رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”آپنی ابلیزیہ بہت زیادہ ہے اوپر سے اتنے گہرے رنگ کا سوٹ۔“ میں نے احتجاج کیا۔  
”سوٹ تو والدہ نے بنائے ہیں اس لیے ان سے بات کرو، البتہ میک اپ اتارنے کی کوشش کی تو میں ناراض ہو جاؤں گی تم سے۔“ صدف آپنی نے دھمکی دی۔ مگر کیا نہ کرتا کہ مصداق اسی لباس اور میک اپ کے ساتھ جب میں کمرے سے نکلی تو کئی تعریفی اور تو صی جملوں سے استقبال ہوا۔ ڈرائنگ روم میں آئی تو امی جان، تیمور، مظہر کے علاوہ نگہت کی سسرال سے اس کی ساس بمعہ ماہِ رُخ اور ستارہ کے موجود تھیں۔ ماہِ رُخ نے اپنا منگنی کا جوڑا پہن رکھا تھا اور ستارہ بھی سیاہ ستاروں بھرے سوٹ میں جھلملا رہی تھی۔ میں سب کو مل کر بیٹھی، تھوڑی دیر میں سہرا بندی کا شورا اٹھا اور سب صحن میں اٹھ کر آگئے جہاں سہرا بندی ہو رہی تھی۔ والدہ نے سب بہنوں کو سہرا بندی اور باگ پکڑائی کے ٹیگ دیئے اور بارات روانہ ہوئی۔

بارات کے استقبال کے لیے اپنے بیٹے مظہر علی کے ہمراہ کھڑی ہوئی سیکنہ آنٹی کے چہرے کا اطمینان اور مسرت دیدنی تھی، جن کے نصیب میں ان کے صبر کے پھل کے طور پر اللہ نے نوید صاحب اور علی بھائی جیسے داماد لکھ دیئے تھے۔ علی بھائی کی بارات پہلے پہنچی تھی، دوسری بارات کو تھوڑی دیر بعد کا وقت دیا گیا تھا، تاکہ استقبال میں کوئی کمی نہ ہو اور ہر بارات کا استقبال علیحدہ اور

شایان شان طریقہ سے ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد سیکنہ آنٹی میرے پاس آئیں اور خواہش ظاہر کی کہ میں بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو کر نوید صاحب کی بارات کا استقبال کروں۔

”علی بیٹا تو تمہارا بھائی ہے اس لیے تمہیں اس کی بارات میں آنا تھا، مگر میری بیٹی کی حیثیت سے اب تم کھڑی ہو جاؤ کیونکہ ثناء زارا اور تانیہ کے ساتھ بیوی پار لگ گئی ہوئی ہے۔“ سو میں اٹھ کر ان کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی اور ساتھ ہی دوسری بارات کی آمد کا شورا اٹھا، تھوڑی دیر میں والدہ، امی جان، مظہر اور تیمور بھی آ کر ہمارے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔ اس مان پر سیکنہ آنٹی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مظہر علی نے تو سب لوگوں کا شکریہ ادا کر بھی دیا کہ انہوں نے بارات کے استقبال کے لیے کھڑے ہو کر ان کی عزت افزائی کی تھی۔

بارات آگئی، استقبال ہوا اور پھر اسٹیج پر دو دو لمبے بیٹھے۔ ماشاء اللہ سیکنہ آنٹی کی دونوں بیٹیاں بہت پیاری تھیں اور اللہ نے ان کے نصیب بھی دیے ہی پیارے لکھے تھے۔ باری باری نکاح ہوئے اور پھر کھانا پیش کیا گیا۔ کھانے کے بعد دونوں دلنیں لائی گئیں اور خوبصورت جوڑیوں سے اسٹیج سج گیا۔ دونوں اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ نظر ہی نہ ٹھہر رہی تھی۔ طویل فوٹو سیشن ہوئے اور پھر زارا کی رخصتی ہوئی۔ آنسوؤں اور سسکیوں میں اپنے جگر کا ایک ٹکڑا سیکنہ آنٹی نے نوید صاحب کے اور دوسرے اعلیٰ بھائی کے حوالے کیا۔

ایک ساتھ دو بیٹیوں کی رخصتی جہاں آنٹی کے لیے ایک بہت بڑے فرض کی ادائیگی تھی، وہیں ان کے آنگن سے چڑیوں کی چھہا ہٹ اور رونق کو بھی ساتھ لے گئی تھی۔ انہیں بھی اپنا سینہ کھوکھلا محسوس ہو رہا تھا۔ دنیا کی ہر ماں اس کیفیت سے دوچار ہوتی ہے جب اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی پٹی پلائی بیٹی کو کسی کے حوالے کرتی ہے، اصل میں تو بیٹی امانت ہی ہوتی ہے، جسے ماں سالوں کیلچے سے لگا کر رکھتی ہے اور جب اصل حقدار آ جاتے ہیں تو یہ امانت بلا چون دچرا ان کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ بارات کی دایسی شروع ہوئی تو میں بھی آنٹی اور ثناء کو مل کر روانہ ہوئی۔ مظہر علی اور آنٹی کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ہم پر اعتماد کر کے ہمیں اپنی بیٹی دی۔ والدہ نے بھی آنٹی سے گلے ملنے ہوئے بہت تسلی دی کہ وہ تانیہ کو اپنی بیٹی بنا کر لے جا رہی ہیں بہو نہیں..... اور یہ کہ اسے کبھی بھی تکلیف نہیں ہونے دیں گی۔ اور مجھے معلوم تھا کہ والدہ تھیں بھی ایسی ہی بے ضرری۔ انہیں اپنی اکلوتی بہو کو تھیلی کا چھالا بنا کر ہی رکھنا تھا۔

چند گھنٹے قبل ہی انہوں نے ہم چاروں بہنوں کو بٹھا کر یہ بات سمجھائی تھی کہ ہمیں اپنی اکلوتی بھابھ کو عزت، محبت اور اس کا اصل مقام دینا ہے۔ کسی دوسرے گھر سے آنے والی بیٹی ایک ناتواں پودے کی طرح ہوتی ہے، جسے جڑوں سمیت اس کے میکے سے اکھیر کر سسرال میں لایا جاتا ہے۔ اس ناتواں پودے کو کئی جگہ اور نئے گھر میں جڑ پکڑنے میں وقت لگتا ہے۔ ہر گھر کا ماحول، طریقہ اور روایات مختلف ہوتے ہیں۔ اس کی مدد کریں کہ وہ ہمیں سمجھ سکے، ہمارے ماحول کو اور اپنے نئے گھر کو..... اگر ہم شروع کے اس آزمائشی دور میں اس کی مدد کریں گے، اسے آسانیاں فراہم کریں گے تو وہ ہمیں اپنا سمجھے گی۔

ہم اس کی عزت کریں گے تو وہ ہماری عزت کرے گی۔ کچھ باتیں اسے ہماری برداشت کرنا ہوں گی کچھ ہمیں اس کی۔ ہم سب اس سے عمر میں بھی زیادہ ہیں اور تجربے میں بھی اس لیے ہمارے رویوں میں پلک زیادہ ہونی چاہئے۔ یوں بھی ہم میں سے ہر کوئی کم کم ہی میکے آتا تھا، سب سے زیادہ میں ہی آتی تھی کہ میں سسرال میں ایک مختلف حیثیت سے رہ رہی تھی۔ شوہر اور بچے نہ تھے اور نہ ہی ایسی مجبوری اور ذمہ داری جو میکے آنے میں حارج ہوتی جبکہ باقی بہنیں اپنے گھروں، شوہروں اور بچوں کے گورکھ دھندوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

اگلے روز رات کو نوید صاحب کا ولیمہ تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میرا پروگرام تھا کہ گھر جاؤں گی اور وہیں سے سب کے ساتھ ویسے پر آؤں گی۔ تانیہ باجی صبح ہی چلی گئی تھیں، انہیں اس ویسے میں شرکت نہ کرنا تھی کہ ان کے سسرال میں اپنے ہی بھیلے کافی تھے، نئی رشتہ داریاں اور تعلقات بھانا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ صدف آپنی بھی اپنے گھر چلی گئی تھیں وہیں سے انہیں ویسے پر آنا تھا۔ عائشہ باجی وہیں تھیں۔ میں والدہ کے کمرے میں ہی سو رہی تھی، اس لیے با آسانی فجر کے وقت اٹھ گئی۔ نماز پڑھ کر ابو، والدہ کے لیے اور اپنے لیے چائے بنائی، پھر ناشتہ۔ ناشتے کی خوشبو سونگھ کر عثمان بھائی بھی آپنچے جبکہ باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ میرے موبائل فون پر علی بھائی کا پیغام آیا، چائے بھجوانے کے لیے۔ میں نے خود اٹھ کر چائے بنائی، دو پلیٹوں میں نمکین اور میٹھے بسکٹ رکھے اور خود رے لے کر کمرے میں گئی۔

علی بھائی اور تانیہ صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ دونوں کو ان کی نئی زندگی کی پہلی صبح کی مبارکباد دی۔ علی بھائی نے اٹھ کر مجھے صوفے پر بیٹھنے کو جگہ دی اور خود بیڈ کے ایک کونے پر ٹپک گئے۔ میں نے دونوں کو چائے بنا کر دی۔ شکر یہ کہ تانیہ نے کپ لے لیا۔ نکھری نکھری سی اور شرمائی لبائی سی تانیہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ”کیسی لگی ہماری چوائس علی بھائی؟“ میں نے شرارت سے کہا۔

”ہوں ٹھیک ہی ہے بس گزارہ لائق!!“ علی بھائی نے شرارت سے کہا تو تانیہ مسکرا دی اور میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

”آپ کو کیسے لگے علی بھائی؟ بھابی!!“

ماہاجی! آپ مجھے تانیہ ہی کہیں، جیسے پہلے کہتی تھیں اور..... وہ شرمائی گئی ”آپ کے بھائی ہیں، آپ بہتر جانتی ہیں، آپ اتنی اچھی ہیں تو آپ کے بھائی بھی ایسے ہی ہوں گے۔“

”ہوں گے کا کیا مطلب؟ کوئی شک ہے کیا؟“ علی بھائی نے اس کی طرف گھوم کر دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

”بس اب آپ بس کریں۔ مت تنگ کریں اس کو۔ اس نے تو پھر بھی آپ سے بہتر جواب دیا ہے۔“ میں ٹھٹکی۔

”ظاہر ہے کہ مجھ سے بہتر ہیں تو بہتر جواب ہی دیں گی ناں!!“ علی بھائی کے لہجے میں شرارت تھی۔

”واہ واہ بھئی واہ! یہ ہوئی ناں بات..... آپ نے تو ہزاروں لاکھوں کی بات کی ہے۔“ میں نے کہا اور تانیہ کے چہرے پر حیا اور مسکراہٹ کے رنگ بکھر گئے۔

دوپہر کے کھانے پر تیمور بھی آگیا، اس نے بتایا کہ وہ مجھے لینے کے لیے آیا تھا۔ ابو نے اسے کہا کہ وہ خود مجھے چھوڑنے جا رہے تھے لیکن میں سمجھ گئی تھی کہ تیمور کے اندر تجسس کا کیرا کلبلا رہا تھا اور مجھے واپسی پر اسے جواب دہی کرنا ہوگی۔ کھانا کھا کر سب کو خدا حافظ کہہ کر میں تیمور کے ساتھ روانہ ہوئی۔ حسب توقع تیمور کی گاڑی کا رخ گھر کی بجائے مال روڈ پر واقع ایک چھوٹے سے کافی ہاؤس کے سامنے جا کر اس نے گاڑی روکی۔ ”اگر آپ براندہ منائیں تو ایک کپ کافی ہو جائے؟“

”جوابات تم نے کرنی ہے وہ گاڑی میں بیٹھ کر بھی کی جاسکتی ہے!!“ میں نے بے تاثر چہرے

کے ساتھ کہا۔

”تو گویا آپ کو میرے ساتھ کافی پینے پر اعتراض ہے؟“ تیمور نے ایکٹنگ کی حیرت کی۔

”ایسی کوئی بات نہیں!!“ میں گاڑی سے نکل آئی۔

”سب خیریت تو ہے بھائی؟ کوئی گڑبڑ ہے جو میں نہیں جان پارہا، آپ کچھ روشنی ڈالیں تو؟“

”کس معاملے میں؟“

”جو داستان آپ کا چہرہ کہہ رہا ہے!! کوئی پریشانی ہے؟ کچھ نہ کچھ تو ہے کہ جس کی پردہ داری

ہے؟ کہیں ڈاکٹر صاحب سے جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہو گیا؟“ وہ مسخرے پن سے بولا۔

”یہی سمجھ لو!!“ میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے پر کوئی رنگ نہ آئے۔

”وجہ؟“

”وجہ کوئی ایسی خاص نہیں!“ میری آواز کانپی۔

”اگر ناراض ہو کر پریشان اور اداں رہنا ہو اور بات بے بات لہجہ بھیگنے لگے تو بہتر نہیں کہ

ایسی ناراضگی کو رفع کر دیا جائے۔ منگنی کے بعد تو چھوٹی موٹی ناراضگیاں ٹھیک رہتی ہیں، بڑی

ناراضگیوں کو شادی کے بعد تک کے لیے اٹھا رکھیں۔“ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

”شادی تک نوبت ہی نہیں آئے گی!!“ میں نے دھماکہ کیا۔

”کیوں کیا اتنی شدید ناراضگی ہے؟“ تیمور حیرت سے بولا۔

”سب معاملہ ختم ہو گیا ہے تیمور! میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے، دن کے اجالوں میں اور کھلی

آنکھوں سے۔ مجھے اس نے بے سہارا سمجھ لیا تھا یا ترنوالہ، ٹھیک ہے میں تنہا تو ہوں یہ میں جانتی

ہوں مگر بے آسرا نہیں، جب تک تم ہو، علی بھائی ہیں اور مظہر ہے۔“ اور پھر آنسوؤں اور سسکیوں

کے ساتھ میں نے اسے اپنی بد قسمتی کی تمام داستان کہہ سنائی۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا، کبھی ٹشو پیپر

دیتا کہ میں آنسو صاف کر لوں، کبھی میرے کندھے پر ہاتھ کر لیتی دیتا اور جب تمام کہانی ختم ہوئی تو

مجھے اندازہ ہوا کہ میرا جسم جیسے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا، اپنے کرب اور درد کا سارا بوجھ تیمور کے کندھوں پر

ڈال کر میں خود کو محفوظ اور مطمئن سمجھنے لگی تھی۔ تیمور کا خاموش چہرہ اس کے اندر اٹھتے ہوئے جوار

بھاٹوں کا عکاس تھا۔

”میں ایک دفعہ پھر اپنا ہاتھ آپ کو سہارے کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں!!“ جب وہ بولا تو

میرے قریب ہی جیسے کوئی بم پھٹا تھا۔

”میرا جواب اب بھی دے رہا ہے جو اس سے قتل تھا!!“

”مجھے فوری جواب نہیں چاہئے، آپ سوچیں اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں.....“

”تیمور تم ایک Non Practical قسم کی بات کر رہے ہو!!“ میں نے زور دے کر کہا۔

”میں نے کہا ہے کہ مجھے نہ فوری جواب چاہئے نہ بے سوچا سمجھا فیصلہ!!“ کہتا ہوا وہ بل ادا

کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے مجبوراً اس کے پیچھے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

واپسی پر ہمارے ساتھ ایک نامعلوم سی خاموشی، ہمسفر تھی۔ مجھے وحشت ہونے لگی۔ یقیناً تیمور

کا سوال مظہر کی طرف سے کی گئی جواب طلبی کا نتیجہ تھا۔ اس رات دونوں بھائیوں کے مابین جو بھی

بات ہوئی ہوگی اس کے بعد تیمور نے میرے مسئلے کا بھی حل نکالا ہوگا۔

”کورس کیسا رہا تمہارا؟“ میں نے یونہی برسنیل تذکرہ کیا۔

”اچھا تھا، دوسری پوزیشن آئی ہے میری!!“

”بہت مبارک ہو!! اب واپس کوئی جاؤ گے کیا؟“

”نہیں فی الحال بہادپور ہی جاؤں گا یونٹ میں اور چھ ماہ کے بعد پھر پوسٹنگ ہو جائے

گی..... امید ہے۔“ اس نے سیدھے سے سوال کا سادہ سا جواب دیا۔

”کہاں پوسٹنگ ہوگی پھر؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا!! پر دوشن ہوگا تو ساتھ ہی تبدیلی کے احکامات کی توقع ہے اور یونٹ بھی

کافی عرصہ سے بہادپور میں ہے ہو سکتا ہے کہ یونٹ ہی کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے۔“ گھر آنے

تک میں ہی کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتی تھی اور تیمور پوچھے گئے سوال کا مختصر سا جواب دے دیتا۔

”تیمور! تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ؟“ میں نے گھر کے نزدیک پہنچ کر سوال کیا۔

”جی؟“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے معظم سے منگنی توڑنے کا فیصلہ غلط کیا ہے؟“

”منگنی توڑنے کا فیصلہ تو آپ نے درست کیا ہے کہ ایسے حالات میں اس کے علاوہ کوئی

چارہ نہیں تھا۔ لیکن آپ سے عرض ہے کہ اس کے بعد اپنے بارے میں فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔“

تیمور نے معنی خیز انداز سے کہا۔

”مجھے حیرت ہوتی ہے تمہارے منہ سے یہ بات سُن کر..... تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری اور ماہِ زرخ کی باہمی پسندیدگی کو نہیں جانتی؟ کیا میں نہیں جانتی کہ تم دونوں ایک دوسرے کی پسند ہو اور مٹگئی شدہ بھی ہو۔“ میری آواز خواخوہ اوچی ہونے لگی۔

”پسند ہونا یا پسند کیا جانا اور چیز ہے، اپنی پسند کو پالنا ہر کسی کے مقدر میں کب ہوتا ہے؟ اور اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ مجھے ماہِ زرخ سے زیادہ پسند ہیں تو؟“ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ میں تمہیں پسند ہوں، مگر اس پسند کی حیثیت مختلف ہے۔ تم میرا احترام کرتے ہو اپنے بھائی کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے اور بہنوں کی طرح سمجھتے ہو۔“

”باتوں میں میں کبھی کسی عورت سے آج تک جیت نہیں پایا۔ البتہ اب آپ گاڑی سے اتریں اور یاد رکھیں کہ میرا سوال قائم ہے۔ مٹگئی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، اگر ڈاکٹر معظم کی اور آپ کی ٹوٹ سکتی ہے تو میری اور ماہِ زرخ کی بھی ٹوٹ سکتی ہے.....“

”اللہ نہ کرے!!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

نوید صاحب کا ولیمہ ایک بڑے ہوٹل کے خوبصورت ہال میں تھا۔ رنگ و نور اور خوشبوؤں کا سیل رواں تھا۔ نوید صاحب اور زارادونوں ہی خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ آٹنی سیکنہ بیٹی کو خوش دیکھ کر خوش تھیں اور نظروں سے بیٹی اور داماد کے صدمے جاری تھیں۔ والدہ آئیں تو ساتھ عائشہ باجی، صدف آپی وغیرہ کے علاوہ پوری چھب سے علی بھائی اور ثانیہ بھی نیا شادی شدہ جوڑا موجود تھا۔ ثانیہ اس روز بہت حسین لگ رہی تھی، کوئی آسمان سے اتری ہوئی مخلوق۔ اپنی امی سے ملی اور پھر آکر مجھے ملی۔ ”بہت پیاری لگ رہی ہو ثانیہ!!“ میں نے کھلے دل سے تعریف کی۔

”بہت شکریہ ماہاجی!!“ اس نے کہا، ”آپ تو خیر ہیں ہی پیاری، آج اور بھی لگ رہی ہیں۔“

”اب تم بھی مجھے ماہا کہا کرو، جی! کادم چھلا اتار دو، خود تو بھائی کہلانے سے انکار کر دیا.....“

میں نے مسکرا کر کہا۔

”آپ تو ہماری محسن ہیں، اس لیے احتراماً آپ کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔“

”پلیز ثانیہ! آپ لوگ اس طرح نہ کہا کریں۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے آئندہ کوشش کروں گی آپ کو صرف ماہا کہنے کی، ماہاجی!“ اور اس بات پر علی بھائی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اسے لیے ہوئے اسٹج کی طرف بڑھ گئے۔

بارات اور ویسے کی تقریبات تو اب صرف لباس، زیور اور میک اپ کی نمود و نمائش کی تقریبات بن کر رہ گئی ہیں۔ مہندی کے فنکشن پر پھر کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی رہتی ہے مگر باقی دنوں میں تو صرف بیٹھ کر لوگوں کو دیکھتے رہنا ہی مقصد رہ گیا ہے۔ اس قدر بوریٹ بھر فنکشن تھا۔ اگر اٹھ کر کسی گروپ کے ساتھ بیٹھ جاؤ تو ہر کوئی دوسروں پر تنقید کرتا نظر آ رہا ہوتا ہے، کوئی دولہا اور دلہن کا موازنہ کر رہا ہوتا ہے اور ادھیڑ عمر خواتین بیٹھی ہوئی دیکھ رہی ہوتی ہیں کہ چلتی پھری اور بنی سنوری لڑکیوں میں سے کون ان کی بہو بننے کے لائق ہے، اس کا شجرہ پوچھا جا رہا ہوتا ہے اور مستقبل کا لائحہ عمل طے کیا جاتا ہے اور یہ سب تو آج کل ہمارے ہاں فوٹید گیوں، قلم، دسویں اور چالیسویں کی تقریبات میں بھی ہو رہا ہے۔

علی بھائی کے ویسے میں ہم بہنیں پیش پیش تھیں۔ ہمارے اکلوتے بھائی کا ولیمہ تھا، رشتہ دار، احباب، دوست اور سہیلیاں غرض سینکڑوں کا مجمع تھا اور ہر ایک کو ذمہ داریاں تفویض کر دی گئی تھیں۔ رانی باجی کو اس سے قبل ہر تقریب میں مدعو کیا جاتا تھا، مگر اب کے والدہ نے انہیں نہ بلوایا تھا، وجہ ظاہر تھی۔

اور تو اور مظہر اور تیور بھی کام میں پیش پیش تھے۔ علی بھائی کا ولیمہ بھی ایک بڑے ہوٹل کے ہال میں تھا اور اس نوعیت کے ہوٹلوں میں تمام تر ذمہ داری انتظامیہ ہی کی ہوتی ہے تاہم مہمانوں کا استقبال، ان کی نشست اور کھانے کے وقت ان کا خیال رکھنا، ایسے فرائض ہیں جو خاندان والوں کو ہی سرانجام دینا ہوتے ہیں۔ صدف آپی کے شوہر خرم بھائی، عائشہ باجی کے شوہر عثمان بھائی اور ثانیہ باجی کے شوہر عقیل بھائی ان تمام کاموں میں پوری ذمہ داری سے مصروف تھے، انہیں دیکھ کر قطعی یہ احساس نہ ہو رہا تھا کہ علی بھائی اکلوتے بھائی ہیں۔

شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ بیٹیاں دے کر داماد بیٹے بن جاتے ہیں اور والدہ تو دامادوں کی انتہائی زیادہ عزت کرتی ہیں۔ بلکہ بیٹیوں سے بڑھ کر ان سے پیار کرتی ہیں۔ انتہائی دوستانہ رویہ



اور والدہ جو کہ اسٹیج پر تھیں، ان کے پاس پہنچی تو انہوں نے فوٹو سیشن کے لیے پاس ہی بٹھالیا۔ میں جھنجھلائی گئی، کچھ تو مجھے تصاویر کھینچوانے کا اتنا شوق بھی نہ تھا اور کچھ جس کام سے آئی تھی اس کی وجہ سے ذہن میں الجھن سی تھی۔ چاروٹا چار دو تین تصاویر کھینچوائیں، چہرے پر مسکراہٹ لانے کی حتی المقدور کوشش کی مگر اس وقت بڑی مری مری سی مسکراہٹ آسکی تھی۔

تب والدہ کے پرس سے اپنا موبائل فون لیا اور لے کر کچھیلی طرف نسبتاً کم رش والی جگہ پر آ گئی تاکہ اطمینان سے بات کر سکوں۔ اور فون ملاتے ہوئے میرے ہاتھ بھی کپکپا رہے تھے۔ دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر فون نہ اٹھایا گیا۔ دوسری اور پھر تیسری کوشش پر فون آن ہوا..... ”جی!!!“ ماہ رخ کی آواز تھی۔ مجھے پچھتاوا ہوا کہ کیوں کال کیا۔ ایک دفعہ سوچا کہ فون بند کر دوں لیکن ماہ رخ نے میرا نام دیکھ لیا ہوگا اور میرے فون بند کر دینے سے جانے وہ کیا مطلب اخذ کرے۔

”ماہ رخ!!! تم ہی ہوناں؟“ یہ قوفی میں غلط جملہ میری زبان سے پھسل گیا۔

”کیوں کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟“ اس کے لہجے میں کیا تھا..... طنز یا تضحیک!!!

”میں پریشان ہو گئی تھی تیور کو نہ دیکھ کر..... میں سمجھی کہیں اس کی طبیعت..... خدا خواستہ۔“ میں اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر پا رہی تھی۔

”وہ خود تو ٹھیک ہے مگر تمہارے بارے میں پریشان ہے۔ بتا رہا تھا کہ تم نے اپنی منگنی توڑ دی ہے اور اب وہ فکر مند ہے کہ تمہارا کیا ہوگا!!“ اس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

”تیور ہے کہاں؟ اسے فون دو پلیز ذرا اور تم لوگ کہاں ہو؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔

”ہم ہوٹل میں ہی ہیں اور کافی پی رہے ہیں..... تیور ذرا ہاتھ روم تک گیا ہے۔ ویسے مجھے ایک بات پر بڑی حیرت ہے ماہ!۔“

”کس بات پر؟“

”یہ کہ جب نگہت بھابی اعجاز بھائی کے ساتھ باہر جاتی تھیں تو تب تمہیں کبھی فکر نہ ہوئی کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ بے تکلفی کی کن حدوں کو چھو رہے ہیں؟ اور تم جانتی ہو کہ وہ کون کون سی حدیں توڑ چکے تھے۔ اور تیور کا تم یوں پہرہ دیتی ہو جیسے میں کہیں اسے نگل ہی جاؤں گی..... کیا فکر ہے تمہیں اور کس بنا پر تم اس کی اتنی چوکیداری کرتی ہو؟ اب منگنی بھی توڑ دی ہے تم نے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے.....“ میرا سارا بدن سُن ہو گیا۔ میں نے بولنے کی

دامادوں کے ساتھ رکھتی ہیں۔ اچانک چپکے سے غالب کی یاد در آئی جو میری شکایتیں والدہ کو لگانے کی دھمکیاں مذاق میں مجھے دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ والدہ کا رویہ ان کے ساتھ بہت پیار بھرا اور دوستانہ تھا۔ اور اس شخص کو شاید جلد ہی اس دنیا سے چلے جانا تھا، اسے احساس تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے کہ اس نے بہت جلد اپنا مقام سسرال میں بنالیا تھا۔ والدہ اب بھی کہتی ہیں کہ غالب ان کے دامادوں میں ہیرا تھا۔

اور میں خالی مٹھی لیے بیٹھی ہوں، خود کو بہلانے کو کہتی ہوں، ہیرا ہے اس میں، اسے سنبھالنا ہے۔ کس کو دھوکہ دے رہی ہوں؟ خود کو ہی شاید!! مجھے معلوم ہے ہیرا کھو چکا، میرے آئینل میں ٹکا تھا کچھ دیر کو، اب تو تہہ خاک معدوم ہو چکا۔ مٹھی میری خالی ہے، پھر بھی بند کیے بیٹھی ہوں۔

یکدم مجھے احساس ہوا کہ تیور نظر نہ آ رہا تھا..... میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے کافی تلاش کیا اور اپنے دل میں آنے والے کسی اندیشے کے تحت نظریں امی جان کو ڈھونڈنے کے لیے دوڑائیں تو وہ بھی مجھے نظر نہ آئیں۔ میں اپنی نشست سے اٹھی اور مظہر کی طرف بڑھی۔

”تیور اور امی جان کہاں ہیں مظہر؟“ بے چینی سے پوچھا۔

”یہیں کہیں ہوں گے؟ میں دیکھتا ہوں، آپ بیٹھیں!!“ مظہر نے رمان سے کہا۔

”مجھے تو پریشانی ہو رہی ہے!!“ میری آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”خیریت ہی ہوگی، کوئی ایسی بات ہوتی تو مجھے بتا کر جاتے وہ لوگ!!“ مظہر نے کہا، ”ارے وہ رہیں امی جان اسٹیج پر تصویریں کھینچاتی ہوئی۔ اب تو آپ کی فکر ختم ہو جانی چاہئے۔ اور اب آپ ڈھونڈیں ماہ رخ بھابی کو!!! غالباً تیور بھائی ان کے ساتھ کہیں! دھرا دھرا ہو گئے ہیں موقع بھی ہے، دستور بھی ہے۔“ اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

”اس طرح کی حرکتیں کیوں کرے گا تیور؟ میں جانتی ہوں وہ ایسا بے وقوف نہیں ہے۔“ میں نے مظہر کو گھڑکا۔ لیکن میرے اپنے اندر الجھن سی تھی۔ والدہ کے پرس میں میرا موبائل رکھا تھا، اس لیے سوچا کہ یہ قوفیوں کی طرح تیور کو ڈھونڈے کی بجائے اسے کال کر کے پوچھ لیتی ہوں کہ کیا واقعی وہ ماہ رخ کے ساتھ ہے۔

کوشش کی تو میری آواز ہکلائے لگی۔

”کون ہے فون پر؟“ فون میں تیمور کی آواز آئی، غالباً اس نے فون ماہ رخ سے لے لیا تھا۔

”ماہا ہے!!“ ماہ رخ نے کہا تھا۔

”جی بھابی؟“ تیمور نے ریسور میں کہا۔

”وہ میں تمہیں نہ دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔“ میری آواز لرز رہی تھی۔

”خیریت تو ہے؟ آپ کی آواز جس طرح لرز رہی ہے یہ صرف میری فکر میں تو نہیں ہو سکتی۔

کہیں امی جان کی طبیعت وغیرہ تو خراب نہیں ہے؟“ وہ فکر سے بولا تھا۔

”پہلے تمہیں نہ دیکھ کر میں بھی یہی سمجھی تھی۔ لیکن امی جان بالکل ٹھیک ہیں، تم پریشان نہ ہو!!“

میں نے اسے تسلی دی، ”بس تم ایک بات کا خیال رکھنا کہ ماہ رخ سے کوئی ایسی بات نہ کرنا بھی!!“

”دیکھی؟“ اس نے مصلحتاً مختصر سوال پوچھا۔

”کسی بھی قسم کی..... خصوصاً میرے حوالے سے اور جو بات تم نے مجھ سے کی ہے اس کی

بابت!!“ مجھے سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی بات کی وضاحت کروں۔

”میں نیچے آتا ہوں!! مجھے آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“

”نہیں تم بیٹھو ماہ رخ کے ساتھ ورنہ وہ اپ سیٹ ہو جائے گی..... میں موقع دیکھ کر تھوڑی دیر

میں اوپر آتی ہوں..... میں نے سختی سے کہا۔

”آپ بھی غائب ہو گئیں تو ڈھنڈیا پڑ جائے گی۔“

”میں کسی نہ کسی کو بتا کر آؤں گی۔ بس تم نیچے نہ آؤ، میں ہی اوپر آتی ہوں اور میرے آنے تک

تم میرے بارے میں مزید کوئی بات نہ کرنا.....“ فون بند کر کے میں نزدیکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ اور میں خود سے ہی سوال کر رہی تھی کہ ماہ رخ کے ساتھ زندگی

کیونکر گزر سکے گی بھلا؟ تب مجھے لگا کہ میں کسی کی نظروں کے حصار میں ہوں۔

عورت کو اللہ تعالیٰ نے بڑی حساس نوعیت کے سنسر عطا کیے ہیں اسے اپنا احاطہ کرنے والی

نظریں بھی محسوس ہو جاتی ہیں۔ میں نے محتاط نظروں سے ہر طرف دیکھا لیکن کسی کو بھی نہ پا کر

مطمئن ہو گئی۔ تب میں ہال کے اگلے حصے کی طرف گئی جہاں مظہر کو تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا۔ لیکن

مجھے وہ بھی نظر نہ آیا۔ میں امی جان کے پاس گئی جو کہ اسٹیج سے اتر کر اگلے صوفوں پر بیٹھی تھیں۔

”امی جان میں ذرا باہر جا رہی ہوں، اوپر تیمور نے مجھے بلایا ہے۔ اسے کوئی کام ہے.....“

”یہ کیا موقع ہے کام کا، بیٹا تم نہ ہوئیں اور کوئی پوچھ بیٹھے تو؟“ امی جان ناراض ہونے لگیں۔

”اسی لیے تو آپ کو بتا رہی ہوں کہ ایسی کوئی بات ہوئی تو آپ صورت حال کو سنبھال لیجئے

گا۔ آپ کہیں کہ آپ نے مجھے کسی کام سے کہیں بھیجا ہے، پلیز!“ میں نے منت کی۔

”عجیب منطق ہے تم لوگوں کی، ایسی بے تکی قسم کی باتیں کرتے ہو۔“ امی جان نے کہا۔

”اصل میں تیمور کا کافی پیٹنے کو جی چاہ رہا ہے اور یہاں کی کافی بہت اچھی ہوتی ہے۔“ میں

نے بہانہ گھڑا۔

”ماہ رخ کہاں ہے؟“ امی جان جہاں دیدہ تھیں، انہیں دال میں کا نظر آنے لگا۔

”یہیں کہیں ہوگی..... ابھی اسے ڈھونڈ کر آپ کے پاس بھجواتی ہوں میں۔“ کہہ کر میں اٹھی

گئی، مبادا کہ انہیں میری آنکھوں سے میرے جھوٹ کا علم ہو جائے۔

باہر نکل کر پہلے میں نے باتھ روم کی طرف کا راستہ اختیار کیا تاکہ اگر کوئی مجھے ٹکٹا ہوا دیکھے تو

یہی سمجھے کہ میں باتھ روم جا رہی ہوں۔ باتھ روم سے نکل کر میں نے ہال کی بجائے مخالف راستہ

اختیار کیا اور خود کارزینوں یا لفٹ سے جانے کی بجائے سیڑھیوں کا راستہ اوپر جانے کے لیے

استعمال کیا۔ اس سے دیکھ لیے جانے کا احتمال کم سے کم تھا۔ تب بھی مجھے یہ احساس رہا کہ شاید کوئی

میرا تعاقب کر رہا تھا۔ مڑ مڑ کر میں پیچھے دیکھ رہی تھی مگر کوئی بھی نہ تھا۔

چوتھی منزل پر پہنچی تو پوچھنے پر علم ہوا کہ کافی شاپ تو پہلی منزل پر تھی۔ مجھے شدید گھبراہٹ اور

کوفت ہوئی۔ اتنی سیڑھیاں چڑھ کر آئی کہ ہانپ رہی تھی۔ اور اب مجھے لوٹ کر واپس جانا تھا۔ تب

میں نے لفٹ کی مدد سے نیچے جانے کا سوچا اور لفٹ کی طرف بڑھی۔ تیر کے اشاروں کی مدد سے

لفٹ کی نشاندہی کی گئی تھی۔ میں تیر کے انہی نشانات کی تقلید میں چل پڑی۔ دیزر قالیٹینوں والے

فرش پر بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے بھی مجھے لگا جیسے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز آرہی ہو۔

یہ فلور سب رہائشی کمروں کا تھا، اس لیے راہداریاں ویران تھیں، ماسوائے کہیں کہیں اکاڈ کا

لوگوں کے اور میں نے بار بار مڑ کر دیکھا مگر کوئی میرے تعاقب میں نہ تھا۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ لفٹ

کا مٹن دبا کر میں لفٹ کے انتظار میں کھڑی تھی۔ لفٹ کے باہر لگے ہوئے نوٹس کو میں انہماک سے

پڑھ رہی تھی۔ تبھی مجھے اپنے بالکل پیچھے کسی کی موجودگی محسوس ہوئی اور پھر دو مضبوط ہاتھوں نے

کوشش بھی میں اپنی چیخ نہ روک سکی۔

”دور کرو اپنے ہاتھ مجھ سے، مت چھوؤ مجھے اپنے ناپاک ہاتھوں سے..... نفرت ہے مجھے تم سے، تمہارے وجود سے اور تمہاری گھٹیا سوچ سے.....“ میں سسکی۔

”نہیں ماہا! تم یوں نہیں کر سکتی میرے ساتھ، کیسے تم میرے نام کی انگوٹھی پہن کر مجھے چھوڑ کر جاسکتی ہو؟ مجھے ایک بار موقع دو ماہا!! میں تمہاری زندگی میں مسکرائیں، سکھیر دوں گا۔ تم مجھے ملنے سے انکار کر رہی تھیں۔ میرا فون اینڈ نہیں کر رہی تھیں اور میں آج خاص طور پر یہاں آیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ مجھے موقع ضرور ملے گا۔ دیکھو قسمت نے میرا ساتھ دیا ہے، یہ خوش بختی کی علامت ہے۔ مجھے معاف کر دو، مجھے اپنالو، مجھے اکیلا مت کرو ماہا!!“ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا، میرے اندر کچھ چبھنے لگا۔

”بس مسٹر!! بہت ہو گیا ڈرامہ، اب دور ہٹو بھابی سے!!!“ مظہر کی سنسناتی ہوئی آواز میرے کان سے ٹکرائی میں پتھر کی بن کر رہ گئی۔

میں نے پلٹ کر مظہر کو دیکھا، شکر ہے کہ اس کے ہاتھ میں رولور نہ تھا۔  
”کیا کمال کا ہیرو ہے، بالکل صحیح وقت پر انٹری دیتا ہے۔“ معظم نے مظہر کا مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا۔

”تم بھی بڑے کینے ولن ہو، اور جب تک تمہیں صحیح سبق نہ دیا جائے گا، اسی طرح موقع بہ موقع نظر آتے رہو گے۔“ مظہر کے لہجے میں خوفناک دھمکی تھی۔

”کیا سبق دو گے تم مجھے استاد؟“ مظہر کو خالی ہاتھ دیکھ کر معظم کا حوصلہ بلند تھا۔  
”اب میں تمہیں زبانی نہیں بلکہ عملی سبق دوں گا۔“ کہتے ہوئے مظہر نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ میں چاہوں تو خود ہی یہاں تمہارا بھر کس نکال کر ایک طرف ڈھیر کر جاؤں مگر اس سے بھابی کی عزت پر حرف آئے گا۔ پولیس بھی آئی تو بھابی اس معاملے میں ملوث نظر آئیں گی، اس لیے تمہارے لیے خصوصی بندوبست کیا ہے میں نے۔“ مظہر نے اسے کہا ”بھابی آپ چلیں نیچے میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

”نہیں مظہر! میرے بھائی، تم کچھ نہیں کرو گے، تمہیں میری قسم!!“ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

مجھے اپنے گلے میں کس لیا۔ میں پوری طاقت سے جدوجہد کر رہی تھی کہ خود کو اس مضبوط گرفت سے چھڑا سکوں، مگر پکڑنے والے کی گرفت نہ صرف مضبوط بلکہ تکنیکی لحاظ سے بھی ایسی تھی کہ میں بالکل بے بس تھی۔

وہ اسی حالت میں مجھے گھسیٹ کر ایک طرف لے جا رہا تھا، لفٹ سے دور..... راہداری میں بائیں طرف مڑ کر سامنے ہی دو کرسیاں پڑی نظر آئیں۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر گرادیا، میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

”معظم!!!؟؟“ حیرت قائم تھی مگر خوف رعب ہو چکا تھا۔ کیونکہ میں یہ جانتی تھی وہ اتنا ”بہادر“ نہ تھا کہ مجھے کوئی تکلیف پہنچا سکتا۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

”صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بات سن لو، مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دو۔“ وہ منت کر رہا تھا۔

”کچھ باقی نہیں رہا، نہ سننے کو نہ کہنے کو.....“ میں نے سختی سے کہا۔  
”مجھے یوں مت ٹھکراؤ ماہا! مجھے بے آسرامت کرو۔“ وہ گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑ رکھے تھے، ”میں زندہ نہیں رہ سکوں گا تمہارے بغیر ماہا!“ وہ رو رہا تھا۔

”یہی ڈائیلاگ اور اسی طرح کے ڈائیلاگ تم نہ جانے کتنی ہی عورتوں کے ساتھ بول چکے ہو اور ان میں سے دو تو تمہاری لپچھے دار باتوں سے متاثر ہو کر، تمہارے جال میں پھنس کر اپنی زندگیاں بھی برباد کر چکی ہیں۔“ میں نے غصے سے کہا، ”چھوڑو مجھے ورنہ میں چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کر لوں گی۔“

”چیننا منت ماہا پلیز! میں منت کرتا ہوں تمہاری۔ وہ دو عورتیں خود بدکردار تھیں اور اپنی بدکرداریوں کے عملی نمونے میرے سر تھوپ رہی تھیں، اس لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا۔“

”اب بھی تم جھوٹ ہی بولے جا رہے ہو، کاش تم یہ کہتے کہ تم اپنے کہے پر شرمندہ ہو، کاش تمہیں کبھی ان عورتوں پر کیے گئے ظلم پر ندامت ہو۔ کاش تم اپنے بچوں کو اپنا نام دینے کو تیار ہو جاتے.....“

”تمہارے دماغ میں خناس بھر گئی ہے وہ کتیا اور فاحشہ!!“ اس نے چیخ کر مجھے جھنجھوڑا تو بصد

”آپ فکر نہ کریں، مجھے اپنے ہاتھ اس کو لگا کر ناپاک کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں اس کو چھوؤں گا بھی نہیں، بس آپ جائیں نیچے میں ابھی آتا ہوں۔“ زبردستی اس نے مجھے دھکیلا۔

”دیکھو مسٹر! تم یہ مت سمجھنا کہ میں اکیلا ہوں اور تم میرے ساتھ کچھ بھی کر لو گے تو کسی کو علم نہ ہوگا۔“ معظم کی آواز میں کپکپاہٹ واضح تھی، ”میرے ساتھ میرے کچھ دوست بھی ہیں اور وہ نیچے بیٹھے ہیں۔“

”اچھی بات ہے، تمہیں لے جانے میں انہیں سہولت رہے گی“ مظہر نے طنز سے کہا۔ میں لفٹ کے انتظار میں کھڑی تھی۔ تبھی راہداری کی دوسری طرف سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ دو یا تین لوگ ہوں گے۔ ”خیال سے بچو!!“ مظہر کی آواز آئی، ”مرے نہیں اور تم لوگوں کے چہرے اسے نظر آئیں نہ کوئی فنگر پرنٹ کہیں چھوڑنا، کمرہ نمبر 413 کا کارڈ ہے۔ کارروائی ایک گھنٹے کے بعد شروع کرنا جب میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔ آپس میں کسی کا نام بھی نہ بولنا..... اور اس کا موبائل فون وغیرہ ضائع کروینا۔ اتنی ”ڈوز“ دینا کہ صبح تک سوتا رہے۔“

میں پھٹی ہوئی آنکھوں اور کھلے منہ کے ساتھ کھڑی مظہر کی ہدایات سن رہی تھی۔ دل یہی چاہ رہا تھا کہ جاؤں اور اسے منع کر دوں، مگر خوفزدہ ہو گئی۔ اس کے لہجے میں جو خوفناکی تھی وہ میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ میں کچھ علی اقدام کرتی، اس سے پہلے ہی مظہر تیز تیز قدموں سے آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز قدموں سے پچھلے زینوں کی طرف لپکا، میں خوفزدہ سی اس کے ہمراہ تقریباً دوڑ رہی تھی۔ ”نہ آپ نے کچھ دیکھا نہ سنا ہے، نہ آپ چوتھی منزل پر آئی ہیں۔“ وہ درشتی سے کہہ رہا تھا۔

”یہ غلط ہے مظہر!!! اس طرح مت کرو..... منع کر دو اپنے دوستوں کو.....“ میں نے التجا کی۔

”کن دوستوں کو؟ آپ سے کہا ہے میں نے کہ آپ نے کچھ نہیں سنا.....“

”پلیز مظہر!! اتنا بڑا قصور نہیں ہے معظم کا!!!“ میں گھگھکی اور وہ میرا ہاتھ پکڑے تیزی سے میڑھیاں اتر رہا تھا۔

”کتنا بڑا قصور چاہتی ہیں آپ اس کا؟ اس نے آپ کو ہاتھ لگایا، کس ناطے سے، کس رشتے سے؟ اگر میں نہ آتا تو آپ کو کیا معلوم کہ وہ کیا کرتا؟ شکر کریں کہ میں نے خود اس کا ہاتھ نہیں توڑا جس ہاتھ سے اس نے آپ کو چھوا..... اور آپ اوپر گئیں کیوں؟ میں مسلسل آپ کو دیکھ رہا تھا، کیا اس ذلیل آدمی نے آپ کو فون کر کے اوپر بلایا تھا؟“ وہ غصے سے پوچھ رہا تھا۔

تو گویا جو نظریں مجھے اپنا احاطہ کرتے ہوئے محسوس ہوئی تھیں وہ مظہر کی تھیں اور میرا تعاقب کرتا ہو بھی وہی اوپر آیا ہوگا۔ ”نہیں!! میں تو اوپر تیمور اور ماہ رخ کو ڈھونڈنے گئی تھی۔“ میں نے وضاحت کی۔

”وہ دونوں تو کافی شاپ میں ہیں، پہلے فلور پر.....“ اسے تیمور اور ماہ رخ کے بارے میں بھی علم تھا۔

”مگر ماہ رخ نے کہا کہ وہ اوپر ہیں تو میں سمجھی کہ سب سے اوپر کے فلور پر۔“ میں نے ہٹلا کر کہا۔

”لیکن آپ کو ان کی جاسوسی کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟“ اس کے اس سوال پر میں خاموش رہی، اسے کیا بتاتی کہ مجھے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں تیمور ماہ رخ کو یہ نہ کہہ دے کہ وہ اسے چھوڑ کر مجھ سے شادی کرنا چاہ رہا تھا۔ ماہ رخ کا دماغ تو پہلے ہی شکوک کی آماجگاہ تھا۔ اسے تو عبور حاصل تھا کہ وہ نہ ہونے والی بات پر بھی اپنے تصور کی اڑان سے قیافے لگاتی رہتی تھی اور اگر ایسی کوئی بات تیمور کو دیتا تو۔

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے مظہر کسی وقت!!!“ آخری میڑھی پر پہنچ کر میں رکی کہ سانس بھی بحال ہو جائے۔

”کسی وقت کیوں؟ ابھی کر لیں.....“ اس نے میری چہرے پر کھوجتی نظر ڈالی۔

”بات طویل ہے.....“ میں نے کہا، ”مگر انتہائی ضروری..... میں پہلی فرصت میں تم سے کروں گی۔ اگر کہتے ہو تو میں دفتر آ جاؤں گی کیونکہ گھر میں ممکن نہ ہوگا.....“

”ٹھیک ہے، جیسے اور جب آپ مناسب سمجھیں!!!“ اس نے آہستگی سے کہا اور چل دیا۔

”مظہر!!!“ میں نے اسے پکارا، وہ ٹھٹھکا اور مڑا، اس کی نظروں میں استفسار تھا۔ میں گڑبڑا گئی.....

”ڈاکٹر صاحب کی طرف سے پریشانی ہے ناں آپ کو؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔ کیا اندازہ لگایا تھا اس نے، میں پھر خاموش ہی رہی، ”فکر نہ کریں، اس کی ہمت کے مطابق ہی اس کو خوراک ملے گی۔ میں جانتا ہوں کہ اب اسے ایسی خوراک کی بہت ضرورت ہے ورنہ وہ بار بار آپ کے راستے میں آئے گا۔“

”مجھے یہ سب مناسب نہیں لگ رہا.....“ میں نے بمشکل خود کو غنڈہ گردی کا لفظ کہنے سے روکا،

”جانے کس طرح کے لوگ ہیں، اگر اسے مار ڈالیں تو؟“

”آپ کو ان سے کیوں ہمدردی محسوس ہو رہی ہے؟ کوئی غنڈے موالی نہیں ہیں، میرے جیسے ہی لوگ ہیں۔ کہا ہے کہ آپ نہ پریشان ہوں۔“ وہ چل دیا اور میں بھی پچھلے دروازے سے ہال میں داخل ہوئی۔ میرے اندر بے چینی یوں تھی جیسے خون میں گردش کر رہی ہو۔ کسی کل قرار نہ آ رہا تھا۔ اگرچہ معظم کے اقدام پر مجھے خود بھی اس پر غصہ آیا تھا مگر ظاہر ہے جو راستہ مظہر نے اختیار کیا تھا وہ غیر محتاط بھی تھا اور غیر قانونی بھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ تیور سے بات کروں کہ وہ مظہر کو سمجھائے مگر تیور بھی نظر نہ آ رہا تھا۔

اس پورے فنکشن میں میرا صرف جسم ہی موجود تھا، دماغ تو جانے کن کن جہانوں کی سیر کر رہا تھا۔ یہ بھی شکر ہے کہ کسی نے میری غائب دماغی کو محسوس نہ کیا تھا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی مہمانوں کی روانگی شروع ہو گئی تو ہم سب گھر کے لوگ مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ خود بھی آخر میں جب رخصت ہوئے تو واپسی پر گاڑی مظہر ہی چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری سیٹ پر تیور بیٹھا تھا، جبکہ میں اور امی جان پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ”کاش امی جان ساتھ نہ ہوتیں!!“ میں نے دل میں سوچا، کم از کم میں تیور کو بتا سکتی کہ کیا ہوا تھا یا مظہر سے پوچھتی کہ اس نے معظم کو کیا انجام کروایا تھا۔

گھر پہنچ کر تھکاوٹ کے باعث سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیئے۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا اور آہستگی سے باہر نکل کر مظہر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”آجائیں بھابی!“ اندر سے مظہر کی آواز آئی۔ اسے کس قدر درست اندازہ ہوا تھا کہ دروازے پر میں تھی، تاہم میں نے اس کی داد نہ دی۔

”سو گئے ہو کیا؟“ میں نے تھوڑا سا دروازہ وا کیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

”نہیں! جاگ رہا ہوں۔ خیریت ہے ناں؟“ اس نے پوچھا۔

”بس مجھے ذہن میں الجھن ہی تھی.....“ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کس طرح بات کروں۔

”آپ بے فکر ہو جائیں، اس کو تھوڑا سا سمجھا بھجا کر گھر بھیج دیا ہے اور اگر سمجھدار ہوا تو اس کے بعد آپ کے راستے میں نہیں آئے گا.....“ مظہر نے میرے الجھے ہوئے سوال سے بھی سراسیمہ نہ ہوا۔ میں خاموشی سے واپسی کے لیے مڑی۔ ”امید ہے کہ مجھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ بات آپ تیور بھائی کو نہ بتائیں؟“

اس نے سوال کیا تھا یا دھمکی دی تھی کہ سر سے پاؤں تک مجھے سننا ہٹ سی ہونے لگی۔ ”کیا مظہر کسی جرائم پیشہ گروہ کا حصہ بن گیا تھا یا اس کے تعلقات غلط لوگوں سے تھے۔ اور اس کا کہنا کہ میں تیور کو نہ بتاؤں، بھلا اتنی بڑی بات کس طرح تیور سے چھپا سکتی تھی؟ اسی خاموشی سے میں مظہر کے کمرے سے غائب دماغی سے باہر نکلی اور آہستگی سے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور مڑی تو سنائے میں رہ گئی۔ سامنے ٹی دی لاونچ میں تیور کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور خالی گلاس تھا، وہ غالباً پانی لینے کے لیے آیا تھا اور مجھے مظہر کے کمرے سے نکلنے ہوئے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کی کئی تہیں آ کر منجمد ہو گئی تھیں۔

میں اپنے ذہن میں جلدی سے کوئی بہانہ سوچ رہی تھی کہ جو تیور کے سوال کرنے پر اسے بتاؤں گی، مگر مجھے لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہو، جب تیور نے ”سوری“ کہہ کر اپنے کمرے کی راہ لی۔ ”بات سنو! تیور!!“ میں اسے پکارتی رہ گئی اور اس نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔

کسی لاش کی طرح میرا جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور اسی طرح مرے مرے قدموں سے میں اپنے کمرے کی طرف لگی اور بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا، جودھاکوں سے پھٹ رہا تھا۔ ”یا اللہ! یہ دن بھی دیکھنا تھا میں نے، کن نظروں سے دیکھا تھا تیور نے؟ کیا سمجھا ہو گا وہ؟ کیا مجھے اس نے اتنا بیچ سمجھ لیا ہے..... مجھ سے پوچھتا تو سہی کہ معاملہ کیا ہے..... یوں اتنی شک بھری نظریں جو میرے اندر تک چھید کر گئی ہیں..... میں کیا کہوں اس سے، کیا بتاؤں اسے، کہ ایک طرف مظہر نے اسے نہ بتانے کو کہا ہے اور دوسری طرف وہ میری طرف سے کسی صفائی کا منتظر ہو گا۔

عورت تیری کیا وقعت ہے، کیا حیثیت ہے؟ جب تو بن چادر ہو جاتی ہے، ہر نظر شک بھری اٹھتی ہے، ہر زبان طعنوں کا رس پٹکاتی ہے کانوں میں، ہر راہ چلتا تیرا تعلق دار قرار پاتا ہے۔ ہر آنکھ تیرے عیبوں کی متلاشی، زندگی سفر ہے آبلہ پانی کا، دشت ہیں، دریا ہیں، گھاٹیاں ہیں، آزمائشیں، آزمائشیں اور آزمائشیں۔

صبح تک سوچتی رہتی تو شاید مر رہی جاتی کہ نیند بھی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی، میں نے دوپٹہ

اوڑھا، اپنے زخمی دل اور تار تار وجود کو سمیٹا اور تیمور کے کمرے کے دروازے پر جا کر دستک دی، پورا بدن سامع بن گیا تھا مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی تھی۔ ”کیا تیمور سو گیا تھا؟“ خود ہی سے سوال پوچھا، ”کیسے سو سکتا ہے وہ اتنی جلدی!!“ میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا..... زیادہ زور سے دستک دیتی تو مظہر بھی اٹھ کر آ سکتا تھا۔ دوسری اور تیسری دستک پر بھی تیمور نے دروازہ نہ کھولا۔ میں پلٹ کر اپنے کمرے میں آئی اور اپنے موبائل فون سے تیمور کے نمبر پر کال کیا۔

”ہوں!!“ تیمور کی آواز گویا نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم جاگ رہے ہو..... مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”اس وقت سو جائیں، صبح بات ہو سکتی ہے۔“

”تمہیں اسی وقت میری بات سننا ہوگی، صبح کس نے دیکھی ہے۔“

”بتائیے کیا بات ہے؟“ لہجہ بالکل بے تاثر تھا۔

”میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں، ابھی تمہارے کمرے میں آ کر۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”یہ وقت مناسب نہیں ہے ہمارے بات کرنے کے لیے، مظہر یا امی جان اٹھ گئے تو.....“ وہ ہچکچارہا تھا۔

”تم لاؤنچ میں آ جاؤ مجھے تم سے ابھی بات کرنا ہے۔“

”آپ کو مظہر کا علم ہے کہ کس قدر جذباتی ہے، ہمیں اگر وہ جاگ کر اتنی رات گئے اکٹھے بیٹھا دیکھ لے گا تو جانے کیا سمجھے؟“ وہ مجھے سمجھا رہا تھا۔

”کم از کم تمہاری طرح نہیں سمجھے گا، تمہاری طرح مجھ پر شک نہیں کرے گا، تمہاری طرح میرے بارے میں گھٹیا خیال ذہن میں نہیں لائے گا.....“ میں پھٹ پڑی اور اپنے دل کا غبار نکال کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد بار بار میرے فون کی گھنٹی بجتی رہی، مگر میں نے اٹینڈ نہ کیا، میں نے اپنے دل کا غبار آنکھوں کے راستے بہاتے ہوئے فجر کی اذان سنی اور اٹھ کر وضو کر کے نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے سے دل اور ذہن ایسے مطمئن اور پرسکون ہوئے کہ مجھے نیند آ گئی۔

زور زور سے کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا تو میں چونک کر جاگی۔ بیڈ کے کنارے رکھا لیمپ جلا کر وقت دیکھا تو دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ”اوہ خدایا! میں اتنی دیر تک سوتی رہی تھی؟“ اچھل کر بیڈ سے اتری اور دوپٹہ اوڑھ کر دروازہ کھولا، امی جان کھڑی تھیں، پریشان اور متفکر۔

”کیا بات ہے بیٹا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ بلیقے کتنی ہی دفعہ تمہیں جگانے کے لیے آئی مگر تم نے دروازہ نہیں کھولا، مظہر بھی کہہ گیا تھا کہ بارہ بجے تمہیں دفتر بھی جانا تھا.....“

”ہاں! وہ رات سو نہیں سکی تھی، فجر پڑھ کر سوئی تو پھر ہوش ہی نہ رہا۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”خیر تو یہ رات کیوں نہیں سوئیں؟ طبیعت نا ساز تھی تو مجھے بلا لیتیں!!“ وہ تشویش سے بولیں۔

”یونہی امی جان! کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ رات بھر نیند ہی نہیں آئی۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”اکیلی عورت کی تو پوری زندگی ہی رات کی طرح ہوتی ہے بیٹا اور رات آنکھوں میں کاٹ دیتا تو اس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے، نیند بھی روٹھ جاتی ہے اور بستر ٹنسنے لگتا ہے.....“ امی جان نے خود بیوگی کا ٹی تھی، تنہائی کی طویل راتیں اور لگ بھگ بیس ایکس سال ہونے کو آئے تھے ان کو بیوہ ہوئے۔ ان سے زیادہ کون جانتا تھا کہ بیوہ عورت کی زندگی کا نٹوں کی سیج ہوتی ہے۔

”آپ پریشان نہ ہوں، کئی دن سے تھکاؤتھی اور نیند کی کمی.....“ میں نے چہرے پر بشارت لانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔

”اب دفتر جاؤ گی کیا؟“ امی جان نے پوچھا۔

”نہیں ابھی طبیعت سست ہو رہی ہے، کل چلی جاؤں گی.....“

”چلو ٹھیک ہے، نہاد کو کرنا تازہ دم ہو کر تھوڑا سا دودھ لے لو اور پھر دوپہر کا کھانا ہی کھاتے ہیں۔“ امی جان نے پیار سے کہا۔

”دودھ نہیں، بلیقے کو بتائیں مجھے ایک کپ چائے بنا دے.....“ کہتی ہوئی میں ہاتھ روم میں گھسی اور دیر تک نیم گرم پانی سے نہاتی رہی تاکہ تھکاؤتھر جائے، قلب و ذہن ہلکے پھلکے ہو جائیں۔

”تیمور کہاں ہے امی جان؟“ میں نے اخبار پڑھتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں!!“ ان کے کہنے پر میں چونکی۔

”کیوں؟“ حیرت سے میں نے پوچھا۔

”اے بھی تھکاؤتھر سے ہی غالباً تیز بخار ہے، ناشتہ کر کے اس نے بخار کی دوا لی ہے اور

ساتھ ہی سردرد کی شکایت کر رہا ہے، وہ بھی کہہ رہا ہے کہ رات بھر سو نہیں سکا۔“ وہ سادگی سے بتا رہی تھیں اور میں ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اگر جوہ جان جائیں کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی نیندیں اڑا کر خود بھی بے آرام ہوئے تھے تو ان کا کیا رد عمل ہوتا؟ ایک دفعہ سوچا کہ تیار ہو کر دفتر چلی جاؤں اور تیور کا سامنا نہ کروں۔ مگر یہ سوچ کر کہ امی جان کیا سوچیں گی، میں نے اخبار سمیٹ کر رکھا اور انہی۔

”میں دیکھتی ہوں، اس کی طبیعت کیسی ہے!“

”بیٹا یہ سوپ لیتی جائیں، میں جابئی رہی تھی سوپ لے کر۔“ بلقیس نے نفاست سے نجی سوپ والی ٹرے مجھے تھادی۔ میں نے خاموشی سے ٹرے پکڑی۔ تیور کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی، اندر سے تیور کی ٹھاتھ بھری ”لیس!“ کی آواز آئی تو میں نے ایک ہاتھ میں ٹرے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے لاک کھما کر دروازہ کھولا۔ کمرے میں بیڈ لیپ کی ہلکی اور پیلی لو سے کمرہ اور بھی اندھیرا اور تیور مزید بیمار لگ رہا تھا۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے اور تیور کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سوپ میں نے میز پر پہلے سے رکھ دیا تھا۔

”اٹھو ہاتھ منہ دھو کر سوپ پی لو۔۔۔۔۔“ میں نے جھپکتے جھپکتے دایاں ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھا،

”اس وقت تو بخار نہیں ہے میرا خیال ہے۔“

”ان کے آنے سے جو آ جاتی ہے شکل پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے“

انتہائی سنجیدگی سے اس نے شعر کی ٹانگ توڑی۔

”کتنا بخار تھا صبح؟“ میں نے سوال کیا۔

”کافی زیادہ تھا۔۔۔۔۔ غالباً دو تین ڈگری تو ہوگا۔“ اس نے شرارت سے کہا۔

”میں تو ویسے اس اطلاع سے قبل تمہیں انسان ہی سمجھتی تھی۔“ میں اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکی۔

”شکر ہے کہ آپ مسکرائیں، ورنہ میں تو اسی طرح رخصت ہو جاتا۔۔۔۔۔“

”کبھی تو ٹھیک بات کیا کرو، جب بھی کرتے ہو الٹی بات کرتے ہو۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”میرے رخصت ہونے کے ذکر پر آپ اتنے غصے میں کیوں آگئیں؟ اچھا ہے ایسا ہو جائے

تو آپ کے بہت سے مسائل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ میں اتنا برا ہوں، آپ کو اتنا تنگ کرتا ہوں، بہتر

ہے کہ نہ رہوں بلکہ میں ہی چلا جاتا غالب بھائی کی جگہ تو کم از کم آپ کی زندگی میں کوئی مسئلہ موجود ہی نہ ہوتا۔“ وہ رو رہا تھا آنسوؤں سے، اس وقت مجھے وہ اتنا معصوم لگا کہ جی چاہا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہی اس کو تسلی دوں۔

”بکواس بند کر تو تم اپنی!!“ میں نے آنسوؤں پر بند باندھنے کی کوشش کی۔ میرے اس لہجے پر اس نے چونک کر مجھ دیکھا، ”شرم آتی چاہئے، تمہیں ایسی غلط سلسلہ اور کفر بھری باتیں کرتے ہوئے۔“

”میں تو رات آپ کی باتیں سن کر تقریباً ختم ہی ہو گیا تھا، مجھے تو خود حیرت ہے کہ میں زندہ کیسے رہا؟“

”اور اپنی باتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں نے کیا کہا تھا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بسا اوقات خاموشی باتوں سے زیادہ قاتل ہوتی ہے، جو تم نے نہیں کہا وہ کہہ دیتے تو مجھے کم تکلیف ہوتی۔“ میں نے لاکھ کوشش کی مگر سسک پڑی۔ ”تم نے خاموش رہ کر جو تکلیف اور اذیت مجھے دی وہ برداشت سے باہر ہے۔“

”میں کچھ نہیں سمجھا، آپ کہہ کیا رہی ہیں؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”تم نے پوچھا کیوں نہیں کہ میں اس وقت منظر کے کمرے سے کیوں نکلی تھی؟“

”مجھے یہ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کیونکہ تم نے اپنے ٹکلی ذہن سے خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔“ میں اونچی آواز میں بولی۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں آپ پر کیوں شک کرنے لگا؟ کس نے کہا کہ میں نے آپ پر

شک کیا ہے؟ کیسی عجیب بات کر رہی ہیں آپ؟“ وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا اتنا مجھے یقین ہے۔

”تو پھر تم نے سوری کیوں کہا تھا؟“ اب مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

”سوری میں نے اس لیے کہا تھا کہ شاید آپ منظر سے کوئی بات کرنے اس کے کمرے میں

گئی ہوں گی اور میرے کچن میں جانے سے یا واپس آنے سے کوئی کھٹکے کی آواز پیدا ہوئی ہوگی جو

آپ بغیر بات کیے نکل آئیں، کیونکہ آپ بمشکل دو منٹ ہی اندر رکی ہوں گی۔ آپ اس کے

کمرے میں داخل ہوئیں تو میں اسی وقت اپنے کمرے سے نکل رہا تھا اور ظاہر ہے کہ جوتنی ضروری

بات تھی کہ رات کے دو بجے کی جاتی، وہ دو منٹ میں ختم ہونے والی بات تو نہ ہوگی؟“ وہ سادگی

سے کہہ رہا تھا..... مجھے پھر بھی یقین نہ ہو رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔  
”بس مجھے مختصر سی بات کرنا تھی.....“

”اور میں آپ پر شک کیوں کروں گا، وہ بھی منظر کے حوالے سے، جو آپ کی نظر میں اب بھی چھوٹو ہے..... ہم دونوں آپ کی بہت عزت کرتے ہیں.....“ اس نے مجھے یقین دلایا۔  
”اور جو تم نے بے وقوفوں والا سوال کیا ہے مجھ سے؟ کوئی سنے تو کیا سوچے گا؟“ میں نے طنز سے کہا۔

”وہ سوال انتہائی عقلمندی کا ہے، مجھے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ اور یہ عقلمندی کی بات مجھے اب منظر نے سمجھائی ہے جسے میں بہت بے وقوف سمجھتا تھا۔“ اس نے گہرے انداز سے کہا۔  
”میں منظر کو اب بھی بے وقوف سمجھتی ہوں۔ قد اور عمر بڑھ جانے سے عقل نہیں آ جاتی۔“ میں نے ساٹ لہجے میں کہا، ”کہیں تم نے بیوقوفی کی یہ بات ماہِ رُخ سے تو نہیں کہہ دی؟“

”اس سے ملا تو آج اسی مقصد کے لیے تھا مگر ادھر ادھر کی باتوں میں اس نے اس موضوع پر آنے ہی نہ دیا، اور پھر میرے ذہن میں بھی خیال آیا کہ وہ کہیں جذباتی ہو کر کوئی بے وقوفی کی بات آپ سے نہ کہہ دے۔ آپ میرے سوال کا جواب ہاں میں دیں تو میرے لیے اس سے بات کرنا آسان ہو جائے گا۔“ اس کی نظر جھکی ہوئی تھی، میں جانتی تھی کہ اس کے لیے مجھ سے نظر ملا کر یہ بات کہنا ممکن ہی نہ تھا۔

”تم نے ایک فضول بات کی خواہو رٹ باندھ لی ہے، وہ بھی منظر کے کہنے پر!!“ میں نے سختی سے کہا۔

”منظر نے صرف میرا دھیان اس طرف کیا ہے ورنہ آپ سے بات کرنے سے قبل میں نے بہت سوچ لیا تھا۔“

”سوپ پی چکے ہو تو اب آرام کرو اور ریلیکس رہو میرے بھائی!“ میں نے گویا اس کی بات کا جواب دے دیا تھا، اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

”مجھے شرمندہ کر رہی ہیں آپ؟“ چوٹ کھایا ہوا لہجہ تھا۔

”اوہو! سمجھا رہی ہوں تمہیں کہ میں تمہیں اپنے بھائی جیسا سمجھتی ہوں..... اس تعلق کو یونہی رہنے دو۔“ حتیٰ انداز سے کہہ کر میں نے سوپ کے خالی برتنوں کی ٹرے اٹھائی اور اس کے کمرے

سے نکل آئی۔

”سورہا ہے کیا؟“ امی جان نے پوچھا، ”کیسا ہے اب؟“

”نہیں جاگ رہا ہے، سوپ لے لیا ہے اس نے، اب آرام کر رہا ہے اور اب بخار بھی نہیں ہے اس کو۔“ میں نے وضاحت کی تو امی جان مطمئن ہو گئیں۔

”منظر کا ٹیلی فون آیا تھا، وہ انتظار کر رہا تھا تمہارا، میں نے اسے بتایا کہ تم آج نہیں آ رہیں۔ تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا، میں نے بتا دیا کہ تم تیمور کے کمرے میں ہو، اس کی طبیعت ناساز ہے اور اس کی خیریت پوچھنے گئی ہو تم۔“ امی جان سادگی سے بتا رہی تھیں اور میرے ذہن میں عجیب سا خیال آیا کہ منظر میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا؟ یقیناً وہ جانتا ہوگا کہ تیمور نے مجھ سے بات کی ہے۔

اگلے ہی روز ناشتے سے فارغ ہو کر امی جان کو بتا کر دفتر کے لیے روانہ ہوئی۔ دفتر پہنچ کر منظر نے گاڑی میرے لیے بھجوا دی تھی۔ دفتر پہنچی تو اسٹاف کے کبھی لوگ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ میں کافی دنوں کے بعد دفتر آئی تھی۔ دفتر کے سب لوگوں سے میرا رویہ بہت ہمدردانہ اور شفقانہ ہوتا تھا جبکہ منظر کا انداز رانتختی لیے ہوئے ہوتا تھا۔

نوید صاحب ابھی چھٹی پر تھے، وہ اور زارا ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف گئے تھے اور ساتھ ہی علی بھائی اور ثانیہ بھی۔ یونہی ایک بھولی بھٹکی یاد آگئی کہ غالب اور میں تو ہنی مون پر بھی نہ جاسکے تھے، کچھ مصروفیت، کچھ ناسازی طبع اور پھر غالب عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے۔ اس دفتر میں آ کر تو اکثر ہی مجھے غالب کا خیال آ جاتا تھا اور بسا اوقات محسوس ہوتا کہ وہ وہیں ہیں، میرے ارد گرد، مجھے اپنی پناہ میں لیے ہوئے، اپنے مضبوط حصار میں لیے ہوئے۔ کبھی میں نے وہاں خود کو تنہا محسوس نہ کیا تھا۔

منظر مصروفیت کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا تھا۔ نوید صاحب کے نہ ہونے کی وجہ سے ہر چھوٹی بڑی ذمہ داری اسی کے کندھوں پر تھی۔ بلاشبہ نوید صاحب نے بڑے احسن اور دیانتدارانہ طریقے سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں۔ غالباً مجھے سہولت دینے کے لیے وہ تمام تر امور کو خود ہی



انجام دیتے تھے، تمام مسائل سے خود ہی نمٹتے تھے اور صرف فائل منظوری کے لیے فائلیں میرے پاس آتی تھیں۔ مجھے یاد بھی نہ آ رہا تھا کہ کبھی انہوں نے رخصت لی ہو اور اب شادی کے بعد رخصت تو یقیناً ان کا حق تھی۔

منظہر کی زبانی ہی علم ہوا کہ مظہر علی بھی دس دن کی رخصت پر تھا، اور ابھی تین دن کی چھٹی اس کی باقی تھی۔ یقیناً مظہر کے لیے سارے محاذوں پر اکیلے نبرد آزما ہونا مسئلہ ہی تھا جبکہ وہ خود بھی ابھی نو آموز ہی تھا اور میں نے کسی حد تک کاروبار کے اسرار اور موزمجھ لیے تھے۔

”جب تک نوید صاحب چھٹی پر ہیں، تم چاہو تو میں آجایا کروں دفتر؟“ میں نے کہا۔  
”ارے نہیں بھائی! کرلوں گا میں کسی نہ کسی طرح، چند دن کی بات ہے۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔

”چوتور ہے ہو!!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اصل میں صبح دفتر کی ایک وین خراب ہو جانے سے اسٹاف کے کچھ لوگ اور کچھ ورکر دفتر نہیں پہنچ سکے ہیں، اس کی کوفت ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا بھی کہ کرایے کی وین لے کر سب کو دفتر بھجوادو، مگر ہمارے لوگ تو چھٹی کے لیے بہانے کے متلاشی ہوتے ہیں۔ سب نے یہ کہہ کر کرایے کی وین پر آنے سے انکار کر دیا کہ واپسی پر مسئلہ ہوگا.....“ جھنجھلا کر اس نے کہا۔  
”صحیح کہہ رہے ہو، بہت کم لوگ ہمارے ہاں خلوص نیت سے کام کرتے ہیں، ہر کوئی موقع دیکھ کر چکر دینے کی تلاش میں ہوتا ہے.....“ میں نے لوگوں کے عمومی رویے کا تجزیہ کیا۔

”چلیں چھوڑیں ان باتوں کو، آپ بتائیں کیا لیں گی چائے یا کافی؟“ مظہر نے پوچھا۔  
”چائے پیالوں گی، لیکن میں تو سوچ رہی تھی کہ ہم اس ملاقات کو کسی اور دن پر اٹھا رکھتے۔“  
”بھائی! میرے لیے نہ دنیا کی کوئی شخصیت آپ سے بڑھ کر اہم ہے اور نہ ہی اس وقت آپ کی بات سننے سے بڑھ کر اہم کوئی کام۔“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی ایسا خاص کام تھا۔“ میں نے جھجک کر کہا۔  
”بغیر کسی خاص کام کے تو آپ اس دفتر نہ آتیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کام بھی خاص ہے لیکن کسر نفسی کی عادت ہے، اس لیے یہ کہنا بھی ضروری ہے.....“ وہ مسکرایا۔  
”کسر نفسی کوئی بری عادت تو نہیں ہے مظہر!“ کینے میرا والا لڑکا چائے رکھ کر چلا گیا تو میں

نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ”تم نے خود کو بہت غفلت سمجھنا شروع کر دیا ہے!“ وہ چونکا۔  
”کیوں، کب کیا ہے یہ دعویٰ میں نے؟ آپ سے بڑھ کر غفلت تو نہیں ہو سکتا میں۔“ وہ مسکرایا۔  
”تم نے تیمور سے کوئی بات کی ہے؟“ میں بولتے بولتے جھجک گئی۔

”تیمور بھائی سے تو میں نے کئی باتیں کی ہیں۔“ وہ سنجیدہ تھا۔  
”مم!! میرے حوالے سے۔“ میں نے تھوک نکل کر مشکل یہ الفاظ کہے۔  
”آپ کے حوالے سے بھی کئی باتیں ہوئی ہوں گی، آپ کا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟“  
”جو تم نے تیمور کو احقانہ مشورہ دیا ہے۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔  
”آپ سے شادی کرنے کا؟“ وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔  
”ہاں!!“

”اس کو آپ احقانہ مشورہ کیوں کہہ رہی ہیں؟ یہ بات تو غالب بھائی کی وفات اور آپ کی عدت کی تکمیل کے بعد خود بخود دامی جان، تیمور بھائی یا آپ کے والدین کے ذہنوں میں آنی چاہئے تھی۔ یہ تو بہترین حل ہے ہمارے مسائل کا بھی اور آپ کے مسائل کا بھی۔ نہ نوبت آتی ڈاکٹر معظم سے منگنی ہونے اور پھر ٹوٹنے کی اگر پہلے ہی یہ حل سوچ لیا جاتا۔“ اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔  
”کیا تم جانتے ہو کہ ماہِ رُخ اور تیمور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں؟“ میں نے سر جھکا کر کہا۔  
”جنس مخالف کی باہمی کشش کو آپ پسندیدگی کا نام دے لیں، اور اگر پسند کرتے بھی تھے تو لازم نہیں کہ حالات تبدیل ہونے کے بعد تیمور بھائی اپنی پسندیدگی کو تبدیل نہ کر لیتے۔ اب اگر ستارہ مجھے پسند کرتی ہے تو کیا لازم ہے کہ میں بھی اسے پسند کروں؟ ہر بشر کو اللہ تعالیٰ نے عقل اور شعور دیا ہے اور مردوں کو اپنے فیصلے دل سے نہیں بلکہ دماغ سے کرنے چاہئیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا غصہ تھا جو اس کا خاصا تھا۔

”تمہیں کیسے علم ہوا کہ ستارہ تمہیں پسند کرتی ہے؟“ میرے منہ سے اچانک پھسلا۔  
”آپ کو صرف یہی ایک نقطہ قابلِ توجہ نظر آیا ہے۔“ وہ طنز سے ہنسا، ”اگر عورتوں میں مخصوص حسیں ہوتی ہیں تو مردوں کے پاس بھی ایسی نظر ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے اوپر پڑنے والی پسندیدگی کی نظروں کو دیکھ اور جان سکیں۔“  
”اچھا ہے، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ پیاری لڑکی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں زندگی گزارنے کے لیے لڑکیوں میں جن خصوصیات کو لازمی سمجھتا ہوں وہ نہ ستارہ میں ہیں نہ ماہِ رُخ بھائی میں۔ اللہ ہم پر کرم کرے، اگر آپ نے تیمور بھائی کے لیے انکار کر دیا تو پھر میں مستقبل کا بڑا بھیانک نقشہ دیکھ رہا ہوں۔ اسی لیے میں نے بقول آپ کے تیمور بھائی کو وہ بیوقوفانہ مشورہ دیا ہے۔ اب اگر آپ عقلمندی کا مظاہرہ کریں تو اس مشورے پر غور فرمائیں اور اسے قبولیت بخشیں۔“ مظہر نے مسکرا کر کہا۔

”میں خاص طور پر اسی لیے تم سے ملنے آئی ہوں کہ جو خناس تم نے تیمور کے ذہن میں بھرا ہے وہ ایک ناممکن بات ہے، اس لیے تم اس طرح کے مشورے اسے مت دو۔ جلد ہی..... جب اس کا پروموشن ہو جائے گا انشاء اللہ! تو اس کی شادی ہو جائے گی.....“

”ان کی شادی کے بعد آپ کی کیا حیثیت ہوگی؟ بلکہ شادی سے پہلے بھی جو حیثیت ہے اس پر جانے لوگ کس کس طرح کی باتیں کرتے ہوں گے۔“

”کس طرح کی باتیں؟“ میں نے چونک کر سراٹھایا۔

”ہو سکتا ہے کہ کہتے ہوں، گھر میں دود دیور ہیں اور نامحرم ہیں اور جانے کیا کیا.....“ وہ ہچکچا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سر پر ہم پھوڑ دیا گیا ہو۔

”مگر ای جان ہیں اور تم لوگ میرے بھائیوں جیسے ہو..... میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ میں اپنے ہی گھر میں رہتی ہوں۔“ میری آواز سے ہی میرے لہجے کی کمزوری عیاں ہو رہی تھی۔ آنسو روکنے کے لیے کوشاں تھی نمکین پانی آنکھوں میں ریت کے ذروں کی طرح چھہ رہا تھا۔

”آپ بھی یہی سمجھتی ہیں، ہم بھی یہی سمجھتے ہیں، لیکن ہمارے سمجھنے سے معاشرتی اور مذہبی حقائق بدل نہیں جاتے اسی لیے کہتا ہوں کہ اگر آپ تیمور بھائی سے نکاح کر لیں تو آپ کی حیثیت مستحکم ہو جائے گی اور آپ کا اس گھر میں رہنے کا شرعی جواز بھی رہے گا.....“ اس نے دلیل دی۔

میں بالکل خاموشی سے میز کی سطح کو گھور رہی تھی، جس کی چمکدار لکڑی کی سطح پر مظہر کا عکس کسی ہیولے کی طرح نظر آرہا تھا۔ میرے پاس کوئی جواز ہی نہ تھا..... کوئی جواب نہ تھا۔ کتنی بڑی اور تلخ حقیقت تھی جس سے میں آج تک نظریں چرائے ہوئے تھی اور مظہر نے مجھے بتا دیا تھا کہ بوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی غائب نہیں ہو جاتی۔

کیا واقعی لوگ ایسی باتیں سوچتے ہوں گے؟ تیمور تو کم کم ہی گھر پر ہوتا تھا اور مظہر مجھ سے کم از

کم چار برس چھوٹا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ لوگوں کے ذہن اتنے پراگندہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ میرے اور مظہر کے بارے میں کوئی غلط بات سوچیں۔ میں نے نظرائٹھا کہ مظہر کی طرف دیکھا..... میری آنکھوں میں بھرے پانی کے باعث وہ مجھے دھندلا سا نظر آیا مگر وہ ماشاء اللہ بھرپور جوان تھا اور اب چھوٹو تو دکھتا ہی نہ تھا۔

زندگی میں یہ مقام بھی آنا تھا کہ ہوا میں معلق ہو کے سوچنا پڑ گیا ہے..... کہاں ہے میری زمین، کون سا آسمان ہے میرا، اس بیکراں سمندر میں، کوئی لہر ہے میرے لیے بھی، برستی ہے بارش تو کوئی قطرہ، ہے میرے مقدر کا بھی؟ یا مجھے یونہی عمر بھر ہوا میں معلق رہنا ہے.....؟

میں نے اپنے نکلروں میں ٹوٹے ہوئے وجود کو اکٹھا کیا اور دونوں ہاتھوں سے میز کی سطح کو پکڑ لیا کہ اٹھوں..... دل میں عجیب سی کشش تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں ناں بھابی؟“ مظہر نے تشویش سے پوچھا، میں خاموش تھی۔ ”پلیز میری کوئی بات بری لگی ہو تو مجھے معاف کر دیں!“ اس کا لہجہ التجائی تھا۔ میں نے پرس اٹھایا اور واپسی کے لیے اسی خاموشی اور مرے مرے قدموں سے چلنے لگی۔ ”بھابی! پلیز، میری باتوں پر غور ضرور کیجئے گا۔“ وہ بولا، ”حقیقتیں ہوتی تو بہت تلخ ہیں لیکن ہمیں کبھی نہ کبھی ان کی تلخیوں کو Face کرنا ہی پڑتا ہے۔“

میں اپنا ٹوٹا ہوا حوصلہ اور بدن وہاں سے بمشکل کھینچتی ہوئی لے کر باہر آئی۔ اگر کسی نے سلام کیا تو میں نے غائب دماغی سے جواب دیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی اور میں اتنی غائب دماغ تھی کہ مجھے علم ہی نہ ہوا کہ گھر کب آیا۔ گھر میں داخل ہوئی تو بلیقے نے بتایا کہ امی جان کی طبیعت ناساز تھی اور وہ سوچکی تھیں۔ کھانا اس نے میز پر لگایا اور گھر جانے کی اجازت چاہی۔ دوپہر کے وقت وہ اپنے بچوں کو کھانا دینے کے لیے دو گھنٹے کی چٹھی پر جاتی تھی۔ وہ چلی گئی اور پھر تیمور بھی کھانے کی میز پر آ گیا، اس نے میری وجہ سے ابھی تک کھانا نہ کھایا تھا۔

”تم کھانا کھا لیتے، خواخواہ اتالیٹ کر دیا۔“ میں نے تیمور سے کہا۔

”میں نے ناشتہ بھی کافی دیر سے کیا تھا اس لیے کوئی ایسالیٹ نہیں ہوا۔“ وہ خوش دلی سے مسکرایا، ”آپ بتائیں میٹنگ کیسی تھی، کوئی مسئلہ تو نہیں دفتر میں؟ مظہر نے کام کیسا سنبھالا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے!!“ اس کے اتنے سارے سوالوں کا میرے پاس یہی جواب تھا۔

”باقی سب تو ٹھیک ہوگا، مگر آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی اور میں خاموشی سے اس وقت یہ بھی سوچ رہی تھی کہ میں کس شرعی حیثیت سے اس وقت تیمور کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اور اگر واقعی اس وقت کوئی گھر میں آئے تو کیا سوچے؟ ایک بوڑھی ماں جو نیند کی دوا کے زیر اثر سو رہی تھی..... ملازمہ بھی گھر پر نہ تھی۔ اور اگر کوئی تھا گھر میں تو میں تھی، تیمور تھا اور تنہائی تھی.....!!! لوگ کچھ بھی سوچیں وہ سوچنے میں حق بجانب تھے، کیونکہ شیطان ایسے ہی موقعوں کی تلاش میں ہوتا ہے اور جب بھی ممکن ہوتا ہے وہ اپنا کام کر دکھاتا ہے۔ میری نیت اور سوچ جتنی بھی کھری اور صاف ہو..... تیمور اور مظہر کی نظروں اور دل میں میرے لیے جیسا بھی احترام ہو..... اگر کبھی ذرا سا بھی کچھ غلط ہو گیا تو؟؟؟.....

”بھابی! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ تشویش سے تیمور بولا، ”آپ کھانا بھی نہیں کھا رہی ہیں۔“

”آں..... ہاں!!“ میں چونکی، ”میں؟؟ نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، سر میں درد ہے۔“

”میں آپ کو چائے بنا دوں؟ کوئی دوا لے لیں تھوڑا سا کھانا کھا کر..... یا پھر میں سر

دبا دوں؟“ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں یوں اچھلی جیسے بچھونے ڈنگ مار دیا ہو۔

”نہیں نہیں!! تم میرے قریب مت آنا..... میرے سر کو ہاتھ بھی نہ لگانا.....“ ہذیانی انداز

میں کہتی ہوئی میں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور کمرہ اندر سے لاک کر کے اس سے

ٹیک لگالی۔ میں دھواں دار روئے لگی، اسی طرح روتی روتی میں زمین پر بیٹھ گئی، یونہی دروازے

سے ٹیک لگائے ہوئے۔ آنسوؤں کی دھند میں میرے سامنے کتنے ہی مناظر، کتنے ہی لمحات وارد

ہونے لگے کہ جس کے متعلق لوگ جب چاہیں جو مرضی بات کریں۔

میں جتنی بھی مضبوط سہی مگر جتنی تو بے آسرا، بے سہارا، ایک بیوہ عورت..... اور ہمارے ہاں تو

ہر شخص گویا دور بین تھا بے بیوہ عورتوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے کہ ان کی کمزوریاں نظر آئیں تو انہیں

اچھالیں۔ میرا تعلق اگر خوشحال میکے اور سسرال سے تھا تو مجھے ہرگز اس خوش فہمی میں نہیں رہنا

چاہئے کہ کوئی میرے بارے میں بات نہ کرتا ہوگا۔ اور تو اور جانے ماہِ رُخ کیا کیا باتیں کرتی

ہوگی.....؟؟؟ ”تو کیا میں دوسروں کے نفع و نقصان کے احساس سے عاری ہو جاؤں اور صرف اپنے

فائدے کا سوچوں؟ کیا میں تیمور سے شادی کر لوں؟؟؟“ خود ہی سوچ رہی تھی۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا

ہے کہ تیمور کی شادی ماہِ رُخ سے بھی ہو جائے اور میں بھی اس سے نکاح کر لوں..... اس گھر میں کسی

شرعی حیثیت سے رہوں۔“

ماہِ رُخ تو اس بات پر کبھی بھی تیار نہ ہوگی..... ماہِ رُخ سے یہ نکاح خفیہ بھی تو رکھا جاسکتا

ہے.....؟؟؟ تو کیا میرا اور تیمور کا رشتہ صرف کاغذی رشتہ ہوگا؟؟؟ کیا میری زندگی صحراؤں میں بھٹکتے

ہوئے گزرے گی؟ لیکن اگر تیمور ہی اس بات پر تیار نہ ہو تو؟؟؟ وہ تو کبھی دوشادیاں کرنے پر تیار نہ

ہوگا..... لیکن ماہِ رُخ سے اس نے شادی نہ کی تو وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن بن جائے گی..... وہ

ہمارے گھر کے بہت سے رازوں کی امین ہے..... اگر تیمور نے اس سے شادی نہ کی تو وہ ہمارے

گھر میں دھماکہ کر دے گی..... جگہت اور اعجاز کے رخصتی سے قبل کے تعلقات کا..... اور یہ تو بہت بڑا

تازیانہ ہوگا مظہر اور تیمور کی غیرت پر..... مجھے کوئی اور راہ دیکھنا ہوگی؟ جلد بہت جلد!! اور جب میرا

مسئلہ حل ہو جائے گا تو باقی سارے مسئلے خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ میں گویا کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

اگلے روز شام کو تیمور کی بہاؤ پلور کے لیے ٹرین سے روانگی تھی۔ ناشتے کی میز پر ہم سب اکٹھے

بیٹھے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی گفتگو جاری تھی کہ میں نے اس موقع کو بات کرنے کے لیے مناسب

سمجھا۔ رات بھر میں نے سوچ سمجھ کر اپنے لیے جو راہ چنی تھی، وہ مجھے سب کو بتانی تھی۔ میرا اندازہ

تھا کہ مظہر سے یقیناً کسی نے ایسی کوئی بات کی ہوگی جس کی بنا پر اس نے کہا تھا کہ لوگ باتیں

کرتے ہوں گے۔ ماہِ رُخ کا کاروبار کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے سلسلہ میں دفتر میں آنا جانا رہتا

تھا، ممکن ہے کہ اسی نے کوئی بات کی ہو یا تھپتھپا اعتراض اٹھایا ہو۔

”تیمور میں سوچ رہی ہوں کہ والدہ کی طرف چلی جاؤں.....“

”چلی جائیں، اس میں میری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“ تیمور تو نہ سمجھا تھا مگر مظہر کے

ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے تھے اور امی جان بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”میرا مطلب ہے کہ مستقل.....“ میں نے ذرا وقفہ دیا، ”ویسے تو میں آتی جاتی رہوں گی۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ تیمور یکدم حیرت سے اور بلند آواز سے بولا، ”کسی نے کچھ کہا ہے آپ

سے؟ آپ مجھے کل دوپہر سے ہی ٹھیک نہیں لگ رہیں..... تم نے کچھ کہا مظہر؟“ اس نے نظریں

مظہر کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”مم..... میں؟“ مظہر ہکھلایا، ”میں کیوں کہوں گا کچھ؟ آپ پوچھ لیں بھابی سے۔“ مظہر نے کچھ کہا بھی ہوتا تو اس کو پورا یقین ہوتا کہ میں اس کا راز کبھی طشت از بام نہ کروں گی۔

”مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا..... والدہ بیمار رہتی ہیں، اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے پاس وقت گزاروں۔“

”بہن جی تو اب پہلے سے بہتر ہیں، اور پھر کس نے تمہیں منع کیا ہے بیٹا ان کے پاس وقت گزارنے سے، جب چاہے چلی جاؤ، بھلے ہر روز چلی جایا کرو.....“ امی جان نرمی سے بولیں۔

”نہیں امی جان! میں مستقل وہاں رہنا چاہتی ہوں، ان کی دیکھ بھال کرنا چاہتی ہوں۔“

”اب تو ان کے گھر میں بہو آگئی ہے دیکھ بھال کرنے والی.....“ تیمور نے کہا۔

”بیٹیاں، بیٹیاں ہی ہوتی ہیں اور بہوئیں بہوئیں.....“ میں نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”اتنے سالوں سے تم نے دن رات محنت کی، اپنی جان ماری اور کاروبار سنبھالا ہے۔ اب جبکہ مظہر کا رو بار سنبھالنے لگا ہے اور تمہیں آرام کے دن نصیب ہوئے ہیں تو تم یہاں سے جانے کا کہہ رہی ہو، تاکہ دیکھنے اور سننے والے کہیں کہ سسرال والوں نے ضرورت کے وقت اسے رکھ لیا تھا اور اب ان کا مطلب نکل گیا ہے تو ماہا کو میکے بھیجا دیا ہے.....“ امی جان بولیں۔

”میں تو اسی گھر کو اپنا میکہ سمجھتی تھی امی جان!!“

”تو پھر اب کیا ہوا ہے؟“ تیمور اور امی جان بیک وقت بولے، مظہر مسلسل خاموش تھا اور ناشتہ بھی نہیں کر رہا تھا۔

”اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا یہاں رہنا بے جواز ہے.....“ میری آواز بھرا گئی۔

”کیا مطلب ہے اس بات کا؟“ امی جان نے پوچھا۔

”امی جان!!“ میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، ”میں اس گھر کو اپنا میکہ سمجھوں، آپ مجھے بیٹی سمجھیں، تیمور، مظہر اور نگہت بہن..... جب بھی اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب سچ نہیں ہے..... لوگوں کی نظر میں میرا اس گھر میں رہنا غیر شرعی ہے۔“

”کون لوگ ہیں؟ کس احمق نے کچھ کہا ہے؟“ تیمور غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کسی نے ہمارے منہ پر اگر کچھ نہیں کہا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ ہماری بیٹھ پیچھے باتیں نہ کرتے ہوں گے۔“ میں سسکی۔

”اور ہم ہر جاہل بندے کی بات سن کر پریشان ہونا شروع کر دیں؟“ تیمور نے بالکل میرے سامنے آکر جھک کر میری ٹھوڑی اپنی دائیں انگشت شہادت سے اوپر اٹھائی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر پرے کیا۔

”ویسے بھابی کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہیں، کس حیثیت سے وہ اس گھر میں رہ رہی ہیں؟“ مظہر نے سوال کیا۔ تیمور نے مڑ کر مظہر کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ماہا کی اپنی ضد ہے ورنہ اس گھر میں اس کی حیثیت کا شرعی اور مستحکم ہونا کوئی ناممکن بات تو نہیں ہے.....“ امی جان نے رمان سے کہا، ”اس وقت بھی تیمور تمہاری طرف سے جواب کا منتظر ہے بیٹا!!“

میں سمجھ رہی تھی کہ بات صرف مظہر، تیمور اور میرے بیچ ہے، اندازہ ہوا کہ یہ بات کرنے میں اصل محرک امی جان ہی تھیں۔ اب میں ان کو کیسے سمجھاتی کہ میرا دل اس بات پر نہیں مانتا۔

”امی جان پلیز! اس موضوع پر بہت بحث ہو چکی ہے.....“ میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

”اور تم اپنی ضد پر قائم ہو؟“ وہ جھنجھلا گئیں۔ میں خاموش رہی۔

”ٹھیک ہے آپ جائیں اپنی والدہ کی طرف اور اس مسئلے پر تحمل اور سکون سے سوچیں۔ ہمیں آپ کی طرف سے مثبت جواب کا انتظار رہے گا۔ اور آپ وہاں چند دنوں کے لیے ہی جائیں گی..... وہ گھر اب آپ کا نہیں ہے، آپ کا یہی گھر ہے..... اور اگر ایسی ہی خراب صورتحال ہوئی کہ کسی کو اس گھر میں آپ کی شرعی حیثیت کا شک ہو تو اس گھر میں آپ امی کے ساتھ رہیں، میں اور مظہر کوئی فلیٹ کرایے پر لے لیتے ہیں..... نہ اس گھر میں آپ کا کوئی نامحرم موجود ہوگا، نہ کسی کو کوئی اعتراض ہوگا.....“ تیمور نے جتنی انداز میں کہا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ یعنی میں اس گھر میں رہوں، تم دونوں کو اس گھر سے بے دخل کر کے؟ نہیں! ہرگز نہیں۔“ میں نے جوش سے کہا۔

”میرے خیال میں یہ اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔“ مظہر نے تیمور کی تائید کی۔ تھوڑی دیر کے لیے ایک عجیب سی خاموش چھا گئی۔ ہر کوئی خاموش تھا، ہر کوئی سوچ میں تھا۔

”کیوں بیٹا؟ اب اس حل پر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟ اور ہاں جو بھی تمہارا فیصلہ ہوگا اس پر کوئی تمہیں مجبور نہ کرے گا۔ اگر تمہیں تیمور کا رشتہ قبول ہو تو ہمارے لیے اس سے بڑھ کر

کوئی بات نہیں، لیکن اگر کہیں اور تمہاری شادی ہوگی تو بھی تم اسی گھر سے رخصت ہو کر جاؤ گی۔“  
امی جان نے کہا۔

میں نے سر ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور آنسوؤں کو بہہ جانے دیا..... روتے روتے میری پٹکی بندھ گئی۔ تیمور اور مظہر اٹھ کر چلے گئے۔ امی جان میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد میں نے سر اٹھایا اور اٹھ کر باتھ روم میں جا کر چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے اور دوبارہ آکر لاؤنج میں امی جان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بھی خاموش تھیں اور شاید روئی بھی تھیں۔  
وہ بھی ایک عورت تھیں اور اس وقت میری کیفیت، میرے دکھ اور میری الجھن کو سمجھ رہی تھیں۔ اس لیے مجھے مجبور بھی نہ کر سکتی تھیں۔ انہیں علم تھا کہ عورت کے لیے زندگی میں دوسری بار دلہن بننے کا تجربہ اور فیصلہ انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ میں چاہ رہی تھی کہ ماہِ رُخ کے حوالے سے انہیں بتاؤں کہ ہماری مجبوریوں اس کے ہاتھ میں تھیں اور اس کا رشتہ تو ذکرِ ہم اپنے لیے نئی مصیبت کھڑی کر لیں گے۔ تب میں نے آہستگی سے انہیں بتایا کہ ماہِ رُخ سے رشتہ کرنا ہر طرح سے ہی مجبوری تھی، ایک تو وہ تیمور کی پسند تھی اور یہ سب سے اہم وجہ تھی اور یوں بھی وہ نگہت اور اعجاز کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہے کہ وہ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

”تو بیٹا! اب تو نگہت اور اعجاز کا بیاہ ہو چکا ہے اور دو بچے بھی ہیں، ایسی کوئی بات کھل بھی جائے تو اس میں ہمیں اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ رہی بات اس کے جاننے کی تو وہ تیمور سے بیاہ کے بعد بھی اسے بتا سکتی ہے کہ نگہت اور اعجاز کے مابین رخصتی سے قبل ہی.....“ انہوں نے بات نامکمل چھوڑ دی، ”تو بیٹا مرد کو دو شادیوں کی اجازت بھی تو ہمارا مذہب دیتا ہے نا؟“

”امی جان..... آپ نہیں سمجھ رہیں جو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہی ہوں۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا، ”تاہم آپ میری طرف سے انکار ہی سمجھیں اور تیمور کو بھی بتادیں۔ اور ہاں اگلے دو تین روز میں ہی میں والدہ کی طرف چلی جاؤں گی۔“ میں نے حتیٰ انداز سے اپنا فیصلہ سنایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو..... جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ امی جان نے کہا، ”اور تیمور نے جو سوال تم سے کیا ہے اس کا جواب تم اسے خود ہی دینا، میں کوئی تم دونوں کے بیچ میں قاصد تھوڑی ہی ہوں۔“ وہ مسکرا رہی تھیں۔

”چلیں آپ نہ نہیں قاصد اور نہ بتائیں اسے۔ اسے میری خاموشی سے خود ہی کوئی نتیجہ اخذ

کر لینا چاہئے۔“ کہتی ہوئی میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تیمور چلا گیا اور میں اپنا ضروری سامان سمیٹ کر والدہ کی طرف لوٹ آئی۔ آنے سے دو دن قبل میں نے فون پر انہیں بتا دیا تھا کہ میں اپنے سازد سامان سمیت واپس آ رہی تھی۔

فجر کی نماز پڑھ کر پھر سو جاتی، نو بجے تک پڑی سوتی رہتی۔ پھر اٹھ کر اخبار پڑھتی۔ ابو سے گپ شپ لگاتی۔ والدہ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی یا لان میں پودوں اور گملوں کو دیکھتی۔ ٹیلی فون پر بہنوں سے باتیں کرتی، کتابیں پڑھتی، لیکن دل میں بے کلی سی تھی۔ زندگی لگتا تھا کہ جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ گھر میرا اپنا تھا، میرے والدین کا اور اس گھر میں میں نے شادی سے پہلے کہ انیس سال بھی گزارے تھے۔ دل جانے کہاں رہ گیا تھا۔ کبھی کبھار خود سے یہ سوال پوچھتی کہ کہیں میں خود تیمور سے شادی کرنے کی خواہش مند تو نہ تھی؟

والدہ نے ابھی تک بیٹھ کر تفصیل سے اور کھل کر مجھ سے بات نہ کی تھی، لیکن مجھے علم تھا کہ انہیں میرے اس طرح چلے آنے پر تعجب تو ہوگا۔ شاید وہ سوچتی ہوں گی کہ میں خود سے کوئی بات کروں گی۔ ابو تو میرے آنے سے بہت خوش ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ والدہ کو بھی دوسرا ہٹ رہے گی اور ثانیہ کو بھی کہنی رہے گی اور اسے اس گھر میں دل لگانے میں آسانی رہے گی۔ صدف آپلی اور ثانیہ باجی خوش تھیں کہ کم از کم میں نے والدین کی تنہائی کا سوچا تو۔ کیونکہ وہ دونوں تو اپنے گھروں، بال بچوں اور شوہروں کے ساتھ مصروف تھیں اور صرف میں ہی تھی جو ان جھمیلوں سے ”فارغ“ تھی۔

چار پانچ دن کے بعد علی بھائی اور ثانیہ بھی ہنی مون سے لوٹ آئے۔ ثانیہ بات بے بات مسکراتی ہوئی مجھے بہت پیاری لگی۔ اس کا حسن دنوں میں گھر گیا تھا، علی بھائی بھی مجھے بہت خوش اور مطمئن لگے، مجھے اپنی تجویز کی اس قدر خوبصورت تعبیر پر بہت مسرت ہوئی۔ والدہ نے بیٹے اور بہو کی بخیریت واپسی پر بکرا منگوا کر صدقہ دیا۔ علی بھائی اور ثانیہ سب کے لیے چھوٹے چھوٹے خوبصورت تحائف لائے تھے۔ علی بھائی کو تو خیر خریداری کا بالکل ہی آئیڈیا نہ تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ کبھی تحائف کم قیمت تھے۔ تاہم میں خاموش رہی، نہ بھی وہ کچھ لاتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہ

بھی کیا کم تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے اہم اور خوبصورت دنوں میں بھی ہمیں یاد رکھا اور پھر اس احساس نے میری نظر میں ان شخصوں کی وقعت بہت بڑھا دی تھی۔

علی بھائی ابھی چھٹی پر تھے، اگلے ہی روز والدہ اور ابو سے اجازت لے کر وہ دودن کے قیام کے لیے ثانیہ کے میکے چلے گئے تھے۔ مجھے ان کی آمد سے گھر میں ہلچل اور زندگی کا احساس ہوا تھا اور ان کے جانے سے بے انتہا بوریت ہونے لگی۔ والدہ سے پوچھ کر میں بھی علی بھائی کی سرال چلی گئی، جہاں میرا بہت پر تپاک استقبال ہوا۔ میں کافی دنوں کے بعد ان کے ہاں آئی تھی۔ اصرار کر کے مجھے انہوں نے رات کے کھانے کے لیے روک لیا تھا اور زارا اور نوید صاحب بھی آگئے تھے۔ رات دیر تک محفل جمی رہی۔ مظہر علی اور آنتی کے چہروں پر سکون اور شادمانی تھی۔ کچن میں میں شا کے پاس گئی تو مظہر علی بھی وہیں آگیا۔

”میڈم! آپ آفس میں بھی نہیں آتیں اور ویسے بھی آپ سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ آپ کے فون پر رابطہ کرتے ہوئے ذرا جھجک جاتا ہوں۔ لیکن آپ سے مجھے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی۔“ مظہر علی نے کہا۔

”ابھی کہہ لیں جو بات کرنا ہے اگر ثناء کے سامنے کرنے میں اعتراض نہ ہو تو؟“ میں نے کہا۔  
 ”نہیں میڈم! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ بیٹھ جائیں۔“ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔  
 ”میں آپ کے ادارے کی ملازمت چھوڑ رہا ہوں!!“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”تو پھر کیا کریں گے آپ؟“

”میں نے اپنا کام شروع کرنے کا سوچا ہے۔۔۔۔۔ بینک سے قرض لینے کے لیے علی بھائی کی مدد اور نوید صاحب کی شخصی ضمانت سے امید ہے کہ قرض مل جائے گا اور یوں بے شک چھوٹے پیمانے پر ہی، مگر اپنا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ ہے۔“ اس کے لہجے میں عزم تھا۔  
 ”اللہ آپ کی مدد کرے، لیکن سوچ سمجھ کر ہی کسی نئے کام میں ہاتھ ڈالیں۔ کسی فیلڈ میں کام کا ارادہ ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”یوں تو کافی فیلڈز ہیں لیکن میں نے اس میں سے دو تین کام اپنی دلچسپی کے منتخب کیے ہیں۔ سیالکوٹ سے کھیلوں کا سامان منگوا کر Finish کر کے ایکسپورٹ کرنے میں کافی کامیابی کے امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ چمڑے کی مصنوعات ہیں، جو لاہور میں بھی تیار ہو رہی ہیں اور کراچی

میں بھی۔ سیالکوٹ بھی اچھی مارکیٹ ہے۔“ وہ مجھے اپنے عزائم بتا رہا تھا۔  
 ”میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”دفتر کی طرف سے قرض ہے مجھ پر اور اگر آپ مظہر صاحب سے کہہ سکیں کہ وہ مجھے نوکری سے کلیرنس دے دیں، اور جونہی میں اس قابل ہوا میں سارا قرض چکا دوں گا۔ فی الحال تو میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ مظہر علی نے کہا۔

”میں مظہر سے کہہ دوں گی۔۔۔۔۔“ میں نے کہا اور ڈرائنگ روم میں آگئی جہاں خوب گپ شپ ہو رہی تھی۔

”کہاں چلی گئی تھیں تم بیٹا؟“ آنتی نے کہا۔

”میں ذرا کچن میں تھی، ثناء کے پاس۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ تبھی مظہر علی بھی آگیا۔  
 ”تم کدھر تھیں یار؟“ علی بھائی نے کہا۔

”میں کچن میں تھا۔۔۔۔۔“ اس نے کہا تو میری نظر ایک لحظے کے لیے اٹھی، علی بھائی کے چہرے پر مجھے عجب سا تاثر نظر آیا، شاید سبکی کا۔۔۔۔۔ مجھے اپنا جسم ٹھنڈا ہوتا ہوا نظر آیا۔  
 ”ٹگتا ہے کھانے پر بہت محنت ہو رہی ہے، سبھی لوگ کچن میں تھے۔“ نوید صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”جی نہیں! کھانا تو ثناء ہی گرم کر رہی ہے، بنایا غالباً آنتی نے ہوگا۔ مظہر علی مجھے اپنے نئے کاروبار شروع کرنے کے ارادے کے بارے میں بتا رہے تھے۔“ میں نے جان بوجھ کر نوید صاحب کے سوال کا جواب دیا تاکہ علی بھائی کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔

ہم مشرقی لڑکیاں شکوک کے سائے میں، اندیشوں کے اندھیروں میں زندگی گزار دیتی ہیں۔ ہمارے اپنے، ہمارے خونی رشتے ہی ہمارے لیے امتحان گاہ ہیں، انہی کی نظریں ہمیں کبھی پہنچاتی ہیں آسمانوں کی بلندیوں پر اور کبھی اتار دیتی ہیں زمین سے بھی نیچے پاتال میں!

والہیسی پر زارا اور نوید صاحب مجھے چھوڑنے آئے کیونکہ میں ٹیکسی پر آئی تھی۔ نوید صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کے لیے زارا کا رشتہ تجویز کیا تھا۔ نوید صاحب نے زبان سے شکریہ کہا اور زارا کی آنکھیں اور اس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔

”جواب چھوڑ دی ہے زارا یا چھٹی پر ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نوید کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے میں نے چھوڑ دیا ہے۔ آپ کو تو پتا ہے ماہا کہ میں ضرور تانوکری کر رہی تھی شوق نہیں۔“ زارا نے حقیقت بیان کی۔

”اچھا کیا ہے، ویسے بھی عورت کے لیے شادی کے بعد اس کی اولین ترجیح اس کا شوہر اور گھر ہی ہوتے ہیں۔“ میں نے بڑی بوڑھیوں کی طرح نصیحت کی۔

”میں تو آپ کے لیے بہت دعا کرتی ہوں ماہا! اللہ آپ کے لیے بہت بہتر کرے۔ آپ دوسروں کے لیے اتنی اچھی ہیں..... اتنا خیال رکھتی ہیں۔“ زارا نے خلوص سے کہا۔

”اللہ نے آپ کی نیک نیتی کا آپ کے لیے کوئی خاص اجر ہی رکھا ہوگا.....“ نوید صاحب نے کہا، ”کب تک آرہے ہیں ڈاکٹر معظم پاکستان؟ میرا مطلب ہے کہ شادی کے لیے؟“

”نوید صاحب! میری منگنی ڈاکٹر معظم سے ختم ہو گئی ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا لیکن میرے یہ الفاظ نوید صاحب اور زارا کے سروں پر گویا بم کی طرح پھٹے، انہوں نے گاڑی روک دی، وہ دونوں خاموش تھے مگر میں جانتی تھی کہ وہ دونوں کس کشمکش میں مبتلا تھے۔ ”چلیں نوید صاحب! پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔“ انہوں نے خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور گھر پہنچے تو میں نے انہیں چائے کے لیے اندر آنے کو کہا۔

”پھر آئیں گے ماہاجی! اس وقت تو بہت دیر ہو گئی ہے۔“ زارا نے کہا۔

”آئی ایم سوری!“ نوید صاحب نے کہا، ”میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا، مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں..... یوں بھی ظاہر ہے کہ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔“

”اِس اوکے!“ میں نے کہا، ”آپ شرمندہ نہ ہوں۔ قسمت میں خرابی ہو تو اس میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔“

”سوری ماہاجی! مجھے سن کر بہت دکھ ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ ثانیہ کو علم ہو مگر اس نے مجھے بھی نہیں بتایا۔“ زارا نے افسوس کا اظہار کیا۔

میں نے گاڑی سے اتر کر انہیں خدا حافظ کہا اور ان کے روانہ ہوتے ہی گھر کے اندر آ گئی۔ ملازم لڑکا گیٹ کے اندر کی طرف کھڑا تھا، گاڑی کی آواز سن کر اس نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اندر گئی تو والدہ جاگ رہی تھیں۔ میں انہیں اتنی دیر تک جاگتے دیکھ کر شرمندہ ہو گئی۔

”آپ سو جاتیں والدہ!!“

”نیزد ہی نہیں آرہی تھی۔ تمہارے ابو تو سو گئے ہیں، لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کہ تم سے بہت سی باتیں کروں، بہت سی باتیں پوچھتا ہوں مجھے تم سے..... بہت عرصے سے وقت ہی نہیں ملا کہ تمہارے پاس بیٹھوں اور تم سے تمہارا حال بھی پوچھوں۔“

”میرا حال ٹھیک ہے والدہ اور چال بھی.....“ میں نے بشارت سے کہا۔

”کیسا رہا ڈنر؟ اور آئی کیسے ہو؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”ڈنر اچھا تھا اور نوید صاحب اور زارا چھوڑ کر گئے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”تو انہیں اندر بلا تیں بیٹا! زارا تمہاری بھانج کی بہن ہے۔“ والدہ نے پریشانی سے کہا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے والدہ! میں نے کہا تھا ان سے۔ لیکن پھر مجبور نہیں کیا کہ وہ بھی نئے شادی شدہ ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے کا وجود اہم ہے نہ کہ ہمارے ہاں چائے پینا۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”ماہا! بیٹا..... تم سے کچھ پوچھنا تھا لیکن تم یہ محسوس نہ کرنا کہ خدا خواستہ تم ہم پر بوجھ ہو۔“ والدہ ہچکچاہتی تھیں۔ میں ان کے انداز سے اگرچہ کچھ سمجھ گئی تھی تاہم سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”بیٹا! غالب کی وفات کے بعد ہم نے بہت چاہا کہ تم لوٹ آؤ اور عدت گزار کر اپنا سلسلہ تعلیم جاری کر لو یا پھر کچھ عرصہ گزر جائے تو مناسب رشتہ دیکھ کر تمہاری دوسری شادی کر دی جائے، کیونکہ بیس برس کی عمر میں یہ تم پر بیوگی کا بوجھ پڑ گیا۔ پھر کوئی آسرا بھی نہ تھا کہ تم بیٹھ کر زندگی اس کی خاطر گزار دیتیں۔ تم نے اس وقت خود ہی سسرال میں رہنے کا فیصلہ کیا، اور ہمیں بھی تسلی تھی کہ تم نے اپنی مرضی سے اس گھر کا انتخاب کیا تھا۔ پھر ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ تم تیمور سے نکاح کر لیتیں، اس سے بھی تم نے انکار کر دیا، تیمور کی بھی منگنی ہو گئی اور تمہاری بھی.....“ وہ سانس لینے کو رکیں اور میں ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”جانے قسمت میں کیسی ٹھوکر لکھی تھی کہ بظاہر اتنا اچھا نظر آنے والا ڈاکٹر معظم بھی کھوٹا سکہ نکل آیا اور خدا نے تمہیں بروقت بچالیا۔ اس واقعے پر صدف خود کو مجرم محسوس کرتی ہے اور بہت شرمندہ ہے۔ بارہا مجھ سے معافی مانگ چکی ہے اور کہتی ہے کہ اسے تم سے معافی لے کر دوں۔“

”اس میں ان کا کیا قصور والدہ؟ وہ تو اتنا ہی جانتی تھیں جتنا انہیں بتایا گیا تھا۔ یہ سب تو میرے مقدر کی ٹھوکر ہیں جو میں نے کھانی ہیں۔ اگر اتنی ہی اچھی قسمت ہوتی تو غالب ہی نہ

جاتے یا پھر میرا بچہ ہی بچ جاتا۔“ میں نے آزر دگی سے کہا۔

”ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے بیٹا!“ والدہ نے کہا، ”اگر تمہاری اور معظم کی منگنی ٹوٹ سکتی ہے تو پھر تیمور اور ماہ رخ کا بھی نکاح تو نہیں ہوا، منگنی ہی ہوئی ہے۔“

”والدہ!!! پلیز..... مت کریں ایسی باتیں۔ منگنی ہو یا نکاح، ان کا ہونا کھیل ہے نہ ٹوٹنا کھیل۔

منگنی ہوتی ہے تو دل پر کیا کیفیت ہوتی ہے اور ٹوٹتی ہے تو کیا بنتی ہے.....؟ کیا آپ نہیں جانتیں؟ کیا میں خود تمام کیفیت سے گزر کر بھی دوسروں کو اس کیفیت میں مبتلا کر دوں؟ کیا میں ماہ رخ کی آنکھوں

سے بھی حسین خواب نوچ کر پھینک دوں، جیسے میرے پھینکے گئے؟“ میں سسکنے لگی۔

”دنیا امتحان گاہ ہے بیٹا! کسی حادثے کو دل کا روگ بنالینا ٹھیک نہیں؟“ انہوں نے مجھے تسلی دی۔

”آپ میری ماں ہیں والدہ!! آپ کو بتا رہی ہوں..... غالب نے مجھے مینوں میں سالوں کا

پیار دے دیا۔ وہ گئے تو مجھے لگا شاید میری زندگی بے مقصد ہو گئی ہو۔ پھر میں نے اپنے لیے تو کیا

جینا تھا، غالب کے گھر والوں کے لیے زعمہ رہی کہ انہیں میری ضرورت تھی۔ غالب کے جانے

سے ہم سب کی زندگیوں میں خلا آ گیا تھا۔ ان کی امی نے اپنا جوان بیٹا کھویا تھا۔ مجھے لگا اس وقت

اس گھر کو میری ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے وہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ٹھیک ہے کہ آپ لوگوں کے

ذہنوں میں تیمور کے حوالے سے جو خیال تھا اور ہے وہ بجا سکی، لیکن میں نے اسے ہمیشہ ایک بھائی

کی طرح سمجھا ہے۔“ میں ذراڑکی۔

”لیکن تمہارے سمجھنے سے وہ بھائی بن تو نہیں جاتا نا؟؟“ والدہ نے اصرار کیا۔

”درست ہے!! مانتی ہوں۔ لیکن آپ کو بتایا تھا کہ وہ اور ماہ رخ ایک دوسرے کو پسند کرتے

تھے، اسی لیے میں نے امی جان کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی منگنی کروادی تاکہ مجھ پر ان کی

طرف سے اس مطالبے میں کمی ہو جائے اور خود..... میں شکار ہو گئی ڈاکٹر معظم کی چکنی چڑی باتوں

کا..... والدہ!! میں نے اس سے منگنی کا فیصلہ کسی جذباتی یا لحاظی دباؤ کے نتیجے میں نہ کیا تھا۔ میں

نے بہت سوچا تھا اور پھر میرے دل اور دماغ نے اس کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ اور پھر آپ کی یہ

بے وقوف بیٹی اسے چاہنے لگی بھی گئی کہ میری خوشیوں کو نظر لگ گئی..... میری آنکھیں تو کھل گئیں

لیکن میرے اندر جذبول کے سوتے بند ہو گئے..... اب یقین کریں والدہ..... کسی سے بھی شادی

کرنے کو طبیعت نہیں مانتی۔ کچھ حادثہ ابھی نیا ہے اور کچھ زخم بہت گہرا ہے، مجھے سنبھلنے کے لیے کچھ

وقت دیں.....“ میں نے بمشکل بات مکمل کی۔ والدہ نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا..... مجھے لگا کہ میں جلتی بلتی دھوپ میں سے کسی شجر سایہ دار تلے آگئی ہوں۔

”میری بچی! میری جان!! جانے قدرت نے تمہارے لیے کیوں اتنی آزمائشیں رکھی ہیں۔

میں اور تمہارے ابو تمہاری ہی فکر میں گھلتے رہتے ہیں۔“

”بس آپ میرے لیے دعا کیا کریں!“

”لیکن ابھی اتنی ضد کر کے آنے کی کیا وجہ ہے؟“ والدہ نے کہا۔

”کیا آپ کو میرا آنا برا لگا؟“ میں نے جان بوجھ کر انہیں چھیڑا۔

”پاگلوں والی باتیں نہ کرو..... میرے سوال کا جواب دو۔“ والدہ نے گھر کا۔

”بس والدہ!“ اب مظہر نے کاروبار سنبھال لیا ہے..... میں گھر پر فارغ ہوتی ہوں۔ اور پھر

اب جلد ہی تیمور کی شادی متوقع ہے، مجھے لگا کہ مجھے اس سے پہلے پہلے وہاں سے نکل آنا

چاہئے..... بعد میں آتی تو لوگ سوچتے کہ شاید ماہ رخ کے ساتھ میری کوئی ناچاقی ہو گئی ہے۔“

میں نے وضاحت کی۔

”بڑی عظمندی کی باتیں کرنا شروع ہو گئی ہو تم اور کتنی خوش بین بھی ہو گئی ہو..... لیکن اصل

بات تم نے اب بھی مجھے نہیں بتائی؟“ وہ مسکرائیں۔

”یہی اصل بات ہے..... سب کچھ آپ کو بتا دیا ہے تو کچھ کیوں چھپاؤں گی؟“ میں نے

نظریں چراائیں۔

”سو جاؤ اب بیٹا!!!“ والدہ اٹھیں۔

”والدہ!!“ میں نے کہا اور خود ہی جھجک گئی۔

”کیا بات ہے میری جان؟؟“ وہ ٹھٹھکیں۔

”میں بہت تھک گئی ہوں!!!“ میں نے گویا اعتراف جرم کیا اور سر گھٹنوں پر رکھ کر دھواں

دھار روئے لگی۔ والدہ نے دوبارہ بیٹھ کر مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

”نہ روؤ بیٹا!!! اللہ بہتر کرے گا، تمہاری آزمائش ختم ہوگی.....“ وہ بھی رو رہی تھیں۔



ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی میری اور ثانیہ کی ملاقات کھانے کی میز پر ہی ہوتی تھی۔ وہ بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی اور ابھی تک گھر کے کام کاج شروع نہ کیے تھے۔ شادی کو دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ شام کو اکثر ہی ثانیہ اور علی بھائی گھومنے پھرنے نکل جاتے تھے۔

تب والدہ نے باقاعدہ رات کے کھانے پر اعلان کیا کہ وہ کم از کم چکن کی ذمہ داریوں سے استعفیٰ دے رہی ہیں اور ثانیہ اپنی پہلی ذمہ داری سنبھالے۔ ملازمین موجود تھے، ان سے کام کروانا تھا، لیکن ملازمین سے کام وہی کروا سکتا ہے جس کو خود کام کرنا آتا ہو۔ ثانیہ کو میں نے اس کے سینکے میں دیکھا تھا، وہ بہت سنگھڑ تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ باورچی خانے کا انتظام بخوبی سنبھال لے گی۔

”کل کیا پکاؤں امی؟“ اس نے والدہ سے پوچھا۔

”یہی تو تمہاری ذمہ داری ہے، پکانے کو تو خانساں بھی موجود ہے۔ میری سب سے بڑی سروردی تو ہر روز یہی ہوتی تھی کہ کیا پکایا جائے!! اسی لیے یہ ذمہ داری تمہیں تفویض کر رہی ہوں بیٹا!! کل جھڑا مبارک کا دن ہے اور تمہارا شو ہر بھی دوپہر کے کھانے پر موجود ہوگا۔ ابھی تک تمہیں اس کی پسند اور ناپسند کا اندازہ ہو گیا ہوگا؟“ والدہ نے کہا۔

”مجھے تو ابھی تک ان کی سمجھ ہی نہیں آئی۔“ ثانیہ نے اتنی سادگی سے کہا کہ سب کی ہنسی نکل گئی۔

”لو بیٹا مجھے پچیس سالوں میں آج تک اس کے باپ کی پسند ناپسند کی سمجھ نہیں آئی تو.....“

والدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں جانتی تھی کہ وہ صرف ثانیہ کا دل رکھنے کو ایسا کہہ رہی تھیں۔ ورنہ وہ تو ابو کے چہرے سے ہی ان کے مزاج کی کیفیات کا اندازہ کر لیتی تھیں۔ ان کی خاموشی کو بھی سمجھ جاتی تھیں اور ان کبھی باتوں کو بھی۔ اس وقت فقط ثانیہ کو خفت کے احساس سے بچانے کے لیے وہ ایسا کہہ رہی تھیں۔

”چلیں ابو آپ بتائیں کہ کل میں کیا پکاؤں؟ پہلے دن میری مدد کریں۔“ ثانیہ نے ابو سے کہا۔

”اچھا تم بتاؤ کہ تمہیں سب سے اچھا کیا بنانا آتا ہے؟“ ابو نے پوچھا۔

”باتیں!!“ اچانک علی بھائی بولے تو میں مسکرا پڑی اور ثانیہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”یار علی! تم ذرا چپ نہیں رہ سکتے؟ ہم ایک اہم مسئلہ پر بات کر رہے ہیں۔“ ابو نے علی بھائی

کو گھر کا۔

”مجھے سب کچھ بنانا آتا ہے ابو.....“ ثانیہ نے کہا۔

”چلو پھر کل تم آلو گوشت بنا لو اور ساتھ ماش کی دال.....“ ابو نے فرمائش کی۔

”ٹھیک ہے ابو!!“ ثانیہ کے چہرے پر جیسے روشنی آگئی، ”میں خود پکاؤں گی کھانا، خانساں ماں سے نہیں بنواؤں گی۔“

”بیٹا! تین ملازمین بھی ہیں، کھانا بناتے وقت ان کا بھی خیال رکھنا اور خانساں کو بتا دینا وہ بنالے لگا خود کہاں تھکے گی۔“ والدہ نے کہا۔

”نہیں امی! مجھے خود کھانا بننا کر خوشی ہوگی۔“ ثانیہ نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر ماہا تمہارے ساتھ مدد کر دے گی۔“

”ارے نہیں! ان کو کیوں زحمت دیں، وہ تو یہاں مہمان ہیں، ہم ان سے تھوڑا ہی کام کروائیں گے۔“

”میں اب یہیں رہوں گی، اس لیے میں مہمان نہیں ہوں.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اس پر ثانیہ تو خاموش رہی البتہ علی بھائی نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”خیر تو ہے ماہا؟ تم اب یہاں کیوں رہو گی؟“

”بھئی ماہا کا اپنا گھر ہے اور پھر اب تو اس کی دوست اس گھر میں اس کی بھابی بن کر آگئی ہے اس لیے خوا خواہ بھی اس کا جی چاہے گا یہاں رہنے کو۔“ ابو نے کہا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا ابو..... مجھے تو ماہا کے یہاں رہنے کی بہت خوشی ہوگی۔ میں ہمیشہ سے یہ چاہتا تھا کہ وہ یہاں آکر ہی رہے، لیکن اس نے خود ہی وہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ کسی سے کوئی ناراضگی وغیرہ تو نہیں ہوگئی؟“ علی بھائی سٹپٹا گئے۔

”نہیں علی بھائی! میں ہنسی خوشی سے آئی ہوں اور آتی جاتی رہوں گی.....“ میں نے کہا۔

”بہن جی تو چند دنوں میں ہی اتنی اداس ہو گئی ہیں۔ مجھ سے بڑھ کر وہ ماہا کو پیارا کرتی ہیں اور اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہیں۔“ والدہ نے کہا۔ ثانیہ اس تمام گفتگو میں لائق سے بیٹھی رہی..... یونہی میرا دل چاہا کہ اگر وہ ایک دفعہ ہی یہ کہہ دیتی کہ اسے میرے یہاں رہنے سے خوشی ہوگی۔ لیکن میں نے اس کی خاموشی کو بھی اس کی سادگی اور جھجک پر محمول کیا۔

اگلے ہی روز امی جان کی کال آئی۔ وہ والدہ اور تمام اہل خانہ کو شادی کی خوشی میں کھانے پر بلانا چاہ رہی تھیں۔ والدہ شاور لے رہی تھیں اس لیے میں نے ان سے کہا کہ میں ان سے پوچھ کر بتا دوں گی۔ ”تم ٹھیک ہونا؟ خیریت سے اور خوش؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں امی جان اور شاید خوش بھی ہوں۔“

”میں تو بہت تنہا ہو گئی ہوں.....“

”اب جلد ہی تیور کی شادی کر دیں.....“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ہاں نگہت کی کال آئی تھی، تمہیں بہت سلام کہہ رہی تھی۔ تمہارے جانے کا سن کر پریشان بھی ہوئی تھی۔ اسی کے توسط سے اس کی ساس نے کہلوا یا ہے کہ انہیں شادی کی جلدی ہے کیونکہ چھوٹی والی کے بھی رشتے آرہے ہیں.....“ امی جان نے ہا۔

”آپ نے تیور سے بات کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کی تو ہے، مگر وہ کہہ رہا ہے کہ چھبیس سال کی عمر سے پہلے اگر وہ شادی کرتا ہے تو اسے شادی شدہ افسران والی مراعات نہیں مل سکیں گی، خصوصاً گھر.....“ انہوں نے بتایا۔

”تو اچھا ہے سال ڈیڑھ آپ کے پاس رونق رہے گی۔“ میں نے خوشی سے کہا، ”شادی پر تو کوئی پابندی نہیں ہے ناں۔ صرف گھر ہی نہیں ملے گا.....“

”کہہ رہا تھا کہ آئندہ برس اس نے اپنے کیریئر کا اہم کورس کرنا ہے، اس کے بعد اس کا شادی کا ارادہ ہے۔“ امی جان نے بتایا۔ ”میں نے نگہت کو بتا دیا تھا۔ دیکھو اب وہ لوگ اس پر کیا کہتے ہیں انہیں اندازہ ہونا چاہئے کہ ایک فوجی کی زندگی میں اس کے کورسز کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔“

”چلیں دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ ممکن ہے کہ تیور کو خود بات کرنا پڑے ماہِ رُخ کے بڑے بھائی سے۔ اور اگر چھوٹی کے رشتے آرہے ہیں تو وہ کر دیں اس کا رشتہ، شادیاں دونوں بہنوں کی اکٹھی ہو سکتی ہیں۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”بیٹا! تمہیں کہہ رہی ہوں..... کسی اور سے نہیں کہا.....“ امی جان رازداری سے بولیں، ”مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ہمیں دوسرا رشتہ دینے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں، اسی لیے ہمارے کانوں میں یہ بات ڈال دی ہے کہ چھوٹی کے رشتے آرہے ہیں۔“

”اچھا نہیں ہے امی!! از زیادہ سمجھانے نہ بنیں تو بہتر ہے۔“ میں ہنسی۔

”ناں بیٹا! میں تو ہاری..... ایک رشتہ بھی میں وہاں سے لینے کے حق میں نہ تھی کہ اس گھر میں پہلے سے بیٹی دے رکھی ہے۔ صاف وٹہ سٹہ بن گیا ہے۔ یہ بھی تمہاری ہی مہربانی ہے جو ماہِ رُخ کا رشتہ مانگتے ہیں اتنا اتنا دلا پن دکھایا تم نے.....“ وہ طنز سے کہہ رہی تھیں۔

”اس کا مقصد تھا اس گھر میں امی جان!! ویسے آپ مظہر سے ضرور پوچھ لیں ستارہ کے بارے میں!!“ میں نے آخر میں کہا۔ فون بند کر کے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اگر امی جان مظہر کو بتائیں کہ میں نے کیا کہا تھا تو وہ خوب پیچ و تاب کھائے گا۔ اچانک یہ مجھے احساس ہوا کہ میں اسے مس کر رہی تھی۔ ”چلو والدہ سے بات کرتی ہوں.....“ میں نے دل میں سوچا، ”جس دن کھانے کا پروگرام ہو گا میں ایک دن پہلے چلی جاؤں گی اور دو ایک دن رہ کر آؤں گی.....“ یقیناً امی جان زارا اور نوید صاحب کو بھی بلائیں گی اور زارا اور ثانیہ کے میکے والوں کو بھی۔

ثانیہ کھانا بنانے میں مصروف تھی، نئے گھر میں نئے میدان عمل میں پورے استحقاق کے ساتھ۔ میں نے کچن میں جھانکا اور مدد کے لیے پوچھا۔ ”بہت شکریہ، میں کر لوں گی!“ اس نے کہا، ”آپ بتائیں آپ کو چائے بنا دوں؟“

”اگر ممکن ہو تو ایک کپ بنا دو.....“ میں نے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا۔

کھانے کے وقت تک علی بھائی بھی گھر آ گئے تھے، ابو جمعہ کی نماز پڑھ کر آتے تھے تو اس کے فوراً بعد کھانا جن دیا جاتا تھا اور ساتھ ہی ملازمین کو بھی کھانا دے دیا جاتا تھا۔ والدہ اس روز بالکل باورچی خانے کی طرف نہ گئی تھیں۔ شاید اس لیے کہ ثانیہ اس کو مدخلت نہ سمجھ بیٹھے، نئے رشتوں میں بسا اوقات معمولی سی باتیں دلوں میں دراڑ ڈال دیتی ہیں۔ بہتر تعلقات کے آغاز کے لیے بہتر ہے کہ تمام فریقین ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

کھانا میز پر چٹا ہوا تھا، ایک ڈونگے میں خوش رنگ اور خوشبودار آلو کوشت اور دوسرے میں دال، تازہ بنے ہوئے پھلکے، سلاد اور چٹنی سب کچھ موجود تھا۔ سب نے کھانا شروع کیا اور ثانیہ کو خوب کھلے دل سے داد دی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ ”بیٹا ملازمین کے لیے سائمن وغیرہ نکال دیئے تھے؟“ والدہ نے پوچھا۔

”جی امی! ان کے لیے سالن نکال دیا تھا دال کا اور خاناماں سے کہا تھا کہ روٹیاں بنالے۔“  
ثانیہ نے بتایا۔

”تو کیا ان کو گوشت کا سالن نہیں دیا؟“ والدہ نے حیرت سے کہا۔

”نہیں گوشت کا سالن آدھا میں نے میز پر رکھا ہے اور آدھارات کے لیے فرج میں رکھ دیا ہے۔“ ثانیہ نے بتایا تو ہم سب ہی دل میں شرمندہ ہوئے کیونکہ ہمارے ہاں کبھی ایسی تفریق نہ کی جاتی تھی۔ چاہے تھوڑی مقدار میں ہو مگر انہیں مرغی یا گوشت جو بھی پکا ہو ضرور دیا جاتا ہے۔

”بیٹا! رات کے لیے کچھ اور بن جاتا، مگر انہیں تم دونوں سالن وے دیتیں.....“ والدہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

”چلیں کوئی بات نہیں، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ ثانیہ بیٹا! آئندہ سے تم ذرا خیال رکھنا اس بات کا۔“ ابو ثانیہ کی حمایت میں بولے تو تاتا و ذرا سا کم ہوا۔

”امی آپ کو چاہئے تھا کہ آپ پہلے سے ثانیہ کو بتا دیتیں..... اسے تو علم نہ تھا، مگر ملازمین کیا سوچتے ہوں گے اس کے بارے میں۔“ علی بھائی نے کہا، ان کا لہجہ تو عام سا تھا، مگر مجھے ان کا اس طرح کہنا یوں لگا جیسے وہ والدہ سے گستاخی کر رہے ہوں۔

”میری عی غلطی ہے بیٹا کہ دن بھر جھانک کر بھی کچن میں نہ دیکھا۔ اصل میں جمعے کے دن میرے وظائف اور تسبیحات کافی طویل ہو جاتی ہیں۔“ والدہ نے مصالحت سے کہا۔ بات آئی گئی ہو گئی، ابو آرام کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور ثانیہ برتن سمیٹنے لگی تو میں نے اسے منع کر دیا۔ خاناماں کو بلا کر کہا کہ وہ برتن اٹھالے۔ علی بھائی اور ثانیہ بھی اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اور والدہ تنہا رہ گئے۔ ٹی وی روم میں آکر بیٹھ گئے۔ ”ماہا! بیٹا میں کہتی تھی ناں کہ طبقاتی فرق کی بہت اہمیت ہوتی ہے.....“ والدہ کھوئے کھوئے انداز سے بولیں۔

”والدہ ٹھیک ہو جائے گا..... ٹھیک ہے اس نے اپنے گھر میں اتنے اچھے حالات نہیں دیکھے ہیں اور اب نئے گھر کے طور طریقے سیکھ لے گی۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”نہیں بیٹا! مجھے تو لگتا ہے کہ ہم سے غلط فیصلہ ہو گیا ہے..... جس نے اپنے پیچھے غربت اور تنگدستی چھوڑی ہو اس کا ہاتھ اور ظرف ہمیشہ تنگ رہتا ہے۔ یہ میرا خیال نہیں ہے، یہ بزرگوں کے ہزار ہا سال کے تجربات کا نچوڑ ہے۔“ وہ وثوق سے کہہ رہی تھیں۔

”پڑھی لکھی ہے، سکھڑ ہے اور سمجھدار ہے، جلد ہی آپ کے گھر کے طور طریقے بھی سیکھ لے گی.....“ میں نے ان کو تسلی دی، ”میں کسی وقت مناسب موقع دیکھ کر اس کو سمجھاؤں گی۔“

”ہرگز ایسا نہ کرنا، بھول کر بھی ایسی غلطی نہ کرنا۔ عموماً نئی بہو خود کو اپنی سسرال والوں سے زیادہ عقلمند سمجھتی ہے اور ایسے موقع پر اگر تم نے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی تو ممکن ہے تمہارے خلاف ایک محاذ کھل جائے۔“ والدہ نے سختی سے کہا۔

”ارے والدہ!! میں نے ان کی کڑے وقتوں میں مدد کی ہے اور میرے احسان یہ سب مانتے بھی ہیں۔ میری بات کا وہ برا نہیں منائے گی، مجھے پورا یقین ہے۔“

”شاید تم نے حضرت علیؓ کا وہ قول نہیں سنا کہ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو..... ممکن ہو تو اس سے واسطہ بھی نہ رکھو.....“ والدہ نے کہا۔

”یہ تو بڑا عی عجیب قلعہ ہے والدہ!! میں نے پہلی دفعہ یہ سنا ہے۔“ میں واقعی اس سے لاعلم تھی۔  
”چلو اب سن لیا ہے تو اس پر عمل کرنا.....“ والدہ نے مجھے سوچوں کے بھنور میں دھکیل دیا تھا۔  
”ارے ہاں والدہ! امی جان کا فون آیا تھا..... کھانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ کیا خیال ہے اتوار کا رکھ لیا جائے تو میں کل ادھر چلی جاؤں گی اور اتوار رات کو کھانے کے بعد آپ لوگوں کے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گی۔“ میں نے والدہ سے پوچھا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، بیٹے علی اور ثانیہ سے پوچھ کر دیکھ لینا، ان کی کوئی مصروفیت نہ ہو۔“ انہوں نے کہا تو میں نے سوچا بعد دوپہر علی بھائی سے پوچھ لوں گی۔ شام کی چائے پر میں نے علی بھائی اور ثانیہ سے سوال کیا کہ کہیں وہ اتوار کو مصروف تو نہیں ہیں.....

”کوئی خاص نہیں! خیریت تو ہے؟ کوئی کام ہے کیا؟ کہیں جانا ہے؟“ علی بھائی بولے۔

”امی جان آپ سب لوگوں کو کھانے پر بلانا چاہ رہی ہیں!“ میں نے بتایا۔

”والدہ سے پوچھ لو.....“ علی بھائی نے کہا۔  
”وہ تو فارغ ہیں، آپ لوگوں کی کوئی مصروفیت نہ ہو، صرف یہی چیک کرنا تھا۔“ میں نے کہا،  
”کیوں ثانیہ ٹھیک ہے ناں؟“

”جو بھی آپ لوگوں نے پلان کر لیا ہے، وہ ٹھیک ہے.....“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔  
”ابھی کوئی پلان فائل نہیں ہوا۔ ہم نے امی جان کو ابھی بتایا بھی نہیں، اگر آپ لوگوں کی کوئی

معروفیت نہ ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ اگر آپ معروف ہیں تو بتادیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اصل میں اتوار کو ہم امی کی طرف جاتے ہیں، زارا وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔“ جبکہ کر اس نے کہا۔ والدہ اور ابو خاموش تماشا کی بنے بیٹھے تھے۔

”تو آپ کا میکہ بھی تو اسی شہر میں ہے، بھلے آپ لوگ وہاں چلے جائیں اور وہیں سے ڈنر پر آجائیں۔ بات تو ایک ہی ہے، زارا لوگوں کو بھی آنا ہے اور تمہاری امی وغیرہ کو بھی۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میرے اندر عجیب سی دھکن پڑ رہی تھی۔ آخر ثانیہ کس طریقے سے Behave کر رہی تھی۔ چند دنوں میں ہی اس نے اپنی جون بدل لی تھی۔

”ٹھیک ہے ناں ماہا! اگر اتوار کا دن آپ سب لوگوں کو مناسب لگتا ہے تو ٹھیک ہے، ہمارا ثانیہ کے میکے جانا کچھ ایسا ضروری بھی نہیں اور خصوصاً جب ان لوگوں کو بھی وہاں آنا ہے تو پھر وہیں ملاقات ہو جائے گی۔ ہر اتوار کو وہاں جانا کون سا کہیں لکھ کر فرض کر دیا گیا ہے۔“ علی بھائی نے حتی انداز میں کہا۔ انہیں بے مقصد بحث سے ہمیشہ بڑی جلدی کو فٹ ہوتی تھی۔

”مجھے کل صبح اُدھر چھوڑ آئیں گے علی بھائی؟“ میں نے ان سے سوال کیا۔

”کل؟ ہوں چھٹی کا دن ہوتا ہے آرام سے اٹھ کر چھوڑنے جاؤں گا؟“ علی بھائی نے ہنس کر کہا۔

”تم آرام سے سو نایار! میں چھوڑ آؤں گا ماہا کو۔“ ابونے کہا۔

”کیا کیا پکاؤ گی ماہا؟“ علی بھائی شرارت سے پوچھنے لگے۔

”آپ بتائیں کیا کیا کھانا ہے؟“ میں نے بھی اسی لہجے میں پوچھا۔ ”کافی لوگوں کی دعوت

ہے میرا خیال ہے کہ کھانا باہر سے پکوا یا جائے گا۔ اور یوں بھی مظہر کو باہر کا کھانا بہت پسند ہے۔“

”نہیں تو! یہ آپ سے کس نے کہا؟“ ثانیہ یکدم بولی، ”کہ مظہر بھائی کو باہر کا کھانا پسند ہے؟“

”میں نے اپنے دو دو مظہر کی بات کی ہے، مظہر علی کی نہیں۔“

”اوہ سوری! میں سمجھی آپ نے مظہر بھائی کی بات کی ہے۔“ وہ ذرا سی خفیف ہوئی اور اس کی

اس حرکت پر مجھے والدہ کے چہرے پر بڑھنے والا تاد صاف نظر آ رہا تھا۔ علی بھائی اور ثانیہ چائے

پی کر باہر لان میں چلے گئے تو میں نے والدہ سے پوچھا۔

”آپ کیوں پریشان سی دکھائی دے رہی ہیں؟“

”اگر میں پریشان ہوں تو تمہیں اس پریشانی کی وجہ کا بھی علم ہو گا؟“

”آپ کی زیادہ تر پریشانیوں کی وجہ تو میں ہی ہوں ناں؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”بے شک تم ٹھیک سمجھی ہو۔۔۔۔۔ اس وقت میری پریشانی کی سب سے بڑی وجہ تم ہی ہو!!“

والدہ نے کہا تو میرے دل کی ایک دھڑکن Miss ہوئی۔۔۔۔۔ میں نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا

تو مجھے ان کے چہرے پر عجیب سی اجنبیت سی نظر آئی۔۔۔۔۔ ”اچھا ہوتا کہ تم یہاں نہ آتیں۔۔۔۔۔“

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ تمہیں اندازہ ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ ابونے مداخلت کی۔

”میرا دماغ تو ٹھیک ہے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس گھر کے حالات ابھی ٹھیک نہ رہیں گے اور

میری بچی جو اتنے مان سے اپنے میکے میں آئی ہے، جانے اس کے لیے آگے کیا کیا مصائب منتظر

ہیں۔۔۔۔۔“ والدہ رونے لگیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں والدہ! یہ مصائب بہت چھوٹے ہیں ان مصائب سے جو میں گزشتہ

پانچ چھ برس سے جھیل رہی ہوں۔۔۔۔۔ شاید مجھے ہی محتاط رویہ اپنانا ہو گا۔“ میں نے انہیں تسلی کی۔ تبھی

ثانیہ تیز قدموں سے اندر کی طرف آئی نظر آئی، والدہ نے اپنے آنسو اسے دکھانے سے وہاں

سے اٹھ جانا بہتر سمجھا۔

”خیریت ہے ثانیہ؟“ میں نے پوچھا۔

”جی سب خیریت ہے۔۔۔۔۔ علی کہہ رہے تھے کہ مالی کے لیے اور چوکیدار کے لیے شربت

بنادوں۔۔۔۔۔“ کہتی ہوئی وہ کچن کی طرف چلی۔

”میں بنادیتی ہوں یا خانساں کو کہہ دیتی ہوں!!“ میں نے پیش کش کی۔

”خانساں تو بازار گیا ہوا ہے، وہی بڑے لینے کے لیے۔۔۔۔۔ آپ بیٹھیں ابو کے پاس میں

بنالیتی ہوں۔“ ابونے مجھے اور میں نے ابو کو دیکھا۔۔۔۔۔ یہ بھی ایک نیا رواج قائم ہونے جا رہا

تھا، ورنہ ہر وقت گھر میں وہی بڑے بنا کر فریزر میں رکھے ہوتے تھے اور دس منٹ میں تیار

ہو جاتے ہیں۔ والدہ کے گھر میں بازار کی چیز کھانے کا رواج ہی نہ تھا اور نہ ہی ثانیہ کے گھر میں ایسا

رواج تھا، ان کے لیے تو ایسی عیاشی کا تصور ہی محال تھا۔

تھوڑی دیر میں ثانیہ شیشے کے جگ میں ہلکے گلابی رنگ کا شربت بنا کر نکلی، میری نظر پڑی تو

مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے چینی گھول کر صرف رنگ بنانے کے لیے ہی شربت ڈالا تھا۔ میں نے نظر چرائی، مبادا میرے منہ سے کوئی بات نہ نکل جائے۔ ”ابو.....! ماہا! آپ لوگ لیس گے شربت؟“ میں نے تو انکار کر دیا مگر ابو نے انکار نہ کیا۔

”ابھی تو چائے پی ہے مگر ثانیہ بیٹی کے ہاتھ کا شربت تو ضرور پیئیں گے۔“ اور اس نے خوش ہو کر ابو کو ایک گلاس میں ڈال کر شربت دیا اور باقی شربت لے کر باہر چلی گئی۔ ”ماہا! بیٹا، یہ شربت ذرا اپنی والدہ کو تو دکھاؤ.....“ ابو کے لہجے میں شرارت تھی۔

”رہنے دیں ابو وہ پہلے ہی بہت دکھی ہیں، آپ جان بوجھ کر انہیں تنگ نہ کریں.....“ میں نے کہا، ”ویسے ایک بہت اچھی خبر ہے آپ کے لیے۔“

”کون سی؟“ ابو نے مسکرا کر پوچھا۔

”ٹی وی میں اشتہار میں بتاتے ہیں کہ ایک بوتل سے چوبیس گلاس شربت تیار ہوتا ہے، لیکن آپ کے گھر میں ایک بوتل سے ایک سو چوبیس گلاس شربت تیار ہو جایا کریں گے.....“ اس پر میرا اور ابو کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا اور میں نے شربت کا گلاس اٹھا کر جاکر کچن کے سنک میں بہا دیا۔

میں تو خود اس خیال کی حامی تھی کہ اپنا میکہ جھوڑ کر سسرال آنے والی لڑکی ایک ایسے کمزور پودے کی طرح ہوتی ہے۔ جسے نئی جگہ پر جڑ پکڑنے کے لیے مناسب دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور سسرال والوں کو بھی اپنے رویوں میں پلک رکھنی چاہئے تاکہ بہو کو اپنی سسرال میں قدم جمانے میں سہولت ہو۔ کچھ وہ اپنی منوائی ہے کچھ اسے سسرال والوں کی ماننا پڑتی ہے۔ شروع میں ظاہر ہے کہ ہمیں ثانیہ کے کچھ طور طریقوں پر اعتراض ہو گا یا وہ ہمارے لیے ناقابل قبول ہوں گے، لیکن قدم قدم پر اس کی حوصلہ شکنی کرنے سے بہتر ہے کہ اسے آہستہ آہستہ اپنے نئے گھر کے طور طریقے سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ اچھی لڑکی ہے اور جلد خود کو ہمارے مطابق ڈھال لے گی۔

میں نے والدہ کو بھی یہی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان کا خیال یہ تھا کہ ہمیں خود کو ثانیہ کے مطابق ڈھالنا ہو گا کیونکہ ان کو ثانیہ کے رویے میں بہت کم پلک نظر آ رہی تھی اور ان کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ دوستی اور رشتہ داری میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دوستی میں آپ کو دوستوں کی کوئی

بات بری لگے تو آپ انہیں بتا بھی سکتے ہیں اور اگر ممکن نہ ہو تو کنارہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن رشتہ داری کا معاملہ دوسرا ہے، بعض رشتوں کی نزاکت ایسی ہوتی ہے کہ آپ بتا بھی نہیں سکتے اور کنارہ کیسے کریں..... میں اپنے بھائی کو اور والدہ اور ابو اپنے بیٹے کو کس طرح چھوڑ سکتے تھے؟

میں نے ہرگز جلد بازی میں ثانیہ کو علی بھائی کے لیے پسند نہ کیا تھا، مگر میری نظر اور تجربہ اسے مستقبل کے حوالے سے دیکھ اور جانچ نہ پائے تھے۔ بہر حال ابھی تو آغاز ہی تھا، آگے آگے دیکھنا تھا کہ کیا ہوتا ہے۔

اگلے دن علی بھائی کے ہمراہ میں امی جان کی طرف آئی، مظہر دفتر جا چکا تھا۔ امی جان مجھے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ مجھے ان کو یوں تنہا دیکھ کر دکھ بھی ہوا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر میں نے چائے بھی پی اور اگلے روز کے ڈنر کی ساری منصوبہ بندی بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں سب مہمانوں کو تحائف بھی دینے چاہئیں جو کہ کپڑوں کی صورت میں ہوں۔ لیکن میں نے اختلاف کیا، کیونکہ یہ بہت لمبا چوڑا سلسلہ ہو جاتا۔ ”بہتر ہے کہ آپ دونوں دہنوں کو کچھ نقد رقم سلامی میں دے دیں۔ کپڑے تو ابھی ان کے پاس بہت سے ہوں گے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”یوں تو پھر ان کے پاس پیسے بھی بہت ہوں گے۔“ امی جان نے کہا۔ ”نقد رقم کی نسبت تحفے کی وقعت اس لیے بھی زیادہ ہوتی ہے کہ تحفہ آپ کوشش کر کے خریدتے ہیں اور وہی کوشش ہمارے خلوص کا اظہار ہوتی ہے۔“ امی جان نے کہا۔

”جیسے آپ بہتر سمجھیں۔ پہلے گھر میں دیکھ لیتے ہیں کہ کیا کیا موجود ہے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”گھر میں میں نے چیک کر کے باقی لسٹ بنائی ہے۔ شام میں مظہر آئے گا تو چل کر اس کے مطابق خریداری کر لیں گے۔ یقین کرو اکیلے مجھے سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ کیسے کام کروں۔ اتنی زیادہ عادت ہو گئی ہے تمہارے مشورے کی۔ تمہاری بری حالانکہ میں نے سب اکیلے ہی بنائی تھی، مگر اب تو لگتا ہے کہ میں اکیلے کچھ کر ہی نہیں سکتی۔“

”آپ کی پسند بہت اچھی ہے امی جان، آپ نے میری بری کے تمام جوڑے بہت خوبصورت بنائے تھے۔“ میں نے خلوص دل سے اعتراف کیا۔

”اب تو زندگی میں لگتا ہے کہ خوشیاں ختم ہو گئی ہیں، کوئی بات خوش کرتی ہے نہ کسی خوشی پر مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔“ وہ غمگین ہونے لگیں۔ نماز کا وقت ہو رہا تھا، وہ بھی انھیں اور میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی، کمرہ جوں کا توں تھا۔ صفائی لگ رہا تھا کہ باقاعدگی سے ہوتی ہے۔ یہ کمرہ..... جو میری اور غالب کی محبت بھری ساعتوں کا راز دار تھا، زندگی کے خوبصورت ترین لمحات کی یادوں کا امین..... مجھے لگا کہ غالب بھی اس کمرے میں تھے، اپنی یادوں کی خوشبو کے ساتھ۔ آج تک میری ڈریسنگ ٹیبل پر آدھے حصے میں غالب کے پرفیوم..... آفرشیو، میجر برش اور لوٹن وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ میں سامنے ہی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ کتنے سال تک میں نے اس بات کو محسوس ہی نہ کیا تھا۔ اور وہ سب کچھ وہاں کیوں رکھا تھا؟ شاید اس لیے کہ ابھی تک مجھے یہی امید تھی کہ غالب ابھی کہیں سے آجائیں گے۔ میں کن خوابوں اور سراپوں کی دنیا میں زندہ تھی؟ مجھے حقیقت پسند ہونا چاہئے۔ غالب اب کہیں سے نہ آنے والے تھے۔ میں نے ایک کاغذی تھیلا لیا اور غالب کی یادوں کا ایک ایک نقش سمیٹ کر اس میں رکھ دیا۔

جسم، کہ بن گیا درد کا اک مکان  
کوئی احساس ہے، کہ ہے درد ہے بیکراں  
درد سر میں بھی ہے، درد شانوں میں ہے  
درد ہاتھوں میں ہے، درد بانہوں میں ہے  
درد پہلو سے اٹھ کر جگر تک گیا  
ہر طرف کرب ہے کہ جسم ہی سرد ہے  
پہلے دل تھا جہاں، وہاں فقط درد ہے  
(شیریں حیدر)

مظہر لوٹا تو میں اور امی جان لاؤنج میں ہی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مظہر کے چہرے پر ایک دم مسکراہٹ آ گئی۔

”وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے  
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں“

اس نے ترنم سے کہا۔

”بڑی شاعری شروع ہو گئی ہے، نہ سلام نہ دعا!!“ میں ہنسی۔

”السلام علیکم“ اس نے شرمندگی سے کہا۔

”وعلیکم السلام“ میں نے جواب دیا، ”کیسے ہو؟“

”آپ بتائیں کیا لگ رہا ہوں؟“ وہ مسخرے پن سے بولا۔ ”پورے چوالیس دن کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔“ میں نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ چہرے پر اذلی سادگی اور معصومیت تھی۔

”بڑے دن گئے جاتے ہیں کبھی خیال نہ آیا کہ آکر مل ہی جاتے!“ میں نے شکایت کی۔

”امی جان خود تو ایک دفعہ جا کر آپ کو مل آئیں، ہمیں کبھی کسی نے کہا بھی نہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا کوئی باقاعدہ لائسنس یا اجازت نامہ لے کر وہاں آنا پڑتا ہے؟“

”ارے نہیں بھابی! بس میری سستی کہہ لیں یا مصروفیت۔“ وہ بیٹھ گیا، ”بلقیس آپا! چائے لاویں۔“

”اب اس وقت چائے کیوں پیتے ہو، ایک ہی دفعہ کھانا کھانا!“ امی جان نے کہا۔

”یونہی سر بھاری ہو رہا ہے.....“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”مظہر علی نے ہمارے ہاں سے نوکری چھوڑ دی ہے بھابی!“ مظہر نے مجھے اطلاع دی، ”اپنا

کوئی کاروبار شروع کر رہا ہے۔ ہفتے میں ایک دن ہمارے ہاں آتا ہے کیونکہ میں نے خود اس سے

کہا تھا کہ جب بھی ممکن ہو وہ آتا رہے۔ اصل میں ہمیں ابھی تک اس جیسا سختی آدمی نہیں مل پارہا۔“

”چلو مل جائے گا کوئی نہ کوئی، اشتہار دیتے کوئی کسی بڑے اخبار میں۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”ارے ہاں! اس طرف میرا ذہن ہی نہیں گیا۔“ بلقیس مظہر کے لیے چائے لے آئی تھی۔

”بیٹا! بازار جانا تھا، یا تو جلدی کھانا کھا کر نکل چلتے ہیں یا پھر آکر کھانا کھالیں گے۔“ امی

جان نے کہا۔

”کیا لینا ہے امی جان؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ کپڑے لئے لینا تھے، کل مہمانوں کو تحائف دینے کے لیے۔“ انہوں نے بتایا۔

”اس کے سر میں درد ہے امی جان! میں لے چلتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میں چائے پی کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اس وقت آپ لوگوں کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی چلتے ہیں اور شاپنگ کر کے کھانا بھی باہر سے ہی کھالیں گے۔“ اس نے اپنی پسندیدہ تجویز دی۔

سب لوگوں کے لیے کپڑوں کی شاپنگ ہوئی، اس میں آنٹی سکینہ، مظہر علی اور ثناء بھی شامل تھیں۔ امی جان نے بتایا کہ انہوں نے ماہ رخ کو بھی آنے کو کہہ دیا تھا۔ تحائف ہم نے پیک بھی کروائے، لبلبہ لگوائے اور کام مکمل ہوا تو ہم مظہر کے پسندیدہ ریسٹوران میں کھانا کھانے چلے گئے۔ خوشگوار ماحول میں گپ شپ کرتے ہوئے کھانا کھایا گیا۔ اگلے دن کا مینو تجویز کیا گیا اور وہیں بیٹھے ہوئے اپنے موبائل فون سے مظہر نے کیئرنگ سروس والوں کو فون کر کے فائل مینو بتادیا۔ اس نے باقی انتظامات کی بابت پہلے سے کہہ رکھا تھا۔

اگلا دن انتہائی مصروفیت لیے ہوئے آیا۔ فون پر نگہت اور تیمور سے بھی بات ہوئی۔ یوں تو ان دونوں سے والدہ کی طرف رہتے ہوئے بھی رابطہ تھا۔ دونوں نے ہی اصرار کیا تھا کہ اب میں آئی تھی تو کچھ دن رہوں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اب جلد آتی رہوں گی۔

چھٹی کا دن تھا، ناشتہ بھی کافی دیر سے ہوا کیونکہ مظہر دیر سے اٹھا تھا۔ سچ ہے کہ ہمارے گھروں کا نظام عموماً سرووں کی مصروفیات کے شیڈول کے مطابق ہی چلتا ہے، وہی گھر کا سربراہ ہوتا ہے اور کھانے پینے کے اور دیگر اہم مصروفیات اس کی سہولت کے مطابق ترتیب دی جاتی ہیں۔ بلقیس کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کروائی اور پھر شام کے لیے چٹنیاں اور سلاؤ وغیرہ گھر پر بنائے۔ شام میں ماہ رخ بھی آگئی۔ اس نے پوچھا ضرور کہ اگر کچھ مدد چاہئے ہو تو؟ مگر اس کا قیمتی اور خوبصورت لباس دیکھ کر میں نے اسے کوئی کام نہ کہا۔ خود میں نے کام مکمل کر دیا اور پھر شاور لے کر مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی ایک ہلکے سے کام والے جوڑے کے ساتھ تھوڑا سا میک اپ اور ہلکے زیور پہن کر تیار ہو گئی۔

غالب کی چیزیں میں نے دن کو ہی مظہر کو دے دی تھیں کہ اتنی پرانی ہو چکی تھیں، ممکن ہے استعمال کے قابل ہی نہ ہوں، اس لیے چاہے تو انہیں ضائع کر دے یا کسی کو دے دے۔ اس نے

پرفیوم اسپرے کر کے دیکھے تو ابھی تک ان کی خوشبو قائم تھی۔ ”نا قابل یقین! حیرت انگیز۔“ مظہر حیرت سے چلایا ”ابھی تک ویسی ہی خوشبو آرہی ہے جیسی خوشبو غالب بھائی کے پاس سے آتی تھی..... ذرا سونگھیں بھائی!“ اس نے اپنی کلائی کو میری ناک کے قریب لاکر کہا۔

”واقعی..... اتنے سالوں میں بھی ان کی خوشبو قائم ہے.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ چیزوں کی میعاد کا تعین کیا جاسکتا ہے، انسانوں کا نہیں۔ انسانوں کی بنائی ہوئی مشینوں کی گارنٹی تو دی جاسکتی ہے مگر خود انسان کا اگلے پل کا بھی علم نہیں ہے۔“ وہ آزدہ ہونے لگیں۔

”میں رکھ لوں یہ سب چیزیں اپنے استعمال کے لیے؟“ اس نے مجھ سے اجازت چاہی۔

”ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔

کھانا انتہائی پر تکلف تھا، مظہر نے کوئی کسی قسم کی کسر نہ چھوڑی تھی۔ میں اور ماہ رخ مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، ان کے مشروبات اور کھانے کا خیال کر رہے تھے۔ مظہر بھی مسلسل مصروف نظر آ رہا تھا۔ ایسے میں بار بار آوازیں آرہی تھیں کہ تم لوگ بھی کھانا کھا لو۔ مگر ہم تو میزبان تھے اس لیے بعد میں بھی کھا سکتے تھے۔

کھانے کے بعد بیٹھے کا دور پھر چائے کا دور چلا اور پھر امی جان نے سب کو تحائف دیئے۔ ہر کوئی شاندار کھانے کی تعریف کرتا اور تحائف کا شکریہ ادا کرتا ہوا رخصت ہونے لگا۔ میں بھی چلنے کو تیار تھی کہ امی جان نے اصرار کر کے ایک رات کے لیے روک لیا، کیونکہ ابھی ہم نے کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ تب میں نے ابو سے کہا کہ میں صبح مظہر کے ساتھ نہ آئی تو ناشتے کے بعد مجھے لینے کے لیے گاڑی بھجوا دیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد مظہر نے کھانا گرم کروا کے اندر ڈائننگ ٹیبل پر لگوا دیا۔ کیئرنگ والے باہر اپنا باقی ماندہ سامان سمیٹ رہے تھے۔ مظہر نے سب کے لائے ہوئے تحائف بھی لا کر میز پر رکھ دیئے تھے۔ امی جان کھانا کھا چکی تھیں اس لیے وہ تحائف کھول رہی تھیں، جب کہ ہم تینوں کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ ان پر تبصرہ بھی کر رہے تھے۔

زارا اور نوید صاحب، والدہ اور سکینہ آنٹی..... سب نے علیحدہ علیحدہ امی جان، مظہر، تیمور اور

میرے لیے انہجائی خوبصورت تحائف کا انتخاب کیا تھا۔ مجھے ذرا خفت سی ہوئی۔ ماہ رخ جانے کیا سوچ رہی ہوگی؟ ”لو بھلا! سب لوگ میرے لیے کیوں تحائف لے کر آئے ہیں؟ میں کون سا کوئی یہاں رہ رہی ہوں؟“ اپنی خفت کو مٹانے کو میں نے یوں ہی ایک جملہ کہا۔

”تم یہاں نہ بھی رہو تو سب کو علم ہے کہ تم اس گھر کا فرد ہو۔“ امی جان نے کہا۔

”تم یہاں سے جا کر بھی یہاں موجود ہو ماہا!“ ماہ رخ نے سلگتا ہوا ایک فقرہ اچھالا، میں خاموش رہی۔

زارا اور نوید صاحب کی طرف سے میرے لیے خوبصورت گھڑی، والدہ کی طرف سے ایک پرفیوم سیٹ اور ایک سونے کا بریسلٹ اور سیکنہ آنٹی کی طرف سے بھی قیمتی سوٹ۔ میں نے اپنے تحائف دیکھ کر انہیں ماہ رخ کے آگے رکھا اور اپنی طرف سے غلغلی کی۔ ”ان میں سے جو کچھ تمہیں پسند ہے، وہ تم لے لو۔“

”کیوں میں تم سے بھیک میں تختہ لوں؟“ وہ نخوت سے بولی۔

”خدا نہ کرے! ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ تو تمہیں اپنی طرف سے تحفہ دینا چاہ رہی تھی۔“ میں شرمندہ ہو گئی۔

”بہت شکریہ تمہیں ہم تن گوش ہو گئے،“ کہ میری حیثیت آج میزبان کی تھی یا مہمان کی؟“ اس نے ابرو چڑھا کر پوچھا تو ہم تینوں ہمت نہ کوش ہو گئے، ”کہ میری حیثیت آج میزبان کی تھی یا مہمان کی؟“

”ظاہر ہے کہ آپ میزبان ہیں!“ مظہر نے کہا۔

”اگر میزبان ہوں تو پھر مہمانوں کو علم ہونا چاہئے تھا کہ اس گھر میں کون کون میزبان ہے۔“

بلند آواز سے وہ بولی۔

”ابھی تم اس گھر میں آئی نہیں ہو ماہ رخ اور بطور میزبان میں نے تمہیں خود مدعو کیا تھا۔“ امی جان کے لہجہ میں بھی سختی تھی اور انہیں یقیناً ماہ رخ کے اس لہجہ اور انداز پر بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔

”ارے آنٹی میں تو ماہا سے مذاق کر رہی تھی، آپ خواہ مخواہ سیریس ہو رہی ہیں۔“ اس نے فوراً

جون بدلی۔

”ماہا اس گھر کی بڑی ہے اور اس کے ساتھ کوئی بھی اس طرح کا مذاق کرے، یہ بات مجھے پسند نہیں۔“ امی جان بولیں۔

”مگر ماہامیری کلاس فیلو بھی رہی ہے اور میں عمر میں ماہا سے بڑی ہوں۔“ وہ دودب بولی۔

”بات عمر کی نہیں، مرتبے کی ہو رہی ہے۔ تیور بھی عمر میں ماہا سے بڑا ہے لیکن وہ اس کا احترام کرتا ہے، نگہت اور اعجاز بھی اس کی عزت اور احترام کرتے ہیں۔۔۔۔۔“ امی جان جذباتی ہو رہی تھیں۔ میں کسی بڑے معرکے کے ظہور پذیر ہو جانے سے خوف زدہ تھی۔

”چلتی ہوں میں، بہت دیر ہو گئی ہے۔“ ماہ رخ اٹھی۔

”میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو، اس وقت اکیلی نہ جائیں۔۔۔۔۔“ مظہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں پہلی دفعہ تو اتنی رات گئے اکیلے سفر نہیں کر رہی۔ فکر نہ کرو، میں پہنچ جاؤں گی گھر۔“ اس نے بے تاثر لہجہ میں کہا۔

”پھر بھی بیٹا، مظہر اپنی گاڑی میں علیحدہ ساتھ چلا جاتا ہے اور گھر تک چھوڑ آتا ہے۔ آدھی رات ہو رہی ہے اور کوئی علم نہیں ہوتا کہ گاڑی کو ہی کوئی مسئلہ ہو جائے تو۔۔۔۔۔“ امی جان بولیں، ”چلو اٹھو مظہر اور اپنی گاڑی ماہ رخ کے پیچھے پیچھے لے جا کر اسے گھر چھوڑ آؤ۔“ ان کا انداز جتنی تھا اس لیے مظہر نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور ماہ رخ کے ساتھ چلا گیا۔ میں اور امی جان تہوارہ گئے۔

”جانے اس گھر کا کیا بننے والا ہے؟“ امی جان بولیں۔

”اللہ مالک ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”تم تو یہی کہو گی بیٹا! تمہیں ان تمام حالات کا ادراک نہیں ہے جو مستقبل میں ہمارے ساتھ پیش آنے والے ہیں۔ میں تو اس لڑکی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ابھی سے خوف زدہ ہوں۔“ وہ پریشانی سے بولیں۔ میں اس بات پر مسکرائی تو ان کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”تم ہنس لو، ہنس ہی سکتی ہو، یہ سب کیا دھڑا تمہارا ہی ہے۔“ ان کی اس بات پر پھر ہنسی نکل گئی اور میں انہیں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ یہ سب کیا دھڑا اس تیر نظر کا ہے جس نے تیور کو گھائل کر دیا اور وہ ماہ رخ کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مظہر کی واپسی تک میں اور امی جان جاگتی رہیں اور نگہت کو فون پر ڈنر کی ساری تفصیل سے آگاہ کیا، امی جان نے تو اسے ماہ رخ سے ہونے والی گفتگو بھی من و عن بیان کر دی تھی۔

والدہ کے گھر میں اگرچہ کرنے کو اتنا کچھ خاص نہ ہوتا تھا لیکن ابو اور والدہ سے گپ شپ



لگانے میں ہی وقت گزرنے کا ادراک تک نہ ہوتا تھا۔ ثانیہ نے اب آہستہ آہستہ گھر میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا شروع کر دیا تھا۔ گھر کا سودا سلف لانے کی ذمہ داری پہلے بھی علی بھائی والدہ کے ساتھ جا کر سرانجام دیتے تھے، اب والدہ نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ثانیہ کے ساتھ جا کر خریداری کریں۔ اور پہلی دفعہ ہی جب ثانیہ خریداری کر کے آئی تو دل ہی دل میں والدہ نے سوچا ہوگا کہ اپنا سر تمام لیں، مگر بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

جس سپر مارکیٹ سے والدہ ہمیشہ اچھی کوالٹی اور بہترین برانڈ کی اشیاء کی خریداری کرتی تھیں وہیں سے ثانیہ نے تمام اشیاء بلکی بلکہ گھٹیا ترین کوالٹی کی خریدی تھیں۔ کھلے مصالحے اور کھلی دالیں..... جن کی قیمتیں کم تھیں مگر معیار بہت گھٹیا تھا۔ ”بیٹا پیکٹوں کے مصالحے اور دالیں خرید کر لاتیں؟“ والدہ نے آہستگی سے احتجاج کیا۔

”امی وہ تو اتنی مہنگی پڑتی ہیں..... دیکھ لیں لسٹ کے مطابق سارے سووے لے آئے ہیں؟ اور علی کہہ رہے تھے کہ اتنے ہی سووے آپ اس سے دوگنی قیمت میں لاتی تھیں.....“ اتر کر ثانیہ نے اپنی کارکردگی دکھائی۔

”بیٹا کھلے مصالحے ناقص اور دالیں وغیرہ بھی غیر معیاری ہوتی ہیں۔ جب کھول کر دیکھو گی تو ہر دال میں سے آدھا پاؤ کنکر اور پتھر نکلیں گے۔“

”ہم نے تو ہمیشہ کھلی دالیں اور مصالحے ہی استعمال کیے ہیں۔ پیکٹوں میں بند دالیں صاف شدہ اور مہنگی ہوتی ہیں اور جو عورتیں محنت سے جی چراتی ہیں وہ ایسی مہنگی خریداری کر کے مہنگائی میں اضافے کا سبب بنتی ہیں ورنہ دال میں سے چند پتھر چن کر صاف کر لیا جائے تو وہ پیکٹ والی دال جیسی ہی ہو جاتی ہے۔“ ثانیہ نے اپنی دانست میں عقلمندی کی بات کی تھی لیکن وہ والدہ پر صاف چوٹ کھگتی تھی۔

”امی جان! آپ سووے چیک کر لیں، اگر کوئی چیز ناقص یا غیر معیاری ہے تو میں تبدیل کر کے لے آتا ہوں۔“ علی بھائی نے بات کا رخ بدلا۔

”رہنے دو بیٹا! ٹھیک ہے اتم نے خود ہی کہا کہ میں دو گنے دام دے کر خریداری کرتی ہوں تو پھر مزید بے وقوفی نہ کی جائے تو بہتر ہے۔“ والدہ مجبوراً بول اٹھیں۔ ماحول پر بوجھل پن سا طاری ہو گیا۔ ”چلو ثانیہ ہم ساری چیزیں سنبھال لیں۔“ میں نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی خاطر کہا۔

باورچی خانے میں جا کر ثانیہ نے ہر چیز کو احساس ملکیت کے ساتھ سیٹنا شروع کر دیا۔ سارے سووے سنبھال چکی تو ماش کی دال نکال کر صاف کرنے بیٹھ گئی۔

”آج میں امی جان کا یہ خیال غلط ثابت کر دوں گی کہ کھلی دالیں ناقص ہوتی ہیں۔“

”ثانیہ! والدہ تمہاری بزرگ ہیں، ماں جیسی ہیں اور اگر انہوں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا ہے تو لازم نہیں کہ تم اسے غلط ثابت کرنے بیٹھ جاؤ.....“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”وہ بھی تو ہر بات میں مجھے غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔“ وہ ٹھنکی۔

”اس طرح مقابلہ بازی شروع ہو گئی تو ساس اور بہو کی ازلی رقابت شروع ہو جائے گی۔“

والدہ بہت فہم و فراست والی ہیں اور انہوں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں کہ تمہارے کیے ہوئے غلط کام کو غلط کہہ کر وہ تمہاری ہتک کریں۔ اسی طرح سمجھاتی ہیں جیسے ہمیں سمجھاتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جہاں ساس اور بہو ہوتی ہیں وہاں ازلی رقابت تو ہوتی ہے۔ وہ میرے ہر کام کو غلط ثابت کر کے مجھے علی کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”علی بھائی ان کے ایک ہی بیٹے ہیں اور تم ان کی اکلوتی بہو ہو۔ ایسا وہ کیوں کریں گی۔ وہ تو ہم بہنوں کو بھی یہی کہتی ہیں کہ تمہاری عزت بڑی اور اکلوتی بھالوج کی طرح کریں.....“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ماہا! آپ کے تو ہمارے اوپر بہت احسانات ہیں اور اس بوجھ کی وجہ سے میں تو آپ کے سامنے کبھی بول ہی نہیں سکتی اور آپ سب میری عزت اس لیے کرتے ہیں کہ میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ امی جان جس طرح بے عزتی کر دیتی ہیں اس طرح تو ہماری اپنی امی نے بھی نہیں کی۔ میں نے تو اس گھر کو اپنا گھر سمجھنا شروع کر دیا ہے مگر امی جان مجھے اس گھر کا فرد سمجھنے کو تیار نہیں ہیں۔“ وہ اٹھ کر دال بھگونے لگی۔ میں نے سب کے لیے چائے بنائی اور ساتھ بسکٹ رکھے، ثانیہ کو بھی سمجھایا، والدہ کی علالت کے بارے میں بتایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسکرا کر چائے کی ٹرے اٹھا کر چل پڑی، ”آئیں ماہا سب اکٹھے چائے پیتے ہیں۔“ چائے پینے کے دوران وہ والدہ کے ساتھ مسکرا کر بات چیت بھی کرتی رہی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بعد ازاں جب ثانیہ کچن میں کھانا بنانے کے لیے گئی تو میں نے باتوں ہی باتوں میں والدہ سے کہا کہ وہ ثانیہ کو سب کے سامنے کچھ نہ کہا کریں۔

”اور اگر اکیلے میں کچھ کہہ دوں گی تو ایک ایک بات کو سو روگ وے گی۔“ والدہ نے کہا۔  
 ”آپ کچھ عرصہ برداشت کریں، اسے سمجھ لینے دیں اور پھر آہستہ آہستہ سمجھائیں اور یوں بھی اس پر سے اس کے میکے کے اثرات زائل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“ میں نے کہا۔  
 ”ہم زائل ہو جائیں گے بیٹا مگر لڑکیوں پر سے ان کے میکے کے رنگ کبھی زائل نہیں ہوتے۔  
 اور پھر ثانیہ جس کے لیے ہر اتوار کو میکے کی حاضری بھی فرض ہے، یہی تو نقصان ہے ایک شہر میں میکہ اور سرال ہونے کا۔“ والدہ سخت غصے میں لگ رہی تھیں۔  
 ”ابھی نیا نیا شوق ہے، گھر کی ذمہ داریوں میں اور بچوں میں الجھ کر خود ہی اس کو وقت نہ ملے گا۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

اور پھر سب سے دلچسپ بات تب ہوئی جب ثانیہ کی اتنی محنت سے اور اتنی ذائقے دار بنی ہوئی دال میں سے قریباً ہر ایک کے منہ سے پتھر اور کنکر برآمد ہوئے، اور جب علی بھائی کے منہ سے زور سے آواز آئی اور وہ اپنا ہاتھ گال پر رکھ کر سامنے کی طرف جھکے تو ہم سب کی نظریں پریشانی سے ان کی طرف اٹھیں..... بھاگ کر انہوں نے نوالہ باہر پھینکا اور کلی کر کے دیکھا تو ان کے ایک دانت کا کونہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اور دانت ٹوٹنا تو یوں بھی نفسیاتی طور پر بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ جو دانت ٹوٹ جائے وہ کبھی اصلی دانت جیسا نہیں بن سکتا۔  
 ”جب میں نے کہا تھا کہ میں سودے تبدیل کر لاتا ہوں تو تم نے دیئے کیوں نہیں مجھے؟ کیوں ہم سب کو پتھر کھلا کر دانت توڑنے ہیں یا ہمارے گردوں میں پتھری کروانی ہے۔“ علی بھائی انتہائی غصے سے بولے تو ثانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔  
 ”آرام سے اور تحمل سے بات کرو.....“ والدہ نے علی بھائی کو ٹوکا، ”یہ کیا طریقہ ہے بیوی سے بات کرنے کا۔“

”آپ نے بتایا بھی تھا کہ کھلی دالیں صاف نہیں ہوتیں تو کم از کم پکانے سے پہلے انہیں صاف کر لیتی۔“ علی بھائی کا غصہ اپنا دانت ٹوٹنے کے باعث ٹھنڈا ہی نہ ہو رہا تھا۔  
 ”میں نے بہت اچھی طرح دال صاف کی تھی۔“ ثانیہ آہستگی سے بولی۔  
 ”برخوردار تم یہ دیکھو کہ جو پتھر دال میں ملاوٹ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں وہ رنگ، سائز اور ساخت میں بالکل دال جیسے ہیں.....“ ابو نے اپنی پلیٹ میں رکھا ہوا پتھر علی بھائی کو دکھانا

چاہا، مگر وہ کھانا اذھورا چھوڑ کر اٹھ کر چلے گئے، ہم باقی سب لوگ خاموشی سے بیٹھے رہ گئے۔

تیور کا پروموشن بھی ہوا تھا اور اس کا سیالکوٹ میں تبادلہ بھی۔ اس خوش خبری پر میں اور والدہ تو فوراً ہی امی جان کی طرف جانا چاہتے تھے لیکن ابو کی گاڑی خراب تھی۔ علی بھائی کو کال کر کے گاڑی مانگی تو انہوں نے بتایا کہ گاڑی وہ گھر بھجوا چکے تھے مگر اس پر ثانیہ کو زارا کی طرف جانا تھا۔ اب زارا کا گھر تو بالکل ہی مخالف سمت میں تھا اس لیے ہم ثانیہ سے لفٹ بھی نہ لے سکتے تھے۔ ناچار شام تک علی بھائی کے آنے کا انتظار کرنا پڑا۔ میں نے امی جان کو فون کیا مبارک باد دی۔

”میں اور والدہ تو ابھی آنا چاہ رہے تھے لیکن علی بھائی سے بات ہوئی تو وہ کہہ رہے تھے کہ شام کو چلیں گے کیونکہ وہ بھی آنا چاہ رہے تھے۔“ میں نے بہانہ گھڑا۔  
 ”تو تم اور بہن جی ابھی آ جاؤ، اچھا ہے بہن جی شام تک میرے پاس وقت گزار لیں گی..... اور تم رہنے کے لیے آنا۔“ انہوں نے اصرار کیا۔

”وہ ابو کی گاڑی بھی خراب ہے۔“  
 ”تو میں منظر سے کہتی ہوں کہ گاڑی بھجوا دے.....“ امی جان نے کہا۔  
 ”ارے نہیں امی جان، بہت شکریہ!“ میں نے کہا، ”شام کو آئیں گے انشاء اللہ۔“  
 اور جب شام کو علی بھائی کو بتایا کہ ہم سب کو وہاں جانا ہے تو انہوں نے لاپرواہی سے کہا کہ انہیں زارا کی طرف جانا تھا، وہاں سے ان چاروں کا باہر کھانا کھانے کا پروگرام تھا۔  
 ”ان کے گھر کی یہ بہت بڑی خوشی ہے علی..... اور پھر ماہانہ ان سے کہا بھی تھا کہ تم بھی آنا چاہتے ہو اس لیے ہم شام کو آئیں گے۔“ والدہ نے علی بھائی سے اصرار کیا۔

”ماہا کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر میرے بارے میں کوئی بھی مصروفیت طے کرتے وقت کم از کم مجھ سے پوچھ لیا کریں.....“ علی بھائی کی بات پر میں سن ہو کر رہ گئی۔  
 ”چلو آئندہ خیال رکھیں گے، آج تم ہمیں چھوڑتے ہوئے چلے جاؤ، ذرا سی دیر ہی ہو جائے گی ناں تمہیں..... فون کر کے ثانیہ کو بتا دو۔“ والدہ نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔  
 ”امی جان! وہ ماہا کی سابقہ سرال ہے اور اس کی اہمیت تبھی تک تھی جب تک ماہا وہاں تھی۔“

وقت سونے کا معمول ہے اس لیے.....“ میں نے فوراً کہا۔

بلقیس تو جا چکی تھی، چائے وغیرہ بنانے کے لیے مظہر خود ہی کچن میں گیا تو میں اس کی مدد کے خیال سے اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئی۔ اسے کہا بھی کہ وہ بیٹھے میں چائے بنا لوں گی مگر اس نے ضد کر کے مجھے باہر نکال دیا کہ میں مہمان تھی۔ مجبوراً میں آ کر والدہ اور امی جان کے پاس ہی بیٹھ گئی اور ہم کپ شپ لگانے لگے۔

اور جب رات دیر گئے علی بھائی اور ثانیہ آئے تو میری اور والدہ کی حالت دیدنی تھی۔ علی بھائی اور ثانیہ کے انداز میں بہت گرجوٹی اور اپنائیت تھی۔ نہ صرف وہ ایک اچھے بڑے ہوٹل کی بیکری کا مہنگا سا کیک لے کر آئے تھے بلکہ لیٹ ہو جانے پر معذرت خواہ بھی تھے اور جھوٹ بھی پنپ گیا تھا، لیکن کچھ تھا عجیب!! کیا بات؟ یہ احساس ایک میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا تھا.....

”کیا ثانیہ بہت خوش تھی اس روز؟“ ”مگر کس بات پر؟“ خود ہی دماغ سے میں سوال اٹھاتی رہی اور لا جواب ہو جاتی۔ اور جب علی بھائی، والدہ اور ثانیہ روانہ ہوئے تو اس کے بعد امی جان اور مظہر ثانیہ کے بہترین اطوار، انداز گفتگو اور خوش گفتاری کے قائل ہو چکے تھے۔ ”شاید یہی اس کا مقصد تھا؟“ میں نے دل میں سوچا..... ”مگر کیوں؟“ اس کا جواب پھر نہ پایا۔

دودن رہ کر جب میں نے والدہ کی طرف روانگی کا قصد کیا تو امی جان منت سماجت کرنے لگیں کہ دو ایک روز اور رُک جاؤں کیونکہ تیور بھی آنے والا تھا۔ تب میں نے کال کر کے والدہ کو بتا دیا کہ میں مزید دودن رہوں گی۔ امی جان اس بات پر دل سے میری ممنون ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ بیچاری دن بھر اکیلی گھر میں بور ہوتی رہتی تھیں۔

ماہ رخ کے گھر والوں نے ابھی تک صرف فون پر مبارکباد دی تھی۔ امی جان حیران تھیں کہ وہ خود آئے نہ تھے حالانکہ تیور کے پروموشن کی خبر ان کے لیے بھی اتنی ہی اہم تھی، ماہ رخ کا منگیتر ہونے کے حوالے سے۔ ”کہیں ایسا تو نہیں امی جان کہ وہ یہ توقع کر رہے ہوں کہ ہم انہیں مبارکباد دینے کیلئے جائیں؟“ مظہر بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔

”دماغ تو درست ہے تمہارا میاں؟ میرے بیٹے کی ترقی ہوئی ہے۔“ امی جان ٹھنکیں۔

اب ماہیہاں ہے، اس لیے اس کی سسرال کو غیر ضروری اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے..... اور آپ کو ذرا سی دیر لگتی ہے، مجھے سب سے بری عادت لگتی ہے، وقت پر نہ پہنچنا.....“ علی بھائی کا لہجہ نکلی لیے ہوئے تھا، ”تاہم تیار ہو جائیں آپ..... جلدی!“

والدہ نے خاموشی سے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا..... اور کچھ نہ بولیں..... راستے میں علی بھائی نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اندر نہ جائیں گے اور یہ کہ والدہ واپسی پر اپنا کوئی اور بندوبست کر لیں، کیونکہ انہیں دیر ہو سکتی ہے۔

”بیٹا! جتنی بھی دیر ہو جائے، واپسی پر مجھے لے لینا..... ابھی تم جلدی میں ہو، واپسی پر کھڑے کھڑے تم اور ثانیہ بھی مبارک باد دے دینا۔ بیٹا، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ ان کے گھر سے مجھے کوئی چھوڑنے کو جائے، تمہارے ابو کی گاڑی ٹھیک ہوتی تو میں کبھی تمہیں مجبور نہ کرتی۔“ والدہ کے لہجے میں اتنی بلجاعت تھی کہ میرا دل بھی پسج گیا۔

بیٹا پھر بیٹا نہیں رہتا!! ماں جو ایک سنے کو آنکھوں میں بسائے، بیٹا پروان چڑھاتی ہے..... اسے سکھاتی ہے، کھلاتی ہے، گدگداتی ہے، ہنساتی ہے، بڑا آدمی بنانے کو اسے پڑھاتی ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو ارماں آنکھوں میں بساتی ہے اور اس کے لیے دنیا کی سب سے خوبصورت اور دلنشین لڑکی بہو بنا کر لاتی ہے۔ بیٹا پھر بہو کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے شوہر بنتا ہے تو کیا بیٹا نہیں رہتا؟

راستے میں رک کر مٹھائی یا کیک بھی نہ لے سکے کہ علی بھائی کے پاس وقت نہ تھا، اس خاص موقع پر خالی ہاتھ جانے کا تصور ہی والدہ کے لیے تکلیف دہ تھا۔ تاہم میں نے وہاں پہنچتے ہی بات کو سنبھالا دیا۔ ”سوری امی جان! والدہ تو مٹھائی یا کیک لانا چاہ رہی تھیں، مگر میں نے ہی منع کر دیا کہ یہاں کوئی بھی زیادہ بیٹھا کھانے والا نہیں ہے اس لیے بعد میں کسی وقت نمکین لے کر آجائیں۔“

”اچھا کیا بیٹا منع کر دیا۔ تمہیں تو خیر سب علم ہے۔ مگر علی بیٹا کہاں ہے اور بھائی صاحب کیوں نہیں آئے؟“ امی جان نے پوچھا۔

”علی بھائی تو آئیں گے تھوڑی دیر میں، ثانیہ کو لینے گئے ہیں زارا کی طرف سے اور ابو کا اس

”ان کا داماد بھی تو ہے.....“ مظہر نے تکرار کی۔

”ابھی تک صرف میرا بیٹا ہے وہ، داماد ان کا ابھی بنا نہیں۔ شادی ہوگی تو دیکھا جائے گا۔“

”امی جان! مظہر مذاق کر رہا ہے۔“ میں نے ان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”اگر ایسی کسی امید پر وہ بیٹھے ہیں تو بھلے اپنی بیٹی کو بھی گھر بٹھا کر رکھیں۔ نہ میں ان کی بیٹی بیاہ

کر لاؤں گی اور نہ ہی وہ میرے بیٹے پر قابض ہوں.....“ امی جان نے غصے سے کہا۔

”کون آپ کے بیٹے پر قابض ہونا چاہ رہا ہے؟“ مظہر نے کہا۔

”اس کی سرال والے.....“ امی جان نے کہا..... ”لیکن مجھے اپنے بیٹے پر پورا اعتماد ہے۔“

”خدا آپ کے اعتماد کو قائم رکھے۔“ میں نے دل میں سوچا۔ ”میں ان دنوں والدہ کی

امیدوں کی وہجیاں اڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور مجھے مستقبل میں یہی نقشہ امی جان کے گھر کا بھی

نظر آ رہا تھا..... ”اللہ ماہ رخ کو ہدایت دے اور وہ امی جان کی اس جہد مسلسل کا احساس کرے جو

انہوں نے اپنی اولادوں کو پروان چڑھانے میں کی تھی۔“ میں نے ول سے وعاک کی۔

حیرت انگیز طور پر تیسوڑا گلے ہی روز شام کو اپنے ساز و سامان سمیت آن پہنچا اور گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز طور پر عین شام کی چائے کے بعد ماہ رخ کے اہل خانہ بھی مبارک باد کے لیے آن پہنچے۔ یقیناً ماہ رخ کو تیسوڑے پروگرام کا علم تھا اور اسی کے مطابق انہوں نے اپنا بھی آنے کا پروگرام ترتیب دے رکھا تھا۔

اور جس وقت وہ پہنچے تھے وہ شام کی چائے کا تو تھا نہیں..... میں نے مظہر کو کچن میں بلا کر فرج اور فریزر چیک کیے، لیکن ہنگامی حالات کے لیے اتنی زیادہ مہمانداری کا سامان موجود نہ تھا۔ سو میں نے مظہر کو دوڑایا کہ وہ پکا پکا یا کھانا لے آئے، کیونکہ وقت اتنا ہو چکا تھا کہ فریزر سے مرغی وغیرہ نکال کر پکانے بیٹھتی تو بہت دیر ہو جاتی اور یوں بھی یہ صرف تیسوڑے کی سرال تو نہ تھی، بگھٹ کی سرال بھی تھی اور اس لحاظ سے ان کی کافی زیادہ خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ مظہر کافی پر تکلف کھانا لے کر آ گیا تھا، بلیقیں کو میں نے روک لیا تھا، اس نے جلدی سے آٹا گوندھ کر روٹیاں بنانا شروع کیں اور میں نے مظہر کی مدد سے کھانا میز پر چن دیا۔ انتہائی بے تکلف ماحول میں سب نے

جی بھر کر اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

ماہ رخ پورے استحقاق سے تیسوڑے کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھی۔ کھانے کے بعد آئس کریم پیش کی گئی اور پھر سب لوگ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ماہ رخ اور ستارہ کو ان کی امی نے وہاں سے اٹھ جانے کو کہا تو وہ دونوں ٹی وی لائونج میں چلی گئیں۔

”بہن جی!“ ماہ رخ کی والدہ گویا ہوئیں، ”ماہ رخ پچیس ویں سال میں قدم رکھ چکی ہے۔“

آپ کی بیٹی بمشکل بائیس برس کی ہوئی تھی تو ہمارے بیٹے نے رخصتی کی جلدی ڈال دی تھی، ابھی

غالب بیٹے کی وفات کو بھی بہت زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا، اور میں جانتی ہوں کہ جب بیٹے، تھیلی پر یوں

سرسوں جمانا چاہتے ہیں تو اصل میں اس کے پس منظر میں کسی اور کی بیتابیاں کا رفرما ہوتی ہیں.....“

آئی کو اندازہ ہی نہ ہو رہا تھا کہ ان کے الفاظ تھے یا خنجر اور تلوار۔ امی جان بالکل بت کی طرح

ساکت تھیں۔

”میری ماہ رخ تو بہت مختلف قسم کی بچی ہے، اپنے منہ سے بول کر تو نہیں کہہ سکتی، مگر میں ماں

ہوں اور مجھے اندازہ ہے کہ وہ پچیسویں برس میں لگ گئی ہے اور اس سے چھوٹی بھی اب بائیسویں

برس میں لگ گئی ہے۔ اب تو اس کی بھی شادی کی عمر آ گئی ہے، مگر آپ لوگوں کو معافی کر کے شادی کی

فکر ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ہر ماں کو اولاد کی کمائی کھانے کا شوق ہوتا ہے مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ

ہمارے سر پر بھی فرض کی تلوار لٹک رہی ہے۔“ آئی نے مزید تیر چلائے۔

”بیٹے کی کمائی میں کیا کھاؤں گی، اس بے چارے کی تنخواہ تو اس کے اپنے لیے بھی ناکافی

ہوتی ہے۔ ہر ماہ اس کے اخراجات کے لیے اضافی رقم گھر سے جاتی ہے.....“ امی جان تھل سے

بولیں، ”رہی بات شادی کی تو شادی ہم آج کرنے کو تیار ہیں، مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ابھی

ایک سال تک تیسوڑے کو گھر نہ مل سکے گا۔ ابھی وہ پچیس برس کا ہوا ہے ماشا اللہ اور اس کو چھبیس برس کی

عمر سے شادی شدہ افسران کی مراعات ملنا شروع ہوں گی۔ اب فوج کے قاعدے اور قانون تو ہم

نہیں بدل سکتے۔“

”تو کیا اس گھر میں ماہ رخ کے رہنے کے لیے جگہ نہ ہوگی؟ ماہا تو بیوہ ہو کر بھی پانچ چھ برس

بہیں رہی اور ماہ رخ کے لیے آپ کی سوچ مختلف کیوں ہے؟“ آئی کی اس بات پر ہم سب چیخ و

تاب کھا کر رہ گئے۔

”آئی پلیز!“ تیمور بولا..... ”آپ اپنی اور ماہ رخ کی بات کریں..... آپ نے میری بہن کے بارے میں تو کہہ دیا ہے لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھ پر بھی آپ کی بیٹی کی طرف سے کافی پریشر ہے جو کہ اس بات سے مشروط ہے کہ اسے میرے ساتھ ہی رہنا ہے اور میں معذرت کے ساتھ بتا دوں کہ میں کراپے پر گھر لے کر اسے نہیں رکھ سکتا۔“

تیمور کی اس بات پر ماہ رخ کے بھائی امتیاز اور شہباز بل کھا کر رہ گئے مگر ان کے والد نے ان کو بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ”آپ لوگ خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہیں..... جہاں اتنا وقت گزر گیا، وہاں ایک سال اور گزر جائے گا.....“

”میوور بنا! اگر تمہیں ماہ رخ کی اتنی سی شرط بھی قبول نہیں بیٹا تو اس کو اس کمزور سے بندھن سے آزاد کر دو۔ کم از کم میں تو اس طویل انتظار سے تنگ آگئی ہوں۔“ آئی پلیز لہجے میں اور عجیب سی بات کر رہی تھیں۔

”بس اب چپ رہو تم..... زیادہ فالتو باتیں مت کرو۔“ ماہ رخ کے والد بولے..... ”آپ اپنے گھر میں بات کر کے مناسب تاریخ کا تعین کر کے ہمیں بتا دیں بہن جی! میرا خیال ہے کہ اب شادی کر ہی دی جائے کیونکہ غیر ضروری طوالت، منگنی جیسے کمزور بندھن کو مزید کمزور کر دیتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ امی جان نے آہستگی سے صرف اتنا ہی کہا۔ اس گھر میں بیٹی نہ ہوتی تو اس وقت ان کی اس جرأت اور بے باکی پر تیمور انگوٹھی اتار کر ان کے منہ پر دے مارتا یا مظہر جذباتی ہو کر کچھ کہہ دیتا، اور تو اور مجھ سے آئی کا انداز برداشت نہ ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آگئی جہاں ماہ رخ اور ستارہ کسی فیشن شو کو دیکھتے ہوئے اس پر دلچسپ تبصرہ کر رہی تھیں، یہ جانے بغیر کہ ڈرائنگ روم میں کیسا طوفان برپا تھا۔

مہمانوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب یوں لاؤنج میں بیٹھے تھے جیسے کوئی مرگ ہوگئی ہو، خاموش اور پریشان۔ ”میں تو بہت الجھن میں ہوں.....“ تیمور بولا، ”اور یقین کریں کہ دل چاہ رہا تھا کہ انگوٹھی اتار کر آئی کے ہاتھ پر رکھ دوں.....“

”تمہارے ہی جنون کا کیا دھرا ہے یہ سب، جو تم پر عشق بن کر سوار ہو گیا تھا۔“ امی جان بولیں۔

”پلیز امی جان!!“ میں نے کہا۔

”کب میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے؟“ تیمور بلند آواز سے بولا۔

”مجھے نہیں تو جس کو بتایا تھا، اس نے تمہاری منزل آسان کر دی۔“ امی جان غصے سے بولیں۔

”پلیز امی جان!“ اب کے مظہر نے ان کو کندھوں سے تھاما۔

”دیکھ لینا تم لوگ..... اس گھر میں وہ تماشے ہوں گے جو آج تک چشم فلک نے بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ آج تیمور نے میرے آگے آواز بلند کی ہے، کل کو وہ آکر اس گھر میں اس سے بڑھ کر چیخے گی، اس سے بڑھ کر تماشے کرے گی۔“

”تو مت لائیں اس کو..... منگنی توڑ دیں.....“ تیمور چیخا۔

”تاکہ وہ بدلے میں تیری بہن کو دو بچوں سمیت طلاق دے کر بھجوا دیں۔“ امی جان بولیں،

”یہی چاہتے ہو تم؟ تم نے تو میرے وجود میں بے بسی بھری ہے۔“ امی جان رونے لگیں۔

”پلیز تیمور چپ کرو، تم ہی خاموش ہو جاؤ..... ایسی کون سی بڑی قیامت آگئی ہے۔ کوئی ناجائز مطالبہ نہیں کیا ہے ماہ رخ کی امی نے۔ ماہ رخ اب پیچس کی ہو رہی ہے..... اور آئی کون سا پڑھی لکھی ہیں جو انہیں علم ہو کہ بات کس طرح کرنی ہے.....“

”تعلیم حاصل نہ کرنے کا یہ مطلب تو نہیں بھابی کہ انہیں تمیز بھی نہ ہو۔“ تیمور جھنجھلایا۔

”پلیز تیمور! تم اس طرح بات بڑھاؤ گے تو تمہاری کئی زندگی کا آغاز ہی بد مزگی سے ہوگا۔“ میں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

ہم تو کیا سوچتے اور کیا فیصلہ کرتے کہ اگلے ہی روز نگہت اور اعجاز کی کال آگئی، وہ دونوں تین ماہ کے بعد پاکستان آرہے تھے، دو ماہ کے لیے اور ان کا اس دفعہ آنے کا ارادہ اسی لیے تھا کہ ماہ رخ کی شادی اور ستارہ کی منگنی کر کے جائیں۔ میں نے امی جان کو بھی سمجھایا بچھایا اور تیمور کو بھی۔ دسمبر میں ٹھیک ٹھاک سردی ہوتی ہے، مگر چونکہ نگہت اور اعجاز کو چھٹی ہی اس حساب سے مل رہی تھی اس لیے مجبوری تھی اور دوسرے ماہ رخ کی سالگرہ بھی دسمبر میں ہوتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ اس کی سالگرہ کے دن ہی اس کی شادی ہو۔ تیمور اس مطالبے پر بہت جزبہز ہوا لیکن جب دسمبر میں شادی ہونا ہی تھی تو اس بات سے کیا فرق پڑتا تھا کہ کون سی تاریخ ہو!

امی جان تو چاہتی تھیں کہ میں اب وہیں رہوں کہ تین ماہ گزرنے کا علم بھی نہ ہو گا اور یوں بھی شادی کی تیاری میں چھوٹے بڑے ہزاروں کام ہوتے ہیں جو ان کے بس کا روگ نہ تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں آتی ہوں گی اور کام بھی ہو جائیں گے۔ اب ایک دفعہ والدہ کی طرف اٹھ آئی تھی تو وہیں دل لگانے کے لیے کوشاں تھی۔

والدہ نے دو ایک رشتہ کرانے والیوں سے بھی میری بابت کہہ رکھا تھا، جن کا گھر میں مستقل پھیرا لگتا ہی رہتا تھا اور ہر دفعہ وہ کوئی بخشش یا انعام بغیر کوئی کارنامہ سرانجام دیئے لے جاتی تھیں۔ زیادہ تر ان کے پاس رشتے رندوؤں اور بچوں والوں کے تھے جن کی عمریں بھی چالیس سال سے تجاوز کر چکی تھیں۔ والدہ اور ہر دفعہ ایسے کسی رشتے کی تفصیل جان کر وہی ہو جاتی تھیں۔ ان کی یہ بھی کوشش ہوتی تھی کہ یہ تمام کارروائی فی الحال ثانیہ سے پوشیدہ رہے، تب تک جب تک کوئی رشتہ پسند نہ آجائے، اسی لیے زیادہ تر ایسے کام اتوار کو ہی انجام دیئے جاتے۔

میں نے بارہا والدہ کو سمجھایا، ایسے موقع پر کہ جب وہ کسی ایسے رشتے کا سن کر دلگیر ہو جاتیں کہ میں بھی تو بیوہ تھی اور اس ”کینگری“ کی عورتوں کے لیے ایسے رشتوں کی آمد بعید از امکان نہیں ہوتی۔ مگر کوئی مجھے میری والدہ کی نظر سے دیکھ پاتا تو اسے اندازہ ہوتا کہ وہ میرے لیے کیا چاہتی تھیں۔ ان کی نظر میں ابھی بھی کسی دور وریس سے کوئی شہزادہ آنے والا تھا جو ان کی شہزادیوں جیسی بیٹی کے دکھ اپنی انگلیوں کی پوروں سے سمیٹ لینے والا تھا۔ مگر زندگی از خود اتنی تلخ حقیقت ہے اور اس میں ہر لمحہ ہمیں تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

والدہ نے ہی مجھے بتایا کہ ثانیہ نے ان سے دو ایک دفعہ اس کی بابت پوچھا تھا کہ کیا ان کا کوئی ارادہ تھا میری شادی کی بابت یا نہیں، اور والدہ نے اسے بتایا تھا کہ اس بات کا فیصلہ کلی طور پر ماہا کے اختیار میں ہے کہ وہ جو چاہے اپنے لیے فیصلہ کرے۔ شاید ثانیہ شادی سے قبل یہ جانتی تھی کہ والدہ کے گھر میں تین افراد ہیں اور چوتھا فرد وہ ہوگی۔ میں نے بھی ایسے وقت والدہ کے پاس آنے کا فیصلہ کیا تھا جب وہ توقع بھی نہ کر رہی ہوگی۔

لاکھ میرا وجود بے ضرر رہی، لیکن گھر میں ایک اضافی فرد تو میں تھی ہی کہ جس سے ابو اور والدہ کو بھی بے حد پیار اور انیسیت تھی اور علی بھائی کو بھی یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصے سے میں خود ہی علی بھائی کے رویے میں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن خود کو یہی کہہ کر سمجھاتی تھی کہ ان کی نئی شادی

ہوئی ہے، اس وقت ان کی پہلی ذمہ داری ثانیہ ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ان کی شریک حیات ہے، جس کے وجود سے ان کو راحت ملتی ہے، اس کی ناز برداری تو وہ کریں گے ہی۔ میں نے کبھی اس سے پہلے بھی زندگی میں کسی سے زیادہ توقعات وابستہ نہ کی تھیں۔

اللہ کا شکر ادا کرتی تھی کہ اس نے مجھے ہمیشہ اس مقام پر رکھا کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے میں ان کا خیال رکھ سکوں۔ بجائے دوسروں سے لینے کے میں نے ہمیشہ دیا ہی تھا۔ اپنے کام دوسروں سے کرانے کی بجائے یہی کوشش کرتی تھی کہ اپنا کام بھی خود کروں اور دوسروں کے لیے بھی حتی الامکان مددگار ثابت ہو سکوں۔ لیکن زندگی کس موڑ پر کیا رخ اختیار کرتی ہے، کس موسم میں حالات کیسے بدلتے ہیں، یہ سب میرے لیے نیا نہ تھا۔ مجھے تو زندگی میں گزشتہ چھ برسوں میں کئی اتار چڑھاؤ کی سمجھ آگئی تھی۔

زارا اور ثانیہ دونوں امید سے تھیں۔ زارا ہمارے ہاں آئی تو مجھے اس کے چہرے پر مسرت اور اطمینان کے رنگ نظر آئے اور ویسے ہی رنگ نوید صاحب کے چہرے پر جھلک رہے تھے۔ ایک مثالی جوڑا لگ رہے تھے دونوں۔ ثانیہ کی طبیعت کا معلوم ہوتے ہی والدہ نے اسے گھر کے ہر کام سے چھٹی دے دی، اس کی صحت اور خوراک کا خیال رکھنے لگیں اور پوتے یا پوتی کی آمد کی نوید نے ان کے اور ثانیہ کے مابین تعلقات میں خوش گواریت پیدا کر دی تھی۔

میں نے امی جان کے ساتھ مل کر پہلے فہرست تیاری کی کہ جو چیزیں شادی کے لیے تیار کرنا تھیں اور پھر آہستہ آہستہ تیاری شروع کر دی۔ نومبر میں نگہت نے بھی آ جانا تھا پھر زیور اور دیگر اشیاء کی شاپنگ ہو جاتی۔ سیالکوٹ نزدیک ہونے کے باعث تیوری کی آمد بھی جلد جلد ہوتی اور جب وہ آتا تو یا لینے آ جاتا، یا پھر فون کر کے بلوالیتا۔ اس کی موجودگی میں تھوڑی بہت شاپنگ ہم ماہ رخ کو ساتھ لے کر بھی کر لیتے تھے۔ میری پسندنا پسند جیسی بھی لیکن میرا اپنا خیال تھا کہ جس کو چیزیں استعمال کرنی ہیں اس کی پسند کو فوقیت دی جانی چاہئے۔ ماہ رخ شاپنگ کرتے وقت نہ قیمت پوچھتی تھی اور نہ ہماری سکت اور استطاعت۔

اس نے پچاسوں سوٹ خرید کر سبھی سلنے کے لیے دے دیئے تھے، حالانکہ میں نے اسے سمجھایا

کہ بسا اوقات ناپ میں فرق آجاتا ہے اور کپڑے جلدی تنگ ہو جاتے ہیں یا پھر فیشن تبدیل ہو جانے سے کپڑے بیکار ہو جاتے ہیں۔ ”فیشن بدل جائے تو اور کپڑے بن جائیں گے اور ناپ..... وہ ابھی اتنی جلدی تبدیل نہ ہوگا میرا، یہ مجھے علم ہے۔“ پورے وثوق سے اس نے کہا تھا ”ہر کوئی تمہاری طرح جلدی میں نہیں ہوتا۔“

ون اور ہفتے پر لگا کراڑ رہے تھے اور میری ایک ٹانگ والدہ کے گھر میں تھی ان دنوں تو دوسری امی جان کے ہاں۔ میں ہر کام ہی نفاست سے کرنے کی عادی رہی تھی اور تیمور کی شادی کے فنکشن میں تو مجھے ہر چیز اے۔ ون کرنا تھی۔ امی جان کے اور اپنے ملبوسات، نگہت اور بچوں کے کپڑے، منظر اور خصوصاً تیمور کے خصوصی ملبوس اور ان کے لوازمات، سبھی میری ذمہ داری تھی۔ کبھی میں امی جان کے ساتھ بازار جاتی تھی اور کبھی منظر کے ساتھ۔

میں نے کاموں کی فہرست بنا رکھی تھی اور جو کام مکمل ہو جاتا تھا اس پر نشان لگا دیتی۔ ورزشیوں، جیولرز اور کام اور کڑھائیوں والے..... سب کے ہاں جس ون چیزوں کی تیاری کا وعدہ تھا ان کا میں نے ایک کیلنڈر وضع کر رکھا تھا۔ ہمیشہ سے میری اسی طرح عادت تھی اور اس طرح کام ہوتا بھی منظم طریقے سے ہے۔ جو جو چیزیں تیار ہوتی جا رہی تھیں انہیں میں سب کے کمروں میں اسی طرح تیار کر کے سیٹ کرتی جا رہی تھی۔ خود کو میں نے ذمہ داریوں کے بوجھ سے ہلکا کر رکھا تھا۔ ہر وقت ذہن پر شادی کے کاموں کے حوالے سے ہی سوچیں سوار رہتی تھیں۔ کبھی رات کو سوتے سے آنکھ کھل جاتی اور کچھ یاد آجاتا تو اسی وقت بینڈ کالیمپ آن کر کے اپنی ڈائری میں کام نوٹ کر لیتی تھی۔

منظر کا خیال تھا کہ ہمیں اب کمرے کی سجاوٹ کے لیے بھی بنگلہ کروالینی چاہئے، اس نے سجاوٹ والوں کو بلا لیا۔ سجاوٹ والوں نے کمرے کے لیے کلر اسکیم پوچھی تو ہم دونوں ہی مختلف آراء رکھتے تھے۔ تب ہم نے ماہ رخ سے رائے لینے کا سوچا، منظر نے ہی اسے کال کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کمرے میں کس رنگ کے پھولوں کی سجاوٹ چاہتی ہے۔ ”مگر وہ تو ماہا بھائی کا کمرہ ہے!!“ منظر کی آواز پر میں چونک اٹھی۔ منظر نے میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے فون بند

کر دیا۔ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ منظر نے سجاوٹ والوں کو جانے کیا کہہ کر لوٹا یا اور میرے پاس آ بیٹھا، ”آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی کہ انہوں نے کیا کہا ہے؟“ میں خاموش رہی۔ ”میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ وہ آپ کا کمرہ ہے۔“ منظر نے جیسے مجھے تسلی دی۔

”میں کون سا یہاں رہتی ہوں.....؟“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”وہ کہہ رہی تھیں کہ تیمور بھائی کے کمرے سے لان کا نظارہ نہیں ہوتا..... میں تو سوچ رہا ہوں کہ ان کی مسہری اپنے والے کمرے میں لگوا دوں.....“

”تمہارا کمرہ چھوٹا ہے منظر!“ میں نے کہا، ”میرے والا..... میرا مطلب ہے جو کمرہ پہلے میرا ہوتا تھا وہی ٹھیک ہے.....“

”آپ پھر میرے والا کمرہ لے لیں یا پھر تیمور بھائی والا.....“ منظر نے پیش کش کی۔

”تیمور والا کمرہ نگہت کے لیے ٹھیک کر دوا دیں گے اور میں کون سا اب یہاں رہ رہی ہوں۔ شادی کے چند دن ہوں گے، اس دوران بھی اگر میں رہی تو اوپر کسی کمرے میں رہ لوں گی.....“

”اوپر آپ کہاں اکیلی رہیں گی..... بس آپ کے لیے میں اپنا کمرہ خالی کروں گا اور میں اوپر شفٹ ہو جاؤں گا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ میرے لیے وہی بہتر ہو۔ اوپر کے دونوں کمرے میں لے لوں گا۔ ماہ رخ بھائی کے ساتھ تو اپنا گزارہ ہوتا مشکل نظر آتا ہے۔“ منظر نے شرارت سے کہا۔

”وہ کون سا یہاں رہ رہی ہے، تھوڑا عرصہ رہے گی پھر چلی جائے گی تیمور کے ساتھ.....“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم اس کے لیے کمرہ سیٹ کر دواؤ۔“

”بھائی! مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے.....“

”کس بات پر؟“

”جب تک ہم اس کمرے کو آپ کا کمرہ کہتے تھے، نہ ہمیں کبھی غالب بھائی کی موت کا یقین آیا تھا اور نہ ہی یہ علم ہوا تھا کہ آپ واپس اپنے میکے جا چکی ہیں۔ ایک امید کا ”ناگ“ تھا، جسے ہم ہر وقت تھاہے رکھتے تھے..... آپ کا کمرہ خالی ہوتا تھا تو یہ امید قائم تھی کہ اسے آپ ہی آکر آباد کر سکتی ہیں۔ ماہ رخ بھائی کے تسلط میں وہ کمرہ چلا جائے گا تو آپ کے لوٹ آنے کی امید موہوم ہو جائے گی۔“ منظر اپنے مخصوص سنجیدہ اور قلیل لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میں نے اس گھر کو اور اس گھر کے کینوں کو اپنا سمجھا ہے منظر! مجھے کسی کمرے کے ہونے یا نہ

ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں آتی جاتی رہوں گی..... جب تک تم لوگ چاہو گے اور جب تک حالات موافق رہیں گے۔“ میں نے وعدہ کیا۔  
 ”بس آپ حالات کے موافق رہنے کی وعادہ کریں۔“

والدہ کی طبیعت کچھ ناسازی تھی اس لیے میں رہ نہ سکی، حالانکہ اس روز تیسرے کو بھی آنا تھا اور ہمیں زیورات کی خریداری بھی کرنا تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ میں والدہ کے ہاں لوٹ آئی۔ دیر تک والدہ کے پاس بیٹھی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہی، مجھے معلوم تھا کہ کچھ ہوا ہوگا جو اتنی ٹینشن لی ہوگی کہ درودل حد سے بڑھ گیا۔ مگر بات کا سرانہ ملا اور نیند کی دواؤں کے زیر اثر وہ غنودگی میں چلی گئیں۔ میں انھی یہ سوچ کر کہ نہا کر نماز پڑھ لوں۔

ثانیہ باورچی خانے میں تھی اور ابولاؤنچ میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے لاؤنچ میں کھلنے والا اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو مجھے لگا کہ میں نے غلطی سے کسی اور کمرے کا دروازہ کھول لیا ہو۔ کمرے میں ہلکے سے رنگ کا نیا قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں میرے بیڈ کی بجائے ایک بے بی کاٹ اور بچوں کے بہت سے لوازمات اور کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے واپس مڑی اور اس سے پہلے کہ کچھ سمجھتی یا کچھ بولتی، ابو بولے..... ”تمہیں سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ تمہاری والدہ کی اچانک ناسازی طبع کی وجہ کیا ہے؟“ میں ہونٹوں کی طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”علی اور ثانیہ کا خیال ہے کہ یہ کمرہ ان کے بیڈروم کے نزدیک ہے اور بچے کے لیے انتہائی مناسب..... تم آرام سے اوپر رہ سکتی ہو، یہی سوچ کر انہوں نے تمہارا سارا سامان اوپر ایک بیڈروم میں شفٹ کروا دیا ہے.....“ ابو کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”کوئی بات نہیں ابو!“ میں نے حوصلہ جمع کر کے کہا، ”اوپر چار کمرے، ہم چاروں بہنوں ہی کے تو ہیں، میں تو سب پر قبضہ کر سکتی ہوں۔“

”نہیں بیٹا! میں اوپر چلا جاؤں گا، تم اپنی والدہ کے ساتھ نیچے سو جایا کرو۔ سامان بے شک تمہارا اوپر ہی رہے.....“ ابو کا لہجہ کیسا ٹوٹا ہوا تھا۔

”کمال کرتے ہیں ابو آپ!!“ میں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی، ”اب میری وجہ سے اس عمر

میں آپ اور والدہ میں علیحدگی ہو، مجھے اچھا نہیں لگے گا، اور یوں بھی آپ کے لیے تو بار بار سیڑھیاں چڑھنا بھی مسئلہ ہے۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا! سیڑھیاں چڑھنا تو بہت ہی معمولی سا مسئلہ ہے.....“ ابو کے لہجے میں کیسی بے بسی کی جھلک تھی۔ ”تم اپنی والدہ کے پاس رہو.....“

”ابو آپ میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔ میں کوئی ایسی بے ٹھکانہ نہیں ہوں کہ آپ کو میرے رہنے کے بارے میں پریشان ہونا پڑے۔ میں کہیں بھی رہوں، خود کو اسی کے مطابق ڈھال لینے کی عادی ہوں۔“

”جانتا ہوں بیٹا! لیکن کبھی کبھار انسان کے پیروں کے نیچے سے زمین خواہ خواہ بغیر کسی بڑی اور نامگہانی آفت کے بغیر ہی کھسکنا شروع ہو جاتی ہے.....“ ابو کے لہجے میں ان کی عمر بھر کا تجربہ بول رہا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں ابو.....“ میں نے قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھائے۔ اوپر آئی تو ایک ہی لاؤنچ میں کھلنے والے چاروں دروازے دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ کبھی یہ کمرے، ہم چاروں بہنوں کے لیے بنے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ میں تنہا کبھی اپنے کمرے میں نہ رہی تھی۔ گھر بھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ پہلے صدف آپنی کے پاس رہی، ان کی شادی ہوئی تو عائشہ باجی اور پھر ثانیہ کے ساتھ رہی۔ سب کی شادیوں کے بعد جب اکیلی رہ گئی تو نیچے والے فلور پر مہمانوں والا کمرہ میں نے لے لیا اور شادی سے پہلے اور بعد میں جب بھی آتی وہیں رہتی۔ اس کمرے میں میرے الہڑ پن، میرے کنوار پن کی یادیں تھیں اور شادی کے بعد غالب کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی یادیں۔ آج ہی مجھے ان سب یادوں سے تہی دست ہونا تھا۔ میری اور غالب کی یادوں کے دونوں مسکن مجھ سے ایک ہی روز چھٹنا تھے۔ کچھ عجیب سا اتفاق تھا، شاید قدرت اب چاہتی تھی کہ میں غالب کو کھلی طور پر بھول جاؤں۔ شاید آئندہ آنے والا وقت میرے لیے کوئی بہتر سوغات لے کر آنے والا تھا۔

ایک بار تو جی چاہا کہ ثانیہ سے پوچھوں کہ کیا تھا اگر وہ مجھے چند ماہ اور اس کمرے میں رہ لینے دیتی..... آنے والا بچہ کون سے پیدائش کے بعد پہلے دن سے ہی علیحدہ سونے والا تھا۔ مگر میری



خودداری نے مجھے اس بات کی اجازت ہی نہ دی۔ یوں بھی میں نے دل سے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ یہ اب اسی کا گھر تھا اور ان تمام فیصلوں کے اختیارات بھی اسی کے پاس تھے۔

”یا اللہ! اسے میرے ماں باپ کی عزت کرنے کی توفیق دے.....“ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھے تو ہر بیٹی کی طرح ماں باپ کی خوشی اور سکون کے لیے دعا کیے بنا نہ رہ سکی۔ دیر تک مصلے پر بیٹھی یہ سوچتی رہی کہ اگر وہ میرے والدین کو بھی ”کمرہ بدر“ کر دے تو؟ لیکن یہ گھر تو میرے والدین کا تھا۔ انہیں بے اختیار کرنے کا حق اس کے پاس کہاں تھا۔ مگر جس نے میرے والدین کی زندگی میں ان کی سب سے لاڈلی بیٹی کا کمرہ چھین لیا تھا اور وہ سوائے ٹینشن لینے کے کچھ نہ کر سکے تھے، اب وہ والدین کچھ کرنے کے حقدار ہی کہاں رہے تھے۔ والدین بوڑھے ہوتے ہیں تو جوان اولادیں انہیں ان کے فرائض کے علاوہ حقوق سے بھی رہنما کر کے بٹھا دیتی ہیں۔

جانے کتنے ہی سالوں کا سفر میں نے وہیں مصلے پر بیٹھے بیٹھے کر لیا تھا۔ خود ہی سوال کیے، خود ہی جواب دیئے۔ خود ہی شکوے کیے اور آپ ہی تسلیاں دیں خود کو۔ تسبیح اور درود شریف پڑھتے ہوئے بھی ذہن بار بار بھٹک جاتا اور خیالات کی روکھیں سے کہیں جا پہنچتی رہی۔ بس یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ آنے والا وقت میرے لیے نئی طرح کی آزمائش والا تھا۔ ”میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے!“ میں نے خود کو تسلی دی اور چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ اپنے ہی نرم ہاتھوں کا لمس پا کر میں ایسی بے اختیار ہوئی کہ یکدم ہچکیوں سے رونے لگی..... کیسی بے بسی محسوس ہو رہی تھی مجھے۔ یا پھر یہ وہ غبار تھا جو کئی دنوں سے وجود میں جمع ہو رہا تھا اور اب آنسو بن کر بہہ جانا چاہتا تھا۔

آنسو کیا ہیں؟؟ قطرہ آب.....؟ ہاں، قطرہ آب ہی تو ہے جو وجود میں دکھ کے سمندر سے بھاپ بن کر اٹھتا ہے..... بادلوں کا غبار بن کر دماغ پر چھاتا ہے، جب بادل متحمل نہیں ہو پاتے اتنے غبار کا تو بارش کے قطروں کی طرح، ٹپک پڑتا ہے آنکھ سے، آنسو بن کر!

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ماہا؟“ شام کی چائے پیتے ہوئے ثانیہ نے پوچھا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں..... بس والدہ کی طرف سے پریشانی ہے۔“

”آپ کی آنکھوں سے لگ رہا ہے کہ آپ روئی ہوئی ہیں؟“

”روئی نہیں..... بس یونہی پریشانی کی وجہ سے.....“

”آئی بھی تو اپنی طبیعت خود ہی خراب کرتی ہیں۔ آپ کا کمرہ ہم نے اوپر شفٹ کیا تو اس پر موڈ خراب ہو گیا۔ میں نے کہا بھی کہ ہم اوپر شفٹ ہو جاتے ہیں، اس پر کہنے لگیں کہ میرے لیے سیڑھیاں اترنا چڑھنا ٹھیک نہیں ہے۔ اب اگر تھوڑا عرصہ آپ اوپر رہ لیں گی تو حرج ہی کیا ہے؟ خواہ مخواہ ٹینشن لی اور بول بول کر اپنی طبیعت بھی خراب کر لی.....“ ثانیہ کے لہجے اور اس کے الفاظ کے بین السطور معانی سے مجھے بہت تکلیف ہوئی لیکن میں اسے کہتی بھی تو کیا اور اسے اثر بھی کیا ہونا تھا۔

”کوئی حرج نہیں ہے۔ میں والدہ کو سمجھا دوں گی، تم بے فکر رہو۔“ میں نے مختصر ا کہا۔

”میں تو سوچ رہی تھی کہ اپنی امی کی طرف چلی جاؤں یا پھر ہم کرائے پر کوئی گھر لے لیں۔ اس حالت میں مجھے بھی خوش رہنے کی ضرورت ہے۔“ اس کے الفاظ تھے یا ہم؟ میں فقط اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کتنے تھوڑے عرصہ میں ہی اس نے اپنی شخصیت کی پرتیں اتارنا شروع کر دی تھیں۔

”تم خوش رہو ثانیہ! اس حالت میں اور والدہ کو بھی خوش رہنے دو، وہ بھی دل کی مرینہ ہیں۔ تم چند دن ممبر کر لیتیں اور مجھ سے بات کرتیں تو میں خود ہی والدہ کو کسی طریقے سے سمجھا بچھا کر اوپر شفٹ ہو جاتی۔ جس طریقے سے آپ لوگوں نے میرا سامان اوپر شفٹ کیا ہے وہ واقعی ان کے لیے تکلیف دہ ہے۔“

”آپ ادھر تھیں اپنی سابقہ سسرال میں.....“ ثانیہ نے طنز سے کہا۔

”میں وہاں پانچ ماہ کے لیے نہیں گئی تھی۔ آپ کے بچے کی پیدائش میں ابھی پانچ ماہ باقی ہیں۔“

”ساتویں مہینے کے بعد تو بچہ کسی بھی وقت پیدا ہو سکتا ہے..... لیکن آپ کو کیا معلوم، آپ کون سا اس مرحلے سے گزری ہیں کبھی.....“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں، میرا تجربہ واقعی ناقص ہے۔ مجھے بہت سی باتوں کا نہ اندازہ ہے نہ تجربہ۔“ میں نے چڑ کر کہا۔

”میرے ساتھ تو اس گھر میں ہر ایک کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ حالانکہ میں تو اس گھر کو اور اس گھر کے ہر فرد کو اپنا سمجھتی ہوں.....“ ثانیہ اکھڑ پن سے بولی۔

”کسی کا رویہ تمہارے ساتھ اکھڑا اکھڑا نہیں ہے ثانیہ! یہ تمہاری اپنی سوچ ہے۔ صرف اس

میں وسعت پیدا کرو۔“ میں نے نرمی سے اسے کہا۔

”دیکھا.....“ اس نے ابرو اچکائے۔ ”کیسے آپ مجھے میرا ماضی اور میری اصلیت یاد دلادیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ سے اور آپ کی والدہ سے ہمارے گھر کی پرانی حالت پوشیدہ نہیں، اسی لیے آپ مجھے اس گھر میں بہو کا درجہ اور عزت نہیں دے پاتے۔“

”ثانیہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اتنی خوشی، چاؤ اور ارماتوں سے تمہیں بیاہ کر کیوں لاتے؟ والدہ نے اور میں نے یہ شادی بڑے شوق سے کی ہے اور سب کچھ جانتے ہوئے کی ہے۔ تم والدہ کو میری والدہ کی بجائے اپنی امی جیسا سمجھنا شروع کر دو تو بہت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔“

”جو جیسا ہے اسے ویسا ہی سمجھا جائے گا۔ ساس تو ساس ہی ہوتی ہے، ماں کیونکر سمجھی جاسکتی ہے۔ جیسے امی جان کے لیے جو حیثیت ان کی بیٹیوں کی ہے وہ میری تو کبھی بھی نہیں ہو سکتی، چاہے میں سو نے کی بن کر آ جاؤں۔“ ثانیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”دلوں سے کدورتیں نکال دی جائیں تو بہت سے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں، بلکہ مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔“ میں نے فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ والدہ کمرے سے نکل کر آہستگی سے چلتی ہوئی آ گئیں۔ ”کیسی طبیعت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”چائے لیں گی آپ؟“ ثانیہ نے پوچھا تو والدہ نے اس کی بات جیسے سنی ان سنی کر دی۔ اس پر ثانیہ نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے والدہ؟ موسم کچھ خراب لگ رہا ہے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔  
”اگر تمہیں موسم خراب لگ رہا ہے تو موسم کی خرابی کی وجہ کا بھی علم ہوگا۔“ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”آپ کچھ روشنی ڈالیں گی تو علم ہوگا۔“ میں نے مذاقاً کہا۔  
”میرے پاس روشنی ڈالنے کے لیے کوئی نور ہی نہیں بچا۔ لگتا ہے کہ اندھیرے میں کھڑی ہوں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ہی کچھ نظر نہیں آ رہا ہے، اس سے دور کی کیا کہوں؟“ والدہ کے لہجے میں کافی سرد مہری تھی۔

”آپ سے کہا ہے کہ ریلیکس رہا کریں..... کیوں ہر چھوٹی بڑی بات کی ٹینشن لیتی ہیں آپ؟“ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر دبا دیا۔

”جب تک زندہ ہوں تب تک تو ٹینشن لینے سے باز نہیں آ سکتی، البتہ جس دن نہیں رہوں گی، اس دن سب کی ٹینشن ختم ہو جائیں گی۔“ ان کی آنکھیں لبریز ہونے لگیں۔

”ارے والدہ! کتنا سادہ ساحل تھا یہ ساری پریشانیوں سے آزاد ہونے کا، مجھے بھی کوئی چھ سال قبل آپ بتا گئی ہوتیں تو میں خود بھی نجات پا گئی ہوتی اور آج آپ بھی سکون میں ہوتیں.....“ بات ختم ہونے سے قبل میرا ضبط ختم ہو گیا اور میں والدہ کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ والدہ کے آنسو بھی میرے چہرے پر ٹپ ٹپ کرنے لگے..... ثانیہ کی آنکھوں کے گوشے بھی مجھے بھیکے ہوئے نظر آنے لگے.....

”تمہاری فکر تو مجھے مرنے بھی نہیں دیتی اور نہ ہی ڈھنگ سے جیا جاتا ہے۔“ والدہ بولیں۔  
”آپ جنیں ڈھنگ سے اور خوشی سے۔ رہی بات میری فکر کی تو اسے اللہ پر چھوڑ دیں۔ آپ کے پریشان ہونے سے تو مسائل حل نہ ہوں گے.....“ میں نے دلا سہ دیا۔

”اللہ کرے گا تو ماہاجی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، آپ پریشان نہ ہوں امی جان!“ ثانیہ کے لہجے میں یکسر تبدیلی آ گئی تھی۔ ”میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

ثانیہ کے جاتے ہی والدہ مجھ سے ناراض ہونے لگیں کہ مجھے ثانیہ سے احتجاج کر کے اپنا کمرہ واپس لینا چاہئے۔ لیکن میں نے ہی انہیں سمجھایا کہ مجھے جلد یا بدیر اوپر منتقل ہونا ہی تھا۔ دل سے وہ بھی سمجھتی تھیں کہ میں انہیں بہلانے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن کبھی کبھار خوش فہمیوں میں مبتلا رہنا بھی اچھا لگتا ہے۔ ”پھر بھی تمہارے آنے کا انتظار تو کرتی.....“ انہوں نے رنجش سے کہا۔

”میں تو آپ کی ناسازی طبع کا سن کر آئی ہوں، ورنہ ابھی میرا آنے کا ارادہ کہاں تھا۔ نگہت اور تیمور بھی آنے والے ہیں، شادی سر پر ہے اور سو کام پڑے ہیں.....“ میں نے بہانہ کیا۔

”جب بھی تم تیمور کی شادی کی بات کرتی ہو، مجھے لگتا ہے میرے ہاتھ سے امیدوں سے کئی سنہری دھاگے چھوٹ جاتے ہیں۔ مجھے تو ابھی تک کسی معجزے کی توقع ہے، ابھی تک کسی انہونی کے ہونے کی امید۔“ والدہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا، ”کاش اس وقت بھی تم اپنی ہٹ دھرمی چھوڑ دو، باقی سب کو میں خود منالوں گی۔“

”والدہ پلیز!!“ میں نے لجا کر کہا..... ”اس بات کو اب بول جائیں.....“ ثانیہ کے چائے

لے کر آتے ہی بات وہیں پر رہ گئی۔ میں نے والدہ کو اشارہ کر دیا کہ اب خاموش رہیں۔

تھی۔ عبداللہ بھی اب کافی تیز ہو گیا تھا، کئی دفعہ وہ بھی اتنی ضد کرتا کہ نگہت کو مجبوراً اسے بھی میرے پاس چھوڑنا پڑتا۔ نگہت کا بھی ایک پاؤں میکے میں اور ایک سرال میں ہوتا تھا۔ تاہم حتیٰ فیصلہ یہی تھا کہ نگہت میکے کی طرف سے شادی میں شرکت کرے گی کیونکہ وہ تیمور کی اکلوتی بہن تھی۔ اعجاز اپنے گھر سے شادی میں شرکت کر رہے تھے۔

نگہت کے آتے ہی ڈھولک رکھ لی گئی اور ہر روز شام کو خوب رونق لگتی۔ کسی دن نگہت سرال میں ہوتی تو وہ ڈھولک کے ناغے کا دن ہوتا۔ شام میں کوئی بھی کام نہ ہو پاتا تھا، اس لیے دن بھر بہت مصروفیت رہتی۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے مصروفیت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

”بھائی! کسی دن وقت نکال کر آپ اپنا فیشل وغیرہ بھی کروالیں..... آنکھوں کے گرد اتنے گہرے حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے آپ کی نیند بھی نہیں پوری ہو پاتی.....“ نگہت نے پیار بھرے انداز سے مجھے سرزنش کی، ”کل ہی چلیں اور اپنا فیشل کروائیں.....“

”میں یوں ہی ٹھیک ہوں نگہت!.....“ میں نے کہا، ”فیشل کروا کر بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا اور یوں بھی مجھے کس کے لیے بچنا سنورنا ہے.....؟“

”شاید اسی شادی میں کوئی آپ کو سچے سنورتے ہوئے دیکھ لے.....“ وہ شرارت سے مسکرائی، ”اور تقریبات تو بہانہ ہی بنتی ہیں، کئی جوڑے اور بن جاتے ہیں.....“

”رہنے دو تم!“ میں نے طنز سے کہا، ”ہمیں نہیں دکھانا کسی کوچ سنور کے، جسے پسند کرنا ہے وہ ہمیں یوں ہی پسند کر لے، مگر جھائے ہوئے چہرے اور گہرے حلقوں والی آنکھوں کے ساتھ!“

”آپ ہیں اتنی پیاری، کہ کسی کو ایک لمحہ بھی سوچنے کی ضرورت نہ پڑے..... جانے آپ نے تیمور بھائی کو کیوں ٹھکرا دیا؟“ نگہت نے مایوسی سے کہا۔

”پلیز نگہت“ میں نے التجا کی، ”اب اس موضوع پر بات کرنا بند کر دو۔ اس سے قبل کہ کسی بات کی بھنک ماہ رخ کے کانوں میں پڑے۔ اور میں نے تیمور کو قطعی نہیں ٹھکرایا، وہ تو اتنا پیارا ہے لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں نے اسے ہمیشہ اپنا بھائی ہی سمجھا ہے.....“

”جیسے آپ کے سمجھ لینے سے وہ آپ کے بھائی بن گئے ہیں۔“ نگہت پر جوش انداز میں بولی۔

”بس یہ گفتگو اس کے بعد نہ ہو..... یہ میری درخواست ہے“ میں نے اصرار کیا۔

”آپ درخواست کیوں کرتی ہیں، حکم کریں..... تاہم میرے دل سے تو یہ کک نہیں جانے

اگلے دو روز میں میں نے اپنا سامان کمرے میں سیٹ کیا اور ساتھ ہی اپنی پیکنگ کی کیونکہ اب مجھے جانا تھا تو پھر شادی تک وہیں رہنا تھا۔ نگہت نے مجھے اس بات کا الٹی میٹم دے رکھا تھا۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ شادی کے قریبی دنوں میں میرے لیے ہر وقت آنے جانے کی زحمت کرنا ممکن نہ ہوگا۔ گاڑیاں گھر میں ایک سے دو ہو گئی تھیں لیکن اسی طرح کام بھی بڑھ گئے تھے۔ کئی دفعہ ہمیں ٹیکسی سے بازار جانا پڑتا تھا۔ ابو کی طرف بھی دو گاڑیاں تھیں، علی بھائی کی اپنی مصروفیات تھیں اور ابو کی گاڑی لے کر نکلنے کا میں رسک نہ لے سکتی تھی کہ وہ کہیں بھی بند ہو جائے اور پریشانی اٹھانا پڑے۔ مجھے گاڑی کی یعنی اپنی ذاتی گاڑی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

علی بھائی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے سیکنڈ ہینڈ کار بہت اچھی حالت میں لے ویں، یا پھر نئی گاڑی بینک سے لیزنگ کے ذریعہ نکلواویں۔ علی بھائی نے جانے کیسے باتوں باتوں میں نوید صاحب یعنی اپنے ہم زلف کے سامنے بات کر دی یا ممکن ہے کہ ثانیہ نے کر دی ہو کہ بات امی جان تک جا پہنچی۔ انہوں نے تو خوب ہی میرے لئے لیے کہ میں نے ان سے کیوں نہیں کہا۔ میں وضاحتیں دیتی رہ گئی اور اگلے دو روز میں ”میری“ چھپاتی ہوئی، نئی نگر گاڑی گھر پہنچ گئی۔ میں نے کافی لیت و لعل سے کام لیا، مگر میری کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

میں نے بھی یہ سوچا کہ چلیں گاڑی کی ضرورت تو شادی کے دنوں میں گھر پر ہے اور میں کون سا اسے ساتھ لے جاؤں گی، اسی گاڑی کو ماہ رخ استعمال کر لے گی۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ ماہ رخ کے والدین اسے جہیز میں اس کے ذاتی استعمال کے لیے گاڑی دے رہے تھے۔ مگر یہ ہوا کہ اپنی گاڑی آجانے سے مجھے کافی سہولت ہو گئی اور کسی کی طرف دیکھنے کی بجائے جب میرا دل چاہتا یا جہاں بھی کام ہوتا میں امی جان کو ساتھ بٹھا کر لے جاتی اور کر لیتی تھی۔

میں نے اپنا سامان اوپر والے کمرے میں ہی سیٹ کیا تھا۔ میرے والا کمرہ تیمور اور ماہ رخ کے کچلہ عروسی کے طور پر سجایا جا رہا تھا۔ نگہت نے بھی آکر تیمور کا کمرہ لینے سے انکار کر دیا اور یوں اوپر کے کمرے آباد ہو گئے۔ میرے پاس خوشی سوتی تھی، کیونکہ وہ میرے ساتھ جلد ہی گھل مل جاتی

والی.....“ نگہت نے مایوس لہجے میں کہا۔

دو تین دفعہ ڈھولک پر کافی زیادہ لوگ تھے، اس روز والدہ کی طرف سے والدہ اور ثانیہ بمعہ علی بھائی، ثانیہ کے میکے سے آئی، ثنا اور مظہر علی، زارا اور نوید صاحب، نوید صاحب کی بہنیں نادیہ اور حنا اور تیمور کی سسرال سے بھی ماہ رخ کے سوا سبھی لوگ آتے رہے۔ ستارہ کے مظہر سے التفات کو تو میری چھٹی حس نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا، مگر اب مجھے لگا کہ ثانیہ کا بھی مظہر سے رویہ منفرد سا تھا۔ کم از کم ایسا نہیں کہ جسے نظر انداز کیا جاسکے۔ ہر ہر تقریب کے حساب سے زارا اور ثانیہ کے پاس تو اپنی شادیوں کے ملبوسات ہی کافی تھے لیکن ثناء کی تیاری بھی کسی سے کم نہ تھی۔ جدید تراش خراش کے اور شوخ رنگوں کے ملبوسات کے ہمراہ میونگ زیورات، جوتے اور چوڑیاں۔

جانے کسی اور نے محسوس کیا یا نہیں لیکن میری نظر سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ میں تو عمر اور تجربے میں بہت کم تھی، اس بات کو والدہ نے بھی محسوس کیا تھا اور امی جان نے بھی اور دونوں نے ہی علیحدہ علیحدہ مجھ سے بات کی تھی۔ ستارہ کا لباس تو جسم کو چھپانے سے زیادہ دکھانے کی کوشش کرتا تھا اس لیے مظہر کا اس کی طرف مائل ہونا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ مگر جلد ہی گھر میں جس فرد کا اضافہ ہونے والا تھا اس سے بعید نہ تھی کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی اس ناممکن کو ممکن بنا لیتی۔ ثناء کے حسن میں معصومیت بھی تھی، سادگی بھی اور ادا بھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ اس دوڑ کو جیت سکتی تھی۔ مظہر کو لڑکیوں میں جس طرح کی چیزیں متاثر کر سکتی تھیں وہ ستارہ سے زیادہ ثناء کے پاس تھیں۔ ناز وادا کے لیے آج کل کی فلمیں اور ڈرامے تربیت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

مہندی کی تقریب میں پہلے اور سبز رنگوں کے ملبوسات پہنے ہوئے لڑکیاں رونق بڑھا رہی تھیں۔ مہندی لے کر ہم سب کو ماہ رخ کے ہاں جانا تھا، جہاں لڑکی کے خاندان اور اقارب کی لڑکیاں ہمارے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ ہم پر پھولوں کی پتیوں کی بارش کر دی گئی۔ خوبصورت اور پر تپاک استقبال ہوا۔ ڈھولک، لڈی، فوٹو سیشن، کھانا اور یوں رات ختم ہو کر جب صبح کے آثار نمودار ہونے ہی والے تھے تو تقریب ختم ہوئی۔ والدہ ابو کے ساتھ رات واپس چلی گئی تھیں کیونکہ ان کے لیے رات دیر تک جاگنا ممکن نہ تھا۔

ماہ رخ ہماری طرف سے بھجوائے گئے گوٹے والے جوڑے میں ملبوس تیمور کے ساتھ بیٹھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی نظر اتاری اور اس پر سے وار کر صدقے کی رقم مانگنے والیوں کو دی۔ ”اپنی سہیلی کی نظر اتار رہی ہیں؟ میری نہیں اتار رہیں۔“ تیمور نے ہنس کر کہا۔

”تمہاری نظر اتار رہی ہوں گی، میرے ساتھ نظر بٹو بیٹھا ہے اس لیے میری نظر اتارنے کی کیا ضرورت ہے؟“ ماہ رخ نے بے ساختہ تیمور کی بات کا جواب دیا تو اسٹیج کے گرد کھڑی ہوئی لڑکیوں کا قہقہہ بلند ہوا۔ نگہت کے چہرے پر غصے سے ایک رنگ سا آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ دبایا، میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ کوئی جواب دے اور صورت حال خراب ہو۔ ماہ رخ سے ایسی بیباکی اور بے ساختگی غیر متوقع نہ تھی۔ گھر واپس بھی لوٹے تو نگہت کو اس بات کا غصہ تھا۔ ”آپ نے مجھے خاموش کیوں کروادیا؟ میں اسی وقت حساب برابر کر دیتی اس کا.....“

”بعض مواقع پر جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوشی کی تقریب میں کبھی ذرا سی بات دلوں میں میل لے آتی ہے۔ کچھ باتیں برداشت کر لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔“

”ساری زندگی باتیں ہی برداشت کرنی ہیں آپ لوگوں نے..... ابھی تو آغاز ہے، آگے آگے دیکھئے کیا ہوگا۔ ماہ رخ آئے گی تو آپ لوگوں کو برداشت کے ایسے ایسے مواقع ملیں گے کہ آپ کے حوصلے جواب دے جائیں گے۔“ نگہت نے مستقبل کا بھیانک نقشہ کھینچا۔

”چلو نگہت یوں تو یوں ہی سہی، دیکھتے ہیں ہماری برداشت زیادہ ہے یا اس کی زبان کے ترکش میں تیر..... اور کبھی جو تمہاری نند اور کل بننے والی بھابی نے تم سے یہ شکایت کی کہ اسے پلٹ کر میں نے جواب دیا تو کہنا۔“ میں نے ہنس کر اسے چیلنج کیا۔

”آپ تو میدان خالی کر کے چلی گئی ہیں یہاں سے اور اب بھی اس کے حق میں اپنے کمرے سے دستبردار ہو گئیں، لیکن اصل تو امتحان ہے امی، تیمور بھائی اور مظہر کی برداشت کا۔ آپ کی امی کی طبیعت اور طرح کی ہے، ٹھنڈی طبیعت۔ مجھے اپنی امی کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ غصے میں آ بھی جاتی ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کر دیتی ہیں.....“ نگہت نے کہا تو میں سوچنے لگی کہ واقعی عورتوں کی اصل برداشت کا تب علم ہوتا ہے جب وہ بہو کی ساس بنتی ہیں۔ خصوصاً اگر بہو میں محاذ آرائی پر تل آئیں۔ میں نے اپنی والدہ کی برداشت کو بھی ختم ہوتے دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ غصے کا برملا اظہار نہ کرتی تھیں مگر اندر ہی اندر گھلتی رہتیں اور ٹینشن سے دل پراثر لے لیتیں۔ نتیجتاً بلڈ پریشر ہائی

مظہر کی نظر التفات کس پر پڑتی ہے۔ اتفاق سے میں مظہر کی نظروں کی کوئی بھی چوری نہ پکڑ سکی۔ والدہ مجھے سستی لگیں۔ بارہا میں نے کوشش کی کہ ان کے پاس بیٹھوں اور ان کی طبیعت کی بابت پوچھوں۔ وہ ابھی تک ٹھیک محسوس نہ کر رہی تھیں، مگر واقعات اور مصروفیات مجھے موقع ہی نہ دے رہی تھیں۔ ”بورہور ہی ہیں یا طبیعت ٹھیک نہیں؟“ میں نے ایک دفعہ موقع پا کر پوچھا۔ ”نہیں بورہور بھی نہیں ہو رہی اور طبیعت بھی ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ بس یونہی!“ وہ سستی سے بولیں۔ ”بس یوں ہی کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو۔۔۔۔۔ میرا دل چاہ رہا ہے۔“ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”خیر تو ہے والدہ؟ اتنا رومانس کیوں بگھارا جا رہا ہے؟“ میں نے شرارت سے کہا۔ ”بس تم آج بہت پیاری لگ رہی ہو، دل چاہتا ہے تمہیں جب بھر کر دیکھوں۔۔۔۔۔“ ان کی آنکھوں کے پینے چھلکنے ہی والے تھے۔ ”لیکن ڈرتی ہوں کہ تمہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے۔“ ”والدہ!! آپ بھی ناں بس۔“ میں نے شرما کر ان کے کاندھے سے سر ٹکا دیا۔ ”ساری ماؤں کو اپنی اپنی بیٹیاں ایسے ہی پیاری لگتی ہیں۔۔۔۔۔“

”آج گھر چلو گی ناں؟“ ان کے لہجے میں منت تھی۔

”پرسوں ولیمہ ہے والدہ۔۔۔۔۔ آج دلہن لے کر گھر جائیں گے تو کتنا ہی کام ہوگا، اور آج تو میرا گھر پر ہونا ویسے بھی ضروری ہے۔۔۔۔۔“

”کیا لاڈ پیار ہو رہے ہیں ماں بیٹی میں؟“ آنٹی ابھی سلامی دے کر لوٹی تھیں۔

”والدہ مجھے مسکے لگا رہی تھیں۔۔۔۔۔ تعریف کر کے مجھے پھلار ہی تھیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”تو کون سا جھوٹی بات کر رہی ہیں۔۔۔۔۔ ہماری بیٹی ماشا اللہ پوری تقریب میں سب سے اچھی لگ رہی ہے اور تو اور دلہن کے پاس جا کر بھی بیٹھ جائے تو لوگ اسے بھول کر تمہیں دیکھنا شروع کر دیں۔۔۔۔۔“ آنٹی نے کہا تو میں ہنس پڑی۔

”یک نہ شد، دوش نہ شد۔۔۔۔۔ آنٹی آپ کو بھی لگتا ہے والدہ کی طرح نزدیک کی عینک کا نمبر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”خدا کرے یونہی ہنستی رہو بیٹا!!“ آنٹی نے دعا دی۔

”آمین!!! اللہ نظر بد سے بچائے۔“ والدہ نے کہا۔

ہو جاتا، لیکن یہ ساری باتیں نگہت کو بتانا گویا اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھانے کے مترادف ہوتا۔

”نگہت تم امی جان کو بھی سمجھانا اور میں مظہر سے بات کروں گی۔ ہمیں اس رشتے کو خوش اسلوبی سے نبھانا ہوگا۔“

”چاہے آنے والی عاذا آرائی کے خیال سے آرہی ہو۔۔۔۔۔“ نگہت جھنجکی۔

”نگہت! ماہ رخ کا اس گھر میں دو ہزار رشتہ ہے اور تمہارا اس کے میکے میں۔ اس لیے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہماری باتوں اور شکایتوں سے تمہارے گھر پر بھی اثر پڑے گا۔“

”یہ باتیں آپ نے رشتہ طے کرتے وقت نہیں سوچیں، اب ان کا کچھ فائدہ نہیں۔ اب تو آپ دعا ہی کریں کہ یہ بیل منڈھے چڑھ جائے۔۔۔۔۔“ نگہت تو کہہ کر کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور میں تفکرات کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی کہ جانے آئندہ والا وقت کتنی دفعہ میرے لیے یہ الزام لے کر آنے والا تھا کہ یہ سب کیا دھرا میرا ہی تھا۔

بارات کے وقت میں نے اور نگہت نے ایک جیسے مگر مختلف رنگوں کے بھاری کا مڈا ر جوڑے پہن رکھے تھے۔ اگرچہ مجھے وہ کپڑے اپنے لیے بہت بھاری لگ رہے تھے مگر سب کے اصرار پر مجھے پہننا ہی پڑے۔ اپنی شادی کے بعد پہلی دفعہ میں اتنے بھاری لباس میں ملبوس تھی۔ ہم دونوں ہر موقع پر پیش پیش بھی تھیں۔ مجھے خود پر پڑنے والی بہت سی توصیفی نظروں کا احساس بھی تھا اور بہت سے خوبصورت جملے بھی سننے کو ملے۔ نگہت مجھ سے کم عمر تھی مگر دو بچوں کی پیدائش اور لندن کی ہوا تازہ خوراک کی وجہ سے وہ صحت مند ہو گئی تھی اور میں دیکھنے میں اس سے کم عمر ہی لگتی تھی۔

مقامی ہوٹل کے ایک وسیع وعریض ہال میں بارات کے استقبال اور طعام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ دونوں طرف سے سب کے چروں پر مسکرائیں اور خوشیاں رقصاں نظر آرہی تھیں۔ ستارہ اس روز سیاہ اور نقرئی لباس میں اپنی چھب دکھلا رہی تھی جب کہ ثناء فیروز کی رنگ کے لباس میں تھی۔ دونوں لڑکیاں عمر کے ایسے دور میں تھیں کہ جب حسین نظر آنے کے لیے بہت زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مظہر دولہا کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے اور اپنی وجاہت کے باعث بہنوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مگر میں تو تمام وقت یہ جائزہ لینے کی کوشش کرتی رہی کہ ستارہ اور ثناء میں سے

”آپ بھی ناں دونوں..... بس مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ اصل میں آپ دونوں کی اپنی آنکھوں میں اتنا حسن ہے کہ آپ کو ہر چیز حسین نظر آتی ہے.....“

”اب یہ تم ہم دونوں کو مسکا لگا رہی ہو۔“ والدہ نے کہا اور آنٹی نے ان کی تائید کی، ”بے شک!!“

”آنٹی آپ کی تو اپنی ساری بیٹیاں ماشا اللہ اتنی پیاری ہیں..... ایک سے بڑھ کر ایک اور یہ ثناء کو تو دیکھیں کتنی پیاری نکل آئی ہے..... نظر ہی نہیں ٹھہرتی.....“ میں نے دل کھول کر زارا، ثانیہ اور ثناء کی تعریف کی۔

”تینوں مل کر بھی تمہارے جتنی پیاری نہیں ہیں اور پھر تمہارا حسن صورت اور حسن سیرت مل کر یہاں موجود ہر لڑکی کے حسن کو زیر و کر دیتے ہیں۔ میرا مظہر علی تو تمہاری عادت اور حسن اخلاق کی اتنی تعریف کرتا ہے اور بیٹا میں آج یہاں جس اعتماد اور جس حیثیت میں بیٹھی ہوں۔ یہ بلاشبہ تمہاری نیک نیتی، خلوص اور محبت کا مرہون منت ہے۔“ آنٹی رطب اللسان تھیں اور میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

”پلیز آنٹی یوں کہہ کر شرمندہ نہ کریں، آپ خود اتنی اچھی ہیں اور یہ سب کچھ جو آج آپ کو حاصل ہے یہ مظہر علی کی اپنی محنت اور جدوجہد کا ثمر ہے.....“ میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی تمہارا براہِ اپن ہے بیٹا.....“

”کیسا ہے مظہر علی کا کام آنٹی؟ خوش تو ہے ناں؟“ میں نے ازراہِ معلومات پوچھا۔

”بہت خوش ہے بیٹا! بہت اچھا کام جا رہا ہے، لیکن تمہارے والے دفتر کو بہت یاد کرتا ہے، کہتا ہے کہ اگر تم وہاں سے نہ جاتیں تو وہ کبھی وہاں کی نوکری نہ چھوڑتا۔“ آنٹی نے کہا۔

”چلیں اچھا ہے آنٹی! میری وجہ سے وہ مردوت میں رہتا تو آج اتنی ترقی نہ کر پاتا۔ اپنا کام شروع کر لیا ہے۔ اپنا کاروبار تو یقیناً ملازمت سے بہتر ہوتا ہے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”بس بیٹا! اب تو سوچتی ہوں، اس کی شادی بھی کروں، دو بہنوں کا فرض اس نے پورا کر دیا۔ تیسری کا بھی جب وقت آئے گا تو ہو جائے گا۔“

”ہاں ہاں! کیوں نہیں آنٹی۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی شادی کریں، آپ بھی گھر میں بہو لائیں، رونق دیکھیں پوتے پوتیاں کھلائیں.....“ میں نے خلوص سے کہا۔

”کیوں نہیں بیٹا! دعا کرو کہ اب اللہ میری خواہش بھی پوری کرے اور میرے بیٹے کی بھی.....“ آنٹی نے میری طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

”ضرور!! میں دعا کروں گی۔ آپ نے کوئی لڑکی وغیرہ دیکھی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہوں.....“ آنٹی کہیں کھوی گئیں۔ ”لڑکی دیکھی ہے..... مظہر علی کی پسند کی ہی ہے۔“

”اچھا..... واؤ! پھر تو کوئی خاص ”چیز“ ہوگی آنٹی؟“ میں نے مسکرا کر استفسار کیا۔

”خاص نہیں، خاص الٹی ص کبھی بیٹا..... ہماری آنکھوں میں تو اپنے آنگن میں چاند اترنے کا سپنا بس گیا ہے۔“ آنٹی نے کہا اور میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کا منہ دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا لڑکی کا نام چاند ہے؟“ اور اس سے قبل کہ آنٹی کوئی جواب دیتیں، والدہ نے مجھے کہا کہ مجھے اسٹیج پر جانا چاہئے۔ میں اپنے سوال کا جواب سننے بنا ہی والدہ کے حکم کی تعمیل میں اسٹیج کی طرف بھاگی۔ والدہ کا تو لگتا تھا کہ ارادہ ہی نہ تھا کہ میرا بازو چھوڑیں مگر یکدم ہی انہوں نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔

مظہر علی بھی تقریب میں موجود تھا، زیادہ تر مردانہ حصے میں، کم کم ہی سامنا ہوا مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی صحت بھی بہتر ہو گئی تھی اور اپنے خوبصورت تراش کے سوٹ میں وہ زیادہ پر اعتماد لگ رہا تھا۔ نوید صاحب اور علی بھائی کے سالے کی حیثیت سے بھی وہ ان کے ساتھ ساتھ تھا اور غالباً اس کے اپنے کاروبار نے اسے زیادہ پر اعتماد بنا دیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ ایک بار سامنا ہونے پر اس نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں الحمد للہ! آپ کیسے ہیں؟“ میں نے جواباً پوچھا۔

”آپ کی دعائیں ہیں، احسانات ہیں اور اللہ کا خاص کرم ہے۔“

”مظہر علی!! پلیز..... آپ تو ایسی باتیں کر کے شرمندہ نہ کریں۔“ میں نے کہا۔

”اور کس نے آپ کو شرمندہ کیا ہے؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”آپ کی امی حضور، یہ فریضہ بخوبی سرانجام دے چکی ہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ بعد میں

بھی سوچا کہ آنٹی، مظہر علی، زارا اور ثناء کا رویہ مجھ سے ایسے ہی ہوتا تھا جیسے کسی محسن سے ہوا کرتا ہے،

مگر ثانیہ کی نظر اور لہجہ بدل گیا تھا، اور اس کی وجہ یہی ممکن ہے کہ میرے اور اس کے رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جس پر احسان کرو اس سے صلے کی توقع نہ کرو۔

رخصتی کا شور اٹھا تو ہم سب بھی اسی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ہاتھوں سے ہم ماہِ رخ کو اسٹیج سے پکڑ کر تیمور کی مہر اہی میں گاڑی تک لائے۔ ماہِ رخ کی آنکھوں میں آنسو تھے نہ چہرے پر اداسی کا شائبہ، شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ فلم بن رہی تھی اور وہ اس وقت روکر فلم میں اپنا خراب چہرہ نہ ریکارڈ کروانا چاہتی تھی۔ اس کے اندرونی اطمینان اور خوشی کے رنگ اس کے چہرے پر میک اپ کے ساتھ خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔

ماہِ رخ کی والدہ کے چہرے پر البتہ مجھے اداسی کے وہ تاثرات نظر آئے جو اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت ہر ماں کے دل کے عکاس ہوتے ہیں۔ جس بیٹی کو جنم دے کر اسے پالا ہوتا ہے اور اتنے سال تک وہ گھر کی رونق رہی ہو، کیونکر اس کی جدائی سے دل میں تکلیف نہ ہو۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کسی کے حوالے کرتے ہوئے سینے میں کیسا کھوکھلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ماہِ رخ کو گاڑی میں بٹھا کر میں نے ان کے گلے لگ کر ان کو بیٹی کی شادی کی مبارکباد بھی دی، تسلی بھی اور وعدہ بھی کہ ہم ان کی بیٹی کا بہت خیال رکھیں گے۔ مجھ سے لپٹ کر وہ رونے لگیں۔ مجھے بھی رونانا گیا ان کے دکھ کو محسوس کر کے۔ بیٹی کی شادی کا موقع ہوتا ہی ایسا ہے کہ رخصتی کے وقت بیٹیاں بھی اور بیٹیوں والے بھی اداس ہو جاتے ہیں۔

لڑکی کی زندگی میں یہ ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے، بچپن کے کھیل کھلونے اور میکے کا گھر چھوڑ کر جانا کیسا کٹھن سفر ہوتا ہے۔ پھر اندیشے بھی مہر اہی ہوتے ہیں کہ جانے آگے مقدر میں کیا لکھا ہے۔ ماں باپ ایک طرف اس بات پر خوش اور مطمئن ہوتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے فرض کی ادائیگی کر رہے تھے تو ساتھ ہی اپنے آنگن کا سونا پن بھی انہیں نظر آتا ہے، یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ان کی نازوں پلی کے لیے آزمائشوں کا سفر اب شروع ہوتا ہے۔ اسے نئے لوگوں میں جانا ہے اور ان کے دل بھی جیتنے ہیں۔ خود کو ان کے ماحول کے مطابق ڈھالنا ہے۔

امی جان نے ماہِ رخ کی امی کو مجھ سے علیحدہ کیا اور ان سے گلے مل کر اجازت چاہی۔ ہوٹل

سے ہی سب مہمان بھی رخصت ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے والدہ اور ثانیہ کو بھی مل کر خدا حافظ کہا اور سیکنہ آنٹی کو بھی۔ رات کافی بیت چکی تھی ورنہ ان سب کو ہم اپنے ساتھ گھر لے کر جاتے کیونکہ یہ سب لوگ بارات کے ساتھ آئے تھے۔ سب لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے تو بارات کا قافلہ دعاؤں کے سائے میں رخصت ہوا۔ دولہا اور دلہن کی گاڑی کو تقریباً درمیان میں رکھا گیا تھا۔ جو گاڑی گھر میں سب سے پہلے پہنچنا تھی اس میں میں اور نگہت تھے۔ ہمیں گھر پہنچ کر ماہِ رخ کو خوش آمدید کہنا تھا۔

ہم نے گھر پہنچ کر گھر کی ساری بتیاں آن کر دیں، ڈیک پر گانا بھی سیٹ کر دیا اور پھولوں کی چٹیاں بھی ٹوکریوں میں بھر کر تیار کر لیں۔ صدقے وغیرہ کا بندوبست بھی موجود تھا۔ پہلے پہنچ جانے کے باعث ہمیں آدھا گھنٹہ مل گیا تھا اور ہم نے اطمینان سے ساری تیاری کر لی تھی۔ فلم بنانے والوں کی گاڑی بھی پہنچ گئی تھی اور وہ اپنے کمرے اور روشنیاں وغیرہ سیٹ کر رہے تھے۔ گیٹ سے لے کر اندر کے دروازے تک ہم نے دور دیر دیئے رکھے تھے، میں نے ان کو بھی جلا دیا تھا اور سب کو احتیاط برتنے کو کہہ رہی تھی۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور باقی ساری گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ تقریباً سبھی گھر کے لوگ ہی تھے یا پھر چند قریبی رشتہ دار۔ دولہا دلہن گاڑی سے برآمد ہوئے تو ہم نے ان پر پھولوں کی چٹیاں نچھاور کیں۔ میں نے ماہِ رخ کا ہاتھ تھام کر اسے دلہن سے اندر کی طرف کیا۔ تیمور دوسری طرف سے ہمراہ تھا۔ صدقے والے بکرا لے کر آ گئے تھے۔ تیمور نے ماہِ رخ کا ہاتھ تھام کر بکرے پر رکھا اور قصاب نے تھوڑے سے فاصلے پر ہی بکرے کو قابو کر لیا۔ جونہی اس نے تکبیر پڑھ کر بکرے کی گردن پر چھری پھیری، ماہِ رخ نے بے اختیار چیخ ماری اور میری طرف جیسے گرنے لگی۔ اس کے لڑکھڑاتے ہی میں نے اسے بھی سنبھالا اور خود کو بھی، شکر ہے کہ میرا ہاتھ کسی چیز پر پڑ گیا ورنہ میں گر جاتی۔ لمحوں میں ہی اندازہ ہوا کہ ماہِ رخ کے بھاری بھر کم لباس اور میرے دوپٹے کے ایک سرے نے آگ پکڑ لی تھی۔ میں یکدم گھبرا گئی، کسی نے بڑھ کر ایک ایک کر کے سارے دیے بجھا دیئے، شور مچا دیا۔

ہم دونوں کے کپڑوں سے بھی آگ فوراً بجھادی گئی تھی۔ کپڑا جلتے اور دیوں کے بجھنے کی ایک مخصوص سی بوفضا میں پھیل گئی اور اس سے بھی بڑھ کر جو چیز فضا میں پھیلی تھی وہ تیسرے اور مظہر کی ایک رشتہ داری ”سرکوشی“ تھی، جسے انہوں نے کہا تو سرکوشی کے انداز میں تھا مگر وہ سب کی سماعتوں تک پہنچ گئی تھی، جو بھی متعلقہ لوگ تھے، ”اے ہئے!!! ایسی غصہ والاکام کرو گے تو اندر لگی ہوئی آگ کسی نہ کسی طرح باہر سے بھی تو جلانے گی۔ تمہیں کوئی سہاگن نہ ملی تھی دہن کا سواکت کرنے کو؟“ میں تو وہیں پتھر ہو گئی۔

کس نے کیا کہا، انہیں کسی نے ڈانٹایا منع کیا..... مجھے کچھ علم نہ ہوا۔ نہ مجھے کچھ اور سنائی دے رہا تھا نہ کچھ نظر آرہا تھا۔ ”اندر لگی ہوئی آگ باہر آگئی!“ میری سماعتوں میں یہی گونج رہا تھا۔ کس کے اندر آگ لگی تھی؟ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے میرے ہی بارے میں کہا تھا۔ مگر انہوں نے ایسا سوچا بھی کیونکر؟ بس میں اس سارے منظر میں نہ رہی تھی، جانے کیسے اندر آئی تھی اور کیسے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ امی جان نے مجھے پکارا، ”ماہا بیٹا! چلو اب دہن کو کمرے میں پہنچاؤ تم اور نگہت۔“ میں جیسے نیند سے جاگ گئی تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے امی جان نگہت سے کہیں!“ میں نے بے خیالی سے کہا۔

”ایسی باتوں کو دل پر نہیں لیتے بیٹا!“ امی جان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ”حاصل نہ صرف خود اپنی آگ میں جلتا ہے بلکہ وہ اپنے ارد گرد موجود ہر شخص کو اس آگ سے بھسم کر ڈالتا ہے۔ اسی لیے تو میں نے اس خاندان میں رشتے نہیں کیے، بچیاں لاکھ اچھی سہی مگر ان کی ماؤں کے دلوں میں تکبر اور حسد بہت ہے اور دوسرے کو خوش دیکھ کر ان سے برداشت نہیں ہوتا۔“

”نہیں امی جان! ایسی بات نہیں ہے۔ میری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں۔ میں تھک گئی ہوں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ پھر بھی ان کی ناراضی کے ڈر سے اٹھی اور نگہت کے ہمراہ ماہ رخ کو تھام کر اس کے گلہ عروسی تک پہنچایا، دل میں سوچ رہی تھی کہ ماہ رخ خود بھی وہاں پہنچ سکتی تھی۔ یہ سارا گھر اچھی طرح اس کا دیکھا بھالا تھا۔ ماہ رخ البتہ خاموش سی تھی۔ اسے کمرے میں چھوڑ کر ہم باہر نکلنے لگیں تو اس نے مجھے پکارا۔ میں ٹھٹھک کر رک کر اور مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہیں واقعی اس آگ کی بات سے دکھ ہوا ہے یا کوئی اور بات ہے؟“ ماہ رخ نے پوچھا۔

”میں لوگوں کی باتوں پر خواہ مخواہ دھیان نہیں دیتی۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی اور بات ہے پھر؟“ اس کا لہجہ کیسا عجیب سا تھا۔

”طبیعت خراب ہے میری“ میں نے کہا، ”میں نے بتایا تھا ناں!“

”یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کچھ کھونے کے احساس سے تو طبیعت خراب نہیں ہو گئی؟“

”میں سمجھی نہیں؟“ میں واقعی اس کی اس عجیب سی بات کو نہ سمجھی تھی۔

”تمہارا کمرہ جو میں نے لے لیا ہے..... مجھے لگا وہ بات بدل گئی ہے۔“

”ارے نہیں ماہ رخ!“ میں نے ہنسنے کی کوشش کی، ”میں کون سا اب اس گھر میں رہتی ہوں۔“

یہ گھر اب تمہارا ہی ہے، پورے کا پورا۔ اس گھر کے مکین بھی تمہارے ہیں اور کمروں کا کیا ہے، سارے کمرے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ خوشیاں تمہارا نصیب ہوں، سدا سہاگن رہو، جگ جگ جیو! میرے لیے تو تم دوست بھی ہو اور بہنوں جیسی بھی، اب تیسرے کی بیوی بن کر تم میری بھالی بن گئی ہو۔“

”بہت شکریہ!“ اس نے مسکرا کر کہا تو میں اور نگہت کمرے سے نکل آئیں۔ تیسرا بھی لاؤنچ میں ہی تھا۔

”چلو تیسرا اب آرام کرو، بہت دیر ہو گئی ہے، صبح پھر کوئی نہ کوئی کام نکل آتا ہے تقریب

تک۔“ میں نے تیسرے سے کہا۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ تیسرے نے میرے پاس کھڑے ہو کر پوچھا۔

”ہوں!!“ میں نے چہرے کو نارمل رکھا، ”مجھے کیا ہو گا بھلا؟“

”پریشان لگ رہی ہیں“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم میری فکر نہ کرو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”چلیں آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں، مگر آپ کا چہرہ اور آپ کے الفاظ اس وقت ایک

دوسرے سے مختلف ہیں۔“ اس نے جیسے حتی فیصلہ سنا دیا تھا۔

”تم جاؤ اب آرام کرو۔“ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ چلا گیا تو میں بھی اٹھی اور

ساتھ ہی باقی لوگ بھی۔ نگہت کے بچے گودوں میں ہی سو رہے تھے۔ میں نے مظہر کو تاکید کی کہ وہ

انہیں اوپر اس کے کمرے میں پہنچا دے۔ خود میں گھر پر ٹھہرنے والے باقی مہمانوں کے انتظامات

کو دیکھنے لگی۔ مزید ایک گھنٹہ لگ گیا جب میں اپنے کمرے میں آئی۔ خوشی وہاں گہری نیند سو رہی



تھی۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ کیسی اچھی عمر ہوتی ہے یہ، بے فکری والی..... اس عمر سے تو آگے بڑھنا ہی نہیں چاہئے۔ لباس تبدیل کیا اور زیور، میک اپ اتار کر میں خوشی کو ساتھ لپٹا کر لیٹ گئی۔ وہ تھکی ہوئی بے سہ سوری تھی۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے میری ذہنی پریشانی کے باوجود میرے لیے لوری کا کام دے رہے تھے۔

صبح اٹھی تو جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ تھکاوٹ بھی تھی اور اس سے بڑھ کر ذہنی تکلیف تھی جس نے یہ حال کر دیا تھا۔ میری بیوگی میں میرا کیا قصور تھا؟ شاید یہی رات سوتے میں بھی فکری تھی اور اسی وجہ سے طبیعت ٹھیک نہ رہی تھی۔ میں بستر میں کسلندی سے لیٹی تھی نکھت ہی جب خوشی کو جگانے آئی تو اس نے میری حالت دیکھ کر سب کو بتایا ہوگا، اسی لیے امی جان اور مظہر بھی میری طبیعت کا پوچھنے آ گئے تھے۔ تیمور اور ماہ رخ ابھی جاگے نہ تھے۔

”بس امی جان! تھکاوٹ سے بیمار پڑ گئی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔  
”نظر لگ گئی ہے میری بیٹی کو۔“ امی جان نے کہا اور کچھ پڑھ کر پھونکنے لگیں۔ میں ہنس دی۔  
”نظر کیا لگے گی امی جان!! اور وہ بھی مجھے۔“

”اور کسے نظر لگ سکتی ہے..... خود کو میری نظر سے دیکھو تو تمہیں علم ہو۔“ امی جان نے کہا۔

”سارا حسن تو پھر آپ کی نظر میں ہی ہوا ناں!!“ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”آپ خود کو لوگوں کی باتیں سن کر بیمار نہ کیا کریں بھابی!“ مظہر نے کہا۔

”باتوں سے بھی کوئی بیمار ہوتا ہے بھائی؟“ میں نے روہانے انداز میں کہا۔

”باتیں تو انسان مار بھی دیتی ہیں بھابی!!“ اس نے کتنی گہری بات کی تھی۔

”چلیں آپ لوگ انھیں، میں بھی ذرا فریش اپ ہو کر آتی ہوں، گھر میں مہمان بھی ہیں اور

دولہا دلہن بھی.....“ میں نے بات بدلی۔

”نکھت ہے ناں، دیکھ بھال کر رہی ہے.....“ امی جان نے کہا، ”تم لیٹی رہو۔“

”ارے نہیں امی جان! کچھ کھانی کر بخار کی دوا لیتی ہوں۔“ میں نے لہجہ میں بشارت لانے

کی کوشش کی، ”مجھے اس بخار کو بھگانا ہے، آج تیمور کا ولیمہ ہے، اتنا خوشی کا دن ہے اور میں بیمار

پڑ جاؤں۔“ میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے انہیں جانے کو کہا اور خود غسل خانے میں چلی گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر، بال سمیٹتی ہوئی نیچے آئی، تیمور لاؤنج میں بیٹھا تھا، مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا حال ہے بھابی آپ کا؟ نکھت بتا رہی تھی کہ آپ کی طبیعت کچھ نا ساز ہے!“

”بخار تھا ذرا، اب ٹھیک ہوں.....“ میں نے مسکرا کر کہا، ”تم سناؤ.....؟“

”میں کیا سناؤں؟“ وہ مسکرایا۔ ”اب میرے پاس سنانے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔“

”ماہ رخ جاگ گئی ہے کہ نہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”سوری ہے ابھی تک، میں نے جگانے کی کوشش کی تو مزاج برہم ہو گیا.....“ تیمور ہنسا،

”پہلا حکم یہ ملا ہے کہ جب تک ملکہ عالیہ خود نہ جاگیں، انہیں ہرگز نہ جگایا جائے۔“

”تو پھر بادشاہ سلامت بھی سوئے رہتے انہیں کون سا اٹھ کر امور سلطنت سرانجام دینا

تھے؟“ میں نے بھی اسی کے لہجہ میں بشارت سے کہا۔

”میری تو عادتیں فوج نے خراب کر دی ہیں..... اپنے وقت پر آنکھ کھل جاتی ہے.....“

”چلو اب کچھ عادتیں جو فوج نے خراب کر دی ہیں، انہیں ماہ رخ ٹھیک کر لے گی۔“

”ماہ رخ مجھے ٹھیک کرے گی یا میں ماہ رخ کو، یہ وقت بتائے گا!“ تیمور کے انداز میں چیلنج تھا۔

”پہلے دن تو شکست مان کر آگئے ہو، یہ تو ابتدا ہے، آگے آگے دیکھیے!“ میں بھی ہنسی۔

”نئے گھر، نئی زندگی میں اس کی پہلی رات اور پہلا دن تھا، اس لیے اسے خاص رعایت دی

ہے۔“ تیمور کھسیا ہٹ سے بولا۔

نکھت نے آکر ناشتہ میز پر لگ جانے کی خبر سنائی، مظہر بھی بچوں کو لے کر اتر رہا تھا اور امی

جان بھی آگئی تھیں۔ نکھت نے ماہ رخ کو بلانے کو کہا تو تیمور نے اسے منع کر دیا۔

”کہیں اس بات پر ہی اس کا مزاج نہ بگڑ جائے کہ اسے ناشتے کے وقت کیوں نہیں بلایا!“

نکھت نے کہا۔

”وہ سوری ہے، جب جاگے گی تو ناشتہ کر لے گی۔“ تیمور نے لا پرواہی سے کہا۔

”اس وقت اکیسے ناشتہ کرے گی؟ اس کی شادی کے بعد اس گھر میں پہلی صبح ہے۔ یا تو پھر

آپ بھی ابھی ناشتہ نہ کریں!“ نگہت نے تیمور سے کہا۔

”نگہت! مجھے ہر کام اپنے وقت پر کرنے کی عادت ہے اور میرے اپنے معمولات ہیں۔ اگر میں اپنے معمول کے مطابق ناشتہ کر لوں اور وہ اپنے معمول کے مطابق تو اس میں کیا حرج ہے؟“ تیمور چڑچڑاہٹ سے بولا۔

”نگہت ٹھیک کہہ رہی ہے تیمور! ماہ رخ اس بات پر برا منائے گی.....“ میں نے رسان سے کہا، ”میرا خیال ہے کہ ہمیں ناشتے پر اسے بلا لینا چاہئے، نگہت تم جاؤ اسے بلا لاؤ۔“ امی جان اور مظہر دونوں ہی خاموش تھے اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ خوشی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ناشتہ کر رہی تھی اور عبداللہ مظہر کی گود میں تھا۔ ”میں جاؤں؟“ نگہت متذبذب ہوئی، ”تیمور بھائی آپ جائیں!“ ”میں بھی تمہاری طرح اس سے ڈرتا ہوں!“ تیمور نے مسخرے پن سے کہا۔ ”تیمور تم اٹھ کر ماہ رخ کو ناشتہ کا بتا کر آؤ اور باقی لوگ خاموشی سے ناشتہ کریں۔“ امی جان نے بالآخر مدخلت کی۔

”رہنے دیں، اسے سونے دیں!“ تیمور نے ہچکچاہٹ سے کہا، امی جان خاموش ہو گئیں اور سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگیں۔ تیمور کو ان کی ناراضی کا احساس ہوا تو وہ اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف گیا، دو منٹ میں ہی واپس آ گیا۔ ”وہ کہہ رہی ہے، اسے بھوک نہیں ہے.....“ سب لوگ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔

تقریباً بارہ بجے ماہ رخ اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تو اس نے نائی اور اس پر گاؤن پہن رکھا تھا۔ گیلے بال اس نے صرف تو لیے سے جھٹکے تھے اور اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ”صبح بخیر!!“ لاؤنج میں آکر اس نے کہا، جہاں ہم سب بیٹھے ہوئے تھے۔ مظہر نے اپنی کلائی والی گھڑی پر اور اسی وقت امی جان نے کلاک پر بے اختیاری وقت دیکھا۔ ”اس وقت کوڈو پہر کہتے ہیں بھابی!!“ مظہر نے سادگی سے کہا۔ ”ماہ رخ! کیا لوگ ناشتے میں؟“ میں نے فوراً بات بدلی۔

”آپ کے ہاں دوپہر ہو چکی ہے، اس لیے میرا ناشتہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا.....“ ماہ رخ نے اپنی خاص ادا سے کہا۔

”مذاق کر رہا ہے مظہر!!“ میں نے مظہر کا دفاع کیا۔

”میں نے اسے تمہارے ساتھ مذاق کرتے ہوئے تو کبھی نہیں دیکھا.....“ ماہ رخ نے ناراضی سے کہا، ”صرف میں ہی ملی ہوں اسے مذاق اڑانے کو؟“

”ماہ رخ! ہم سب آپس میں مذاق کر لیتے ہیں، یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے.....“ تیمور نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے یہ بات پسند نہیں کہ مجھ سے ہر کوئی اور ہر وقت، بے موقع مذاق کرے۔ میں اس گھر میں بہو بن کر آئی ہوں اور مظہر تمہارا چھوٹا بھائی ہے، اسے چاہئے کہ میری عزت کرے۔“ امی جان، نگہت اور مظہر حیرت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

”اوہو ماہ رخ! اب ایسا بھی کیا ہو گیا ہے..... ہم سب گھر میں دوستوں کی طرح ہیں اور اس طرح کا مذاق چلتا ہی رہتا ہے.....“ میں نے صلح صفائی کروانے کی کوشش کی۔

”میرا اس گھر میں ایک رشتہ ہے سب سے، امی جان کی بہو ہوں، تیمور کی بیوی اور نگہت بھابی اور مظہر کی بھابی..... اس لیے مجھے اسی طرح کی عزت اور احترام کی ضرورت ہے۔ تم اس گھر میں چاہے دوست کی حیثیت سے رہو، مگر کس کس کی دوست؟ اس کا بھی تعین کر لینا.....“ اس کے الفاظ تھے یا ہم سب کے لیے مستقبل کا پلان اس نے پیش کر دیا تھا۔ سب سُن ہو کر رہ گئے تھے۔

”بہو! اپنے کمرے سے باہر نکلتے وقت اپنا حلیہ تبدیل کر کے نکلا کرو، گھر میں جوان دیور بھی ہے اور یوں بھی ایسا حلیہ میرے سامنے لے کر بھی مت آیا کرو۔“ امی جان کی آواز غصے سے بلند ہو رہی تھی، ”باقی رہی عزت اور احترام، تو وہ تمہیں اتنا ہی ملے گا جتنا تم دوسروں کو دو گی۔ مظہر نے تم سے بے وقوفی میں بات تو کر دی ہے، لیکن تم نے کہہ دیا ہے تو آئندہ کبھی نہیں کرے گا۔ رہی بات ماہا کی حیثیت کے تعین کی، تو ماہا اس گھر میں میرے بعد سب سے بڑی ہے۔ آئندہ اس سے اسی حیثیت سے بات کرنا!“

امی جان کی بات کے دوران اس نے اپنے دانت بھیجنے رکھے تھے، جونہی ان کی بات ختم ہوئی وہ اسی خاموشی سے مڑی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ ہم سب کے درمیان خاموشی کا ایک

طویل وقفہ آگیا تھا۔ کیسا برا آغاز ہوا تھا..... ہر کوئی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔  
 ”سوری! تیمور بھائی، مظہر کی آواز خاموشی کے تالاب میں پہلا کنکر ثابت ہوئی تھی۔  
 ”تم اپنی زبان پر قابو رکھنا سیکھو!!“ امی جان نے مظہر کو سرزنش کی۔  
 ”میں تو پہلے ہی کہتی تھی.....“ نگہت نے ایک اور پتھر اچھالا۔  
 ”سب ٹھیک ہو جائے گا! ہم ہی ذرا برداشت کر لیں گے۔“ میں نے جیسے کنویں سے آواز نکالی۔  
 ”ٹھیک نہیں ہوگا، سب خراب ہوگا، اس سے بڑھ کر خراب ہوگا۔“ نگہت کی آواز بلند تھی۔  
 ”جانے میرے نصیب میں اس گھر میں کیا کیا تماشے دیکھنا لکھے ہیں!!“ امی جان کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

”پلیز امی جان!! آپ ہی ذرا برداشت سے کام لیں۔“ میں نے منت کی۔  
 ”سارا قصور تو میرا ہی ہے، میں ہوں ہی برا۔“ مظہر کا لہجہ جذباتی تھا۔  
 ”اے اس گھر کے طور طریقے سیکھاؤ تیمور! اے بتاؤ کہ اسے کس طرح دوسروں کے لیے اپنا دل اور اپنا ظرف بڑا رکھنا ہے..... اگر اسے اس گھر میں رہنا ہے تو!“ امی جان نے غصے سے کہا۔  
 ”پلیز امی جان!!“ میں کھکھکیائی۔  
 ”آپ امی جان کو بات کرنے دیں بھابی!!!“ نگہت نے مجھے ٹوکا، ”وہ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... اگر تیمور بھائی اسے نہیں بتائیں گے کہ اسے کس کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے تو پھر وہ سیکھے گی کس طرح؟“

”یہاں رہنا شروع کرے گی تو آہستہ آہستہ سب سمجھ جائے گی!“ میں نے دلیل دی۔  
 ”وہ پہلی دفعہ یہاں نہیں آئی ہے۔ بہت عرصے سے آ رہی ہے اور اس گھر اور اس کے کینوس کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہے۔“ نگہت نے بحث کی۔  
 ”وہ سب جانتی بھی ہے اور سمجھتی بھی ہے، اتنی معصوم وہ ہرگز نہیں ہے، لیکن اس گھر میں اپنی مستقل آمد کے پہلے ہی دن وہ ہم سب پر جتا رہی ہے کہ وہ یہاں کس طرح رہے گی اور ہمیں اس کو کیا مقام دینا ہوگا۔“ امی جان کے لہجے میں سختی تھی۔

”ٹھیک ہے امی جان!“ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، ”اب تو میں یہاں مہمان ہوں اور نگہت بھی، یہ گھر اب اسی کا ہے اور آپ لوگ بھی اسی کے ہیں، ماں، شوہر اور بھائی۔ اسی نظر سے

آپ تینوں اسے دیکھیں تو میرا اندازہ ہے کہ گھر کی گاڑی ٹھیک چلے گی۔ وہ اب اس گھر کی بہو ہے، بڑی بہو!! اور اسے یہ مقام آپ سب کو دینا ہی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب اس کی عزت کریں گے تو وہ بھی آپ کی عزت کرے گی۔ نئے ماحول میں سیٹ ہونے کے لیے اسے کچھ وقت لگے گا، آپ سب کے مزاج اور طبیعتیں سمجھنے کے لیے بھی اسے وقت چاہئے!“  
 ”تم کچھ نہیں بول رہے ہو اس معاملے میں؟ جیسے تمہارا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔“ امی جان نے تیمور سے کہا۔

”میں کیا بولوں؟ یوں بھی آپ سب ماہ رخ کی بابت بات کر رہے ہیں۔“ تیمور نے لاپرواہی سے کہا۔  
 ”تو ماہ رخ کون ہے اور اس گھر میں کس حوالے سے ہے؟“ امی جان نے زور دے کر پوچھا۔  
 ”ماہ رخ آپ کی بہو ہے، بیٹیوں جیسی ہے اور یہی اس گھر میں اس کا معتبر حوالہ ہے۔“  
 ”اس گھر میں سب سے زیادہ معتبر حوالہ اس کا تمہاری بیوی ہونا ہے۔ شوہر کی حیثیت سے تمہیں اس کو اس گھر کے قاعدے قانون سکھانے ہیں۔“  
 ”گھر بیاہمت سے رہنے کی جگہ ہوتے ہیں امی جان! وہاں قاعدے قانون کیا ہوتے ہیں، ان کا تو مجھے خود بھی علم نہیں ہے.....“ تیمور رسان سے بولا، ”رات کو وہ اس گھر میں آئی ہے..... آپ لوگ ذرا ہاتھ ہلکا رکھیں۔ اس کی نئی زندگی کا آغاز ہی آپ طنز و تشنیع اور اعتراضات سے کریں گے تو پھر اس کو بھی اس گھر میں سیٹ ہونے میں دقت ہوگی۔“  
 ”دیکھ لیں امی جان!!“ نگہت بولے بنانہ رہ سکی۔

”نگہت!!“ میں نے سرزنش کی، ”تیمور ٹھیک کہہ رہا ہے۔ دن کا آغاز ہی غلط ہوا ہے اور ہماری طرف سے ہوا ہے۔ مظہر نے بے سوچے سمجھے ایک بات کر دی اور اس سے ہنگام بن گیا۔“  
 ”تو میں جا کر ان کے پیروں میں گر کر گڑا کر معافی مانگ لوں!!“ مظہر نے میری بات کاٹی اور اس کی آواز خاصی بلند تھی۔ میں نے اور تیمور نے ایک ہی وقت میں حیرت سے اسے دیکھا۔  
 ”اس کی ضرورت نہیں ہے!“ میں نے فوراً کہا، ”نگہت پلیز! ذرا ناشتہ تیار کر کے ماہ رخ کے کمرے میں بھجوا دو، میں اس سے بات کرتی ہوں۔“ مظہر اٹھ کر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔

میں نے دو تین دفعہ دروازے پر ہلکی سی دستک دی، لیکن اندر سے جواب نہ دارا..... مجھے معلوم تھا کہ وہ کمرے میں ہی ہوگی اور دستک کی آواز بھی سن رہی ہوگی، لیکن جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی ہوگی۔ زیادہ زور سے دستک دیتی تو ملازمین تک آوازیں جاتیں۔ تب تیمور اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے آکر دروازہ ہینڈل گھا کر کھولا، ”دروازہ تو کھلا ہے بھابی!! آپ اتنی دیر سے دستک دے رہی ہیں۔“

”بغیر اجازت کے اندر آنا تو غیر اخلاقی حرکت ہوتی.....“

ماہ رخ اسی طرح بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، یہ محسوس کر کے بھی کہ کوئی کمرے میں آیا ہے اس نے جنبش تک نہ کی تھی۔ تیمور نے آگے بڑھ کر اس کی سائیڈ ٹیبل کا لیپ آن کیا۔

”ماہ رخ!“ تیمور نے اسے پکارا، جواب نہ ملنے پر اس نے اس کے شانے کو ہلکا سا چھوا۔

”مت چھوؤ مجھے! مجھے اکیلا چھوڑ دو.....“ اس نے بلند آواز سے کہا تھا۔

”بھابی آئی ہیں.....!!“ تیمور نے کھیانے لہجے میں کہا۔ وہ پھر بھی اسی طرح پڑی رہی، خاموش اور بے حرکت۔

”تیمور! تم ذرا ہم دونوں سہیلیوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو گے؟“ میں نے کہا تو تیمور نے میری طرف دیکھا، میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا، ”ہمیں بھی کچھ باتیں کرنا ہیں..... تمہاری باتیں تو کبھی ختم ہی نہیں ہوں گی.....“ میں نے لہجے میں بشارت لانے کی کوشش کی۔ تیمور خاموشی سے باہر نکل گیا، جونہی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی، ماہ رخ نے کروٹ بدلی، اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رو رہی تھی۔ میں نے دل میں تکلیف محسوس کی..... آج اس کی نئی زندگی کی پہلی صبح تھی اور آغاز ہی ایسا ہوا تھا۔ میں نے کرسی گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے نزدیک کی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکائیں۔ خاموشی کا وقفہ آیا۔

”میں تم سے معذرت کرتی ہوں ماہ رخ، منظر کی طرف سے، اگر تم چاہو تو وہ بھی تم سے معافی مانگ لیتا ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”کس بات کی معافی؟“ ماہ رخ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اس نے بے وقوفی میں تم سے مذاق کر دیا۔ اصل میں وہ گھر میں چھوٹا بھی ہے اور کم عمری میں یتیم ہونے کی وجہ سے سب کا لاڈ لا بھی!“

”تمہیں وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں، یہ سب باتیں میں جانتی ہوں..... اور اس نے کوئی مذاق کیا ہی کب ہے، اس نے توجہ بولا تھا، اسی لیے میں واپس آگئی اور یوں بھی میں قابل اعتراض علیے میں تھی، اس لیے زیادہ دیر تک اپنی ساس صاحبہ کے سامنے رہنا مناسب نہ سمجھا!“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

”پلیز ماہ رخ! تم جانتی تو ہو، ہمارا گھر انہ تمہارے گھر کی نسبت ذرا قدامت پسند ہے.....“

”ہمارا گھر انہ؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں شپٹا گئی۔ ”اور قدامت پسند؟ ہونہ!“

”سوری ماہ رخ! میں ابھی تک ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس گھر سے ہی منسلک پاتی ہوں،

کیونکہ اس گھر کو میں اپنا گھر ہی سمجھتی ہوں۔ پہلے یہ میری سرال تھا، اب مجھے یہ اپنا میکہ لگتا ہے۔“ میں نے خواہ مخواہ اس کو وضاحت دی۔

”میں سب جانتی ہوں، تمہیں بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

”اس گھر کے سب لوگ بہت پر خلوص، سادہ اور سچے دل سے پیار کرنے والے ہیں۔ ذرا سادہ تمہیں اپنے رویے میں چلک پیدا کرنا ہوگی۔ کچھ وقت لگے گا، ان کو سمجھ لو گی اور یہ لوگ تمہیں سمجھ لیں گے تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ سب اسی طرح لگنے لگیں گے، جیسے یہ مجھے لگتے ہیں۔“ میں بول رہی تھی اور وہ سن رہی تھی، ”تمہیں تیمور سے پیار ہے ناں..... یہ سب تیمور ہی کی ذات کے حوالے ہیں، تیمور کی امی، تیمور کا بھائی، نگہت تو خیر تیمور کی بہن ہونے کے علاوہ تمہاری بھابی بھی ہے اور میں بھی تیمور کی بہن!!“ میری بات پوری ہوئی تو اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

”تمہیں اپنی صفائی دینے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“ کیا چہبتا ہوا سوال تھا۔

”صرف یہ بتا رہی ہوں کہ جس سے پیار ہوتا ہے، اس کی تو ہر چیز سے پیار ہوتا ہے، اس کے ہر رشتے سے ویسی ہی محبت، جیسی وہ خود کرتا ہے..... تب ہی تمہارا اس سے پیار مکمل ہوگا.....“ میں نے اس کا ہاتھ اب بھی تھام رکھا تھا۔

”حقیقت تو حقیقت ہی ہوتی ہے ماہ! نہ مجھے تیمور کے رشتوں سے تیمور جیسا پیار ہو سکتا ہے اور نہ ہی میں تیمور سے توقع کرتی ہوں کہ وہ میرے رشتے داروں سے ویسا پیار کرے۔ میں تصوراتی اور خیالی دنیا میں نہیں رہتی۔“ ماہ رخ کے لہجے میں دو ٹوک انداز تھا۔

”چلو نہ سہی دیے، لیکن ایک لڑکی جب اپنا گھر چھوڑ کر نئے گھر میں آتی ہے تو دراصل وہی

اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ اسی گھر میں اس کا جینا مرنا ہوتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔  
 ”ضروری تو نہیں ہے..... کہ وہیں جیا جائے اور وہیں مرا جائے۔ جیسے تم یہاں بیاہ کر تو  
 آئیں مگر یہاں رہنے کا فیصلہ تمہارا اپنا تھا، غالب بھائی کے مرنے کے بعد بھی.....“ میری آنکھوں  
 میں کرچیاں چھینے لگیں، ”ضروری تو نہیں تھا کہ تم یہاں رہتیں..... جیسے اب چلی گئی ہو، بہت پہلے  
 چلی جاتیں، کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر دوسری شادی کر کے آرام سے اپنی زندگی بسر کرتیں..... جو  
 کام تم نے اب کیا ہے، بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔“  
 ”میں اس گھر میں پیار کے رشتوں سے بندھی ہوئی تھی ماہ رخ! غالب کے اپنے مجھے میرے  
 اپنے لگتے تھے، میں کیسے انہیں چھوڑ کر چلی جاتی؟“

”کوئی اپنا بنتا ہے نہ بناتا ہے ماہ! یہ سب غرض کے رشتے ہوتے ہیں، اس گھر والوں کو تمہاری  
 ضرورت تھی، سوانہوں نے تمہیں جگہ دے دی۔ میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے، مجھے معلوم ہے کہ  
 میں صرف تیمور کی وجہ سے اس گھر میں ہوں۔ امی جان نے نہ صرف میرے رشتے کو دل سے تسلیم  
 کیا ہے، نہ وہ یہ چاہتی تھیں اور نہ ہی وہ مجھے گھر میں وہ جگہ دے پائیں گی جو تمہاری تھی، اور رہے  
 گی.....“ اس کا تجزیہ مکمل طور پر غلط بھی نہ تھا، میں اس کو جھٹلا بھی نہ سکتی تھی۔

”اس گھر میں اب تم بڑی بہو ہو، اور وہی ہوگا جو تم چاہو گی، لیکن بڑی بہو ہونے کے ناطے  
 سے تمہاری ذمہ داریاں بھی بڑی ہیں اور اپنا دل بھی بڑا کرنا ہوگا۔“ اس نے میرے ہاتھ مضبوطی  
 سے تھام لیے، ”چلو اب اٹھو، اپنے گھر میں اپنا پہلا دن خوش مزاجی سے گزارو..... آہستہ آہستہ  
 سب ٹھیک ہو جائے گا، جب تمہیں اس گھر کے مکینوں کی سمجھ آ جائے گی اور مسکراؤ..... آج شام کو  
 تمہارا ولیمہ بھی ہے۔“ وہ مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جو آپ کا حکم جناب! آپ بڑی ہیں مرتبے میں۔“

ماہ رخ کی گھر میں آمد کے بعد کیا حالات پیش آ سکتے ہیں، اس کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کا  
 اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا، لیکن یہ سب کچھ پہلے دن ہی شروع ہو جائے گا اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔  
 میرے ذہن پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اس گھر سے جا کر بھی میں خود کو اس گھر کے حالات اور مسائل  
 سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ والدہ کے گھر پر ہوتے ہوئے ان کے گھر کے مسائل کی فکر رہتی تھی اور

دن میں کئی بار سوچتی کہ امی جان کیا کر رہی ہوں گی، یا تیمور اور مظہر کیسے ہوں گے۔  
 ماہ رخ کا رویہ، مجھے مسئلہ محسوس ہو رہا تھا، اس گھر کا نہیں بلکہ میرا اپنا۔ کیونکہ امی جان تو مجھے  
 بتا چکی تھیں کہ میں نے ہی اس کا رشتہ مانگنے میں اتنا دلا پن دکھایا تھا۔ اس سے میرا رشتہ تو کوئی نہ تھا،  
 صرف کالج میں کلاس فیلو ہونے کا تعلق تھا، جسے دوستی کہنا بھی بجا نہ تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ تیمور  
 سے کہوں گی کہ جیسے بھی ہوا سے اپنے ساتھ لے جائے، اسی میں سب کا بھلا تھا۔ شاید یہی ماہ رخ  
 بھی چاہتی ہوگی۔ اسے ہرگز شوق نہ تھا باقی گھر والوں سے پیارا اور اتفاق سے رہنے کا۔

اور بہتر بھی یہی تھا کہ وہ علیحدہ رہتی تاکہ ہر روز چلی کٹی سنانے کا موقع نہ ملے۔ یہ اس کی ہمیشہ  
 سے ہی عادت تھی اور اس کا تبدیل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس ایک تعلق کی ڈور سے نگہت کا گھر بھی بندھا  
 ہوا تھا۔ اگر ماہ رخ اور تیمور کے بیچ کچھ غلط ہوتا یا ماہ رخ کے اختلافات سسرال میں بڑھ جاتے تو  
 اس کی آنچ ٹھہرت اور اعجاز کے گھر تک ضرور پہنچتی۔ میں نے رشتہ مانگتے وقت یہ سب کیوں نہ سوچا  
 تھا۔ صرف یہی سوچا تھا کہ اگر ماہ رخ سے رشتہ ملے نہ ہوا تو نگہت اور اعجاز کے رخصتی سے قبل  
 تعلقات کا راز ہمارے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل جائے گا۔ اس ایک راز کو پٹاری میں رکھنے  
 کے لیے میں نے جو عقلمندی کی تھی اب اس کا خیا زہ بھگتنے کا وقت تھا۔

اب تو اور بھی دھڑکا لگ گیا تھا کہ جانے وہ کس وقت غصے میں اس راز کو مظہر اور تیمور کی  
 موجودگی میں طشت از بام کر دے۔ امی جان ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ نگہت اور اعجاز کی شادی کے بعد تو  
 اس کی اتنی وقعت بھی نہ رہی تھی اور پھر دونوں کو بتایا بھی جاسکتا تھا کہ شرعی طور پر وہ میاں بیوی تو  
 نکاح کے دو بول پڑھتے ہی بن چکے تھے۔ لیکن یہ سب اتنا آسان کہاں تھا۔ میں تیمور اور مظہر کو  
 جانتی تھی، دونوں ہی چند معاملات میں جذباتی تھے۔ تیمور تو پھر بھی عملی زندگی میں آکر کچھ تبدیل  
 ہو گیا تھا، اس کی شخصیت نسبتاً مضبوط ہو گئی تھی اور وہ عموماً فوری رد عمل کا مظاہرہ نہ کرتا تھا، لیکن مظہر  
 کی جذباتیت اور انتہا پسندی کے تو میں کئی مظاہرے دیکھ چکی تھی۔ وہ غصیلا اور جوشیلا بھی تھا اور  
 جیب میں ہتھیار بھی رکھتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ مجھے ماہ رخ کو سمجھانا چاہئے کہ اس سے ذرا احتیاط رویہ رکھے اور کوئی بھی ایسا  
 موقع نہ آنے دے، ایسا نہ ہو کہ مظہر کسی بات پر غصے میں آکر کچھ اور ہی کر بیٹھے، خود کو یا.....

بعد دو پہر ماہ رخ تیار ہو کر نگہت کے ساتھ اپنے میکے چلی گئی، اعجاز ان دونوں کو لینے کے لیے آیا تھا۔ وہیں سے اس کو بیوٹی پارلر جانا تھا اور پھر سیدھا شادی ہال میں ہی آتا تھا۔ دو پہر میں مظہر دو دفعہ ہال میں جا کر انتظامات کا جائزہ لے کر آیا تھا۔ ہم سب کو بھی اپنے مقررہ وقت پر تیار ہو کر ہوٹل پہنچنا تھا اور جیسے باقی سب مہمان آرہے تھے اسی طرح ہمیں بھی مہمانوں کی طرح جانا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ دوبارہ گھر کی فضا کشیدہ نہ ہو۔ ماہ رخ جاتے ہوئے ہم سب کے ساتھ بیٹھ کر خوشی خوشی دو پہر کا کھانا کھا کر گئی تھی۔ مظہر سے بھی پوچھا کہ اسے کھانے میں کیا پسند ہے.....

جاتے ہوئے اس نے امی جان سے پوچھا بھی کہ کیا وہ چلی جائے..... اندر سے تو سب کو الجھن ہو رہی تھی کہ اس کا رویہ اتنا دوستانہ کیسے ہو گیا تھا، میں دل ہی دل میں اس کی منمن ہوئی کہ اس نے اپنے رویے میں ذرا سی پلک پیدا کر لی تھی تو کشیدگی کچھ کم ہو گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ اپنی بات پر اڑی رہتی تو بھی میں اس کا کیا کر سکتی تھی؟ ”اللہ کرے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح کا مظاہرہ کرے، مصلحت پسندی کے ساتھ رہے.....“ میں نے دل سے دعا کی۔

بیوٹی پارلر سے نگہت کی کال آئی تھی کہ تیمور کو فوٹو سیشن کے لئے وہاں جانا تھا، تیمور خاصا جھنجھلایا ہوا تھا۔ ”اب عین تقریب کے وقت میں پارلر چلا جاؤں، یہ کیا دھکوسلا ہے، بھلا میرا کیا کام وہاں..... مہمانوں کا استقبال کون کرے گا؟“

”یونہی ہر بات کا بیکٹرنہ بنالیا کرو۔ جو بھی زمانے کے تقاضے ہیں انہیں نبھانا تو ہے۔ جاؤ اور جلدی آجانا، کسی کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ فوٹو سیشن کے لیے گئے تھے۔ اچھا ہے اس طرح تم انہیں ساتھ لے کر آ جاؤ گے!“ میں نے اسے سمجھایا۔

”امی جان کو جانتی ہیں آپ، وہ تو ایسی فضول چیزوں سے چڑتی ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔  
 ”چلو وہ چڑتی رہیں، تم تو نہ چڑو۔ تم تو آج کل کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنا سیکھو اور پھر ماہ رخ اب تمہاری زندگی کی ساتھی ہے، اس کی خوشی کو بھی ملحوظ رکھو..... تو ہی وہ تمہاری خوشی کا خیال رکھے گی۔“ میں نے اسے کہا تو وہ ہنس دیا۔

”باتوں سے تو میں عورتوں سے کبھی بھی نہیں جیت سکتا، میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں، اور آپ کو میری کمزوریوں کا علم ہے اس لیے آپ ہمیشہ اپنی بات منوالیتی ہیں۔“ اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا کیا کمزوریاں ہیں آپ کی؟ ذرا ہمیں بھی تو علم ہو.....“ میں نے سوال کیا۔  
 ”آپ کا خلوص، آپ کی دوستی، آپ کی محبت میری کمزوری ہے.....“ تیمور کے کندھے کے پیچھے مجھے مظہر کا چہرہ نظر آیا تھا، اس سے قبل کہ میں کچھ کہتی، ”آپ میری کمزوری ہیں..... آپ کی کوئی بات میں ٹال ہی نہیں سکتا.....“

”واہ! واہ!“ مظہر نے تالیاں بجائیں تو تیمور چونک کر مڑا، ”یہ کیا ہو رہا ہے، کسی ڈرامے کی ریہرسل؟ یا بھابی سے ڈائلاگ سیکھ رہے ہیں آپ، ماہ رخ بھابی کے ساتھ بولنے کے لیے؟“  
 ”اوائے، فضول بکواس نہ کرو، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ماہ رخ سے ایسے ڈائلاگ بولنے کی؟“ تیمور نے اسے مصنوعی غصہ دکھایا۔

”تو اور کس کے ساتھ بولنے ہیں آپ کو یہ ڈائلاگ؟“ مظہر نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”یہ ڈائلاگ مجھے بھابی کے ساتھ ہی بولنا ہیں اور انہیں کے ساتھ بول رہا ہوں.....“ تیمور نے فوراً کہا تو مظہر نے سیٹی کے اسٹائل میں ہونٹ سکڑے.....

”واؤ!!!!!!“ میں یکدم شپٹا گئی، مظہر کا انداز ہی ایسا تھا۔  
 ”آئندہ یہ ڈائلاگ بھابی کے ساتھ بولنا ہوں تو ذرا تخیلے کا خیال کر لیا کریں..... جس طرح میں اچانک آ گیا ہوں، کسی دن ماہ رخ بھابی آ گئیں تو.....“ وہ ذرا سار کا، ”آپ کو تو شاید وہ کچھ نہ کہیں، لیکن اگر انہوں نے ماہ بھابی سے کوئی گستاخی کر دی تو بہت برا ہوگا..... میں شاید کچھ سن کر برداشت نہ کر سکوں۔“ وہ کہہ کر وہیں سکون سے بیٹھ گیا۔ میرے وجود میں جوار بھائے اٹھ رہے تھے کہ ابھی تیمور مظہر کے گلے پڑ جائے گا یا دونوں بھائیوں میں بہت بد مزگی پڑ جائے گی۔

”میں بھابی سے جو کچھ کہہ رہا تھا..... اس کا کچھ ایسا غلط مطلب نہیں ہے۔ میرے دل میں بھابی کا کتنا احترام ہے، عزت ہے اور محبت ہے، یہ سب کو علم ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے یہ بھی تمہیں معلوم ہے.....“ تیمور نرمی سے وضاحت دے رہا تھا۔

”میں تو جانتا ہوں..... اور بھی سب لوگ جانتے ہوں گے لیکن ماہ رخ بھابی کو ماہ بھابی کا اس گھر میں یہ مقام بہت کھٹکتا ہے..... اس لیے آپ اس بات کا خیال رکھیں۔ اگر آپ کو اپنی زندگی کی گاڑی کو کامیابی سے چلانا ہے تو اس کے لیے واضح راستوں کا تعین کر لیں، جہاں ماہ بھابی سے سامنا ہونے کے امکانات کم سے کم ہوں۔“ وہ چھوٹا ہو کر ہمیشہ کی طرح پتے کی بات کہہ گیا تھا۔

علی کھڑے ہو کر کھانا کھا سکتا تھا مگر میرے ساتھ کی خالی نشست پر کبھی نہ بیٹھتا۔ وجہ یہی تھی کہ اس نے میری ماتحتی میں کام کیا تھا، دل سے احترام بھی کرتا تھا، میرا ممنون احسان بھی تھا۔ شروع سے ہی میں نے جو حد فاصل رکھی تھی، وہ صرف مظہر علی ہی کیا، میرے دفتر کے تمام عملے کو مجھ سے با تکلف رکھتی تھی۔

مہمان آہستہ آہستہ کھانا کھا کر رخصت ہو رہے تھے، ماہ رخ اور تیمور کو اس رات ماہ رخ کے میکے جانا تھا، سو وہ بھی تمام مہمانوں کے ساتھ رخصت ہوئے اور بالآخر ہم بھی گھر لوٹ آئے۔

اگلی صبح میں نے مظہر سے کہا کہ وہ مجھے والدہ کی طرف چھوڑ آئے کیونکہ کافی دن ہو گئے تھے مجھے آئے ہوئے۔

”بیٹا! ایک دفعہ ذرا اپنی نگرانی میں دو لہا دلہن کا کمرہ بلقیس سے صاف کروادو، کئی چیزیں ادھر ادھر پڑی ہوتی ہیں، کہیں کچھ گم ہو گیا تو.....“ امی جان نے مجھے کہا تو میں نے بلقیس کو بلایا۔ وہ باورچی خانہ صاف کر رہی تھی، میں اسے فارغ ہونے کا کہہ کر اس کے کمرے میں آگئی جواب ماہ رخ اور تیمور کا کمرہ تھا، کبھی وہ کمرہ میرا اور غالب کا کمرہ تھا اور پھر کتنے سال میں نے اس کمرے میں گزارے تھے۔ وہ کمرہ میری محبتوں کا، میری چاہتوں کا، میری محرمیوں کا، دکھوں کا، آنسوؤں کا اور خوابوں کا امین تھا۔ اس کمرے کی ایک ایک دیوار میرے رازوں کی امین تھی۔ میری اور غالب کی محبتوں کے اولین لمحات سے لے کر غالب کی وفات تک کا ہر لمحہ اس کمرے کے ہر کونے نے دیکھا تھا۔

○ وہ چاہتیں تیری،

وہ تیرے اولین لمس!!!

میری آنکھوں کو چھوتی ہوئی تیری نظروں کی تپش

میرے بالوں سے کھیلتی ہوئی تیری مضطرب انگلیاں

تیری سرگوشیاں..... میری خاموشیاں

تیری بے تائیاں..... میری چشم حیران

خاموشی ہو گئی تھی، بوجھل سی خاموشی.....

”تم اب جاؤ تیمور! پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے.....“ میں نے خاموشی کو توڑا۔

”ہم لوگ نکلیں اب، اگر تم لوگ تیار ہو تو.....؟“ امی جان تیار ہو کر نکل آئی تھیں۔ ہم سب بھی تیار ہی تھے، ایک گاڑی میں تیمور روانہ ہوا اور دوسری میں ہم، میں نے امی جان کو بتا دیا کہ تیمور پارلر سے ماہ رخ کو لیتا ہوا سیدھا ہال میں پہنچے گا۔

صرف بڑے شہروں میں ہی نہیں بلکہ اب تو یہ وبا چھوٹے شہروں تک بھی پھیل گئی ہے، شادی بیاہ کی تقریبات کا خواہ مخواہ آدھی آدھی رات تک چلنا۔ تقریبات کا رڈز پر دیئے گئے وقت سے گھنٹوں لیٹ شروع ہوتی ہیں اور پھر اسی طرح دیر تک چلتی ہیں۔ ہمارے مہمان بھی اکا دکا کر کے آہستہ آہستہ آرہے تھے۔ کارڈز پر دیئے کا وقت ہم نے رات آٹھ بجے کا دے رکھا تھا اور ہم اس وقت استقبال کے لیے موجود تھے مگر مہمانوں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ سب سے پہلے مہمان بھی ساڑھے آٹھ بجے آئے اور پھر ایک سلسلہ چل پڑا۔ نوبے تیمور، ماہ رخ اور نگہت بھی آ گئے تھے۔ خوشی اور عبد اللہ اپنی دوھیال میں تھے۔

زیادہ تر مہمان آپکے تھے جب ماہ رخ کے میکے والوں کی آمد ہوئی، ہم نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور ہم سب سے مل کر وہ اسٹیج کی طرف بڑھ گئے جہاں ان کی بیٹی اور داماد جلوہ افروز تھے۔ جلد ہی سب مہمانوں کو کھانا پیش کر دیا گیا۔ میں نے اسٹیج پر دو لہا دلہن کے لیے کھانا اپنی نگرانی میں بھجوایا اور اپنا کھانا لے کر بیٹھنے کے لیے جگہ ڈھونڈنے لگی۔ صدف اپنی، سکینہ آنٹی، والدہ، ثانیہ، زارا، ابو اور علی بھائی بیٹھے تھے، میں نے ابو کے ساتھ والی نشست سنبھالی اور تھوڑی دیر کے بعد مظہر علی بھی اسی طرح جگہ ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا۔ سوئے اتفاق میرے ساتھ والی نشست خالی تھی۔

مظہر علی نے وہاں بیٹھنے کی بجائے، ارد گرد دیکھنا شروع کر دیا۔ ”بیٹھ جاؤ یا ر!“ علی بھائی نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ مظہر علی ذرا سا ہچکچایا، میرے اور علی بھائی کے درمیان نشست خالی تھی، جبکہ علی بھائی کی بائیں طرف ثانیہ بیٹھی تھی۔ مظہر علی کو متذبذب دیکھ کر ثانیہ اپنی نشست سے اٹھ کر میرے ساتھ کی خالی نشست پر آ بیٹھی۔ میں نے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مظہر

سب ابھی تھیں یہاں!!!

اب کھو گئیں کہاں..... میرے صنم مہرباں!!

تو ہے کہاں ○

مجھے اندازہ ہی نہ ہوا کہ کب میں اس پھولوں بھری بیچ پر آ کر بیٹھی، کب میں بیڈ پر دراز ہوئی اور کب مجھ پر یادیں ایسی غالب ہوئیں کہ میں اپنے ضبط کے سبھی بندھن توڑ بیٹھی۔ بلقیس جانے کب اندر آئی اور مجھے یوں دیکھ کر امی جان کو بتانے چلی گئی۔ میں تو اس وقت چونکی جب امی جان اور ان کے پیچھے مظہر کمرے میں داخل ہوا۔ میں یوں جھٹکا کھا کر اٹھی جیسے مجھے کرنٹ لگا ہو.....

”تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟“ امی جان نے سوال کیا۔ میں خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”ہوں؟“ میں جیسے نیند سے جاگی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ماہا؟“ انہوں نے آگے بڑھ کر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے ان کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے جلتے جلتے ماتھے سے اٹھایا اور اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”اوہو!! تمہارا جسم تو تپ رہا ہے.....“

”میں ٹھیک ہوں!!“ میں نے تھوک نلکتے ہوئے کہا..... میں انہیں کیسے بتاتی کہ یہ کیسی جلن تھی..... میرے اندر کیا کرب تھا۔ اسی کمرے میں کبھی میرے لیے بھی بیچ بچی تھی..... کبھی میں نے بھی یہاں وصل کے لمحات گزارے تھے، غالب کے دل کی دھڑکنیں سنیں تھیں۔ کبھی میرے لیے بھی ہوائیں محبتوں کے پیغام لے کر آتی تھیں اور غالب کے قرب کی خوشبو مجھے محو کر دیتی تھی۔ میں کیسی تہی دست ہو گئی تھی..... میں تو جیسے زمین اور آسمان کے بیچ میں معلق ہو گئی تھی۔

”تم ٹھیک تو نہیں لگ رہیں مجھے!!“ امی جان نے اصرار کیا۔

”نہیں آپ پریشان نہ ہوں، میں ٹھیک ہوں، ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ”مظہر مجھے چھوڑاؤ چل کر والدہ کی طرف، پلیر!!“

”بھابی! آپ کی عمر کتنی ہے؟“ راستے میں مظہر پوچھ رہا تھا۔

”عورتوں سے ان کی عمر نہیں پوچھتے!!“ میں نے بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔

”میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اچھی اطلاع ہے۔“ میں نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا، ”لیکن میں اس وقت مذاق کے

موڈ میں ہوں۔“

”پھر میں نے کوئی مذاق کر دیا تو ماہ رخ بھابی کی طرح موڈ آف ہو جائے گا۔“

”میں تمہیں اچھی طرح سمجھتی ہوں چھوٹو!! اور تمہارے مذاق کو بھی.....“

”مزاج کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے مسخرے پن سے کہا۔

”مزاج آشنائی کا دعویٰ بھی کسی حد تک ہے.....“ میں نے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ پورے

انتہاک سے سامنے نظریں جمائے ہوئے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

”بھابی! آپ پلیر بلا تاخیر شادی کر لیں..... ابھی بھی آپ.....“ وہ ذرا سارکا، ”میرا مطلب

ہے کہ جوان ہیں، خوش شکل ہیں۔ زندگی کا اتنا طویل سفر کیسے گھٹ گھٹ کر گزاریں گی؟“

”زندگی کے سفر کی طوالت کا کسے علم ہے مظہر کہ اب ختم ہوتا ہے۔ باقی شادی..... شاید

میرے مقدر میں ہی نہیں ہے۔ ابھی تو میں اتنے بڑے دھوکے سے سنبھلی ہوں۔ ابھی تو میں اس

موضوع پر سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“ میں نے اداسی سے کہا۔

”آپ خود کیوں سوچتی ہیں؟ ابھی آپ کے بزرگ ہیں، انہیں سوچنے دیں۔ انہیں اپنی

زندگی کا فیصلہ کرنے دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے اس حق سے غفلت کر کے ہم سب گناہگار

ہو رہے ہیں۔“

”میں کسی کو اس سلسلے میں قصور وار سمجھتی ہوں نہ غافل..... مجھے معلوم ہے کہ میرے ارد گرد

سب لوگ میرے لیے مخلص ہیں۔ سب اپنی طرف سے میرے لیے مثبت کوششیں کرتے ہیں،

لیکن یہ میری قسمت ہی کی خرابی ہے.....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”میں بات کرتا ہوں سب بزرگوں سے، اور ہمیں اس سلسلے میں اپنی کوششیں تیز کر دینا

چاہئیں۔“ وہ بالکل سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ ”ایک دو تجاویز میرے ناقص ذہن میں بھی ہیں۔“

میں صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔



گھٹ اور اعجاز شادی کے بعد واپس جا چکے تھے، تیور شادی کے بعد ایک ماہ کی چھٹی گزار کر واپس جاتے ہوئے ماہ رخ کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ زندگی پر جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ ثانیہ اور والدہ کے درمیان کبھی کبھار خاموش محاذ آرائی شروع ہو جاتی تھی۔ میں تو پھر بھی والدہ کو ہی سمجھاتی تھی، کیونکہ ثانیہ کی اب جسمانی حالت بھی ایسی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ خوش رہنے کی ضرورت تھی۔ میں اپنی زندگی میں آنے والی ہر تبدیلی کو رضائے الہی جان کر صبر کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ ثانیہ کو علم ہو چکا تھا کہ معظم سے میری منگنی کیوں ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ اگر وہ اپنی پہلی دو بیویوں کو چھوڑ ہی چکا تھا تو مجھے اپنے رویے میں لچک پیدا کرتے ہوئے، اس کے ماضی کو نظر انداز کر کے اس سے شادی کر لینا چاہئے تھی۔ مجھے اس کے نقطہ نظر پر اس سے بحث نہ تھی۔

والدہ سے بسا اوقات وہ گستاخی کرتی جاتی تو میں بعد ازاں مناسب موقع دیکھ کر اس سے بات ضرور کرتی تھی۔ اگرچہ والدہ میرے اس عمل کو بے فائدہ سمجھتی تھیں، لیکن میرا خیال تھا کہ اصلاح کی گنجائش بھی ہوتی ہے جب ہم اس کے لیے کوشاں رہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر کہ جب ثانیہ کے آنے والے بچے کی سسرال یا میکے میں پیدائش کے حوالے سے بات ہو رہی تھی تو ثانیہ مصر تھی کہ وہ پہلے بچے کی ولادت پر میکے جائے گی۔ والدہ نے اسے سمجھایا کہ چونکہ زارا کی ساس نہ تھیں، اس لیے اسے تو میکے آنا ہی تھا، اس لیے ثانیہ کا بھی انہی دنوں میکے جانا اس کی امی پر بار بڑھا دے گا۔ ”اب تو مظہر بھائی کا اپنا کاروبار اتنا اچھا ہے، اللہ کا کرم ہے، وہ اپنے گھر میں دو بچوں کی پیدائش کا بوجھ بھی اٹھا سکتے ہیں۔“ ثانیہ نے تنک کر کہا تھا۔

”میں مالی بوجھ کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ بیٹیاں بیاہ کر سسرال والوں کی ذمہ داری بن جاتی ہیں۔ اگر زارا بھی ولادت کے لیے میکے آئے گی تو اس کے تمام اخراجات نوید کی ذمہ داری ہیں اور اگر تم بھی مصر رہیں گے تو اس کے لیے میکے ہی جاؤ گی تو اخراجات کی تمام ذمہ داری ہماری ہوگی نہ کہ تمہاری والدہ یا مظہر کی۔“ والدہ رساں سے بولیں۔ ”میں تو تمہاری امی کے لیے جسمانی طور پر بوجھ کی بات کر رہی تھی۔ دو بچے سنبھالنا ان کے لیے آسان نہ ہوگا۔“

”گھر میں ثناء بھی ہوگی.....“ ثانیہ نے دلیل دی تھی۔

”پھر بھی بیٹا..... ہمارا بھی پہلا پوتا پوتی ہوگی، اگر تم یہیں رہو گی تو ہمارے لیے زیادہ خوشی ہے۔“ والدہ نے مصالحت آمیز انداز اختیار کیا۔ بعد ازاں علی بھائی نے خود ہی ایک دفعہ بات

چھڑنے پر فیصلہ دے دیا تھا کہ ثانیہ یہیں رہے گی۔

اسی بات پر میں اسے سمجھا رہی تھی کہ بے شک مظہر کا کاروبار چل رہا ہے اور اچھا چل رہا ہے، لیکن ابھی اس پر قرضوں کا بوجھ بھی کافی تھا۔ اسے سب سے پہلے وہ اتارنا تھا۔ پھر کاروبار کا کچھ علم نہیں ہوتا کہ کس وقت اس میں اتار چڑھاؤ آجائیں۔ ابھی ثناء کی ذمہ داری باقی تھی اور پھر مظہر علی کی بھی تو ایک دن شادی ہونا تھی، اس کے اپنے اخراجات ہوں گے۔

”آپ بہت اچھی ہیں ماہاجی!! کیسی سمجھدار ہیں، ہر معاملے کو کیسی سمجھداری سے سلجھاتی ہیں۔“ وہ مسکرا کر میری تعریف کر رہی تھی۔

”ہر شخص معاملات کو سمجھداری سے ہینڈل کر سکتا ہے اور ہر عورت عقلمند ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”سمجھداری کا مظاہرہ کر کے.....“ میں نے ہنس کر کہا۔

”وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ سمجھداری کا مظاہرہ کیسے ہو؟“

”بڑوں کی بات مان کر، ان کی عزت کر کے، انہیں مان دے کر۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”اور اگر کوئی بڑا آپ کو پسند ہی نہ کرتا ہو تو؟“ وہ میری بات سمجھ گئی تھی۔

”ایک بات یاد رکھو ثانیہ!! اگر والدہ کی مرضی نہ ہوتی تو تم اس گھر کی بہو کبھی بن سکتیں۔ اس گھر میں فیصلے ابھی تک والدہ ہی کرتی ہیں۔“ میں نے وضاحت کی، ”تم ہرگز خود کو ناپسندیدہ یا ان چاہی ہو نہ سمجھو۔ علی بھائی سے بھی رائے پوچھی گئی تھی، لیکن فیصلے کا اختیار والدہ ہی کے پاس تھا۔“

”پتا نہیں ماہاجی! کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے کہ وہ مجھے میری غربت کے طعنے دیتی ہیں..... صاف طور پر تو نہیں لیکن ہمارے اور اپنے گھر کا موازنہ کرتی رہتی ہیں.....“ کہہ تو وہ کسی حد تک ٹھیک ہی رہی تھی کہ کبھی کبھار والدہ اس کی کچھ عادات کے باعث چڑ جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھار مجھے کہہ بھی دیتی تھیں کہ اس کا ذہن تنگ ہے یا ظرف چھوٹا ہے..... لیکن ایسی باتیں یا تو وہ مجھ سے کرتی تھیں یا پھر ابو سے۔ ممکن ہے کہ ثانیہ نے کہیں انہیں کچھ کہتے ہوئے سن لیا ہو۔

”والدہ نے تم نے کسی وقت کہا ہے کچھ ایسا؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”نہیں کہا تو نہیں۔“ وہ بولی، ”لیکن میں نے ان کی کچھ باتوں سے خود ہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔“ میں نے سکھ کی سانس لی کہ یہ صرف اس کا اندازہ ہی تھا۔

”پانگلوں والی باتیں مت کرو، تمہاری اولاد بھی تو والدہ ہی کی اولاد ہے ناں!! اور وہ تو ان کو علی بھائی اور تم سے بڑھ کر پیاری ہوگی۔“ میں نے فوراً کہا۔

”آپ نے کوئی نام سوچے ہیں امی جان؟“ ثانیہ نے براہ راست والدہ سے پوچھا تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، میں انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔ پھر انہوں نے مجھے دیکھا۔ ”نہیں!!“ انہوں نے آ، سگی سے کہا۔

”لیس والدہ!! آنے والا یا والی کسی بھی وقت آسکتے ہیں اور آپ نے کیسی سستی کر دی ہے، ابھی تک نام ہی نہیں سوچا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”کچھ بھی رکھ لیں جو علی اور ثانیہ کو پسند ہو!!“

”یہ کیا بات ہوئی والدہ!“ میں نے اعتراض کیا، ”ابھی علی بھائی اور ثانیہ کو کیا معلوم کہ انہوں نے آپ کے پوتے یا پوتی کا کیا نام رکھنا ہے..... آپ اپنی چوٹیں تو بتائیں؟“

”تمہارے ابو کو لڑکوں کا نام عبدالرحمن پسند ہے اور مجھے لڑکیوں کے ناموں میں ذہب.....“ بالآخر والدہ نے اپنی پٹاری کھول ہی دی۔

”دونوں نام ہی بہت پیارے ہیں.....“ ثانیہ نے دل سے کہا تھا۔

”تم لوگوں نے بھی تو کوئی نام سوچے ہوں گے؟“ والدہ نے ثانیہ سے براہ راست پوچھا، برف پکھلنے لگی تھی۔

”یقین کریں ہم نے واقعی کوئی نام نہیں سوچے تھے، ہمیں معلوم تھا کہ یہ کام آپ اور ابو ہی کر رہے ہوں گے۔“ ثانیہ نے ہنس کر کہا اور میرے اندر سکون اتر رہا تھا۔

تیمور کی کال آئی تھی، والدہ نے مجھے بتایا۔ ”اسے کہیں کہ میرے موبائل پر فون کر لے، مجھے میڈرہیاں اتر کر نیچے جانے کی سستی ہو رہی تھی۔ دراز کھول کر موبائل فون نکالا تو اس کی تیل میں نے بند کر رکھی تھی اور تیمور کی درجنوں کالیں اس پر آچکی تھیں۔ میں خود ہی شرمندہ ہو کر کال کرنے کا سوچ رہی تھی کہ پھر تیمور کی کال آگئی۔ میں نے فون آن کر کے حسب معمول سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟“ اس نے بشارت سے کہا۔

”ثانیہ! وہ ایک لطیفہ ہے ناں کہ ماں باپ ہمیں ملتے ہی اس وقت ہیں جس وقت ان کی اچھی اور بری عادتیں پختہ ہو چکی ہوتی ہیں اور انہیں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے اس کا بہتر حل یہی ہے کہ ہم اپنی کچھ عادات کو بدل لیں، زندگی آسان ہو جاتی ہے۔“

”آپ کے خیال میں میری کون سی عادت بری ہے، جو تبدیل کروں تو انہیں اچھی لگے لگوں؟“

”تم بہت اچھی ہو ثانیہ! مجھے تمہاری کوئی عادت بری نہیں لگتی ہے۔ تھوڑا وقت لگے گا کہ تم اس گھر کے طور طریقے سیکھ لو گی، اور یہ گھر تو ہے ہی تمہارا، اسے تم نے ہی چلانا ہے، والدہ تو ساری زندگی اس گھر کی سربراہ نہیں رہیں گی..... بس ذرا برداشت کی ضرورت ہے۔“

”اللہ نہ کرے.....“ مجھے امی جان کی سیٹ سنبھالنے کا کوئی شوق نہیں۔ اللہ انہیں ہمارے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے.....“ ثانیہ نے بے اختیار کہا تو میں نے اس سے بھی زیادہ بے اختیاری سے اسے ساتھ لپٹا لیا۔

”بس ان کا خیال رکھا کرو، ان کی وعائیں لو، دل کی مریضہ ہیں۔ جانے تمہارے مقدر میں کتنی وعائیں لکھی ہیں ان کی.....“ آنکھوں میں آنسو تو تھے ہی، میرا لہجہ بھی نرم ہو گیا تھا، ”انہیں اپنا دشمن نہ سمجھا کرو۔ وہ تو تمہیں ہم ساری بہنوں سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں ماہاجی!!“ وہ میرے ساتھ لپٹ گئی، ”میں ایسا نہیں سمجھتی، میرے لیے وہ میری ماں جیسی ہی ہیں۔“ یقیناً یہی مناسب وقت تھا اسے سمجھانے کا اور وہ سمجھ رہی تھی۔

”امی جان! آپ کو برا لگا ہے ناں ماہاجی کے کمرے میں بچے کا سامان رکھنا؟“ میں ثانیہ اور والدہ بیٹھے ہوئے تھے، جب اس نے اچانک پوچھ لیا۔ والدہ خاموش رہیں۔

”ثانیہ! ٹھیک کیا تم نے۔ اب ظاہر ہے کہ بچہ ہوگا تو اس کے سامان وغیرہ کے لیے ایک کمرے کی ضرورت تو ہوگی، تمہارے کمرے میں اتنی گنجائش ہی کہاں ہے..... بچوں کی تو بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوتی ہیں۔ تم نہ بھی سامان رکھتیں تو اب میں خود ہی اس کمرے کو خالی کر دیتی۔“ میں نے والدہ کی خاموشی کا مطلب سمجھ کر ثانیہ کو جواب دیا تھا۔

”امی جان سوچتی ہوں گی کہ میں نے اپنی اولاد کی خاطر ان کی اولاد کو بے کمرہ کر دیا ہے؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسے ہو؟ ماہ رخ کیسی ہے؟“

”میں بھی ٹھیک ہی ہوں!!“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟ ماہ رخ کہاں ہے؟“

”وہ گھر پر ہے، میں دفتر سے فون کر رہا ہوں.....“ وہ بول رہا تھا اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہی ہوگی جو وہ دفتر سے فون کر رہا ہے۔

”کیسی ہے وہ؟“

”ناخوش!!“ اس نے مختصر کہا۔

”ناخوش؟“ میں حیرت سے بولی، ”مگر کیوں؟“

”ساری باتیں فون پر ہی تو نہیں کر سکتا.....“

”تم آرہے ہو؟“ میں نے خوشی سے پوچھا۔

”ہاں آرہا ہوں!! امی جان کی طبیعت بھی کچھ ناساز رہتی ہے، وہ مظہر کی طرف سے بھی کچھ پریشان ہی ہیں، وہ دفتر بھی کم کم جاتا ہے..... راتوں کو بھی غائب رہتا ہے.....“

”میری تو کل ہی امی جان سے بات ہوئی ہے!“ میں نے حیرت سے کہا، ”مجھے تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔“

”بتا رہی تھیں آپ کے فون کا..... میں نے کہا بھی کہ آپ سے وہ بات کرتیں، مگر وہ آپ کا خیال کرتے ہوئے آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتیں.....“

”یہ تو امی جان نے بڑی غیریت والی بات کی ہے.....“ میں نے شکوہ کیا۔

”آپ پر ہم زندگی بھر اپنی پریشانیوں کا بوجھ بھی تو نہیں لا دیتے.....“

”لیکن ماہ رخ کیوں ناخوش ہے؟“ مجھے یکدم کچھ یاد آیا۔

”میں نے تو بتاؤں گا.....“

”میں اتنا عرصہ انتظار ہی کرتی رہوں گی؟“ میں نے احتجاج کیا۔

”میں اور ماہ رخ جیسے کوآرہے ہیں، میری دس دن کی رخصت ہے..... آپ بھی آجائیں اپنی والدہ سے دس دن کی رخصت لے کر.....“ وہ مسخرے پن سے بولا۔

”جیسے میں تو ابھی چار دن ہیں، میں کل ہی جاؤں گی امی جان خیریت پوچھنے.....“ میں نے

جواب دیا، ”اور تم سے ملنے بھی آؤں گی کسی دن!!“

”رہنے کے لیے نہیں آئیں گی کیا؟“

”اصل میں ان دنوں کسی بھی وقت ثانیہ کے ہاں ولادت متوقع ہے.....“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”جب ایسا وقت آیا تو میں خود آپ کو چھوڑنے چلا جاؤں گا۔“

”اچھا نہیں لگتا تیمور! میرا اس وقت والدہ کے پاس ہونا اہم ہے.....“ میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ میری زندگی کا مسئلہ اس وقت زیادہ اہم ہو؟“ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

”کچھ اشارہ دو تو مجھے سمجھ میں آئے.....“

”اشارہ بھی نہیں دے سکتا.....“ اس نے مجھے کنکاش میں مبتلا کر کے فون کر دیا۔

”ثانیہ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ تمہیں کب ہسپتال جانے کی ضرورت پیش آئے گی؟“ اگلے ہی روز میں اس وقت ثانیہ سے پوچھ رہی تھی جب علی بھائی دفتر جا چکے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ ابھی بیس پچیس دن تو ہیں۔“ ثانیہ نے جواب دیا، ”کیوں پوچھ رہی ہیں آپ؟“

”امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ان کی خیریت پوچھنے تو خیر آج ہی جاؤں گی۔ پھر تیمور آرہا ہے دس دن کی چھٹی، اس کی کال بھی آئی تھی کہ میں اس کی چھٹی کے دوران وہاں رہوں۔“

میں نے عام لہجہ میں کہا۔

”اب بھی وہ آپ کا کتنا خیال کرتے ہیں.....“ ثانیہ نے جیسے رشک سے کہا۔

”ہاں وہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔“

”میں تو تیمور کی بات کر رہی ہوں..... حالانکہ اب ان کی شادی بھی ہو گئی ہے.....“ اس کے لہجے میں کچھ اتنا عجیب تھا کہ میں چونک گئی۔

”کیا مطلب شادی کے بعد کیا بھائی بہنوں کا خیال نہیں رکھتے۔ علی بھائی میرا خیال نہیں

رکھتے کیا؟ کیا وہ مجھ سے پہلے جیسی محبت نہیں کرتے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

مسائل کا مارا ہوا نوجوان ہے، جس کے گھر کی پریشانیاں چہرے سے مترشح تھیں۔ کیسے میرا کارڈ دیکھ کر اس کا چہرہ چمکا تھا، امید کی کرن جو میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اپنے وزینگ کارڈ کی صورت میں۔

میرے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے دوران کتنی ہی بار اس نے دفتر کے چکر لگائے تھے، اسی امید پر کہ میں اس کے لیے کوئی نوکری پیش کروں، وہ کام شروع کرے، محنت کرے اور اپنے گھر کے حالات کو بہتری کی طرف لے جائے۔ بار بار جب وہ آیا ہوگا اور ملاقات نہ ہو سکی تو کیسے اس کے خواب بکھر بکھر گئے ہوں گے۔ وہ جو اپنے باپ اور پھر بھائی کی ناگہانی موت کے بعد اپنی ماں اور تین جوان بہنوں کا اکلوتا سہارا اور ان کی امیدوں کا تار تھا۔ جس کو غربت، تنگدستی اور کنٹھن حالات کے ساتھ ذمہ داریوں کا بوجھ زادِ راہ کے طور پر آغازِ سفر میں ہی مل گئے تھے۔

کتنی محنت کرتا تھا، عارضی ملازمتیں، ٹیوشن بھی کرتا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ زندگی کا سفر کنٹھن ہی سہی، مگر وہ کنٹھنایاں جھیل رہا تھا۔ اس کے اندر لگن تھی، کچھ کر دکھانے کی، خود کو ثابت کرنے کی، خود کو منوانے کی۔ وہ راستے میں حائل مشکلات کا سامنا کرنا چاہتا تھا، انہیں ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک مظہر علی کا نہیں، میرے ملک کے بہت سے نوجوانوں کا مسئلہ ہے۔ لیکن کتنے ہیں ان میں سے، جنہیں کوئی ہاتھ تھام لیتے ہیں، جنہیں ماہا جیسی سرپرستی نصیب ہو جاتی ہے۔

گاڑی ایک جھٹکے سے سگنل پر رک گئی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اچانک بریک لگانے پر سرزنش کی۔ ”وہ جی! یہ بچہ اچانک سامنے آ گیا تھا.....“ ڈرائیور نے وضاحت کی۔ میں نے باہر دیکھا، دس بارہ سالہ بچہ، اب میرے والی کھڑکی کی طرف آ رہا تھا۔ ہر سگنل پر، ہر چوک پر اور ہر رش والی جگہ پر مشروم کی طرح پھیلے ہوئے یہ گدا گر بچے.....

”میڈم!!!..... آپ مجھ سے پھول کی یہ ٹپلی لے لیں، صرف دس روپے میں..... بڑی دکانوں پر تو آج یہ سو روپے کی مل رہی ہوگی.....“ اس نے رٹے رٹائے جیلے بولے۔

”کیوں آج کیا ہے؟ اور اس کلی میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“ میں نے حیرت سے گلاب کی اس لال ادھ کی کلی کو دیکھ کر پوچھا۔

”آج چودہ فردری ہے میڈم! ویلنٹائن ڈے ہے۔“ اس نے جیسے میری معلومات میں

کر پوچھا۔

”علی آپ کے بھائی ہیں ماہا جی!!“

”تیور بھی میرا بھائی ہے.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

”آپ کے کہنے سے تو وہ آپ کا بھائی نہیں بن جاتا.....“

”تو پھر کس کے کہنے سے وہ میرا بھائی بن جاتا ہے؟“

”بھائی صرف وہی ہوتا ہے جس نے آپ کی اپنی ماں کے وجود سے جنم لیا ہوتا ہے، آپ کا اور اس کا ماں اور باپ ایک ہی ہو، یا کم از کم ماں یا باپ میں سے ایک سا نکھا ہو.....“ وہ جیسے مجھے سمجھا رہی تھی..... ”یوں تو سارے مسلمان ہی آپس میں بھائی بھائی ہیں..... اور بہن بھائی ہیں۔“ میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”اب آپ کہیں گی کہ آپ میرے بھائی مظہر کو بھی اپنا بھائی سمجھتی ہیں..... حالانکہ!!“

”حالانکہ کیا؟“ میں نے بے ساختگی میں پوچھا۔

”وہ آپ کو اپنی بہن نہیں سمجھتے.....“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ظاہر ہے کہ اس کی اپنی تین بہنیں ہیں مجھے بہن سمجھنے کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ میں تیور کو اس لیے بھی بھائی سمجھتی ہوں کہ اس سے میرا اس نوعیت کا رشتہ ہے، وہ کبھی میرا دیور رہا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”جبکہ مظہر کا اور میرا تعلق باس اور ماتحت کا رہا ہے اس لیے وہ کبھی بھی اس سے ہٹ کر نہیں سوچ سکتا۔“ میرا اور اس کا تعلق محسن اور احسانمند کا تھا۔

علی بھائی سے گاڑی منگوا کر میں نے والدہ اور ابو سے اجازت لی اور اپنا کپڑوں کا ایک جوڑا بھی اپنے بیگ میں رکھ لیا، شاید رات رکنا پڑ جائے، یہ سوچ کر۔ راستے سے میں نے پھولوں کی دکان سے پھول لیے۔ وہی پھولوں کی دکان، جہاں پہلی بار میری مظہر علی سے ملاقات ہوئی تھی اور اس ملاقات میں اس نے مجھ پر اس کی خودداری اور اخلاق کا بڑا اچھا تاثر چھوڑا تھا۔

پھول لے کر گاڑی میں بیٹھ بھی گئی تو یادوں کے اس سفر کا سلسلہ نہ چھوٹا تھا..... کیسا نوجوان سا لڑکا تھا، چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں، لباس سے، حلیے سے اور گفتگو سے، ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کوئی

اضافہ کیا۔

”اسٹوپڈ!!“ میں نے دل میں سوچا، ”کیسی بیوقوف قوم ہیں ہم، انگریزوں کی نقالی کرنا ہر چیز میں فرض سمجھتے ہیں۔ ہمارا بھلا کیا تعلق اس طرح کے دنوں اور تہواروں سے۔ مگر ہماری بد قسمتی سے ایسے سب اجتماع تہوار آہستہ آہستہ ہماری معاشرت کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔ ماؤں کا دن، باپ کا دن، استادوں کا دن اور یہ فضول محبت کرنے والوں کا دن۔ کیسی آسانی سے ہم مغرب کی بے تنگی رسموں پر یقین کر لیتے ہیں اور خواہ مخواہ انہیں اپنا کر اپنا مذہب اور معاشرت دوغلی کر لیتے ہیں۔

”میڈم پلیز!! لے لیں ناں..... ایک ہی کپلی لے لیں.....“ اس نے التجا کی۔

”بھیک مانگنے کے عجیب و غریب طریقے تم لوگوں نے اپنا رکھے ہیں۔“ میں بلند آواز سے بڑبڑائی تھی۔

”میں بھیک نہیں مانگتا میڈم!“ اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا تھا، ”میں پڑھتا ہوں میڈم اور فارغ وقت میں پھولوں کی دکان پر کام کرتا ہوں۔ صرف آج کے دن یوں سڑک پر نکل کر۔“ اس کے لہجے میں آنسو تھے، آنکھیں اس کی چمک رہی تھیں، احساسِ تباہی سے کہ وہ بھیک نہیں مانگتا۔

”مجھے پانچ کلیاں دے دو.....!“ میں دل میں شرمندہ ہوئی اور پرس سے پچاس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”مگر ویلنٹائن تو صرف ایک ہوتا ہے میڈم.....“ وہ نوٹ تھامتے ہوئے متذبذب تھا۔

”میں کسی ویلنٹائن پر یقین نہیں رکھتی..... پھول تو محبت کی علامت ہیں..... اس لیے لے لیے ہیں۔“ اس نے میری اس بات پر نوٹ پکڑ لیا اور شکریہ کہہ کر مڑ گیا۔ میں نے ڈرائیو کو گاڑی قبرستان کی طرف موڑنے کو کہا اور خود پھر سوچوں میں گم ہو گئی۔ اس پر عزم بچے میں بھی مجھے مستقبل کا مظہر علی نظر آیا تھا۔ مظہر علی، جسے کام کہہ کر مجھے ہمیشہ بے فکری ہو جاتی تھی، پوری محنت، توجہ اور لگن سے کام کرتا تھا۔ اس نے ملازمت کے دوران کبھی ناحق چھٹی مانگی نہ کبھی کام میں سستی کی تھی۔ اسے کام کہنے کی ضرورت ہوتی تھی سمجھانے کی نہیں، نوید صاحب بھی اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور مظہر نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ اسے مظہر علی جیسا محنتی آدمی اور کوئی نہ مل رہا تھا۔

میں نے مظہر علی کی شخصیت کو ایک پریشان حال نوجوان سے لے کر ایک کامیاب کاروباری

آدمی کے طور پر بتدریج بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سراپا محنت کی علامت تھا۔ دفتر سے قرض حسنہ دے کر میں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس کے گھر کے حالات سدھارنے کی کوشش کی تھی، جس کے لیے وہ ہمیشہ میرا ممنون احسان رہتا تھا۔ قرض کو اس نے ہمیشہ بوجھ ہی سمجھا تھا اور ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ اس کے سر سے یہ بوجھ فوراً اتر جائے۔

اپنا کاروبار اس نے اپنی ذاتی کاوشوں سے جمایا تھا۔ اپنے دونوں بہنویوں کی مدد شامل حال تھی، لیکن وہ صرف کاروبار شروع کرنے کے ابتدائی مراحل تک تھی، اس سے آگے اس نے تمام محاذوں پر خود ہی جنگ لڑی تھی۔ مجھے مظہر علی اپنے اخلاق، محنت اور عادات کی وجہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ آج کل کے عام نوجوانوں سے بہت مختلف تھا۔ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے پستے ہوئے بھی اس نے کبھی ان ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی کوشش نہ کی تھی۔ اپنی ماں اور بہنوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔

گاڑی رک گئی تھی، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، قبرستان آ گیا تھا۔ میں نے گلاب کی کلیاں ہاتھ میں پکڑ لیں اور گاڑی سے نکل آئی۔ میرے قدم اسی طرف اٹھ رہے تھے، جہاں میری محبت تہہ خاک تھی۔

○ کیسی خوش نصیب ہے تو

اے میرے پیردوں تلے کی زمیں

تجھ پر پاؤں بھی دھرتی ہوں

تو یہ احساس ہوتا ہے یہ تیری بے حرمتی ہے.....

تجھے تو میں اپنی آنکھ کا سرمہ بنالوں

اے خاکِ قبرستان

تیرے وجود میں سوری ہیں

کتنی ہی ہستیاں

جو محبتیں ہیں جیسے دالوں کی

جن کے پیارے پیارے چہرے،

جن کے لمس اور جن کے الفاظ.....

زندہ رہ جانے والوں کے وجود کی قبروں میں ہیں

اور ان کے جسد..... جسدِ خاکی

تیری خاک کا حصہ بن کر تیرے پاس ہیں

کیسی خوش نصیب ہے تو اے خاکِ قبرستان!!! ○ (شیریں حیدر)

میں غالب کی قبر کے پاس پہنچ کر اس کے پہلو کے پاس بیٹھ گئی..... ”یہاں وہ ہاتھ ہوں گے جو کبھی.....“ پہلی سوچ وارد ہوئی اور میرا وجود جیسے ہوا میں تحلیل ہونے لگا۔ ”غالب!!!“ آہ کی طرح میری آواز نکلی..... ”میں کیا کروں؟“ بے بسی کا غلبہ تھا اور میں غالب سے ہی سوال کر رہی تھی..... جہاں سے مجھے معلوم تھا کہ کوئی جواب نہ آنے والا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلیاں جیسے غالب کے ہاتھ پر رکھ دیں..... فاتحہ پڑھی اور اٹھ کر واپس روانہ ہو گئی۔ گاڑی میں آکر بیٹھ گئی اور یادوں کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ مگر اب یادوں کا یہ سفر غالب کے مختصر ساتھ تھا۔

گھر پہنچی تو امی جان بہت خوش ہوئیں۔ مجھے وہ پہلے سے کمزور لگ رہی تھیں، پھولوں کا تھفہ پا کر بہت خوش ہوئیں، سب گھر والوں کی خیریت پوچھی۔ بلقیس بھی باورچی خانے سے بھاگی آئی اور خوشی کا اظہار کیا۔ ”ڈیڑھ ماہ کے بعد آئی ہیں باجی!!!“

”بڑا حساب رکھتی ہو بلقیس!!!“ میں نے بٹاشت سے کہا، ”سناؤ گھر پر سب خیریت ہے نا؟“

”جی اللہ کا کرم ہے.....“ اس نے مسکرا کر کہا، ”آپ کے ساتھ توجی رونق ہی اور طرح کی ہوتی ہے..... میرا تو دل لگتا ہی آپ کے ساتھ ہے۔“

”اتنا دل اگر تم اپنے شوہر کے ساتھ لگاؤ تو شاید تمہارے اور اس کے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”وہ توجی جھگڑا کرنا نہیں چھوڑ سکتا..... مجھ سے جھگڑا کیے بنا تو وہ زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔“

”خدا کا شکر ادا کرو بلقیس!!! جھگڑا تو زندگی کی علامت ہے۔ زندہ لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں.....“ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”باتیں کم کرو بلقیس! جاؤ باجی کے لیے چائے بناؤ اور پھر کھانے کا کچھ دیکھو.....“ امی جان

نے ہماری گفتگو میں مداخلت کی۔

”جو بھی پکا ہے میں وہی کھاؤں گی..... میرے لیے کچھ تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں

کوئی مہمان تھوڑا ہی ہوں۔“

”اب تو تم مہمانوں کی طرح ہی آئی ہو۔“ امی جان نے کہا۔

”طبیعت کیسی ہے آپ کی اور مظہر کا کیا حال ہے؟ دفتر گیا ہے کیا؟“ میں نے اکٹھے ہی سوال

داغ دیئے۔

”مظہر!!!“ وہ ذرا سارکیں، ”میرا خیال ہے کہ اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا.....“

”سو رہا ہے اس وقت، کیوں؟“ میں نے حیرت سے کہا، ”اور یہ آپ کا خیال کیوں ہے؟“

”پتا نہیں بیٹا! مجھے تو کچھ کچھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ اس لڑکے

کی حرکتیں کچھ عجیب سی ہو گئی ہیں.....“ امی جان تذبذب میں تھیں۔

”باہر گاڑی تو ایک ہی کھڑی ہے امی جان؟“

”تمہاری گاڑی اس نے گیراج میں کھڑی کر رکھی ہے.....“ امی جان نے کہا، ”کئی بار کہہ

چکا ہے کہ وہ گاڑی تمہیں بھجوا دے گا۔“

”امی جان! مجھے بھلا گاڑی کی کیا ضرورت ہے؟ اسے کہیں اس کو بیچ دے۔ مگر وہ گھر پر کیوں

ہے؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

”رات بھر باہر رہا ہے آج بھی!“ امی جان رکیں، ”کافی دنوں سے ایسا ہو رہا ہے۔ مجھ سے تو

یہ معاملہ سلجھ ہی نہیں رہا ہے.....“

”میں بات کرتی ہوں اس سے جاگتا ہے تو!“ میں نے امی جان سے کہا اور فون اٹھا کر دفتر

میں نوید صاحب کا نمبر ملایا۔ معلوم ہوا کہ وہ سیٹ پر نہ تھے، پھر میں نے ان کا موبائل نمبر ملایا۔

میرے سلام کا جواب انہوں نے بڑی گرجبوشی سے دیا۔ میں حیران ہوئی۔

”آپ دفتر میں نہیں ہیں نوید صاحب!! خیریت تو ہے؟ مظہر بھی آج دفتر نہیں گیا!“

”مظہر صاحب تو بمشکل ہفتے میں دو دن آتے ہیں.....“ نوید صاحب شاید طنز کر رہے تھے،

”اور میں اس وقت ہسپتال میں ہوں.....“

”اوہو!! خیریت تو ہے؟“ میں نے بے خیالی سے پوچھا۔

”جی بالکل خیریت ہے..... میرا بیٹا پیدا ہوا ہے ماہا!!“ جوش جذبات میں وہ مجھے میڈم کہتا بھی بھول گئے۔

”بہت بہت مبارک ہو نوید صاحب!!“ میں نے مبارکباد دی، ”زارا کیسی ہے؟“

”جی بالکل ٹھیک ہے، ماشاء اللہ اور نیا مہمان بھی!!“

”اللہ تعالیٰ آپ کو بہت مبارک کرے!!“ میں نے انہیں مبارکباد دے کر زارا اور نومولود کو پیار کہا اور فون بند کر دیا۔

”اوہو! آتے ہی تم نے مظہر کا پوچھ لیا بیٹا! اور میں تمہیں بتانا بھول گئی.....“ امی جان نے اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا، ”نوید نے دفتر سے اٹھتے ہوئے مجھے کال کر کے اجازت لی تھی، کیونکہ اس وقت تک مظہر دفتر نہ گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ زارا رات سے ہسپتال میں تھی اور اس وقت اسے بیٹے کی ولادت کی خبر ملی تھی۔“

”تو کیا وہ رات سے ہسپتال نہیں گئے تھے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں وہ رات کو سیکینہ بہن کے ساتھ ہی زارا کو ہسپتال لے کر گیا تھا اور پھر صبح دفتر کے وقت پردہ دفتر آ گیا تھا، اس کی غیر حاضری میں ہی ولادت ہوئی تھی.....“ امی جان نے بتایا۔

”نوید صاحب کو ہسپتال میں رہنا چاہئے تھا، وہاں ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی، یا کوئی اور پیچیدگی ہو جاتی تو؟“ مجھے دل میں شرمندگی کا احساس ہوا کہ نوید صاحب فرض شناسی کے مارے اپنی زندگی کی رفیق کو ایسے مشکل وقت میں تنہا چھوڑ کر آ گئے تھے۔ یہ سراسر مظہر کی لاپرواہی تھی، اسے مالک ہو کر بھی اپنے کاروبار کے ڈوبنے کی فکر نہ تھی.....

”میں بھی سمجھتی ہوں بیٹا! لیکن میرے بس میں بھی تو کچھ نہیں ہے..... مظہر کون سا میرے کہے میں ہے!“ امی جان کے لہجے میں بے بسی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت ادھر جاؤں اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مظہر سے پوچھوں کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے اور اسے اپنے اچھے برے کی فکر کیوں نہیں رہی۔ مگر یہ سوچ کر رک گئی کہ اب مجھے اس طرح کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر وہ جوابا کوئی بدتمیزی کر دے تو!! بلقیس چائے لے کر آئی تھی۔ میں اور امی جان چائے پینے لگیں، تبھی باہر کی کھنٹی کی آواز آئی تو بلقیس باہر گئی۔ واپسی پر مظہر علی اس کے ساتھ تھا۔

”السلام علیکم آئی، السلام علیکم میڈم!“ اس نے مودب انداز سے سلام کیا۔ اس کے ہاتھ میں

مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ تھا جو اس نے میز پر رکھ کر امی جان کے سامنے سر جھکایا، انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میں نے بیٹھے بیٹھے ہی اس کے سلام کا جواب دیا۔

”بہت مبارک ہو آپ کو، ماموں بن گئے ہو.....“ میں نے اور امی جان نے بھی اسے مبارکباد دی۔ ”بیٹھو بیٹا!“

”بہت شکریہ!“ کہتا ہوا وہ بیٹھ گیا۔ امی جان نے بلقیس کو اور چائے لانے کو کہا۔ مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور اسے مظہر علی کی طرف بڑھایا..... ”یہ تو میں آپ لوگوں کے لیے لایا تھا!“ وہ ہنچکایا۔

”تو کیا ہوا، تم اس وقت ہمارے مہمان ہو، میں ہی تمہارا منہ میٹھا کروا رہی ہوں۔“ امی جان نے کہا۔

”آپ لیس پہلے!!“ اس نے امی جان سے کہا۔

”میں تو بیٹا شوگر کی مریضہ ہوں.....“ امی جان نے کہا تو اس نے ڈبہ میری طرف بڑھایا،

میں نے ایک گلاب جا من اٹھالی اور شکریہ ادا کیا۔

”آپ کی والدہ کی طرف بھی گیا تھا تو معلوم ہوا کہ آپ یہاں ہیں.....“

”ہاں میں امی جان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آئی تھی، ان کی شوگر ان دنوں بہت زیادہ رہتی ہے۔ اپنا خیال بھی نہیں رکھتیں.....“ میں نے وضاحت کی۔

میں نے مٹھائی کا ڈبہ اٹھایا کہ اسے باورچی خانے میں رکھ آؤں..... چادر کا پلو نیچے لٹک رہا تھا..... میں نے اسے ایک ہاتھ سے اٹھا کر جھٹکا دیا تاکہ مٹی وغیرہ صاف ہو جائے، لیکن اس میں سے گلاب کی ایک کلی آزاد ہو کر زمین پر گر گئی، مظہر علی نے فوراً جھٹک کر اسے اٹھا لیا.....

”اوہو! شاید یہ اس گلدستے میں سے گر گئی ہے!“ مظہر علی نے کہا، ”لیکن وہ گلدستہ تو سارا

سفید گلابوں کا ہے۔“ خود ہی اس نے کہا اور میری دماغ کی پھر کی کسی تیز محوم رہی تھی۔ یہ کلی تو

غالب کی قبر سے ہی میرے آنچل سے لپٹ کر چلی آئی تھی۔ اس وقت مظہر کے ہاتھ میں تھی، تو کیا

غالب نے یہ سازش کی تھی کہ ان پانچ کلیوں میں سے ایک کلی اس وقت مظہر علی کے ہاتھ میں تھی؟

وہی مظہر علی، جس کی بہن ثانیہ نے صبح ہی مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنی بہن کی طرح نہیں سمجھتا۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی، جو ثانیہ نے کہی تھی۔ میں نے تو کچھ پوچھا بھی نہ

تھا، خاموش رہی تھی، اس نے خود ہی بتایا تھا، ”مظہر علی کے دل میں میرے ساتھ کی خواہش بس رہی تھی!!!“

”نہیں!! یہ کلی اس گلدستے میں سے نہیں گری.....“ میں نے کہا۔ ”یہ تو میں نے علیحدہ سے خریدی تھی!! ایک بچہ بیچ رہا تھا..... ویلنٹائن ڈے کے موقع پر.....“

”آپ ایسی چیزوں کو مناتی ہیں؟“ مظہر نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”نہیں..... لیکن.....“ میری آواز مظہر پر نظر پڑتے ہی ہکلا نے لگی، وہی مظہر علی جو نظر اٹھا کر میری طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا..... اس وقت اس کی نظروں میں مجھے عجیب سے جذبات کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ہی اپنی نظر کا زاویہ بدلا اور مٹھائی کا ڈبہ لے کر کچن کی طرف چلی۔ ڈبہ میز پر رکھ کر بھی میں وہیں کھڑی رہی۔ بلقیس روٹیاں بنا رہی تھی۔  
 ”میں چلتا ہوں آنٹی!!“ مظہر علی کی آواز آئی۔

”رکوبٹا! کھانا کھا کر جانا، کھانا بالکل تیار ہے۔“ امی جان اسے روک رہی تھیں۔  
 ”بہت شکریہ آنٹی! مجھے ابھی کچھ اور گھروں میں مٹھائی دینا ہے اور پھر نوید بھائی بھی دفتر میں مصروف ہیں اس لیے ہسپتال کے معاملات مجھے دیکھنا ہیں۔“ میں کچن سے نکلی۔

”کھانا کھا کر جاتے آپ مظہر علی! مظہر گھر پر ہے، میں اسے جگاتی ہوں، وہ دفتر چلا جائے تو نوید صاحب بھی فارغ ہوں۔ ان کے لیے اس وقت ان کی فیملی اہم ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میڈم! نوید بھائی کی دفتر میں ملازمت ہے، اس لیے ان کے لئے وہ بھی اہم ہے۔ میں اور مظہر صاحب تو چھٹی کرنا یا دفتر نہ جانا انورڈ کر سکتے ہیں.....“ کہتا ہوا وہ اٹھ کر چلا گیا۔  
 گلاب کی کلی اس کے ہاتھ میں ہی تھی..... میں دل ہی دل میں اس دلچسپ اتفاق پر مسکرا پڑی۔

”یہ کیا ڈے کہہ رہی تھیں ماہیٹی تم؟“ امی جان نے سوال کیا، ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔  
 ”ویلنٹائن ڈے امی جان!!“ اور پھر میں نے وضاحت کی کہ وہ ہوتا کیا ہے اور کس طرح یہ بے ہودہ رسومات اب ہمارے معاشرے میں پھیل رہی ہیں۔

”لو بھلا ایک چودہ فروری کو ایک دوسرے کو محبت کا پیغام دے اور باقی سارا سال.....“  
 ”باقی سارا سال بلقیس اور اس کے شوہر کی طرح لڑتے رہو!!“ میں نے ہنس کر کہا تو امی جان بھی ہنس دیں۔

”ایک طرف تم انہیں خرافات کہہ رہی ہو اور دوسری طرف تم نے خود بھی گلاب کی کلی خرید لی؟“ امی جان نے پوچھا۔

اگرچہ بات کرتے ہوئے ثانیہ بھی متردق تھی اور مجھے معلوم ہے کہ مظہر علی کا دل بھی اس خواہش کی پرورش کرتے ہوئے اندیشوں میں مبتلا ہوگا..... مگر خواہشوں کا کوئی مقصد تو ہوتا ہی نہیں۔ خواہشات تو بنا پوچھے من آنگن میں بسیرا کر لیتی ہیں..... میں ثانیہ کو تو ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہہ سکتی تھی، مگر مجھے یاد آیا کہ سیکہ آنٹی نے تیمور کی شادی پر کہا تھا کہ ان کے اور مظہر علی کے دل میں چاند آنگن میں اتر آئے کی خواہش بس گئی تھی۔

اس بات پر مجھے والدہ نے وہاں سے فوراً بھگا دیا تھا..... تو کیا سیکہ آنٹی کا اس بات کا یہی مقصد تھا اور کیا والدہ اس بات کو سمجھ گئی تھیں؟ یقیناً والدہ پر ان الفاظ کا مطلب واضح ہوگا..... اسی لیے تو میں راستہ بھر مظہر علی کو سوچتی ہوئی آئی تھی، جس سے ہمدردی کا تعلق اب رشتہ داری میں بدل چکا تھا، مضبوط رشتہ داری۔ اس کی بہن میری بھابی تھی، اور اب مظہر علی کے گھر والوں کے دل میں جو خیال تھا وہ اس تعلق کو مزید مضبوط کرنے کا تھا..... اس کی خواہش ہے تو کیا ہوا، میرے دل میں تو ایسی کوئی خواہش نہیں ہے..... میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا، کبھی اسے ایک ماتحت کے علاوہ کسی نظر سے دیکھا بھی نہ تھا۔

اگر میں اس کے بارے میں سوچتی بھی تو.....؟ سب لوگ یہ بات کرنے میں حق بجانب ہوتے کہ میری تمام ہمدردیاں، کسی غرض کی وجہ سے تھیں۔ میں نے اس کے لیے جو بھی کیا اس میں کوئی لالچ مضمر تھا۔ میں نے اس کا معیار زندگی اس لیے بلند کیا تھا کہ مجھے اس کو اپنے معیار تک لانا تھا..... نہیں!! میں ہرگز لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتی اور نہ ہی اس سلسلہ میں میرے پاس کوئی دلائل ہیں جو میں اپنی صفائی میں دوں۔

مظہر علی میں کوئی کمی نہیں ہے، وہ اسماٹ بھی ہے، خوش شکل بھی اور اس وقت کا مایابی سے کاروبار بھی کر رہا ہے، اس نے بینک سے لیز پر گاڑی بھی لے لی ہے اور اس کی آمدن ہر آنے والے دن میں بڑھ رہی ہے..... مگر..... میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں؟ میں نے سر کو جھٹکا۔



”بس مجھے اس بچے پر ترس آ گیا تھا، جو بچہ کلیاں بیچ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے پانچ کلیاں خرید لیں.....“ میں نے وضاحت سے امی جان کو بتایا۔

”ایک کلی دس روپے کی، غضب خدا کا.....“

”یہ تو فٹ پاتھ کے ریٹ ہیں امی جان! آج تو یہ کلیاں دکانوں میں سو سو روپے میں بک رہی ہیں۔“ میری بات پر امی جان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”تم بتا رہی تھیں کہ تم نے پانچ کلیاں لی تھیں؟“

”جی ہاں!! پچاس روپے میں پانچ، پانچ سو والی کلیاں! کیسا سودا ہے؟“ میں اٹھلائی۔

”مگر باقی کلیاں کہاں ہیں.....؟“ امی جان نے چونک کر پوچھا تھا۔

”وہ میں قبرستان گئی تھی..... ساری کلیاں وہیں کے لیے لی تھیں..... غالب کی قبر پر رکھی بھی تھیں..... نہ جانے یہ کیسے میری چادر میں انک کر ساتھ ہی آ گئی..... شاید اس کے ساتھ کوئی کاٹنا ہوگا جو پھنس گیا ہوگا؟“ میں نے امی جان کو وضاحت کی۔

”ویسے یہ مظہر علی کیسا لڑکا ہے؟“ امی جان نے پوچھا۔

”اچھا ہے امی جان!“ میں ان کی بات کی غرض سمجھ کر بھی سادگی سے جواب دے رہی تھی..... ”مختی ہے اور ایماندار بھی، لگن سے کام کرتا ہے۔“

”میں اس کی ملازمت کی خوبیاں نہیں پوچھ رہی!!“ امی جان خفگی سے کہنے لگیں۔

”میں نے تو اسے اسی حیثیت میں دیکھا اور جانچا ہے۔“

”اس سے تمہاری رشتہ داری بھی ہے، ان کے ہاں تمہارا آنا جانا رہا ہے؟“ امی جان نے کہا۔

”رشتہ داری قائم ہونے کے بعد سے تو ملاقاتیں نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں۔ دوران

ملازمت میرا اس سے واسطہ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”مجھے اچھا لگا ہے یہ لڑکا!! پہلے بھی اس سے مل چکی ہوں، لیکن اب تو اس کی ظاہری شخصیت میں بھی بہت تبدیلی آ چکی ہے۔ مختی بھی ہے، تم بتا رہی ہو، شریف بھی اور اسمارٹ بھی.....“

”امی جان!!“ میرے ہاتھ کا نوالہ میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔

”کھانا کھاؤ تم!!“ امی جان یوں اسبابک سے کھانا کھانے لگیں جیسے انہوں نے کچھ کہا نہیں ہو۔

”میں مظہر کو جگاؤں امی جان؟ اب تو اڑھائی بج رہے ہیں، پھر مجھے جانا بھی ہے.....“ ظہر کی نماز پڑھ کر میں نے امی جان سے پوچھا۔

”اتنے دن کے بعد آئی ہو بیٹا! کچھ دن تو رک.....“ انہوں نے درخواست کی۔

”میں پھر آؤں گی امی جان، جب تیور آئے گا.....“

”ایک رات ہی رک جاؤ!!“ تب میں نے ان کی بات مان لی، گھر سے بھی میں ذہنی طور پر

تیار ہو کر آئی تھی کہ ایک رات تو رکوں گی ہی۔“

”اچھا رک جاتی ہوں، میں مظہر کو جگاتی ہوں.....“ میں اوپر کی طرف چلی، مظہر نے تیور کی

شادی کے وقت اپنا سامان مستحضر اوپر ہی منتقل کر لیا تھا۔ امی جان کے لیے سیڑھیاں چڑھنا مشکل

تھا، اس لیے وہ کم کم ہی اوپر جاتی تھیں۔ صرف بلیقیں صفائی کرنے کے لیے اوپر جاتی تھی۔ اوپر تین

بیڈروم تھے، جن میں سے شادی کے دنوں میں ایک میں رہی تھی اور ایک میں نگہت، جب کہ

نیچے تین بیڈروم اس وقت خالی پڑے تھے جو کبھی غالب، تیور اور مظہر کے تھے اور امی جان کا

بیڈروم بھی نیچے ہی تھا۔

میں نے مظہر کے کمرے کے دروازے پر دستک دی..... اندر سے ”کم ان“ کی آواز آئی تو

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں نیم تار کی تھی۔

”کون ہے؟“ بلیقیں آپا؟“ میں خاموش رہی۔ پہلے روشنی کرنے کا سوچا، پھر ارادہ تبدیل

کر دیا ”بھابی؟“

”کوئی اور نہیں ہو سکتا؟“ میں اس کے قیام پر فحش دی اور بتی جلانے لگی۔

”آپ کی مخصوص خوشبو کو پہچانتا ہوں.....!!“ اس نے کہا۔

”نظر آرہی ہوں میں سامنے کھڑی ہوئی!“ ساتھ ہی میں نے بتی جلادی، اس کی پشت

دروازے کی طرف تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے کس طرح درست اندازہ لگایا ہوگا..... ”بہت

تیز ہو دیے تم باتیں کرنے میں۔“

”کب آئیں آپ؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”تمہارے گھر آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی۔“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”میں تو گھر پر ہی تھا!!“

”جھوٹ بھی بولنے لگے ہوتے؟ رات تم گھر پر نہیں تھے!!“

”آپ سے کس نے کہا ہے؟ امی جان نے!!“ اس نے وضاحت طلب کی۔

”نہیں میں نے رات کو فون کیا تھا تو معلوم ہوا کہ تم گھر پر نہیں ہو.....“ میں نے یونہی کہہ دیا۔

”آپ بھی جھوٹ بولنے لگی ہیں بھابی!!“ سنسناتی ہوئی آواز تھی، ”آپ نے رات کو کوئی فون نہیں کیا تھا، میں نے صبح سی ایل آئی پر سارے نمبر چیک کیے تھے..... ہر روز چیک کرتا ہوں..... آپ کی کال دوپہر میں آئی تھی۔“ میرے اندازے سے کہیں بڑھ کر تیز تھا وہ۔

”چلو تم یہ تو مان گئے ناں کہ تم صبح ہی گھر لوٹے ہو.....؟“ میں نے کہا، ”کہاں رہتے ہو، کیا کرتے پھر رہے ہو؟ اور کاروبار تم نے کس کے آسرے پر چھوڑ رکھا ہے؟“

”میں نے بہت سی چیزیں اللہ کے آسرے پر چھوڑ رکھی ہیں، آپ کی طرح؟“ وہ مسکرایا، ”آپ بتائیں کیا اسی شکایت پر سرزنش کرنے آئی ہیں؟“

”میں کون ہوتی ہوں تمہاری سرزنش کرنے والی اور تمہاری شکایت کون لگائے گا مجھ سے۔“ میں نے ناراضی سے کہا، ”میں تو صرف امی جان کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔ تمہیں تو گھر پر رہتے ہوئے بھی ان کی فکر نہیں ہے، مگر تم گھر پر بھی ہوتے کہاں ہو.....“

”آج تو سرمنڈواتے ہی.....“ وہ ہنسا ”ویسے اچھا لگ رہا ہے، آپ کی سرزنش، آپ کی ڈانٹ اور آپ کی باز پرس مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ بہت بچپن سے عادت جو پڑ گئی تھی۔ اس میں شفقت بھی ہوتی ہے اور سچ بتاؤں بھابی!“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”آپ کی ڈانٹ سن کر یہ لگتا ہے کہ کوئی تو ہے جسے میری پرواہ ہے..... میری فکر ہے..... اور اس گھر میں سب مجھ سے لاتعلقی ہیں۔“ میں اسے کیا کہتی، سنتی رہی۔

”فریش اپ ہو کر نیچے آ جاؤ.....“ میں کہتی ہوئی باہر نکل آئی، مجھے کافی دیر ہو گئی تھی اوپر آئے ہوئے، نہ جانے امی جان کیا سوچیں گی..... ہر وقت مجھے اندیشہ رہتا تھا، دوسروں کی سوچوں کا..... زندگی کا سارا سفر ہی جیسے بل صراط پر گزر رہا تھا۔

○ ہوا بھی ذرا تیز چلتی ہے تو

تھام لیتی ہوں اپنی اوڑھنی!!

سر سے اڑ نہ جائے کہیں.....

ننگے سر ہوں تو مجھے سارے ہی اندیشے ہیں.....

دھوپ سے سر جلتا ہے.....

بارش جو برے تو بھیگتا ہے

کسی سے ہنس کر بول لوں تو

سر پہ الزام آتا ہے.....

ننگے سر ہونے سے!!

کتنے ہی خوف، مسافر ہیں ○ (شیریں حیدر)

مظہر جب سے اتنا بڑا ہوا تھا کہ اپنی باتیں چھپانے لگا تھا، مجھے اس کی حرکتوں کا کچھ اندازہ بھی تھا، اسی لیے میں اس سے خوف زدہ بھی رہتی تھی، خصوصاً اس کے پاس ریوالور کی موجودگی سے مجھے بہت ڈر لگتا تھا کہ جانے کس وقت وہ کیا حرکت کر بیٹھے۔ امی جان کو کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہونا چاہئے کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔ تیمور تو اب گھر پہ ہی نہ تھا جو وہ اس پر کنٹرول رکھ پاتا۔ وہ یوں بھی قابو سے باہر ہو چکا تھا، لیکن یہ اندازہ نہ ہو پارہا تھا کہ وہ دفتر سے غائب رہ کر اور یوں راتوں کو باہر کہاں رہتا تھا، کیا کرتا پھر رہا تھا۔

جرائم میں اس کے لیے ملوث ہونے کے امکانات اس لیے بھی کم تھے کہ اسے کسی شے کی کمی نہ تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے گھر میں پیسے کی ریل پیل دیکھی تھی۔ مالی مشکلات کا اللہ کے فضل سے اس گھر کو کبھی سامنا نہ ہوا تھا، نہ اپنے باپ کی شہادت کے بعد نہ غالب کی وفات کے بعد..... لڑکی کا چکر بھی نہ ہو سکتا کہ میں مظہر کی طبیعت کو جانتی تھی۔

اس کے مزاج میں پچھلے چند سالوں سے مذہبی رجحان ور کر آیا تھا، اور ایک اہم تبدیلی اس کے مزاج میں یہ تھی کہ وہ شدت پسند ہو گیا تھا، فوراً غصے کی انتہا پر پہنچ جاتا تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ذہن بھی تھا، نور بات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا، چہرہ شناسی اور قیادہ شناسی میں بھی ماہر تھا۔

”جاگ گیا ہے کہ نہیں؟“ نیچے پہنچی تو امی جان نے پوچھا۔ ”اس کو شرم ہے نہ حیا، جانے کن

گھٹیا کاموں میں پڑا ہوا ہے؟ طوائفوں کے کونھوں پر جاتا ہے یا پھر نشہ کر کے پڑا رہتا ہے۔“  
 ”امی جان پلیز!“ ان کی آواز اگرچہ دہلی دہلی سی تھی مگر کچن کتنا ہی دور تھا کہ بلیس نہ سن پاتی  
 اور وہ جو اسی وقت اوپر سے اتر آتا تو؟ ”آپ غصہ نہ کریں..... وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، ہمیں احتیاط  
 کے ساتھ اس معاملے کو سلجھانے کی ضرورت ہے۔“

”بہت برداشت کر لیا ہے میں نے، میں نے اپنی شوگر خطرناک حد تک بڑھالی ہے، اس کی  
 ان حرکتوں کی وجہ سے، جانے کیا کرتا پھر رہا ہے، اپنے شہید باپ کی عزت کو بٹالگائے گا۔“  
 اوپر سے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور امی جان خود ہی خاموش ہو گئیں۔ میں نے دل  
 ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ چپ ہو گئی تھیں..... جو ان خون تھا، جلدی اٹلنے لگتا ہے اور پھر  
 عزت اور احترام کا جو ایک باریک سا پردہ ہوتا ہے اگر وہ بھی چاک ہو جائے تو..... میں نے بلیس  
 سے کہا کہ وہ تازہ روٹی بنا کر مظہر کے لیے دوپہر کا ناشتہ بنالے تو مظہر کھیانی سی ہنسی ہنس دیا۔  
 ”رہیں گی آج؟“ اس نے پوچھا۔

”امی جان کو ملنے آئی تھی، ان کے اصرار پر رکن پڑ گیا ہے۔“  
 ”گر کیٹ!! پھر آج رات کا کھانا کھانے کہیں باہر چلیں گے.....“ مظہر جوش سے بولا۔  
 ”آج نہیں!!“ میں نے مترددا انداز میں کہا، ”پھر کبھی سہی!!“  
 ”پھر کب؟ آپ آتی ہی کب ہیں؟“ اس نے شکوہ کیا۔  
 ”اگلے ہفتے آؤں گی، کچھ دن رہنے کے لیے!! پکا وعدہ۔“

”تیور بھائی آرہے ہوں گے؟“ کھانا کھاتے ہوئے وہ لا پرواہی سے کہہ رہا تھا..... میں  
 اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی، جھیل کی سطح جیسا پرسکون..... ”اس کے علاوہ آپ کس کے لیے آئیں  
 گی.....؟ میرے لیے تو نہیں آسکتیں؟“

”تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟ میرے لیے تم دونوں ایک جیسے ہو!“ میں نے آہستگی سے کہا۔  
 ”اونہوں!!“ اس کے منہ میں نوالا تھا۔ ”اس طرح کے مذاق نہ کیا کریں!“

”چھوٹو!!“ میں نے احتجاج کیا۔ ”یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔ تم میرے خلوص اور میری محبت پر  
 شک کر رہے ہو؟“

”بھابی! میں نے کوئی شک نہیں کیا، صرف سچ بتایا ہے..... محبت میں شک ہے نہ خلوص میں،

صرف حقیقت بتا رہا ہوں.....“ وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا حقیقت ہے؟“ میں نے کہا، ”ذرا میں بھی تو سنوں!!“

”حقیقت یہ ہے بھابی کہ میں، میں ہوں اور تیور بھائی، تیور بھائی.....“

”یہ تو ظاہر ہے کہ حقیقت ہے۔“

”اس سے بھی واضح حقیقت ہے کہ میں جو کچھ بھی بن جاؤں..... آپ کے لیے تیور بھائی

جیسا نہیں بن سکتا۔“

”تم جو مرضی کہہ لو لیکن..... میرے دل میں تمہارا مقام بھی ویسا ہی ہے.....“ میں نے اس

سے کہہ تو دیا، لیکن مجھے اپنے الفاظ خود بھی کھوکھلے لگ رہے تھے کیونکہ حقیقت وہی تھی جو مظہر نے

بیان کی تھی، واقعی تیور سے میرا تعلق اسی طرح کا تھا، جیسے اوپر تلے کے بہن بھائی ہوتے ہیں۔

”کیا تم فضول بحث کر رہے ہو؟“ امی جان نے دخل دیا، ”ایک دو دن کے لیے آئی ہے اور تم

اسے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہو۔“

”ارے نہیں امی جان!! ہم تو یونہی گپ شپ لگا رہے ہیں..... مذاق کر رہا ہے مظہر!“ میں

نے امی جان کا خراب موڈ دیکھ کر صفائی دی۔

”میں نے لوگوں سے مذاق کرنا چھوڑ دیا ہے بھابی!!“ وہ سنجیدگی سے بولا، ”تیور بھائی کی

شادی کے بعد حالات بہت مختلف ہو گئے ہیں.....“

”اچھا میں لوگ نہیں ہوں..... میرے لیے کچھ بھی حالات نہیں بدلے اور نہ ہی میں تمہارے

لیے تبدیل ہوئی ہوں.....“ میں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”والدہ میں کل امی جان کی طرف جاؤں گی؟“ میں نے والدہ کو اجازت لینے کے انداز میں

اطلاع دی۔

”کس لیے بیٹا؟“

”تیور اور ماہ رخ آرہے ہیں..... دو ایک دن کے لیے جاؤں گی۔“

”جا کر مل آنا کسی وقت، رہنے کے لیے جانے کی کیا ضرورت ہے..... اور اول تو وہ آرہے

ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ آکر تمہیں مل کر جائیں.....“ والدہ نے ابرو اچکا کر کہا۔

”وہ تو اگر میں نہ جاؤں گی تو وہی آکر مجھے مل کر جائیں گے.....“ میں نے آنکھیں سے کہا،  
”اگر آپ کو مناسب نہیں لگتا تو میں نہیں جاتی۔“

”مجھے نامناسب کیوں لگنے لگا..... یونہی بات کر رہی تھی..... جو تمہاری خوشی ہے!“  
”اگر ثانیہ کو ہسپتال جانے کی ضرورت پڑے تو مجھے فوراً کال کر دیں، میں پہنچ جاؤں گی،  
چاہے دن ہو یا رات.....“ میں نے والدہ کو اصرار کر کے کہا۔

”ٹھیک ہے..... ویسے تو صدف بھی یہی کہہ رہی تھی کہ وہ پہنچ جائے گی، میں بھی ہوں اور چند  
دنوں تک تو زارا کا بچہ بھی سنبھل جائے گا، کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، انشاء اللہ!“

”پھر بھی آپ مجھے بلا لیں والدہ!! میں کہہ رہی ہوں ناں۔“ میں ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔  
”ماہا!!“ انہوں نے جیسے مجھے دور سے پکارا۔

”جی!“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”ہوں!!“ وہ بے خیالی سے مجھے دیکھنے لگیں۔

”کیا بات ہے والدہ؟“ میں نے ان کا گھٹنا تھام کر ان سے پوچھا، ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک  
ہے۔“

”ہاں، ٹھیک ہے.....“ مختصر سا جواب دیا۔

”تو کیا آپ کو میرا وہاں جانا برا لگ رہا ہے؟“ میں نے اندازہ لگایا۔  
”اُنہوں.....“

”تو پھر کیا بات ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں!! بس یونہی.....“

”یونہی کیا والدہ! آپ کیا کہنے والی تھیں؟ پلیز بتائیں ورنہ مجھے الجھن ہی رہے گی۔“ میں  
ان کا گھٹنا ہلارہی تھی۔ انہوں نے میرا سر تھام کر اپنے کندھے سے لگا لیا، ایسا وہ اس وقت کرتی  
تھیں جب ان کو ہم سے کوئی اہم بات کرنا ہوتی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ کوئی بہت خاص بات تھی۔

”ماہا!! ثانیہ نے تم سے کوئی بات کی ہے بیٹا.....؟“ انہوں نے بالآخر اپنے وجود کی پٹاری  
میں سے وہ بات نکال ہی دی۔ مجھے اداکاری کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ مجھے فوراً ان کی  
بات سمجھ میں آگئی تھی۔ ان کا مقصد یقیناً مظہر علی اور سیکندہ آئی کی خواہش سے تھا، ”میں تو اسی روز سمجھ

گئی تھی بیٹا! جب تیرور کی شادی پر انہوں نے اشارے بات کی تھی۔“

”جی والدہ کی ہے ثانیہ نے بات.....“ میں نے جواب دیا۔

”ابھی تو ثانیہ کے توسط سے بات ہوئی ہے، وہ کہتی ہے کہ اگر ہم مثبت اشارہ دیں تو وہ لوگ  
باقاعدہ یہ بات کرنا چاہتے ہیں..... میرا مطلب ہے رشتے کی بات!!“ والدہ نے آہستہ آہستہ  
وضاحت کی۔ میں اس بات کا کیا جواب دیتی، میں نے تو ابھی اتنی سنجیدگی سے اس رشتے کی بابت  
سوچا ہی نہ تھا۔ میرے تصور میں مظہر سے آخری ملاقات کا منظر آگیا..... وہی ویلنٹائن ڈے والی  
ملاقات اور جاتے وقت مظہر کی آنکھوں کے بدلے ہوئے انداز.....

”میں نے اس بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا.....“ میں نے ہولے سے کہا۔  
”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے اس کے بارے میں سوچنا چاہئے؟“

طویل خاموشی کا وقفہ ہمارے درمیان در کر آیا..... ”میرے ذہن کی سلیٹ اس معاملے میں  
بالکل کوری ہے والدہ..... اگر آپ کو اس میں کوئی مناسب بات نظر آتی ہے تو میں سوچوں گی، اور  
اگر میری رائے کو اہمیت دیے بغیر بھی آپ کوئی فیصلہ کرنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“  
”مظہر علی خود تو اچھا لڑکا ہے..... مجھے پسند ہے، لیکن“ والدہ ذرا سار کیں، ”ثانیہ کے انداز

اور اس کا رویہ دیکھ کر عجیب سے اندیشے ذہن میں آتے ہیں۔“

”ثانیہ کے رویے سے زیادہ تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ سب لوگ..... امی جان، تیور، مظہر، نوید  
صاحب اور علی بھائی..... سب لوگ سوچیں گے کہ اس سارے ہمدردی اور مدد کے جذبے کی آڑ  
میں، میں دراصل اپنی راہیں ہموار کر رہی تھی۔“

”کس کی جرأت ہے کہ میری ماہا کے کردار پر شک کرے؟“ والدہ غصے سے بولیں۔

”کوئی بات نہ بھی کرے والدہ! تو بھی مجھے یوں ہی لگتا ہے کہ سب لوگ یہی سوچیں گے۔“  
میں نے کہا۔

”جلدی تو کوئی نہیں ہے..... تم جب ذرا ذہنی طور پر پرسکون ہو تو اس بارے میں سوچنا۔“  
والدہ نے اپنی نرم انگلیاں میرے بالوں میں پھیریں تو میرے اندر تک سکون اترنے لگا اور میں  
خود بخود مظہر علی کے بارے میں سوچنے لگی..... اس سے بڑھ کر پرسکون میں اور کب ہو سکتی تھی۔

تیو اور ماہ رخ کے بیچ میں مجھے تاؤ سا محسوس ہو رہا تھا..... شاید ایسا ہی تھا یا مجھے لگ رہا تھا۔  
 ”گھر کیسا ہے تمہارا ماہ رخ؟“ میں نے اپنے انداز سے سوال کیا۔  
 ”گھر؟ ہونہہ!“ اس نے طنز سے کہا، ”اُسے گھر کون کہتا ہے..... ایک کمرہ، ایک باتھ روم اور  
 برآمدے میں بنایا ہوا ایک عارضی سا باورچی خانہ!“  
 ”گھر تو گھر ہی ہوتا ہے ماہ رخ..... جہاں سکون ہو، محبت ہو اور انسان کو تحفظ کا احساس ہو۔“  
 میں نے یہ سوچ کر کہ اسے ساری شکایت گھر کی وجہ سے ہے، سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اور اگر تمہیں  
 وہاں گزارا مشکل لگتا ہے تو تم یہاں رہو اپنے گھر میں، چند اور مہینوں کی تو بات ہے..... تیو کو گھر  
 مل جائے گا تو پھر چلی جانا۔“  
 ”اس قدر بروریت ہے سیالکوٹ میں..... گھر بھی مل جائے گا تو دل کیسے لگے گا؟“ اس نے  
 بیزاری سے کہا۔

”دل تمہارا تیو سے لگے گا یا پھر گھر کی دیواروں سے؟“ میں ہنسی۔

”اس سے تو میں ناراض ہوں، اس کی حماقتوں کی وجہ سے!“

”لو میرے اتنے سیانے بھائی کو تم نے ایک منٹ میں احمق کہہ دیا.....“ میں نے مصنوعی  
 ناراضگی سے کہا، ”اس کی وضاحت کی جائے ورنہ مابودلت آپ سے ناراض ہو جائیں گے.....“

”ماہا! جب غالب بھائی کی وفات ہوئی تو تم امید سے تمہیں ناں؟“

”ہاں!! چھ ماہ ہو چکے تھے۔“ میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر تم نے ابارشن کہاں سے کروایا؟“ اس کے سوال سے مجھے یوں لگا جیسے کرنٹ لگا ہو۔

”تم سے یہ کس نے کہا کہ میں نے خود ابارشن کروایا تھا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، مجھے لگا

شاید نگہت نے ایسی بات کی ہوگی، ”اور ابارشن کیوں کرداتی میں؟“

”ظاہر ہے کہ بچے کے ساتھ تو تمہارے لیے دوسری شادی کرنا مشکل ہوتا.....“

”دوسری شادی تو ویسے بھی بہت مشکل ہوتی ہے ماہ رخ! اللہ کسی عورت کے نصیب میں یوں

دوسری بار دلہن بننا لکھتا ہے تو یہ اس عورت کے لیے بھی بہت تلخ تجربہ ہوتا ہے.....“ میرے لہجے

میں اداسی اتر آئی۔

”سوری! ماہا..... میں سمجھی کہ تم نے خود ہی.....“ وہ ذرا شرمندہ سی ہوئی۔

”مگر تم نے یہ بات کی کس لیے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اصل میں مجھے.....“ وہ رک گئی..... میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا ”مجھے  
 ابارشن کروانا تھا.....“

”کس کا؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”کس کا ہو سکتا ہے ماہا!“ اس نے جیسے میری بے وقوفی پر مجھے ملامت کی۔

”لیکن کیوں؟“ میں حیرت کی زیادتی سے چیخ پڑی۔

”آہستہ بولو! میری ساس کے کانوں تک تمہاری آواز نہ پہنچ جائے۔“ اس نے مجھے سرزنش کی۔

”مگر ایسا کیوں کر رہے ہو تم لوگ.....؟“ میں نے دہی آواز سے احتجاج کیا۔

”لوگ نہیں!!! صرف میں.....“ اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کہلاتے ہوئے کہا، ”وہ تو بہت

خوش ہے۔“

”اگر وہ خوش ہے تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”مجھے کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے زور دے کر پوچھا، ”یعنی تمہارے خیال میں میری مرضی اور

خواہش کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے..... میں انسان ہوں ماہا! کوئی بھیڑ بکری یا گائے نہیں ہوں۔“

”تو کیا انسانوں کے ہاں بچے نہیں ہوتے؟“

”ہوتے ہیں مگر پلاننگ سے، باہمی رضا مندی سے..... دونوں فریقین کی مرضی سے.....“

”ایسی باتیں نہ کرو ماہ رخ!! یہ بہت بڑا گناہ ہے، بچے تو اللہ کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ ہم کون

ہوتے ہیں، اس کی رضا کو جھٹلانے والے، یہ کفرانِ نعت ہے!“ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم اپنے لیکچر چھوڑ دو اور میری مدد کرو.....“ وہ بضد تھی۔

”یہ قتل ہے ماہ رخ اور اس میں، میں تمہاری مدد تو کیا کروں گی، میں تمہیں بھی ایسا نہیں کرنے

دوں گی۔“ میں نے لہجے میں سختی سے کہا۔

”یہ اچھی دھونس ہے..... تمہاری سوچ بھی تیو کی طرح فرسودہ ہے۔“ اس نے طنز سے کہا۔

”جو چاہا ہو، لیکن پلیز ایسا مت کرو، سوچو بھی نہیں ایسا!“ میں نے اس کی منت کی۔ ”اس گھر

میں ننھی سی رونق آنے دو، بہت عرصے کے بعد اس گھر میں بچے کی قلفکاریاں گونٹیں گی انشاء اللہ!“

”تم اگر نہیں مدد کرنا چاہتیں تو نہ کرو، لیکن مجھ پر اپنے فرسودہ خیالات مت ٹھونسو..... مجھ سے

ابھی اس طرح کی ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا.....“ اس نے بے زاری سے کہا۔  
 ”تم صرف ایک ذمہ داری پوری کر دو، میں تمہیں پال کر دے دوں گی۔“ میں نے اسے  
 فراخ دلانہ پیشکش کی۔

”ساری بات تو فکر خراب ہونے کی ہے..... پالنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، خوشی اور عبداللہ  
 کو بھی میں نے ہی شروع میں سنبھالا تھا۔“

”پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہ ہوا۔“ میں ہنسی، ”ٹریننگ تو تمہاری ہو چکی ہے۔“  
 ”لیکن میں ابھی سے بچہ پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں، میں اپنی زندگی کو کچھ عرصہ بھر پور  
 انداز سے گزارنا چاہتی ہوں۔ ایک ایک لمحے سے خوشیاں کشید کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ جوش سے  
 بول رہی تھی۔

”تو بچہ کون سا تمہاری راہ میں حائل ہو رہا ہے..... بچہ تو شادی شدہ زندگی کی خوشیوں کی تکمیل  
 ہے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے ابھی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا ہے ماہا اور یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔“ اس نے سختی سے کہا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تیمور کے لیے زندگی میں پریشانیوں کا آغاز ہو چکا تھا، مگر بد قسمتی سے  
 میرے پاس ان کا کوئی حل نہ تھا۔ میں ماہ رخ کی ضدی طبیعت کو جانتی تھی، وہ جو کچھ ٹھان لیتی تھی  
 کر کے ہی چھوڑتی تھی۔ لیکن جو کچھ وہ کرنے جارہی تھی وہ بہت غلط تھا، اسے کسی بھی طرح اس کی  
 اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ تو کیا میں ماہ رخ کی امی یا بھابی سے بات کروں؟ خود ہی سوچ رہی  
 تھی، لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ میں خواہ مخواہ میں تیمور اور ماہ رخ کے معاملے میں دخل نہ دوں۔

مگر اسی روز تیمور ایسے وقت میں میرے پاس آ گیا جب میں باورچی خانے میں اپنے ہاتھوں  
 سے بریانی بنا رہی تھی۔ ماہ رخ سو رہی تھی، تیمور نے آ کر چائے بنانے کو کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیسی ہیں آپ؟ کیسی گزر رہی ہے؟“ بشارت سے اس نے پوچھا۔

”الحمد للہ! تم سناؤ؟“ میں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور دوسری کرسی پر آ بیٹھی۔

”کس وقت آپ سے بات ہو سکتی ہے؟ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔“ اس

نے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”ابھی کرلو، بس بریانی بنا رہی ہوں، ساتھ ساتھ بنتی رہے گی!“  
 ”یہاں تو کسی بھی وقت ماہ رخ یا مظہر آ سکتے ہیں.....“ وہ متردد ہوا۔  
 ”ایسی کون سی بات ہے، جس کے لیے اتنی پراسراریت کا ماحول چاہ رہے ہو؟“ میں نے  
 مذاق سے کہا۔

”مظہر کہاں ہے؟“ آہستگی سے تیمور نے پوچھا۔

”مظہر تو دفتر میں ہے۔ امی جان آرام کر رہی ہیں.....“ میں نے بتایا۔

”آپ بریانی کا چولہا بند کر کے، چائے لے کر آجائیں تو ادھر ہی بیٹھ کر بات کر لیتا ہوں۔  
 بلقیس کس وقت آتی ہے؟“ تیمور نے مجھے ہدایات دے کر سوال پوچھا۔

”وہ شام تک ہی آئے گی، بہر حال تم بات کرو، وہ ابھی گئی تو بات بعد میں ہو سکتی ہے۔“ میں  
 دو گلوں میں چائے لے کر آ گئی، ”ماہ رخ..... میرا مطلب ہے کہ سو رہی ہے ناں؟“

”آپ بیٹھیں.....“ میں بیٹھ گئی، ”مجھے لگتا ہے کہ ماہ رخ خوش نہیں ہے میرے ساتھ۔ شاید  
 اسے اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو رہا ہے.....“

”تمہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے اور ابھی شادی کے دو ماہ کے بعد ہی؟ یہ وقت تو ایک دوسرے  
 کو جاننے اور سمجھنے کا ہوتا ہے۔“ میں نے اسے پوچھا۔

”جہاں شادی سے پہلے ایک دوسرے کو زیادہ جان لیا جاتا ہے، وہاں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔“  
 ”پہلے سے جانتے ہو تو پھر تو کوئی ڈھکی چھپی بات ہی نہیں رہتی۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ ماہ رخ کو  
 اب برا لگنے لگا؟ وہ تو تمہیں چاہتی بھی تھی اور جانتی بھی تھی۔“

”فوج میں حالات بہت مشکل ہوتے ہیں بھابی، وہ جس ماحول کی پروردہ ہے، اس کے بعد  
 اسے میرے ساتھ چلنے کے لیے جس صبر، تحمل، برداشت، فراست اور میچورٹی کی ضرورت ہے، وہ  
 اس میں نہیں ہے۔“

”وہ ایک انتہائی اسمارٹ لڑکی ہے تیمور اور خود کو اس ماحول میں ڈھال لے گی۔“ میں نے ماہ  
 رخ کی وکالت کی۔

”وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتی، صرف دو ماہ میں وہ بیسیوں بار مجھے کہہ چکی ہے کہ فوج چھوڑ

دوں۔“ میں نے چوہک کر تیور کو دیکھا۔ فوج میں جانا تو اس کا ہمیشہ سے ارمان تھا، اسے عشق تھا فوج سے اور وہ گھر کے مشکل ترین حالات کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے فوج میں چلا گیا تھا۔ اب ماہ رخ اس سے کہہ رہی تھی کہ اس کی خاطر وہ اپنا پہلا عشق ٹھکرا دے۔

”اے سمجھاؤ اور اگر وہ نہ سمجھے تو.....“ میں رک گئی، سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کہوں۔

”اگر وہ نہ سمجھے تو فوج چھوڑ دوں؟“ وہ سکون سے بول رہا تھا، ”یہی کہنا چاہتی ہیں آپ؟“

”نہیں تیور!!! میں ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کتنا شوق تھا فوج میں جانے کا اور اسی شوق کی وجہ سے میں نے گھر کے مشکل ترین حالات میں خود کو سنبھالا، اس گھر کی پتواری سنبھال لی تھی، صرف اس لیے کہ تمہیں اپنے شوق میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔“ میں نے وضاحت کی۔

”یہ تو ایک بات ہے بھابی!! اس کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں..... اے شہر پسند نہیں، گھر پسند نہیں!! اب شروع میں تو ایسے ہی گھر ملتے ہیں اور پھر میرے پاس کوئی چوٹس تھوڑی ہے کہ اپنی مرضی کے شہر میں تبادلہ کروالوں..... وہ لاہور میں رہنا چاہتی ہے، اور علیحدہ گھر میں.....“ اس نے سر پکڑ لیا، ”میں اس کی ان فضول ترین خواہشات کی تکمیل کیسے کروں؟“

”تخل سے تیور! سمجھداری سے کام لو۔ تمہیں تو اتنے عرصے سے اسے ملتے ہوئے اچھی طرح سمجھ لیتا چاہئے تھا۔ وہ تمہاری اولین چاہت ہے.....“

”اب یہ سب مجھے اپنی بیوقوفی لگتی ہے بھابی!! مجھ سے بڑھ کر تو مظہر عقلمند ہے جو سمجھتا ہے کہ ماہ رخ اور ستارہ میں گھر لسانے والے اوصاف ہی نہیں ہیں!!“ تیور شاید بے خیالی میں کہہ گیا تھا۔

”ایسا کیوں کہا مظہر نے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، حالانکہ یہی بات مظہر نے میرے سامنے بھی کی تھی لیکن حیرت تو یہ تھی کہ اس نے تیور کے سامنے یہ بات کیوں کی تھی۔

”وہ.....“ تیور گڑبڑا گیا، ”ماہ رخ کے کہنے پر میں نے امی جان سے کہا تھا کہ مظہر کے لیے ستارہ کا رشتہ بھی مانگ لیں۔ اس پر مظہر نے امی جان کو یہ جواب دیا تھا۔“

”چلو خیر وہ تو ایک علیحدہ بات ہے، لیکن اب تمہاری شادی تو ہو چکی ہے، اسے بھانا تمہارا فرض ہے۔ کچھ اس کی مانو، کچھ اپنی منواؤ۔“ میں نے تیور کو سمجھایا۔

”وہ صرف منوانے کی قائل ہے، ماننے کی نہیں.....“ تیور نے جھنجھلا کر کہا، ”اور ایک مطالبہ تو اس کا اتنا احتمقانہ ہے کہ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتا.....“

میں سمجھ تو گئی کہ وہ معاملہ کیا ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ میں اس معاملے میں اس کی کوئی مدد بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ کپ اٹھائے اور سنک میں رکھنے کو کھڑی۔

”مظہر کی سرگرمیوں کی بابت جاننے کے لیے میں نے اپنے ایک دوست کی ذمہ داری لگائی ہے وہ ایک انٹیلی جنس ایجنسی میں ہے..... دیکھیں اس کی مصروفیات کا کیا راز نکلتا ہے؟“

”مگر مظہر کو معلوم ہو گیا تو.....؟“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”یہ بات میں نے صرف آپ کے ساتھ کی ہے میں نے اور صرف میرے اور آپ کے درمیان ہے..... کسی تیسرے کو تبھی علم ہوگا جب آپ بتائیں گی.....“

”تم ہی ہو جس سے میں ہر طرح کی بات کر لیتی ہوں۔ تم بے فکر ہو جاؤ کہ اس بات کا کسی اور کو علم ہوگا..... میرا اور تمہارا تعلق.....“ میں کپ رکھ کر مڑی ہی تھی کہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ دروازے میں جانے کس وقت سے ماہ رخ کھڑی تھی۔ میرے انداز پر چوہک کر تیور نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”جاگ گئیں تم؟ آؤ بیٹھو.....“ میں ہونٹوں کی طرح خاموش ہی کھڑی تھی۔

”جاگ ہی گئی ہوں، حالانکہ مجھے سوتے ہی رہنا چاہئے تھا۔ خواہ مخواہ تم لوگوں کے رنگ میں بھگ ڈالنے چلی آئی۔“ میں تو اس کے الفاظ کی زہرناکی کا زہرا پنے وجود میں اترتا دیکھ رہی تھی۔

”فضول باتیں نہ کرو ماہ رخ، میں اور بھابی چائے پی رہے تھے..... گھر کے مسائل کی باتیں کر رہے تھے۔“ تیور وضاحت دے رہا تھا۔

”سن لیا ہے میں نے کہ تم لوگ گھر کے مسائل کی باتیں کر رہے تھے یا اپنے تعلقات کو صیغہ راز میں رکھنے کی۔“ وہ اب بھی دروازے میں کھڑی تھی۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ماہ رخ.....“ میں ہکلا نے لگی۔

”میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے..... کسی نے بتایا نہیں ہے کہ میں سوچوں مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے اپنی قوت سماعت پر شک ہے نہ اپنی فہم پر۔ جو کچھ میں نے سنا اور سمجھا ہے، وہ وہی ہے جو تم نے کہا ہے۔“ وہ بول رہی تھی اور اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

”ماہ رخ! تم فضول باتیں کر رہی ہو!“ تیور چلایا۔

”مجھے پہلے سے ہی شک تھا..... بھلا کیسے ممکن ہے کہ تم دونوں کے درمیان غالب بھائی کی

وقات کے بعد پسندیدگی نہ ہوتی تو یہ اتنے سالوں سے یہاں پڑی ہوئی تھی۔ یہ اسی لیے یہاں رہ رہی تھی کہ اس کے تہارے ساتھ تعلقات تھے۔ اسے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرا ہی دماغ خراب تھا جو اس شک کے باوجود تم سے دل لگا بیٹھی اور اپنی زندگی خراب کرنے کے لیے اس گھر میں آ گئی..... وہ بلند آواز سے چلا رہی تھی۔ امی جان بھی کمرے سے نکل آئی تھیں اور حق و حق چہرہ لیے صورتحال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے تیمور؟“ انہوں نے کمال ضبط کے ساتھ تیمور سے پوچھا۔

”وہ میں اور بھائی بچن میں چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے..... ماہ رخ سورہی تھی، اٹھ کر آئی تو اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی۔“ تیمور نے وضاحت پیش کی۔ میں اس سارے قصے میں مجرموں کی طرح کھڑی تھی۔

”کیا غلط فہمی ہوئی ہے تمہیں؟“ امی جان نے ماہ رخ سے پوچھا۔

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ بس میں نے وہ تماشہ دیکھ اور سن لیا ہے جسے آپ سات سال سے نہیں دیکھ سکیں۔ یا جانتی ہیں تو نظر انداز کیے پڑی رہیں کہ چلو گھر کی گاڑی تو چل رہی ہے۔“ انتہائی بدتمیزی کے ساتھ وہ امی جان سے کہہ رہی تھی۔

”ماہ رخ!!“ تیمور چیخا۔ امی جان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کر دیا۔

”ایک بات میری کان کھول کر دھیان سے سن لو.....“ امی جان کا یہ لہجہ میں نے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ ”اس گھر میں رہنا ہے تو عزت کرنا اور کروانا سیکھو۔ آج تم نے بدتمیزی کی ہے یہ پہلی اور آخری دفعہ ہونی چاہئے۔ تیمور اور ماہا کے درمیان بھائی بہن جیسا رشتہ ہے، نہ ہوتا تو آج تم اس گھر میں نہ ہوتیں۔ اس گھر کی دیواروں کو اونچی آوازیں سننے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی بہوئیں ساسوں اور شوہروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہیں۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں جنگلی ماحول میں رہنے کا..... آپ لوگ بدتمیز ہیں.....“ تیمور کے تھپڑ نے اس کی بات بھی پوری نہ ہونے دی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر تیمور کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا بھی نہیں۔ ابھی تو مجھ پر تہمت لگا رہی تھی، اسے میں اور موقع کیسے دیتی۔

”تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے؟“ وہ چیخی۔ ”تم ہو ہی ایسے وحشی!! میں یہاں ایک منٹ کے لیے نہیں رکوں گی..... میں تمہیں بتا دوں گی.....“ وہ ہڈیاں بکتی وہاں سے نکلی اور اگلے دس منٹ میں

ہی سامان لے کر گھر سے اپنی گاڑی میں روانہ ہو گئی۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی اس وقت حواسوں میں تھا ہی کب.....

”بہت برا ہوا ہے تیمور، امی جان اسے سمجھائیں میری وجہ سے اپنے گھر میں جھگڑا کھڑا نہ کرے۔ پلیز اسے فون کر کے روک لو..... پلیز تیمور!!“ میں نے اس کے آگے ہاتھ باندھے۔ اس نے میری طرف دیکھ کر جیب سے موبائل فون نکالا اور ماہ رخ کا نمبر ملایا۔ ماہ رخ نے فون اٹھا کر جانے کیا کہا ہوگا۔

”اپنی مرضی سے جا رہی ہو..... یہ یاد رکھنا کہ میں تمہیں لینے کبھی نہیں آؤں گا..... اور اگر تم نے میرے بچے کے ساتھ کچھ کیا تو پھر اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہ ہوگی۔“ اپنی بات کر کے اس نے فون بند کر دیا۔ میں کرسی پر ڈھگئی اور بچکیوں سے رونے لگی۔

”ماہ رخ پر گلیٹ ہے کیا؟“ امی جان نے تیمور سے پوچھا۔

”جی!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تم اس سے نرمی سے بات کرو، اس حالت میں بعض عورتیں جلدی غصے میں آ جاتی ہیں۔“ تھوڑی دیر میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو لوٹ آئے گی۔“ امی جان نے آہستگی سے کہا۔ ”تم مجھے اس وقت بتاتے تو میں اسے جانے ہی نہ دیتی۔“ تیمور کے حوالے سے خوش خبری نے امی جان کو جو مسرت دی ہوگی وہ فطری تھی۔ میں نے دل سے ماہ رخ کے خیریت سے ہونے کی دعا کی اور تہیہ کیا میں واپس چلی جاؤں گی، مجھے یہاں رہ کر ان کے آپسی تعلقات کو بگاڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر اس کے دماغ میں غلط فہمی سا گئی تھی تو مجھے اس کو بڑھانے کی بجائے اس سارے منظر سے نکل جانا چاہئے۔ ثانیہ کی طبیعت کا بہانہ موجود تھا، اسی شام کو میں واپس آ گئی۔

والدہ کے ساتھ جا کر میں زارا کا نو مولود دیکھ کر آ گئی۔ ثانیہ کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ ساتھ جاتی۔ سیکنڈ آئنٹی کے گھر پر ہی ہم دونوں ہو کر آئیں۔ صحت مند اور گل تھوٹھا سا بچہ تھا۔ ولید نام رکھا گیا تھا۔ زارا کے انگ۔ انگ سے خوشی اور اطمینان جھلک رہا تھا۔ ہمارے تحائف کا اس نے شکریہ ادا کیا۔ ٹاگ گھر پر تھی، ہمارے وہاں بیٹھے ہوئے ہی وہ کالج سے لوٹی تو اس کے یونیفارم کی فٹنگ



اور اس کے اسٹائل اور ہلکے میک اپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ثناء بھی تبدیل ہو رہی تھی اور باہر کے ماحول کا اثر قبول کر رہی تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر آئی کو کہ شاید انہوں نے اسے کالج جاتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا اور اب واپسی پر اس کے حلیے پر اعتراض کریں گی..... وہ آکر ہمیں ملی اور وہیں بیٹھ گئی۔ ہم چائے پی رہے تھے، اچانک موبائل فون کی بیل ہوئی، میرا تو نہ تھا..... شاید زارا کا ہوگا، میں نے سوچا، لیکن متحیر ہوئی جب ایک نئے ماڈل کا ٹیلی فون ثناء کے بیک سے برآمد ہوا۔ اسکرین پر دیکھ کر مجھے لگا کہ جیسے وہ ایک لمحہ کے لیے پریشان ہوئی تھی، مگر اس نے فون آن کیا، ”ہیلو!! ہاں ساجدہ میں گھر پہنچ گئی ہوں..... نہیں ابھی مہمان بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر ٹھہر کر کال کرنا پھر ہوم ورک بتا دوں گی۔“ مختصر ا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ کیسے جون بدل گئی تھی اس کی، میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

تجبی میں نے خود کو ملامت کی..... بھلا میں کون ہوتی ہوں اس طرح سوچنے والی؟ قسمت سے ان کے دن پھر گئے تھے تو وہ بھی تو ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اسے بھی حق حاصل تھا زندگی سے خوشیاں کشید کرنے کا۔ اسے اگر گھر کے حالات اجازت دیتے تھے کہ وہ موبائل ٹیلی فون رکھے تو مجھے کیوں عجیب لگا اور اگر اس کی ماں اور بھائی بہن کو اعتراض نہ تھا تو میں اعتراض کرنے والی کون ہوتی تھی۔

”زارا تھوڑی ٹھیک ہو جائے تو میں اور زارا آپ کی طرف آئیں گے!“ سیکنہ آنٹی والدہ سے کہہ رہی تھیں۔ باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی اور پھر ذرا دیر کے بعد مظہر علی اندر آیا تھا، سلام دعا کے بتاؤ لے کے بعد وہ وہیں بیٹھ گیا اور والدہ کی خیریت دریافت کی۔

”بہت دن کے بعد آئی ہیں آپ؟“ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ولید نے ہمیں بلایا ہے تو ہم آئے ہیں.....“ میں نے ولید کو ساتھ لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں..... میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا..... یہ منظر میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے..... اسی طرح، یہ سب لوگ، یہ سب باتیں، ”آپ بھی تو کبھی نہیں آتے ہمارے ہاں..... حالانکہ آپ کی بہن اس گھر میں ہیں، انہیں ملنے کے بہانے.....“ جانے کیسے میرے منہ سے یہ پھسل گیا۔

”مجھے ثانیہ کا بہانہ کر کے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ وہ کہہ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ یہ منظر میں نے ہو بہو اس طرح دیکھا تھا جب میں نے ثانیہ اور علی بھائی کے رشتے کے

لیے استخارہ کیا تھا، صرف جگہ مختلف تھی، مظہر علی کا پرانا گھر..... میں نے بچہ آہستگی سے زارا کے حوالے کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ارے بیٹھیں ناں!! میں آیا اور آپ چل دیں۔“  
تو کیا قدرت نے اس وقت مجھے اپنے نصیب کا اشارہ دیا تھا، میں حیرت سے سوچ رہی تھی۔  
”تم ٹھیک تو ہو ماہا؟“ والدہ کی آواز جیسے مجھے دور سے آئی تھی۔  
”بس انھیں..... چلیں، گھر چلنا ہے، ثانیہ اکیلی ہے۔“ میں کسی کو بھی ملے بغیر باہر کی طرف چل دی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا تمہیں ماہا؟“ والدہ واپسی پر پوچھ رہی تھیں۔

”پتا نہیں کیا ہوا تھا۔“ میں نے سچائی سے کہا، ”مجھے یکدم یوں لگا جیسے میں اس ماحول سے کٹ گئی تھی۔ میں وہاں بالکل اکیلی تھی، اور کوئی نہ تھا وہاں.....“  
”کیوں ایسا کیا ہوا؟ مظہر کے آنے سے پہلے تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔ کیا اس حوالے سے کوئی پریشانی ہے۔“ والدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”میں خود اب شرمندہ ہو رہی ہوں والدہ! انہوں نے کیا سوچا ہوگا؟ میں کسی کو ملی بھی نہیں..... یکدم مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔“

”کوئی وجہ بھی تو ہوگی، اس کی!!“ والدہ نے سوال کیا۔

”مجھے لگا، وہ سارا منظر پہلے بھی میں دیکھ چکی ہوں، ان کے پہلے گھر میں، ہم سبھی لوگ.....“  
”ہوتا ہے ایسا، سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ کچھ ایسا نیا تو نہیں۔ بس کچھ تحت الشعور میں رکھا ہوتا ہے اور کچھ لاشعور میں اور وہ سارے تصورات ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا خواب، کوئی خیال۔ جب حقیقت میں ایسا ہوتا ہے تو ہمیں لگتا ہے کہ یہ منظر وہرایا جا رہا ہے۔“  
والدہ مجھے سمجھا رہی تھیں۔

”آپ کو یاد ہے جب میں نے ایک دفعہ استخارہ کیا تھا؟ علی بھائی کے رشتے کے لیے اور میں نے آپ کو اپنے ٹوٹے بکھرے خواب سنائے تھے؟“

”ہاں کچھ کچھ یاد ہے، مگر خواب یا نہیں کہ تم نے کیا سنائے تھے۔“ والدہ نے کہا۔

”یہ میں نے اس رات خواب میں دیکھا تھا، یہی منظر اور یہی لوگ..... مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے یکدم یاد آیا اور پھر مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔“ میں نے انہیں بتایا۔

”ممکن ہے اس استخارے میں قدرت نے تمہیں خود تمہارے لیے کوئی مثبت اشارہ دیا ہو!“ والدہ نے بالکل وہی بات کی تھی جو میں تھوڑی دیر پہلے سوچ چکی تھی، تاہم میں خاموش رہی۔ والدہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں، میں نے ان کی نظروں کو چہرے پر محسوس کیا اور گاڑی کے شیشے سے باہر کے مناظر دیکھنے لگی۔

میرے موبائل پر ماہ رخ کی کال تھی..... میں شش و پنج میں تھی کہ اس سے بات کروں یا نہیں۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر فون اٹھا ہی لیا۔ ”السلام علیکم!!“

”وعلیکم السلام!!“ چپکتی ہوئی آواز آئی..... ”واپس کیوں چلی گئی ہو؟“

میں اس کی اس بات کے جواب میں کیا کہتی..... اس لیے خاموش ہی رہی۔

”کیا بات ہے، ناراض ہو گیا؟“ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے بہت پریشان ہو رہی ہو.....

”معاف نہیں کرو گی مجھے؟ جانے کیا اول فول بک گئی میں..... تمہیں تو معلوم ہے کہ میں کتنی پریشان تھی..... کچھ غلط سلسلہ منہ سے نکل گیا، ہو تو معاف کر دینا۔“

غلط سلسلہ تمہارے منہ سے کیا نکلے گا، وقت اور حالات ہمیشہ مجھے ہی غلط ثابت کرتے ہیں۔

میرے جذبات، میرے رشتے اور میری سوچیں..... سب غلط ثابت ہو جاتی ہیں..... میں ہوں ہی بے سائبان، اس لیے مجھے بارش، دھوپ اور تو اور پتھروں کی بھی توقع ہوتی ہے۔“ میں سسک پڑی، ”تم نے بھی ایسا کچھ نیا تو نہیں کیا، مجھے اس کی توقع ضرور رکھنا چاہئے تھی، تیور کو میں بھائی کہتی ہوں، ضروری نہیں کہ دوسروں کی بھی وہی سوچ ہو۔“

”پلیز ماہ! مجھے معاف کر دو، اور شرمندہ نہ کرو..... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

”یوں نہ کہو ماہ رخ! میں نے تیور کے حوالے سے ہمیشہ بہت عزت دی ہے اور ہم تو ایک دوسرے کو بہت بچپن سے جانتی ہیں..... تم سے یہ توقع نہ تھی بس۔“

”میں آ رہی ہوں تمہارے پاس، تمہارے سامنے ناک سے لکیریں کھینچ کر معافی بھی مانگ

لوں گی اور آتے ہوئے تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا۔“ اب جانے وہ کس طرح کا ناک کر رہی تھی۔ مجھے دوبارہ وہاں بلوا کر شاید پھر بے عزتی کرنا چاہتی تھی۔

”نہیں تم مت آؤ، ثانیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، آج کل میں ہی اسے ہسپتال جانا ہوگا..... میں والدہ کو اس موقع پر اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی، تمہیں معلوم ہے کہ وہ خود بھی دل کی مریضہ ہیں۔“ میں نے حجت کی۔

”پلیز ماہ! ایک دفعہ آ جاؤ..... پھر بے شک دوبارہ چلی جانا..... تیور مجھ سے بہت ناراض ہے کہ میں نے اس کی بہن کو ناراض کر دیا ہے۔“ وہ منت کر رہی تھی، شاید اس لیے کہ تیور اس سے ناراض تھا۔ مجھے تجسس بھی تھا کہ وہ گھر کیسے لوٹ آئی تھی؟ کیا خود سے؟

”اچھا میں کل خود ہی آ جاؤں گی.....“ میں نے ہتھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔

”نہیں! میں اور تیور تمہیں لینے آئیں گے۔“ اس نے اصرار کیا، ”اسی بہانے تمہارے بھائی کا موڈ بھی میرے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کی بات پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، میں نے اس کی بے وقوفی پر اسے معاف کر دیا۔

گہری نیند میں تھی کہ دستک کی آواز سے چونک کر جاگی، ”کون ہے؟“ میں نے آواز لگائی تو باہر سے علی بھائی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی..... ”آتی ہوں“ کہہ کر میں فوراً اٹھی اور دروازہ کھولا۔ علی بھائی گھبرائے ہوئے تھے، یقیناً ثانیہ..... ”کیا بات ہے علی بھائی؟“

”ہسپتال جانا ہے..... والدہ.....“ علی بھائی انک کر بولے۔ میں سمجھی کہ والدہ کا کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں، ”والدہ کو شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

”کہاں ہیں والدہ؟“ میں باہر کو بھاگی۔ علی بھائی نے مجھے پکڑا۔

”آرام سے، والدہ کو ہسپتال کی ایمبولینس میں ہی بھجوا دیا ہے، ابو ساتھ گئے ہیں۔ اب میں

جار ہا ہوں، تم گھر پر ہی رکو ثانیہ کے پاس، اس کی طبیعت۔“

”مجھے ہسپتال جانا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا، ”آپ رکیں ثانیہ کے پاس۔“

”پلیز ماہ! مجھے جانے دو، ثانیہ کے پاس تم رکو.....“ علی بھائی نے منت کی۔

”آپ تانیہ کی امی کو فون کر کے یہاں بلوالیں، مجھے ابھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔“ میں نے انہیں تجویز دی جو جانے کیسے یکدم میرے ذہن میں آئی تھی۔ علی بھائی نے فون کیا، مظہر کو ساری بات جلدی سے سمجھائی اور اسے فوراً پہنچنے کو کہا۔ میں ابھی تک رات کے سونے والے لباس میں تھی، علی بھائی نے مجھے لباس تبدیل کرنے کو کہا۔ میں نے فوراً باتھ روم میں لٹکا ہوا شلوار قمیض پہنا، سویٹر پہن کر شال بھی لی، مگر میرا جسم پھر بھی کانپ رہا تھا۔ کسی انہونی کا خوف رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ ہم سیکنہ آئی کے پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تانیہ کی طبیعت کچھ زیادہ خراب نہ تھی، اس کی کمر میں درد تھا۔ بہت زیادہ تجربہ نہ سہی، لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کی طرف سے فکر کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہمارے پاس ہی بیٹھی تھی۔

مظہر علی اور آنٹی پہنچے تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے، مظہر علی ہمارے ساتھ چلنے کو تیار تھا۔ علی بھائی نے اسے گھر پر رکنے کا کہا لیکن وہ مصر تھا کہ ساتھ ہی جائے گا۔ سیکنہ آئی نے بھی تانیہ کی حالت دیکھ کر وہی اندازہ لگایا تھا کہ تانیہ کی طرف سے پریشانی کی ابھی کوئی بات نہ تھی۔ علی بھائی نے گاڑی کی چابی گھر پر ہی چھوڑ دی اور کہا کہ وہ ڈرائیور سے رابطہ کر کے اسے گھر بھجواتے ہیں تاکہ پریشانی نہ ہو۔ ہسپتال تک کا راستہ کٹ ہی نہ رہا تھا۔

”مظہر علی آپ گاڑی بہت آہستہ چلا رہے ہوں!“ میں نے گاڑی میں ورنے والی خاموشی کو توڑا۔ ”بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں، سڑکیں خالی ہیں اور میں گاڑی بہت تیز چلا رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے رمان سے جواب دیا۔ علی بھائی خاموش تھے، شاید ان کا دھیان کا دوطرف بٹا ہوا تھا، اس لیے.....

”آپ کو کیسے معلوم ہوا تھا علی بھائی؟“ میں نے وقت گزارنے کے لیے علی بھائی سے وہ سوال پوچھا جو ابھی تک پوچھ نہ پائی تھی۔ گھر پر بھی تمام وقت ہم خاموشی سے بیٹھے رہے تھے۔ ”ابو نے مجھے جگایا تھا اور پھر میں نے ہسپتال کے ایرجنسی کے شعبہ میں کال کیا تھا..... وہاں سے منٹوں میں ڈاکٹر اور ایمبولینس پہنچ گئے تھے.....“

”آپ اس وقت مجھے جگالیتے.....؟“ میں نے شکوہ کیا۔

”والدہ کی حالت بہت خراب تھی، میرا ہاتھ انہوں نے تھام رکھا تھا، وہ بہت تکلیف میں تھیں۔“ میں ان کی بات سن کر رونے لگی۔ ”میں نے ابو سے کہا کہ میں ساتھ جاتا ہوں، مگر وہ مصر

رہے کہ میں گھر پر ہوں اور ہم دونوں میں سے ایک ہر صورت گھر پر رہے، تانیہ کے پاس! وہ بتا رہے تھے، ”تمہاری تجویز بہت اچھی رہی کہ ہم دونوں ہی جا رہے ہیں۔“ میں رو رہی تھی۔

”آپ تو بہت بہادر ہیں ماہاجی!! یوں تو نہ روئیں.....“ اتنی پریشانی کے باوجود میں یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکی تھی کہ زندگی میں پہلی بار مظہر علی نے مجھے ”ماہاجی“ کہا تھا، وہ ہمیشہ مجھے میڈم ہی کہتا تھا۔ لیکن یہ وقت شاید ایسی باتوں پر سوچنے کا نہ تھا۔ ہسپتال آ گیا تھا، گاڑی رکتے ہی میں فوراً اتری اور علی بھائی بھی۔ استقبالیہ پر سے ہم نے تفصیلات چیک کی ہی تھیں کہ مظہر علی بھی گاڑی پارک کر کے پہنچ گیا تھا۔ راہداریوں میں ہم تیز قدموں سے جا رہے تھے، رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن ہسپتال کے اندریوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دن کا وقت ہو۔ جب ہم مطلوبہ وارڈ میں پہنچے تو دور سے ہی ہمیں ابو، صدف آپنی اور خرم بھائی نظر آ گئے تھے۔

تقریباً بھاگتی ہوئی جا کر صدف آپنی سے گلے لگ کر ہچکیاں لینے لگی۔ خرم بھائی نے ہمیں علیحدہ کیا اور ابو نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ ”روئے نہیں ہیں بیٹا! دعا کرو اللہ انہیں صحت دے۔“

”مجھے ملنا ہے والدہ سے ابھی!!“ میں نے ضد کی۔

”ہم بھی جس وقت سے آئے ہیں، یہیں بیٹھے ہیں..... کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے۔“ صدف آپنی نے کہا۔

”تانیہ کے پاس کس کو چھوڑ کر آئے ہو تم لوگ؟“ ابو نے استفسار کیا، ”میں نے کہا بھی تھا کہ تم دونوں میں سے ایک گھر پر ہے!“

”سیکنہ آئی کو بلوا کر چھوڑ کر آئے ہیں، آپ پریشان نہ ہوں، وہ ٹھیک ہے!“ علی بھائی نے ابو کو تسلی دی۔ وقت کٹنے میں ہی نہ آ رہا تھا، ہمارے آنے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد تانیہ آپنی اور عقیل بھائی بھی آ گئے، اور ہماری طرح راہداری میں ہی بیٹوں پر بیٹھ گئے۔

”تم ملی ہو والدہ سے؟“ تانیہ آپنی نے مجھ سے پوچھا۔

”کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے!“ میں نے مختصر کہا۔

”تو پھر یہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ؟“ عقیل بھائی رکھائی سے بولے..... وہ ایسے ہی تھے، کسی کی پرواہ نہ کرنے والے اور نہ ہی بات کرنے سے پہلے یہ سوچتے تھے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔

جائے۔ اپنے تمام بہنوئیوں میں سے مجھے وہ مختلف لگتے تھے اور اس وقت تو بہت برے لگ رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان سے کہوں کہ وہ چلے جائیں۔

”آپ چلے جائیں گھر!“ تانیہ آپنی نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔

”تم کیسے واپس آؤ گی؟“

”کوئی نہ کوئی چھوڑ دے گا!“

”کوئی نہ کوئی کون؟“ انہوں نے تانیہ آپنی کو گھورا، ”جب فارغ ہو جاؤ تو مجھے کال کرنا، میں لینے کے لیے آ جاؤں گا۔“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور سب کو خدا حافظ کہہ کر چل دیئے۔ میں نے نظر اٹھا کر تانیہ آپنی کی طرف دیکھ، ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ ابو آکر ان کے پاس بیٹھ گئے تھے جہاں سے ابھی عقیل بھائی اٹھ کر گئے تھے اور ان کا سراپے ساتھ لگایا۔ وہ چپکوں بہکوں رونے لگیں..... میں نے اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھ کر دبا دیا۔

”حوصلہ کرو بیٹا! ٹھیک ہو جائیں گی تمہاری والدہ!!“ ابو کو بھی معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہی تھیں اور انہیں بھی معلوم تھا کہ ابو سب سمجھتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو والدہ کی بیماری کی پریشانی کا شاخسانہ سمجھ رہے تھے۔ وہ بھی تکلیف میں تھیں اور ابو بھی کرب میں تھے، وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کو ہر وقت پل صراط پر چلنا پڑتا تھا، سسرال تو ساری اچھی تھی، پر جسے اچھا ہونا چاہئے تھا اس کی زبان گویا ترکش تھی۔ آدھی عمر اس کے ساتھ گزار کر بھی وہ اسے اس بات پر قائل نہ کر پائی تھیں کہ اپنی شریک زندگی سے نرمی سے گفتگو کرنا بھی نیکی ہے۔ باقی پابندیاں تو پھر برداشت ہو جاتی ہیں۔ والدہ بھی تانیہ آپنی کو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ جو کہتا ہے، وہی مان لو۔ جس بات سے خوش ہوتا ہے، وہی کرو۔ حتیٰ کہ انہیں تانیہ آپنی کا میکے آنا بھی پسند نہ تھا۔ سو وہ سال میں بمشکل دو تین مرتبہ ہی، وہ بھی خاص موقعوں پر میکے آتی تھیں۔ اس وقت وہ ابو کے کندھے سے لگی آنسو بہا رہی تھیں، اپنے دکھ پر بھی اور شاید اس بات پر بھی کہ وہ ماں جو ہر وقت حوصلہ دیتی ہے، دعاؤں کا وسیلہ ہے، اسے کچھ نہ ہو جائے۔

ہر رات کے نصیب میں صبح لکھی ہوتی ہے، سو اس رات کی بھی صبح ہو گئی تھی۔ ابو نے زبردستی خرم بھائی اور منظر علی کو واپس بھیج دیا تھا۔ علی بھائی منظر علی کے ساتھ ہی گئے تھے اور واپس پر اپنی گاڑی لے کر آ گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تانیہ بالکل ٹھیک تھی۔ ابو نے علی بھائی سے کہا کہ وہ تانیہ آپنی کو

بھی چھوڑ آئیں۔ ”مجھے نہیں جانا ابو!! پلیز“ انہوں نے احتجاج کیا۔

”بیٹا ابھی تو ملنے ہی نہیں دے رہے، جب اجازت ملے گی پھر آ جانا۔“ ابو نے سمجھایا۔

”پھر میں کیسے آؤں گی؟ آپ کو تو معلوم ہے ابو!!“ وہ فریادی ہوئیں۔

”میں خود تمہیں لینے آ جاؤں گا..... پرویز سے بات کروں گا۔“ ابو نے انہیں تسلی دی، پرویز

تانیہ آپنی کے سر تھے اور ابو کے دور پار کے کزن بھی..... ”میرا وعدہ ہے تم سے۔“

”تاکہ پھر عقیل سمجھیں کہ میں نے آپ سے شکایتیں کی ہیں!“ وہ ٹھٹھکیں۔ ابو اس بات پر

خاموش رہے، ان کے پاس بھلا اس بات کا کیا جواب تھا۔ عقیل بھائی جیسا آدمی کچھ بھی سوچ سکتا

ہے۔ ابو نے اصرار کر کے ان کو علی بھائی کے ساتھ روانہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی ایک ڈاکٹر نے

آکر بتایا کہ والدہ کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ملاقات کی ابھی اجازت نہ تھی۔ ”ممکن ہے کہ

اگلے دو تین دن ان سے ملنے کی اجازت نہ ملے۔“ ڈاکٹر نے بتایا، ”اس لیے آپ لوگ چلے

جائیں..... زیادہ سے زیادہ کوئی ایک شخص رک جائے، اگرچہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا

رابطہ نمبر چھوڑ جائیں تاکہ کسی ضرورت سے رابطہ کرنا پڑے تو.....“

”میں ڈاکٹر صدف ہوں! کیا میں اپنی والدہ کو دیکھ سکتی ہوں.....“ صدف آپنی نے کہا تو مجھے

اپنے ڈاکٹر نہ ہونے پر بہت دکھ ہوا۔ صدف آپنی ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنے پیٹے کا فائدہ اٹھاتی

تھیں۔ لیکن جب ڈاکٹر نے یہ کہا کہ وہ بھی والدہ کو ملنا تو درکنار دیکھ بھی نہیں سکتیں تو مجھے بہت کمینی

سی خوشی ہوئی۔

ہم میں سے کوئی بھی ہسپتال سے جانا نہ چاہتا تھا، لیکن والدہ کی حالت کا خطرے سے باہر

ہونے کا سن کر ابو نے سب سے کہا کہ گھر چلیں۔ صدف آپنی بھی ہمارے ساتھ ہی گھر آ گئیں۔

انہوں نے تانیہ کو چیک کیا اور بتایا کہ ابھی وقت دور ہے۔ آٹنی سیکنہ نے بھی رخت سفر باندھ

لیا، کیونکہ ہم سب لوگ گھر آ گئے تھے، گھر پر زارا اور ثناء رات سے اکیلی تھیں۔ میں نے اصرار

کر کے انہیں روکا اور خاناماں سے کہہ کر ناشتہ تیار کروایا۔ ناشتہ کر کے ابو نے علی بھائی سے کہا وہ

آٹنی کو چھوڑ آئیں۔ صدف آپنی بھی ناشتہ کر کے اپنے گھر چلی گئیں۔

”کیسی ہیں اب امی جان؟“ ثانیہ نے مجھ سے پوچھا تھا۔

”ہم تو انہیں دیکھ سکے ہیں نہ مل سکے ہیں، ویسے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“ میں نے مختصر اُکھا۔

”شکر ہے ماہاجی!“ وہ بولی، ”میں تو بہت ڈر گئی تھی۔ بار بار میرا دل ڈوب رہا تھا کہ کوئی بری خبر سننے کو نہ ملے۔ اس حالت میں کوئی بری خبر میرے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے!“ عجیب سے انداز میں وہ اس سے بھی عجیب قسم کی بات کر رہی تھی۔ میں صرف اسے دیکھ کر رہ گئی، اسے بات کرتے ہوئے کب احساس ہوتا تھا کہ اس کے الفاظ مخاطب پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں..... ”رات کئی دفعہ تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے بچے کی حرکت بھی تھم گئی ہو.....“

”بچے کسی وقت آرام بھی کرتے ہوں گے؟“ میں نے یونہی بات کر دی جس پر وہ ہنس دی۔

”آپ کو تو یوں بتا رہی ہوں جیسے آپ کو بہت تجربہ ہو.....“ اس کی اس بات پر میں خاموش ہی رہی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ، مجھے بھلا کیا تجربہ ہو سکتا ہے..... ابو اپنے کمرے میں تھے اور علی بھائی سکیئر آئی کو چھوڑنے گئے تھے وہیں سے انہیں دفتر چلے جانا تھا۔ مجھے اب نیند بھی آرہی تھی، لیکن میں سو ناہیں چاہ رہی تھی۔ یہی سوچ رہی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ میں سوئی رہ جاؤں اور ابو مجھے گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔

”ثانیہ! مجھے چائے تو بنادو..... سر بھاری ہو رہا ہے..... بلکہ آپ رکو میں خود ہی خانساں کو کہہ دیتی ہوں۔“ کہتی ہوئی میں اٹھی اور خانساں کو چائے کا بتایا۔

”ماہاجی! آپ سے کوئی بات کی تھی میں نے کچھ دن پہلے؟“ ثانیہ نے مجھ سے اچانک سوال کیا۔ بھلا یہ کون سا موقع تھا یہ سوال کرنے کا، میں خاموشی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”امی جان نے بتایا تھا کہ آپ نے ہی فیصلہ کرنا ہے اور آپ سوچ کر بتائیں گی!!“ میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ ”آپ نے کچھ سوچا اس بارے میں؟ کچھ عرصہ قبل آپ نے مجھ سے رائے پوچھی تھی میرے بھائی کے بارے میں..... آج میں آپ سے اپنے بھائی کے بارے میں سوال کرتی ہوں کہ آپ کو میرا بھائی کیسا لگتا ہے؟ ویسے میرا بھی ایک اندازہ ہے.....“ وہ رکی۔

”کیا؟“ یکدم میرے منہ سے پھل گیا۔

”کہ آپ کو مظہر بھائی اچھے لگتے ہیں.....“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا ہے؟“ میں حیران ہوئی۔

”یہ آپ کی پسندیدگی کا ہی تو سارا نتیجہ ہے ماہاجی! آپ کو مظہر بھائی اچھے لگے تو ہی آپ ہمارے گھر آئیں، حد سے بڑھ کر مدد کی، ہمارے گھر کے حالات بدلنے میں معاونت کی اور زارا آپ کا اور میرا بہترین رشتہ کروایا، ہماری شادیوں کا فریضہ آپ نے اپنا فرض سمجھ کر پورا کیا۔ اس لیے کہ آپ ہمیں اپنا اور ہمارے گھر کے مسائل کو آپ نے اپنے مسائل سمجھا..... یہ سب کچھ اور کس لیے ہو سکتا ہے؟“ اگر ثانیہ یہ سب سوچ رہی تھی اور کہہ رہی تھی تو یقیناً وہ اکیلی نہ تھی جو اس طرح سے سوچتی ہوگی۔ اس کے گھر میں کم از کم پانچ لوگوں کا مظہر علی سمیت یہی خیال ہوگا۔ میں کس کس کا منہ بند کر سکتی تھی اور کس کس کو اس طرح سوچنے سے روک سکتی تھی۔

”کیا میں یہ سب انسانی ہمدردی کے تحت نہیں کر سکتی ثانیہ؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”پھر تو دنیا بلکہ ہمارے شہر میں ہی سینکڑوں لوگ ہوں گے ہمدردی کے مستحق!!“ وہ مسکرائی۔

”میرا واسطہ مظہر علی سے پڑا ہی اس طرح کے حالات میں تھا کہ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔“ میں نے خواہ مخواہ میں اپنی صفائی دینا شروع کر دی تھی۔

”اب اس محبت کے جذبے کو آپ ہمدردی کا نام دے لیں.....“ وہ ایک ادا سے ہنسی،

”لیکن مجھے کم از کم میرے سوال کا جواب تو دے دیں۔“

”میں نے ابھی اس کی بابت سوچا نہیں!“ میں نے مختصر اُکھا دیا۔

”ویسے حیرت ہے۔ اس میں اتنا سوچنے کی کیا ضرورت ہے..... اور آپ کو کیا چاہئے؟ دوسری شادی کے لیے عورت کو کنوارا اور اسمارٹ بندہ پر پوز کر رہا ہو تو.....“ وہ یوں ناز سے بولی تو مجھے بہت برا محسوس ہوا۔

”زارا کو بھی دوسری شادی کے لیے کنوارا اور اسمارٹ بندہ مل ہی گیا ناں ثانیہ!“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی گھل گئی اور میں غصے میں ایک فضول بات کر گئی، کچھ میں ذہنی طور پر پریشان ہی اتنی تھی۔

”زارا آپ کو طلاق ہوئی تھی، بغیر رخصتی کے۔ آپ کے حالات اور تھے، زارا آپ کی تو کنواری جیسی تھیں۔ برتی ہوئی عورت کو کنوارا رشتہ ملنا خوش قسمتی ہوتی ہے.....“ اس کے بظاہر نرم الفاظ میں بھی زہری زہر تھا۔

”جو میری قسمت میں ہوگا، مجھے مل جائے گا ثانیہ!“ میں نے کوشش کی کہ میرا الجھن تلخ نہ ہو، ”آج تک تو میں نے بے وقوفی سے اپنی قسمت کی دنگلوں کو دوسروں کے در پر منتقل کر دیا تھا۔ اب اپنے لیے کچھ سوچوں گی، آپ فکر نہ کیا کرو.....“

”کیسے فکر نہ کروں؟ میں آپ کی اکلوتی اور بڑی بھانج ہوں اور آپ کی ماں جیسی ہوں.....“ آخر یہ اب میرا ہی فرض ہے کہ آپ کی فکر کروں۔“ اس نے جیسے مجھے لاڈ سے کہا۔ میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر خدا نخواستہ والدہ کو کچھ ہو گیا تو..... ”اللہ نہ کرے!“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اللہ والدہ کو صحت یاب کرے.....“ آنکھیں بند کر کے میں نے دل ہی دل میں دعا کرنا شروع کر دی..... میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

”آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے ماہا جی؟“ ثانیہ نے سادگی سے پوچھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر آنسو خشک کیے اور ررسان سے کہا۔

”ثانیہ میں والدہ کی طرف سے بہت پریشان ہوں..... میرے لیے تو سب کچھ وہی ہیں۔“ ”مجھے معلوم ہے، آپ چھوٹی بھی ہیں اور لاڈلی بھی..... اس لیے۔“ اس نے اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ کر مجھے تسلی دی، ”امی جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گی!“

”انشا اللہ!“ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے، ”آپ دعا کرنا ثانیہ! میں نے سنا ہے کہ اس حالت میں دعائیں قبول ہوتی ہیں.....“ اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ مجھے اس کے لمس سے شفقت کا احساس ہونے لگا، شاید اس لیے کہ وہ بھی ممتا کے عہدے پر سرفراز ہونے والی تھی۔

”میں تو بہت دعا کرتی ہوں خصوصاً آپ کے لیے!!! اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بہت بہتر کرے، آپ کی زندگی کی آزمائشیں ختم کرے اور آپ بھی سکون کی زندگی گزاریں، خوشیوں کے ساتھ.....“

”شکریہ ثانیہ!!!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

عائشہ باجی اور عثمان بھائی بھی آگئے تھے۔ والدہ کی حالت سنبھل رہی تھی اور ہم اب بھی ایک نقطہ انہیں دور سے دیکھ ہی سکے تھے، اس سے کم از کم یہ تسلی ہوئی تھی کہ وہ ٹھیک ہیں اور بہتر ہو رہی ہیں۔

ماہ رخ اور تیمور اگلی شام کو جب مجھے لینے آئے تو میں ہسپتال میں تھی، اس پر وہ دونوں ہسپتال ہی آگئے تھے۔ انہوں نے بھی والدہ کو دور سے ہی دیکھا تھا، پھر ہم راہداری میں رکھے بیچوں پر آ بیٹھے تھے۔ ”اگر ہم آپ کو لینے خود سے نہ آتے تو ہمیں کبھی علم نہ ہوتا کہ آنٹی اتنی شدید بیمار ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔“ تیمور نے بیٹھتے ہی مجھ سے شکوہ کیا۔

”میں اتنی پریشان تھی تیمور کہ کچھ یاد نہ تھا، تمہیں اطلاع دینے کا خیال بھی نہ آیا۔“ میں نے حقیقت بیان کی۔ واقعی ایک لمحے کے لیے بھی مجھے تیمور اور ماہ رخ کا خیال تک نہ آیا تھا۔

”مجھے معلوم ہے بھابی! اور مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی بھی نہیں ہے۔“ میں اس کی اس بات کا کیا جواب دیتی..... ماہ رخ بھی میرے پاس ہی بیٹھی میرے ہاتھ سہلا رہی تھی۔

”لگتا ہے تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟“

”ارے نہیں ماہ رخ!“ میری آنکھیں چھلک پڑیں، ”بجدا میں والدہ کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔“

”ٹھیک ہو جائیں گی آنٹی!“ تیمور نے مجھے تسلی دی۔

”تم لوگوں کو تو معلوم ہے کہ وہ میرے لیے کیا ہیں!!“ میں سسکی۔

”آپ حوصلہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ تیمور نے بھی مجھے تسلی دی۔

”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو!!“ میں نے اپنے آنسو پونچھے کیونکہ سیکنا آنٹی اور مظہر علی بھی آگئے تھے۔ آنٹی نے مجھے ساتھ لگا کر تسلی دی اور مظہر علی نے سلام کر کے تیمور سے ہاتھ ملایا۔

”لگتا ہے کہ آپ رات سے اب تک رورہی ہیں؟“ مظہر علی نے مجھ سے پوچھا۔ ”حوصلہ کریں، آپ تو دوسروں کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔“

”بس یونہی!“ میں نے مختصر کہا۔

”کیسے ہو مظہر؟ کام کیسا جا رہا ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”اللہ کا کرم ہے سر! آپ کیسے ہیں؟ بھابی آپ کیسی ہیں؟“ مظہر نے جواباً اس کی اور ماہ رخ کی خیریت دریافت کی۔ اس کے بعد مظہر علی، والد اور علی بھائی کے پاس چلا گیا۔ سیکنا آنٹی صدف آپلی کے پاس بیٹھی تھیں۔

والدہ صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئیں۔ ڈاکٹر کا مشورہ تھا کہ ان کے آپریشن کے لیے ہمیں اگلے ہارٹ ایکٹ کا انتظار نہیں کرنا چاہئے، لیکن فی الحال چونکہ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے اس لیے انہیں وہی طور پر آپریشن کے لیے تیار ہونے کے لیے کچھ وقت دیا جائے۔ میں تو والدہ کی گھر آمد پر ان سے ہی جیسے چٹ گئی تھی۔ ایک لمحہ بھی ان سے الگ ہوتی تو مجھے لگتا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

ماہ رخ کی امی، ابو اور بھابی فرح بھی والدہ کی خیریت دریافت کرنے کو آئیں۔ میں باورچی خانے میں چائے کا انتظام دیکھنے کو آئی، ثانیہ بھی والدہ اور مہمانوں کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ فرح بھابی تھوڑی دیر کے بعد میرے پیچھے باورچی خانے میں آگئیں۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ جا کر والدہ کے پاس بیٹھیں، لیکن وہ وہیں بیٹھ گئیں۔ ”دماغ ٹھیک ہوا کچھ ماہ رخ کا کہ نہیں؟“ ان کی اچانک بات پر مستفسرانہ نظروں سے میں نے انہیں دیکھا، ”تمہیں تو سب معلوم ہے، جیسے وہ گھر سے ناراض ہو کر نکلی تھی۔“ میں پھر بھی خاموش رہی۔

”اس کی امی نے تو کہا کہ اس نے بالکل درست کیا ہے اور وہ اب میکے ہی رہے گی، پھر انہوں نے اعجاز کو فون کر کے ساری بات بتائی، اس پر اعجاز بھائی نے کہا کہ ماہ رخ نے غلط کیا ہے اور وہ کبھی اس کی حمایت نہیں کریں گے۔ آئی نے تو کہا کہ اعجاز بھی نگہت کو واپس بھیج دے، اس پر اعجاز بھائی نے صاف کہہ دیا کہ اگر ماہ رخ کو تیسویں گھر سے نکالتا یا اسے خدا نخواستہ طلاق بھی دے کر بھیجتا تو بھی وہ نگہت کو کبھی متاثر نہ ہونے دے گا۔“ مجھے یہ سب باتیں ناقابل یقین لگ رہی تھیں۔

”آپ کو یہ سب آئی نے خود بتایا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں! میں نے اتفاقاً دوسرا فون اٹھا لیا تھا، اپنے کمرے سے..... وہ اسی نمبر کی ایکسٹینشن ہے جو نمبر لاؤنچ میں لگا ہوا ہے۔“ انہوں نے مجھے بتایا۔ ”فون بند ہوا تو میں لاؤنچ میں آگئی، وہاں آئی اور انکل میں بھی اسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا ماہ رخ بھی وہیں پر تھی، وہ رو رو کر تیور کے گھر والوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ کبھی واپس اس گھر میں نہیں جاؤں گی اور نہ ہی تیور کا بچہ پیدا کروں گی..... طلاق لے لوں گی.....“ میں سانس روکے بغیر دخل دیے سن رہی تھی..... عموماً مجھے کسی کی بات کا یوں تجسس بھی نہیں ہوتا اور میں کسی اور کی باتیں یوں سننا برا سمجھتی ہوں، لیکن مجھے ماہ رخ کے معاملے کا تجسس بھی تھا اور سمجھ میں نہ آیا تھا کہ ماہ رخ کس طرح اتنی مختلف باتیں کر رہی

”رات کو ادھر ہی تھیں آپ؟“ تیور نے پوچھا۔

”ہاں! رات ہی تو آئے تھے، صبح گھر چلے گئے تھے اور شام کو پھر آ گئے تھے۔“ میں نے بتایا۔

”اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟“ تیور نے سوال کیا، ”آج گھر جائیں گی یا پھر اسپتال میں؟“

”یہاں رکنے کی تو کسی کو بھی اجازت نہیں ہے..... رات کو گھر پر ہی چلے جاتے ہیں سب۔“

”تو پھر ہمارے ساتھ ہی چلیں، ہمارے گھر.....“ تیور نے کہا، میں اور ماہ رخ آپ کو لینے

ہی آئے تھے۔ وہ بہت شرمندہ ہے.....“

”میں آؤں گی، والدہ ٹھیک ہو جائیں تو پھر گھر آ جائیں..... ابھی عائشہ باجی بھی آئی ہوئی

ہیں۔“ میں نے عذر پیش کیا۔

”چلیں ہم آپ کی طرف چلتے ہیں اور رات کو دیر سے آپ ہمارے ساتھ چلی چلیں جب

عائشہ باجی سو جائیں تو!!“ تیور بحث کر رہا تھا۔

”چلو ناں ماہ! ماہ رخ نے کہا۔“ کل واپس آ جانا۔“

”ماہ رخ تمہیں معلوم ہے ثانیہ کی طبیعت.....“

”تو آج تو کم از کم عائشہ باجی ہیں ناں، آج چلو.....“ ماہ رخ نے بھی منت کی۔

”پلیز ماہ رخ اصرار نہ کرو..... مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔“ میں نے شرمندگی سے کہا۔

”پھر کب آئیں گی پہلے پکا وعدہ کریں.....“ تیور نے مداخلت کی، ”میری چھٹی صرف چھ

دن رہ گئی ہے۔ مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“

”آؤں گی ضرور..... وعدہ رہا اور کب آؤں گی یہ بتانا مشکل ہے۔ بس دعا کرو کہ والدہ ٹھیک

ہو جائیں۔“ میں نے اس کی تسلی کے لیے وعدہ کر لیا۔

”وہ گھر اب بھی تمہارا ہے ماہ!.....“ ماہ رخ نے میرا ہاتھ تھام لیا، ”اسے اب بھی اپنا میکہ ہی

سمجھنا، میں ہی بے وقوف تھی جو غلط سمجھی تھی۔“

”وہ گھر اب بھی اپنے میکے جیسا ہی لگتا ہے۔“ میں نے اسے دیکھا، ”تم خوش رہا کرو، زندگی

کا آغاز ہی بد مزگیوں سے ہوگا تو آگے جا کر یہ بڑے مسائل بن جائیں گے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کا خیال رکھا کرو، ایک دوسرے کی خوشی کا۔“ میں نے بڑے بوڑھوں کی طرح اسے نصیحت کی۔

تھی۔ میں ساتھ ساتھ سمو سے فرائی کر رہی تھی۔ ”انکل نے آنٹی سے کہہ دیا کہ اگر تم نے اسے کوئی غلط پٹی پڑھائی تو میں تمہیں بھی طلاق دے دوں گا، کسی چیز کا خیال نہیں کروں گا..... یہ بھی نہیں سوچوں گا کہ تم دادی بن چکی ہو۔“ فرح بھابی نے بتایا۔

”آپ کے سامنے ہی یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”عموماً ماں بیٹیاں میرے سامنے کوئی بات نہیں کرتیں، بلکہ مجھ سے چھپاتی بھی ہیں، لیکن انکل میری بہت عزت کرتے ہیں، مجھے گھر کا فرد ہی سمجھتے ہیں اور ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کے اعتماد کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں نے ہمیشہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھا ہے اور اس گھر کی کوئی بات کبھی اپنے میکے میں بھی نہیں کی۔“

”لیکن اب آپ مجھے تو بتا رہی ہیں؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”تمہیں بتانے کی بھی کوئی وجہ ہی ہے..... کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان ہو۔“

”مجھے کیسے نقصان ہوگا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم نے ہمیشہ ماہ رخ کا اچھا چاہا ہے، میں جانتی ہوں، لیکن وہ تمہارے ساتھ نہ کبھی مخلص رہی ہے نہ آئندہ ہوگی.....“ فرح بھابی بولیں۔

”نہیں بھابی! وہ بہت اچھی ہے بس ذرا غصے میں جلدی آ جاتی ہے۔“ میں نے غلوں سے کہا۔

”یہ بھی تمہاری اچھائی ہے ماہا کہ تم اسے اچھا سمجھتی ہو، وہ تو تمہارا پتا کاٹنے کی فکر میں ہے۔“ وہ بولیں، ”اس کی امی نے اب اس کو نئے سبق سکھلا کر بھیجا ہے۔“ وہ راز داری سے بولیں۔

”ٹانیہ اچانک باورچی خانے میں آ گئی تھی، ”دلوگ مل کر چائے بنا رہے ہیں پھر بھی چائے نہیں گل رہی.....“

”چائے تو میں ہی بنا رہی ہوں.....“ میں نے فوراً بات بنائی، ”بھابی تو مجھے اپنے بیٹے کی باتیں بتا رہی تھی..... ٹانیہ اتنا کیوٹ بیٹا ہے بھابی کا، بے اختیار اسے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔“

”ہاں میں نے دیکھا تھا شادی کے دنوں میں۔“ ٹانیہ نے مختصر کہا۔

”چلیں فرح بھابی! چلتے ہیں، چائے تیار ہے.....“ میں نے ٹرائی تیار کر لی تھی۔ میرے کہنے سے فرح بھابی بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی.....

”ماہاجی! آپ ذرا چائے دے کر میرے کمرے میں آئیں گی؟“ ٹانیہ نے آہستگی سے کہا۔

”خیریت ہے ناں ٹانیہ.....؟“ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”معلوم نہیں!!“ اس کی آواز کمزوری تھی۔

”اوہ خدایا!“ فرح بھابی چیختی تھیں، ”اسے تو فوراً ہسپتال لے جانا ہوگا، مجھے لگتا ہے کہ اسے

بلیڈنگ ہو رہی ہے!“ فرح بھابی کے کہنے پر میں نے غور سے ٹانیہ کو دیکھا تو میرا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔

”چائے کو چھوڑ دو ماہا!“ فرح بھابی چیخیں، ”میرے ساتھ مل کر اسے کسی طرح صوفے یا بیڈ

تک پہنچاؤ..... اسے فوری طور پر ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

”آہستہ بولیں بھابی!“ میں نے آہستگی سے کہا، ”والدہ کے کانوں تک ہماری آواز نہ

پہنچے۔“ میں نے اور فرح بھابی نے اسے تقریباً اٹھا کر قریبی صوفے پر لٹایا اور میں نے لرزتی ہوئی

آواز میں علی بھائی کو کال کی..... ساتھ ہی میں نے صدف آپ کی کو بھی اطلاع کر دی تھی۔

”درود نہیں ہو رہا کہیں تمہیں ٹانیہ؟“ فرح بھابی نے پوچھا تھا۔

”بس کمر اور ٹانگوں میں بہت درد ہے.....“ ٹانیہ نے کمزوری آواز سے کہا۔

”تم پریشان نہ ہو..... سب ٹھیک ہو جائے گا!“ میں نے اس کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔

”بھابی آپ پلیز چائے لے کر جائیں، میرا پوچھیں تو کوئی بہانہ کر دیں کہ میں ہاتھ روم میں ہوں

اور ہو سکے تو آرام سے آپ والدہ کو بتا دیں کہ ٹانیہ کی طبیعت خراب ہے۔“ میرے کہنے پر بمشکل

بھابی چائے لے کر گئیں۔ ٹانیہ تو گھبراہٹ میں رہی ہوگی، مگر میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

والدہ کو تو ابھی بستر سے ہی نہ اٹھنا تھا مگر ماہ رخ کی امی اٹھ کر آ گئیں اور ٹانیہ کی حالت دیکھ

کر تشویش کا اظہار کرنے لگیں۔ وہ ایسی ہی لاپرواہ تھیں کہ انہیں بات کرتے ہوئے احساس بھی نہ

ہوتا تھا کہ وہ کسی کے جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ ”کاش یہ اس وقت یہاں نہ آئی ہوتیں!“ میں

نے دل ہی دل میں سوچا۔ علی بھائی کے ساتھ ہی میں نے سیکنڈ آنٹی کو بھی فون کر دیا تھا۔ دونوں کو

میں نے یہی بتایا تھا کہ ٹانیہ کی طبیعت خراب ہے۔ ٹیلی فون پر تفصیل بتانا غیر ضروری تھا۔ تھوڑی

دیر کے لئے آنٹی اور فرح بھابی کو وہیں چھوڑ کر میں والدہ کی طرف گئی اور انہیں تسلی دی۔

”ابو کو ساتھ لے کر تم ہسپتال چلی جاؤ.....!“ ان کے لہجے میں تشویش تھی، ”ابھی تھوڑی دیر

پہلے ہی تو یہاں بالکل ٹھیک بیٹھی ہوئی تھی۔“



کہیاں اپنے گھٹنوں پر نکائے زمین کو دیکھ رہا تھا، اور علی بھائی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے سر اٹھایا تو انہوں نے نظر چرانے کی کوشش کی۔ مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں اس طرح میری طرف دیکھ رہے تھے؟ کیا وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے اور..... وہ بات کیا ہو سکتی ہے۔ بچوں پر بیٹھے بیٹھے لگا صدیاں ہی بیت گئیں۔

”باہر چل کر کسی کینٹین وغیرہ سے چائے نہ پی جائے؟“ فرح بھابی نے تجویز دی۔ ”سردی بھی بہت بڑھ گئی ہے اچانک.....“ یہ تو وہ احساس تھا جو ہمارے اندر تھا اور نہ سردیوں کا موسم تو اختتام پر تھا۔ ”یہاں بیٹھ کر تو الٹا اور بھی پریشانی ہو رہی ہے..... ذرا باہر نکلیں تو!!“ فرح بھابی کی تجویز پر تھوڑی دیر سب نے سوچا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مظہر علی نے یہ بھی کہا کہ وہ جا کر چائے وہیں لے کر آ جاتا ہے لیکن یوں ہسپتال کے کارڈور میں بیٹھ کر چائے پینا..... ہم سب کو وہ تجویز پسند نہ آئی تھی، اس لیے ہم وہاں سے اٹھ کر باہر کی طرف چلے۔

لان میں گھاس تو بالکل خشک تھی البتہ پھر بھی پھولوں کے تختوں پر رونق نظر آ رہی تھی اور لوگوں کا رش اس طرح تھا جیسے کوئی میلہ لگا ہوا ہو۔ لگتا تھا کہ سارا شہر ہی بیمار پڑ گیا ہو۔ چند ایک بچے تھے جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور چند ایک پر لوگ سو بھی رہے تھے۔ ہمیں کوئی بچہ خالی نظر نہ آیا۔ کینٹن کے پاس سیڑھیاں تھیں ہم اسی طرف چل دیئے۔ علی بھائی چائے لینے چلے گئے اور سیکنہ آئی کو باتھ روم جانا تھا، مظہر علی انہیں ہمراہ لے کر روانہ ہوا تو شاید یہی موقع تھا جس کی فرح بھابی کو تلاش تھی۔ وہ فوراً رازداری سے مجھ سے گویا ہوئیں۔

”ماہا! میں تم سے جو بات کر رہی تھی، بچ میں ادھوری ہی رہ گئی۔ یوں تو میں کبھی اپنے گھر کی باتیں یوں کسی سے نہ کروں، مگر ماہا ایک تو تم بہت اچھی ہو، اور دوسرے تمہیں یہ بات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ میں تمہیں خبردار کرو کیونکہ یہ بات براہ راست تمہارے ہی بارے میں ہے۔“ میں خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ”تم میری طرف سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا.....“ وہ رکیں، ”تم سن رہی ہو ماہا؟“

”جی!!“ میں نے مختصر کہا۔

”ماہ رخ کچھ سال پہلے تک ایسی نہ تھی، اس کی امی ہمہ وقت اسے غلط سلیقہ باتیں سکھاتی رہتی ہیں۔ میرے سرال کے سب لوگ تو بہت اچھے اور سمجھدار ہیں، میرے سر، میرے دیوار اور

”آپ فکر نہ کریں، ابو آپ کے پاس رہیں گے، میں نے علی بھائی کو کال کر دیا ہے۔“ میں نے والدہ کو تسلی دی۔ ثانیہ کو بلیڈنگ ہوئی تو تھی مگر اب نہ ہو رہی تھی، اس لیے میرا خیال تھا کہ ایسی زیادہ پریشانی والی بات کوئی نہیں۔ واپس آ کر لاؤنج کے دروازے بند کر کے میں نے فرح بھابی کے ساتھ مل کر ثانیہ کا لباس تبدیل کروایا اور بیگ وغیرہ بھی لاؤنج میں لا کر پاس ہی رکھ لیا جو والدہ نے ہنگامی حالات کے لئے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔

ہسپتال کے کارڈور میں، میں سردی کی لہروں کو اپنے وجود میں اترتے ہوئے محسوس کر رہی تھی، فرح بھابی بھی ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ ماہ رخ کے والدین ہمارے گھر سے رخصت ہو گئے تھے۔ سیکنہ آنٹی، مظہر علی کے ساتھ سیدھی ہسپتال ہی آ گئی تھیں۔ صدف آپنی اسی ہسپتال میں تھیں اور اس وقت وہ ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ آپریشن تھیٹر میں تھیں اور ہم سب باہر بیٹھے ہوئے تھے، بے چینی لہوین کرگوں میں دوڑ رہی تھی۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ انہیں بچے کے بارے میں تشویش تھی..... اپنے پیشہ ورانہ انداز میں انہوں نے ہمیں تسلی تو دی تھی لیکن امیدوں کے مضبوط آسرے نہ دیئے تھے۔ ہم میں سے ہر کوئی سر نہبواڑے خاموشی سے بیٹھا تھا، آپس میں کوئی بات بھی نہ کر رہا تھا، ہم پانچ لوگ بیٹھے تھے اور خاموشی چھپے ہمارے ہی کی طرح ہمارے ساتھ تھی۔ سیکنہ آنٹی کوئی درد کر رہی تھیں۔ ایک بچہ علی بھائی اور مظہر علی بیٹھے تھے اور ایک بچہ پر میں اور فرح بھابی سیکنہ آنٹی کے ساتھ۔

میرے ہونٹوں سے بھی درود شریف کا ورد جاری تھا، دل میں اندیشے اور چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں۔ کبھی کبھی مجھے خود پر کسی کی نظریں محسوس ہو رہی تھیں، مجھے دیکھے بغیر بھی اندازہ تھا کہ یہ نظریں مظہر علی کی تھیں۔ مجھے الجھن بھی ہو رہی تھی، اگر جو علی بھائی اسے یوں دیکھ لیتے مجھے گھورتا ہوا تو کیا سوچتے؟ اگر والدہ اور ثانیہ کو معلوم تھا کہ اس نے میرے رشتے کا عندیہ دے رکھا ہے تو یقیناً علی بھائی کو بھی علم تھا۔ تب میں نے سوچا کہ میں اچانک اس کی چوری پڑلوں تو شاید وہ شرمندہ ہو کر مجھے دیکھنا چھوڑ دے۔

میں نے نظر اٹھائی تو حیرت سے دوچار ہو گئی، کیونکہ مظہر علی اپنا سراپے ہاتھوں میں تھامے،

میرے شوہر.....“ ان کی اس بات پر مجھے مکمل یقین تھا کیونکہ جس طرح انہوں نے اعجاز کے بارے میں بتایا تھا کہ اس نے اپنی ماں کا ایک غلط مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا، حتیٰ کہ میری اور معظم کی متغنی کے بعد جس طرح انہوں نے معظم کی چھان بین کروائی تھی، یہ ان کی ذہنی چٹنگی کو ظاہر کرتی تھیں۔“ میں نے اتفاق سے ماہ رخ اور اس کی امی کی گفتگو سن لی تھی، جو تمہارے بارے میں تھی!“

”میرے بارے میں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”مختصر بتاتی ہو، کیونکہ وقت کم ہے۔“ انہوں نے جلدی سے کہا، ”ماہ رخ کی امی نے اب اسے یہ سمجھا کر بھیجا ہے کہ وہ تمہیں میٹھی چھری سے ذبح کرے.....“

”کیا مطلب؟“ میں سمجھ نہ پائی تھی۔

”مطلب یہ کہ“ بھائی فرح میرے نزدیک ہو کر رازداری سے بولیں، ”وہ ماہ رخ کو سمجھا رہی تھیں کہ تم سے پیار سے بات کرے اور تیور کے سامنے اپنا رویہ اچھا رکھے، اور کسی طرح تمہیں منا کر جیسے بھی ہو، جو بھی پہلا رشہ نظر آئے وہاں تمہاری شادی کروا دے، ان کے خیال میں تم ماہ رخ کے قدم جمانے کے راستے میں سب سے بڑا کاٹنا ہو، اور تمہارا بندوبست کرنا ضروری ہے!“

”چائے لے لیں بھابی!“ علی بھائی چائے لے کر آگئے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان سے چائے کا کپ لے لیا، وہ میرے ساتھ ہی سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ میرے کانوں میں فرح بھابی کے الفاظ کی بازگشت تھی۔

”تم ٹھیک تو ہو ماہا؟“ علی بھائی نے مجھ سے پوچھا۔

”آں ہاں!!“ میں چونکی، ”میں ٹھیک ہوں۔“

”لگ تو نہیں رہا!!“ علی بھائی مسکرائے۔

”آپ ٹھیک ہیں علی بھائی؟“ میں نے استفسار کیا، ”مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟“ میں زبردستی مسکرا کر بولی، ”بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ ہماری پریشانی کا سبب کیا ہے؟“ لیکن مجھے لگا!!

”کیا لگا تمہیں؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”جیسے آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے، اندر جب ہم وہاں کا ریڈور میں بیٹھے تھے.....“

”تمہارا اندازہ درست ہے.....“ وہ بولے، ”میرا دھیان والدہ کی طرف تھا اور سوچ رہا تھا

کہ تم سے کہوں کہ تم ان کے پاس چلی جاؤ.....“ اور فرح بھابی بھی اپنے گھر چلی جاتیں، یہاں نہ جانے کتنی ہی دیر لگ جائے.....“

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں، والدہ کی ایسی طبیعت ہے کہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا..... اب تو کسی ایمر جنسی کی صورت میں اکیلے ہی ہوں گے.....“ آئی سیکنہ اور مظہر علی بھی آگئے تھے، علی بھائی نے اٹھ کر آئی کو جگہ دے دی تھی اور وہ خود مظہر علی کے ساتھ کھڑے تھے۔

”تو تم چلی جاؤ گھر، ڈرائیور چھوڑ دیتا ہے تمہیں بھی اور فرح بھابی کو بھی۔“ علی بھائی بولے۔

”ارے میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے، مجھے کوئی جلدی نہیں ہے گھر جانے کی۔“ فرح بھابی بولیں۔

”علی بھائی یہاں پر ہوں تو دھیان گھر پر والدہ کی طرف ہے اور ان کے پاس جاؤں گی تو یہاں کی فکر رہے گی..... میں یہیں ٹھیک ہوں.....“

”چلی جاؤ بیٹا! بہن جی اکیلی ہیں، اگر خدا نہ کرے ان کی طبیعت خراب ہو جائے تو.....“ سیکنہ آئی نے کہا۔

”نہیں آئی مجھے یہیں رہنے دیں۔“ میں نے دل ہی دل میں ثانیہ کے بارے میں سوچا، جب اسے ہوش آنے کا اور علم ہوگا کہ میں نہیں ہوں تو سوچے گی کہ شاید کسی کو اس کی پرواہ ہی نہیں ہے۔

”تو علی بیٹا پھر آپ چلے جاؤ گھر پر!!“ سیکنہ آئی نے علی بھائی سے کہا، ”یہاں تو مظہر علی ہے، کوئی ضرورت پڑی تو معاملہ سنبھال لے گا..... کوئی مسئلہ ہوا تو تمہیں کال کر دیں گے۔“ علی بھائی نے ان کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ جلدی جلدی چائے ختم کرنے لگے۔

”میں چلی جاتی ہوں اور والدہ کو دیکھ کر واپس آ جاؤں گی!“ میں نے بادل خواستہ حامی بھری۔

”چلیں فرح بھابی! آپ بھی چلیں.....“ وہ میرے ساتھ ہی بولیں۔ میرا ارادہ صرف یہ تھا کہ انہیں ان کے گھر بھجوا دوں گی، والدہ کو دیکھنے آئی تھیں اور خواہ مخواہ میں انہیں ایسی صورتحال میں ہماری اخلاقی مدد کے لیے ہسپتال آنا پڑ گیا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ چلنے کی حامی بھری۔

مظہر علی اور سیکنہ آئی دوبارہ ہسپتال کی طرف چلے گئے جبکہ علی بھائی ہم دونوں کو گاڑی تک چھوڑ گئے۔ راستے میں بھی فرح بھابی، ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے محتاط انداز میں اشارتاً کچھ نہ کچھ بتاتی رہیں۔ ان کی باتوں سے کم از کم میرے ذہن سے یہ الجھن تو دور ہو گئی تھی کہ ماہ رخ خود بخود گھر کیسے لوٹ آئی تھی..... اپنے گھر پر میں اتنی تو باہر سے ہی فرح بھابی نے رخصت

بھائی کا نمبر ڈائل کیا، دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ اس کے علاوہ تو میرے پاس صرف مظہر علی کا نمبر تھا، لیکن میں نے اسے ڈائل کرنا مناسب نہ سمجھا، خصوصاً اس وقت جبکہ وہ اور علی بھائی اکٹھے ہی ہوں گے۔

کھانا گاڑی میں ہی رہنے دیا، یہی سوچا کہ تھوڑی دیر کے بعد سب باہر ہی کہیں بیٹھ کر کھانا کھالیں گے، یا پھر گاڑی میں بیٹھ کر۔ اندر پہنچی تو میرے قدم رکنے لگے، کارڈور میں ماحول بہت سنجیدہ اور پریشان کن لگ رہا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی علی بھائی کے پاس پہنچی، ”کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے شانوں کے گرد رکھ کر مجھے اپنے ساتھ لگالیا، ان کا جسم لرز رہا تھا۔ ”سب ٹھیک تو ہے ناں علی بھائی؟“ میں نے سراپسنگی سے کہا، میری آواز میں بھی خوف سا تھا، ”ٹانیا کیسی ہے اور بچہ.....؟“

”ٹانیا ابھی ”ری کوری روم“ میں ہے، اسے ہوش تو آ گیا ہے، مگر ابھی مکمل طور پر.....“ ان کی آواز رگ رہی تھی۔

”اور بچہ؟؟“ میں نے جلدی سے کہا۔ اس پر علی بھائی نے مجھے اپنے ساتھ لپٹالیا..... میری سسکیاں نکل گئیں..... ”کیا ہوا بچے کو؟.....“

”اللہ کی یہی رضا تھی بیٹا!!“ ”سیکنڈ آکسی نے مجھے ساتھ لگالیا.....“ اس کا یہ کرم کیا کم ہے کہ ٹانیا زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔“

”مگر ہوا کیا؟؟“ میں تقریباً چیخی۔

”اس کی زندگی ہی چند سانس تھیں!“ ضبط کی کوشش کے باوجود میں بلند آواز سے سسک پڑی! ”سیکنڈ آکسی کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ علی بھائی نے مجھے آکسی سے علیحدہ کر کے اپنے ساتھ لگالیا۔ میں انہیں لپٹ کر سسنے لگی۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی ایسی پیچیدگی ہو گئی تھی کہ ٹانیا کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی اور آپریشن سے ولادت ہوئی تو بچہ چند سانسوں کا ہی مہمان تھا۔ علی بھائی کا آنگن بسنے سے پہلے ہی ویران ہو گیا تھا، جہاں معصوم قلعاریوں کو گونجتا تھا وہاں اب آنسو بکھر گئے تھے۔ والدہ کیسے انتظار میں تھیں، ان کے بیٹے کی پہلوٹھی کی اولاد، ان کی آئندہ نسل میں اضافہ، لیکن وہ پھول کھلنے سے قبل ہی مرجھا گیا تھا۔

”آپ لوگ ٹانیا سے ملے ہیں؟“ میں نے علی بھائی سے پوچھا۔

چاہی، ”بھابی آپ آتیں اندر کوئی چائے وغیرہ تو لیتیں.....“ میں نے اصرار کیا۔

”پھر کسی وقت پر چائے ادھار کر لیتے ہیں.....“ انہوں نے کہا، ”ایک بات کہنا تھی تم سے!“

”جی بھابی؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”مجھے تم سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے کہ جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں..... انہیں میرے اور تمہارے درمیان ہی رہنا چاہئے..... میں تم پر اعتبار کر سکتی ہوں ناں کہ تم.....“

”آپ فکر نہ کریں بھابی!!“ میں نے ان کی بات کاٹ کر ان کے ہاتھ تھام کر انہیں یقین دہانی کروائی۔

”ویسے ماہ رخ ول کی بری نہیں ہے.....“ انہوں نے بتایا، ”صرف ماں کی تربیت کے زیر سایہ ہے جو اسے منفی باتیں سکھاتی ہیں، حالانکہ مائیں اولاد کو بہتر چیز دینے کی کوشش کرتی ہیں۔“

میں نے ڈرائیور کو سمجھایا کہ وہ فرح بھابی کو چھوڑ کر واپس آ جائے۔

والدہ کو میرے یوں واپس آ جانے پر تعجب تھا، ان کا خیال تھا کہ مجھے اس وقت ہسپتال میں ہونا چاہئے تھا۔ چونکہ وہ خود ایسی حالت میں نہ تھیں ورنہ وہ خود ہسپتال میں ہوتیں۔ میں نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ سیکنڈ آکسی، صدف آپی، علی بھائی اور مظہر علی وہیں پر تھے اور میں اسی خیال سے گمراہی تھی کہ کہیں وہ دیر ہو جانے پر پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا اور ٹانیا کا آپریشن ہو رہا تھا، دونوں باتیں میں نے والدہ سے چھپائی تھیں، البتہ بعد ازاں میں نے ابو کو بتا دیا تھا۔

ابو نے ہی مجھے اصرار کر کے دوبارہ ہسپتال بھجوا دیا تھا، میں نے والدہ اور ابو کو بھی رات کا کھانا کھلادیا تھا اور ہسپتال میں موجود لوگوں کے لئے بھی ٹین بکس تیار کر کے دوبارہ ہسپتال روانہ ہوئی۔ ٹکلتے ہوئے والدہ نے واپس بلا کر دوبارہ تاکید کی کہ جو نبی خیر کی خبر ملے میں انہیں فوراً اطلاع کر دوں۔ میں نے والدہ کو دوا بھی دے دی تھی تاکہ وہ ریٹیکس ہو کر سو جائیں.....

”اللہ کرے کہ خیر کی خبر ہی ہو.....“ گاڑی میں بیٹھ کر ہسپتال جاتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ابھی تک کوئی فون بھی نہ آیا تھا، میں تو حیران تھی کہ آپریشن اتنا طویل کیوں ہو گیا تھا۔ عجیب سی پریشانی دل کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ خود ہی فون کر کے خیریت دریافت کرنے کا سوچا، علی

”صرف میں ملا ہوں، وہ بھی صدف آپ کی وجہ سے.....“ علی بھائی طول لہجے میں بولے۔  
 ”وہ بالکل ٹھیک ہے ناں اب؟ اسے کچھ نہیں ہوگا ناں؟“ میں رورہی تھی۔  
 ”حوصلہ کرو ماہا!“ علی بھائی نے میرے کندھے چپکے۔  
 ”آپ نے بچے کو دیکھا ہے؟“.....  
 ”نہیں!“ انہوں نے آہستگی سے کہا، ”مجھ میں حوصلہ نہیں ہے.....“

کیسے ارمانوں سے وہ اس لمحے کا انتظار کر رہے ہوں گے جب ڈاکٹر لبروم سے باہر آکر کہتی، ”مسٹر علی! مبارک ہو، آپ ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہیں.....“ اور یہ آواز سننے سے وہ محروم رہے تھے۔ جانے کس حوصلے سے انہوں نے سنا ہوگا، جب ڈاکٹر نے باہر آکر کہا ہوگا، ”ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے بچے کو نہیں بچا سکے!!“ اگرچہ مارنے اور بچانے والی طاقت تو وہ ہے جو ہم سب کی خالق ہے، لیکن اسی کے پیدا کردہ انسانوں میں سے کچھ مسیحا بن جاتے ہیں، جن کی زندگی کا مقصد ہی انسانی جان کو بچانا ہوتا ہے لیکن جہاں تقدیر میں لکھا ہو کہ اب سائیں تمام ہونیں، اس سے آگے تو ہر انسانی کاوش بے بس ہوتی ہے۔  
 ”والدہ کو یہ خبر کس طرح سنا میں گئی علی بھائی؟“ میں نے تشویش سے کہا، ”وہ تو شدت سے انتظار کر رہی ہیں اس خوشخبری کا جو ہم سے روٹھ گئی ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا.....“ علی بھائی بولے، ”گھر چلتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ کس طرح صورتحال کو سنبھالنا ہوگا، بچے کی تکلیفیں و تدفین بھی تو کرنا ہے۔ انہیں جیسے بھی ہو، احتیاط سے بتانا تو ہوگا، یہ خیر ان سے چھپائی تو نہیں جاسکتی۔“ صدف آپ نے ہم سب سے کہہ دیا تھا کہ ہم گھر چلے جائیں، لیکن سیکرٹ آئی نے وہاں رکنے پر اصرار کیا۔ اگرچہ ٹائیڈ آئی سی یو میں تھی اور جب تک وہاں سے باہر نہ آجاتی، سیکرٹ آئی بھی اسے نہیں مل سکتی تھیں۔

”آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں آئی!“ صدف آپ نے ان سے کہا۔

”نہیں بیٹا! میں اب گھر چلتی ہوں، صبح آجاؤں گی۔“ انہوں نے ہتھیرا ڈالتے ہوئے کہا اور مظہر علی کے ساتھ گھر روانہ ہوئیں جب کہ میں، صدف آپ اور علی بھائی اپنے گھر کھانا تو گاڑی میں ہی دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ راستے میں ہم منصوبہ بندی کرتے رہے کہ کس طرح بات کریں گے۔

والدہ اور ابولاؤنچ میں ہی بیٹھے بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

”السلام علیکم!“ ہم تینوں نے سلام کیا۔

”یار تم فون کیوں بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے؟“ ابو کی آواز میں خفگی اور غصہ تھا۔

”بیڑی ختم ہو گئی تھی ابو!“ علی بھائی آہستگی سے بولے۔

”ہم تو پریشان ہی ہو گئے تھے.....“ ابو ذرا نرم لہجے میں بولے۔ میں اور صدف آپ ابی ابو کے

پاس بیٹھ گئیں اور علی بھائی والدہ کے پاس۔

”ثانیہ کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی والدہ..... موت کے منہ سے واپس آئی۔“

”یو نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ماں کا وجہ اتنا افضل نہیں رکھا ہے، ہر عورت موت کے منہ سے ہی

لوٹ کر آتی ہے۔ انسان کی ولادت دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ماں کے قدموں میں جنت بھی تو

اسی لیے ہے کہ وہ اتنی تکلیف اور کرب سے اولاد کو جنم دیتی ہے.....“ والدہ نے کہا، ”لیکن اب تو وہ

ٹھیک ہے ناں؟“

”جی والدہ!.....“ علی بھائی آہستگی سے بولے۔

”اور بچہ کیسا ہے؟“ میں تو سمجھی تھی کہ تم لوگ آتے ہی مجھے بچے کی مبارک باد دو گے؟“ والدہ

نے شکوہ کناں نظروں سے ہمیں دیکھا۔

”جی!!“ علی بھائی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”اصل میں والدہ.....“ صدف آپ ابی اٹھ کر والدہ کے پاس جا بیٹھیں اور انہیں کندھوں سے

تھام لیا۔ میرا دل لرز نے لگا کہ اب صدف آپ کی انکشاف پر والدہ جانے کیا اثر لیں۔ ”پریشانی

ہی ایسی تھی کہ نہ آپ کو کال کر کے بتا سکتے تھے اور.....“

”کیا بات ہے صدف! جلدی بولو میرا تو دل ہولنے لگا ہے؟“ والدہ بے قراری سے بولیں۔

”خود کو سنبھالیں والدہ! اللہ کی رضا میں انسان کیا کر سکتا ہے.....“ صدف آپ نے فقرہ مکمل

کیا، والدہ نے آنکھیں موند لیں، ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، ان کے چہرے سے ان کے

اندرونی کرب کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ضبط کا دامن تھامے

رکھتی تھیں، اس وقت بھی ان کے لب پھڑپھڑا رہے تھے، مگر ان سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی۔

”انا للہ وانا الیہ رجعون!“ ابو نے کہا ہی تھا کہ میں سسک پڑی، ابو نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”والدہ!!“ صدف آپنی نے والدہ کو پکارا، تھوڑی دیر تک انتظار کر کے پھر پکارا، ”آپ ٹھیک تو ہیں والدہ؟“

”میں تو ٹھیک ہی ہوں!“ وہ رورہی تھیں، ”بس اس بچی پر ترس آرہا ہے، جس نے اتنی تکلیف برداشت کی اور پھر اس کی گود بھی خالی رہی.....“

”آپ حوصلہ کریں والدہ.....“ علی بھائی بولے، ”آپ تو ہمیں حوصلہ دیتی ہیں اگر آپ حوصلہ ہاریں تو پھر ثانیہ کو کون سنبھالے گا۔ آپ کو علم ہے کہ اس کی اس وقت کیا کیفیت ہوگی؟“

”مجھے اسپتال لے چلو..... میں اس کو دیکھ لوں تو مجھے حوصلہ ہوگا، تم لوگ تو اسے تنہا چھوڑ کر آگئے ہو۔“

”صبح آپ کو لے چلیں گے والدہ.....“ صدف آپنی نے وعدہ کیا۔ دیر تک ہم سب وہاں اسی طرح پریشانی کے عالم میں بیٹھے رہے۔

ثانیہ آئی سی یو میں ہی تھی، علی بھائی اور مظہر علی اسپتال جا کر بچے کو لے آئے تھے، سیکنہ آنٹی، زارا اور ثناء بھی آگئی تھیں۔ تیمور بھی امی جان کے ساتھ آگیا تھا، اس معصوم سے بچے کی تکلیفیں و تدفین کی رسومات انجام پائیں اور اس کی چند سانسوں کی زندگی کا سفر تمام ہوا۔ صحت مند بچہ تھا لیکن نیلا پڑ گیا تھا، دیکھ کر برداشت نہ ہو رہا تھا، علی بھائی کی پہلوٹھی کی اولاد۔ ہم سب غمگین تھے۔ ثانیہ آپنی بھی آئی تھیں۔ بے شک ایک چھوٹا سا بچہ ہی سہی، مگر صدف ماتم بچھی تھی، ماحول سوگوار تھا۔ والدہ کی خرابی طبیعت کے باعث کوئی بھی رونہ نہ رہا تھا۔ ان کے لیے رونے اور ماتم کی آوازیں تکلیف دہ تھیں۔

علی بھائی اور سیکنہ آنٹی ہسپتال چلے گئے تھے، زارا اور ثناء مظہر علی کے ساتھ گھر لوٹ گئی تھیں۔ صرف صدف آپنی، میں، والدہ اور ابو ہی گھر پر رہ گئے تھے۔ اصرار کر کے والدہ کو کھانا کھلایا اور ہم نے بھی کھایا۔ موت تو برحق ہے، ہر ایک کو آنی ہے، لیکن زندہ رہ جانے والوں کی زندگی کی اپنی ضروریات ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ زندگی معمول پر آ جاتی ہے۔ والدہ کے اصرار کے باوجود بھی انہیں اسپتال نہ لے جایا جاسکتا تھا۔ صدف آپنی ایک دفعہ صبح جا کر ثانیہ کو دیکھ آئی تھیں، انہوں

نے ہی بتایا کہ شام تک ثانیہ کو کسی کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا۔ شام میں میں اور صدف آپنی اسپتال کے لئے روانہ ہوئے۔

علی بھائی ہمیں کارڈور کے باہر ہی مل گئے تھے، وہ بتا رہے تھے کہ ثانیہ کمرے میں آچکی ہے اور وہ اس کے لئے سوپ وغیرہ لینے نکلے تھے۔ ”آپ ہمیں بتاتے، ہم گھر سے لے آتے۔“ میں نے شرمندگی سے کہا۔ ہمارے ذہن میں ہی نہ آیا تھا کہ ہم گھر سے بخنی وغیرہ بخواتے۔

”کوئی بات نہیں، میں بازار سے لے آتا ہوں! ثانیہ کو ویسے بھی بازار کا سوپ زیادہ پسند ہے۔“ علی بھائی کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ میں اور صدف آپنی اپنے مطلوبہ کمرے کی طرف بڑھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا، اندر سے بلند آواز آرہی تھی، یقیناً ثانیہ ہی تھی۔

”مجھے دکھا تو دیتے آپ میرا بچہ.....“ وہ رورہی تھی۔ میرا دل جیسے کوئی مٹھی میں مسلنے لگا، میں تو خود اس تکلیف سے گزر چکی تھی۔ ”میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟“

”بس بیٹا!!“ سیکنہ آنٹی کی پشت ہماری طرف تھی، ”یہ تو اللہ کی طرف سے آزمائش تھی۔“

”زارا آپنی کا بچہ بھی تو ہے، اسے کچھ نہیں ہوا.....“ ثانیہ کے لہجے میں تکلیف تھی، ”اس لیے امی!! کہ اس پر کوئی نحوست کا سایہ نہیں تھا..... مجھے تو پہلے ہی ڈر تھا امی!! حسد کی نظر کا شکار ہو گیا ہے میرا بچہ.....“ صدف آپنی بھلے لاکھ اداکاری کرتیں، مجھے کھینچ کر وہ کمرے سے دور لے جا رہی تھیں، جہاں سے آنے والی آوازیں، آوازیں نہیں نشتر تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں وہ کس کے بارے میں تھا اور اس کا مطلب کیا تھا، میں نے صدف آپنی کی گرفت سے اپنا آپ چھڑایا اور ایک بیٹخ پر بیٹھ گئی۔ اس طرف رش نہ تھا کیونکہ یہ پرائیویٹ کمرے تھے۔ میرا پورا جسم آندھیوں کی زد پر تھا۔

”وہ اس وقت تکلیف میں بھی ہے اور قابل ہمدردی بھی.....“ صدف آپنی کہہ رہی تھیں۔ میں خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، ”ہمارے ہاں عام طور پر عورتوں کو ایسی حالت میں کفر اور شرک کے کلمات بک دینے کی عادت ہے.....“

”آپ مجھے سننے تو دیتیں کہ میرے بارے میں اس کے کیا خیالات ہیں.....“ میں نے گلوگیر

لجے میں کہا۔

”ضروری نہیں کہ وہ تمہارے بارے میں ہی بات کر رہی ہو.....“ صدف آپنی کی خوش فہمی اب بھی قائم تھی۔

”ہمارے ہاں بیوہ عورت سے زیادہ کسے منحوس سمجھا جاتا ہے؟ مجھ سے زیادہ کس کے بارے میں سوچ سکتی ہے وہ کہ اس سے حسد کر سکتی ہے.....“

”وہ تمہاری دوست بھی ہے ماہا! تم خواہ مخواہ اس کی طرف سے دوسوے کا شکار نہ ہو.....“ صدف آپنی نے کہا۔

”دوست بھی تو بسا اوقات تکلیف اور آزار کا سبب بنتے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ وہ اس وقت تکلیف میں ہے آپنی، لیکن میں بھی تو گزشتہ کتنے ہی برسوں سے تکلیف میں ہوں، میں اپنے دل اور وجود کے زخم کسی کو کھول کر نہیں دکھاتی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں سکون میں ہوں۔ میں نے کبھی کسی کی دل آزاری کی یا کسی کو اپنی زبان سے مجروح کیا، صرف اس لیے کہ میں تکلیف میں ہوں تو کوئی اور کیوں خوش رہے؟“ میں سسکی۔

”تم تو بہت بہادر ہو، ہم سب اس کا اعتراف کرتے ہیں۔“ صدف آپنی نے مجھے لپٹالیا۔

”بہادری کے سرٹیفکیٹ زخموں پر پھا ہے نہیں رکھ سکتے صدف آپنی! بہادر بننا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔“ میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو رگڑا۔

”ماہا! ہم سب تمہارے غم کی وجہ سے تکلیف میں ہیں، تمہاری تنہائی، ہم میں سے کسی کو سکون سے نہیں رہنے دیتی، ہم ہنستے ہوئے بھی تمہارے چہرے کی تہ میں غم کی رقت ڈھونڈ لیتے ہیں.....“

”میں جانتی ہوں صدف آپنی!!“ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا، ”میں سب سمجھتی ہوں کہ میرے غم اور تکلیف کا کس کس کو احساس ہے، مجھے معلوم ہے کہ میرا غم ہی والدہ کی صحت کو چاٹ رہا ہے، لیکن میں کیا کروں..... کون سی ایسی عورت ہے جو میری عمر میں غم کے ایسے ایسے کوہِ گراں عبور کر رہی ہوگی..... کیا میں یہ سب کر کے خوش ہوں؟ کوئی ہے جو میرے اندر جھانک کر دیکھ سکے کہ مجھ پر ہر روز کیا کیا قیامتیں گزرتی ہیں؟“

”میری جان ماہا!“ صدف آپنی نے مجھے لپٹالیا، ”مجھے معاف کر دینا، میں بھی تمہاری تکلیف میں اضافے کا ہی باعث بنی ہوں۔ ایک دکھ بڑھایا ہی ہے میں نے تمہارا..... میرا بس چلے تو میں

تمہاری راہوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لوں..... اتنی ہی پیاری ہو تم مجھے..... تم مجھے کرن ہی کی طرح لگتی ہو.....“

مجھے ان کے ہر لفظ کی صداقت پر یقین تھا۔ باقی نوے اور نالے میں نے دل ہی دل میں گھونٹ لیے تھے اس سے قبل کب میں نے کسی کو اپنے دل کے زخم دکھائے تھے۔ والدہ سے جو بات کرتی تھی تو اس میں بھی حجاب مانع ہوتا تھا اور اس احساس کی رکاوٹ ہوتی تھی کہ میری کی ہوئی کوئی بات والدہ کے دل کو تکلیف نہ دے۔ صدف آپنی کے کہنے پر میں نے ایک ہاتھ روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور نشوونما سے تھپتھا کر چہرہ صاف کیا۔ صدف آپنی نے کاہل، لپ اسٹک اور آئینہ میری طرف بڑھایا، میں نے ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد ان کے ہاتھ سے مسکرا کر چیزیں تھام لیں۔ انہوں نے اپنی چیزیں میرے استعمال کے بعد مجھ سے لے کر واپس اپنے بیگ میں رکھ لیں اور میرا ہاتھ تھام کر دوبارہ اس کمرے کی طرف چلیں، جہاں سے تھوڑی دیر قبل ہی میرے جذبات مجروح ہوئے تھے۔

صدف آپنی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا، میں تھوڑا سا ہی پیچھے تھی، سیکہ آنٹی نے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ وہ بھی روٹی ہوئی لگ رہی تھیں۔ صدف آپنی اور میں آگے بڑھ کر ان سے ملیں، پھر ہم ثانیہ سے ملیں۔ صدف آپنی کے بعد میں نے بھی اسے اپنے ساتھ لپٹالیا، دل اس کی تکلیف محسوس کر کے پھٹکنے لگا اور آنسو دوبارہ آنکھوں کے بند توڑ کر بہنے لگے۔ علی بھائی کے بیٹے کی موت کا دکھ تھا، ثانیہ کی گود سونی رہ جانے کا دکھ تھا اور حقیقت میں اب اس میں یہ دکھ بھی شامل تھا کہ ثانیہ میرے بارے میں کتنے منفی خیالات رکھتی ہے، مجھے کتنا برا سمجھتی ہے۔

ثانیہ کے گھر آ جانے پر گھر کا ماحول بھی اداس سا لگتا تھا، وہ چپ چاپ سی رہتی تھی، مجھے لگتا تھا کہ میرا وجود ناگوار محسوس ہوتا ہے مگر میں کیا کرتی..... کیا والدہ کو یوں بیماری کی حالت میں چھوڑ کر چلی جاتی؟ اور کہاں؟ کیا میں ایسی ہی بے اماں اور بے ٹھکانہ ہو گئی تھی۔ ثانیہ کو گھر آئے دو دن ہو گئے تھے۔ ”میں دو چار دن کے لئے امی جان کی طرف چلی جاؤں ابو؟“ میں نے کھانے کی میز پر کہا تو والدہ کا ہاتھ رک گیا۔

”کیوں کیا ہوا؟ کس لیے جانا ہے؟“ والدہ نے چتون چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”تیور کی چھٹی ختم ہو رہی ہے، وہ جب سے آیا ہے کافی اصرار کر رہے تھے، وہ اور ماہ رخ بھی۔“ میں نے والدہ کے چہرے پر کھوجنے کی کوشش کی کہ شاید انہیں صدف آپی نے ہسپتال میں تانیہ کی باتوں کے بارے میں کچھ بتا رکھا ہو۔ لیکن ان کے چہرے سے مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا۔

”ابھی تک گھر پر آیا گیا لگا ہے.....“ والدہ متذبذب تھیں۔

”والدہ بھی بیمار ہیں ماہا!!“ علی بھائی نے کہا، لیکن مجھے تھوڑے وقت کے لیے اس ماحول سے فرار چاہئے تھا۔ ابو نے دخل اندازی کرتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ کھانا خاموشی سے کھایا جا رہا تھا۔

”کب واپسی ہوگی بیٹا؟“ ابو نے خاموشی کا طلسم توڑا۔

”ابو ٹھیک سے علم نہیں کہ تیور کی چھٹی کتنی رہ گئی ہے، بس جس دن اسے اور ماہ رخ کو واپس جانا ہوگا اسی روز میں بھی لوٹ آؤں گی۔“ میں نے تفصیل سے جواب دیا، ”لیکن اگر کوئی مسئلہ ہوا تو جب چاہے آپ مجھے کال کر دیں، میں فوراً آ جاؤں گی، آدھے گھنٹے کا تو راستہ ہے۔“

”اگر مجھے کچھ ہو ہوا گیا، تو میں آدھا گھنٹہ مرنے کے لیے بھی تمہارا انتظار ہی کروں گی جیسے!“ والدہ کے لہجے میں خفگی اور ناراضی تھی، مجھے اس کا سبب سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے والدہ؟ بڑی مایوس سی باتیں کر رہی ہیں.....“ میں نے لہجہ میں بشارت لانے کی کوشش کی۔

”جانے کیوں دل گھبرا سا رہا ہے.....“ وہ ہولے سے بولیں۔

”آپ پریشان ہیں، اس لیے.....“ میں نے انہیں تسلی دی، ”اور دل کا تو اب بندوست ہونے ہی والا ہے۔ چند دنوں میں ہی آپ سمجھیں جیسے پرانے دل کی جگہ ایک نیا دل براجمان ہو جائے گا، ویسے ہوگا تو یہی دل، مگر اس کی اوور ہانگ ہوگی تو بالکل نئے انداز سے دھڑکے گا۔“

ابو مسکرا پڑے، ”ویسے پتا نہیں نیا دل کیا کیا مانگ لے ماہیٹا؟“

”اسی لیے تو اب دوسرا دل نہیں لگا رہے، دل تو یہی رہے گا نا!!“ میں ہنسی۔

”مگر جب اندر ساری تبدیلیاں ہو جائیں گی تو جذبات بھی تو تبدیل ہو جائیں گے۔“ علی

بھائی نے لقمہ دیا۔

”میرا دل اور اس کے جذبات اب کیا بدلیں گے بیٹا!“ والدہ سنجیدہ ہونے لگیں، ”ماں کا دل

بھی بھلا کبھی تبدیل ہو سکتا ہے اولاد کے لیے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ خطرہ صرف مجھے ہے، میرے لیے تبدیلی جذبات ممکن ہے.....“ ابو مسخرے پن سے بولے، تو تانیہ بھی مسکرا دی۔

”ابو مجھے چھوڑ آئیں گے آپ؟“ میں نے ابو سے پوچھا۔

”میں چھوڑ آتا ہوں.....“ علی بھائی نے پیش کش کی۔

”نہیں بیٹا تم رکو، اسی بہانے میں بھی ذرا گھوم پھر آؤں گا۔“ ابو نے علی بھائی کو منع کر دیا۔

ماہ رخ کی طبیعت میں کسلمندی سی تھی، بالآخر اس نے اپنا وہ فیصلہ تبدیل کر ہی لیا تھا کہ اسے وہ بچہ نہیں چاہئے۔ جانے کیا کیا رواج ہمارے ہاں بھی فروغ پاتے جا رہے ہیں کہ بچوں کو اپنے تعلقات مضبوط ہونے کی وجہ سمجھنے کی بجائے انہیں اپنی خوشیوں کے راستے میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے اور پھر اسی اولاد سے بڑھاپے میں خدمت کی توقع بھی کی جاتی ہے۔ ماہ رخ اپنی خرابی طبیعت کی وجہ سے بیزار تھی لیکن مجھے یوں اچانک دیکھ کر کھل اٹھی۔ ”شکر ہے تمہیں بھی ہمارا خیال آ ہی گیا۔“ اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا، ”ہمیں تو جیسے بھول ہی گئی تھیں تم۔“

”تم سب لوگوں کو میں کس طرح بھول سکتی ہوں!!“ میں نے اسے مل کر امی جان سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

ماہ رخ نے تانیہ کے واقعے پر افسوس کا اظہار کیا، ”میں تو آنا چاہ رہی تھی مگر طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی اور میری امی نے بھی کہا کہ مجھے مرگ والے گھر میں نہیں جانا چاہئے۔“

”ایسی تو ہم پرستی ہندوؤں سے ہمارے معاشرے میں در کر آئی ہے.....“ امی جان اس کی بات پر ناراضی سے بولیں، ”ہمیں اس طرح کی سوچ نہیں رکھنی چاہئے۔ ویسے نئی نسل ہر بات

میں نیا پن چاہتی ہے، مگر جہاں بات آتی ہے فضول توہمات کی، وہاں وہ سب سے آگے ہیں۔“

”ارے نہیں امی جان! ٹھیک ہے احتیاط اچھی بات ہے۔ آپ اور تیور جو آگئے تھے.....“

میں نے فوراً کہا۔

”سوری ماہا! شاید مجھے بھی آنا چاہئے تھا۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”ارے نہیں ماہ رخ! سوری کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے علم ہے کہ تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آئی نہ معلوم کیا سوچتی ہوں گی؟“

”کوئی کچھ نہیں سوچ رہا ہے، تم خواہ مخواہ میں ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔“ میں نے صدق دل سے اسے کہا، ”اچھا بتاؤ ذرا تیمور کہاں گیا ہے؟“

”تیمور دفتر گیا ہے!“ اس نے مختصر کہا۔

”چار دن چھٹی آیا ہے تو آرام کرتا گھر پر، دفتر کیوں گیا ہے؟ مظہر جو جا رہا ہے دفتر۔“ میرے کہنے پر امی جان اور ماہ رخ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ میں ان کی خاموشی پر حیران تھی۔ ”سب خیریت تو ہے نا امی جان؟“

طویل خاموشی کا وقفہ آیا..... ”مظہر کو امی جان نے گھر سے نکال دیا ہے!“ ماہ رخ کی آواز پر مجھ پر جیسے دھڑا دھڑا آسمان گرنے لگا۔

”کیوں؟“ میں نے شدید حیرت سے پوچھا۔

”دونوں بھائیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا.....“

”کس بات پر؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”معلوم نہیں!!“ ماہ رخ نے کندھے اچکائے، ”میں اور امی جان سوری تھیں، دو پہر کا وقت

تھا، شور کی آواز سے ہم دونوں ہی لاؤنچ میں آئیں تو دونوں بھائی دست و گریبان تھے۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہاتھ پائی ہو رہی تھی؟“ میرے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”یہی مطلب ہے میرا!“ ماہ رخ بولی، ”تیمور نے کسی بات پر ناراض ہو کر مظہر کو تھپڑ مار دیا

تھا، اور مظہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر..... تیمور بے کہا.....“

”کیا کہا؟“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

ماہ رخ خاموش رہی..... ”بتاؤ مجھے ماہ رخ، پلیز بتاؤ.....“ میں نے پھر کہا۔

”بس رہنے دو ماہا! تمہیں بھی سن کر دکھ ہوگا.....“ ماہ رخ نے کہا تو میں نے نجی نظروں سے

اس کی طرف دیکھا۔ وہ پھرامی جان کو دیکھنے لگی۔

”بتا دو اسے بھی!!“ امی جان کہنے لگیں، ”یہ بھی اس گھر کی فرد ہے، میں تو بہت پہلے اسے گھر

سے نکال دیتی جو ہر بار یہ اس کے دفاع کو نہ آجاتی۔ اسی نے ہمیشہ مجھے کہا کہ چھوٹا ہے، لاڈلا

ہے، تھوڑا سا ضدی ہے۔ اسی کے کہنے میں آکر میں ہمیشہ درگزر کرتی رہی اور اسی کو تاہی نے مجھے

یہ دن دکھایا ہے۔“ میرے اندر خوف کسی ناگ کی طرح کبلانے لگا، جانے میں کیا سننے والی تھی۔

”مظہر نے تیمور سے کہا،“ ماہ رخ گویا ہوئی، ”جو ہاتھ مظہر پر اٹھتا ہے، وہ سلامت نہیں رہتا۔

آج آخری بار ہونی چاہئے کہ آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، ورنہ نتائج کی ذمہ داری میری نہ ہوگی۔“

”یہ کہا مظہر نے؟“ میں ہکلائے لگی، ”مگر کیوں..... کیوں کہا اس نے؟ تیمور نے اس پر

ہاتھ کیوں اٹھایا؟ تم نے پوچھا تیمور سے؟“

”تیمور کہتا ہے کہ یہ اس کا اور مظہر کا آپس کا معاملہ ہے، مجھے دخل اندازی کرنے کی ضرورت

نہیں۔“ ماہ رخ کے انداز میں ناگواری تھی۔

”آپ نے پوچھا امی جان؟“ میں نے امی جان سے پوچھا، ”آپ نے تیمور سے پوچھا کہ

اس نے کیوں مظہر پر ہاتھ اٹھایا؟“

”تیمور مجھے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتا رہا..... میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا ہے۔“ امی

جان بولیں، ”مجھے تو امید تھی کہ تم پوچھو گی تو تمہیں بتا دے گا۔“

”اگر اس نے آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا اور نہ ہی ماہ رخ کو، تو وہ مجھے بھی کچھ نہیں بتائے

گا۔“ میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا، مجھے شدید پریشانی لاحق تھی۔

”مجھے بھی لگتا ہے ماہا! تم پوچھو گی تو تمہیں تیمور بتا دے گا۔“ ماہ رخ نے وثوق سے کہا،

”تمہاری وہ عزت بھی کرتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس کے اور مظہر کے درمیان جو بھی مسئلہ ہے

اسے صرف تم ہی حل کر سکتی ہو۔ کیونکہ صرف تیمور ہی نہیں بلکہ مظہر بھی تمہاری بات مان لے گا۔“

”مگر مظہر میری بات کیسے مانے گا؟“ میں نے تجب سے پوچھا، ”مجھے وہ ملے گا کہاں؟ کیا

کسی کو علم ہے کہ وہ ہے کہاں؟“

”ہمارا تو وہ فون ہی اٹینڈ نہیں کرتا، لیکن مجھے یقین ہے ماہا کہ تم فون کر دو کہ وہ ضرور بات

کرے گا۔“ ماہ رخ نے کہا، ”ہوگا تو اسی شہر میں، کہیں جا بھی کیسے سکتا ہے؟ نہ وہ گاڑی لے کر گیا

ہے، نہ ہی اس نے ان دنوں اپنے اکاؤنٹ سے کوئی رقم نکلوائی ہے۔“



”بنک اکاؤنٹ سے رقم وہ نکلوا بھی نہیں سکتا، میں نے تیمور سے کہہ کر بینک منیجر کو سختی سے ہدایت کر کے اس کا اکاؤنٹ منجمد کروا دیا ہے۔“ امی جان نے کہا۔

”آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا امی جان۔“ میں نے آہستگی سے کہا، ”اس بات پر اسے طیش بھی آسکتا ہے، ہے تو وہ آپ کا بیٹا ہی ناں۔ بھائیوں میں اونچ نیچ ہو گئی ہے تو آپ غیر جانبدار رہتیں۔ آپ کے لیے تو سب اولادیں برابر ہونی چاہئیں۔ ہو سکتا ہے کہ قصور بالآخر تیمور کا نکل آئے اور یوں بھی اس کو یوں مالی طور پر مفلوج کر کے آپ نے اس کے لیے کسی جرم میں ملوث ہونے کے امکانات بڑھادیئے ہیں۔“

”تم کوشش کرو اسے کال کرنے کی!“ ماں تھیں، فوراً پریشان ہو گئیں۔

”پہلے میں تیمور سے پوچھ لوں، مجھے علم تو ہو کہ معاملہ کیا ہے، پھر اسی حساب سے مظہر سے بات کروں گی۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ میں اپنے ذہن میں ہی وہ الفاظ ترتیب دے رہی تھی، جن سے مجھے مظہر سے بات کرنا تھی۔ ”جانے کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا؟“ سوچ کر مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں نے تو اسے لڑکپن سے بڑھتے اور ایک نوجوان بنتے دیکھا تھا۔ کافی حد تک میں اسے سمجھتی بھی تھی۔ وہ ہرگز ایسا برا نہ تھا، بس جانے کیسی بری صحبتوں میں پڑ گیا تھا اور نوبت یہاں تک آگئی کہ اپنے سے بڑے بھائی تیمور کے ساتھ گرما گرمی ہو گئی تھی۔ تیمور کا انتظار اس سے قبل میں نے اتنی بے چینی سے بھلا کب کیا تھا؟؟

”مت نام لیں میرے سامنے اس اسٹوپڈ کا!!“ مظہر کے بارے میں استفسار کرنے پر تیمور کا پارہ آسمان سے بات کرنے لگا، ”انتہائی بدتمیز انسان ہے وہ۔“

”آرام سے تیمور! غصے میں مت آؤ، میری بات کا جواب تحمل سے دو.....“ ہم دونوں اس وقت لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، میں نے خود ہی تیمور سے بات کرنے کے لیے اسے لان میں بلایا تھا۔

”میرے پاس آپ کی بات کا کوئی جواب نہیں ہے، اس نے بدتمیزی کیوں کی ہے، یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔“ تیمور جھنجھلا کر بولا۔

”وہ مجھے کہاں ملے گا جو میں اس سے پوچھوں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”آجائے گا، یہیں کہیں رُل رہا ہوگا، بھیک مانگ کر تو گزارا نہیں کر سکتا!“ تیمور غصے سے بولا۔

”تمہیں پتا ہے کہ وہ بھیک نہیں مانگے گا، مجھے تو صرف یہ ڈر ہے کہ وہ کسی غلط راستے سے

دولت کا حصول نہ شروع کر دے۔ بچہ ہے، کچا ذہن ہے!“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ اسے ہمیشہ بچہ ہی سمجھتی رہیں، بے شک وہ ہم سب سے بڑھ کر خود کو بڑا سمجھنا شروع

کر دے۔ اس نے مجھے، بڑا سمجھنے سے انکار کر دیا ہے، وہ خود کو مجھ سے بڑھ کر عقلمند سمجھتا ہے، وہ سمجھتا

ہے کہ مجھے اس کو اچھا برا سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی.....“ تیمور بڑبڑا رہا تھا۔

”تیمور!“ میں نے انتہائی نرمی سے کہا، ”میرے بھائی! ایک بھائی کو تم سے موت چھین کر

لے گئی ہے، دوسرے بھائی کو تمہاری ضد نہ چھین لے.....“

”پلیز بھابی!“ تیمور چونکا، ”یوں نہ کہیں..... میرا مقصد ہرگز ضد یا ہٹ دھرمی نہیں ہے۔

صرف اسے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں، ان راہوں سے، جہاں سے وہ لوٹ کر نہ آ سکے۔ بھابی!

میں آپ کو بھی بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میری ہی غلطی

تھی کہ میں نے ایسے وقت میں گھر کے مسائل کو چھوڑ کر فوج میں شمولیت اختیار کر لی، جب مجھے گھر

میں رہ کر ان مسائل کا ادراک کرنا تھا اور ان کا کوئی حل ڈھونڈنا تھا، بلکہ میں گھر پر ہوتا تو شاید یہ

مسائل پیدا ہی نہ ہوتے۔“

”اب تمہیں بھی علم ہے کہ یوں باتیں کر کے ہم گئے ہوئے وقت کو واپس تو نہیں لا سکتے۔“

میں نے اسے سمجھایا۔

”آپ گئے وقت کی بات کر رہی ہیں بھابی!“ تیمور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”مجھے

تو لگتا ہے کہ جہاں تک مظہر جا چکا ہے، ہم اسے بھی وہاں سے واپس نہیں لا سکتے۔“

”اللہ نہ کرے،“ میں نے فوراً کہا، ”ایسا بھی کیا برا کر دیا ہے اس نے؟“ لیکن مجھے خود بھی

احساس تھا کہ میرے الفاظ کتنے کھوکھلے تھے، مجھے شک تھا کہ وہ کسی انجان منزل کی اندھی راہوں کا

مسافر بن گیا تھا۔ جس طرح وہ گھر سے بے سروسامانی کے عالم میں نکل گیا تھا، اس کی جگہ اگر کوئی

عام لڑکا ہوتا تو دو ہی دن میں باہر کی شو کریں کھا کر گھر والوں سے رابطہ کرتا۔ لیکن مظہر کے تو نہ

جانے کہاں اور کیسے تعلقات تھے کہ اسے گھر والوں کی پریشانی کا خیال بھی چھو کر نہ گزرا تھا۔

”میں بھی دعا ہی کر سکتا ہوں بھابی کہ وہ جہاں بھی ہو، ہمیں اس کی طرف سے کوئی بری خبر سننے کو نہ ملے۔ مجھے سب سے زیادہ تو امی جان کی پریشانی کا خیال پریشان کر دیتا ہے۔“ تیمور کے انداز میں تشویش تھی۔

”اسی لیے تو مجھے امی جان اور ماہ رخ نے کہا ہے کہ میں مظہر کو کال کروں.....“ میں نے رکتے ہوئے کہا، ”لیکن اگر میں اسے کال کروں تو کیا بات کروں۔ مجھے تو علم ہی نہیں کہ تم دونوں کے بیچ جھگڑا کس بات پر ہوا ہے؟“

”بات ایسی ہے کہ اس کا راز رہنا ہی بہتر ہے، اسی لیے میں نے امی جان اور ماہ رخ کو بھی نہیں بتائی۔ عورتوں کے منہ سے عموماً وہ بات ضرور پھسل جاتی ہے جو انہیں راز رکھنے کو کہی جائے!“ میں پر امید اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، ”آپ پر مجھے اعتماد ہے کہ آپ اس کی نزاکت کو سمجھیں گی۔ آپ سے صرف ایک وعدہ چاہئے!“

”ہوں؟“ میں نے مختصر کہا۔

”آپ امی جان اور ماہ رخ کو یہ نہیں بتائیں گی کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔“

”تو جب وہ پوچھیں گی تو میں جھوٹ بولوں گی کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بعض جھوٹ مصلحتاً جائز ہوتے ہیں بھابی!“ اس نے جیسے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی، ”اس جھوٹ سے کسی کا کوئی نقصان تو نہیں ہوگا۔“

”لیکن جھوٹ تو جھوٹ ہی ہوتا ہے!“ میں بڑبڑائی۔

”چلیں پھر میں آپ کو بھی نہیں بتاتا تا کہ آپ کو بھی جھوٹ نہ بولنا پڑے۔“ اس نے جیسے

بات ختم کر دی۔

”اچھا ٹھیک ہے، جیسا کہو گے، وہی کروں گی۔ اب بتاؤ مجھے!“ میں نے فوراً اس کی ہمت کی۔

میرے لیے یہ بات جاننا بے حد اہم تھا کہ آخر کون سی ایسی بات تھی کہ جس کی وجہ سے دونوں بھائی باہم دست و گریبان ہو گئے تھے۔

”میں نے اپنے ایک دوست کو یہ ذمہ داری تفویض کر رکھی تھی کہ وہ مظہر کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔“ اس نے بتانا شروع کیا، ”میرا یہ دوست ایک خفیہ ایجنسی میں ملازم ہے۔ اس نے جو انکشافات کیے ہیں ان کی بابت میں نے اس سے باز پرس کی تو وہ بھر پڑا.....“ میں ہمہ تن گوش

تھی، ”اس کی حرکتوں کے باعث میری نوکری جاسکتی ہے، ہم پر کوئی بھی مصیبت نازل ہو سکتی ہے، ہم سب مصیبت میں ہو سکتے ہیں..... اس کے دور نزدیک کے رشتہ دار اور دوست تک بھی.....“

”کھل کر بات کر تیمور!“ میرا جسم سنسانے لگا تھا۔

”بھابی!!“ تیمور میری طرف دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر آرہے تھے۔

”مجھے معلوم ہے تیمور! کوئی بہت بڑی بات ہے لیکن تم بات کرو۔“ میں بے چین ہو رہی تھی۔

”مظہر کچھ ملک دشمن عناصر کا آلہ کار بن گیا ہے.....“ اس نے بالآخر بات کہہ دی، جس کو سن

کر مجھ پر جیسے دھڑ دھڑکتا ہی ملے گر رہا تھا، ”یہ عناصر اندرون ملک بھی ملک کو کمزور کر رہے ہیں اور

بیرون ملک سے بھی اور میرے دوست نے ہی میری دوستی کی وجہ سے مجھے یہ کہا تھا کہ میں کسی طرح

مظہر کو سمجھا کر اس سے باز رکھوں اور ہو سکے تو کچھ عرصہ کے لیے اسے منظر سے ہٹا دوں، کیونکہ اس

گروہ کے خلاف ایجنسیوں کا گھیراؤ ہو رہا ہے..... میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ اس سے بات

کر کے اسے کچھ عرصہ کے لیے نگہت کے پاس بھجوا دوں۔ لیکن وہ تو میرے یہ پوچھنے سے ہی بدک

گیا کہ وہ کیوں ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔“

”اس سے بہت طریقے سے بات کرنا چاہئے تھی.....“ میرے حواس گویا تختل سے تھے،

”کہیں ہم سختی سے اسے اور بھی باغی نہ کر دیں۔ تمہیں بھی علم ہے کہ وہ اپنی سادگی اور معصومیت کی

وجہ سے ایسے لوگوں کا آلہ کار بن گیا ہے..... ہم تو جانتے ہیں تیمور کہ وہ برا نہیں ہے.....“

”انسان کے کام ہی اس کی پہچان ہوتے ہیں بھابی! انسان اچھائی اور برائی کے معیار سے

ہی جانا جاتا ہے۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہے تو اچھا مگر صرف کام برے کر رہا ہے؟“ تیمور سوال

کر رہا تھا۔

”اب میں اسے کال کر کے کیا کہوں؟“ میں نے تیمور سے پوچھا۔

”دکھ تو یہ ہوتا ہے کہ جس مادر وطن کی خاطر باپ شہید ہوا اور بھائی اس کی حرمت کی ذمہ

داری پر مامور ہے، وہ کن راہوں پر چل نکلا ہے کہ وہ اسی مادر وطن کو خدا خواستہ ختم کر دینے کے

عزائم رکھنے والوں کا آلہ کار بن گیا؟“ تیمور کے لہجے میں کرب تھا، ”وہ شاید ہم سب کے سمجھانے

کی حد سے گزر چکا ہے۔“

”ہم اسے تنہا بھی تو نہیں کر سکتے تیمور! یہی تو وہ لوگ چاہتے ہیں۔“ میں نے کھوئے کھوئے

لہجہ میں کہا۔

”بھابی! پلیز آپ سے پھر درخواست کر رہا ہوں کہ اس بات کا صیغہ راز میں رہنا بہت ضروری ہے۔ ہم سب کی سلامتی کا مسئلہ ہے، مظہر کی اپنی سلامتی بھی اس میں ہے کہ اس کے اس راز سے کوئی واقف نہ ہو۔ ورنہ وہ لوگ اپنے راز کو راز رکھنے کے لیے.....“ میں تیمور کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر اتنی پریشان ہوئی کہ میرا جسم باقاعدہ لرزنے لگا۔

”پلیز بھابی! آپ خود کو سنبھالیں، جو راز اپنے منہ سے آشکار نہ کریں گی وہ آپ کی یہ پریشان کن کیفیت کروے گی.....“ تیمور مجھے سمجھانے لگا۔

”میں مظہر کو کال کروں گی تیمور! میں دیکھتی ہوں کہ میں اسے کس طرح سمجھا سکتی ہوں۔ جب وہ آئے..... خدا کرے کہ وہ لوٹ آئے.....“ میں نے خود ہی کہا، ”اس سے پیار سے بات کرنا۔ وہ پیار کی بات سمجھتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ وہ خود کو تنہا سمجھنا شروع ہو گیا تھا، جس کے نتیجے میں اس نے باہر کی دنیا میں سہارا ڈھونڈنا تو اسے غلط ہاتھوں نے سہارا دے دیا۔“

”کچھ بتایا تمہیں تیمور نے؟“ امی جان نے اسے وقت مجھ سے بات کی جب تیمور اور ماہ رخ رات کے کھانے پر تیمور کے کسی کورس میٹ کے ہاں گئے ہوئے تھے۔

”آپ کو تو معلوم ہے امی جان!“ میں نے پہلے سے ہی جواب سوچ رکھا تھا جو مجھے امی جان اور ماہ رخ کو بھی دینا تھا، ”دونوں بھائی غصیلے اور جذباتی ہیں، کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی اور بات بڑھ گئی!“ ماہ رخ کو تو اس گھر میں آکر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مظہر کے غصے کا مظاہرہ دیکھنا پڑا تھا اور تیمور کے مزاج کو بھی وہ سمجھتی تھی اس لیے اسے مطمئن کرنا بھی مشکل نہ ہوگا۔

”تو اسے فون کرو بیٹا!!! تم ہی اسے سمجھا سکتی ہو۔“ امی جان مجھے کہہ رہی تھیں گویا وہ روٹھ کر اپنے کمرے میں بیٹھا ہو اور وہاں سے اس کو منا کر لانا ہو۔ انہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ یہ کام کتنا مشکل ثابت ہونے والا تھا۔

”جی امی جان! میں کسی وقت کال کروں گی اسے!“ انہیں یہ بتا کر بھی پریشان کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ میں نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اسے سینکڑوں بار کال کی تھی اور اس کا موبائل

فون بند تھا۔ تب مجھے ایک ترکیب سوچھی تھی کہ میں نے اسے ایک پیغام بھیجا تھا..... جس وقت بھی وہ فون آن کرے گا، اسے میرا پیغام ضرور ملے گا..... ”مظہر! میں ایک مسئلے سے دوچار ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی اشد ضرورت ہے!“

زبردستی ماہ رخ اور تیمور مجھے اور امی جان کو لے کر گھر سے نکلے تھے کہ گھر میں رہ کر ہر وقت مظہر کی پریشانی لاحق رہتی تھی۔ تیمور کو دیکھ کر مجھے ترس بھی آ رہا تھا کہ اس کے ذہن پر کتنے بوجھ تھے اور اسے یہ بوجھ اکیلے ہی اٹھانا تھا۔ ماہ رخ اس کی ایسی شریک حیات نہ تھی کہ جس پر وہ اعتماد کر کے اپنا دکھ اور پریشانی بانٹ سکے۔ نہ ہی وہ امی جان کو اس راز میں شریک کر سکتا تھا۔ مجھے اس نے شریک راز تو کر لیا تھا لیکن میں بھی اس مسئلے میں خود پریشان ہونے کے سوا اور کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ اگر مظہر فون آن کرے اور میرا پیغام دیکھے تو ہی ممکن تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرتا۔ میرے دل خوش فہم کو ابھی بھی بہت سی امیدیں تھیں۔

بے مقصد ہی ہم دوکانوں پر گھومتے رہے، تیمور اور ماہ رخ نے زبردستی مجھے اور امی جان کو ایک ایک سوٹ لے کر دیا۔ مارکیٹ میں یوں بے مقصد نظروں سے لوگوں کو کھوج رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا کہ لوگوں کے جھوم میں سے اچانک مجھے مظہر کا چہرہ نظر آ جائے گا۔ خریداری کرنے کے بعد تیمور نے گاڑی ایک فیملی ریسٹوران کے باہر کھڑی کر دی اور ہمارے ناں ناں کرتے ہوئے بھی وہ ہمیں باہر نکلنے کا کہتے ہوئے ریسٹوران کی طرف چل پڑا۔ اس کی تھلید میں ماہ رخ بھی نکلی اور پھر مجھے اور امی جان کو بھی مجبوراً باہر نکلنا پڑا۔ گاڑی کے سارے دروازے لاک کر کے ہم بھی ریسٹوران کی طرف چلے۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھ پر پھر یادوں کا غلبہ ہونے لگا۔ یہ وہی ریسٹوران تھا جہاں پر ایک دفعہ میں اور مظہر کھانا کھا رہے تھے تو معظم کے آجانے پر ان دونوں کے درمیان بد مزگی ہو گئی تھی اور بالآخر ہوٹل کی انتظامیہ نے ہمیں چلے جانے کو کہا تھا، کیونکہ مظہر کے ریوالور نکال لینے سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ وہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ مجھے یاد آ رہا تھا۔

تیمور نے بیرونی طرف کی ایک میز کا انتخاب کیا اور سب لوگ بیٹھ گئے۔ میرا آکر ہمیں مینو کارڈ دکھایا۔ سب مینو کارڈ دیکھ رہے تھے اور میرے مینو کارڈ پر مظہر کا چہرہ تھا اور آنکھوں میں آنسو، زندگی میں پہلی دفعہ ہم کھانے پر باہر آئے تھے کہ مظہر اس خاندان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہ تھا۔ میں نے مینو کارڈ اٹھا کر چہرے کے آگے کر لیا۔ ”تم روری ہو ماہا؟“ امی جان نے میرا مینو کارڈ نیچے کر کے مجھ سے پوچھا۔ میں نے نشوونما پر سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ماہ رخ اور تیمور بھی میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

”نہیں!!! بس ویسے ہی.....“ میرا لہجہ بھی بھگیا ہوا تھا۔

”تو پھر کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟“ تیمور نے مجھ سے پوچھا تو میں چونک گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا لیس گی آپ کھانے میں؟“ تیمور کا فقرہ پورا ہوتے ہی میں نے سکھ کی سانس لی۔

”جو باقی لوگ کھائیں گے.....“ میں نے مینو کارڈ میز پر رکھا۔

”سب لوگ اپنی اپنی مرضی کا کھانا آرڈر کریں گے.....“ تیمور مسکرایا۔

”ماہ رخ! تم کیا لوگی؟“ میں نے ماہ رخ سے پوچھا، امی جان سے بھی اور ہم مل جل کر مینو کی بابت مشورہ کرنے لگے۔

ماہ رخ اور تیمور روانہ ہونے والے تھے کہ علی بھائی کی کال آئی اور انہوں نے مجھے ہسپتال پہنچنے کو کہا تھا، جہاں پرائمر جنسی میں والدہ کو لے جایا گیا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ تیمور نے کہا کہ وہ مجھے لے کر خود ہسپتال جائے گا، ماہ رخ نے بھی اس کی تائید کی، بلکہ ماہ رخ اور امی جان بھی ساتھ ہی جانے کو تیار تھیں۔ میں نے کافی پس و پیش کی کہ مجھے ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیں۔ ”کیا بات ہے بھابی؟ کیوں اس طرح غیریت والی باتیں کر رہی ہیں؟“ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

”تم لوگوں کو دیر ہو جائے گی اور یوں بھی نوکری کا معاملہ ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”کوئی مسئلہ نہیں بھابی! میں آدھی رات کو بھی روانہ ہوا تو پہنچ جاؤں گا، سیالکوٹ ہے کتنا

دور، اور پھر کوئی مجبوری ہو تو چھٹی بڑھائی بھی جاسکتی ہے!“ تیمور نے جیسے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ تب میں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور ہم سب لوگ ایک ہی گاڑی میں ہسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ ماہ رخ اور تیمور آگے تھے جب کہ میں اور امی جان پچھلی سیٹ پر۔ امی جان تو تسبیح پر مسلسل ورد کر رہی تھیں جب کہ میرا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”والدہ ٹھیک ہوں گی نا امی جان؟“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”انشا اللہ!!“ انہوں نے مجھے ساتھ لگا لیا۔ میرے آنسو آنکھوں کے بند توڑ کر بہنے لگے۔

”مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے.....“ میری آواز بھی لرز رہی تھی۔

”گھبراؤ نہیں، ہمت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا!!“ امی جان نے مجھے تسلی دی۔

ہسپتال میں صرف ہماری کمی تھی باقی سبھی لوگ موجود تھے۔ میں ایک ایک سے مل کر والدہ کی خیریت کا پوچھ رہی تھی۔ وہ آئی سی یو میں تھیں۔ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ بہت شدید ہارٹ ایک ہوا تھا اور ڈاکٹروں کی کوشش تھی کہ ان کی جسمانی کیفیت بہتر ہو تو مزید کیا کرنا ہے کا فیصلہ کیا جائے۔ میری بے چینی اور گھبراہٹ میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ایک خوف سا طاری تھا۔

○ جیسے کوئی وعید ملنے کو ہو

ایسا کوئی دھڑکا کہ

کچھ چھن جانے کا خوف بھی ہے

دل یوں ہے

جیسے کوئی صحرا ہو اور اس میں پیاس سے بلکتا کوئی بچہ

لہو بدن میں بھاگ تو رہا ہے

مگر جیسے سرد سا ہو کر

اندیشے تیز ہوا کی طرح

میرے حواس کو اڑا رہے ہیں

○ (شیریں حیدر) کیا کچھ کھونے کو ہے میرا؟

ہسپتال کی سرد پتھریلی بنچوں پر بیٹھے ہوئے ہم سب لوگ آپس میں کوئی بات نہ کر رہے تھے۔ تیمور در ماہ رخ رات کو دیر سے روانہ ہو گئے تھے۔ باقی لوگ بھی کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا مگر میں مسلسل وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میلے میں کسی بچے کے ہاتھ سے اس کی ماں کا ہاتھ جھوٹ گیا ہو۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرے دل میں عجیب سا احساس اٹھا اور سینہ درد سے بھر گیا ہو۔ ”کیا میری ماں کا سایہ مجھ سے چھن جائے گا؟“ میں نے سوچا اور ساتھ ہی میرا جسم زلزلوں کی زد پر آ گیا۔ میں اندر سے لرز رہی تھی۔ ”تو کیا والدہ اسی لیے مجھے روک رہی تھیں اس روز؟“ میں نے پھر سوچا۔ ”یا اللہ! والدہ کو صحت اور زندگی عطا فرما!“ میں نے ہاتھ بلند کر کے دل سے دعا کی۔ ابو پاس ہی بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا، ”ابو! والدہ کو کچھ نہیں ہو گا ناں؟“

ابو خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید ان کے پاس میرے اس سوال کا جواب نہ تھا۔ میں نے ابو کا ہاتھ تھام لیا، گرم ہاتھ، محبت اور شفقت کی گرمی والا ہاتھ۔ میں نے ان کا ہاتھ چوم لیا، ”ابو! دعا کریں کہ والدہ کو کچھ نہ ہو۔“ میرا یہ کہنا تھا کہ ابو کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ضبط کی انتہا پر پہنچ کر ان کا پیٹ نہ لبریز ہو گیا تھا۔ یہ بھی شکر ہے کہ اس وقت اور کوئی ہم دونوں کے پاس نہ تھا۔ کوئی نماز کے لیے گیا ہوا تھا، کوئی گھر اور کوئی کھانے کے لیے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اس روز پہلی بار ابو کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

شاید ابو غالب کی وفات پر بھی روئے ہوں مگر اس وقت مجھے ہوش ہی کہاں تھا۔ میں نے اپنے پرس سے ٹشو پیپر نکال کر ابو کو دیا، ”ابو! اگر آپ یوں دل چھوٹا کریں گے تو ہم کیا کریں گے؟“ ”بس بیٹا! یونہی دل بھر آیا تھا.....“ ابو آہستگی سے بولے، ”تمہارا خیال سب سے زیادہ پریشان کر دیتا ہے۔ تمہاری والدہ کو بھی تمہاری طرف سے پریشانی رہتی ہے۔“

”جانتی ہوں ابو!“ میں نے کہا، ”میں ہوں ہی آپ سب لوگوں کی پریشانی کا باعث!“

”ہنگی نہ ہو تو!“ ابو نے میرے سر پر ہلکی سی چپت لگائی، ”ماں باپ کے سامنے بیٹیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ تمہارے دکھ سے دل دکھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی کی خوشیاں عطا کرے تو ہم بھی اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو سکیں گے۔“

”ابو دعا کریں پلیز!!“ میں نے ابو سے کہہ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

صدف آپ کی کئی بار اصرار کر چکی تھیں کہ مجھے گھر چلے جانا چاہئے لیکن میرا دل اتنا بے چین تھا کہ میں گھر کے لیے روانہ نہ ہوتی تو شاید راستے سے ہی لوٹ آتی۔ ابو اور علی بھائی بھی بار بار اصرار کر رہے تھے مگر میں نے انکار کر دیا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے مجبور نہ کریں۔

بہتر (72) گھنٹوں کے بعد والدہ کی طبیعت ذرا سنبھلی اور انہیں علیحدہ کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور ہمیں ان کو دیکھنے کی اجازت ملی۔ میں اپنی باری پر گئی تو والدہ کو مشینوں کے حصار میں دیکھ کر پریشان ہو گئی، ان کا ہاتھ تھام کر میرا ہناؤ جو دلرز نے لگا۔ ان کے ہاتھ کی حرکت اتنی معمولی تھی کہ جیسے انہیں اس بات کا احساس ہی نہ ہو کہ میں ان کے پاس ہوں۔ ”والدہ!!“ میں نے ہولے سے پکارا..... ”میں ہوں آپ کی.....“ میرے حلق میں پھندہ پڑ گیا جیسے۔

”ماہا!!“ والدہ کی خیف سی آواز آئی۔

”جی والدہ!“ میں نے جوش سے ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، ”کیسی ہیں آپ؟“ جواب میں انہوں نے ہولے سے میرا ہاتھ دبایا، شاید اس سے زیادہ وہ بول ہی نہ سکتی تھیں۔ میں بھی ان کی کیفیت اور تکلیف کو سمجھتی تھی اس لیے مزید گفتگو نہ کی۔ یوں بھی ہم سب کو نقطہ پانچ پانچ منٹ کی اجازت ملی تھی۔ میں تو شاید پانچ منٹ سے زیادہ ہی وقت لگا کر باہر نکلی اور میرے آنسو جو اندر بند باندھے ہوئے تھے باہر نکل کر بے اختیار بہہ نکلے۔ میں ابو سے لپٹ کر رونے لگی۔ ابو مجھے دلا سہ دے رہے تھے اور مجھے اسی طرح پکڑے پکڑے کیفی ٹیرا کی طرف چل دیئے۔ کیفی ٹیرا میں مجھے ایک میز کے گرد بٹھا کر وہ چائے لینے چل دیئے۔ چائے لے کر لوٹے تو ساتھ کھانے کا کچھ سامان بھی تھا۔ اصرار کر کے انہوں نے مجھے کچھ چیزیں کھانے کی دیں۔

”ماہا! بیٹا یہ مظہر آج کل کہاں ہوتا ہے؟“ ابو کے سوال پر میں نے انہیں چونک کر دیکھا۔

”کون سا مظہر ابو؟“ جانے کیسے میرے منہ سے نکلا۔

”غالب کا چھوٹا بھائی!“ ابو نے مختصر کہا۔

”یہیں ہوتا ہے.....“ میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے سے میرا جھوٹ نہ پکڑا جائے۔

”یہیں کہاں؟ کیا گھر پر ہوتا ہے؟“ ابو نے پھر سوال دہرایا۔

”جی جی جی ہاں!!“ میرا لہجہ ہکھلانے لگا۔ ابو نے میری طرف بے یقینی سے دیکھا، اور پھر وہ خاموشی سے یوں چائے کی چسکیاں لینے لگے جیسے چائے پینا دنیا کا اہم ترین کام ہو۔ مجھے الجھن

ہونے لگی۔ ”آپ نے کیوں پوچھا ابو؟“ میں رہ نہ سکی اور بے چینی سے پوچھا۔

”یونہی!!“ انہوں نے ایک لفظی جواب دیا، مگر میری الجھن رفع نہ ہو رہی تھی۔

”کیا آپ سے کسی نے کوئی بات کی ہے کسی نے؟“

”جھ سے!“ ابو حیرت سے بولے، ”کس سلسلے میں؟“

”مظہر کے سلسلے میں؟“ میں نے فوراً کہا۔

”جھ سے مظہر کے سلسلے میں کون بات کرے گا بھلا؟“ ابو مسکرائے۔

”مگر آپ کا یوں مظہر کی بابت پوچھنا!“ میں ذرا سارکی، ”میرا مطلب ہے کہ ضرور کوئی نہ

کوئی بات ہے ورنہ آپ یوں اچانک کوئی بات کیسے کر دیتے۔“

”یونہی بیٹھے تھے کوئی نہ کوئی بات تو کرنا تھی۔“ ابو نے جواب دیا، لیکن مجھے اس کا یقین نہ آیا۔ میں

نے انہیں کبھی بے مقصد کوئی بات کرتے ہوئے دیکھا تھا نہ ہی انہیں کسی کی یوں ٹوہ لیتے ہوئے۔

”چلیں آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں مگر.....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گئی، شاید یہ کہ، مجھے

یقین نہیں آ رہا۔

”ویسے یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میرے بیٹے کو دائیں بائیں کی باتیں کر کے مطمئن نہیں کیا

جاسکتا۔“ ابو نے۔

”تو پھر سیدھی بات ہی کریں ناں!!“ میں بھی مسکرائی۔

”کال آئی تھی مظہر کی!!“ ابو نے آہستگی سے کہا تو میں جیسے خوشی سے اچھلی۔

”کب اور کہاں؟“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”جب تم اپنی والدہ سے ملنے گئی تھیں اور تمہارا فون میرے پاس تھا.....“ ابو نے کہا۔ والدہ

کے کمرے میں موبائل فون لے کر جانے کی اجازت نہ تھی کیونکہ وہاں پر مختلف مشینیں جو کہ جسم کے

مختلف حصوں کے افعال کو ریکارڈ کر رہی ہوتی ہیں ان کے نظام میں خلل اندازی کا خدشہ ہوتا ہے۔

”پھر؟ کیا کہا اس نے؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا اور جھ سے یہ بھی کہا کہ تمہارے علاوہ میں کسی کو یہ بھی نہ بتاؤں

کہ اس کا فون آیا تھا۔“ ابو نے بتایا، ”جس طرح وہ بات کر رہا تھا، وہ انداز بھی تجھے عجیب لگا اور

تمہارے علاوہ پھر اس کے گھر کے باقی لوگ ہی ہو سکتے ہیں، اس سے میرا اندازہ ہے کہ وہ گھر پر

نہیں رہ رہا؟ کہاں ہے، کب سے ہے اور کیوں ہے، اس کا تو اندازہ تمہیں ہی ہوگا!!!“ ابو نے میرا

فون جیب سے نکال کر میری طرف بڑھایا۔

”کیا کہتا تھا، کیا پھر فون کرے گا؟“

”کہہ رہا تھا کہ تم سے ملنا چاہتا ہے، دوبارہ فون کرنے کا کچھ بھی نہیں کہا، ممکن ہے کہ پھر کال

کرے۔ تم سے ملنے کے لیے رابطہ کر کے ہی پروگرام طے کرے گا۔“ ابو نے قیاس لگایا۔

”ہاں یہ تو ہے!“ میں نے کھوئے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”ہے تو مظہر اور اس کے گھر والوں کا ذاتی معاملہ، لیکن میں پوچھے بغیر نہ رہ سکوں گا کہ سب

خیریت تو ہے ناں؟“

”جی ابو! بس دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا تھا.....“ میں نے مختصر آ کہا۔

”کوئی ایسا معاملہ جس میں، میں دونوں بھائیوں میں مصالحت کرانے میں مدد کر سکوں؟“ ابو

نے کہا، ”تو بچکیا نا نہیں، میرے لیے وہ بچوں جیسے ہی ہیں، میں سمجھاؤں گا دونوں کو۔“

”نہیں ابو! میں کروں گی مظہر سے بات۔ وہ ذرا جذباتی اور غصیلہ ہے، جلد غصے میں آ جاتا

ہے۔ آپ بات کریں گے تو اسی بات پر ناراض ہو جائے گا کہ آپ تک بات کیوں پہنچی“ میں نے فوراً

کہا ”اور ویسے بھی میں سمجھا رہی ہوں دونوں بھائیوں کو۔ ٹھیک ہو جائے گا سب، دونوں بھائی میرا

احترام بھی کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میری بات مانیں گے نہیں۔“ میرے لہجے میں اعتماد تھا۔

”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو بیٹا!“ ابو نے خلوص دل سے کہا۔ چائے ختم کر کے ہم کیفے ٹیریا سے

نکلے، کاریڈور ہی میں پھر میرے فون کی گھنٹی بجی، میں نے بے تابی سے پرس میں سے فون نکالا کہ

شاید مظہر کا فون ہو، اسکرین پر تیمور کا نام جگمگا رہا تھا۔

”السلام علیکم تیمور!“ میں نے فون آن کر کے کہا۔

”علیکم السلام! کیسی ہیں بھابی آپ؟ اور آئی کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

”والدہ سے آج مختصر ملاقات ہوئی ہے۔ پہلے سے بہتر ہیں لیکن مکمل طور پر ٹھیک نہیں کہہ سکتے۔“

”اللہ کرے گا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ تیمور نے مجھے تسلی دی۔

”انشا اللہ!“ میں نے فوراً کہا۔

”کہاں ہیں آپ اس وقت؟“

کر کے اسے سمجھانا چاہتا ہوں!!“ تیمور نے کہا مگر میرا شک رفع نہ ہو رہا تھا۔

”تم اسے گرفتار تو نہیں کروادو گے.....؟“ میرا اندیشہ زبان پر آئی گیا۔

”وہ میرا بھائی بھی ہے بھابی! اگرچہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے مگر میں ایک بار اسے سمجھانا تو ضرور چاہوں گا اور پھر بھی اگر وہ نہ سمجھا تو.....“ تیمور کی ادھوری بات نے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ اس کا کیا مطلب تھا۔

”وہ بہک گیا ہے تیمور! اسے ایک موقع ضرور دینا۔ پہلے مجھے اس کو سمجھانے دینا.....“ میں نے درخواست کی۔

”ایک اور اہم بات بھابی!!“

”وہ کیا؟“

”آپ کو بھی علم ہے اور مجھے بھی کہ وہ جب بھی رابطہ کرے گا، صرف آپ ہی سے کرے گا۔ میں اس کے موبائل فون پر کافی دفعہ پیغامات چھوڑ چکا ہوں لیکن مجھے وہ جواب بھی نہیں دیتا۔ میں نے ہی اسے آئی کی عیال کی خبر دی تھی، شاید اسی لیے اس نے کال کی ہوگی.....“ تیمور نے وضاحت کی۔

”اچھا!!“ میں نے مختصر اُ کہا۔

”ممکن ہے کہ اسے کسی مرحلے پر اپنے فون کے ٹریس ہو جانے کا شک ہو اور وہ کسی اور نمبر سے آپ کو کال کرے۔“ تیمور نے وضاحت کی، ”یہی سوچ کر میں نے آپ کا نمبر بھی ٹریسنگ پر لگوادیا ہے۔ اس پر آنے والی ہر کال ریکارڈ ہوگی اس لیے آپ اپنی گفتگو میں محتاط رہیں، ہر کال میں اور جب مظہر کی کال آئے تو اسے طویل کرنے کی کوشش کریں اگر وہ لاہور میں ہی ہوا تو کال کے دوران ہی ہم اسے پکڑ سکتے ہیں!!“

”مگر.....“ میں ہکلائی، ”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”آئی ایم سوری بھابی! آپ کا فون ٹریسنگ پر لگوانا مجھے بھی بہت عجیب لگا، مگر میری اس غلطی کو معاف کر دیجئے گا، صرف اس وقت تک کی بات ہے جب تک ہمیں مظہر نہ مل جائے۔“ تیمور نے معذرت کی۔

”میں اپنے فون کی ٹریسنگ سے پریشان نہیں ہوں، صرف مظہر کے بارے میں فکر مند

”ہسپتال میں!“ میں نے جواب دیا۔

”اکیلی ہیں یا ارد گرد کوئی ہے؟“ اس کے سوال پر میں نے چونک کر ابو کو دیکھا جو میرے ساتھ ہی چل رہے تھے۔

”ابو بھی بالکل ٹھیک ہیں اور پاس ہی ہیں میرے۔“ میں نے فوراً بات بتائی۔

”مجھے آپ سے انتہائی ضروری بات کرنا ہے اور فوراً.....“ تیمور نے کہا، ”مگر اس طرح کہ آپ اکیلی ہوں۔ ارد گرد کوئی بھی نہ ہو.....“ میں اندر سے گھبرا گئی تھی۔ اب یہ بھی نہ پوچھ سکتی تھی کہ کس بارے میں اور دماغ میں ساتھ ہی کوئی ترکیب بھی سوچ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے کہہ دوں گی، ماہ رخ کو میرا بہت سلام دینا۔“ میں نے گندم کا جواب چنے میں دے کر فون بند کر دیا اور خاموشی سے ابو کے ساتھ چلنے لگی۔ والدہ کے کمرے کے پاس پہنچ کر میں نے صدف آپنی سے والدہ کی خیریت پوچھی اور پھر باتھ روم کا بہانہ کر کے وہاں سے نکلی۔ اسی فلور کے کاریڈور کے آخری سرے پر بالکونی تھی۔ میں اس طرف آئی اور فوراً تیمور کا نمبر ملایا۔ دیر تک کھنٹی بجتی رہی مگر فون کوئی نہ اٹھا رہا تھا۔ بار بار میں نمبر ڈائل کر رہی تھی فون مصروف تھا۔ بالآخر میں نے تھک کر فون بند کر کے پرس میں رکھا اور واپسی کی راہ لینے کو ہی تھی کہ تیمور کی کال آگئی۔ میں نے فوراً فون آن کر کے اسے سلام کرتے ہی پوچھا کہ کیا ضروری اور اہم بات تھی۔

”مظہر کا فون آیا تھا آپ کے فون پر؟“ تیمور نے جواب نما سوال کیا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”آپ کے ابو نے فون اٹینڈ کیا اور اس نے انہیں کہا ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دوبارہ آپ کو کال کرے گا!“ تیمور کہہ رہا تھا اور میرے وجود میں سنسنی دوڑ رہی تھی، ”جب وہ فون کرے تو آپ نے کوشش کرنی ہے کہ اس سے لمبی گفتگو کریں.....“

”تمہیں کیسے معلوم ہوئی اس کی گفتگو؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”میں نے اس کا فون ٹریس کر دیا، وہ اب بند و بست کیا ہے، اگر آپ طویل گفتگو کریں گی تو ہمیں معلوم کرنے میں سہولت ہوگی کہ اس کا فون کہاں سے استعمال ہو رہا ہے۔“ تیمور نے وضاحت کی۔

”پھر کیا ہوگا؟“ میرے اندر عجیب سے اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔

”بھابی! اس کے گرد ایجنسیوں کا گھیراؤ ہو رہا ہے، اس سے پہلے میں ایک بار کوشش

ہوں۔ تم کس طرح اس کے گرد گھیرا تنگ کروا رہے ہو اور اسے پکڑ کر کیا کرو گے؟“ میرے لہجے میں تشویش تھی۔

”آپ فکر نہ کریں۔“ تیمور ہنسا، ”میں اسے پکڑ کر آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

ڈاکٹروں کا والدہ کو ہسپتال سے فارغ کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، انہیں وہیں زیر نگرانی رکھا گیا تھا اور ملاقات ابھی تک محدود تھی۔ ان کی طرف سے ذرا بے فکری بھی تھی کہ اب ان کی حالت قدرے بہتر تھی۔ ڈاکٹر آپریشن کرنے کے لیے انہیں دہنی اور جسمانی طور پر تیار کر رہے تھے اور اس دوران گھر نہ بھیجنا چاہتے تھے کہ کہیں دوبارہ دل کا دورہ پڑ گیا تو حالات بگڑ بھی سکتے تھے۔ مجھے ہر وقت کسی بری خبر کا دھڑکا لگا رہتا تھا، والدہ کی طرف سے بھی مجھے پریشانی تو تھی ہی مگر اب منظر کی فکر بھی دو چند ہو چلی تھی۔

ٹیلی فون کی ہر کھٹی پر میں چونک اٹھتی اور انجان نمبروں سے بھی کالیں اٹینڈ کر لیتی تھی، جو میں عموماً نہیں کرتی تھی، مگر یہ سوچ کر کہ جانے کون سی کال منظر کی ہو میں ہر وقت منتظر رہتی۔ خوف سا بھی تھا اور یہ منصوبہ سازی بھی کرتی رہتی تھی کہ کس بات میں اسے الجھا کر گفتگو طویل کر سکوں گی۔ کبھی کوئی کوئی تجویز ذہن میں آتی اور کبھی کوئی، کبھی کبھار یہ بھی محسوس ہوتا کہ دماغ ہی کام کرنا چھوڑ گیا ہے۔ ایک روز شام کو نہا کرٹی وی لاؤنچ میں تنہا بیٹھی تھی۔ ابو اور علی بھائی ہسپتال گئے تھے اور ثانیہ غالباً اپنے کمرے میں تھی کہ میرے فون کی کھنٹی بجی، اسکرین پر منظر علی کا نام جگمگا رہا تھا۔

”السلام علیکم!“ میں نے حسب عادت فون آن کر کے کہا۔

”وعلیکم السلام! منظر بول رہا ہوں۔ کیسی ہیں آپ؟“ منظر نے سوال کیا۔

”اللہ کا کرم ہے!“

”والدہ کیسی ہیں آپ کی؟“

”قدرے بہتر ہیں، ڈاکٹر ان کی صحت یابی کی رفتار سے مطمئن ہیں الحمد للہ!“ میں نے

جواب دیا۔

”آپ سے ملنا چاہ رہا تھا، کچھ دنوں سے کسی کام کے سلسلہ میں۔“

”جب چاہیں آ جائیں، اگر کوئی ایسی بات ہے جو فون پر کی جاسکتی ہو تو؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ تو مجھے اپنے ذاتی مسائل کی بابت بات کرنا تھی اور کچھ مجھے آپ سے آپ ہی کے بارے میں بات کرنا تھی۔“ اس کے انداز میں جھجک تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاید وہ مجھ سے اسی خواہش کی بات کرنا چاہ رہا تھا، جس کا اظہار اس سے قبل ثانیہ بھی مجھ سے کر چکی تھی۔ روبرو وہ یہ بات کرنا تو مجھے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

”میرے بارے میں کون سی بات آپ کو کرنا ہے؟“ میرے سوال میں حیرت تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ میرے لیے فوری طور پر بات کرنا مشکل ہو جائے۔“ وہ رک رک کر بولا۔

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تجسّس کی وجہ سے مجھے نیند نہ آئے۔“ اس لیے آپ ابھی بات کر لیں۔“ میں نے جونہی اس سے کہا، مجھے یاد آ گیا کہ میرا فون ٹریڈنگ پر لگا ہوا تھا، مگر میرے الفاظ تیر کی طرح میری زبان سے نکل چکے تھے، اب منظر علی جو بھی کہنے جا رہا تھا، اسے روکنا بہت ضروری تھا، ورنہ جانے وہ کیا کہتا اور اس ریکارڈنگ کو کتنے لوگ سنتے اور اس کے دل کی بات جانے کہاں کہاں تک پہنچ جاتی، مجھے اور کچھ نہ سوچتا تو میں نے فوری طور پر فون بند کر دیا۔ مگر چند لمحوں کے بعد ہی دوبارہ فون کی کھنٹی بجی، دوبارہ منظر علی کا ہی فون تھا، میں نے کچھ سوچ کر اسے آن کیا اور کہا، ”جی؟“

”سوری! شاید فون کٹ گیا تھا؟“

”میرے فون کی بیٹری ختم ہو رہی ہے!“ میں نے جھوٹ بولا۔

”میں گھر کے نمبر پر فون کر لیتا ہوں آپ کو؟“ وہ مجھے عجیب انداز سے مخاطب کر رہا تھا، مجھے احساس ہوا کہ اس تمام گفتگو میں اس نے مجھے ایک دفعہ بھی میڈم نہ کہا تھا۔ اس کا طرزِ مخاطب ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔

”آپ کہاں پر ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں گھر پر ہوں!!“ جواب آیا۔

”سیکنڈ آئی کہاں ہیں؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”گھر پر ہی ہیں۔“ وہ رکا، ”اور میں ان کی اجازت سے ہی فون کر رہا ہوں، وہ جانتی ہیں کہ

میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔ اس وقت وہ باورچی خانے میں ہیں۔“



”نہیں میرا یہ مقصد نہیں تھا پوچھنے کا!“ میں کھسیا سی گئی۔

”اصل میں امی نے مجھے بتایا تھا کہ.....“ وہ رکا، شاید بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہ مل پارہے تھے اسے۔ ”ثانیہ کا رویہ آپ کی بابت کچھ منفی طرز کا ہے، مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا اور میں ثانیہ سے تب سے ناراض ہوں جب سے مجھے معلوم ہوا ہے۔“

”ارے نہیں!“ میں نے فوراً کہا، ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”ایسی کوئی بات ہوگی بھی تو آپ کبھی اپنے منہ سے بول کر نہیں بتائیں گی، یہی تو آپ کا بڑا پن ہے، لیکن امی نے مجھے اس واقعے کی بھی تمام تفصیل بتائی تھی جب آپ ہسپتال آئی تھیں، ان کی کمر دروازے کی طرف تھی مگر انہوں نے اپنے عقب میں آہٹ سن لی تھی اور مڑ کر انہوں نے آپ کو اور صدف آپنی کو ٹکلتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ بتا رہی تھیں کہ ثانیہ نے بہت نامناسب گفتگو کی تھی۔“ مظہر نے وضاحت کی۔

”آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دکھ اور تکلیف میں انسان کے منہ سے کلمات کفر تک نکل جاتے ہیں اور یوں بھی ثانیہ میری بڑی بھابی ہے اور ماں جیسی ہے، اگر وہ مجھے کچھ کہہ بھی دے تو مجھے اس پر پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ ہی آپ کو اس سے ناراض ہونے کی۔“ میں نے ثانیہ کی طرف داری کی۔

”ثانیہ شاید ہمارے گھر اور ہمارے دلوں میں آپ کا مقام بھول گئی ہے، اسے شاید یاد نہیں رہا کہ اس کا حالیہ مقام اور ہمارے گھر کے حالات آپ کے احسان کی وجہ سے ہیں۔ وہ اپنی حسد کی دل آزاری کر کے نہ صرف آپ کی بلکہ میری بھی دل آزاری کی مرکب ہوئی ہے..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ.....“ وہ بولتے بولتے رک گیا اور اس کے نامکمل جملے کے بین السطور کو سمجھ کر میرا دل عجیب سے احساس سے دوچار ہوا۔

”مظہر! آپ پریشان نہ ہوں، میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ وقتی طور پر مجھے دکھ ہوا تھا مگر بعد ازاں مجھے یہ بات تقریباً بھول ہی گئی تھی، آج کتنے دنوں کے بعد آپ نے یاد کروادی ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی، ”میرے اور ثانیہ کے آپس میں تعلقات بہت خوشگوار ہیں اور ویسے بھی میں ناخوشگوار یادوں کو اپنے حاشے میں زیادہ دیر تک محفوظ رکھنے کی عادی نہیں ہوں۔“

”میں جانتا ہوں، آپ میری تسلی کے لیے ایسا کہہ رہی ہیں، تاہم ثانیہ کی باتوں سے مجھے

بہت دکھ ہوا ہے۔“ اس نے کہا اور گھر کی بیرونی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

”باہر کوئی آیا ہے شاید، گھنٹی بجی ہے!“ میں نے کہا۔

”ارے نہیں! یہ ہمارے گھر کی گھنٹی ہے۔“ مظہر علی نے کہا۔

”حیرت ہے، بالکل ایک جیسی آواز ہے آپ کے اور ہمارے گھر کی گھنٹیوں کی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بس یہی ایک چیز ایک جیسی ہے مگر.....“

”مظہر بیٹا! باہر گھنٹی بجی ہے، دیکھو شاید کوئی آیا ہے.....“ سیکنہ آنٹی کی آواز آئی، ”اچھا تم اگر ابھی تک بات کر رہے ہو تو میں دیکھ لیتی ہوں.....“

”ارے نہیں امی! آپ رکیں، میں دیکھتا ہوں.....“ میں چشم تصور سے مظہر علی کو باہر جاتے دیکھ رہی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں، یوں بھی ثانیہ اب ہمارے گھر کی فرد ہے اور اس سے وابستہ کوئی بھی مسئلہ آپ کا نہیں اب ہمارا مسئلہ ہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”جو بھی ہو، اسے احسان فراموشی نہیں کرنی چاہئے۔“ گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ ”السلام علیکم! جی فرمائیے؟“ مظہر علی کی آواز آئی تھی۔ ”سوری ماہاجی! ایک منٹ ہولڈ کیجئے! میں بات کرتا ہوں۔“

”اوکے!“ میں نے فوراً محسوس کیا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار میرا نام اس انداز سے لیا تھا، لیکن مجھے کچھ ایسی بالچل دل میں محسوس نہ ہوئی تھی۔ میں اسپیکر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی۔

”وعلیکم السلام!“ جواب دینے والے کا لہجہ بھاری بھر کم اور قدرے غصیلا تھا۔

”سوری! میں نے آپ کو پہچانا نہیں.....!“ مظہر علی کی آواز تھی۔

”ہم کون سا تمہارے ماموں ہیں بیٹا! جو تم ہمیں پہچانو گے.....“ ایک اور کرخت سی آواز ابھری تھی۔

”تو پھر کون ہیں آپ اور کس لیے آئے ہیں؟“ مظہر نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”ہمیں یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت ہے نہ حکم!“ بھاری آواز والے نے کہا تھا، ”تم اپنا

تعارف کرواؤ بر خوردار! کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی میرا نام مظہر ہے!“ مظہر علی کے لہجہ میں کچھ تھا، ہٹلاہٹ بھی اور خوف بھی۔

”اب تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے بیٹا!! خود چل کر جاؤ گے یا پھر ہم اٹھا کر لے جائیں؟“  
 کرخت آواز والے نے کہا تھا۔ میں سانس روکے سن رہی تھی اور صورتحال کو بھانپنے کی کوشش  
 کر رہی تھی، میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا، میں نے گھر کے نمبر سے پولیس کا نمبر ڈائل کیا۔  
 ”دیکھیے آپ مجھے پہلے مقصد بتائیں، پھر ہی میں بتا سکتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا  
 یا نہیں!“

”تم اتنے با اختیار نہیں ہو کہ یہ فیصلہ کر سکو کہ ہمارے ساتھ جانا ہے یا نہیں.....“ انتہائی غصے  
 سے کہا گیا، ”ہم تمہیں لینے آئے ہیں اور ہر حال میں لے کر ہی جائیں گے.....“  
 ”اگر میں ساتھ جانے سے انکار کر دوں تو؟“ مظہر علی کی آواز آئی..... کافی دیر تیل جانے  
 کے بعد پولیس اسٹیشن سے فون اٹھالیا گیا تھا۔ میں نے سلام کیا، میرے موبائل سے مظہر علی کے  
 گراہنے کی آواز آئی اور پھر اس کا موبائل فون زمین پر گرنے کی..... شاید وہ لوگ اسے مار رہے  
 تھے۔ میرا دل خوف سے لرزنے لگا۔ میں نے روتے ہوئے اور کانپتی آواز میں ٹیلی فون اینڈ  
 کرنے والے کو مختصر بات سمجھائی۔

”ہولڈ کریں بی بی!“ اس نے میری بات ختم ہونے کے بعد مجھے ہولڈ کر دیا اور قریباً دو  
 منٹ کے بعد دوبارہ فون اٹھا کر کہا، ”اب دوبارہ پولیس جو آپ پہلے کہہ رہی تھیں اور ذرا آہستہ رفتار  
 سے پولیس، کیونکہ میرے لکھنے کی رفتار آپ کے بولنے کی رفتار سے کہیں کم ہے.....“  
 ”دیکھیے پلیز! اغوا کا کیس ہے اور ذرا سی تاخیر سے.....“ میری آواز بھرانے لگی، ”کچھ بھی  
 ہو سکتا ہے۔ جانے کون لوگ ہیں اور کتنے خطرناک ہیں.....“

”اچھا آپ ذرا مغوی کا پورا نام بتائیں پہلے؟ بلکہ سب سے پہلے تو آپ اپنا تعارف  
 کروائیں کہ آپ کون ہیں اور مغوی سے آپ کا کیا ناتا ہے؟“ پولیس والے نے سوال کیا اور اس  
 سے قبل کہ میں اسے کوئی جواب دیتی، مغوی کے نام کے الفاظ سے میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔  
 شاید وہ غلط فہمی میں مظہر علی کو لے گئے ہوں۔ میں نے فوراً فون بند کر دیا اور اپنے موبائل فون پر تیمور  
 کا نمبر نکالا، ممکنات کا بٹن دبا کر بجائے ڈائل کے Delete کا بٹن دبا دیا، فون نے فوراً سوال  
 پوچھا کہ کیا واقعی میں تیمور کا رابطہ نمبر مٹانا چاہ رہی تھی، میں نے نفی کا بٹن دبا دیا۔

صوفی سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی، تیمور سے بات کرتے وقت مجھے اپنے

جذبات اور لہجے کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ بے چینی رگوں میں لبو بن کر دوڑ رہی تھی، مگر مجھے پرسکون  
 رہنے کی کوشش کرنا تھی۔ میری بے چینی اس پر کوئی ایسا راز آشکار نہ کر دے، جس کا راز رہتا ہی بہتر  
 تھا۔ پھر تیمور کا نمبر ڈائل کیا تو مسلسل مصروف تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے جھنجھلا کر مارخ کا نمبر  
 ڈائل کیا۔ مارخ غالباً ٹی دی دیکھ رہی تھی کیونکہ پس منظر میں ٹی دی کی بلند آواز سنائی دے رہی  
 تھی۔ سلام دعا کے بعد میں نے عام سے لہجہ میں پوچھا۔ ”مارخ تیمور کہاں ہے؟“

”میری جیب میں!“ اس نے مزاحیہ لہجہ میں کہا۔

”ذرا اسے جیب سے نکال کر میری بات تو کر دادو۔“ میں نے بھی بڑی کوشش کے ساتھ لہجہ  
 اسی کی طرح بنا کر کہا۔ ”تھوڑی سی دیر کے لیے.....“

”دیکھتی ہوں، کہیں جیب سے باہر نہ گر گیا ہو.....“

”بہتر ہے کہ تم اسے جیب کی بجائے مٹھی میں بند رکھا کرو۔“

”رکھتی تو مٹھی میں ہی ہوں، لیکن آج اس نے میری انگلیوں پر ناپنے سے انکار کر دیا تھا، اس  
 لیے سزا کے طور پر اسے جیب میں ڈال لیا۔“ وہ با آواز بلند فون رہی تھی، مجھے کوفت تو بہت ہو رہی  
 تھی مگر برداشت کر رہی تھی۔

”پلیز مارخ! ذرا جلدی بات کر دادو، پھر مجھے ہسپتال بھی جانا ہے والدہ کو دیکھنے۔“ میں نے  
 جیسے منت کی۔

”ارے ہاں! کیا حال ہے اب آنٹی کا.....؟“ مارخ نے شرمندگی سے پوچھا۔

”بہتر ہیں.....“ میں نے مختصر اُکھا۔ ”تیمور کہاں ہے؟ موبائل فون بھی اینڈ نہیں کر رہا.....“

”ہاں وہ اس وقت راستے میں ہوگا، یہیں بیٹھا تھا کہ اچانک کوئی کال آگئی اور اسی طرح اٹھ  
 کر وہ لاہور چل پڑا اور تو اور کپڑے تک نہیں بدلے..... کہہ رہا تھا کہ کسی دوست کو کوئی حادثہ پیش  
 آیا ہے اور وہ زخمی حالت میں ہسپتال میں ہے۔“ مارخ کی بات ختم ہوتے ہی میں نے خدا حافظ  
 کہہ کر فون بند کر دیا، پریشانی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

بار بار تیمور کا نمبر ڈائل کر رہی تھی کہ جونہی اس کا فون فارغ ہو وہ میری کال اینڈ کرے۔ بیچ  
 میں سیکینڈ آئی کی مسلسل کالیں آرہی تھیں لیکن میں انہیں اینڈ نہیں کر رہی تھی، اس وقت میرے لیے  
 سب سے اہم بات تیمور سے رابطہ ہونا تھا۔ لیکن وہی نہ ہو پا رہا تھا۔

”مظہر کوفون کروں؟“ میں نے دل میں سوچا اور مظہر کا نمبر ڈائل کیا، اس کا فون بند تھا..... ”یا اللہ کیا کروں؟“ میں خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کرنے لگی۔ میری آنکھیں ڈبڈبائے لگیں..... ”کہیں وہ مظہر علی کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں؟“ خیال آیا مگر یہ یقین بھی تھا کہ وہ تیور کے آدمیوں کے پاس تھا اور تیور اسی غلط فہمی میں آ رہا تھا کہ وہ مظہر اس کا بھائی تھا، جس کا سراغ مل گیا تھا۔ تب میں نے مظہر کے فون پر پیغام چھوڑا، ”مظہر بہت ہی اہم معاملہ ہے، تم سے ملنا بہت ضروری ہے.....“ اور پھر فون رکھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ فون کی گھنٹی بجی، علی بھائی کی کال تھی۔

”کیا ہو گیا ہے ماہا؟ فون کیوں اتنا مصروف تھا تمہارا بھی اور گھر کا بھی؟“ بغیر سلام دعا کے انتہائی غصے سے وہ بولے۔

”نہیں تو!“ میں ہکلائی، ”گھر کا فون تو میں استعمال نہیں کر رہی۔“

”تو پھر وہ کیوں مصروف ہے؟“ علی بھائی کے لہجے میں اب بھی غصہ تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر فون کے پاس گئی اور ریسیور درست کر کے رکھا۔

”سوری علی بھائی! ریسیور ٹھیک سے نہیں رکھا ہوا تھا.....“

”ایک وہ ثانیہ ہے تو وہ بھی گھوڑے بچ کر اور فون کی گھنٹی بند کر کے سوتی ہے.....“

”سوری علی بھائی!!“ میں نے نرمی سے کہا، ”غلطی میری ہی ہے..... میں نے ہی فون کا ریسیور پریشانی میں ٹھیک سے نہیں رکھا تھا۔“

”تو کیا تمہیں معلوم ہو گیا ہے؟“ علی بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا؟ کیا پوچھ رہے ہیں آپ؟“ میں نے سوال کیا۔

”تم کس پریشانی کی بات کر رہی ہو؟“ علی بھائی نے سوال کیا۔

”میں تو مظہر علی.....“ میں رکی..... ”فون پر بات نہیں کر سکتی علی بھائی! جب آپ گھر آئیں گے تو بات ہوگی۔“

”خیریت تو ہے؟“ علی بھائی چونکے۔

”خیریت؟؟ شاید نہیں!!“ میں نے کھوئے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”تم ٹھیک تو ہو ماہا؟ کہیں ثانیہ سے تو کوئی بحث مباحثہ نہیں ہو گیا تمہارا؟“

”کیا آپ فوراً گھر آ سکتے ہیں علی بھائی؟ کوئی بہت اہم بات کرنا ہے آپ سے!!“ میں نے

کچھ سوچ کر کہا۔

”ابو اور صدف آپنی آرہے ہیں، میں بھی تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں.....“ علی بھائی نے کہا۔

”آپ سب لوگ آجائیں گے تو والدہ کے پاس کون رہے گا؟ میں آجاتی ہوں وہیں اور وہیں پر آپ سے بات بھی کرلوں گی اور والدہ کے پاس رک جاؤں گی۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”نہیں تم گھر پر ہی رہو، ثانیہ کو بھی فوراً جاؤ! تمہارے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر آپ وہیں رکیں والدہ کے پاس، یا پھر کوئی اور ہے؟ ثانیہ آپنی ہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں آ رہا ہوں.....“ علی بھائی کے لہجے میں کچھ تھا، میرا دل لرزنے لگا..... ”تم بہادر بنو اور حوصلہ کرو..... گھر پر ہی رہو، والدہ کو اب ہم میں سے کسی کی ضرورت نہیں رہی۔“

میں ہذیبانی انداز سے چیخ رہی تھی، ثانیہ بھی گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے سے نکلی اور آ کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا..... ”کیا ہوا ہے؟“

”میں اکیلی رہ گئی ہوں ثانیہ! والدہ مجھ سے روٹھ گئی ہیں، وہ ہم سب سے روٹھ گئی ہیں.....“ میں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

”اوہ میرے خدایا! اسی لیے علی اور امی کی درجنوں کالیں آئی ہیں اور میرے فون کی گھنٹی بند تھی۔“ ثانیہ نے گھبرا کر کہا، ”لیکن آپ کو کس نے بتایا ہے؟“

”علی بھائی نے ہی بتایا ہے.....“ میں بچوں کی طرح رو رہی تھی، ثانیہ بھی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، گھر کے ملازمین بھی گھبرا گئے، انہیں بھی صورتحال کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن انہیں علم نہ تھا کہ وہ ان حالات میں کیا کرتے۔ میں تو یہ خبر سن کر ہی اپنے حواس کھو بیٹھی تھی، ہذیبانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ میں اپنی ماں کے پاس بھی نہ تھی ان کے آخری لمحات میں۔ اتنے دنوں سے مستقل ہسپتال میں تھی اور اسی روز مجھے واپس آنا تھا اور اسی روز میری انگلی ماں کے ہاتھ سے چھوٹ جانی تھی۔

ابو اور صدف آپنی آئے تو میں ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، ”مجھے والدہ کے پاس لے چلیں۔ مجھے ان سے آخری بار ملنا ہے۔“ مگر یہ تلخ حقیقت سب کے چہروں پر کندہ تھی کہ اب وقت نہیں رہا۔ ان کی زندگی نے انہیں اتنی مہلت بھی نہ دی تھی کہ اپنی لاڈلی بیٹی سے جاتے

وقت کوئی بات ہی کرتیں۔ گھر میں منٹوں میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی اور گھر لوگوں سے کچا کچھ بھر گیا۔ میں بالکل یوں تھی جیسے میرا وجود ہوا میں معلق ہو گیا ہو۔ کون آ رہا تھا، کون جا رہا تھا، کیا ہو رہا تھا، مجھے جیسے اس سب سلسلے سے غرض ختم ہو گئی تھی۔ صرف یہ معلوم تھا کہ والدہ مجھ سے دور چلی گئی تھیں اور میں دنیا میں ان کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئی تھی۔

تین روز اور ماہ رخ بھی آئے تھے، مظہر علی بھی آیا تھا۔ گویا مظہر علی ان اغواء کنندگان کے چنگل سے چھوٹ کر آ گیا تھا۔ (یقیناً تیمور کے آنے سے غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی اور انہوں نے مظہر علی کو آزاد کر دیا ہوگا۔) تانیہ آپنی اور عائشہ باجی بھی گھر پر ہی تھیں۔ رانی باجی بھی آئی تھیں، زارا اور نوید صاحب بھی، دفتر کا سارا سٹاف بھی، جو لوگ خود نہ آئے تھے ان کی کالوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، میں بھی مجبور کرنے پر ریسیور پکڑ کر سلام کرتی اور پھر آنسوؤں کی لڑیاں پروتی ہوئی تعزیتی کلمات سنتی رہتی۔ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے، میں اتنی بے خیالی میں ہوتی کہ مجھے علم ہی نہ ہوتا۔ بس یہ احساس تھا کہ ایسا حادثہ ہوا ہے جو مجھ سے بہت کچھ چھین کر لے گیا ہے۔

صدف آپنی نے بتایا کہ والدہ کو جان لیوا ہارٹ ایٹک ہوا تھا، ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکیں، کاش میں ان کے پاس ہوتی!!!“ میں بار بار سوچتی۔ لیکن میں کیا کر لیتی۔ اگر ڈاکٹر کچھ نہ کر سکے تھے، صدف آپنی اور ابو پاس ہوتے ہوئے بھی انہیں نہ روک سکے تھے۔ پھر بھی ایک کسک تھی کہ وجود کا پچھا ہی نہ چھوڑتی تھی۔

میں جو خود کو ابھی تک ایک بچی ہی سمجھتی تھی اور والدہ سے ہر معاملے میں ہدایت کی روشنی ڈھونڈتی تھی، ”اب میں کس سے دل کے دکھ کہوں گی؟“ سوچتی اور پھر سسکیاں لینے لگتی۔ پانچواں دن تھا، گھر سے مہمانوں کا رش چھٹ گیا تا اور گھر کے در و دیوار میں جیسے دیرانیاں اتر آئی تھیں۔ ہر شام، شام غریباں محسوس ہوتی تھی اور دن بھی دھندلا سا لگتا۔ اس سارے عرصہ میں سیکنہ آنٹی نے میری بہت دلجوئی کی۔ انہوں نے مجھے ایک لمحہ بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ پانچویں روز انہوں نے واپسی کا

قصد کیا، مظہر علی انہیں واپس لے کر جانے کے لیے آیا تھا، جاتے ہوئے وہ میرے پاس بھی آیا تھا۔ ”بہت دکھ ہوا، آنٹی کی وفات کا۔ میرے پاس آپ کے اس دکھ کی شدت کو کم کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی آپ کو حوصلہ اور صبر دے!!“ ”بہت شکریہ!!“ میں نے مختصراً کہا۔

”آپ تو بہت غیریت برت رہی ہیں!“ اس نے کہا، ”اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟“ ”کچھ معلوم ہوا کہ آپ کو کس نے اغوا کیا تھا اور کیوں؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔

”سوری میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا.....“ وہ گویا ہوا، ”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ کسی اور کے دھوکے میں مجھے اغواء کر کے لے گئے تھے، آپ نے بروقت تیمور صاحب کو اطلاع کر دی اور وہ فوراً حرکت میں آ گئے۔ آپ کے دماغ نے بہت سرعت سے کام کیا تھا، آپ کو یقین تھا کہ اس معاملے میں فوج کی مداخلت کی ضرورت ہے، ملک کے سیاسی معاملات کی طرح۔“ ”فوج ملک کے سیاسی معاملات میں تبھی دخل اندازی کرتی ہے جب سیاست دان ملک کو زوال کی انتہائی سطح پر لے جاتے ہیں۔“ مجھ سے مظہر علی کا طنزیہ بیان برداشت نہ ہوا تھا۔ ”بہر حال میں کسی سیاسی مباحثے میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ حتمی انداز سے میرا کہنا گویا اس کے لیے اجازت نامہ تھا کہ وہ جاسکتا تھا، اور وہ چند لمحے بیٹھ کر جانے کیا سوچتا رہا، پھر اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ کم از کم اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اغواء کنندگان اسے کس کے دھوکے میں لے گئے تھے، ورنہ اس کے ذہن میں درجنوں سوالات ہوتے اور پھر مظہر کے بارے میں وہ یوں بھی متحسّس ہو جاتا۔

”ابو تمہیں بلارہے ہیں ماہا!“ علی بھائی کی آواز نے مجھے چوکا دیا۔ میں اٹھی اور ان کی تقلید میں ابو کے کمرے کی طرف چلی۔ دروازہ نیم وا تھا، ابو کمرے میں اکیلے ہی تھے۔

”آؤ بیٹا آؤ!“ ابو نے مجھے دیکھ کر بلایا، میں ان کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی اور انہوں نے اپنا دستِ شفقت میرے سر پر رکھ دیا۔ والدہ کی وفات کے بعد میں پہلی دفعہ اس کمرے میں آئی تھی، میرا دل کٹنے لگا، احساس محرومی نے میرے سر پر بادل سے تان دیئے تھے۔ ماں بھی کسی چھتر چھاؤں ہوتی ہے، میں نے سوچا۔ جب تک زندہ رہتی ہے اس کی آغوش ساری اولاد کی پناہ گاہ رہتی ہے، خواہ اولاد خود بھی بڑھا پے کی حدوں کو چھونے لگے۔ اولاد پر مہربان، اس کی تمہبان، اس کی راز داں، کیا کچھ نہیں ہوتی۔ اور ایک اس کے جانے سے اولاد کیسی بے سائبان ہو جاتی ہے۔

”کیا بات ہے ابو؟ آپ نے مجھے بلایا ہے!“ میں نے پوچھا۔

”جی بیٹا اٹھ کر دروازہ بند کر دیں ذرا.....“ ابو نے کہا۔

”خیریت ہے ابو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، ”ایسی کون سی بات ہے؟“

”آپ پہلے وہ کریں جو میں نے کہا ہے۔“ ابو مسکرائے اور پھر کہا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند

کر دیا۔

”جی ابو؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے ان سے پوچھا۔

”مظہر کا فون آیا تھا بیٹا، میرے نمبر پر، افسوس کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تمہارے نمبر پر وہ فون

نہیں کر سکتا۔“ اور کے، ”شاید تمہارا فون ٹیپ ہوتا ہے، کیوں بیٹا؟“ ابو کے سوال میں تشویش تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ابو!“ میں نے فوراً کہا، ”اور اگر مظہر کو کوئی غلط فہمی ہے تو میں ابھی اپنے

نمبر سے اسے فون کرتی ہوں.....“

”اس نے منع کیا ہے بیٹا!“ ابو نے کہا، ”اور یوں بھی مجھے اس نے فون کسی پبلک کال آفس

سے کیا تھا۔ اس کا اپنا موبائل بھی ٹیپ ہوتا ہے، بقول اس کے۔ بہر حال تم رکو وہ ابھی پانچ منٹ

میں تمہیں کال کرتا ہے۔“

”پتا نہیں کیوں ایسے کرتا ہے، سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے!“ میں ابو کی تسلی کے لیے

کہنے لگی۔ ”بھگڑا بھائیوں میں ہے اور یوں غائب ہو کر سزا سب کو دے رہا ہے۔ کسی جذباتی

حرکت ہے ابو!“

”ہاں یہ تو ہے بیٹا، مگر میں اسے جذباتی اور بے وقوف سمجھتا تھا۔ آج اس سے بات کر کے میرا

تاثیر مکمل طور پر تبدیل ہو گیا ہے۔ تیور خود یہاں آیا تھا مگر جس طریقے سے مظہر نے تعزیت کی ہے،

مجھے لگتا ہی نہیں کہ وہ یہاں نہیں آیا۔“ ابو کہہ رہے تھے، ”اور تو اور بتا رہا تھا کہ وہ جنازے میں بھی

شامل تھا مگر مصلحتاً مجھ سے ملاقات نہیں کی۔“

ابو کی بات پر مجھے حیرت ہوئی کہ مظہر نے کیسی بے وقوفی کی۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اسے

جانتے ہیں، اور کوئی پہچان کر تیور کو اطلاع کر دیتا تو؟ پھر خود ہی اپنی بات پر دل میں ہنسی آئی کہ کسی

کو بھلا کیا معلوم کہ تیور اپنے ہی سگے بھائی کی بوسہ لگتا پھر رہا ہے۔ فون کی گھنٹی پر میں چونکی۔ ابو نے

فون اٹھا کر سلام کیا اور لائن کی دوسری طرف سے مظہر کی آواز پہچان کر فون مجھے پکڑا دیا۔ مظہر کی

آواز سننے ہی میرا پورا وجود آنکھ بن گیا، آنسو تھے کہ سیلاب کی طرح رواں تھے۔ سلام کے جواب کے بعد میں خاموش تھی، وہ بول رہا تھا، میں کسی بات کا جواب نہ دے رہی تھی، پھر بھی اسے معلوم تھا کہ میں اسے سن رہی تھی اور رو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ وقت زخموں کو مندمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن والدہ کا چہلم آن پہنچا تھا

اور میرے دل کو قرار ہی نہ آ رہا تھا۔ زندگی یوں گزر رہی تھی کہ اس میں ایک لگا بندھا معمول تھا۔

کھانا، نماز، سونا اور رونا..... یہی کر رہی تھی میں۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہ کر گزار دیتی

تھی۔ کبھی بجلی بند ہو جاتی تو کمرے سے نکل کر لان میں چلی جاتی۔ لان میں بیٹھنا والدہ کو کتنا پسند

تھا، اس کے لیے انہیں بجلی بند ہونے کا انتظار کرنے کی عادت نہ تھی۔ اب میں لان میں جاتی تو

مجھے لگتا کہ کسی گوشے میں والدہ بھی کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہوں گی اور مجھے دیکھ کر کہیں گی.....

”ارے واہ ماہا! آج تو لگتا ہے کہ سورج کسی اور طرف سے نکلا ہوگا جو ہماری بیٹی نے جن میں آکر

چمن کی رونق میں اضافہ کر دیا ہے۔“

ٹی وی روم میں ہر گوشے میں ان کی یادیں..... ان کی مخصوص سیٹ، جس کے دائیں طرف

تپائی پر ان کے زیر مطالعہ کتب اور ساتھ ہی ایک نوکری میں ڈھیروں رنگ برنگی اونٹیں اور

سلائیاں۔ انہیں فارغ بیٹھنے کی عادت ہی نہ تھی، تقریباً سارا سال ہی وہ ان اونٹوں اور سلائوں سے

کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھیں، ٹوپیاں، سویٹر، موزے، سکارف، دستانے اور جانے کیا کچھ۔ ابو کے

لیے، ہمارے لیے اور اپنے نواسوں اور نواسیوں کے لیے اور کچھ عرصہ سے وہ اپنے آنے والے

پوتے یا پوتی کے لیے بہت سی ننھی ننھی چیزیں بن کر تیار کر چکی تھیں۔ جب میں ان چیزوں کو دیکھتی تو

اندازہ ہوتا کہ کیسی حسرت لے کر وہ دنیا سے گئی ہوں گی۔ جس کی آمد کی وہ تیاریاں زور و شور سے

کر رہی تھیں، وہ غنچہ کھل کر پھول بن نہ بن سکا تھا۔

کبھی ہم کھانا کھاتے ہوئے اچانک والدہ کی کرسی کی طرف دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ ابو

کی کرسی کے داہنی طرف کی کرسی پر ہمیشہ والدہ بیٹھتی تھیں۔ بچپن میں شرارت سے اگر ہم میں سے

کوئی والدہ کی کرسی پر بیٹھ جاتا تو وہ ہماری شرارت سمجھ جاتیں، مگر خاموشی سے کوئی اور کرسی

اٹھالاتیں اور والد کی کرسی کے ساتھ ہی کوئی میں وہ کرسی رکھ کر بیٹھ جاتیں۔ ہم اپنی شرارت پر خود ہی شرمندہ ہو جاتے تھے۔ اب وہ کرسی خالی بھی پڑی ہوتی تھی، مگر اس پر کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔

ابو چپاتی کا آخری نوالہ اٹھاتے تو وہ غیر محسوس طریقے سے نئی چپاتی ابو کی پلیٹ میں رکھ دیتی تھیں۔ ان کی طرف سالن کا ڈونگا، سلاڈ اور چٹنی بڑھاتیں، پانی کا گلاس بھر کر رکھتیں اور جب ابو پانی پی لیتے تو اپنے ہاتھوں سے ان کا گلاس پکڑ کر میز پر رکھتیں اور اسے پھر پانی سے بھر دیتیں، میز سے اٹھ کر ابو جب ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف جاتے تو تولیہ پکڑ کر کھڑی رہتیں اور ابو کے ہاتھ خشک کرنے کے بعد وہ اپنے ہاتھ دھوتیں۔ بسا اوقات ہم بہن بھائی والدہ سے کہتے تھے کہ وہ ابو سے بچوں کی طرح برتاؤ کرتی ہیں، وقت پر ابو کی ہر چیز تیار ہوتی تھی اور ابو کے سامنے رکھی ہوتی تھی۔ لیکن اب احساس ہوتا تھا کہ وہ ابو کی ضروریات اور ان کے کاموں کو کتنی اہمیت دیتی تھیں۔

بن کہے اور بن مانگے ابو کو ہر چیز موقع کے مطابق تیار ملتی تھی۔ ابو کو بھی شاید والدہ کی زندگی میں ان چیزوں کا احساس نہیں ہوتا تھا، لیکن اب انہیں کس قدر کی محسوس ہوتی ہوگی۔ دنیا میں ہر اچھی بیوی اسی طرح شوہر کی دمساز ہوتی ہے، لیکن بہت کم انہیں زندگی میں اس بات کی پذیرائی ملتی ہے۔ ان کی خاموش خدمات کا کوئی اعتراف نہیں کرتا۔ مشین کی طرح دن بھر مصروف رہتی ہیں، پھر بھی ان کا کیا ہوا کوئی کام کسی کو نظر نہیں آتا، شاباش ملنا تو بہت دور کی بات ہے۔

میں نے کبھی والدہ کے ماتھے پر ہل بھی نہیں دیکھا، نہ ہی انہیں کبھی ابو کی خدمت سے غافل دیکھا۔ ممکن ہے کہ ابوان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوں، انہیں بتاتے ہوں کہ وہ ان کے لیے کتنی اہم تھیں۔ لیکن اب والدہ کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے جا چکی تھیں۔ ہم سب کے دامن میں کچھ نہ کچھ تو چھپتاؤں کے پھول ضرور تھے۔ یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ہر اولاد کی طرف سے کسی نہ کسی وجہ سے والدہ ضرور فکر مند رہتی تھیں۔ کاش وہ ہم سب کی طرف سے مطمئن ہو کر دنیا سے جاتیں۔ لیکن ایسا کب کسی کی قسمت میں ہوا ہے، کسی کو مکمل جہاں کب ملا ہے؟

میں اور ثانیہ ہی گھر پر ہوتی تھیں، زیادہ تر ہم اپنے کمروں میں مقید رہتیں، میرا کمرہ پھر اوپر سے نیچے آچکا تھا، میں تو اوپر رہنے کی عادی ہو چکی تھی مگر علی بھائی زبردستی میرا سامان نیچے لے

آئے۔ ثانیہ بھی یہی چاہتی تھی میں واپس اس کمرے میں آ جاؤں جو اس نے اپنے آنے والے بچے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ بچے کی غرض سے خریدا گیا تمام سامان ثانیہ نے پیک کر کے اوپر ایک کمرے میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یاد ہے، جب ہم نے اس کمرے سے آپ کا سامان اوپر منتقل کیا تھا تو امی کس قدر ناراض ہوئی تھیں!“ ثانیہ پرانی بات یاد کر رہی تھی۔

”ہاں! والدہ سمجھ رہی تھیں کہ میں ان سے بہت دور چلی گئی ہوں۔“ میں نے ثانیہ کی بات کے جواب میں کہا۔

”وہ بات نہیں تھی ماہاجی!“ ثانیہ نے تردید کی، ”اصل میں یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی ساس اپنی سلطنت میں، اپنی زندگی میں اپنی بہو کی اجارہ داری برداشت نہیں کر سکتی۔“ کیسا بے رحمانہ تجزیہ کر رہی تھی۔

”والدہ بہت بڑے دل اور ظرف کی مالک تھیں ثانیہ!“ میں اپنے لہجے میں غصہ نہ چھپا سکی تھی۔ ”ہر اولاد کو اپنی ماں ایسی ہی لگتی ہے، ہمیں بھی!“ وہ اسی لہجے میں بولی، ”لیکن ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بھابی کو بھی ہماری ماں ایسی ہی لگے گی یا بھابی کے لیے بھی ہماری امی اتنی ہی شفیق ہوں گی، جتنی ہمارے لیے ہیں۔ اصل میں ماہاجی! ساس، بہو کا رشتہ ہے ہی ایسا نازک کہ ”اس کا نام ہی کافی ہے!“ لیکن وہ بات کو یوں اشتہار کے انداز میں کر رہی تھی جیسے مذاق سے بات کر رہی ہو۔ اس کی ایسی بے وقوفانہ باتوں کے جواب میں دیر تک ایک غیر ضروری اور گرما گرم بحث چل سکتی تھی۔ کیونکہ اب مجھے یہ خوف بھی نہ رہا تھا کہ والدہ سن لیں گی تو پریشان ہوں گی، مگر میں نے خاموش رہنا بہتر خیال کیا۔ ”کافی دنوں سے آپ کی سرال سے کوئی نہیں آیا؟“ ثانیہ نے بات بدلی۔ ”آئے تو تھے سب لوگ!“ میں نے کہا، ”اور فون پر بھی رابطہ رہتا ہے۔“ حالانکہ میں دل میں خود بھی سوچ رہی تھی کہ کافی دنوں سے امی جان، ماہ رخ، تیمور یا مظہر میں سے کسی کا فون نہ آیا تھا۔ ”اور ویسے بھی وہ میری سرال نہیں رہی۔“

”تو کیا اب وہ آپ کا میکہ بن گیا ہے؟“ وہ طنز سے ہنسی تھی۔

”میرا میکہ تو آپ لوگ ہیں اور ویسے وہ لوگ بھی میکے جیسے ہی ہیں۔ غالب کے بعد اس گھر میں میری حیثیت بیٹی جیسی ہے۔ وہ اپنے ہر معاملے میں میرے مشورے کو اہمیت دیتے ہیں اور میں بھی اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ ان کی مرضی اور مشورے کے بغیر کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔“ میں نے

رسان سے کہا۔

”چالیسویں کے بعد پھر مشورہ کریں ان سے اپنے بارے میں!“

”کس چیز کے متعلق؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جو سوال ہم نے آپ سے کیا تھا.....“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”میں سمجھی نہیں!!“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

”مظہر بھائی کے لیے میری امی نے آپ کی والدہ کے آگے دست سوال دراز کیا تھا۔“ اس

نے وضاحت کی۔

”اوہ! وہ..... اچھا۔“ میں فوراً سمجھ گئی۔

”شکر ہے آپ کو یاد آگیا۔“ وہ ہنسی، ”تو پھر کیا جواب ہے؟ کیا مشورہ ہوا تھا اور کیا فیصلہ؟“

”والدہ کی زندگی نے انہیں مہلت ہی کب دی تھی ثانیہ!“ میں نے مصلحتی خطا انداز میں بات

کی تھی۔ ”نہ ہی میں نے خود سے اس بارے میں کچھ سوچا ہے۔ والدہ کی بیماری اور پھر ان کی

اچانک وفات نے انہیں کسی بھی چیز کی مہلت نہیں دی۔“

”آپ کی طرف سے تو وہ فکر مند رہتی تھیں۔ آپ تھیں بھی تو ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی

اولاد۔“ ثانیہ نے کہا۔

”ٹھیک کہتی ہو، بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ میری پریشانیاں ہی ان کی بیماری اور دل کا اصل سبب

تھیں۔“ میں دل گرفتہ ہونے لگی، ”ان کے بس میں نہ تھا کہ اپنی مرضی سے میرا نصیب

بنائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر ماں باپ خود کو بے بس پاتے ہیں اور بیٹیاں پیدا ہی نہ ہونے کی

دعاں کرتے ہیں۔“

”آپ اس طرح کیوں سوچتی ہیں ماہا!“ ثانیہ نے ہمدردی سے کہا، ”امی کے مرض کی شدت

میں ہو سکتا ہے کہ اضافہ آپ کی مشکلات کی وجہ سے ہوا ہو، مگر مرض کا سبب تو آپ خود کو مت

سمجھیں۔ بیماری اور تکلیف تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی اور میں حیرت سے سن

رہی تھی۔ شاید والدہ کی وفات نے اسے تبدیل کر دیا تھا، ورنہ یہ وہی ثانیہ تھی جس نے اپنے بچے کی

موت کا سبب بھی میری ہی خواست کو قرار دیا تھا۔ جس نے میرے حواس پر اتنی کاری ضرب لگائی تھی

کہ میں بری طرح دکھی ہو گئی تھی۔

وہی ثانیہ جو خواب میں بھی وہ سب کچھ نہ دیکھ سکتی تھی، جو اسے قسمت اور میری کوششوں سے

نصیب ہو گیا تھا۔ ان کے گھر کی غربت اور کٹھن حالات سے نکلنے میں قدرت نے مجھے وسیلہ بنایا تھا

اور وہ مجھے مخوس سمجھتی تھی۔ اس دن کے بعد سے مصلحت یا پھر اپنی طبیعت کے باعث اگرچہ میں اس

کے ساتھ عام طریقے سے بات کرتی تھی اور کبھی جلتا تو تک نہ تھی کہ میں نے اس کی ساری باتیں

سن لی تھیں، لیکن میرے دل میں اس کی طرف سے میل آ گیا تھا۔ ثانیہ کی ایسی سوچ سیکھنے آئی اور

مظہر علی کو بھی ناپسند تھی، وہ لوگ دل سے میرے مشکور تھے اور اپنی محنت کے ساتھ ثانیہ کا رویہ ان کے

لیے ناقابل فہم اور ناقابل برداشت تھا۔ اب اسی ثانیہ کے منہ سے مجھے یہ الفاظ سن کر حیرت نہ ہوتی

تو کیا ہوتا؟ ”تو پھر ماہا جی؟“ اس نے لٹکا لٹکا کر فقرہ چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

”علی بھائی نے والدہ کے چالیسویں کی اطلاع سب کو کر دی ہے یا نہیں؟“ میں نے بات بدلی۔

”سٹ کے مطابق انہوں نے ٹیلی فون کر کے سب کو بتا دیا تھا۔“ ثانیہ بولتے بولتے چونکی۔

”ارے ہاں یاد آیا، میں بتانا ہی بھول گئی تھی۔ علی نے جب آپ کی سرسرا..... میرا مطلب ہے کہ

تیور بھائی کے گھر فون کیا تو وہاں سے کسی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ اور علی کے پاس مظہر اور تیور

بھائی کے موبائل نمبر نہیں تھے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو خود انہیں بتاویں یا پھر فون نمبر دے دیں تو

علی کال کر لیں گے۔“

”میں کال کر کے بتا دوں گی!“ میں نے کہنے کو تو ثانیہ کو کہہ دیا تھا، مگر دل ہی دل میں حیران

اور پریشان بھی ہو رہی تھی کہ امی جان کہاں جاسکتی تھیں۔ سوچ سوچ کر کوئی راستہ بھائی نہ دیا تو

تیور کے نمبر پر کال کرنے لگی لیکن نمبر بند تھا۔ مظہر کا فون یوں بھی مستقل بند ہی رہتا تھا۔ میں نے

بھی تو اتنے دنوں سے رابطہ نہ کیا تھا مجھے اپنی غفلت پر بھی افسوس ہوا اور اس کے ازالے کے لیے

میں نے خود وہاں جانے کا سوچا۔ علی بھائی کو کال کر کے ان سے ڈرائیور اور گاڑی منگوائی۔ عموامیں

اجتناب ہی کرتی تھی کہ میرے وجود سے کسی کو کسی بھی قسم کی تکلیف نہ ہو مگر بحالت مجبوری مجھے اس

کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آ رہا تھا۔

جونہی گاڑی گیٹ کی طرف مڑی، گیٹ کے باہر لگا ہوا بڑا سا تالا مجھے اپنا منہ چڑاتا ہوا نظر آ رہا

تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور ڈرائیور کو گاڑی واپس موڑنے کو کہا۔ میں سمجھی کہ امی جان کی طبیعت

ناساز نہ ہو لیکن وہاں تو امی جان تھیں ہی نہیں۔ تیور کا موبائل فون شاید بند تھا اور سوئے اتفاق اس

کے پاس گھر پر کوئی ٹیلی فون نہ تھا۔ یکدم مجھے ماہ رخ کے فون کا خیال آیا اور میں نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ چار پانچ گھنٹیاں بچیں اور کسی نے فون اٹھالیا۔ تیمور کی آواز سنتے ہی جیسے میری جان میں آجان آئی۔ ”وعلیکم السلام!“ میں نے کہا، ”شکر ہے کہ تمہاری آواز سننے کو ملی۔“

”کیسی ہیں آپ؟“ اس کی آواز سے شگفتگی مفقود تھی۔

”میں تو ٹھیک ہوں، تم لوگ کیسے ہو؟ امی جان کہاں ہیں اور تم اپنا فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟“ میں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”ٹھیک ہیں ہم لوگ بھی۔ امی جان میرے پاس ہی ہیں۔ بس بہت سی باتیں ہیں اور بہت سی پریشانیاں ہیں۔“ اس کے لہجے میں کچھ غیر معمولی تھا، ورنہ وہ اس طرح کبھی بات نہ کرتا۔

”کچھ نہ کچھ غلط ہے تیمور! ماہ رخ تو ٹھیک ہے نا؟“ میں اپنا اندیشہ زبان پر لے آئی۔

”ٹھیک ہی ہوگی.....“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کیا مطلب ہے اس بات کا؟ وہ کہاں ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”ساری باتیں فون پر نہیں بتا سکتا.....“ تیمور نے کہا، ”کبھی لاہور آیا تو بات ہوگی۔“

”پھر بھی تیمور کچھ تو بتاؤ، مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

”آپ ریلیکس رہیں۔ صرف مجھے پریشان ہونے دیں کیونکہ میں اپنے کیے کو بھگت رہا ہوں۔ اگر میں ایسا بے وقوف نہ ہوتا تو یہ ڈھول ہی اپنے گلے میں نہ ڈالتا۔ پھر بھی میں نے بہت کوشش کی کہ اس سے گزرا کر لوں۔ مگر وہ تمام سرحدیں پار کر گئی ہے.....“

”میں سمجھی نہیں کچھ؟“ میرا دل کسی انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔

”وہ اپنے والدین کے ہاں چلی گئی ہے.....“ تیمور نے بتایا، ”اس سے قبل وہ اپنی حماقت کی وجہ سے دس دن یہاں ہسپتال میں داخل رہی ہے.....“

”اوہ میرے خدا یا!“ میں گھبرا گئی، ”ہوا کیا تھا.....“

”باقی تفصیل ملاقات پر.....“ تیمور نے کہا، ”میں اور امی جان کل لاہور آ رہے ہیں.....“

”ارے ہاں میں بار بار کال اسی لیے کر رہی تھی کہ والدہ کا چہلم ہے اور.....“ میں ہنسی،

”لیکن تم اور امی جان کیوں لاہور آ رہے ہو اور مظہر؟“

”تین دن کے بعد نکلتے بچوں سمیت پاکستان آ رہی ہے۔“ اس کا کہنا تھا کہ میرے سر پر

دھماکے ہونے لگے۔

”وہ کیوں آ رہی ہے؟“ میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”امی جان کا خیال تو یہی ہے کہ ماہ رخ کے اپنے میکے جانے کی وجہ سے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ اجازت بھائی شاید ایسی بے وقوفانہ سوچ نہ رکھتے ہوں۔“ تیمور جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”تم نے بھی تو ان کی بہن کو میکے بھیج ہی دیا ہے ناں، جانے کیا وجہ ہوئی ہے کہ معاملہ اس حد تک بگڑ گیا ہے۔“ میں نے انگریزی میں کہا کیونکہ ڈرائیور کے سامنے میں کھل کر بات بھی نہ کر سکتی تھی۔

”وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور اس کی امی خود آ کر اس کو لے کر گئی ہیں.....“ تیمور غصے میں آنے لگا، ”ساتھ ہی وہ امی جان کے ساتھ خواہ مخواہ میں بدتمیزی بھی کر کے گئی ہے۔“

میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ میں اسی وقت اڑ کر سیالکوٹ پہنچ جاتی۔ کبھی کچھ خیال آ رہا تھا۔ کبھی کچھ۔ جانے امی جان کے ساتھ اس کی کوئی اونچ نیچ ہوگئی تھی، کیونکہ امی جان اس سے جلد ہی غصے میں آ جاتی تھیں۔ ”لیکن وہ ہسپتال کیوں رہی تھی؟“ خیال آتے ہی کئی طرح کے واسطے ذہن میں آ رہے تھے لیکن یقیناً واثق تھا کہ اس نے اپنے ہونے والے بچے کے سلسلہ میں ہی کوئی بے وقوفی کی ہوگی۔ ”میں نے تو ماہ رخ کا نمبر ڈائل کیا تھا..... تو پھر اس کا فون تیمور کے پاس کیوں ہے؟“ پھر مجھے سوچ آئی۔ ایک دفعہ تو سوچا کہ ماہ رخ کے والدین کے گھر فون کر کے صورتحال کی تفصیل پوچھوں، لیکن وہ تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہوتی، انہیں والدہ کے چہلم پر بلانے کا سوچا اور پھر اپنا خیال خود ہی مسترد کر دیا۔

انہی تفکرات میں واپس گھر پہنچ گئی تھی۔ ثانیہ نے مجھ سے حیرت سے پوچھا بھی کہ میں اتنی جلد کیسے لوٹ آئی تھی۔ میں نے اسے مختصر بتایا تھا کہ امی جان سیالکوٹ گئی ہوئی تھیں اور گھر پر تالا تھا۔

”تو آپ کے پاس تو چابیاں ہوں گی؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”میں بھلا بند گھر کھول کر، اندر جا کر کیا کرتی ثانیہ؟“ میں نے اسے جواب دیا۔ لیکن دراصل

میں تالا دیکھ کر ایسی شپٹائی تھی کہ میرے ذہن میں سے یہ بات نکل ہی گئی تھی۔

نماز پڑھ رہی تھی کہ میرے فون پر کوئی پیغام آیا، تھوڑی دیر کے بعد ایک اور پیغام اور میرے



سلام پھیر کر دعا مانگ کر فارغ ہونے تک چار پیغام آچکے تھے۔ میں نے جاء نماز سمیٹی اور پرس سے اپنا فون نکالا۔ سکرین پر چار پیغامات کی اطلاع جگمگاری تھی۔

”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”گھر سے باہر کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”کسی کو اس بات کی خبر نہ ہو!“

”میرے پیغام کا جلد جواب دیں، میں فون آف کرنے والا ہوں۔“

وہ پیغامات مظہر کے تھے۔ میں نے جلدی سے جواب لکھا کہ میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اس سے پوچھا کہ وہ کب اور کہاں ملاقات مناسب سمجھتا تھا اور یہ کہ سب خیریت تو تھی ناں!!! ”میں پھر آپ سے رابطہ کر کے آپ کو تفصیل بتاؤں گا۔“ اس نے آخری پیغام بھیجا اور غالباً اس کے بعد فون بند کر دیا۔ اسے غالباً نہیں یقیناً علم تھا کہ اس کا فون ٹیپ ہو رہا تھا اور جب وہ آن ہوتا تھا تو اس کی جگہ کا اندازہ کرنا آسان تھا۔ میں ایک بار پھر کش کش میں جتلا ہو گئی تھی۔

والدہ کے چالیسویں پر قریبی لوگوں کو اطلاع کی گئی تھی، سو تقریباً سبھی قریبی عزیز موجود تھے۔ مجھے خود پرسب کی ترس بھری نظریں محسوس ہوتی تھیں۔ ایسے ناخوشگوار وقت کا شامیرے لیے سب سے مشکل ہوتا تھا۔ میں اپنی سی کوشش کرتی تھی کہ لوگوں کے ترس بھرے فغروں کی زد سے محفوظ رہوں۔ باتیں تو وہ کرتے ہی ہوں گے لیکن میرے کانوں میں تو نہ پڑیں اور میں خواہ مخواہ کی اذیت سے محفوظ رہوں۔

تیور اور امی جان نے جاتے ہوئے بے حد اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ چلوں، لیکن میرے لیے یوں چلے جانا ممکن بھی نہ تھا کہ گھر پر ساری بہنیں ایک رات کے لیے قیام کر رہی تھیں۔ میں نے اگلے دو تین روز میں ہی ان سے آنے کا وعدہ کر لیا۔ گاڑی کے قریب کھڑے ہو کر جب میں الوداع کہہ رہی تھی تو تیور نے مجھے خاص طور پر تاکید کی کہ آئندہ جب بھی مظہر کا فون آئے تو ایک تو اسے طویل کرنے کی کوشش کروں اور ہو سکے تو اس سے یہ پوچھنے کی کوشش کروں کہ وہ کہاں ہے اور جونہی وہ کچھ بتائے، میں دوسرے فون سے تیور کو فوراً اطلاع کر دوں۔

تیور سے تو میں نے وعدہ کر لیا تھا لیکن ایک بے چینی رگوں میں ابھو کی طرح دوڑنے لگی تھی۔ تیور مجھے چار بار بنا کر مظہر کو اپنے دام میں پھنسانا چاہ رہا تھا۔ مجھے تو وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک بار مظہر کو سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ اس پر خطر راہ کو چھوڑ دے، لیکن نہ معلوم اصل میں اس کا کیا ارادہ ہو۔ ممکن ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کر کے تعریفی اسناد وصول کرنا چاہتا ہو کہ کیسا فرض شناس افسر ہے جس نے مادر وطن کے تحفظ کی خاطر اپنے بھائی سے خونی رشتے کی پرواہ بھی نہیں کی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار تیور نے بتایا تھا کہ ان کی تربیت میں وطن کی حفاظت کا جذبہ اس طرح شامل کیا جاتا ہے کہ وطن کی محبت، ہر محبت پر غالب آ جاتی ہے۔ باقی سب رشتے بیچ نظر آتے ہیں تو کیا تیور بھی فرض شناسی کی عینک پہن کر مظہر کو دیکھ رہا تھا اور برادرانہ محبت پر وطن کی محبت غالب آرہی تھی؟

ایسا تو نہیں کہ تیور مظہر کو راستے سے ہٹا کر خود سیاہ و سفید کا مالک بننا چاہ رہا تھا؟ ایک بھائی تو مر کر راستے سے ہٹ گیا تھا اور دوسرے کو وہ خود ہٹا رہا تھا۔ میں نے لاحول پڑھ کر شیطان کو بھگایا جو میرے دماغ میں ایسے دوسو سے ڈال رہا تھا۔ یقیناً یہ شیطان ہی اچھے خاصے رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ میں نے سر جھٹک کر جیسے اپنے دماغ میں آنے والے ان خیالات کا راستہ روکا۔ ”تیور ایسا لالچی نہیں ہے!“ میں نے خود کو سمجھایا۔ نہ ہی غالب ایسے تھے اور نہ مظہر۔ امی جان نے اپنے بچوں کی تربیت میں یہ بات خاص طور پر شامل کی تھی کہ انہیں بڑے سے بڑا لالچ بھی کسی غلط کام پر مجبور نہ کر سکتا تھا۔ ”تو پھر مظہر کو کون سا لالچ دیا گیا ہوگا؟“ میں نے حیرت سے سوچا۔

علی بھائی کی سسرال والوں کی جانے سے قبل علی بھائی اور ثانیہ کے ساتھ بند کرے کی ملاقات ایسا سوالیہ نشان تھا جو ہم بہنوں کی آنکھوں میں صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ جانے کون سا اہم کام تھا جسے اسی روز انجام دینا ضروری تھا۔ اپنے سسرال والوں کی روانگی کے بعد علی بھائی ہمارے پاس ہی آ بیٹھے تھے۔

”چائے کون کون پئے گا؟“ ثانیہ نے لاؤنج میں آ کر سوال کیا۔

”سب کے لیے بناؤ!“ علی بھائی نے ہم سب کی خاموشی سے کوئی مطلب اخذ کرتے ہوئے

کہا تھا۔ ہم پھر بھی خاموش رہیں تو ثانیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے باورچی خانے کی راہ لی۔

”کیا بات ہے، آپ سب ہمیں کیوں غیر معمولی طور پر چپ ہیں؟“ علی بھائی نے عائشہ آپی کے پاس بیٹھتے ہوئے ہم سب سے پوچھا۔

”نہیں تو!!“ صدف آپی بولیں، ”یونہی تسبیح وغیرہ پڑھ رہی ہیں اور وہ تو خاموشی سے ہی پڑھی جاتی ہے ناں!“

”کیا پڑھ رہی ہیں؟“ علی بھائی نے شماروں سے اپنی مٹھی بھر کر صدف آپی سے سوال کیا۔  
”میں تو درود شریف پڑھ رہی ہوں!“ صدف آپی نے کہا، ”باقی بھی ہر کوئی اپنی مرضی سے کچھ نہ کچھ پڑھ رہا ہے۔“

”کس وقت فارغ ہوں گی آپ؟“ علی بھائی نے سوال کیا۔

”کوئی کام ہے کیا؟“ صدف آپی نے پوچھا۔

”آپ سے کوئی بات کرنی ہے!“

”کہو، کیا بات ہے؟“ صدف آپی متوجہ ہو کر بیٹھ گئیں۔

”یوں نہیں“ علی بھائی شپٹا گئے، ”اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“ صدف آپی حیران ہوئیں، ”جو اکیلے میں کرنا چاہتے ہو؟“

”آپ اور ابو.....“ علی بھائی بولے، ”آپ دونوں سے بات کرنی ہے۔“

”ابو تو اس وقت ذرا تھک کر لیٹے ہیں، ان سے بات کرنے کے لیے تو شام کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ صدف آپی نے علی بھائی سے کہا۔

”کوئی ایسی جلدی بھی نہیں ہے..... میں شام تک انتظار کر سکتا ہوں۔“ کہہ کر علی بھائی شماروں سے کھیلنے لگے۔

رات میں اور صدف آپی ایک ہی کمرے میں تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد ابو کے کمرے میں ایک طویل کانفرنس ہوئی تھی، مجھے علم تھا کہ صدف آپی خود ہی مجھے بتائیں گی پھر بھی تجسس کے مارے سر بھاری ہو رہا تھا۔ ”ماہا! سو گئی ہو کیا؟“ صدف آپی کی آواز آئی۔

”کوشش کر رہی ہوں آپی!“ میں نے کروٹ بدلی۔

”تم سے ایک بات پوچھنا تھی؟“

”جی آپی؟“ میں نے سوال کیا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ ثانیہ کے بھائی مظہر علی کے لیے تمہارا رشتہ آیا ہوا ہے؟“

”ہوں!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”ہوں کیا؟“ صدف آپی کچھ سمجھی نہ تھیں۔

”جی مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”والدہ کو بھی علم تھا کیا؟“ وہ حیرت سے گویا ہوئیں۔

”جی انہی سے بات کی تھی سیکندہ آنٹی نے۔“ میں نے ان کی حیرت میں مزید اضافہ کیا۔

”حیرت ہے۔“ وہ بولیں، ”اتنی بڑی بات اور والدہ نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا؟“

”ان کی زندگی نے انہیں مہلت ہی نہیں دی صدف آپی!“ میں نے والدہ کی صفائی پیش کی۔

”لیکن سیکندہ آنٹی تو کہہ رہی تھیں کہ کئی ماہ ہو گئے ہیں انہیں یہ سوال کیسے ہوئے۔“ صدف آپی نے پوچھا تو میں خاموش رہی۔

”کیا وہ جھوٹ بول رہی ہیں؟“ تھوڑے تو قف سے وہ بولیں۔

”مجھے تو یاد بھی نہیں آپی کہ انہوں نے کب بات کی تھی۔“ میں نے سچائی سے کہا۔

”اب انہوں نے اپنا درست سوال پھر دراز کیا ہے اور خصوصاً مجھ پر زور دیا ہے کہ والدہ کی

وفات کے بعد یہ میری ذمہ داری ہے کہ تمہاری زندگی کی بابت کوئی فیصلہ کروں۔“ صدف آپی کہنے لگیں، ”اور میں تو خود حیران ہوں، اس بات پر، انہیں بھلا کیا جواب دوں؟“

”کس بات پر حیران ہیں آپ؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہی کہ“ وہ رکیں، ”ان کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تمہارا رشتہ مانگیں۔ اپنی حیثیت اور

اوقات دیکھ کر ہی بات کرنا مناسب ہوتا ہے۔“

”کیا ہوا ان کی حیثیت کو؟“ میں نے سوال کیا۔

”تو گویا تمہیں کوئی اعتراض نہیں اس رشتے پر؟“ صدف آپی نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے؟“ میں شپٹائی۔

”تم خود کو بہت ٹھنڈ سمجھتی ہو، لیکن میں ان کی تمام اصلیت جانتی ہوں۔ مجھ سے ان کا غربت

سے امارت کا سفر چھپا ہوا ہے، نہ تمہاری نوازشوں کی بارشیں۔“ صدف آپنی کی بات پر میرا ذہن اڑ گیا۔ ”کیا تم یہ سب اس وجہ سے کرتی رہی ہو کہ تم مظہر علی سے محبت کرنے لگی تھیں، افسانوں اور ڈراموں کی طرح؟“ میں کچھ بول ہی نہ سکی۔ ”تمہیں نہ ان لوگوں کی مکاری نظر آئی، نہ شکاری اور چالاک۔ وہ لوگ تمہیں اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے اور تم اپنی سادگی میں انہیں مخلص سمجھتی رہیں۔“ صدف آپنی غصے سے بولیں۔

”میں تو صرف انسانی ہمدردی.....“ میں ممانکی۔

”انسانی ہمدردی کیا؟ دنیا بھری پڑی ہے مستحقین سے، تمہیں ساری ہمدردی کے لیے یہی لوگ نظر آئے تھے۔ اس طرح کے لوگوں کو تو صرف زکوٰۃ خیرات دے دینا کافی ہوتا ہے، تمہاری بے وقوفیوں نے تو انہیں جہنمی اور جسمانی طور پر ہم لوگوں پر مسلط کر دیا ہے۔ تم نے کیا ٹھیکہ لے رکھا تھا ان کی زندگیاں سدھارنے کا؟ کس نے کہا تم سے کہ تم ان کے روزگار، کاروبار، گھر اور رشتوں کے لیے بھی فکر مند ہو؟ کیا اتنا ہی تمہارے سر پر مظہر علی کے عشق کا جادو چڑھ گیا تھا؟“ صدف آپنی غصے سے بولتی جاری تھیں اور میں اپنا اندر ٹٹول رہی تھی کہ وہ کتنی سچائیاں پیش کر رہی تھیں۔ واقعی مجھے اس خاندان کی ہمدردی میں اتنی انتہا پر جانے کی کیا ضرورت تھی کہ لوگ مجھے جھٹلی سمجھنے لگیں۔

کیوں مجھے اتنی فکر تھی ان کی؟ اور بھی تو دنیا میں بہت سے نادار، مظلوم اور سفید پوش بھرے پڑے ہیں۔ ”کیا میں واقعی مظہر علی سے محبت کرنے لگی ہوں؟“ خود سے میں نے یہ سوال کیا۔ ”کیا میں جسے ان کا خلوص اور تشکر سمجھتی رہی، وہ ان کی مکاری تھی؟ کیا مظہر علی نے میری سادگی سے فائدہ اٹھایا تھا؟ کیا آٹنی سیکنہ نے اس لیے مجھے بیٹی کہا تھا کہ میرے ذریعے اپنی بیٹیوں کا مقدر سنورنا نظر آ رہا تھا۔“ میری آنکھوں کے سامنے پڑے پردے ایک ایک کر کے ہٹ رہے تھے۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے صدف آپنی!“ میں آہستہ سے بولی، ”وہ لوگ ایسے نہیں ہیں اور نہ ہی میرا مظہر علی سے ایسا کوئی تعلق ہے۔ وہ لوگ حالات کے ستارے ہوئے.....“

”بس جو کوئی تم سے ہمدردی بنور نے کو غلط سلط کہہ دے تم اسی کو سچ مان لیا کرو۔ جانے تمہیں کب عقل آئے گی۔ گھر میں چھوٹی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم زندگی بھر چھوٹی ہی بنی رہو۔“ صدف آپنی نے مجھے ڈانٹا۔

”مجھے تو میرے حالات نے تھوڑے ہی عرصہ میں اتنا پختہ کر دیا ہے آپنی کہ میں نے کبھی خود کو

چھوٹا سمجھا ہی نہیں۔ اپنے گھر میں چھوٹی تھی مگر سسرال میں بڑی بہو اور پھر غالب کی وفات کے بعد میرا کردار گھر کے سربراہ کا سا رہا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو میری آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ ”دیکھا! بات بے بات تمہارے آنسو پلکوں سے ٹپکنے لگتے ہیں۔“ صدف آپنی اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھیں اور اپنی انگلیوں سے میرا سر سہلانے لگیں۔

”حقیقت ہے آپنی کہ جن حالات سے میں گزری ہوں یا جو آزمائشیں میرے لیے میرے اللہ نے زندگی میں رکھی ہیں، ان پر یا تو ہر روز رو کر گزارا کیا جاسکتا تھا یا پھر اپنا دل پتھر کر کے اور میں نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی میں کسی کے سامنے روئی نہیں، اپنی تعلیمی قابلیت بڑھائی، کاروبار سنبھالا، گھریبا بھی سنبھالا اور خود کمزور پڑنے کی بجائے ان سب کا سہارا بن گئی۔“ میرا لہجہ بھیجا ہوا تھا۔

”سوری! ماہا میری جان!“ صدف آپنی نے مجھے ساتھ لگالیا، ”مجھے بس یونہی غصہ آ گیا تھا۔ میں کبھی کہ تم مظہر علی کے ساتھ..... میرا مطلب ہے مجھے تم سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہ تھی۔“ اگر اس بات میں صداقت بھی ہو تو اس میں کیا مضاائقہ نظر آتا ہے آپ کو آپنی؟“ میں نے سوال کیا۔

”بس یونہی مجھے یہ لوگ خود غرض اور لالچی سے لگتے ہیں، وہ ہیں نہیں جو نظر آتے ہیں۔“ ”ایسی بات نہیں ہے، حالات نے مجھے بھی انسانوں کی تھوڑی سی جانچ سکھا دی ہے، وہ لوگ سادہ دل اور مخلص ہیں۔ حالات تو آپنی کسی کے بھی اور کسی بھی وقت خراب ہو سکتے ہیں۔“ میں نے زور دے کر کہا، ”ہمیں کیا معلوم ہوتا ہے کہ اگلے لمحہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

”تم جسے بہت اچھا سمجھ کر بھابی بنا کر لائی ہو، اس کا ذہن اور ظرف پر کبھی غور کیا تم نے؟“ صدف آپنی پھر ناراض ہونے لگیں، ”سب سے پوچھتی ہے کہ کتنی روٹیاں کھائیں گے، تاکہ فالتو روٹی نہ بنے، فرج میں رکھی ڈبل روٹی کے سلاکس کتنی ہے کہ صبح ناشتے میں دو دو سلاکس سب کے لیے ہوں گے یا کہ نہیں؟ چائے دم کرتی ہے تو کبھی ایک بوند بھی فالتو نہیں ہوتی کہ کسی کو اور طلب ہو تو؟“

”ہمارا ہی فائدہ ہے اس میں آپنی کہ رزق کا زیاں نہیں کرتی.....“ میں نے نکتہ اٹھایا۔ ”بس اس کی ساری عقل مندی اور فراست رزق کے معاملہ پر ہی ختم ہو جاتی ہے، باقی اللوں

تتلوں میں تو وہ خوب پیسہ لٹاتی ہے، جیسے اس کے اماں باوانے دے کر بھیجا ہو۔“ صدف آپنی نے فوراً اعتراض کیا۔

”بس آپنی! بس کریں، آپ کو یاد ہے کہ والدہ کہتی تھیں کہ ہمیں اس کو گھر کی بڑی بہو کی عزت دینا ہے اور اس پر خواہ مخواہ میں اعتراضات نہ کریں۔ آپ تو بالکل روایتی نند بن گئی ہیں۔“

”میں اس کا سارا پس منظر جانتے ہوئے بھی آج تک خاموش رہی ہوں اور یہ راز میرے سینے میں محفوظ ہے، اسی کی عزت کے لیے، لیکن آج تو وہ شاید میرے مقابلے پر آ رہی ہے!“

صدف آپنی نے کہا تو میں شدید حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا آج؟“ میں نے سوال کیا۔

”سیکنڈ آئی نے مجھ سے اور ابو سے اپنا سوال دہرایا اور بتایا کہ اس سے قبل وہ والدہ سے یہ گزارش کر چکی تھیں، مجھے تو یقین ہی نہ آیا کہ انہوں نے یہ بات والدہ سے کی ہو اور والدہ نے مجھ سے بات نہ کی، کیونکہ وہ مجھ سے ہر بات کر لیتی تھیں۔“ صدف آپنی سانس لینے کو رکھیں، ”لیکن جب انہوں نے کہا کہ اب فیصلہ ابو کو اور مجھے کرنا ہے کیونکہ میں بڑی بہن ہوں اور ماں کی حیثیت رکھتی ہوتی.....“

”تو کیا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”محترمہ ثانیہ فرمانے لگیں،“ صدف آپنی کے لہجے میں طنز تھا، ”اس گھر میں ماں کی حیثیت میری ہے، ماہاجی کے لیے بھی اور صدف آپنی کے لیے بھی۔ یہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں اور یہاں ان کی حیثیت ایک مہمان کی سی ہوتی ہے۔ صدف آپنی سے زیادہ مجھے اس گھر میں فیصلوں کا اختیار ہونا چاہئے۔“ اگرچہ حقیقت وہی تھی کہ وہ گھر کی مالکہ بن گئی تھی اور اس گھر کی بیٹیاں مہمان، لیکن پھر بھی اس کا یہ سب کہنا، مجھے سن کر یقین ہی نہ آ رہا تھا، کیسے اس دنیا میں انسان رنگ بدلتا ہے؟

”کہتی تو وہ ٹھیک ہی ہے صدف آپنی!“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”صرف یہی نہیں، بلکہ ان کے مزید ارشادات بھی سنو،“ صدف آپنی بہت غصے میں تھیں، ”کہنے لگی کہ صدف آپنی تو پہلے ہی اپنی بے وقوفی سے ماہا کی زندگی برباد کرنے والی تھیں، وہ تو قسمت اچھی تھی اس کی جو وہ بچ گئی اور شادی سے پہلے ہی معظم کی اصلیت کا انکشاف ہو گیا۔“ میں

حق دق سی صدف آپنی کا منہ دیکھ رہی تھی، وہ چہکوں پہکوں رونے لگیں۔ ”میں نے خود پر اس وقت سے بڑی مشکل سے قابو پایا ہے ماہا، اس نادان عورت نے تو اپنے الفاظ سے اپنی ماں کے سامنے مجھے چھٹی کر کے رکھ دیا ہے۔ دل چاہ رہا تھا کہ میں اسی وقت اٹھ کر اپنے گھر چلی جاتی مگر اپنے باپ کو پریشان نہ کرنے کی خاطر میں برداشت کر گئی۔“ صدف آپنی کی آواز بمشکل نکل رہی تھی۔

”بس یہ زندگی نصف سے زیادہ تو غلط سلط باتوں کو برداشت کرنے میں ہی گزرتی ہے آپنی، ہمیں سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق تو ملتا بھی نہیں ہے.....“ میں نے انہیں تسلی دی، ”اگر وہ بیوقوف ہے تو آپ بڑی ہیں اور سمجھدار ہیں۔“

”بس ماہا! ایک دکھ ہے اور وہ دکھ بسا اوقات زندگی کی ہر خوشی پر محیط ہو جاتا ہے۔ اس دکھ کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ سینے میں ہی نہیں آتا۔“ میں سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ”اس بیوقوف نے تو یہ سب کہہ دیا ہے.....“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں، ”لیکن تم بیوقوف نہیں ہو اس لیے تم نے آج تک یہ سب کہا بھی نہیں۔ میں نے واقعی تمہارے لیے بہت برا کیا، لیکن میرے ضمیر پر یہ بوجھ اس لیے بھی ہے کہ تم نے کبھی مجھ سے شکوہ کیا ہے نہ شکایت اور خاموشی سے اتنا بڑا حادثہ برداشت کر گئیں۔“

”آپ نے میرے ساتھ کچھ برا نہیں کیا صدف آپنی!“ میں نے ان کا ہاتھ تھپکا، ”میری قسمت میں وہ سب لکھا تھا۔ میں خود بھی تو اس کے دھوکے میں آ گئی تھی، لیکن میرے کسی اچھے عمل کا نتیجہ تھا شاید کہ وقت سے پہلے ہی مجھے اس کی اصلیت معلوم ہو گئی۔“

”لیکن اب بھی بچ جانا ماہا! اب کے ان لوگوں پر چڑھے ہوئے خول دیکھ کر دھوکے میں نہ آنا۔“ صدف آپنی نے مجھے خبردار کیا۔

”ثانیہ کا رویہ میرے لیے ناقابل فہم ہے آپنی! لیکن باقی لوگ تو بہت اچھے ہیں۔“ میں نے معافی پیش کی۔

”تو گویا تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کے جال میں پھنسنے کو تیار ہو؟“ صدف آپنی نے حیرت سے سوال کیا۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا آپنی، لیکن وقت کی مٹھی میں میرے لیے کیا بند ہے، اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ ہم تو یونہی قصور وار ٹھہرتے ہیں کہ ہم نے یہ فیصلہ کیا اور وہ فیصلہ کیا.....“ میں

نے سنجیدگی سے بھرپور لہجہ میں کہا، ”فیصلے تو سب اوپر ہو چکے ہوتے ہیں۔“

نہ میری آنکھوں میں نیند تھی، نہ دل میں سکون۔ اور مجھے علم تھا کہ صدف آپنی بھی سونے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں گی۔ ان سے اپنی ”بے عزتی“ ہضم نہ ہو رہی تھی اور میں تو گھر میں رہتے ہوئے ثانیہ کی اس طرح کی کئی باتیں سننے اور برداشت کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ بات تو وہ بظاہر سادہ اور چھوٹی سی ہی کرتی تھی لیکن اس کے معنی و مطالب بہت شدید ہوتے تھے۔ میں نے صدف آپنی کوتاہی دی تھی اور انہیں کئی مثالیں دی تھیں۔ لیکن وہ یہ کہہ کر کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھیں، ”تم نے تو برداشت کرنا ہی ہے، کیونکہ تم نے ہی یہ ڈھول گلے میں باندھا ہے۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں ہے کہ اس کی بیوقوفانہ باتیں برداشت کروں۔ ماں کے باعث میکہ تھا، اب وہ نہیں رہیں تو ہمارا آنا جانا بھی کم کم ہی ہوگا، وہ بھی ابو کی زندگی تک۔“

اور میں سوچ کر رہ گئی تھی کہ واقعی اب آہستہ آہستہ ان سب کا آنا جانا کم ہو جائے گا۔ والدہ کی زندگی میں تو صدف آپنی تقریباً ہر روز آتی تھیں بھلے کھڑے کھڑے دس منٹ کو ہی آتیں اور ان کی وفات سے لے کر چہلم تک کے دنوں میں وہ شاید دو چار دفعہ آتی تھیں۔ وہ سب تو اپنے گھر یا راور اپنے کھیرٹوں والی تھیں، لیکن میں تو اسی در پر پڑی تھی۔ میرا کون سا کوئی اور گھر تھا، جہاں میں کسی بھی طرح کے حالات میں پناہ لیتی۔ حقیقت یہی ہے کہ آدمی تکلیف میں مبتلا ہو تو اسے دوسروں کی ہنسی بھی زہر لگتی ہے۔ مجھے خود اپنی ذات کے تجزیے سے بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی۔

کسی کے سامنے یہ بات بیان تو نہیں کی جاسکتی تھی، لیکن بسا اوقات ثانیہ اور علی بھائی کی آپس میں خوشگوار زندگی دیکھ کر مجھے جو کیفیت محسوس ہوتی تھی، وہ رشک کی نہیں، بلکہ حسد کی ہوتی تھی۔ خود پر ہی میں لاجور تو پڑھتی تھی، لیکن ایسا تو نہیں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، ایک انسان ہوں اور انسان میں ہر طرح کی جبلت موجود ہے۔ حسد کے جذبات بھی انسان کی جبلت کا حصہ ہیں اور یہ بھسم کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حاسد نہ صرف کسی دوسرے کو کہ جس سے وہ حسد کر رہا ہوتا ہے، بلکہ خود کو بھی نقصان پہنچا رہا ہوتا ہے۔ جب بھی کبھی میرے دل میں حسد کی آگ بھڑکنا شروع کرتی، میں ساتھ ہی اس پر توجہ کر کے جیسے پانی کے چھینٹے مارتی اور کبھی دانستہ حسد نہ کیا۔

دل سے دعا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس جوڑی کو سلامت رکھے۔ میرے والدین کے گھر کا چراغ تھا میرا بھائی اور ثانیہ اس کی لوتھی۔ اللہ اسے ہدایت دے اور رہے گھر کے حالات، تو اسے خود کو ان کے مطابق ڈھالنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے مطابق نہ ڈھل سکے اور ہم اس کے مطابق ڈھل جائیں۔

”میرا پیغام نور سے پڑھیں اور سمجھیں۔ میں آپ کو فون کروں گا، فون پر جو گفتگو ہوگی وہ ہوگی تو قدرتی انداز میں مگر وہ سب اداکاری ہوگی۔ اصل میں کیا ہوگا، اس کے لیے آپ پیغامات پر غور کریں۔ میں آپ سے گفتگو کے دوران ہی آپ کو کسی اور موبائل نمبر سے پیغامات ارسال کروں گا، کال ختم ہونے پر آپ پیغامات پڑھ لیں۔“

مظہر کا تفصیلی پیغام تھا۔ میں نے پڑھا اور فوراً مناد دیا۔ خصوصاً یہ بھی چیک کیا کہ کہیں اس میں اس کا کوئی اور پیغام نہ ہو یا میری طرف سے بھیجا گیا کوئی جواب محفوظ نہ ہو۔ ایک دفعہ تو ذہن میں آیا کہ ابو کو شریک راز کروں، مگر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اس کی کال اور پیغام آئے تو پھر کوئی صورتحال واضح ہو، تب ابو کو بتاؤں گی۔ فون کی گھنٹی پر چونک جاتی کہ شاید مظہر کی کال آئی ہو۔ ابونے بلوایا تھا، میں دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو وہ کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑے تھے۔

”السلام علیکم ابو!“ میں نے اندر داخل ہو کر کہا۔

”وعلیکم السلام، آؤ بیٹا.....“ ابو مڑے، ”کیا ہو رہا تھا؟“

”کچھ نہیں ابو، پڑھ رہی تھی کچھ۔“

”کیا پڑھ رہی تھیں؟“ ابو نے مسکرا کر پوچھا۔

”والدہ کے لیے قرآن مجید پڑھ رہی ہوں ابو!“

”انشاء اللہ بیٹا! اچھی اولاد بھی تو والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے

ختمے تمہاری والدہ کے لیے قبول فرمائے.....“ ابو نے کہا۔

”آمین!“ میں نے کہا، ”آپ نے بلوایا تھا ابو؟“

”اوہ ہاں! آؤ بیٹھو بیٹا!“ ابو صوفے پر بیٹھ گئے، میں ان کے نزدیک ہی دوسرے صوفے پر

بیٹھ گئی تو انہوں نے مجھے پاس بلایا۔ ”ادھر آؤ میرے پاس بیٹا! ادھر آکر بیٹھو۔“ میں اٹھ کر ان کے نزدیک بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ”یوں تو یہ باتیں بیٹیوں کے ساتھ مائیں کرتی ہیں بیٹا، لیکن اب چونکہ آپ لوگ اس کی شفقت اور قربت سے محروم ہو چکے ہیں تو اس کی ذمہ داریاں بھی مجھے ہی نبھانی ہیں۔“ ابو کے لہجے میں اتنا دکھ تھا کہ میں اپنی رقت پر قابو نہ پاسکی۔ ان کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑی، انہوں نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر رکھا، ”زندگی میں سب کچھ وہی ہے، وہی گھر ہے، وہی بچے، لیکن ایک تمہاری والدہ کے نہ ہونے سے مجھے لگتا ہے کہ زندگی میں ساری کشش اور ساری دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ جانے میری زندگی کب تک ہے، لیکن اس کی بے ثباتی کا یقین اتنا واضح ہے سارے اہم کام جلد از جلد کر لینا چاہتا ہوں۔“ میں اسی طرح ان کے کندھے پر سر رکھے، خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

”بیٹا مظہر..... مظہر علی کی والدہ نے اپنا سوال دہرایا ہے۔ اس سے قبل انہوں نے تمہاری والدہ سے بات کی تھی، وہ ابھی استخارہ کرنے کا ہی سوچ رہی تھیں کہ ان کی مہلت ختم ہو گئی۔ اب اس فیصلے کی بھاری ذمہ داری تنہا مجھ پر آن پڑی ہے، لیکن میں خود کو تنہا اس لیے نہیں پاتا کہ آپ اس معاملے کی اہم ترین فریق کی حیثیت سے مجھے اس معاملے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں سہولت فراہم کر سکتی ہیں۔“ میں ابو کی بات سمجھ رہی تھی اور مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی کہ انہیں کیا جواب دوں۔

”علی میرا بیٹا، میرا دست راست ہے، لیکن اس معاملے میں وہ مجھے کوئی غیر جانبدار نہ مشورہ اس لیے نہیں دے سکتا کہ اس وقت ایک پلڑے میں اس کی سرال ہے اور دوسرے میں.....“ ابو نے توقف کیا، ”آپ میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہیں ناں بیٹا؟“

”جی ابو!“ میرا سر مزید جھک گیا۔

”آپ خود استخارہ کر لیں بیٹا..... یا جو بھی مناسب سمجھیں، بہنوں سے مشورہ کر لیں، غالب کی والدہ سے، تیمور سے یا جو بھی آپ کو ٹھیک لگے اور خود بھی سوچ سمجھ کر مجھے بتائیں۔ میں نے ثانیہ کی والدہ سے چند دن کی مہلت مانگی ہے۔“ ابو نے گیند میرے کورٹ میں پھینک دی تھی۔

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا تھا، یہ بھی نہ کہہ سکی کہ ابو جو آپ کو مناسب لگے.....

”ارے ہاں یاد آیا بیٹا!“ ابو یکدم چوٹے۔

”جی ابو؟“ میں نے سر اٹھایا۔

”تیمور کی کال آئی تھی، وہ مجھ سے اجازت مانگ رہا تھا کہ آپ کو دو ایک دن کے لیے بھجوادوں.....“ ابو نے کہا، ”میں نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ گاڑی بھجوا رہا ہے..... آپ تیار ہو جائیں۔“

”جی اچھا ابو!“ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے ہاں ایک ضروری بات!“ ابو کے کہنے پر میں چونک کر مڑی، ”موقع مناسب دیکھ کر ان دونوں ماں بیٹے سے اس رشتے کی بابت بات ضرور کریں بیٹا! وہ بھی آپ کی ماں جیسی ہیں، آپ کو کوئی بہتر مشورہ ہی دیں گی۔“ میں بغیر کچھ کہے ابو کے کمرے سے نکل آئی۔

”اس بد بخت نے مجھے مکار بڑھیا اور جانے کیا کیا کچھ کہا..... تمہارے بارے میں غلط باتیں..... غصے میں اپنے پیٹ پر کہنیاں اور کئے مار مار کر اپنی کوکھ ہی اجاڑ ڈالی.....“ امی جان بتا رہی تھیں اور میں ان تمام سنسنی خیز مناظر کا تصور کر کے بھی لرز رہی تھی۔

”میں نے بھلا اس کا کیا لگاؤ؟“ میں نے سوچا، ”یہی سمجھتی ہوگی کہ میں اور تیمور.....“ اس سے آگے تو مجھ سے سوچا بھی نہ جاسکتا تھا۔ ”میرے بارے میں کیا کہتی ہے امی جان؟“ میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ لیا۔

”رہنے دو بیٹا! ایسی باتوں سے سوائے تکلیف کے کسی کو مل بھی کیا سکتا ہے.....“

”پھر بھی؟“ میں نے اصرار کیا۔

”ایک تو یہی کیڑا ہے دماغ میں بیٹا کہ تیمور.....“ امی جان رک گئیں، مجھے بھی اس بارے میں سننے کا شوق نہ تھا۔ ”اور دوسرے وہ چاہتی تھی کہ اس کی بہن ستارہ کے لیے ہم مظہر کا رشتہ بھجوائیں..... مظہر سے بات کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا تھا، یہ تو خیر پرانی بات ہے۔“

”ایسی بری بھی نہیں ہے ستارہ، امی جان!“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”تم نے صرف ماہ رخ کو دیکھا ہے، اس کی ماں کے چلتے نہیں دیکھے۔ غضب خدا کا، وہ ماں ہے یا ڈائن جو اپنی بی بی کا گھر اجاڑ کر خوش ہے۔ کم بخت کہتی ہے کہ اس کی بیٹیوں کو بہت بر ہیں، چاہے آج ماہ رخ طلاق شدہ ہو جائے یا بیوہ.....“

نے اس کا حق ادا کر دیا۔ غالب کی وفات پر میں خود تو تنہا ہوئی لیکن میں نے ان کے گھر، ان کی ماں اور ان کے بہن بھائیوں کو اپنی ذمہ داری سمجھا۔ میں نے اپنی نساوینیت اور اس کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر خود پر ایک مرد کا خول چڑھا لیا۔ میں اپنی قسمت کی دستکوں پر کان بند کیے پڑی رہی۔ میں نے محرم اور نامحرم رشتوں کے حوالے سے بھی بہت باتیں سنیں، منحوس کے القاب بھی برداشت کیے۔ صرف اس لیے امی جان کہ میں اپنے مرحوم شوہر کے گھر کے حالات کو اس بچ پر رکھ سکوں جس پر ان کی زندگی میں ہوتے۔

”میں سب جانتی ہوں بیٹا!“

”میرے لیے تیمور اور مظہر میرے بھائیوں جیسے تھے، چھوٹے بھائیوں جیسے۔ اگر غالب زندہ ہوتے تو کیا تیمور کا فوج میں جانے کا ارمان ادھورا رہتا، یہی سوچ کر میں نے غالب کا رول ادا کیا۔ مظہر تو ابھی تک انگلی پکڑ کر چلنے والا بچہ تھا۔ میری خود غرضی یہ ٹھہری کہ میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا کہ میری والدہ مجھے دیکھ کر دن رات پریشان نہ ہوں، میرے باپ کے کندھے ایک بیوہ بیٹی کی بے بسی کے بوجھ سے نہ جھکیں۔ میں نے اپنا بھی فائدہ سوچا اور آپ کا بھی۔ ہاں یہ میری خود غرضی تھی۔“ میں نے اپنے کندھے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کیا اور چونک گئی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کیں، مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی، مجھے معلوم تھا کہ وہ تیمور ہی ہوگا۔ جانے کس وقت وہ اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آیا تھا، مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس نے میری گفتگو کا کون سا حصہ سن لیا تھا۔

”آپ یہ ردنا بند کر سکتی ہیں؟“ وہ سامنے آ کر صوفے پر بیٹھ گیا، ”اگر آپ نے مشکل ترین حالات کا مقابلہ مردانہ دار کیا ہے تو اب کیوں کمزور پڑ رہی ہیں۔ کیوں عام عورتوں کی طرح آنسو بہا رہی ہیں۔ آسمان کی طرف منہ کر کے تھوکنے والے کے اپنے منہ پر ہی تھوک گرتی ہے۔ کوئی آپ کو کچھ بھی کہہ دے تو کیا ہم اسے سچ مان لیں گے؟ آپ ایسا سمجھتی ہیں، ہمیں؟“

”کاش میں ساری دنیا کو بتا سکوں تیمور کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کہہ دینے سے رشتے نہیں بن جاتے، کم از کم تمہیں تیمور! تمہیں تو میں اپنے بھائی کے سوا کچھ نہیں سمجھتی۔“ میں سسک پڑی۔

”اللہ نہ کرے!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”یہ سب کچھ سنوانے میں اور میری زندگی میں یہ دن لانے کی آدھی ذمہ دار تم ہو ماہا!“ میں ان کا منہ دیکھ رہی تھی، ”نہ تم مجھے اس کٹھن سفر میں ڈالتیں، نہ ہی مجھے ایسے منحوس دن دیکھنا پڑتے۔“ ”یوں نہ کہیں امی جان!“ میں نے انہیں روکا، ”کوئی دن منحوس نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے دن ہیں۔ بس کچھ آزمائشیں ہماری مقصود ہوتی ہیں تو ہمیں دن کٹھن لگنے لگتے ہیں۔“ ”بس اس عمر میں مجھے یہ سب کچھ دیکھنا تھا کہ وہ تم پر گھنیا الزامات لگائے۔“ وہ بات کرتے کرتے آبدیدہ ہو گئیں۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا، جانے اس نے مجھ پر کیا الزام لگایا ہوگا؟ میرے کردار کے حوالے سے کوئی غلط بات کی ہوگی۔ میرے ساتھ میرے بھائیوں جیسے تیمور کا دل بھی دکھایا ہوگا، جانے اس نے مجھے کس جرم کا مرتکب قرار دیا ہوگا۔ میری نظروں میں لکھا سوال امی جان بھانپ گئیں۔

”وہ ایک قفسیہ تو ہے ہی، اس کے دماغ سے اس خناس کو نکالنا تو ممکن ہے ہی نہیں، مجھے تو اس کی سوچ کو الفاظ میں بیان کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اسے تو تمہارا اتنے سال سسرال میں رہنا، خیال رکھنا، کاروبار سنبھالنا، سب خود غرضی لگتا ہے اور سب سے شرمناک الزام تو اس نے یہ لگایا ہے کہ“ امی جان کہتے کہتے رک گئیں۔

”بولیں امی جان! مجھ میں بہت حوصلہ ہے!“ میں نے جی کڑا کے کہا۔

”وہ کہتی ہے کہ تم نے.....“ وہ پھر انک گئیں، میری نظروں میں سوال بھی تھا اور بات کو جاری رکھنے کی التجا بھی، ”تم نے مالی خرد برد کی ہے۔“ ان کا فقرہ مکمل ہونے پر میں نے ایک طویل سانس سینے کی گہرائیوں سے کھینچ کر آزادی، اپنا ہاتھ امی جان کے ہاتھ پر رکھا۔

”آپ تو سب جانتی ہیں امی جان، اور میرا اللہ جانتا ہے، بس مجھے اور کسی کوئی صفائی نہیں دینا ہے۔“ میں نے پوری کوشش کی کہ میری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔

”مجھے خود سے بڑھ کر اور اپنی اولادوں سے بڑھ کر تم پر اعتماد ہے ماہا اور میرے لیے تم نگہت سے بڑھ کر ہو۔“

”جانتی ہوں امی جان!“ میں روکتی رہ گئی اور آنسو بند توڑتے ہوئے میری آنکھوں سے بہہ نکلے، ”آپ نے اگر مجھے نگہت سے بڑھ کر سمجھایا اپنی اولادوں سے بڑھ کر قابل اعتماد سمجھا تو میں

”ایک دفعہ بھابی، وہ ایک دفعہ مجھے مل جائے تو میں کچھ چارہ کروں اسے سمجھانے کا۔“ تیمور مغرب کے بعد لان کر بیٹھ کر چائے پینے کے بہانے سے مجھے باہر لے آیا تھا۔ یہ وقت امی جان کے وظائف کا ہوتا تھا اور اگر ٹی وی لاؤنج میں بھی ہوں تو بات تو ہو سکتی تھی۔ مگر تیمور کو اندازہ تھا کہ امی جان مظہر کی وجہ سے متحسں رہتی تھیں اور بار بار پوچھتی تھیں، ”مظہر کی کوئی خبر؟“ ہمیں یوں مصروف گفتگو دیکھ کر انہیں بھی اندازہ ہو جاتا کہ گفتگو مظہر کے بارے میں ہی تھی۔

”تمہیں بھی اس نے کبھی ٹیلی فون نہیں کیا ماہ؟“ امی جان نے مجھ سے پوچھا۔

”والدہ کی وفات پر ایک دفعہ کیا تھا!“ میں نے مختصر اُ کہا۔

”دوبارہ کبھی فون کرے تو اسے میری طرف سے منت ترلا کرنا پڑے! اسے کہنا ماں بہت دکھی ہے، اس میں حوصلہ نہیں ہے تمہاری جدائی برواشت کرنے کا۔“ کہتے کہتے وہ طول ہو گئیں۔

”اگر کبھی فون کرے گا تو میں اسے سمجھاؤں گی امی جان!“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”تم خود بھی فون کر کے کوشش کرتی رہا کرو۔۔۔۔۔“

”وہ فون نہیں اٹھاتا امی جان!“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”تم کوشش کرتی رہو، مجھے معلوم ہے کہ تمہارا فون وہ کبھی نہ کبھی ضرور اٹھائے گا، وہ مجھ سے اور تیمور سے رابطہ رکھے نہ رکھے، تم سے رابطہ نہیں توڑ سکتا۔۔۔۔۔“ والدہ نے اعتماد سے کہا، ”میں اپنے بیٹے کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ تمہاری بہت عزت کرتا ہے۔“ ان کا اعتماد بالکل درست تھا اور ان کا کہا ہوا ایک ایک حرف حقیقت واقعی مظہر مجھ سے رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ تیمور کی موجودگی میں تو میں انہیں اتنا بھی نہ بتا سکتی تھی کہ اس کا مجھ سے رابطہ تھا اور اگر تنہائی میں بھی انہیں بتاتی تو اس بات کو صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ لینا بہت ضروری تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں اس راز کو راز ہی رکھتی، بات اسی وقت راز میں رہتی ہے جب تک وہ آپ کے اپنے سینے میں ہے، جو نبی آپ یہ امانت کسی اور کو سونپتے ہیں، وہی اس کے فاش ہونے کے امکان کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ وہ آپ کو رابطہ کرنے کی کوشش تو کرتا ہوگا!“ تیمور کے لہجے میں بھی اعتماد تھا۔

”کوشش کرتا ہو تو اس کوشش میں کامیابی بھی ہونی چاہئے۔۔۔۔۔“ میں نے تیمور کی بات ٹالی۔

”آپ کا موبائل فون ہر وقت آپ کے پاس ہی ہوتا ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”ہوں، مگر گھر پر ہوتے ہوئے میرا فون بند رہتا ہے، البتہ باہر جاتے ہوئے ساتھ رکھتی ہوں۔“

”جب میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ آپ سے رابطہ کرے گا تو آپ کو اپنا فون ہر وقت آن رکھنا چاہئے۔“ تیمور نے جھنجھلا کر کہا۔

”مجھے عادت نہیں ہے تیمور! اور اگر اس نے رابطہ کرنا ہوگا تو گھر کے نمبر پر بھی کال کر سکتا ہے۔“ میں نے لاپرواہی کی اداکاری کی۔

”ممکن ہے کہ اسے گھر کا نمبر ہی معلوم نہ ہو؟“ تیمور نے سوال کیا۔

”نہیں وہ اکثر مجھے کال کرتا رہتا تھا، امی جان نے بھی جب بھی بات کرنا ہوتی تھی، وہی فون ملا کر دیتا تھا۔“ میں نے دلیل دی۔

”ڈائری سے دیکھ کر ڈائل کرتا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ زبانی یاد نہ ہو۔“ تیمور نے قیافہ لگایا، ”آج کل سات اعداد کا نمبر ہوتا ہے، یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔“

”میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا، آئندہ فون آن رکھوں گی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”اس وقت فون کہاں ہے آپ کا؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”اندر میرے کمرے میں، میرے پرس میں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”موبائل فون ہوتا کس لیے ہے؟“ اس نے مصنوعی ناراضگی سے پوچھا۔

”سنبھال کر رکھنے کے لیے۔۔۔۔۔“ میں نے ہنس کر کہا، ”اچھا ذرا فون کی بات چھوڑو اور مجھے

بتاؤ کہ ماہ رخ۔۔۔۔۔“

”اس موضوع کو نہ چھیڑیں بھابی! بہت تکلیف دہ موضوع ہے۔“ تیمور کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”بات ہوگی تو کوئی حل نکلے گا ناں!“ میں نے اصرار کیا۔

”کوئی حل نہیں ہے اس مسئلے کا، اب تو لگتا ہے کہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میرا جنون بھی تمام

ہوا۔“ تیمور بولا۔

”شادی بیاہ کوئی کھیل نہیں ہے گڈے اور گڑیا کا کہ لڑ بھگڑ کر گڈے اور گڑیاں واپس

ہو جائیں۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اگر وہ بے وقوف اور نادان ہے تو تم تو ایک

سمجھدار اور ذمہ دار مرد ہو۔“

”یوں تو عورتیں خود کو دنیا کی عقلمند ترین مخلوق ثابت کرنے پر تلی رہتی ہیں، لیکن جب ازدواجی

زندگی میں ان کے رویوں سے زہر گھلتا ہے تو وہ معصوم اور کم عقل ٹھہرائی جاتی ہیں۔“ تیمور نے کہا۔



کرنا..... پلیز“ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”آپ کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں بھابی؟“ اس نے میرے ہاتھ تھام لیے، ”وہ آپ کے بارے میں اتنی گھٹیا سوچ رکھتی ہے اور آپ پھر بھی اس کے بھلے کی بات کرتی ہیں!!“

”وہ سب اس کی بدگمانی ہے تیمور!“ میں نے اپنے ہاتھ چھڑائے، ”وقت اسے کبھی نہ کبھی اپنی بیوقوفیوں کا احساس دلادے گا کہ وقت بہت بڑا استاد ہے، اس نے اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیا ہے۔“

”چلیں آپ کی خوش گمانی بھی دیکھے لیتے ہیں۔“ تیمور نے ہنکارا بھرا۔

نگہت ایئر پورٹ سے سیدھی سسرال گئی تھی۔ امی جان، تیمور اور میں ایئر پورٹ پر ہی اسے مل کر واپس آ گئے تھے، اس نے فون پر بتا دیا تھا کہ وہ وہیں جائے گی۔ اس میں نہ جانے کیا وجہ مضمر تھی، مگر امی جان کو اس بات پر بہت بے چینی تھی اور وہ نگہت پر ناراض ہو رہی تھیں کہ اسے ماں کے گھر آنا چاہئے تھا، ”جیسے ماہ رخ اپنی ماں کے گھٹنے سے لگی بیٹھی ہے۔“

”امی جان! یہ تو اچھی بات ہے اور اس کی سمجھداری ہے۔“ میں نے انہیں سمجھایا، ”اس سے کم از کم یہ بات تو ثابت ہوتی ہے، جو کہ کافی اطمینان بخش بھی ہے کہ نگہت کو اعجاز بھائی نے میکے واپس نہیں بھجوایا۔ ہمارے ذہنوں میں تو یہی خدشہ تھا کہ ماہ رخ کے میکے جانے کی وجہ سے نگہت کو بھی میکے بھجوایا جا رہا ہے۔“

”ہاں یہ بات تو میرے ذہن میں بھی نہیں آئی۔“ امی جان نے پرسوج انداز میں کہا۔

”کبھی ذہن یوں منتشر ہوتا ہے کہ بالکل سامنے کی چیز بھی نظر نہیں آتی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ویسے بھی امی جان!“ تیمور نے مداخلت کی، ”بھابی کی عینک لگالیں تو چیزوں کے ایسے ایسے پوشیدہ رخ نظر آتے ہیں جو عام آدمی کی نظر سے خفیہ ہوتے ہیں!“

”میری عینک!“ میں بوکھلائی، ”میں تو کوئی عینک نہیں لگاتی؟“

”لگاتی تو ہیں!“ تیمور ہنسا، ”اور اس کے شیشوں پر ”سب اچھا“ لکھ رکھا ہے، اسی لیے آپ کو سب اچھا نظر آتا ہے۔“ تیمور کی اس بات پر امی جان بھی ہنس دیں۔

”خود اچھی ہے اور ہر چیز کا روشن پہلو دیکھنے کی عادت ہے، اس لیے اسے سب اچھا نظر آتا

”نگہت اس گھر میں ہے تیمور اور اب اس کے دو بچے بھی ہیں۔“ میں نے پھر کہا، ”اس کی خاطر، اس کے بچوں کی خاطر تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔ ماہ رخ ضدی ہے، مگر تم سے اسے پیار ہے، وہ ضرور آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”یقیناً آپ کا تجربہ زندگی کے بارے میں بہت وسیع ہے، لیکن اس معاملے میں، میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔“

”چلو نہ کرو، مجھے کوئی شوق بھی نہیں تم سے دوٹ لینے کا.....“ میں نے ماحول کا حکم رد کر دیا کرنے کی خاطر کہا۔

”میرا دوٹ تو ہے ہی آپ کے لیے، آپ کو شوق نہ بھی ہو، تو بھی میں آپ کو ہی دوں گا۔“ تیمور نے ہنسنے کی کوشش کی۔

”بس تیمور آج یہ بات کہہ دی ہے ناں! اس کے بعد ایسا نہ کہنا۔“ میں نے تنبیہ کی سے کہا۔

”کیا؟ میں سمجھا نہیں!“ وہ بے اختیار چونکا تھا۔

”بس اب میں آپ لوگوں کی زندگیوں سے نکل جاؤں گی..... آج ماہ رخ میرے بارے میں شکوک کا شکار رہتی ہے، کل کو مظہر کی بیوی آئے گی تو میں اس کی آنکھوں میں بھی کسی نہ کسی وجہ سے کھٹکوں گی۔“ میں اپنے آنسوؤں کو حلق میں گھونٹنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

”اور ہم لوگ کیسے.....“ تیمور نے حیرت سے کہا، ”ہم کیسے اتنے احسان فراموش بن جائیں کہ اس مشکل وقت کو بھول جائیں جب آپ نے ہماری سرپرستی کی، ہمیں سہارا دیا، اس گھر کی پتوار سنبھالی..... کیا ہم یہ سب کچھ بھول جائیں؟؟ صرف اس لیے کہ ہماری بیویوں کے سروں پر جنون سوار ہے۔“

”تیمور پلیز وہ تمہاری بیوی ہے، تمہارے دکھ کھ کی ساتھی۔ تم سے بڑھ کر اس کا کون ہے؟“

”پلیز بھابی! مجھے اس کی صفائیاں نہ دیں، میں اسے بہت کم عرصے میں سمجھ گیا ہوں۔ کڑوی گولی کی طرح وہ میرے حلق میں پھنس گئی ہے۔ جو عورت اپنی اولاد کو، اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے، وہ اپنے شوہر کے ساتھ کس طرح مخلص ہو سکتی ہے؟“ تیمور کے لہجے میں کرب تھا۔

”پھر بھی تیمور!“ میں نے اس کی منت کی، ”کوئی انتہائی اقدام نہ اٹھانا۔ میری خاطر اپنا گھر نہ اجاڑنا۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں، ہر ممکن حد تک برداشت کرنا اور مصالحت کی کوشش

ہے۔“ امی جان نے مجھے ساتھ لپٹا لیا، ”میری بیٹی جیسی نظر، سوچ اور فہم اللہ دنیا کی ہر لڑکی کو عطا کرے۔“  
 ”آمین!“ تیمور نے بلند آواز میں کہا۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی امی جان، پھر مجھے جانا بھی ہے۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”جی بیٹا؟“ تیمور بھی بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا، مگر اس کا دھیان میری بات میں ہی تھا۔

”ابو نے کہا تھا کہ میں آپ سے اور تیمور سے اس معاملے میں مشورہ لوں، والدہ کی وفات کے بعد میرے لیے آپ ہی ایسی بزرگ ہیں جو اس معاملے میں میری راہنمائی کر سکتی ہیں.....“  
 ”کھل کر بات کرو بیٹا؟“ امی جان نے کہا، تیمور نے اخبار اٹھا کر چہرے کے آگے کر لیا تھا، جیسے وہ ہماری باتیں سن ہی نہ رہا ہو، مگر میں جانتی تھی کہ وہ سب کچھ دھیان سے سن رہا ہوگا۔

”مائیکہ کی امی نے، اپنے بیٹے کے لیے، ابو سے بات کی ہے.....“ میں نے رک رک کر فقرہ مکمل کیا۔

”کس چیز کی بات؟“ امی جان نے سوال کیا تو میں گڑبڑا گئی۔

”وہ.....“ میں جھجکی، ”میرے لیے.....“ اور میرا سرا تانا جھکا کہ ٹھوڑی سے جا لگا۔ اخبار کے لپٹنے اور اسے میز پر رکھنے کی آواز آئی۔ میرا پورا بدن آنکھ بن گیا تھا اور مجھے سر جھکا ہونے کے باوجود تیمور حیرت کی زیادتی سے کھڑا ہوتا ہوا نظر آ گیا تھا۔ امی جان خاموش تھیں، مگر یقیناً ان کی نظریں مجھ پر تھیں۔

”یہ وہی لڑکا ہے ناں..... جس پر ترس کھا کر.....“ تیمور کا فقرہ مکمل ہونے سے قبل ہی میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ میری نظروں میں التجا تھی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

”تمہارے ابو کا کیا خیال ہے بیٹا؟“ امی جان نے پوچھا۔

”انہوں نے فیصلے کا اختیار مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے کہا، ”لیکن میں اتنا بڑا فیصلہ خود کیسے کر سکتی ہوں اپنے بارے میں۔ آپ لوگ میرے بڑے ہیں، آپ لوگوں کی سوچ پختہ ہے، نظر بالغ ہے اور ایک عمر کا تجربہ آپ لوگوں کے پاس ہے۔“

”مجھے یہ تجویز بالکل پسند نہیں آئی۔“ تیمور صاف گوئی سے بولا۔

”تیمور!“ امی جان نے اسے سرزنش کی، ”نہ سوچتے ہو، نہ سمجھتے ہو اور ٹھک سے بات کر دیتے

ہو۔ اپنی زندگی میں بھی تم نے ہر فیصلہ جذباتی دباؤ کے تحت کیا ہے اور اب فضول میں اپنی رائے تم اپنے پاس ہی رکھو۔“

”نہیں امی جان! اسے کہنے دیں، میرا بھائی ہے یہ اور اسے پورا اختیار حاصل ہے، میری زندگی کے بارے میں فیصلے پر رائے دینے کا۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”آپ کو کیسا لگتا ہے وہ لڑکا؟“ تیمور نے میرے سامنے بیٹھے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں اسے دیکھتی رہ گئی، کیسا عجیب اور بلا واسطہ سوال کیا تھا اس نے اور میرے کانوں کی لویں تنپنے لگی تھیں۔

”میں اس معاملے میں اتنی عقلمند ہوتی تیمور تو اس ڈاکٹر معظم کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھاتی۔“ میں نے کہا، ”دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت شاید میری صلاحیتیں بہتر کام کرتی ہیں، اپنی زندگی کی بابت سوچتی ہوں تو خود کو ذہنی طور پر مکمل مفلوج پاتی ہوں۔“

”اچھا.....“ تیمور نے لمبی سانس کھینچی، ”چلیں یہ بتائیں کہ آپ کو اس رشتے میں کیا باتیں مثبت نظر آتی ہیں اور کیا منفی؟“

”تیمور تم بچی کو اپنے سوالوں سے پریشان نہ کرو۔“ امی جان نے اسے ڈانٹا۔

”میں بچی نہیں ہوں امی جان۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اس وقت تو بالکل بچی ہی لگ رہی ہو، جو کسی پریشانی کا شکار ہو اور مدد کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو!“ امی جان کا کہنا تھا کہ میں جذباتی ہو کر ان سے لپٹ گئی۔ والدہ مجھے بچی کی طرح سمجھتی تھیں اور کہتی تھیں، ”میری نظر میں تو تم وہ معصوم سی بچی ہی ہو جس نے میری انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔“ اسی لیے امی جان کے بچی کہنے پر میں ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

”روؤ نہیں بیٹا! رونے سے آدمی کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی ساری صلاحیتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ جب کوئی اہم فیصلہ کرنا ہو تو اس وقت رونا یوں بھی بہت کم عقلی ہے کہ اس سے فیصلے کی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔“ امی جان اپنی انگلیوں سے میرے بال سلجھانے لگیں۔

”بس آپ کے ”بچی“ کہنے سے والدہ یاد آ گئی تھیں۔“ میں نے اپنے آنسو پونچھے تھے۔

”اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بہت سمجھدار اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ جس عورت کی بیٹی اتنی کم عمری میں ایسی عقلمند اور ذہین ہو، اس کی اپنی ذہانت اور عقلمندی تو اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔“ امی جان والدہ کی تعریف کر رہی تھیں۔

”واقعی بھابی! آئی بہت سمجھدار اور نفیس خاتون تھیں، میں تو انہیں بہت پسند کرتا تھا۔ ان کے اندر تو محبتوں کے خزانے بھرے ہوئے تھے، سب پر لڑتی تھیں، پھر بھی ختم نہ ہوتے تھے۔“ تیمور والدہ کی تعریف کر رہا تھا، ”بیٹی کی حیثیت سے تو آپ انہیں اور بھی زیادہ جانتی ہوں گی؟“

”میں تمہارا سوال نہیں سمجھی؟“ میں نے حیرت سے تیمور کو دیکھا۔

”آپ کے خیال میں اگر وہ زندہ ہوتیں تو وہ اس معاملے میں کیا فیصلہ کرتیں؟“ اس نے عجیب سا سوال کیا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں، اس بارے میں!“ میں نے مختصر اُ کہا۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ والدہ کی زندگی میں بھی سکینہ آئی نے اس رشتے کی بات کی تھی اور والدہ کے اس معاملے میں کچھ بے معنی سے تحفظات تھے، وہی دھڑلہ اور غربت جیسے جواز۔

”میں ایک سوال پوچھوں بیٹا؟“

”جی امی جان!“

”مجھے یہ بتاؤ!“ امی جان بولیں، ”تمہیں اس رشتے پر کیا اعتراض ہے؟“

”اور تو کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں.....“ میں نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا..... ”لیکن دو ایک باتیں ہیں..... ایک تو شاید اس کی عمر میرے برابر یا شاید مجھ سے کم ہی ہوگی.....“

”یہ تو ایک بے معنی سا اعتراض ہے۔“ امی جان بولیں۔

”دوسرے یہ رشتہ دھڑلہ کا بن جائے گا.....“ میں نے جھجک کر کہا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، علی اور ثانیہ بہت خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔“ اندر کے حالات سے بے خبر امی جان نے کہا۔

”لیکن سب سے اہم اعتراض یہ ہے امی جان.....!“ میں رکی۔

”کیا ہے سب سے اہم اعتراض؟“ تیمور نے بے صبری سے کہا۔

”آپ سب لوگ..... آپ امی جان، تیمور، مظہر، نگہت، ماہ رخ، نوید صاحب، سکینہ آئی، میری بہنیں، بھائی اور جو بھی لوگ حقائق سے آگاہ ہیں، آپ سب لوگ کیا سوچیں گے؟“

”کیوں ہم سب لوگ کیوں کچھ سوچیں گے اور کیا سوچیں گے؟“ امی جان نے حیرت سے کہا۔

”آپ سب لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ میں نے مظہر علی یا اس کے گھر والوں سے جو بھی

ہمدردی کی اور ان کی زندگیوں میں جو بھی مثبت تبدیلیاں لانے کی کوششیں کیں، ان کے پس منظر میں انسانی ہمدردی نہیں بلکہ کوئی اور جذبہ کارفرما تھا۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”ہم کیوں یہ سب سوچیں گے؟“ امی جان نے مجھے ڈانٹا، ”تم اپنی زندگی کو ہمیشہ اندیشوں کی زد میں رہ کر تو نہیں گزار سکتیں۔ اپنی ذات کے لیے فیصلے کرتے وقت انسان کو کبھی کبھار خود غرض اور دوسرے کیا سوچیں گے“ سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔“

”میں شاید ایسا کبھی نہ کر سکوں!“ میں نے وثوق سے کہا۔

”ویسے واقعی بھابی..... میں سوچ رہا ہوں۔“ تیمور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کیا..... کیا سوچ رہے ہو تم اور سوچ کیسے رہے ہو، اس کے لیے تو دماغ کی ضرورت ہوتی ہے!“

”یہ زیادتی ہے بھابی اور میری ذات کی صلاحیتوں پر بلا واسطہ حملہ۔“ وہ چراغ پا ہوا۔

”اچھا چلو بتاؤ تم اپنے دماغ“ سے سوچ کیا رہے تھے؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کیا واقعی اتنا کچھ جو آپ نے مظہر علی اور اس کے گھر والوں کے لیے کیا اس میں صرف

انسانی ہمدردی کا جذبہ ہی محرک تھا؟“ مجھے اس کے مذاق پر حیرت ہوئی، میں نے نظراٹھا کر ایسے دیکھا تو اور بھی حیرت کا شکار ہو گئی، وہ مذاق نہیں کر رہا تھا، اس کی آنکھوں میں سنجیدگی رقم تھی۔

”ماہا! ماہا! ماہا!..... ماما! ماما! ماما! ماما!“ دن بھر میرے کانوں میں یہی آوازیں گونجتی رہتی

ہیں۔ میں گھن چکر بنی گھومتی رہتی ہوں، جیسے کسی گرداب میں پھنس گئی ہوں۔ بچے ماما، ماما کی رٹ

لگاتے ہیں اور ان کے ابا اور دادی ماہا ماہا کی..... مجھے کبھی کبھار یوں لگنے لگتا ہے کہ بچے میرا نام

بلا رہے ہوں یا پھر ان کے ابا اور دادی مجھے ماما کہہ رہے ہوں۔ میں بچوں کی اکلوتی ماما، ان کی دادی

کی لاڈلی بہو اور ان کے ابا کی من چاہی بیگم..... اور کیا چاہئے مجھے اپنے رب سے۔

اس نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ میرا دامن مجھے چھوٹا لگنے لگتا ہے میں نے غالب کی وفات کے

بعد آڑمانٹوں کے آٹھ سال گزارے، بیوگی کی زندگی تو از خود ایک آزمائش ہے، زندگی بھر پل

صراط پر معلق رہنے کا نام ہے۔ میں نے زندگی میں بیوگی کے بارے میں جتنے محاورے سن رکھے

تھے، میں نے ان سب کا سامنا کیا۔ میری بیوگی کو یوں نحوست سمجھا گیا، جیسے میں نے خود اپنے آپ

کو، اپنی خواہش سے بیوہ کیا ہو۔ مجھے اس لیے منحوس کہا گیا ہے کہ میرے سر پر چادر نہ رہی تھی..... میری گود بھرنے سے پہلے ہی اجڑ گئی تھی۔

میں نے اٹھ سالوں میں زندگی کے اتنے اتار چڑھاؤ دیکھے، چہروں کے پیچھے پیچھے چہرے، نقابوں کے نیچے چھپے چہرے، مسکراہٹوں کے پس منظر میں چھپے طنز۔“ اب میں دس سال سے اتنی خوش گوار زندگی گزار رہی ہوں کہ ان ایام کی تلخیاں بھول گئی ہوں۔“ یہ بات میں اکثر اپنے شوہر سے کہتی ہوں، لیکن آپ بتائیں کیا ہمیں وہ تلخیاں بھول جاتی ہیں؟ کیا ہمیں الفاظ کے تیروں کے زخم بھول جاتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں! اچھا وقت ہمیں اس لیے اچھا لگتا ہے کہ ہم اپنے لاشعور میں اس وقت کا مقابلہ اُس گزرے وقت سے کرتے رہتے ہیں، جو ہم پر کھٹن گزرا تھا۔

میں کم سن تھی کہ بیاہی گئی اور ابھی میری گود میں میری اور غالب کے پیار کی نشانی بھی نہ آئی تھی کہ غالب دل کے جان لیوا دورے کے باعث وفات پا گئے اور اسی صدمے میں، میں ان کی نشانی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ زندگی ایک صحرا بن گئی، مجھے یقین تھا کہ میں مرجاؤں گی، لیکن یہ تو میرا رب تھا، میرا خالق تھا، جس نے مجھے کسی مقصد کے تحت پیدا بھی کیا تھا اور پھر زندہ بھی رکھا تھا۔ غالب کی زندگی ہی اتنی تھی، انہیں چلے جانا تھا، لیکن میرے نصیب لکھنے والے نے ان کے ساتھ لکھے، پھر مجھے ان کی محبت کی ڈور سے ایسا باندھا کہ مجھے ان کے جانے کے بعد ان کی ماں اور ان کے بہن بھائی اپنی ذمہ داری محسوس ہوئے۔ چند مہینوں میں ہی مجھے ان سے اتنی اپنائیت ہو گئی کہ وہ مجھے اپنے اپنے سے لگنے لگے۔

ممکن ہے کہ ان میں سے بھی کسی نے خود غرض سمجھا ہو..... وہ کچھ بھی سوچ سکتے تھے..... مگر میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دکھی تھے، میرا اور ان کا دکھ سا نچا تھا اور یہ دکھ کی سانجھ ہی اس تعلق کا باعث بنی تھی۔ مجھے لگتا کہ میں، میں نہیں رہی تھی..... غالب بن گئی تھی۔ میرے وجود میں لطیف نسوانی جذبات تو جیسے ناپید ہو گئے تھے۔ میں نے مردانہ و ارحالات کا مقابلہ کیا۔ حالات خود ہی ہم کمزور عورتوں کو مضبوط بنا دیتے ہیں۔ میرے والدین کی اچھی تربیت اور والدہ کی سوجھ بوجھ نے مجھے وہ اعتماد بخشا تھا کہ بیوہ ہونے کے باوجود کسی میں جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ مجھے ترنوالہ سمجھے۔

زندگی کی گاڑی رواں ہوئی تو اس میں ساتھ ساتھ کئی اسٹیشن آتے گئے، جن پر ٹھہرنا مقصود نہ تھا، سو اپنے غم کو ہی اپنا رفیق بنائے میں اس سفر میں چلتی رہی۔ تیمور میری زندگی کا پہلا اسٹیشن

تھا، لیکن ہم عمر ہونے کے باعث میں نے سسرال میں اسے اپنا بھائی اور دوست سمجھا تھا۔ دل و دماغ اسے کوئی اور حیثیت دینے پر راضی ہی نہ تھے۔ سب کی نظر میں وہ میرے لیے بہترین انتخاب تھا کہ میں اسی گھر میں رہ جاتی، مگر شروع سے ہی تیمور کی ماہ رخ میں دلچسپی کو جانتی تھی۔ کیونکہ ظالم سماج کا کردار ادا کرتی اور ان دونوں کے بیچ آتی۔

مجھے آج بھی یقین ہے کہ اگر میں تیمور سے شادی کے لیے ہاں کرتی تو وہ ماہ رخ پر مجھے ترجیح دیتا۔ لیکن اس کے دل کے سنگھاسن پر تو ماہ رخ براجمان تھی، اسی ماہ رخ کو وہ کھوکھی بھلا نہ پاتا اور وہ ایک کسک کی صورت ہم دونوں کے بیچ ہمیشہ حائل رہتی۔ یہ اور بات ہے کہ ماہ رخ کو پا کر تیمور نے زندگی کی بہت سی خوشیوں کو کھودیا تھا۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اور اپنی بے وقوفی سے نہ صرف اس نے اپنی کوکھ اجاڑ لی تھی، بلکہ وہ ماں بننے کی صلاحیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

آج تک اس کی روٹھنے اور لڑنے جھگڑنے کی ادا قائم ہے۔ ہر سال وہ ایک سے دو مرتبہ روٹھ کر میسے ضرور جاتی ہے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ تیمور کو اب اس سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ خود ہی وہ چلی جاتی ہے اور پھر جانے کس سوچ کے تحت لوٹ آتی ہے۔ یہ عمل صرف تب تک جاری رہے گا، جب تک اس کی ماں زندہ ہے۔ بعض مائیں اتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی ہیں کہ وہ بیٹیوں کے گھروں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کو اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ اپنی بیٹیاں بیاہتے وقت وہ ان کے پلو سے پیار، محبت، صبر اور ایثار جیسے وصف باندھنے کی بجائے غصہ، سختی، ہٹ دھرمی، ضد اور انا کے ہتھیار باندھ دیتی ہیں۔ اس کا خمیازہ ماہ رخ اگرچہ بھگت چکی ہے مگر جانے وہ عورتوں کی کس قسم میں سے ہے، وہ کہتی ہے کہ اسے اولاد کی کمی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ اسے بچے پیدا کرنے کا شوق ہی نہیں۔

ایسی نامکمل عورت سے تیمور کا تعلق صرف اس لیے قائم ہے کہ میں نے اسے بہت سختی سے کہا تھا کہ اسے طلاق مت دینا، ماسوائے اس کے کہ وہ اپنے منہ سے مانگے۔ بچوں کی خواہش کے نہیں ہوتی؟ تیمور کو تو بچے یوں بھی بہت اچھے لگتے تھے، اس نے اتنی دفعہ ماہ رخ کو اس کی بے وقوفی کے طعنے دیئے کہ اس نے ایک دفعہ زچ ہو کر کہہ دیا کہ اگر تیمور کو بچوں کا ایسا ہی شوق ہے تو وہ دوسری شادی کر لے۔ اور ماہ رخ کی بد نصیبی دیکھیے کہ تیمور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً ماہ رخ کی ہدایت پر عمل

کر لیا، اسے بھی اپنے آنکھن میں قلقاریوں کا کیسا شوق تھا اور اللہ نے اسے ایک نہیں پورے چار بچے عطا کیے۔

چار بچوں کا کام کرتے کرتے میں کسی تھک جاتی ہوں، رات بستر پر لیٹی ہوں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے کیسی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میری تھکاوٹ لحوں میں دور ہو جاتی ہے۔ میں اپنے رفیق کو دیکھتی ہوں، اس کے چہرے کی مسکراہٹ، جو مجھے دیکھ کر اور بھی گہری ہو جاتی ہے، اور شرمناک اس کے ہی سینے میں سر چھپا لیتی ہوں۔

”احمد کی والدہ!“ وہ پیار سے مجھے مخاطب کرتا ہے تو میں ہنس دیتی ہوں۔

”کیا بات ہے سرمد اور اسد کے ابا؟“ شرارت سے میں پوچھتی ہوں۔

”مجھے کچھ بتانا تھا حامد کی والدہ!.....“ ہماری ہر صبح یونہی شرارتوں سے شروع ہوتی ہے اور ہر دن کا انجام اسی طرح ہوتا ہے۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں ہم جھولتے ہیں تو میں اسے اوپر والے کا ہی کرم سمجھتی ہوں۔

ایسے وقت میں نوید صاحب کا مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار مجھے خود پر ترس کے مترادف لگا تھا۔ میں نے ابو اور والدہ مرحومہ کے چہروں پر اطمینان اور خوشی رقصاں دیکھی تھی مگر میرا دل ہی مان کر نہ دیا تھا۔ میرے دل میں نوید صاحب کے لیے کوئی جذبات نہ جاگے تھے۔ وہی نوید صاحب جنہیں میں نے اگرچہ ٹھکرا دیا تھا مگر انہوں نے اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے کے وقت میری رائے کو اہم اور میرے مشورے کو صائب جانا تھا۔ مجھے اس وقت شرمندگی کا احساس ضرور ہوا تھا جب انہوں نے مجھ سے کہا تھا، ”ماہا! آپ نہیں تو جو بھی ہو..... دل میں یہ خوشی تو ہوگی کہ میری زندگی کی ساتھی آپ نہ سہی، آپ کا انتخاب ہی سہی۔“

مجھے اپنے انتخاب پر ہمیشہ فخر رہا۔ زارا نے نوید صاحب کی بہترین رفیقہ ہونے کا حق ادا کر دیا۔ آج بھی نوید صاحب سے ملاقات ہو تو مجھے ان کی آنکھوں میں تشکر کا جذبہ نظر آتا ہے۔ زارا اور نوید صاحب اپنے دو بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ جانے کیوں وہ بچے جب اپنی توہلی زبانوں سے مجھے آئی کہتے ہیں تو مجھے اتنی خوشی ملتی ہے۔ مجھے اکثر نگہت کے بچے یاد آ جاتے ہیں۔

نگہت کے ہاں بھی خوشی اور عبداللہ کے بعد عبدالرحمن کی آمد نے ان کی فیملی کی تکمیل کر دی ہے۔ نگہت اس وقت پاکستان آئی تھی، جب ماہ رخ پہلی دفعہ اپنے میکے روٹھ کر گئی تھی، بلکہ اس کی والدہ اسے ساتھ لے گئی تھیں۔ اس نے وہ سفر بڑی تکلیف دہ حالت میں کیا تھا۔ ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہمارے پاس ماہ رخ کے جواب میں نگہت کو بچوں سمیت بھیجا جا رہا ہے، لیکن نگہت میکے آئی بھی نہیں۔ اپنی آمد کے اگلے روز اس نے پیغام بھیج کر امی جان، تیمور اور مجھے بھی بلوایا۔

ماہ رخ کے ابو، امی اور اس کے بھائی اور بھابھیاں بھی وہیں تھیں۔ نگہت نے بتایا کہ اسے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے مگر پھر بھی وہ سفر کر کے آئی ہے، اگرچہ اعجاز اس بات پر بہت ناراض ہے۔ ”تمہیں اس حالت میں سفر نہیں کرنا چاہئے تھا، اگر بچے کو کچھ ہو جائے تو؟“ ماہ رخ کی والدہ نے کہا تھا۔

”تو کیا؟“ نگہت نے طنز سے کہا تھا، ”آپ کو کیا فکر ہے اگر بچے کو کچھ ہو جائے تو؟“

”اور کس کو فکر ہوگی؟“ ماہ رخ کی والدہ چلائی تھیں، ”میرے بیٹے کی اولاد ہے..... اگر اسے تمہاری کوتاہی یا غلطی کے باعث کچھ ہوا تو تم ذمہ دار ہوگی.....“

”اور آپ کی بیٹی بے شک کسی کے بیٹے کی اولاد کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دے امی جان!“ نگہت نے کہا تو سب کو سانپ سوگھ گیا، ”آپ انہیں قصور وار کہہ کر اپنی بیٹی کو لے کر آئیں۔“ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ ”میں آپ کو بتا رہی ہوں..... اگر آپ نے اپنی ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو میں بھی وہی کروں گی جو ماہ رخ نے کیا..... اور وہ بھی آپ کے سامنے.....“

”دامخ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....“ امی جان غصے میں بولی تھیں، ”چلو تم میرے ساتھ.....“

”میں آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جا رہی ہوں.....“ نگہت نے حتی انداز میں کہا تھا، ”آپ اپنی بہو کو اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ ورنہ پھر یہیں فیصلہ کریں۔ اگر آپ نے ماہ رخ کو نہیں لے کر جانا تو تیور یہیں اس کا فیصلہ کرے اور پھر آپ لوگ مجھے لے جائیں، لیکن اس سے قبل کم از کم میں کچھ ایسا قصور ضرور کروں گی، جیسا ماہ رخ نے کیا اور اس کی سزا مجھے ملے گی۔“

اس پر ماہ رخ کے ابو اور بھائیوں نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کے بھائی شہباز نے ماہ رخ کو حکم دیا کہ وہ جس حالت میں بھی ہے فوراً اپنے گھر چلی جائے۔ ماہ رخ منمناتی رہی، اس کی امی اس صورت حال میں خاموش رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں اور یوں ہم جو تین کے قافلے کی صورت میں گئے تھے، واپسی پر ماہ رخ تیور کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہمارے ساتھ تھی۔ تمام راستہ اس کی صورت بیزاری تھی اور گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔

”اگر تمہیں کسی نے یہ کہا ہے کہ منہ بسور کرتی بہت پیاری لگتی ہو تو اس میں کوئی صداقت نہیں ہے.....“ امی جان کے گاڑی سے نکلنے کے بعد تیور نے ماہ رخ سے کہا تھا، میں نے تو اپنی مسکراہٹ اس بات پر چھپائی تھی مگر ماہ رخ غصے کے باوصف بھی اپنے لبوں پر در آنے والی مسکراہٹ کو نہ چھپا سکی تھی کیونکہ وہ تیور کی شرارتی نظروں کے حصار میں تھی۔

علی بھائی اور ثانیہ کے دو بیٹے ہیں اور وہ دونوں مجھے پھوپھو کہتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ ذرا سے گستاخ بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں قصور اور کسی کا نہیں، صرف ثانیہ کے رویے کا ہے، ثانیہ

جیسی عورتیں بھی تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ والدہ کی وفات کے بعد وہ مختار کل بن گئی، مگر اس کی نظروں میں میرا بے ضرر وجود خوار کی طرح کلکتا رہتا تھا۔ اسے جانے کیا خوف تھا۔ میں تو فقط یہ چاہتی تھی کہ ابو کی زندگی تک وہ ان کا خیال رکھیں۔ باقی مجھ پر تو والدہ کی وفات کے بعد یہ فکر سوار ہو گئی تھی کہ مجھے اپنے بارے میں جلد ہی فیصلہ کر لینا ہوگا، اگر ابو بھی نہ رہے تو میرے لیے اس گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔

کبھی کبھار یہ سوچ بھی آتی تھی کہ ثانیہ کے لیے مجھے نند کے طور پر قبول کرنا مشکل ہو رہا تھا تو بھابی کے طور پر بھلا وہ کیونکر قبول کر لے گی؟ مظہر علی بہنوں کا بہت خیال رکھتا تھا، ماں کے ایک اشارے پر وہ سب کچھ قربان کر سکتا تھا۔ اس نے زندگی کی دوڑ میں خود کو اتنا حصر کر لیا تھا صرف اس لیے کہ ان کو بہترین آسائش فراہم کر سکے۔ مجھے اللہ نے اس کے لیے وسیلہ بنایا تھا اور میرے دل میں اس کا درد پیدا کر دیا تھا۔ ”کیا میں نے وہ سب جذبہ ہمدردی کی بنا پر کیا تھا؟“ وہی سوال جو تیور نے مجھ سے پوچھا تھا کبھی کبھار میں خود سے بھی پوچھتی تھی۔

تیور کی دوسری شادی کے ارادے پر ماہ رخ کے گھر والے بہت چراغ پا ہوئے اور کئی طرح کی تجاویز دیں کہ کوئی بچہ گود لے لیا جائے، مگر ماہ رخ کے ظرف کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرنا بیوقوفی تھی کہ وہ کسی گود لیے ہوئے بچے کو ماں کا پیار دے سکے گی۔ جو خود ہی ماں نہ بننا چاہتی تھی اور خود کو اس وصف سے محروم کر چکی تھی۔ ”میں خاندان میں سے کسی کا بچہ گود نہیں لینا چاہتا کیونکہ جلد یا بدیر اس کو اس بات کا علم ہو جائے گا کہ اس کے حقیقی والدین کون ہیں اور پھر وہ بچہ کسی دغلی زندگی گزارے گا!“ تیور کا نکتہ بجا تھا۔

”پھر یوں کیسے زندگی گزارے گی؟“ میں نے فون پر اس سے پوچھا تھا۔

”گزر رہی ہے! زندگی کون سا قسم جاتی ہے..... اور مکمل جہاں کس کو ملتا ہے۔“

”زندگی قسم تو نہیں جاتی لیکن جینے کی لگن تو ہونا ضروری ہے۔“

”آپ بھی توجی رہی ہیں، بشیر کسی لگن کے؟“ اس نے کیا عجیب جملہ بولا تھا۔

”پھر بھی جی تو رہی ہوں..... غالب کے مرنے کے بعد جینے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر پھر آپ

لوگوں کی خاطر جینے لگی۔ میں تو اسی کو زندگی کی لگن سمجھتی رہی.....“

”آپ اتنی عظیم ہیں اور ہم کیسے خود غرض!“ تیمور نے کہا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے کیسی بیوقوفوں والی باتیں کر رہے ہو؟“ میں نے اسے گھر کا۔

”ماہ رخ نے مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دی ہے۔“ تیمور نے مجھے بتایا۔

”یونہی اس نے مذاق سے کہا ہوگا!“ ماہ رخ کو جانتے ہوئے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ اتنی فراخ دل ہو سکتی تھی۔ ”اس کی بات پر تم نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔“

”مجھے آپ یہ لیکچر نہ دیں..... صرف آپ کی مدد کی ضرورت ہے.....“ تیمور نے جلدی سے کہا، ”بتائیں میری مدد کریں گی؟“

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ میں نے تذبذب سے کہا۔

”اب میں آپ کی ایک بھی نہیں سنوں گا اور آپ کو وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا!“ اس کا انداز اتنا حتمی تھا کہ میں اسے کوئی جواب بھی نہ دے سکی۔

میرے بچوں کی دادو، اٹھتے بیٹھتے مجھے سات بیٹوں کی ماں بننے کی دعا دیتی ہیں اور یہ ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہی ہے کہ دس سال میں میرے ہاں پانچ بیٹوں کی ولادت ہوئی، جس میں سے ایک تو اپنی زندگی کی سانسیں ہی کم لکھوا کر لایا تھا۔ اسد اور سرمد کے بعد جب تیسرے بچے کی آمد آئی تھی، ابو کی طبیعت انتہائی ناساز ہو گئی اور مجبوراً مجھے وہاں جانا پڑا، ان کو تیز بخار تھا، اسی لیے میں رات وہاں رک گئی۔ اسد اور سرمد اپنی دادی کے پاس ہی تھے۔ ثانیہ نے بھی اصرار کیا کہ میں رک جاؤں۔ رات کو اچانک میری طبیعت خراب ہوئی اور اتنی کہ علی بھائی ڈاکٹر کو گھر بلا لائے، مجھے بھی کچھ اندازہ ہو رہا تھا، مگر ڈاکٹر نے آکر تصدیق کر دی کہ ولادت قریب ہے اور اتنی کہ مریفہ کو ہسپتال لے کر جانے کا وقت بھی نہیں رہا۔ ناچار گھر پر ہی تیاری کی گئی اور ثانیہ نے کال کر کے اطلاع بھی کر دی تھی۔ آنے والا گنتی کی چند سانسیں لے کر اسی عدم ہوا تو میں صدمے سے جیسے بکھر گئی۔ مگر ابو کی طبیعت کا سوچ کر خود کو سنبھالا۔ صدف آپنی تو حیران تھیں جنہیں میں دو دن قبل ہی چیک اپ کروا کر آئی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ انشا اللہ سب ٹھیک ہی ہوگا۔

پھر اچانک کیا ہو گیا تھا۔ شاید میں نے ابو کی بیماری کی مینشن لی تھی۔ اللہ کی رضا یہی تھی، یہی سوچ کر میں اپنے آنسو اپنے سینے میں گھونٹ لیتی۔ چند دنوں تک مجھے مجبوراً وہیں رکنا تھا، اس لیے ابو کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کرتی، لیکن رات ہوتی تو تنہائی میں آنسو بہاتی۔

”گھر چلیں؟“ پانچویں دن جب اس نے مجھ سے کہا تو میں نے چلنے کی تیاری کی۔

”ابو سے اجازت لے لیں؟“ میں نے رائے چاہی۔

”بیٹیوں کو اپنے شوہروں کے ساتھ جانے کے لیے ہر دفعہ ابو کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ حتمی انداز میں کہا گیا تو میں لا جواب ہو گئی۔ ایسا ہی ہے، کچھ دل میں احساس تشکر ہے اور کچھ پیار کہ میں اس کے سامنے ہمیشہ لا جواب ہو جاتی ہوں۔ ابو کا دل بھی بہت کمزور ہو گیا ہے، چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں پریشان کر دیتی ہیں اور میرے بچے کی پیدائش اور وفات تو ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ مجھے سامنے دیکھتے تو اس کا احساس انہیں زیادہ ہوتا، یہی سوچ کر میں اپنے گھر چل پڑی۔ روانگی سے قبل میں باورچی خانے میں ثانیہ کے پاس گئی، جو اپنے بچوں کو وہیں کرسیوں پر بٹھائے ملک ٹیک بنا کر پلا رہی تھی۔ اسے اسی طرح عادت تھی بچوں کو علیحدہ بٹھا کر کھلانے پلانے کی۔ کبھی اس کو یہ حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ مقدار میں بنا کر باقی سب کو بھی وہی چیز کھلا پلا دے۔ اور تو اور اپنے بچوں کو کھلاتے پلاتے وقت اسے ان کے باپ کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ کبھی وہ اتنی خاطر علی بھائی کی بھی کرتی تو مجھے خوشی ہوتی..... لیکن میں اس کے گھر کے معاملات میں دخل نہ دیتی تھی..... وہ کون سا میرے گھر کے معاملات میں دخل دیتی تھی۔

”وہ بچے..... ملک ٹیک کی ضد کر رہے تھے!“ اس نے جیسے مجھے صفائی دی۔

”میں نے تو کچھ نہیں پوچھا ثانیہ!“ میں نے مسکرا کر کہا، ”شکر کرو بچے ضد کرتے ہیں کھانے پینے کے لیے۔ ان کی دادو زندہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں اور ان کا کتنا خیال کرتیں۔ ایک میرے بچوں کو ہی دیکھ لو، کتنی کوشش کرتی ہوں تب جا کر نازخروں سے کھاتے ہیں۔ ان کی بھی دادو نے ہی ان کی عادتیں بگاڑی ہوئی ہیں۔“

”دادیاں اگر بچوں کا خیال کریں تو بہوئیں کہتی ہیں کہ وہ بچوں کو بگاڑ رہی ہیں۔“ ثانیہ نے

احتجاج کیا۔

”میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی تھی ثانیہ! جانے سے قبل“ میرے لہجے سے شاید وہ کچھ سمجھ

گئی تھی، فوراً انہوں سے گلاس خالی کروائے اور انہیں باہر بھگا دیا۔  
”جی کہیں؟“

”میرے دونوں بیٹے صحت مند اور نارمل ہیں اللہ کے کرم سے اور اب کی بار بھی میں صدف آپلی سے چیک اپ کروا کر آئی تھی تو ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔ لیکن یہاں آکر اچانک ہی حالات بگڑ گئے اور جو ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔“ میں بول رہی تھی اور وہ مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”میرے ذہن میں تو بھولے سے بھی خیال نہ آیا کہ یہ کسی کی نحوست کا سایہ ہو سکتا ہے۔“ میرے اس فقرے پر اس کا سر جھک گیا۔ ”میں نے اس کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کیا۔ لیکن میری زندگی میں گھر میں بھی اور گھر سے باہر ہونے والے واقعات کو بھی میری نحوست کا شاخسانہ قرار دیا گیا اور یہ کس نے کیا ثانیہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔“

”میں شرمندہ ہوں پلیز!“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”الفاظ کی برچھیاں وجود میں ایسے چھید کر دیتی ہیں کہ عمر بھر ان کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ تم زبان کے استعمال کے معاملہ میں بہت غیر محتاط ہو اور اکثر میں نے تمہیں ابو سے بھی گستاخی سے بات کرتے دیکھا ہے۔“

”نہیں تو..... وہ تو!!“

”اس وقت سے ڈرو جب تمہاری اپنی اولاد دیا پھر ہوئیں تم سے ایسا رویہ اختیار کر لیں۔ یہ دنیا ایک ایسا اسٹیج ہے جس پر ہم ایسے ایسے نظارے دیکھتے ہیں کہ آنکھ کو عبرت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ خود پر ہر تجربہ کیا جائے، بسا اوقات دوسروں کے تجربات سے بھی سیکھ لینا چاہئے.....“ وہ سر جھکائے بیٹھی آنسو ٹپکار رہی تھی۔ میں اس سے کبھی ایسی بات نہ کہتی مگر میرے دل میں کچھ زخم ہرے تھے، ان پر پھاہے رکھنا بھی ضروری تھا۔

تیور اور امی جان سے مل کر گھر لوٹی تو اسی روز مظہر کی کال آگئی۔ وہ شاید کسی نہ کسی طرح جانتا تھا کہ میں وہاں تھی اور اس دوران اس نے کال نہیں کی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”الحمد للہ تم سناؤ، اور ہو کہاں.....“ مجھے معلوم تھا کہ میرے فون کو ٹیپ کیا جا رہا تھا۔

”ادھر ہی ہوں، بس آپ کے شہر میں ہی.....“

”امی جان بہت یاد کرتی ہیں، ان سے مل لیتے تم۔ وہ اور تیور دونوں گھر پر ہیں۔“

”دیکھتا ہوں..... آپ سے کیسے مل سکتا ہوں؟“

”تم بتاؤ، جس طرح بھی کہتے ہو.....“

”ایم ایم عالم روڈ پر میرا پسندیدہ ریہ ٹورنٹ کیسار ہے گا؟“

”تم ادھر اپنے گھر آ جاؤ، میں وہیں آ جاؤں گی، امی جان اور تیور سے بھی مل لیتا۔“

”نہیں ابھی نہیں..... تیور بھائی کو تو کسی نے میرے بارے میں جانے کیا بھڑکا دیا ہے.....“

وہ میری بات بغیر نے مجھے انجینیئروں کے حوالے کر دیں گے۔

”ایسا کیا کر دیا ہے تم نے؟ اور تیور کوئی تمہارا دشمن تھوڑا ہی ہے۔“

”میں کچھ غلط نہیں کر رہا، یہ بات تیور بھائی کو سمجھانا بہت مشکل ہے، اگرچہ وہ میرے دشمن

نہیں ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تو امی جان سے تو کسی نہ کسی طرح ملو، نگہت بھی پاکستان آئی ہوئی ہے..... کیا میں امی جان

کو اپنے ساتھ لے آؤں؟“

”ارے نہیں ہرگز نہیں..... مجھے آپ کو کچھ کاغذات دینا ہیں..... امانت کے طور پر اپنے پاس

رکھیں۔ مجھے کچھ ہوا تو وہ کاغذات تیور بھائی کو دے دیں۔ اس میں ثبوت ہیں اس بات کے کہ ہم

ملک کے نہیں بلکہ ملک دشمنوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔“

”یہ باتیں تم خود بھی تیور کو بتا سکتے ہو.....“

”کل رات آٹھ بجے..... ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور میں دیر

تک فون کو گھورتی رہی تھی۔ فون بند کرتے ہی اس پر پیغامات ظاہر ہونے لگے۔

”یہ فون کال تیور بھائی کی توجہ دوسری طرف لگانے کے لیے تھی۔“ میں آپ کے گھر پر

آؤں گا۔ کل رات آٹھ بجے..... پہلے سے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں..... میری آمد کو راز

رکھیں!“

”اور ہاں! میری آمد پر حیران ہونا نہ بھولیں تاکہ سب سمجھیں کہ آپ کو پہلے سے کچھ معلوم نہ

تھا۔“ پیغامات پڑھتے ہوئے میری مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی، ”چھوٹو! تم نہیں بدل سکتے۔“



ابو کو میں نے بتا دیا تھا کہ تیمور اور امی جان کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اگرچہ تیمور کا وہ فقرہ کسی نیزے کی انی کی طرح میرے دل میں کھب گیا تھا اور میں نے بار بار اپنے دل کو ٹٹولا تھا، اس امید پر کہ کہیں اس میں ننھا سادیا مظہر علی سے محبت کا جمل رہا ہو، مگر ہر بار میری تلاش ناکام رہتی۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے جو کچھ اس کے اور اس کے گھر والوں کے لیے کیا وہ مظہر علی اور زارا کے جذبہ خلوص سے متاثر ہو کر اور ان کے گھر کی غربت کے حالات جان کر کیا تھا۔ اور اب اگر خود کو اس رشتے کے لیے منار ہی تھی تو اس میں صرف نظریہ ضرورت شامل تھا۔ جب مجھے زندگی کا کوئی فیصلہ کرنا ہی تھا اور کسی نہ کسی کو شریک سفر چننا تھا تو پھر وہ کوئی ایسا شخص تو ہو جسے میں کسی نہ کسی حد تک جانتی ہوں۔

اس سے قبل جب میں تاریکی اور مایوسی کی گہرائیوں میں تھی، اس وقت کبھی بھولے سے بھی مجھے یہ خیال نہ آیا تھا کہ آئندہ آنے والے وقت میں، میں کسی بھی مجبور یا جذبے کے تحت مظہر علی کے بارے میں کچھ سوچوں گی۔ ان دنوں تو ہر وقت سوچوں میں وہی تھا کہ مجھے اس معاملے کو ہر پہلو سے دیکھنا تھا۔ ابو سے بات کر کے بھی میں بے چین سی تھی۔ دماغ میں جیسے کوئی الجھن سی تھی اور سوچوں کو ارتکاز میسر نہ تھا۔ تاہم خود کو یہی کہہ کر تسلی دی کہ جب دو مختلف علاقوں، قومیتوں، ذہنیتوں اور طبقتوں کے افراد بھی رشتہ مناکحت میں بندھتے ہیں تو ان کے درمیان محبت کا رشتہ قدرتی طور پر قائم ہو جاتا ہے۔

رات کے کھانے پر جب ہم حسب معمول بیٹھے تھے اور ثانیہ میز پر سے برتن اٹھانے کو اٹھی سی تھی کہ ابو نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ ابو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی کھڑی رہی۔ ابو میز کو گھورنے لگے اور ان کی انگلیاں سامنے رکھی پلیٹ کے کناروں پر گھوم رہی تھیں۔ ایسا ابوتب کرتے تھے جب وہ ہم سب سے کوئی بہت سنجیدہ بات کرنا چاہتے تھے۔ مجھے کچھ تو اندازہ تھا کہ ابو کیا بات کرنے والے ہیں۔ یقیناً وہ اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہے تھے بات شروع کرنے کے لیے۔

”کیا بات ہے ابو؟“ ثانیہ نے ابو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹی!“ انہوں نے اسی طرح جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ”مجھے تم لوگوں سے کوئی اہم

بات کرنا ہے۔“

”جی ابو؟“ سوالیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی۔

”بیٹا علی!“ وہ گویا ہوئے، ”تمہاری والدہ کی وفات کے بعد میری فکریں اور پریشانیاں دوچند ہو گئی ہیں، اسی لیے شاید میری صحت گری گری رہتی ہے۔ تم لوگ بھی سمجھتے ہو کہ میرے لیے سب سے بڑی پریشانی اس وقت ماہا کی ہے۔“ وہ رکے۔

”جی ابو!“ علی بھائی بولے۔ میرے خون میں جیسے سناہٹ ہونے لگی۔

”تمہاری والدہ جب تک زندہ تھیں، مجھے انہوں نے ان پریشانیوں کی بھنک بھی نہ پڑنے دی جو بالآخر ان کی جان لینے کا باعث بنیں، وہ بڑے حوصلے والی تھیں، خود انہیں یہ غم گھن کی طرح چاٹ گیا مگر کسی اور کو انہوں نے کبھی پریشان نہ کیا۔“ ابو اکثر ہی بات بے بات والدہ کی بات کرنے لگتے تھے۔

”واقعی وہ بہت پریشان رہتی تھیں، ماہا جی کے لیے۔“ ثانیہ نے تائید کی۔

”جیسا کہ آپ لوگوں کو علم ہے کہ سیکینہ بہن نے مظہر علی کے لیے خواہش کا اظہار کر رکھا ہے.....“ ابو رکے، مجھے ثانیہ کے چہرے پر بے چینی نظر آئی، ”اب ماہا خود بھی چھوٹی بچی نہیں ہے، اس لیے اس کی رائے اس فیصلے میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ ماہا کی سابقہ سسرال ہے، جہاں ماہا نے شادی شدہ زندگی کے چند ماہ لیکن بیوگی کے بعد کئی سال گزارے۔ وہ لوگ اسے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس گھر میں ہے اس لیے میں نے ماہا سے کہا کہ وہ اپنے اس اہم فیصلے سے قبل ان لوگوں سے بھی رائے لے۔“

علی بھائی اور ثانیہ خاموشی سے ابو کو دیکھ رہے تھے اور میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بار بار نظریں اٹھا کر ان دونوں کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ ابو کے رکنے پر وہ لوگ چونکے۔ ثانیہ سامنے رکھے گلاس سے کھینے لگی۔

”ماہا نے ان لوگوں سے بھی بات کر لی ہے.....“ ابو پھر بولنا شروع ہوئے، ”اور ان لوگوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب تم لوگ دیکھ لو کہ کس طرح بات آگے بڑھانی ہے۔“ ثانیہ جوش سے چیخ مار کر اٹھی اور آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ ”علی بیٹا! تم جس طرح مناسب سمجھو، سیکینہ بہن کو بتادو، میں ذرا ان معاملات میں کورا ہوں۔“

”میں خود امی کو بتاتی ہوں.....“ ثانیہ مجھے لپٹ کر بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بلکہ علی! فون

پر نہیں بتاتی، میں برتن وغیرہ سمیٹ لوں، ہم دونوں ابھی خود جا کر امی کو بتا کر آتے ہیں۔“

”جیسے تم لوگ مناسب سمجھو!“ ابو کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

”آپ جاؤ، میں برتن سمیٹ لیتی ہوں!“ میں نے جلدی سے برتن سمیٹتی ہوئی ثانیہ سے کہا۔

”اوہو! اتنی بے قراری ہے کیا؟“ اس نے مجھے چھیڑا، لیکن اس کی اس چھیڑ چھاڑ پر میرے

دل میں کوئی خوش کن احساس نہ جاگا تھا۔“

”ارے نہیں! میں تو تمہاری مدد کے خیال سے کہہ رہی تھی۔“ میں نے فوراً صفائی دی۔

”جس خیال سے بھی کہہ رہی تھی آپ، وہ خیال ٹھیک ہی تھا.....“ وہ ہنسی، ”لیں سنبھالیں

برتن، میں چلتی ہوں مجھ سے بھی اب وقت گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔“

شام کو ثانیہ کے لوٹنے سے پہلے تیمور کی کال آگئی۔ اس نے یقیناً کل کی ساری گفتگو کی رپورٹ حاصل کی ہوگی۔

”آپ جا رہی ہیں ناں منظر سے ملنے کے لیے؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیا نہ جاؤں؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں نہیں!! ضرور جائیں..... لیکن جونہی منظر آپ کے پاس آئے، آپ تھوڑی دیر کے بعد غسل خانے جانے کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ جائیں اور ہاں اپنا پرس وغیرہ ساتھ لے کر جانا نہ بھولیں۔“ وہ مجھے ہدایات دینے لگا۔

”تیمور! مجھے ڈر لگ رہا ہے..... وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں اس پر غلط شکوک ہیں۔ تم ایک بار خود

اس سے اکیلے میں ملو اور اس سے بیٹھ کر اپنے شکوک و شبہات واضح کر لو.....“

”آپ نہیں جانتیں، وہ ایک ملک دشمن تنظیم کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔“

”مگر مجھے تو وہ بتا رہا تھا کہ ان کی تنظیم، ملک کے دشمنوں کی دشمن ہے اور اس کے پاس معاشرے

میں چھپی کالی بیٹھروں کے خلاف دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔“ میں نے منظر کی صفائی دی۔

”میں نے سن لی ہے اس کی ساری کہو اس، وہ لوگ وہی کہتے ہیں جو ان کے دماغوں میں بھر

دیا جاتا ہے۔ ان نوجوانوں کو اپنے اچھے برے کی پہچان نہیں ہوتی اور چلے ہیں ملک کا اچھا یا برا سوچے۔“ تیمور یکدم غصے میں آگیا۔

”ماہ رخ کیسی ہے اب؟“ میں نے بات بدلی۔

”وہی سی ہے، جیسی آپ ہمیشہ سے دیکھتی آئی ہیں.....“ اس نے طنز سے کہا۔

”تم نے بھی تو اس سے محبت کی تھی، اب وہ سب کیا ہوا؟ اگر وہ ناراض ہے یا تمہیں پریشان

کرتی ہے تو کچھ تم اس کو برداشت کر لو..... کچھ وہ بھی بدل جائے گی وقت کے ساتھ.....“ میں نے

اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ مجھے سمجھانے کی بجائے میری مدد کریں، اگر کر سکتی ہیں تو!“ اس نے پرانی رٹ لگائی۔

”مجھے تمہارا مطالبہ ہی یو تو فائدہ لگتا ہے.....“ میں نے مختصر کیا۔

”میں نے آپ کو اپنا انتخاب بتا دیا ہے، اب آپ کی طرف سے دیر ہے!“ اس نے کہا۔

”تیمور یہ سب..... تم سے ایک بیوی تو سنبھالی نہیں جا رہی، دو کس طرح رکھو گے؟“

”آپ کو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں.....“ اس نے سماجت بھرے

انداز میں کہا، ”یوں بھی بیوہ سے شادی کرنا ثواب کا کام ہے۔ کچھ ثواب ہمیں بھی کمالینے دیں!“

”جو تمہاری مرضی آئے کرو.....“ میں نے زچ ہو کر کہا۔

”بہت بہت شکریہ، ارے ہاں!“ اسے یکدم کچھ یاد آیا، ”جب آپ غسل خانے کا کہہ کر

اٹھیں تو جاتے ہوئے گاڑی کی چابی ضرور میز سے اٹھالیں۔“ منظر گاڑی کی چابی ہمیشہ میز پر

رکھتا تھا، ”اور گاڑی چلا کر گھر چلی جائیں، مڑ کر واپس ہوٹل میں نہ آئیں۔“ اس کی بات مکمل ہونے

تک میرے روکتے کھڑے ہو گئے تھے۔ شکر ہے کہ وہ مخالف سمت میں سوچ رہا تھا، اور جو اسے ذرا

سامجھی ٹنک ہو جائے یا پھر یہ رپورٹ ملے کہ میں اور منظر اس ریسٹورنٹ میں نہ گئے تھے۔

”تیمور!“ میں نے کچھ سوچے ہوئے کہا، ”اب تم اس کے بعد مجھے فون نہ کرنا، اگر کوئی مسئلہ

ہو تو میں خود تم سے رابطہ کروں گی.....“

”مجھے معلوم ہے، میں بھی یہی سوچ رہا تھا..... میں کل آپ سے بات کروں گا.....“ اس کا

فون بند بھی ہو گیا تو میرا دل عجیب اندیشوں سے لرز رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، ویسا نہ

ہو جائے کبھی کچھ سوچتی، کبھی کسی بات پر پریشان ہوتی۔ اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب دروازے پر علی بھائی کے مخصوص انداز سے کھنٹی بجانے کی آواز سنائی دی۔

ثانیہ اور علی بھائی خوش خوش لوٹے تھے، آٹنی سیکنہ کی طرف سے ثانیہ نے مجھے پیار دیا۔ ”امی تو خوشی سے بے چین ہو رہی تھیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی آجائیں، لیکن وہ زارا آپنی کو بھی ساتھ لے کر کل آئیں گی.....“ لاؤنج میں پہنچ کر ثانیہ نے ابو کو بتایا۔

”کل؟“ ابو نے حیرت سے پوچھا۔ ”کل تو بہت جلدی ہے، مجھے باقی بیٹیوں کو بھی اطلاع کرنا ہوگی۔“

”کل تو صرف صدف آپنی کو بلوالیں ابو!“ علی بھائی نے کہا، ”کیونکہ کل تو آٹنی صرف باقاعدہ ہاں کروانے کے لیے آرہی ہیں۔“

”اس موقع پر ماہا کی سب بہنوں کا ہونا تو کم از کم ضروری ہے؟“ ابو نے کمزور سا احتجاج کیا۔

”اس طرح تو وقت لگے گا اور امی نے تو اسی وقت مظہر بھائی کو مٹھائی لینے کے لیے بھجوا دیا تھا اور زارا آپنی کو بھی کال کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ اور نوید بھائی کل ان کی طرف آجائیں اور وہاں سے وہ سب اکٹھے ہمارے ہاں آئیں گے!“ ثانیہ نے منہ لٹکا کر تمام تفصیل بتائی۔ یقیناً سیکنہ آٹنی نے یہ سارا پروگرام جلد بازی میں بنالیا تھا بلکہ میرا اندازہ تو یہ تھا کہ یہ سارا پروگرام ثانیہ کے زرخیز ذہن نے ہی ترتیب دیا ہوگا۔ بہر حال میں خاموش ہی رہی۔ میں چاہ رہی تھی کہ اس موضوع پر گفتگو تو اب ختم ہی ہو جائے اور سب اپنے معمولات میں مصروف ہو جائیں۔ مظہر آنے والا تھا اور اس کے آنے سے قبل اس بحث کو سمٹ جانا ہوتا ہی بہتر ہوتا۔

”چلیں بیٹا! اب جس طرح آپ لوگوں نے مہوچ لیا ہے.....“ ابو نے جیسے ہتھیار ڈالے۔

”میں بات کرتا ہوں صدف، عائشہ اور ثانیہ سے..... جو بھی پہنچ سکیں۔“ ابو کہہ کر اٹھ گئے اور میں اخبار کھول کر بیٹھ گئی۔ ”اور ہاں!“ ابو مڑے، ”علی اور ثانیہ! آپ لوگ ان کی آمد کے پروگرام کے مطابق باقی تیاری دیکھ لیں۔ کھانا یا چائے!“

”جی ابو!“ علی بھائی نے سعادت مندی سے کہا۔ وہ دونوں شام کی چائے کے ساتھ پیش

کیے جانے والے لوازمات کا مینو ترتیب دینے لگے۔ میں بظاہر اخبار پڑھ رہی تھی مگر ان کی باتیں سن رہی تھی کہ علی بھائی نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔ ”کیوں ماہا! یہ مینو ٹھیک ہے نا؟“

”کون سا؟“ میں نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھا، اور سہاویہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”دھیان کہاں ہے تمہارا؟ یہیں بیٹھی ہوئی ہو اور پھر بھی سوال پوچھ رہی ہو!“ علی بھائی جھنجھلائے۔

”میں اخبار پڑھ رہی تھی علی بھائی!.....“ میں نے صفائی دی۔

”ماہا! یہ بہت اہم باتیں ہیں..... اور ان کا تعلق براہ راست تمہاری زندگی سے ہے.....“ علی بھائی ہلکی سی خفگی کے ساتھ بولے۔

”ماہاجی!“ ثانیہ نے مجھے مخاطب کیا، ”یہ فیصلہ آپ نے اپنی مرضی سے ہی کیا ہے نا؟ اس سلسلہ میں کسی نے آپ پر زور یا زبردستی تو نہیں کی؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ثانیہ!“ میں نے پورے اعتماد سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے کہا، لیکن میرے دل کے اندر ہی اندر کوئی مجھے کہہ رہا تھا کہ فیصلہ کرنے میں کسی نے مجھ پر کوئی جبر نہیں کیا ہے لیکن جانے کیوں میرے دل کا یہ فیصلہ ابھی میرا دماغ تسلیم نہیں کر رہا تھا، کوئی الجھن تھی یا خوف؟ کچھ تو تھا کہ جو مجھے خوف زدہ کیے ہوئے تھا، کہیں کچھ ہونے والا ہو جیسے؟

”پڑھ کر سنائیں علی بھائی! آپ نے کیا مینو بنایا ہے؟“ میں نے علی بھائی کی خفگی پر ناراض ہوئے بغیر کہا۔ انہوں نے مجھے مینو پڑھ کر سنایا۔ ”میرے خیال میں بیٹھے میں دو چیزیں نہ رکھیں..... ایک تو میٹھا کبھی لوگ کم کھاتے ہیں اور دوسرے سیکنہ آٹنی بھی تو مٹھائی لے کر آرہی ہیں۔“

”ہاں! بالکل درست کہا تم نے۔“ علی بھائی خوش ہو گئے، ”ماہا!“ انہوں نے پھر مجھے پکارا، ”کیا تم تیور کے گھر والوں میں سے کسی کو بلانا چاہتی ہو؟“

”نہیں! کل نہیں۔“ میں نے فوراً کہا، ”کوئی باقاعدہ تقریب ہوئی تو ضرور بلائیں گے۔“

”ماہاجی! آپ پہنیں گی کیا؟“ ثانیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”جو تم کہو!“ میں نے فراخ دلی سے کہا۔

”یہ ہوئی ناں بات“ وہ بھی خوشی سے چپک اٹھی تھی۔ ”اور ہاں کل کے بعد میں آپ کو ماہا جی نہیں کہوں گی..... بھابی کہا کروں گی.....“ اور جانے کیا ہوا، اس کے یوں کہنے پر، شاید علی

بھائی کے سامنے شرمساری سے میرے عارض دیکھنے لگے اور آنکھوں میں دیپ سے جلنے لگے۔ ٹیلی فون کی کھنٹی اور اطلاعی دروازے کی کھنٹی ساتھ ساتھ بجنے لگیں..... میں سمجھی کہ میرے کانوں کا دھوکہ ہے یا پھر دماغ میں گھنٹیاں بج رہی ہیں..... مگر مجھے علم نہ تھا کہ وہ گھنٹیاں خطرے کی گھنٹیاں تھیں، جو ایک بار پھر میری زندگی کا رخ بدلنے والی تھیں۔ علی بھائی اطلاعی کھنٹی اور ثانیہ ٹیلی فون کی کھنٹی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہیلو!!!“ بڑے ناز سے ثانیہ نے فون اٹھا کر کہا۔ شادی کے بعد سے اس کے ناز واداسی طرح سے بدل سے گئے تھے۔ گھر کا ہر شخص فون اٹھا کر ”السلام علیکم“ کہتا تھا جب کہ ثانیہ کا اپنا ہی انداز تھا۔ میں میز پر رکھے کل کے لیے ترتیب دیئے گئے مینو کارڈ سے کھیل رہی تھی۔ ”امی!!! امی پلیز کیا ہوا ہے؟ کچھ تو بولیں.....“

”دیکھیں مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ یوں سسکتی رہیں گی تو مجھے کیا معلوم ہوگا کہ آپ نے کیوں کال کی ہے۔“ بتائیں ناں امی..... آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اس حالت میں..... ”وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں سمجھ گئی تھی، وہ پھر امید سے تھی اور ابھی میرے سامنے ذکر نہ کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب کیا اور یوں ظاہر کیا جیسے میں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

”کس نے کہا آپ سے؟“

”اوہ میرے خدایا!!!“ وہ چیخی، ”میں پہنچتی ہوں ابھی!!“ اس نے فون بند کر دیا اور چیخنے لگی، ”منخوس! نامراد..... میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی، جانے میرے بھائی پر کیا جادو کر دیا تھا، اسے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے ناک کرتی رہی..... کوکھ جلی! کھل پیری!! جس کی بنتی ہے، اس کو کھا جاتی ہے۔ جانے کتنے گھر اجاڑے گی؟ جانے کس دن سے تاک تھی میرے اکیلے بھائی پر.....“

اپنے ہاتھوں سے وہ باقاعدہ اپنے زانو پیٹ رہی تھی۔ ”ہائے میرا بھائی!!! کتنے اراٹوں سے مٹھائی لے کر دکان سے نکلا ہوگا..... اس کی گردن کٹ گئی پتنگ سے..... میرا بھائی تیری نحوست کا شکار ہو گیا.....“ وہ چند قدم بڑھ کر آگے آئی اور ہاتھوں سے میرا سر اور کندھے پیٹنے لگی، اور میں خاموشی سے پٹی رہی..... مجھے ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کس کے ساتھ کر رہی ہے، جسم مار کھاتے ہوئے بھی درد کے احساس سے عاری تھا..... شاید وہ واقعی سچ کہہ رہی

تھی۔ میری خلا میں معلق آنکھوں میں آنسو تک نہ تھے اس لیے مجھے واضح نظر آ رہا تھا کہ پہلے اپنے کمرے سے ابونکلے..... پھر باہر سے علی بھائی اندر آئے تو مظہر ان کے ہمراہ تھا اور وہ سب بھی اس ”ڈرامے“ کو دیکھ کر اور سن کر حیرت سے ششدر تھے۔

”کیا کر رہی ہیں آپ؟“ مظہر نے آگے بڑھ کر ثانیہ کو کندھوں سے پکڑ کر دور کھینچا تھا، عمومی حالات میں وہ کبھی بھی کسی عورت کو یوں نہ چھوتا مگر اس وقت جب کہ ابو اور علی بھائی بھی عالم تحیر میں تھے، اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

”پہلے یہ تمہارے بھائی کو چاٹ گئی تھی اور اب میرا بھائی!! یہ ہے ہی منخوس۔ اسے کہیں گاڑ دو، زمین میں، زندہ ہی..... یہ ہے ہی اسی قاتل.....“

”بکواس بند کرو.....“ علی بھائی کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر پوری طاقت سے بڑا۔ ابو اپنے دروازے کے سامنے جیسے گڑے کھڑے تھے اور میں اپنی نشست پر۔ کاش کوئی سلیبانی ٹوپی ہوتی تو میں پہن کر اس منظر سے غائب ہو جاتی۔ شرمساری کی انتہا تھی، پھر بھی میں زندہ تھی اور نہ صرف زندہ تھی، ڈٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”لے جاؤ اس کو علی!“ ابو کرب سے بولے، ”وہاں جہاں سے مجھے اس کی آواز سنائی نہوے!“

”انکل!“ مظہر نے ابو کو تھاما..... ”آپ بیٹھ جائیں انکل!“ ابو کو صوفے پر بٹھا کر وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”میں جاتا ہوں اسے لے کر!“ علی بھائی نے کہا، ”سوری یا مظہر! آپ بھی سوچو گے.....“

”بالکل بھی نہیں سوچوں گا..... اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں.....“ مظہر نے پیش کش کی۔

”اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو بلا لوں گا، بہت شکریہ!!“ علی بھائی نے مظہر سے کہا۔ ثانیہ نے کوسے تو بند کر دیئے تھے مگر ابھی تک چیخ چیخ کر رہی تھی۔ میرا دل اس کی آوازوں سے کٹ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا جوان بھائی۔ اس سے آگے کچھ بھی سوچنا محال تھا، زخمی تھا یا؟

”آپ اگر ساتھ جانا چاہیں تو؟“ مظہر نے مجھ سے کہا، ”میری وجہ سے آپ خود کو پابند نہ

سوتن..... ہرگز نہیں!“ میں نے خفگی سے کہا، ”یوں بھی تیمور اپنے ایک دوست کی بیوہ بہن میں دلچسپی رکھتا ہے اور مصر ہے کہ میں اس کا رشتہ لے کر جاؤں.....“

”تیمور بھائی نے زندگی بھر فیصلے جذبات اور جلد بازی میں کئے ہیں.....“ مظہر اونچی آواز میں بولا، مگر پھر فوراً ہی خود احساس کر کے معذرت کی، ”انہوں نے پہلے بھی آپ کے مسئلے کے بہترین حل پر توجہ نہیں دی اور اب بھی وہ کم عقلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔“

”تمیز سے مظہر!“ میں نے سرزنش کی، ”بڑا بھائی ہے..... یوں بھی میں اور تیمور حقیقی نہ سہی لیکن ہم دونوں کے جذبات ایک دوسرے کے لیے بہن بھائی جیسے ہیں۔“

”ہم اصل حقائق سے منہ موڑ کر اپنے لیے مسائل کے انبار کھڑے کر لیتے ہیں۔“ اس نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کو احسن طریقے سے حل کیا جائے۔“

”میرے مسئلے کے حل کو چھوڑو۔“ میں نے بات کا موضوع بدلنا چاہا، ”تم اپنے مسئلے کے بارے میں سوچو۔“

”اب جب ہم سب کو ایک دوسرے کے مسائل کا ادراک ہو ہی گیا ہے تو بہتر ہے کہ ان کا حل بھی اکٹھے ہی بیٹھ کر سوچا جائے۔“ وہ گنہگار لہجے میں بولا، ”میں انکل سے یہی بات کر رہا تھا۔“

”کون سی بات؟“ میرے چہرے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی، مجھے یوں گھما پھرا کر بات کرنا کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ آپ اندر سے جھنجھلا رہی ہوں گی، میری اس طویل تمہید پر۔“ وہ ہنسا۔

”زیادہ قیافے لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”آپ کے بارے میں میں ہر بات وثوق سے کر سکتا ہوں۔“ وہ پھر ہنسا، ”کیونکہ میں آپ کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں، بتائیں ذرا آپ کو کوئی شک ہے؟“

”میں بھی تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور تمہارے بارے میں ہر بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں۔“ میں نے ضد میں اس کے الفاظ دہرائے۔

”جانتا ہوں!! یہ بات بھی اچھی طرح جانتا ہوں، اسی لیے بہت سوچ سمجھ کر انکل سے بات کی ہے۔ وہ بات جو شاید مجھ بہت پہلے کہہ دینا چاہئے تھی۔“ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا، ”آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ آپ سے پوچھنے بغیر ہی وہ بات میں نے انکل سے کی ہے، حتیٰ کہ امی جان

سمجھیں..... میں کچھ دیر انکل کے پاس بیٹھ کر چلا جاؤں گا اور وہ کاغذات بھی انہی کے حوالے کر جاؤں گا۔“

”اؤںہوں!!“ میں نے سینے کی گہرائیوں سے ایک لمبی سی سانس کھینچی..... ”مجھ میں حوصلہ نہیں ہے اسے دیکھنے کا.....“

”چلیں میں آپ کو تھوڑی دیر تک لے کر چلوں گا..... آپ اگر برا نہ منائیں تو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلا دیں۔“ مظہر نے کہا تو میں چونک کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔ تیمور اور مظہر، دونوں بھائیوں کی عادت تھی کہ اگر کسی سے چھپا کر کوئی راز کی بات کرنا مقصود ہوتی تھی اسے یوں ہی منظر سے ہٹا دیتے تھے۔ ”شاید اس نے اسی لیے مجھے اٹھانے کو کہا ہو کہ ابو سے کوئی بات کرنا چاہتا ہو۔“ میں نے دل میں قیافہ لگایا..... تاہم یہی سوچ کر اٹھ گئی کہ گھر آئے مہمان کی تواضع تو کرنا ہی تھی۔

”میں تو سمجھتا تھا کہ آپ یہاں اس لیے رہ رہی ہیں کہ آپ یہاں پر بہت خوش ہیں؟“

چائے پی کر ابو اپنے کمرے میں عشاء کی نماز کا کہہ کر چلے گئے تھے۔ اور جاتے جاتے مجھے کہہ گئے تھے کہ جو بھی پکا ہوا ہو، مگر مظہر کو کھانا کھلا کر ہی بھیجتا ہے۔ ”میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔“

”میں خوش ہوں، جہاں رہوں خوش ہی ہوں۔ یہاں اس لیے بھی ہوں کہ یہ میرے باپ کا گھر ہے اور اس گھر میں جو مرد رہتے ہیں وہ سب میرے محرم ہیں۔“ میں نے آسٹگی سے کہا۔

”طنز کر رہی ہیں؟“ اس نے شرمندگی سے پوچھا۔

”ارے نہیں طنز کیوں کروں گی؟“ میں نے فوراً اس کی تردید کی۔

”میرے الفاظ ہی مجھے لوٹا رہی ہیں!!“

”حقیقت تو یہی ہے مظہر! خواہ کسی کے بھی الفاظ میں ہو۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے اس کا احساس دلادیا۔“

”وہ گھر اب بھی آپ کا ہو سکتا ہے.....“ مظہر نے میری طرف دیکھ کر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”مجھے تیمور کی پہلی بیوی بننا بھی منظور نہ تھا اور اب دوسری بیوی..... وہ بھی ماہ رخ کی

اور تیور بھائی سے رائے بھی نہیں لی اور نہ ہی ان کی اجازت!!“  
 ”کون سی بات؟“ میں ہونٹوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

”وہی بات!!“ اس نے میز پر رکھا مینو کارڈ اٹھایا، ”مینو بھی یہی ٹھیک ہے، البتہ وقت کی مہلت، ذرا چار دن کی چاہئے ہوگی..... آپ کو بھی سب لوگوں کو بلانا ہوگا اور ہم تو ہیں ہی مختصر سے، اور ہاں۔“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ”سیدھے سہاؤ نکاح ہوگا، اور اب میں آپ کی طرف سے کوئی بھی عذر نہ سنوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب آپ کا نکاح ہوگا۔“

”اچھا!“ میں نے طنز سے کہا، ”تم کون ہو میرے بارے میں فیصلے کرنے والے؟“  
 ”ابھی تو شاید کچھ بھی نہیں،“ وہ ہنسا، ”لیکن نکاح کے بعد سب کچھ ہو جاؤں گا..... اور پلیز!“ وہ رکا اور اس کا لہجہ لمحوں میں سنجیدہ ہو گیا، ”اب ضد چھوڑ دیں اور اپنی زندگی کی پتواریں ہاتھوں میں دے دیں، آپ تھک چکی ہیں.....“

”تم!!“ میں ششدر رہ گئی..... ”تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ کیا فضول باتیں کر رہے ہو تم؟“  
 ”کون سی بات فضول کی ہے میں نے؟“ اس نے اڑیل لہجے میں کہا۔  
 ”یہ سب فضول باتیں ہیں.....“ میں نے رخ پھیرا، ”اور تم چلے جاؤ۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم کیسے ایسی بات کر سکتے ہو؟ تم میرے بھائیوں.....“

”بس کریں!! بہت ہو گیا!“ وہ سختی سے بولا، ”نہ میں آپ کا بھائی ہوں، نہ بھائیوں جیسا!!“  
 ”تم مجھ سے کتنے چھوٹے ہو.....“ میں نے ایک اور دلیل دی۔

”شاید چار سال..... مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے بحث شروع کر دی۔  
 ”فرق پڑتا ہے..... میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھا ہے.....“  
 ”حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس تھی، جب ان کا نکاح پچیس سالہ آنحضرت ﷺ سے ہوا تھا۔“

”وہ آنحضرت ﷺ تھے۔“

”ہم ان کی امت ہیں.....“ اس نے فوراً کہا، ”اور انہوں نے یہ مثالیں ہمارے لیے ہی چھوڑی ہیں۔“

”منظہر پلیز.....“ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

”ماہاجی! پلیز!!“ اس کے لہجے میں ساجت تھی، لیکن سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے مجھے بھائی نہیں کہا تھا..... ابو کے کمرے کا دروازہ کھلنے اور ان کے کھنکھانے کی آواز آئی تو میں سنبھل کر بیٹھ گئی اور نارمل نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

”علی کا فون آیا ہے بیٹا!! منظہر علی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“ ابو میرے قریب آ کر بیٹھ گئے، ”پتنگ کی ڈور اس کی گردن پر پھرنے سے اس کی گردن کی بیرونی جلد کٹ گئی تھی، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کی شررگ کٹنے سے بچ گئی۔ ممکن ہے کہ کل تک وہ ہسپتال سے فارغ ہو جائے۔“

”یہاں بھی حالات خطرے سے باہر ہیں انکل!“ منظہر شرارت سے بولا، ”امید ہے کہ باقی معاملات آپ خود سنبھال لیں گے۔“

”ماہا!“ ابو نے مجھے پکارا، ”بیٹا! منظہر کے لیے کھانا لگواؤ۔“  
 ”نہیں انکل چلتا ہوں۔“ اس نے تکلف سے کہا۔

”ارے ایسے کیسے جانے دوں بیٹا.....“ ابو نے اصرار کیا۔

”ماہاجی کو تکلیف ہوگی.....“ اس نے متردّد نظر آنے کی کوشش کی۔ میں دانت میسٹی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور سوچا کہ تیور سے کہوں گی کہ منظہر کے سر سے یہ بھوت اتارے۔ منظہر علی کے لیے میں پہلے ہی کچھ الجھن میں تھی مگر اب رہی سہی کسر ثانیہ کے تازہ ارشادات نے پوری کر دی تھی۔

نیند کا تو اس رات دور تک کوئی نام تھا نہ نشان۔ منظہر جس کے بارے میں کبھی میں بھولے سے بھی اس طرح نہ سوچ سکتی تھی، اس نے کس طرح ایسی بات سوچی اور پھر اس کے پاس میرے ہر اعتراض کا جواب موجود تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ فون ضرور کرے گا، اس کے بغیر وہ رہی نہ سکتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں سارا منصوبہ ترتیب دے رہی تھی کہ اسے فون پر کس طرح سمجھاؤں گی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا میرے فون پر اس کا پیغام آیا کہ وہ پورے دس منٹ کے بعد گھر کے نمبر پر کال کرے گا۔

علی بھائی اور ثانیہ گھر پر نہ تھے پھر بھی میں بغیر آہٹ کے اپنے کمرے سے لاؤنج میں جا رہی

تھی، مبادا کہ ابو کی آنکھ نہ کھل جائے، ٹیلی فون کو میں نے صوفے پر اپنے پاس ہی رکھ لیا اور اس کی کھنٹی کی آواز مدہم کر دی، کم از کم ابو ٹیلی فون کی کھنٹی کی آواز سے نہ جاگ جائیں۔ ذہن میں الفاظ ترتیب دے ہی تھی۔ چند منٹ گزر کر ہی نہ دے رہے تھے۔ ان چند منٹوں میں سوچوں کی رفتار کہیں زیادہ تیز تھی۔ بالآخر ٹیلی فون کی مدہم سی کھنٹی بجی، میں نے فوراً ریسیور اٹھا لیا اور کان سے لگا لیا۔

”شکر ہے کہ آپ میرے فون کا انتظار کر رہی تھیں، ورنہ میں تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا!“ اس نے کہا ہی تھا کہ میرے پورے جسم میں سنسناء ہٹ ہونے لگی۔ کیسی بے وقوفی کی تھی میں نے، اس سے بہتر ہوتا کہ میں فون کا پلگ ہی نکال دیتی اور وہ فون کرتا رہتا، کوئی جواب نہ پا کر اسے اندازہ ہو جاتا کہ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہی میرا جواب ہوتا۔ لیکن پھر وہ باز آنے والا کب تھا، جو بات ایک دفعہ کر لیتا تھا وہ اس پراڑ جاتا تھا۔ وہ میرے موبائل پر کالیں کرتا رہتا یا پھر گھر پر آ سکتا تھا۔

”السلام علیکم، چھوٹو!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”اوہ سوری! وعلیکم السلام!“ وہ شرمندگی سے بولا، ”آپ کا بولا ہوا ایک لفظ ”چھوٹو“ مجھے بہت کچھ جتلا رہا ہے، لیکن میں اس کا مقصد تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔“

”تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو چھوٹو!“

”جی سمجھائیے، آپ کیا سمجھنا چاہتی ہیں؟“

”دو تین چیزیں ہیں، جن پر میں بات کرنا چاہتی ہوں.....“ میں الفاظ نئے سرے سے ترتیب دینے لگی، مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں اسے سمجھنا جتنا آسان سمجھ رہی تھی، اس سے کہیں مشکل تھا۔

”آپ دس چیزوں کے بارے میں بات کریں، جو جو آپ کے ذہن میں سوالات، الجھنیں اور خیالات ہیں، وہ مجھے بتائیں۔“ وہ اپنی بات پراڑا ہوا تھا۔

”مظہر میں نے غالب کی وفات کے بعد اس گھر کی چوراسنہالی، تم اس وقت بچے تھے، میں آج تک تمہیں ویسا ہی سمجھتی ہوں.....“

”اب میں بچہ نہیں رہا، حقیقت یہ ہے کہ میں جوان ہو چکا ہوں، کاروبار سنبھال سکتا ہوں، شادی کے لائق ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ زور دے کر کہہ رہا تھا، اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ آپ کے

سمجھنے یا نہ سمجھنے کے باوجود بھی حقیقت یہی رہے گی۔“

”مظہر میں تم سے کافی بڑی ہوں۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”صرف عمر میں، وہ بھی چند سال..... اور اس بات پر بحث ہو چکی ہے، میں آپ کو دلیل سے قائل کر چکا ہوں۔“

”میں تمہارے گھر میں رہی ہوں، بیوہ کی حیثیت سے، جب تم بھی اس گھر میں تھے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اس دوران میں شاید دیور بھا بھی!!!!“ میں بولتے بولتے انک گئی۔

”لوگ، لوگ، لوگ!“ اس کی آواز میں کھنگلی تھی، ”بس کریں پلیز! زندگی بھر آپ نے لوگوں کو ہوتا بنا کر اپنے اوپر زندگی کی خوشیاں بھی حرام کر لیں۔ تیور بھائی کے متعلق بات ہوئی تو بھی آپ کو یہی اعتراض تھا، لوگ کیا کہیں گے؟ ماہ رخ کیا سوچے گی؟ وہ میرے بھائی جیسا ہے۔“

”یہی سب حقیقت بھی تو ہے مظہر! اس دنیا میں رہنا ہے تو دنیا والوں کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اس کے علاوہ تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟“

”مظہر تم جس طرح چھپ چھپ کر زندگی گزار رہے ہو اور جو تمہاری سرگرمیاں ہیں، اس میں ایسی کسی بات کی کوئی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟ تم اپنے ہی گھر میں نہیں جاتے، اپنی ماں سے نہیں ملتے، اپنے بھائی سے چھپتے پھر رہے ہو۔ ایسی صورتحال میں تمہارا اپنی شادی کے بارے میں سوچنا کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔“ میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنا اندیشہ اس پر ظاہر کر دیا۔

”میں اس وقت اپنے گھر پر ہی ہوں۔“ اس کے کہنے پر میں حیرت سے جیسے اچھل ہی پڑی۔

”کیسے؟“

”جو کائنات میں نے آپ کے حوالے کرنا تھے وہ گھر آ کر تیور بھائی کے حوالے کر دیئے ہیں، وہ میری بوسوگھتے پھر رہے تھے، مگر انہیں میری بات سمجھ میں آگئی ہے۔ میں نے چند اہم راز ان کے حوالے کر دیئے ہیں، اور ہماری تنظیم کے سربراہ ملک چھوڑ کر جارہے ہیں، کیونکہ یہاں ان کی جان کو خطرہ تھا، اس لیے ہماری تنظیم اب غیر فعال ہو جائے گی!!“

اس نے تفصیل بتائی، ”کچھ اور؟“

”لیکن مظہر میں تمہیں اپنا بھائی.....“

”لیکن میں نے کبھی آپ کو اپنی بہن نہیں سمجھا ماہاجی!!“ اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ میرے سارے بدن کا لہو سمٹ کر میرے گالوں پر آ گیا، ”میں نے اول روز سے ہی اپنی زندگی کے ساتھی کے طور پر آپ جیسی لڑکی کا تصور کیا تھا، قسمت نے شاید آپ کو ہی میرے مقدر میں لکھ دیا تھا.....“ وہ تھوڑی دیر کا ”غالب بھائی کی زندگی میں، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے میرا آئیڈل مل جائے گا، اگر وہ زندہ ہوتے تو میں آپ جیسی لڑکی کی خواہش کرتا، مگر اب وہ نہیں ہیں تو میری خواہش بالکل واضح ہے۔“ وہ پھر زکا، ”آپ کچھ بولیں ناں!“

میں نے فون بند کر دیا اور بڑبڑائی، ”بے ایمان.....!!“

اگلی صبح ہی مظہر امی جان کو لے کر پھر موجود تھا۔ ثانیہ تو میکے میں ہی تھی، علی بھائی، صدف آپنی اور ابو کے ووٹ مظہر کے ساتھ تھے..... میں دوٹوں کی بھاری اکثریت سے اور ایک مقام پر دل و دماغ کے ہاتھوں ہار گئی۔ آٹھ سال کی طویل آزمائش کے دن پورے ہو گئے تھے اور میرے صبر کا مجھے میرے پروردگار نے کیسا خوبصورت انعام دیا تھا۔ مظہر جسے میں نے اس گھر میں جا کر ایک بھولے اور معصوم سے نوجوان کی صورت میں دیکھا تھا اور کبھی بھولے سے بھی نہ سوچا تھا کہ وہ میرا شریک سفر بن سکتا ہے، اس نے ایسی فراست کا مظاہرہ کیا کہ کبھی دنگ رہ گئے۔

ڈیل ڈول میں تو وہ سب بھائیوں میں بڑھ کر تھا، اس لیے اس کے ساتھ کھڑی میں آج تک چڑیا جیسی لگتی ہوں اور اس کی قربت مجھے تحفظ کا احساس دلاتی ہے۔ اس کے انداز میں ایک ان چاہا سا احترام بھی موجود ہے جو مجھے جلوت و خلوت کے ہر لمحے میں محسوس ہوتا ہے اور میں کوشش کرتی ہوں کہ جواباً میں بھی اسے اتنا ہی احترام دوں مگر اس کم بخت زبان کا کیا کیا جائے، جس سے اب بھی کبھی کبھار اچانک لفظ ”چھوٹو“ پھسل جاتا ہے۔

تیور نے بھی سادگی سے اپنے دوست کی بہن عفت سے نکاح کر لیا اور عفت اتنی عالی ظرف نکلی کہ اس نے تیور کے ساتھ نگر نگر گھومنے کی بجائے اس کی امی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ پہلے بچے کی ولادت تک وہ وہیں رہی، لیکن پھر تیور اصرار کر کے اسے ساتھ لے گیا۔ بچے ایسا ہی مقناطیس ہوتے ہیں کہ جو والدین کو اکٹھا رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تیور، ماہ رخ اور عفت کے

ماہین تو وزن اور انصاف قائم کرنے کی کوششوں میں ہلکان ہوا جا رہا ہے، لیکن فطری سی بات ہے کہ کبھی جھکاؤ ایک طرف ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرف۔

ماہ رخ نے بھی حالات سے اسی لیے سمجھوتہ کیا ہے کہ یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے، اسے اپنے کیے کی سزا میں سوتن کا تھکا ملا۔ احمد کی ولادت پر وہ میرے پاس ہی تھی۔ میں نے احمد کو اس کی گود میں ڈالا..... ”یہ تمہارا بیٹا ہے ماہ رخ.....“ مظہر کی طرف دیکھا کہ شاید وہ میرے الفاظ کی تائید کرے مگر وہ خاموش ہی رہا۔

”مجھے بچوں کا کوئی شوق نہیں ہے ماہا!“ ماہ رخ نے احمد کو میرے پہلو میں واپس لٹا کر کہا۔ مظہر کے چہرے پر اطمینان اتر آیا تھا۔

”مجھے اپنی اولاد کو اچھی گود سے پرورش دلانا ہے ماہاجی!!“ اس نے بعد میں کہا تھا، ”اتنا بڑا فیصلہ آپ مجھ سے پوچھنے بنا کیسے کر سکتی تھیں۔“

”وہ دکھی ہے مظہر!!“ میں نے صفائی دی۔

”یہ دکھ انہوں نے خود مول لیے ہیں!!“ مظہر نے سچائی بیان کی۔

امی جان تو خوشیوں کے ہنڈولے میں جھومتی پھرتی ہیں، میں اور عفت گویا مقابلے پر ہیں۔ عفت کے ہاں تین بیٹوں کے بعد بیٹی کی ولادت ہوئی تو اسے تیور نے میری گود میں ڈال دیا۔

”یہ آپ کی ہوئی.....“

”ارے نہیں تیور.....“ میں نے ہچکچا کر کہا۔

”اب نہیں!“ اس نے وضاحت کی، ”بڑے ہو کر.....“ میں نے سوالیہ نظروں سے مظہر کو دیکھا، اس نے جواب میں مسکراہٹ سے تائید کی تو میں نے اس نغصی سی گڑیا کو سینے سے بھینچ لیا۔

”اس کا نام بھی آپ ہی رکھیں۔“

”خوشبو!!“ میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر کہا۔

”واؤ! بڑا خوبصورت نام ہے۔“ تیور نے جوش سے کہا، ”یقیناً آپ نے اپنی بیٹی کے لیے سوچ رکھا ہوگا۔“ میرے وجود کے آنگن میں چھن سے غالب کی یاد در آئی۔

”یہ نام غالب کو بہت پسند تھا.....“ میں نے بلا تذبذب بتا دیا۔ احمد کی پیدائش پر جب مظہر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ غالب بھائی کو کون سا نام پسند تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ وہ مومن نام



رکھنا چاہتے تھے۔

”تو پھر ہم اس کا نام مومن رکھ لیتے ہیں؟“ مظہر نے مجھے بانہوں کے حلقے میں لے کر کہا تھا۔  
 ”مجھے اپنی زندگی میں جینے دو مظہر.....“ میں نے اس کے سینے پر سر ٹکا کر کہا تھا۔ امی جان نے نومولو کا نام احمد رکھ دیا اور یوں اس کے بعد اسی قافیے کی تکرار شروع ہو گئی۔ ہمارے ہاں یکے بعد دیگرے احمد، سرمد، اسد اور حامد آ گئے، جب کہ تیمور کے ہاں محمد، اسجد اور محمد کی آمد ہوئی۔ خوشبو، تیمور کی آخری اولاد ثابت ہوئی، جسے آنے والے وقت میں میرے احمد کی ولہن بننا ہے انشا اللہ، اور مجھے تو ابھی تک امی جان دعائیں دے رہی ہیں، اس لیے پھر سے نئے مہمان کی آمد آمد ہے۔ مظہر کو بھی بہت زیادہ بچوں کا شوق ہے۔

زندگی اتنی خوبصورت لگنے لگی ہے، اپنی دنیا ہے، اپنا گھر، اپنا شوہر، امی جان اور بچے..... کہ میکے جانے کی تو مہینوں فرصت نہیں ملتی۔ یوں بھی میکے تو ماں باپ سے ہوتا ہے، ابو کے بعد اب وہاں زیادہ کشش بھی محسوس نہیں ہوتی۔ ثانیہ ہی کی زبانی معلوم ہوتا رہتا ہے کہ سیکنہ آنٹی اپنی ایک غریب بھانجی کی بیٹی کو بہو بنا کر لائیں لیکن اس نے ایسے روپ بدلا کہ ساری بہنوں کو کھجوا آگئی ہے۔  
 ”وہ تو باباجی!! اپنا اصل ایسے بھولی کہ جیسے کسی رئیس کی اولاد ہو۔“ ثانیہ جو الفاظ کہہ رہی تھی، ان کے آئینے میں مجھے اس کی اپنی شکل نظر آ رہی تھی۔  
 ”چلو کم از کم محسوس تو نہیں ہے ناں!“ میں کہے بغیر رہ نہ سکی تھی، اور وہ مجھے دیکھ کر رہ گئی۔

مظہر اور بچوں کے کام مجھے تھکا دیتے ہیں، لیکن مظہر کا پیار مجھے ہمت اور عزم دیتا ہے۔ صرف پہلا سال کچھ مسئلہ رہا تھا کہ مظہر مجھے بلاتے ہوئے ہچکچاتا تھا، لیکن احمد کی آمد سے یہ مسئلہ حل ہو گیا اور وہ مجھے احمد کی والدہ کہہ کر بلانے لگا۔ پھر وقت گزرتا گیا اور اب وہ کبھی کبھار مجھے ماہا بھی کہہ لیتا ہے۔ میں نے اتنا تعاون کرنے والا شریک سفر کی کا نہیں دیکھا، جو گھر سے باہر کے امور بھی منٹاتا ہے، ماں کی خدمت اور بچوں کی سیر و تفریح کا خیال بھی رکھتا ہے۔

کبھی کبھار کسی خاص موقع پر سبھی افراد خانہ جمع ہوتے ہیں تو ہمارے گھر کی رونقیں لوٹ آتی ہیں۔ بچوں کی شرارتیں اور قلقاریاں گھر میں گونجتی ہیں تو کبھی بڑوں کے قہقہے۔ ماہ رخ اگرچہ اس

گھر کی فرو ہے مگر مارے باندھے شریک ہوتی ہے۔ تیمور نے اپنے بچوں سے اسے ماں کہلوا دیا ہے، اس پر وہ بہت چڑتی ہے لیکن تیمور ضد اور شرارت میں اسے اور بھی چڑاتا ہے۔ عفت کو اس کے اپنے بچے ماہا کہتے ہیں اور مجھے بڑی ماہا..... تیمور کی ساری باتیں اٹھی ہیں۔

مظہر گھر کے تمام معاملات کو بڑی سمجھداری اور بالغ نظری سے دیکھتا ہے۔ گھر کے اخراجات کے علاوہ اس نے امی جان، ماہ رخ، عفت کا اور میرا علیحدہ علیحدہ جیب خرچ مقرر کر رکھا ہے۔ سب بچوں کے تعلیمی اخراجات کی رقم بھی وہ ان کی ماؤں کو علیحدہ دیتا ہے۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہو کر بھی وہ سب کے لیے چھتر چھاؤں جیسا ہے۔ اسے سب کے مسائل کا اور اک ہے، سب کی خوشی اور غمی کا احساس ہے۔

”میری اس تمام سمجھداری کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے ماہا!“ وہ اعتراف کرتا ہے، ”آپ کو میں نے اتنی کم عمری میں ایسی فراست اور سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا اور میں ہمیشہ آپ سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ صرف فیصلہ کرنے میں دیر کر دی۔“  
 ”سو تو ہے!“ میں اٹھلا کر کہتی ہوں، ”متاثر کن چیز تو ہم ہیں۔“  
 ”کوئی شک نہیں!“ کہتے ہوئے وہ ایک گستاخی کرتا ہے۔

”مظہر تم میری شان میں گستاخی کر رہے ہو!“ میں ہنستے ہوئے اسے سرزنش کرتی ہوں۔ وہ مجھے بانہوں میں سمیٹ لیتا ہے اور پیار کی حکایات سنانے لگتا ہے۔ زندگی کتنی حسین ہو گئی ہے، چھوٹو کی گستاخیاں بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں..... ”تم باز نہیں آؤ گے چھوٹو!!“ ہمارا مشترکہ قہقہہ گونجتا ہے اور میرا وجود گنگنانے لگتا ہے۔

○ نوید بہار ملی ہے

زندگی کو

آبلہ پاؤں کو، صحرا نوروں کو

افن ملا ہے کہ مسکراؤ!!

بہار آئی ہے.....

اور ہر ڈال پر بہار آئی ہے

کیکٹس ہوں یا امرتیل یا گلاب

سب پر موسم بہار کے آثار ہیں

امرتیل پر بھی پتے، شگوفے اور پھول کھلنے لگے ہیں

تازگی، خوشبو اور رنگوں سے بھرے

زندگی مسکرا رہی ہے !!! O

(شیریں حیدر)

ختم شد